اِس تصویر کے لیے کوئی مناسب شعری یا نثری عنوان تجویز کیجیے۔ نثری عنوان کسی مشہور شاعر کی نظم یا افسانہ نگار کے افسانے کے عنوان ہو تو بہتر ہے۔ پسندیدہ عنوانات اگلے شمارے میں ارسال کنندگان کے شکریے کے ساتھ شائع کیے جائیں گے۔ عنوان بھیجتے ہوئے افسانہ نگار کا نام لکھنا نہ بھولیں۔

اِس صفحے کے لیے قارئین بھی ہمیں ایسی تصویریں بھیج سکتے ہیں جو ہندستان کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کو پیش کرتی ہوں۔ پسندآ تصاویر بھیجنے والوں کے نام سے شائع ہوں گی اور انھیں ان کا معاوضہ بھی پیش کیا جائے گا۔

اردو اکادمی، دہلی کا ماہانہ رسالہ

فون نمبر: ۳۲۶۳۴۴۸، ۳۲۷۶۲۱۱

ایوانِ اردو دہلی

ادارۂ تحریر:
سید شریف الحسن نقوی، مخمور سعیدی

جلد: ۴ ● شمارہ: ۱ ● فی کاپی ۵۰ ر ۲ روپے، سالانہ قیمت ۲۵ روپے ● مئی ۱۹۹۰ء

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتا
ماہنامہ ایوانِ اردو دہلی
اردو اکادمی، دہلی ــــ گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

خوشنویس: تنویر احمد

سید شریف الحسن نقوی (ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر) نے سیما آفسیٹ پریس، دہلی ۱۱۰۰۰۶ سے چھپوا کر دفتر اردو اکادمی، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا

حرفِ آغاز

پچھلے دنوں ملک بھر میں ڈاکٹر امبیدکر کی ۹۹ ویں سالگرہ منائی گئی اور انھیں بعد از مرگ بھارت رتن کا اعزاز دیا گیا جو صدر جمہوریہ کے ہاتھوں سے ان کی بیوہ نے حاصل کیا۔ بعد میں اخبار نویسوں سے بات چیت کرتے ہوئے انھوں نے بجا طور پر یہ شکایت کی کہ ملک نے ڈاکٹر امبیدکر کی قومی خدمات کی اہمیت کا اندازہ کرنے میں بہت سست روی سے کام لیا اور ان کے انتقال پر لگ بھگ چار دہائیاں گزر جانے کے بعد موجودہ حکومت کو ان کی قدر شناسی کا خیال آیا۔

ڈاکٹر امبیدکر کا نام ہمارے جمہوری آئین کے معماروں میں سرِ فہرست آتا ہے اور یہ سچ ہے کہ انھوں نے جمہوریہ ہند کے لیے آئین سازی کے اہم کام میں جو حصہ لیا' اس کی قدر شناسی میں خاصی غفلت برتی گئی لیکن شاید اس سے بھی زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ خود اس آئین کے تئیں جس کی تشکیل میں ڈاکٹر امبیدکر اور دوسرے رہنمایانِ قوم نے شبانہ روز محنت کی تھی اور اسے ایک بہترین جمہوری آئین کی شکل دینے کے لیے انتہائی دل سوزی سے کام کیا تھا' ہمارے دلوں میں وہ عزت اور احترام باقی نہیں رہا جس کا وہ مستحق ہے۔

ایک جمہوری نظام میں تشدد' تخریب کاری اور قتل و غارت کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ یہاں دو یا دو سے زیادہ گروہ اپنے اختلافات باہمی افہام و تفہیم سے دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور جن امور پر اختلافات دور نہ ہو سکیں ان کے حل کے لیے بھی پُر امن ذرائع ہی اختیار کرتے ہیں۔ ہمارا آئین بھی ہمیں یہی سکھاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہم اس کے برعکس کوئی طریقِ کار اختیار کرتے ہیں تو وہ غیر آئینی طریقِ کار ہوگا۔ قومی دستور کا احترام اور اس کی پیروی ہمارا خوشگوار فرض ہے۔ دستور میں ہمیں فکر و عمل کی جو آزادیاں دی گئی ہیں ان کے استعمال سے ہمیں کوئی نہیں روک سکتا اور اگر کوئی روکتا ہے تو ہم اس کے خلاف عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکتے ہیں لیکن ان آزادیوں سے تجاوز ہمیں صرف انتشار اور تباہی کے راستوں پر لے جائے گا' کسی مثبت کامیابی کی طرف نہیں۔

کہا جا سکتا ہے کہ آئین کوئی آسمانی صحیفہ نہیں' انسانی دستاویز ہے۔ بدلے ہوئے حالات کی رعایت سے اس میں ترمیم و اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ بے شک ایسا کیا جا سکتا ہے اور کیا بھی گیا ہے لیکن اس کے لیے بھی آئینی طریقِ کار ہی اختیار کرنا ہوگا۔ دونوں پارلیمانی ایوان ہمارے منتخب نمائندوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اس کام کے لیے یہی ایوان مناسب ہیں' سڑکیں نہیں۔

اصل مسئلہ جمہوری اصولوں کو سمجھنا اور ان پر عمل کرنا ہے۔ اور دُنیا کا کوئی جمہوری نظام ایسا نہیں' جو تشدد اور عدم رواداری کو جائز قرار دیتا ہو ــــــ ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک میں جو بہ یک وقت کئی نسلوں' مذہبوں' تہذیبوں اور زبانوں کا گہوارہ ہے ایک دوسرے کے معتقدات و مفادات کا لحاظ اور باہمی رواداری اور بھی ضروری ہے۔ ہمارے صوفی سنتوں اور دانشوروں کی تعلیمات میں بھی سب سے زیادہ زور اسی پہلو پر دیا گیا ہے اور ہمارے شاعر بھی ہم سے یہی کہتے آئے ہیں:

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینتِ چمن
اے ذوقؔ اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

آج اس آواز پر دھیان دینا جتنا ضروری ہے' شاید پہلے کبھی نہ تھا۔

ــــــ سید شریف الحسن نقوی

ساحر ہوشیارپوری

غم ہمیں دے کہ شادمانی دے
کوئی سوغات، غیر فانی دے

ہو چکا امتحانِ ضبطِ دل
اب اسے اذنِ خوں فشانی دے

اے خداوندِ آب و آتش و گل
نقشِ کہنہ کو پھر جوانی دے

زرد جسموں کو پھر سے کر شاداب
ان کو ملبوس کہکشانی دے

ہو قلم کو عطا زباں کا حسن
لبِ گویا کو خوش بیانی دے

فکر کو بخش رفعتِ پرواز
لفظ کو وسعتِ معانی دے

کر عطا ذہن کو دروں بینی
روح کو ذوقِ نغمہ خوانی دے

دولتِ صبر سے ہو دل مسرور
اس کو تسکین خوش گمانی دے

تیرے در کے سوا جھکیں نہ کہیں
ہم کو کچھ ایسی سرگرانی دے

۲۲۶۹، سیکٹر ۲۸، فریدآباد ۱۲۱۰۰۳

کیف بھوپالی

تقدیر کو نہ کوس نصیب آزما کے دیکھ
شعلوں کے درمیان نشیمن بنا کے دیکھ

پتھر کی مورتوں کو بھی کہتے ہیں شاہکار
جسموں کا اعتبار نہ کر گدگدا کے دیکھ

دُنیا کو چند لوگ سمجھتے ہیں پائیدار
یہ کتنی پائیدار ہے ٹھوکر لگا کے دیکھ

اللہ کس کا نام ہے ملاح کس کا نام
طوفان کس کا نام ہے کشتی میں آ کے دیکھ

تو نے ہی تو کہا تھا ترا شہر چھوڑ دوں
رو رو کے اب نہ دیکھ مجھے مسکرا کے دیکھ

بازار میں نمو دو نمائش کا ہے چلن
شیشوں کی دلکشی پہ نہ جا کھنکھنا کے دیکھ

اے کیف جودھپور کے لڑکے شریر ہیں
اس شہر میں نہ کانچ کے برتن سجا کے دیکھ

شاہ جہاں آباد، بھوپال

حسن نعیم

سبوئے فکر و تماشہ سے اتنا مست رہا
مری زمیں پہ نہ کوئی بلند و پست رہا

دیا بھی غم تو مسرت کو بے نشاں نہ کیا
عجب یہ بختِ گریزاں کا بندوبست رہا

کسے خدا کے علاوہ ہے فرصتِ تخلیق
میں اک عذاب میں گھر کے قلم بدست رہا

رہا میں خواب کے گل بن میں روز و شب لیکن
ہمیشہ فاصلہ دنیا سے ایک جست رہا

تمام عمر رہی جنگ آرزو سے نعیم
یہ غم ہے کیوں نہ مقدر مرا شکست رہا

سی ۲، شالیمار ٹوئینگ نگر، داہسار (ویسٹ) بمبئی ۶۸

بشر نواز

نظمیں

سرابوں کا سفر

عجب دوراہے پر زندگی ہے
ہے اِس سرے پر کہ اُس سرے پر
نہ جانے منزل کہاں مری ہے
کہیں نہ یوں ہو
کہ منزلیں بھی ہوں وہم میرا
ہر ایک رستے کے بعد اک اور راستہ ہو
نہ ہو کہیں بھی سکوں کا ڈیرا
دھواں دھواں منظروں کے پیچھے
کچھ اور منظر دھواں دھواں ہو
سراب کی طرح کچھ نشاں ہوں
کہیں نہ یوں ہو
کرن کرن کچھ کہیں نہیں ہو
مری ہی بے تاب آرزوئیں
سیاہیوں میں چمک اٹھی ہوں
ہزار شکلوں میں ڈھل گئی ہوں
اور آپ میں، اپنے ہی تعاقب ــــ
ــــ میں رستے رستے بھٹک رہا ہوں
کہ جیسے کوئی اکیلا بچّہ
رفاقتوں کو ترس ترس کے
خود اپنی پرچھائیوں سے کھیلے
لگالے خود اپنے چار جانب
خیالی ہمجولیوں کے میلے

تماشہ گاہ کا بے بس تماشائی

ستارہ ٹوٹتا ہے
سیہ مخمل کے پردے پر کوئی تلوار چلتی ہے
کوئی غنچہ، دریچہ کوئی، کوئی اونگھتا پنچھی
گھڑی بھر، صرف اک پل کو
اندھیرے کی ردا سرکا کے جیسے جھانک لیتا ہے
یہاں منظر بدلتا ہے
کوئی بھولا ہوا لمحہ
اُفق سے حافظے کے ٹوٹتا ہے
بطن سے اس کے کوئی اِک اور، اس کے بطن سے کوئی
پھر اُس سے اور کوئی . . .
ذہن میں جیسے مُسلسل پھلجھڑی سی چھُٹتی جاتی ہے
عجب سی جنگ ہے
پردے سبھی کٹ کٹ کے گرتے ہیں
گئے منظر کو پھر سے دیکھنے کی تاب کس میں ہے
میں چلّاتا ہوں، کہتا ہوں
یہاں منظر بدلنا تھا
یہاں منظر بدلنا تھا
مگر پردہ ہی گرتا ہے نہ منظر ہی بدلتا ہے

OO

ملّہ گھاٹی، اورنگ آباد (مہاراشٹر)

جیر امداس فلک

رُباعی کا بنیادی وزن

موجدِ رباعی رودکی نے :

غلطاں غلطاں ہمی رود تالبِ گو

کا وزن بحرِ ہزج سے مقرر کیا اور اس کو رُباعی کے اوزان کی بنیاد بنایا۔ وہ وزن یہ ہے۔ مفعولن ۔ فاعلن ۔ مفاعیل فِعَل۔ مسلماتِ فن (صفحہ ۵۰) 'پہلا قدم' کے تحت لکھا ہے کہ رودکی اپنے زمانے کا ایک نہایت ذہین شخص تھا۔ جب اس نے مندرجہ بالا وزن پر غور کیا تو موصوف نے اصل وزن یہ دریافت کیا۔ مفعول۔ مَفَاعِلُن۔ مَفَاعیلُ ۔ فَعَل ۔ مسلماتِ فن (صفحہ ۳۳) پر 'حضرت نظم طباطبائی فرماتے ہیں' کے تحت لکھا ہے کہ "یہ کلیہ تمام بحور اور اوزان میں جاری ہے کہ اگر مصرعے کے آخر میں دو ساکن ہوں تو دوسرے ساکن کو گرا دینا یا باقی رکھنا ایک ہی بات ہے۔ اس سے وزن نہیں بدلتا" اس قول کی صراحت یوں کی جا سکتی ہے کہ 'فاع' کہو یا 'فع'۔ 'فعول' کہو یا 'فَعَل'۔ 'فعلان' کہو یا 'فعلن'۔ لٰہذا نظم کا یہ قول نہایت عالمانہ ہے۔" اس سے صاف طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایسے اوزان کو جن کے آخر میں فعل اور فعول واقع ہوتے ہیں۔ انھیں الگ الگ وزن تسلیم کرنے کی ضرورت نہیں۔ کلیدِ عروض (صفحہ ۱۱۰) پر لکھا ہے کہ رُباعی کے اصل وزن محض چار ہیں:

۱۔ مُفعولُ ۔ مفاعلن ۔ مفاعیل ۔ فَعَل
۲۔ 〃 〃 〃 فعول
۳۔ 〃 مفاعیل 〃 فَعَل
۴۔ 〃 〃 〃 فعول

یہ چار اوزان نظم طباطبائی کے قول کی روشنی میں مسلماتِ فن (صفحہ ۵۱) پر دُو بنیادی اوزان رہ گئے۔

نمبر۱۔ مفعول مفاعلن مفاعیل فَعَل/فعول
نمبر۲۔ 〃 مفاعیل 〃 〃 / 〃

کلیدِ عروض (صفحہ ۱۱۸) پر لکھا ہے کہ رُباعی کے جملہ اوزان جو بحرِ ہزج سے حاصل کیے گئے۔ دو قوانین کے مرہونِ منت ہیں۔ (۱) تخنیق (۲) عمل معاقبہ۔

معاقبہ : جس رکن میں دو سبب خفیف متوالی آئے ہوں ان کے حروفِ ساکن بیک وقت گرانا مناسب نہیں لیکن دونوں کو الگ الگ طور پر گرانے سے جو ارکان حاصل ہوں۔ ان کا اجتماع جائز ہے۔

مثلاً مفاعی لُن کے مفاعلن اور مفاعیل
مقبوض　مکفوف

ایک دوسرے کی جگہ رکھے جا سکتے ہیں کیونکہ مفاعی لُن میں پانچواں اور ساتواں ساکن حرف گرانے سے یہ مزاحف ارکان حاصل ہوتے ہیں۔ یہ حروفِ ساکن دو سبب خفیف کے ساکن حروف ہیں۔

تخنیق : کلیدِ عروض (صفحہ ۶۰) پر 'تسکین اور تخنیق' کے تحت لکھا ہے کہ محقق طوسی نے تسکین اوسط اور تخنیق میں کوئی فرق روا نہیں رکھا۔ بلکہ تخنیق کو تسکین اوسط ہی کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ کلیدِ عروض (صفحہ ۵۲) پر زحافاتِ مفرد کے تحت نمبر ۸ پر 'تخنیق' کی تعریف یہ لکھی ہے۔ وتد مجموع سے پہلا حرف ساکن کرنا اور ماقبل رکن کے حرفِ آخر متحرک سے پیوست کرنا۔ محقق طوسی نے تخنیق کو دیکھ کر زحاف تسکین وضع کیا۔ یہ زحاف تخنیق کی توسیع تھی۔ یعنی تخنیق جو دو ارکان کے بیچ لاگو ہوتا تھا۔ اب مفرد رکن پر بھی لاگو ہو گیا۔ اور اس طرح یہ زحاف عام ہونے کی وجہ سے صدر وابتدا، حشوین اور عروض و ضرب میں یعنی شعر کے ہر مقام پر وارد ہونے کی صلاحیت کا حامل ہو گیا۔ 'تسکین' کی تعریف یہ ہو گئی۔ وتد مجموع سے پہلا حرف ساکن کرنا اور ماقبل کے حرفِ آخر متحرک سے پیوست کرنا۔ تخنیق کی تعریف میں سے لفظ 'رکن' محذوف کر دیا گیا۔ اس طرح اس تعریف میں وسعت پیدا ہو گئی۔ اور تخنیق و تسکین میں کوئی فرق نہ رہا۔ کلیدِ عروض (صفحہ ۱۱۹) پر لکھا ہے کہ محقق طوسی نے اضمار اور عصب کو دیکھ کر زحاف تسکین ایجاد فرمایا۔ یہ محض غلط فہمی ہے۔ نیز کلیدِ عروض (صفحہ ۵۳) پر تسکین کی تعریف لکھی ہے کہ سہ حرکات متوالی میں سے درمیان کی حرکت کو ساکن کرنا۔ یہ تعریف غلط ہے۔ اگر یہ تعریف صحیح ہوتی تو کلیدِ عروض

(صفحہ ۶۳) پر مفاعلتن اور متفاعلن کو معصوب و مضمر یعنی زحاف عصب اور اضمار سے مفاعی لُن اور مس تف علن نہ بنایا جاتا۔ بلکہ تسکین اوسط سے مفاعی لن اور مس تف علن بنائے جاتے۔ انھیں معصوب اور مضمر نہ کہا جاتا بلکہ مسکّن کہا جاتا۔ کیونکہ دونوں اصل ارکان میں تین حرکات متوالی واقع ہوئی ہیں۔

نظم طباطبائی کے قول کی روشنی میں چار بنیادی اوزان کو دو بنیادی اوزان بنا دیا گیا۔

۱۔ مفعول مفاعلن۔ مفاعیل۔ فَعَل/فعول
۲۔ " مفاعیل۔ " " " / "

معاقبہ کی رُو سے بنیادی وزن نمبر ۱ میں 'مفاعلن' کی جگہ 'مفاعیل' رکھا جا سکتا ہے۔ پھر نمبر ۲ کو بنیادی وزن ماننے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس طرح بنیادی وزن صرف ایک رہ جاتا ہے۔ مفعول۔ مفاعلن۔ مفاعیل۔ فعل/ فعول۔

مسلماتِ فن (صفحہ ۵۱) پر 'دوسرا قدم' کے تحت لکھا ہے کہ حضرت علّام عشق آبادی (سحر عشق آبادی) آنجہانی نے ۔۔۔ مزید دو ابتدائی اوزان اس طرح قائم کیے۔

۱۔ مفعول۔ مفاعیل۔ مفاعلن۔ فَعَل/فعول
۲۔ " مفاعلن۔ " " / "

اور ان دونوں اوزان پر عمل تخنیق فرما کر رُباعی کے مزید بارہ اوزان کا اضافہ کیا۔ غور سے دیکھا جائے تو از روئے معاقبہ یہ دونوں اوزان بھی جن کو ابتدائی اوزان کا نام دیا گیا ہے۔ مندرجہ بالا ابتدائی وزن نمبر ۱ میں سما جاتے ہیں۔ اور اس طرح مفعول۔ مفاعلن۔ مفاعیل۔ فعل/فعول ہی ایک ابتدائی وزن رہ جاتا ہے۔

مسلماتِ فن (صفحہ ۵۲) پر 'تیسرا قدم' کے تحت لکھا ہے کہ رُباعی کے مزید ابتدائی اوزان اس طرح قائم کیے جا سکتے ہیں:

۱۔ فاعلن۔ مفاعلن۔ مفاعیل۔ فَعَل/فعول
۲۔ " ۔مفاعیل۔ " ۔ " /"
۳۔ " ۔مفاعلن۔ مفاعلن۔ "/"
۴۔ " ۔مفاعیل۔ " ۔ " /"

مسلماتِ فن (صفحہ ۵۵) پر 'شجرہ نمبر ۳ فاعلن والے اوزان' کے تحت لکھا ہے کہ ان اٹھارہ اوزان کے اضافے سے اب رُباعی ۵۴ اوزان پر مشتمل ہوگی۔ ان اوزان کے علاوہ اب رباعی کے اوزان میں کسی قسم کے اضافے کی گنجائش نہیں 'مفعول' اور 'فاعلن' (زحاف خرم اور معاقبہ کے عمل سے حاصل شدہ) صدر و ابتدا میں ایک دوسرے کی جگہ رکھے جا سکتے ہیں۔ رودکی کے ابتدائی وزن میں شروع میں 'مفعول' موجود ہے۔ فاعلن اس کی جگہ آسکتا ہے۔ حشوین اور عروض و ضرب کے ارکان بھی اسی وزن میں سما جاتے ہیں۔ اس طرح بھی رودکی کا وزن مفعول۔ مفاعلن۔ مفاعیل۔ فعل/فعول ہی 'بنیادی وزن' کہلانے کا مستحق ہے۔ باقی سب صورتیں رعایتی ہیں۔ چاہے وہ تخنیق کی رُو سے ہوں یا معاقبہ یا معاقبہ اور خرم کے عمل سے ہوں۔

رودکی نے 'بنیادی وزن' سے چوبیس اوزان بنائے۔ سحر عشق آبادی نے بارہ اوزان کا اضافہ کیا۔ نازؔ علامی نے ۱۸ اوزان کا اضافہ کیا۔ مسلماتِ فن میں (صفحہ ۵۳ تا ۵۵) پر یہ اوزان اس طرح درج ہیں:

شجرہ نمبر ۱ مفعول والے اوزان

۱۔ مفعول ۔ مفاعلن ۔ مفاعیل ۔ فَعَل
۲۔ " ۔ " ۔ " ۔ فعول
۳۔ " ۔ " ۔ مفاعی لُن ۔ فع
۴۔ " ۔ " ۔ " ۔ فاع
۵۔ " ۔ مفاعیل ۔ مفاعیل ۔ فَعَل
۶۔ " ۔ " ۔ " ۔ فعول
۷۔ " ۔ مفاعی لُن ۔ مفعول ۔ فَعَل
۸۔ " ۔ " ۔ " ۔ فعول
۹۔ " ۔ مفاعیل ۔ مفاعیلن ۔ فع
۱۰۔ " ۔ " ۔ مفاعی لن ۔ فاع
۱۱۔ " ۔ مفاعی لن ۔ مفعولن ۔ فع
۱۲۔ " ۔ " ۔ " ۔ فاع
۱۳۔ " ۔ مفاعلن ۔ مفاعلن ۔ فَعَل
۱۴۔ " ۔ " ۔ " ۔ فعول
۱۵۔ " ۔ مفاعیل ۔ " ۔ فَعَل
۱۶۔ " ۔ " ۔ " ۔ فعول
۱۷۔ " ۔ مفاعی لن ۔ فاعلن ۔ "
۱۸۔ " ۔ " ۔ " ۔ فعول

رودکی کے ایجاد کردہ: ۱ تا ۱۲
علّام کے ایجاد کردہ: ۱۳ تا ۱۸

شجرہ نمبر ۲ مفعولن والے اوزان

۱۔ مفعولن ۔ فاعلن ۔ مفاعیل ۔ فَعَل
۲۔ " ۔ " ۔ " ۔ "
۳۔ " ۔ " ۔ مفاعی لن ۔ فع
۴۔ " ۔ " ۔ مفاعیلن ۔ فاع
۵۔ " ۔ مفعول ۔ مفاعیل ۔ فَعَل

۶۔ مفعولن ۔ مفعول ۔ مفاعیل ۔ فعول

۷۔ 〃 ۔ مفعولن ۔ مفعول ۔ فَعَل

۸۔ 〃 ۔ 〃 ۔ 〃 ۔ فعول

۹۔ 〃 ۔ مفعول ۔ مفاعی‌لن ۔ فع

۱۰۔ 〃 ۔ 〃 ۔ 〃 ۔ فاع

۱۱۔ 〃 ۔ مفعولن ۔ مفعولن ۔ فع

۱۲۔ 〃 ۔ 〃 ۔ 〃 ۔ فاع

۱۳۔ 〃 ۔ فاعلن ۔ مفاعلن ۔ فَعَل

۱۴۔ 〃 ۔ 〃 ۔ 〃 ۔ فعول

۱۵۔ 〃 ۔ مفعول ۔ 〃 ۔ فَعَل

۱۶۔ 〃 ۔ 〃 ۔ 〃 ۔ فعول

۱۷۔ 〃 ۔ مفعولن ۔ فاعلن ۔ فَعَل

۱۸۔ 〃 ۔ 〃 ۔ 〃 ۔ فعول

رودکی کے ایجاد کردہ : ۱ تا ۱۲

علّام کے ایجاد کردہ : ۱۳ تا ۱۸

شجرہ نمبر۳ فاعلن والے اوزان

۔ فاعلن ۔ مفاعلن ۔ مفاعیل ۔ فَعَل

۔ 〃 ۔ 〃 ۔ 〃 ۔ فعول

۔ 〃 ۔ 〃 ۔ مفاعی‌لُن ۔ فع

۔ 〃 ۔ 〃 ۔ 〃 ۔ فاع

۔ 〃 ۔ مفاعیل ۔ مفاعیل ۔ فَعَل

۔ 〃 ۔ 〃 ۔ 〃 ۔ فعول

۔ 〃 ۔ 〃 ۔ مفاعی‌لن ۔ فع

۔ 〃 ۔ 〃 ۔ 〃 ۔ فاع

۔ 〃 ۔ مفاعی‌لن ۔ مفعول ۔ فَعَل

۔ 〃 ۔ 〃 ۔ 〃 ۔ فعول

۔ 〃 ۔ 〃 ۔ مفعولن ۔ فع

۔ 〃 ۔ 〃 ۔ 〃 ۔ فاع

۔ 〃 ۔ مفاعلن ۔ مفاعلن ۔ فَعَل

۔ 〃 ۔ 〃 ۔ 〃 ۔ فعول

۱۵۔ فاعلن ۔ مفاعیل ۔ مفاعلن ۔ فَعَل

۱۶۔ 〃 ۔ 〃 ۔ 〃 ۔ فعول

۱۷۔ 〃 ۔ مفاعی‌لن ۔ فاعلن ۔ فَعَل

۱۸۔ 〃 ۔ 〃 ۔ 〃 ۔ فعول

زآر علاّمی کے ایجاد کردہ : ۱ تا ۱۸

رباعی میں ارکان کی ترتیب "سبب پے سبب است و وتد پے وتد است" کے اصول کے تحت واقع ہوئی ہے۔ یعنی اگر پہلے رکن کا آخری جزو 'سبب' یا 'وتد' ہے تو اُس کے بعد آنے والے رکن کا پہلا جزو بھی سبب یا وتد ہونا چاہیے۔ ماقبل رکن کا آخری جزو 'سبب' ہوگا تو مابعد رکن کا پہلا جزو سبب ہوگا۔ اسی طرح اگر وتد آخری جزو ہوگا تو اولیں جزو بھی وتد ہوگا۔ وتد مجموع بھی ہوسکتا ہے۔ مفروق بھی۔ اسس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آخری رکن میں اگر ایک حرف زائد ہے تو اس حرف کی نفی کرکے سبب یا وتد کا تعیّن ہوگا۔ کیوں کہ نظم طبا طبائی کے قول کی روشنی میں ایسا کرنا ضروری بھی ہے اور مناسب بھی۔ وجہ یہ کہ 'مفاعی' سے 'فعول' بنایا ہی نہیں جاسکتا۔ یہ فَعَل میں ایک حرف کا اضافہ ہی مانا جاسکتا ہے۔ زحاف ہتم (حذف + قصر) آئینِ عروض کے خلاف ہے۔

مندرجہ بالا گفتگو سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ 'بنیادی وزن' صرف ایک ہے۔ جو رودکی کا ایجاد کردہ ہے۔ یعنی مفعول۔ مفاعلن۔ مفاعیل۔ فعل اور نظم طبا طبائی کے قول کے مطابق فَعَل کی جگہ فعول رکھنے سے وزن نہیں بدلتا۔ مسلماتِ فن (صفحہ ۵۵) پر "شجرہ نمبر۳ فاعلن والے اوزان" کے تحت آخری جملہ یہ لکھا ہے کہ ان اٹھارہ اوزان کے اضافے سے اب رباعی ۵۴ اوزان پر مشتمل ہوگئی ان اوزان کے علاوہ اب رُباعی کے اوزان میں کسی قسم کے اضافے کی گنجائش نہیں۔ اس دعوے کو تسلیم کرنے سے پہلے زحاف عرج پر غور کرلینا مناسب ہوگا۔ مسلماتِ فن (صفحہ ۳۲، ۳۳) پر لکھا ہے۔

عَرَج : اس زحاف کے ذریعے آخری رکن کے آخری "وتد مجموع" سے دوسرا حرفِ متحرک ساکن کیا جاتا ہے۔ کلیدِ عروض میں (صفحہ ۴۶) پر "ارکانِ مزاحفہ از مولف" کے تحت نمبر ۲۷ پر "جبّ و عرج" کے عمل سے 'مفاعی لن' سے 'فاع' حاصل کیا گیا ہے۔ کلیدِ عروض (صفحہ ۵۶) پر نمبر ۲۵ زحافاتِ مفرد کے تحت زحاف جبّ کے عمل سے 'مفاعی لن' سے 'فَعَل' حاصل کیا گیا ہے۔ رباعی میں 'فعل' عروض و ضرب میں واقع ہوتا ہے۔ اگر اس کی جگہ 'فاع' رکھا جائے تو ازروئے عروض بالکل صحیح ہے۔ اور کوئی امر مانع نہیں۔ کیوں کہ اس سے وزن میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اب شجرہ نمبر۱ مفعول والے اوزان کے تحت کے وہ اوزان دیکھیے جن پر زحاف عَرَج کا عمل لاگو ہوسکتا ہے۔

شجرہ نمبر۴ عَرَج شدہ اوزان

وزن شجرہ :

نمبر۱۔ مفعول ۔ مفاعلن ۔ مفاعیل ۔ فَعَل

۵۔ 〃 ۔ مفاعیل ۔ 〃 ۔ 〃

۷۔ 〃 ۔ مفاعی‌لن ۔ مفعول ۔ 〃

۱۳۔ 〃 ۔ مفاعلن ۔ مفاعلن ۔ 〃

۱۵۔ 〃 ۔ مفاعیل ۔ 〃 ۔ 〃

۱۷۔ 〃 ۔ مفاعی‌لن ۔ فاعلن ۔ 〃

عَرَج شدہ وزن:

۱۔ مفعول ـ مفاعلن ـ مفاعیل ـ فاع
۵۔ ″ ـ مفاعیل ـ ″ ـ ″
۷۔ ″ ـ مفاعیلن ـ مفعول ـ ″
۱۳۔ ″ ـ مفاعلن ـ مفاعلن ـ ″
۱۵۔ ″ ـ مفاعیل ـ ″ ـ ″
۱۷۔ ″ ـ مفاعیلن ـ فاعلن ـ ″

کل اوزان : ۶

شجرہ نمبر۲ مفعولن والے اوزان

وزن شجرہ:

نمبر۱۔ مفعولن ـ فاعلن ـ مفاعیل ـ فَعَل
۵۔ ″ ـ مفعول ـ ″ ـ ″
۷۔ ″ ـ مفعولن ـ مفعول ـ ″
۱۳۔ ″ ـ فاعلن ـ مفاعلن ـ ″
۱۵۔ ″ ـ مفعول ـ ″ ـ ″
۱۷۔ ″ ـ مفعولن ـ فاعلن ـ ″

عَرَج شدہ وزن:

۱۔ مفعولن ـ فاعلن ـ مفاعیل ـ فاع
۵۔ ″ ـ مفعول ـ ″ ـ ″
۷۔ ″ ـ مفعولن ـ مفعول ـ ″
۱۳۔ ″ ـ فاعلن ـ مفاعلن ـ ″
۱۵۔ ″ ـ مفعول ـ ″ ـ ″
۱۷۔ ″ ـ مفعولن ـ فاعلن ـ ″

کل اوزان : ۶

شجرہ نمبر۳ فاعلن والے اوزان

وزن شجرہ:

نمبر۱۔ فاعلن ـ مفاعلن ـ مفاعیل ـ فَعَل
۵۔ ″ ـ مفاعیل ـ ″ ـ ″
۹۔ ″ ـ مفاعیلن ـ مفعول ـ ″
۱۳۔ فاعلن ـ مفاعلن ـ مفاعلن ـ فَعَل
۱۵۔ ″ ـ مفاعیل ـ ″ ـ ″
۱۷۔ ″ ـ مفاعیلن ـ فاعلن ـ ″

عَرَج شدہ وزن:

۱۔ فاعلن ـ مفاعلن ـ مفاعیل ـ فاع
۵۔ ″ ـ مفاعیل ـ ″ ـ ″
۹۔ ″ ـ مفاعیلن ـ مفعول ـ ″
۱۳۔ ″ ـ مفاعلن ـ مفاعلن ـ ″
۱۵۔ ″ ـ مفاعیل ـ ″ ـ ″
۱۷۔ ″ ـ مفاعیلن ـ فاعلن ـ ″

کل اوزان : ۶

اس طرح ۶+۶+۶ = ۱۸ اوزان کا اضافہ ہوگیا۔ اب یہ تعداد ۵۴+۱۸ = ۷۲ ہوگئی۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ بنیادی وزن، صرف ایک ہے یعنی مفعول مفاعلن۔ مفاعیل۔ فَعَل۔ باقی صورتیں رعایتی ہیں۔ نیز رباعی کے موجودہ اوزان کی تعداد ۵۴ نہیں بلکہ ۷۲ ہوگئی۔ آخری اٹھارہ اوزان کا اضافہ راقم الحروف کی طرف سے ہے۔

آمنہ ابوالحسن

راستہ

عجیب دروازہ تھا وہ جس سے تیمور دُنیا بھر کے حالات تو دیکھ لیتا تھا مگر جس کا کوئی پٹ خود اُس کی اپنی ذات میں نہیں کھلتا تھا۔

غور و فکر کے عالم میں تیمور نے بارہا تصوّر میں بہت کچھ دیکھا تھا۔ دِل دہلا دینے والے زلزلے۔ خونی چوک۔ جبری بالا دستیاں۔ انصاف کا دُنیا بھر سے مفاہمت آمیز رویّہ۔ اقتدار کا ضروری اور غیر ضروری تسلّط۔

نئی نویلی جمہوریتیں۔ وطنِ عزیز کی شادابی اور مفلوک الحالی۔ قتل و خون کے بازار اور ارد گرد اور ساری دنیا کے ایسے واقعات کے پس منظر میں حسّاس ذہنوں کے باہمی رابطے ... مگر ... اُس کے آگے دھند ہی دھند تھی۔ کئی سوالیہ نشان جن کا کوئی جواب کسی دستک پر تیمور کو نہیں ملا تھا۔ ملکوں ملکوں کے حالات جاننا کتنا بھی دلچسپ سہی لیکن خود اپنے اندرون سے واقفیت بھی اتنی ہی ناگزیر۔ تو پھر وہ خود میں جھانک کیوں نہیں سکتا؟ تہہ در تہہ اپنی ہستی کی حیثیت اور حقیقت جان کیوں نہیں سکتا؟ جی چاہنے پر ایک ایک پرت الٹ کر وہ سب کچھ دیکھ کیوں نہیں سکتا جسے دیکھنے کا وہ دل سے خواہاں رہا ہے۔

اس نے کئی بار سوچا اِس مشکل کو حل کرنے میں کسی نہ کسی کی مدد ضرور لے مگر اوّل تو تمام دُنیا اتنی مصروف تھی کہ انھیں متوجّہ کرنے کی تیمور کی ہمّت ہی نہ ہوئی۔ جو خوش ہیں۔ مطمئن ہیں۔ بے فکر ہیں اگر وہ اُن کی خوشی اُن کے اطمینان اُن کی بے فکری میں حصّہ نہیں لے سکتا تو خواہ مخواہ انھیں ڈسٹرب کیوں کرے پھر دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ تیمور کو احساس تھا کہ مدد اکثر اوقات مضبوط لوگوں کو بھی کمزور کر دیتی ہے اور سہاروں پر زندہ رہنے والے خود اپنا اعتماد گنوا بیٹھتے ہیں۔ یہ تیمور کو کسی حال میں منظور نہیں تھا پھر بھی اِس جہان کا قانونِ حیات کتنا نرالا تھا جہاں کوئی بھی اکیلا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ قدم قدم پر مختلف نوعیتوں میں اُسے مختلف سہاروں اور تائیدوں کی ضرورت بہر حال ہوتی تھی، تو پھر وہ اپنے احساس کی چبھن کس طرح دور کرے؟ کس طرح جانے کہ وہ کیا ہے کیوں ہے اُس کا مقصدِ حیات منتہائے فکر کیا ہے اور اس کی غرض و غایت کیا ...

چائے کی چسکیوں کے ساتھ تیمور یہی سب کچھ سوچ رہا تھا کہ اُس کا عزیز ترین دوست عذیر دھڑاکے سے اپنی بولٹ دھڑ دھڑاتا ہوا آیا اور بولٹ سے اتر کر برآمدے کی چند سیڑھیاں بیک قدم پھلانگتا ہوا سیدھا بیٹھک کے کھلے دروازے سے تیمور کے آگے آکھڑا ہوا۔ "حد ہے بوریت کی۔ ہفتے بھر میں صرف ایک دن تو فرصت و فراغت کا نصیب ہوتا ہے یار اُسے بھی تم ہمیشہ اپنی لایعنی سوچ اور یکسانیت کی نذر کر دیتے ہو۔۔۔ تُف ہے تم پر۔" یہ کہتے کہتے عذیر تیمور کے مقابل ٹک گیا۔ تیمور نے چائے کا گھونٹ نگل کر عذیر سے کہا:

"تلے گلّے تمھی کو مبارک یار۔۔۔ اپنے تو بس کے نہیں۔ کسی بھی تعطیل کے روز اگر برجو مہاراج کا شاگرد بن کر کتھک ڈانس کی کوشش بھی کر ڈالوں تو پورا یقین ہے ناکام رہوں گا۔ نہ ہی ڈسکو اور بریک ڈانس میں میرے فرشتے کبھی کامیاب ہو سکتے ہیں۔ پکنکیں بہت منا چکا ہوں گیت اور غزلیں بہت گا چکا ہوں اس لیے اب اگر تعطیل کے روز اپنی تنہائی میں چائے کی چسکیوں اور غور و فکر کے ساتھ گزارا کر لیتا ہوں تو کسی کو کیوں اعتراض ہو بھلا۔"

"کرتے رہو گزارا مگر ذرا یہ بتلانے کی زحمت گوارا کرو کہ سکندر کہاں ہے؟"

"سکندر؟ مگر سکندر کیوں؟"

"کیوں کہ میری وجہ نزول اس وقت وہی ہے۔"

"مگر وہ تو ابھی سو کر اُٹھا بھی نہیں ہے۔ ہر تعطیل کے روز گیارہ بارہ

"کنجِ عافیت" ڈی-۱۰۵، کرزن روڈ اپارٹمنٹس کستوربا گاندھی مارگ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ن کو جاگنا اور آدھے گزرے
دن کو ہی نیا اور پورا دن سمجھ کر
کرنا معمول ہے اُس کا خیر تم
شربت یا چائے پیو میں اُٹھاتا ہوں
ندر کو۔"

"جی نہیں۔ چائے کی ضرورت اس
کہ ابھی ابھی پی کر آرہا ہوں کہیں
سکندر کو میں خود اُٹھاؤں گا جا کے۔
تھارا استغراق مبارک۔"

عذیر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ملحقہ
میں پہنچا اور اطمینان سے سوئے
سکندر پر سے تانی ہوئی چادر کھینچتا
تھا:

"لعنت ہے تمھاری کاہلی پر میاں۔
راکٹ کے دور میں داخل ہو گیا
دونوں بھائی ارے توبہ... زندگی
سونے کے لیے تو نہیں ہے سکندر۔
منٹ میں تیار ہو کر نہیں آگئے
لینا میں روانہ ہو چکا۔ ان دس
میں میں تیمور کے پاس ہوں گفتگو
یار تم دونوں بھائی جدید سائنسی
توں سے بھی آگے نکل جاتے ہو مگر
... لعنت ہے... پھسڈی
ڈی ہو۔ بس رینگتے سرسراتے
..."

"جی جی۔ میں دس منٹ میں حاضر
ہوں عذیر بھائی۔ آج آپ کو میرا کام
ہی ہے ورنہ لٹکتا رہوں گا اسی
"

عذیر دوبارہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا
ے پاس پہنچا۔ اپنے شگفتہ چہرے
پر تاباں مُسکراہٹ بکھیرتا ہوا شاداب لہجے
میں بولا "ہوں! ذرا سناؤ تو آخر سوچ
کیا ہے تمھاری ——؟ کوئی نئی یا وہی
ہمیشہ والی پُرانی؟ میرا تو مخلصانہ مشورہ
ہے یار کہ خود کو جاننے پہچاننے کا یہ
خطرناک چکر ترک کر دو جو جنجال آج
تک کسی کے نپٹائے نہیں نپٹا تم ہی اسے
کیسے تسخیر کر سکتے ہو۔ شناخت بے حد
تجزیاتی عمل ہے تیمور۔ اس کے بے تحاشہ
پہلو ہیں مگر میری دانست میں کام کی بات
صرف اتنی ہے کہ خود سے زیادہ دوسروں
کو اہمیت دو کیوں کہ کپڑے اگر میلے ہو
بھی گئے تو پروا نہیں دُھل کر پھر صاف
ہو جائیں گے یار لیکن دل دماغ کے آپسی
رشتے اگر میلے ہو گئے تو پھر بڑی مشکل سے
صاف ہوتے ہیں اس لیے دوستی پر یقین
ضروری ہے دوستی ہی سکون کا گھر ہے
دوستی ہی وہ راستہ ہے جو ساری دُنیا
میں ہر طرف جا سکتا ہے۔ اور جس کا کوئی
سچّا دوست نہیں جو خود کسی کا بے لوث
بہی خواہ نہیں وہ کبھی اپنا بھی کچھ نہیں ہوتا
یار۔ زیاں ہی زیاں ہوتا ہے فقط۔
—— تم مانو نہ مانو میرا اعتبار یہی ہے کہ دوستی
کے توسط سے ہی اپنا آپ پایا جا سکتا ہے تو
پھر خواہ مخواہ کی سوچ اور غیر ضروری غور و فکر
کس لیے؟"

عذیر نے شربت کے چند ہی گھونٹ
سِپ کیے تھے کہ سکندر تیار ہو کر آگیا تب سکندر
کے ساتھ آگے بڑھنے سے پہلے عذیر نے تیمور
سے ہاتھ ملایا تو اُس کی الوداعی نظروں
کی نرمی اور گرمی۔ اُس کے اندرون کی سچّائی
اور اُس کے سیدھے سادے لہجے کے انمٹ
خلوص نے بھٹکتے ہوئے تیمور کو منٹوں میں
خود اپنے آپ تک پہنچا دیا اور عذیر کے
روانہ ہو جانے کے بعد تیمور نے
حیرانی سے سوچا کہ اتنے چھوٹے
راستے کو وہ کتنی لمبی مسافت کے
ذریعے طے کرنے چلا تھا... بے وقوف
نادان وہ۔

باہر باہر سناٹا ہے، اندر اندر شور بہت
دل کی گھنی بستی میں یارو، آن بسے ہیں چور بہت

یاد، اب اُس کی آ نہ سکے گی، سوچ کے یہ بیٹھے تھے کہ بس
کُھل گئے دل کے سارے دریچے، تھا جو ہوا کا زور بہت

موجیں ہی پتوار بنیں گی، طوفاں پار لگائے گا
دریا کے ہیں بس دو ساحل، کشتی کے ہیں چھور بہت

میں بھی اپنی جھونک میں تھا کچھ، وہ بھی اپنے زعم میں تھا
ہوتی بھی ہے کچھ مرے پیارو، پیار کی کچی ڈور بہت

آج یقیناً مینھ برسے گا، آج گرے گی برق ضرور
آنکھیاں بھی پُرشور بہت ہیں، کجرا بھی گھنگھور بہت

دل سے اُٹھا طوفان یہ کیسا، سارا منظر ڈوب گئے
ورنہ ابھی تو اس جنگل میں، ناچ رہے تھے مور بہت

برسوں بعد ملا ہے موقع، آؤ لگالیں کشتی پار
آج تو یارو سناٹا ہے، دریا کے اُس اور بہت

ن سے کس کا ساتھی چھوٹا، کس کا عمر کیا حال ہوا
بت پربت، وادی وادی، رات مچا تھا شور بہت

عمر انصاری

تیز ہو جاتا ہے خوشبو کا سفر شام کے بعد
پھول تو شہر میں کِھلتے ہیں مگر شام کے بعد

اُس سے دریافت نہ کرنا کبھی دن کے حالات
صبح کا بھولا جو لوٹ آیا ہو گھر شام کے بعد

میرے بارے میں کوئی کچھ بھی کہے سب منظور
مجھ کو رہتی ہی نہیں اپنی خبر شام کے بعد

تم نہ کر پاؤ گے اندازہ تباہی کا مری
تم نے دیکھا ہی نہیں کوئی کھنڈر شام کے بعد

یہی ملنے کا سمے بھی ہے، بچھڑنے کا بھی
مجھ کو لگتا ہے بہت اپنے سے ڈر شام کے بعد

تیرگی ہو تو وجود اُس کا چمکتا ہے بہت
ڈھونڈ لوں گا میں اُسے نورؔ مگر شام کے بعد

کرشن بہاری نورؔ

کیا کوئی شخص کٹا رات کے سناٹے میں
کیسی آئی یہ صدا رات کے سناٹے میں

دیکھ ہم کس طرح ہر شب کی سحر کرتے ہیں
اس طرف بھی کبھی آ رات کے سناٹے میں

دُور تک جاتی ہے ایسے میں ذرا سی بھی صدا
پاؤں آہستہ اُٹھا رات کے سناٹے میں

کیا پتہ عہد کسی کا کہ مرا دل ٹوٹا
اِک چھناکا سا ہوا رات کے سناٹے میں

اُس نے آواز بہت پاس سے دی ہو جیسے
ایسا محسوس ہوا رات کے سناٹے میں

ایک دستک نے خموشی کے فسوں کو توڑا
ایک دروازہ کُھلا رات کے سناٹے میں

ہم نے جی بھر کے اُٹھایا تری یادوں کا مزہ
دُور تک کوئی نہ تھا رات کے سناٹے میں

اپنے ہم سایوں کو آرام سے سونے دے خلشؔ
برہ کے گیت نہ گا رات کے سناٹے میں

خلش بڑودوی

۲۰، امین آباد پارک، لکھنؤ ۲۲۶۰۱۸

نامی انصاری

مَلِک محمد جائسی

اودھ کے علاقے میں ایک بہت پُرانا اور تاریخی قصبہ جائس ہے جو آج کل ضلع رائے بریلی میں شامل ہے۔ یہ قصبہ ایک ہزار سال سے بھی زیادہ پُرانا ہے۔ پہلے اس کا نام "اُدیا نگر" تھا اور یہاں "بھر" نام کی ایک قوم آباد تھی۔ ۱۰۲۴ء میں اس قصبے کو محمد غوری بادشاہ کی فوج نے فتح کرلیا تب سے اس کا نام جائس ہوگیا۔ اسی قصبے میں پندرہویں صدی عیسوی میں ایک صوفی سنت شاعر مَلِک محمد پیدا ہوئے اور انھوں نے ایک ایسی کتاب لکھی جو چار سو سال گزرنے کے بعد بھی ساری دُنیا میں مشہور ہے اور مَلِک محمد جائسی کے نام کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ اس کتاب کا نام "پدماوت" ہے اور یہ اودھی زبان میں ہے۔ گوسوامی تلسی داس کی کتاب رام چرت مانس یا رامائن پدماوت کے بعد لکھی گئی ہے اور اس کے اسلوب پر پدماوت کا بہت اثر ہے۔

مَلِک محمد جائسی، اودھی زبان کے ایک بہت اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ صوفی بھی تھے اور عبادت و ریاضت میں اپنا زیادہ وقت گزارتے تھے۔ وہ شاہ مبارک بودلے کے مُرید تھے جن کا سلسلہ سید جہانگیر اشرف سمنانی سے ملتا ہے جو عام طور پر بڑے مخدوم صاحب کے نام سے مشہور ہیں۔

مَلِک محمد کی زندگی کے حالات زیادہ معلوم نہیں ہیں پھر بھی بعض باتیں پُرانی کتابوں میں ملتی ہیں جن سے ان کے حالات پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ یہ بات عام طور سے مشہور ہے کہ جب وہ سات سال کے تھے تو ان کو چیچک نکل آئی اور چیچک کے داغ سارے مُنہ پر پھیل گئے۔ اِسی میں ان کی ایک آنکھ بھی جاتی رہی۔ ان کا رنگ بھی کالا تھا جس کے سبب وہ ظاہری طور پر بہت بدصورت ہوگئے تھے مگر ان کا دل آئینے کی طرح صاف اور دماغ روشن تھا۔ ایک مرتبہ شیر شاہ سوری نے ان کی شاعری کی شہرت سُن کر ان کو دربار میں ملاقات کے لیے بلایا۔ جب یہ دربار میں پہنچے تو ان کی ظاہری بدصورتی اور کُبڑے پن کو دیکھ کر شیر شاہ کو ہنسی آگئی۔ مَلِک محمد جائسی نے فوراً کہا "موہکا ہنسیو کہ کُہرئی" یعنی تم مجھ کو دیکھ کر ہنسے یا میرے بنانے والے (کمہار) پر ہنسے! بادشاہ ان کی اِس گہری بات کو سن کر بہت شرمندہ ہوا اور ان کی بہت عزت اور تکریم کی۔

مَلِک محمد اگرچہ عبادت میں بہت دھیان لگاتے تھے مگر اپنی جسمانی خرابی کی وجہ سے کوئی روحانی مرتبہ نہ حاصل کر سکے جس کا ان کو بہت صدمہ تھا۔ ایک دن وہ شاہ مبارک بودلے کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے روحانی تعلیم حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ شاہ صاحب نے کہا "کچھ حرج نہیں مگر تم اتنا ضرور کرنا کہ بغیر کسی مہمان کو شامل کیے کھانا نہ کھانا"۔ مَلِک محمد نے ان کے حکم پر اسی دن سے عمل کرنا شروع کردیا اور کسی وقت بھی بغیر مہمان کو شامل کیے کھانا نہ کھاتے۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ ان کو کوئی مہمان نہ ملا جس کو وہ دسترخوان پر اپنے ساتھ شامل کرلیتے۔ بہت تلاش کے بعد ان کو ایک لکڑہارا دکھائی دیا جس کو کوڑھ کا مرض تھا۔ مَلِک محمد نے اسی کو غنیمت جانا اور کھانے کی دعوت دے دی۔ جب وہ آیا تو کھیر کے ایک ہی پیالے میں اپنے ساتھ کھانے کو کہا۔ لکڑہارے نے اپنی خراب حالت دکھائی اور ان کے ساتھ ایک ہی پیالے میں کھانے سے اِنکار کیا مگر یہ اپنی بات پر اڑے رہے اور اس جذامی لکڑہارے کو اپنے ساتھ ایک ہی پیالے میں کھانے پر مجبور کردیا۔ دونوں کے کھانے کے بعد جو کھیر بچی اس کو مَلِک محمد آنکھ بند کرکے پی گئے۔ جب آنکھ کھولی تو وہ لکڑہارا غائب تھا مگر ان کا دل روشن ہو چکا تھا اور جس روحانی دولت کی ان کو تلاش تھی وہ مل چکی تھی۔ دھیرے دھیرے ان کی بزرگی کی شہرت آس پاس کے علاقوں میں پھیلنے لگی اور لوگ ان کو ہاتھوں ہاتھ لینے لگے۔ فقیر لوگ ان کے لکھے ہوئے دوہوں

A-14/21، سول لائنز، کانپور (یوپی)

اور جو پائیوں کو گا گا کر لوگوں کو سناتے اور بھکشا پاتے۔

جائس سے دس کوس کے فاصلے پر پورب کی طرف ایک قصبہ امیٹھی ہے وہاں کے راجا نے ایک فقیر سے جو مُلک صاحب کے دوہے گا گا کر بھیک مانگا کرتا تھا، یہ دوہا سُنا:

کنول جو بکسا مانسر، بن جل گیو سُکھائے
سوکھ بیل پُن پر لہے، جو پیو سینچے آئے

یعنی کنول مانسر (تالاب) میں بغیر پانی کے سُوکھ گیا۔ اگر اس کو محبوب آکر سینچ دے تو پھر سے ہرا بھرا ہو جائے۔ امیٹھی کے راجا کو یہ دوہا بہت پسند آیا اور جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ اس کے لکھنے والے مُلک محمد جائسی ہیں تو ان کو بڑی عزت سے اپنے یہاں بلوایا اور ان سے التجا کی کہ وہ امیٹھی ہی میں رہیں۔ مُلک محمد نے راجا کی بات مان لی اور اس کے محل سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک کٹیا میں رہنے لگے۔ اسی جگہ ۱۵۴۰ء میں انھوں نے پدماوت لکھی جس کی شہرت بہت جلد سارے ہندوستان میں بلکہ ہندوستان سے باہر بھی پہنچ گئی اور آج تک اس کتاب کو ہندی ادب کا شاہکار سمجھا جاتا ہے۔

پدماوت، دوہوں کے طرز پر لکھی گئی ایک لمبی مثنوی ہے جس میں راجا رتن سین اور رانی پدماوتی کے پیار کی داستان بیان کی گئی ہے۔ اس میں چتوڑ پر علاء الدین خلجی کے حملے کا بھی قصّہ ہے۔ اس داستان میں ہیرامن طوطے کی زبانی رانی پدماوتی کی خوب صورتی کی تعریف سُن کر رتن سین اس کی محبت میں مبتلا ہو جاتا ہے اور پھر طرح طرح کی بلاؤں اور مصیبتوں سے گزرتا ہوا آخرکار رانی پدماوتی کو پانے میں کامیاب ہوتا ہے۔ اس کے آگے اور بھی قصّہ ہے جو علاء الدین کے حملے سے جُڑا ہوا ہے مگر یہ قصّہ تو صرف باہر کی پرت ہے۔ قصّے کے پردے میں مُلک محمد جائسی نے روحانی تعلیم، تصوف اور سلوک کی باتوں کو نظم کیا ہے۔ ان کی شاعری میں خدا پرستی اور انسان دوستی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ انھوں نے اپنے کلام سے ہندوؤں اور مسلمانوں کو آپسی محبت اور بھائی چارے کا سبق سکھایا ہے اور ہندوستان کے تمام فرقوں اور ذاتوں کو آپس میں میل محبت سے رہنے اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں ساتھ دینے کی تعلیم دی ہے۔ ان کی یہ نظم شاعرانہ خوبیوں سے بھی مالا مال ہے اسی لیے ہندی ادب میں اسے ایک اونچا درجہ حاصل ہے۔

پدماوت کے علاوہ مُلک محمد جائسی کی دو اور کتابوں کا پتا چلتا ہے۔ ایک کتاب کا نام اکھراوت ہے اور دوسری کتاب کا نام آخری کلام ہے۔ ممکن ہے انھوں نے کچھ اور بھی کتابیں لکھی ہوں مگر اب ان کا پتا نہیں چلتا۔ ان کی اصل شہرت صرف پدماوت پر قائم ہے۔ یہ کتاب شیر شاہ سوری کے زمانے میں پہلے پہل فارسی رسم خط میں لکھی گئی تھی۔ بعد میں اسے ناگری میں لکھا گیا، اور اس کے ترجمے نثر اور نظم دونوں میں اردو اور فارسی میں بھی ہوئے۔ دھیرے دھیرے یہ کتاب ہندوستان سے نکل کر انگلستان اور دوسرے ملکوں میں بھی پہنچ گئی اور ہر جگہ اس کی قدر ہوئی۔

مُلک محمد جائسی نے بہت لمبی عمر پائی۔ کہا جاتا ہے کہ ان کا انتقال اکبر بادشاہ کے زمانے میں ہوا۔ گویا بابر، شیر شاہ، ہمایوں اور اکبر۔ چار بادشاہوں کے زمانے انھوں نے دیکھے۔ ان کا انتقال امیٹھی سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر رام نگر میں ہوا۔ مشہور ہے کہ ایک بہیلیا نے ان کو اندھیرے میں شیر سمجھ لیا اور ان پر گولی داغ دی جو مُلک محمد کے ماتھے پر لگی اور وہ اسی جگہ شہید ہوگئے۔ امیٹھی کے راجا کو اس حادثے کی خبر ملی تو وہ ننگے پاؤں دوڑا ہوا وہاں گیا مگر مُلک محمد جائسی دُنیا سے گزر چکے تھے۔ راجا کو بہت زیادہ رنج ہوا مگر خدا کی مرضی میں کس کو دخل ہے۔ راجا نے وہیں رام نگر میں ان کا مزار بنوا دیا جو چار سو برس گزرنے کے بعد آج بھی موجود ہے۔ قصبہ جائس میں ان کا گرا پڑا مکان بھی باقی ہے۔ اسی مکان کے سامنے ۱۹۳۸ء میں ان کے ایک انگریز قدرداں اے۔ جی۔ شیرف نے یادگار کے طور پر ایک چھوٹی سی لاٹ بنوا دی تھی جس پر شاعر جائسی کی یہ چوپائی فارسی اور ناگری دونوں میں سنگِ مرمر پر کھُدی ہوئی ہے:

کیمی نہ جگت جس بیچا کیمی نہ لینھ جس مول
جو یہ پڑھے کہانی، ہم ہیں سنورے دو بول

(بقیہ صفحہ ۲۳ پر)

م۔ق۔خاں

نئی پرانی کہانی

قصہ یوں ہے کہ ــــــ دونوں دوست مندر کے اندر جاکر نہیں لوٹے۔ باہر کھڑی عورت حیران و پریشان تھی۔ کافی دیر تک انتظار کرنے کے بعد آخر وہ عورت بھی مندر کے اندر گئی۔ وہاں اس کے شوہر اور شوہر کے دوست کا سر دھڑ سے الگ کٹا پڑا تھا۔ کچھ دیر تک تو وہ عجیب سکتے کے عالم میں کھڑی رہی۔ پھر وہ سوچنے لگی لوگ مجھے ضرور فاحشہ عورت سمجھیں گے کہ میں نے ان کا قتل کیا ہے یا یہ دونوں میرے لیے ہی آپس میں جھگڑ پڑے اور ایک دوسرے کا قتل کردیا۔ غم سے نڈھال تو تھی ہی رسوائی کے خیال سے اس نے تلوار اُٹھائی کہ اپنا سر جسم سے الگ کر دے۔

اسی وقت مندر کی دیوی مجسّم اس کے سامنے آئی اور کہا:

"ٹھہرو! میں تمھاری قربانی کے خیال سے خوش ہوئی۔ اب یہ بتاؤ کہ کیا چاہتی ہو؟ کسے زندہ کروانا چاہتی ہو؟"

"آپ ان دونوں کو ہی زندہ کردیں۔" عورت نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"اچھی بات ہے۔ دونوں کا سر ان کے جسم سے ملادو۔" دیوی نے کہا۔

عورت اس قدر حواس باختہ تھی کہ سر اور جسم کو یکجا کرنے میں اس سے غلطی ہوگئی۔ جسم اس کے شوہر کا تھا تو سر اس کے دوست کا اور اسی شکل میں دونوں زندہ ہوگئے۔ زندہ ہوتے ہی دونوں آپس میں لڑنے لگے۔ بیتال نے راجا وکرم سے دریافت کیا "راجن! اب یہ بتاؤ کہ وہ عورت کس کی بیوی ہوگی؟"

راجا نے کہا "سبھی لوگ جانتے ہیں کہ تمام اعضا میں سر سب سے اعلیٰ و ارفع ہے۔ جس کے جسم پر شوہر کا سر ہے، وہی اس عورت کا شوہر ہوگا۔"

آپ سب لوگ جانتے ہیں کہ نہ تو بیتال نے یہ دریافت کرنے کی زحمت کی، نہ راجا وکرم کو یہ خیال ہوا کہ وضاحت کرتا کہ اس کے بعد کیا ہوگا؟ اس شوہر کا کیا حال ہوگا؟ بیوی پر کیا افتاد ٹوٹے گی اور دوست جس کے سر کے نیچے دوست کا جسم تھا اس پر کیا بیتے گی؟

اور ایک بار پھر ویسا ہی پیچیدہ مسئلہ درپیش ہے۔ اسی طرح سر اور جسم کا مسئلہ! اس بار بھی غلطی شاید بیوی کی ہی ہے اور پرانے فیصلے کے پس منظر میں بیوی اسی کو سونپ دی گئی جس کے جسم پر شوہر کا سر تھا۔

لیکن تب اور اب میں بڑا فرق ہے۔ آج تو اپنے جسم کے اعضا ہی اپنے سر کی حکم عدولی اور نافرمانی پر تلے رہتے ہیں۔ سر کہتا ہے یہ کام اچھا اور نیک ہے لیکن اپنا ہی ہاتھ کسی دوسری جانب دست درازی کرنے کو لپک جاتا ہے ــــ ایسا اس لیے ہے کہ سر کے پیش نظر اپنا مسئلہ ہے۔ اپنی مصلحت ہے تو ہاتھ کو اپنی پڑی ہے۔ اپنی حفاظت، اپنی بقا کا سوال ہے۔ پاؤں کسی اور جانب آوارہ گردی کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ اب کسی ایک کا مطیع و فرمانبردار ہونا لازمی نہیں ہے۔ اب ہر طرف انفرادی آزادی کا رواج ہے۔ اپنے ہی ہاتھ ایک دوسرے کا ہر حال میں ساتھ دینے کو تیار نہیں۔ بیشتر یہ ہوتا ہے کہ ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ کی ہر نقل و حرکت پر نظر رکھتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ چند مصلحتوں کی بنا پر کھلم کھلا بغاوت نہ کرے لیکن درپردہ، بیٹھ پیچھے سازش کرنے یا ردِ عمل کرنے پر بھلا کیا روک لگائی جاسکتی ہے؟

دراصل بات اپنی اپنی اہمیت اور احساس برتری کی ہے۔ ایک ہاتھ کسی وجہ سے اتنا اہم ہو جاتا ہے کہ سارے لوگ محض اسی

حکیم عنایت کالونی، گیا ۸۲۳۰۰۱ (بہار)

ہاتھ کی تعریف وتحسین کا راگ الاپنے
لگیں تو دوسرا ہاتھ رشک وحسد کی آگ
میں کیوں نہ جلے گا؟ ایسی صورت حال میں
دوسرا ہاتھ جسم کے دوسرے اعضا سے
ساز باز میں مشغول ہو جائے گا اور سب
سے پہلے تو اس ہاتھ کو نیچا دکھانے کی ہر
ممکن کوشش کرے گا اور اس میں کامیاب
ہوگا تو سر کی جانب بڑھے گا کہ اُسے بدل کر
کوئی ایسا سر نصب کر دے جو اُس
کے اشارے پر فیصلہ لینے پر مجبور
ہو۔

یہی حال کچھ دوسرے اعضا کا بھی
ہے۔ دل کہتا ہے سر کو دل کا مطیع وفرمانبردار
ہونا چاہیے کہ دل تمام اعضا میں افضل ہے۔
اس کی اہمیت یہ ہے کہ یہ دھڑکنا بند
کر دے تو سارے اعضا ہی معطل ہو جائیں
اور سر بھی اس کی مدد کے بغیر قائم نہیں
رہ سکتا ہے نہ حکم صادر کر سکتا ہے۔

سر کہتا ہے کہ دل تو محض ایک آلۂ کار
ہے اِسے تو بہر حال دھڑکنا ہی ہے۔ سارا
فیصلہ تو سر کا ہے۔ چونکہ ایک عرصے سے
سر کی حکمرانی چلی آرہی ہے، سر کا دعویٰ
بھی یکسر غلط نہیں ہے۔

ایسے مسائل تو تب بھی سر اُبھارتے
ہیں جب جسم کے دوسرے اعضا اور سر
ایک ہی شخص کے ہوتے ہیں۔ جہاں سر
اور جسم کے دوسرے اعضا دو یا اس سے
بھی زیادہ افراد کے ہوں تو آپس میں
کھینچا تانی کچھ زیادہ ہی ناگزیر ہو جاتی
ہے۔

اب ان حالات میں اس عورت
کا مسئلہ تو اور بھی گمبھیر ہے۔ وہ اس
شخص کی جانب دیکھتی ہے جس کے جسم
پر اس کے شوہر کا سر ہے اور فیصلے کے
مطابق وہی اس کا شوہر ہے۔ وہ عورت
نہایت اپنائیت، والہانہ عقیدت کے ساتھ
اس کی جانب بڑھتی ہے وہ جیسے ہی
قریب جاتی ہے۔ اس کے رونگٹے کھڑے
ہو جاتے ہیں۔ اس کا احساس جاگ اُٹھتا
ہے کہ یہ ہاتھ جو اُسے اپنے حلقے میں لینا
چاہتے ہیں اس کے اپنے شوہر کے نہیں
ہیں۔ یہ تو اس کے دوست کے ہاتھ ہیں۔
وہ فوراً محتاط ہو جاتی ہے۔ یہ احساس گناہ
صرف اس عورت کا ہی نہیں، وہ ہاتھ بھی
محسوس کرتے ہیں وہ دست درازی
کر رہے ہیں ——— وہ کسی اور کی بیوی ہے۔
لیکن دوسرے ہی لمحے ہاتھ حرص وہوس
سے مغلوب ہو جاتے ہیں اور سوچتے ہیں۔
جب انھیں سارے اختیارات اس کے شوہر
کے ہاتھوں کے ملے ہیں تو اُسے اس بات
کا پورا حق ہے کہ وہ جیسے چاہیں اُس
عورت کے ساتھ پیش آئیں۔

عورت للچائی ہوئی نظروں سے
ان ہاتھوں کی جانب دیکھتی ہے جو درحقیقت
اس کے شوہر کے ہیں بھولے سے دوست
کے سر سے جڑ گئے ہیں ان ہاتھوں کے
لمس کا جادو، ان کا اپناپن، عورت کو
بار بار اپنی جانب کھینچتا ہے ——— لیکن
دیدہ و دانستہ وہ اپنے کو ان ہاتھوں کے
سپرد نہیں کر سکتی۔ کیونکہ غیر کا سر، اس
کے لب . . . ان ہاتھوں کا بھی عجیب حال
ہے۔ ان کو کچھ ہی دنوں پہلے کی ساری
باتیں ذرا ذرا یاد ہیں چونکہ یہ ہاتھ بے زبان
ہیں۔ وہ برملا اظہار مدعا نہیں کر سکتے۔

عورت بھی پریشان ہے۔ اس کے
پُرانے، مانوس ہاتھ ہیں، کشادہ چوڑا سینہ
ہے جس پر وہ سر ٹیک دیتی تھی تو ساری
دنیا کا سکھ اُسے ہیچ نظر آتا تھا۔ اب
غیریت کا دبیز پردہ حائل ہے۔ وہ
کبھی ان قدموں کی جانب دیکھتی ہے جو
پائیداری اور استقلال کے امین تھے۔
اس عورت کے اندر قربت کی خواہش
مچلنے لگتی ہے لیکن خواہشات کا راون جسم
پر دوسرے شخص کا سر دیکھ لیتا ہے ———
وہ سر لکشمن ریکھا کی طرح موجود ہے اور
وہ سیتا تک نہیں پہنچ سکتا ———
اس عورت کی خواہشات راون کی طرح
روپ بدلنے کا فن نہیں جانتی ہیں۔

غرض ادھر عورت کشمکش سے
دوچار ہے اور ادھر شوہر عجیب شش و
پنج میں ہے۔ وہ شک وشبہ کی آگ میں جل
رہا ہے۔ وہ اختیارات جو شوہر ہونے
کے بعد اُسے ملنے چاہیے تھے وہ ان سے
محروم ہے۔ اس کے جسم کے سارے
اعضا میں ایک انتشار ہے، افراتفری ہے۔
وہ فرمانبرداری کے لیے مجبور نہیں ہیں۔
غیر کا سر بلند ہو پستی کی جانب مائل ہو ان
اعضا کو بھلا کیوں ربط ہونے لگی؟ وہ تو
اکثر و بیشتر اس تاک میں ہیں کہ سر کو
عظمت بخشنے والے اور سر کو سارے حقوق و
اختیارات سونپنے والے یہ محسوس کریں کہ
سر ہی سب کچھ نہیں بلکہ یوں کہا جائے کہ

دوسرے اعضا کی مدد حاصل نہ ہو تو سر کچھ بھی نہیں ہے۔ محض ایک فرضی صفر ہے۔ ادھر اس شخص کے اپنے اعضا نوحہ کناں ہیں، لیکن ان کے بس میں نہیں کہ دوسرے کے سر کے ساتھ جُڑے رہ کر پہلے شخص کی کچھ مدد کریں۔ بہر تو تب ممکن ہوتا کہ دونوں دوست ایک ہوتے۔

ان کے سروں اور اعضا میں مکمّل ہم آہنگی ہوتی ـــــ لیکن ایک خوبصورت عورت کو حاصل کرنے کی خواہش نے دونوں میں بغض و حسد کا الاؤ روشن کر رکھا ہے۔

ایسی صورتِ حال میں دیوی کا وردان مُردوں کو پھر سے زندگی عطا کرنا ایک عذاب مسلسل نظر آتا ہے، ان دونوں دوستوں کے لیے بھی اور اس عورت کے لیے بھی!

اب وقت کا انتظار ہے کہ سبھی چیزیں، سارے تغیّرات قاضیِ وقت کے فیصلے کے پابند ہیں۔

OO

مولانا ابو الکلام آزاد

شخصیت اور کارنامے

بیسویں صدی کے عظیم مذہبی، فکری، سیاسی پیشوا مولانا ابوالکلام آزاد کی برگزیدہ شخصیت اور ان کے علمی، عملی کارناموں پر اہم دستاویز۔

مولانا نے ایک طرف قید و بند اور دار و رسن کی آزمائشوں میں زندگی گزاری اور دوسری طرف اپنی قوم اور خاص طور پر مسلمانوں کی فکری قیادت کی۔ وہ اگر مجاہدِ آزادی تھے تو عالمِ دین بھی تھے۔ انھیں قرآن، فقہ، علم الکلام، علمِ حدیث پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ وہ فلسفی تھے، مفکّر تھے، تاریخ پر ان کی گہری نظر تھی۔ انھوں نے صحافت کے میدان میں قدم رکھا تو انقلاب برپا کر دیا۔ مولانا کا شمار اُردو کے اعلیٰ ترین انشا پردازوں میں ہوتا ہے۔ تقریر میں ان کا ثانی ملنا مشکل تھا۔ مولانا اپنی افتادِ طبع، علم، ذہانت، اہلیت و صلاحیت، معاملہ فہمی اور دُور اندیشی کے لحاظ سے غیر معمولی انسان تھے، ایسے انسان جو صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔

اُردو اکادمی دہلی نے "مولانا ابوالکلام آزاد: شخصیت اور کارنامے" کے عنوان سے جو کل ہند سیمینار منعقد کیا تھا اس میں پڑھے جانے والے مقالے اس کتاب میں یکجا کر دیے گئے ہیں جو چھ حصوں میں تقسیم ہیں۔ سیرت و شخصیت، سیاست، مذہب، ادبی نثر، صحافت اور شاعری۔ اس کتاب میں جو مقالے شامل کیے گئے ہیں ان میں کوشش کی گئی ہے کہ مولانا کی شخصیت اور کارناموں کے ہر پہلو پر خاطر خواہ روشنی پڑ جائے۔

مولانا کی شخصیت اور کارناموں سے مکمّل آگاہی کے لیے اس کتاب کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ تقریباً دو سو صفحات پر مشتمل مولانا کے مکمل سوانح حیات درج کیے گئے ہیں اور مولانا کی تاریخی اور اہم ترین تصویریں بھی شامل کی گئی ہیں۔

مرتب : ڈاکٹر خلیق انجم

صفحات : ۵۰۲

قیمت : ۴۸ روپے

اشاریۂ آجکل

(جلد اوّل)

"آجکل" اردو کا ایک اہم ادبی ماہنامہ ہے۔ یہ ۱۹۴۲ء میں جاری ہوا تھا اور ۱۹۴۷ء کے تین مہینے چھوڑ کر اب تک باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔ اس کے ایڈیٹروں میں جوش ملیح آبادی، سید وقار عظیم، عرش ملسیانی، شہباز حسین، مہدی عباس حسینی اور راج نرائن راز جیسے شاعر اور ادیب رہے ہیں اور نائب مدیروں میں طالب دہلوی، شان الحق حقی، معین احسن جذبی، فضلِ حق قریشی اور بلونت سنگھ کے نام شامل ہیں۔

یہ اسی اہم رسالے کا اشاریہ ہے۔ اشاریوں کی عدم موجودگی، تحقیق کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اگر کوئی ریسرچ اسکالر یہ معلوم کرنا چاہے کہ کسی ادبی جریدے میں اس کے موضوع سے متعلق کیا مواد موجود ہے تو اسے اس رسالے کا پورا فائل تلاش کرنا پڑے گا اور ممکن ہے کہ اس تمام محنت و سعی کے بعد ایک آدھ مقالہ ہی اس کے ہاتھ لگے۔ ہزاروں اہم علمی، ادبی، تحقیقی، تنقیدی مضامین اور اعلیٰ درجے کے تخلیقی ادب کا بڑا حصّہ ادبی رسالوں میں مدفون ہے۔ اس سرمایے تک ہماری رسائی اس لیے مشکل ہے کہ ان رسالوں کے اشاریے تیار نہیں ہوئے اور آج کی مصروف زندگی میں ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ ہزاروں صفحات کی ورق گردانی کر سکیں۔ ماہنامہ "آجکل" کی حد تک یہ مشکل اردو اکادمی نے یہ کتاب شائع کر کے آسان کر دی ہے۔

یہ "آجکل" کی ۴۶ سال کی فائلوں کا اشاریہ ہے۔ اسے دو حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک حصّہ ادبی مضامین سے متعلق ہے اور دوسرا ادب کے علاوہ دیگر مضامین سے۔

یہ کتاب ریسرچ اسکالروں کے لیے ایک ایسا قیمتی تحفہ ہے جس کی اہمیت اور افادیت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کم ہونے کی بجائے بڑھتی جائے گی۔

مرتب : جمیل اختر

صفحات : ۶۸۳

قیمت : ۲۰۰ روپے

اُردو اکادمی، دہلی سے طلب کریں

حمید الماس

نظمیں

چشمِ فنا

کسی نے کہا حاکمِ وقت سے

" اِس جہاں میں
کوئی حادثوں، آفتوں اور برہم ہواؤں پر قادر نہیں ہے
فقط آپ کی ذاتِ اقدس ہی کشف و کرامات سے متصف ہے
کوئی آج دربار شاہی میں
ایسا بھی اِک اجنبی فرد ہے جو
مسلسل مجھے گھورنے میں ہے مصروف
ایسی خطرناک آنکھیں نہ دیکھیں کسی نے یہاں اس سے پہلے
براہِ کرم
سرسراتی ہوا سے یہ کہیے
مجھے اپنے نازک پروں میں چھپا کر
کہیں دُور لے جائے
اپنی حفاظت میں رکھے "
ہوا نے جہاں حاکم وقت کے حکم سے اُس کو چھوڑا تھا
اس غار میں بھی وہی گھورتی منہمک آنکھ تھی
اُس کے مجروح سینے کی گہرائیوں میں
اترتی چلی جا رہی تھی
اترتی چلی جا رہی تھی
تعجب ہے
کمزور دل مطمئن ہے

شور و شر

شور ہی شور ہے چاروں جانب

صف بہ صف

سرخ زبانیں مصروف

یاوہ گوئی میں

سماعت کو بچاؤں کیسے

کھینچ کر ساری زبانوں کو اکٹھا کر لوں

اور راہوں پہ بچھا کر ان پر

رقص کرتا ہوا بڑھتا جاؤں

میرے پیچھے نہ کوئی سایہ ہو

حرف گیری نہ کوئی شکوہ ہو

○○

1355/8، بلاک نمبر ۹، جیا نگر، بنگلور 560069

سراج انور

آج کا بچوں کا نثری ادب

آج کے بچوں کے ادب کا جائزہ لینے کے لیے "گزرے ہوئے کل کے ادب اطفال پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔ ورنہ ہم اِس ادب کی ترقی کو آسانی سے سمجھ نہ پائیں گے۔ بچوں کا ادب کیا ہے۔ اُردو میں بچوں کے ادب کا آغاز کب سے ہوا۔ کون کون سے ادیب تھے جنھوں نے اسے پروان چڑھایا؟ مختصر طور پر اس کا اظہار ضروری ہے۔

بچوں کا ادب کیا ہے؟ کیا ہمارے بڑوں نے بچوں کے لیے جو کچھ لکھ دیا ہے ہم اسے آج کا بچوں کا ادب قرار دیں گے۔ انگریزی کے ایک نقاد HENERY STEEL COMAGER (ہنری اسٹیل کومیگر) نے اس سلسلے کی ایک کتاب A CRITICAL HISTORY OF CHILDREN LITERATURE میں کہا ہے کہ ــــ "ہم آج کے بچوں کے ادب سے کیا سمجھتے ہیں؟ کیا یہ وہی ادب ہے جو خاص طور سے بچوں کے لیے لکھا گیا ہے جیسے پریوں کی عجیب و غریب کہانیاں، ننھی منی نظمیں، آداب و اخلاق کی خشک کتابیں، اسکول یا کھیل کے میدان سے متعلق قصے اور دُور دراز ملکوں کی داستانیں! بے شک یہ بچوں کا ادب کہا جا سکتا ہے۔ لیکن ایک ادب اور ہے جو اس سے زیادہ بڑا اور پھیلا ہوا ہے۔ بچوں کا یہ ادب بڑوں کا وہ سرمایہ و خزانہ ہے جسے بچوں نے قبول کر لیا ہے۔ اور آج کل یہی ان کا ادب ہے کیوں کہ حقیقت یہ ہے کہ نہ والدین، نہ اُستاد اور نہ مُصنّف، بلکہ خود بچے یہ طے کرتے ہیں کہ ان کا ادب کیا ہے۔"

کومیگر کے اس بیان کی تصدیق الف لیلہ نامی کتاب سے بھی ہو جاتی ہے۔ جو لکھی تو بڑوں کے لیے گئی تھی لیکن جسے دُنیا کا ہر بچّہ آج مزے لے لے کر پڑھتا ہے اور اسے ذہن میں محفوظ کر لیتا ہے۔ علی بابا اور مرجینا کا نام انھیں کبھی نہیں بھولتا۔ چوروں کو تیل کے مٹکوں میں بند کرنے والا منظر اُنھیں اچھی طرح یاد رہتا ہے۔ چراغ الہ دین، علی بابا اور سند باد جہازی کی کہانی میرے خیال میں دُنیا کے اسّی فیصد بچوں کو یاد ہوگی اور انھیں پسند بھی آئی ہوگی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بچے اپنا ادب خود تلاش کرتے ہیں خواہ وہ بڑوں کے ادب سے ہی کیوں نہ تلاش کیا گیا ہو۔ بچوں کی مشہور انگریز ادیبہ کورنیلیا میگز (CORNELIA MEIGS) نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ "بڑے ہوتے پر یہی بچے یاد کی ہوئی کہانیاں اپنے بچوں کو سنایا کرتے ہیں۔ اور یوں کہانیوں کا ایک قیمتی سرمایہ سینہ بہ سینہ پچھلی نسل سے نئی نسل میں منتقل ہوتا رہتا ہے۔" میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات یوں بھی دُرست ہے کہ ایسپ کی کہانیاں جو آج سے تقریباً ۵۰۰ سال پہلے ۱۴۸۴ء میں لکھی گئی تھیں، اتنی مدّت گزر جانے کے بعد آج بھی اتنی ہی تازہ لگتی ہیں جتنی ۵۰۰ سال پہلے تھیں اور جو بچوں کے ادب میں آج بھی تازہ کھلی ہوئی کلیوں کی مانند مہک رہی ہیں۔ ان کے بعد ہینس کرسچین اینڈرسن کی کہانیوں کا نمبر آتا ہے۔ جس نے جانوروں اور چڑیوں کی کہانیاں ہی نہیں، گھریلو سامان کی کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ ان میں کیل سے لے کر بندوق کی گولی اور مرغیوں سے لے کر چھت کی منڈیر پر بسنے والی ابابیل تک شامل ہے۔ ان کہانیوں کے ترجمے ہندوستان کی ہر زبان میں ہوئے ہیں اور آج بھی یہ کہانیاں سدا بہار معلوم ہوتی ہیں۔

میں نے اپنے ایک مضمون میں ایک بات کہی تھی کہ ــــ "بچوں کے لیے لکھنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔" میں سمجھتا ہوں کہ بچوں کے لیے لکھنا ایک بے حد دشوار کام ہے۔ بڑے ادیبوں سے جب بچوں کے لیے لکھنے کو کہا جاتا ہے تو وہ بغلیں جھانکنے لگتے ہیں۔ وجہ محض یہ ہے کہ بچوں کے ادیب کو دراصل اس کی اُنگلی پکڑ کر اس کے ساتھ ساتھ چلنا پڑتا ہے۔ اُسی کی طرح اپنے ذہن کو کچّا بنا کر سوچنا پڑتا ہے۔ اُسی کی طرح آسان لفظوں میں بات کرنی پڑتی ہے۔ اور جس چیز کو دیکھ کر وہ خوش ہو اُسے بھی خوش ہونا پڑتا ہے۔ شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ جب تک آدمی خود بچّہ نہ بن جائے تب تک وہ بچوں کے

معرفت ایشیا فوٹو اسٹوڈیو، اُردو بازار، دہلی ۱۱۰۰۰۶

لیے اچھی چیز لکھ ہی نہیں سکتا —" میں اس
بات سے صد فی صد متفق ہوں۔

یوروپی ملکوں میں بچّوں کے ادب نے
بہت ترقّی کی ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ
تعلیمی اور سائنسی میدانوں میں وہاں کے لوگوں
کی ترقی ہے۔ لیکن ہندوستان جیسے غریب
اور یوروپ کے مقابلے میں کم ترقی یافتہ ملک
میں جہاں سولہ زبانوں کو قومی زبان مانا
گیا ہو اور جہاں ہر دس کوس پر ایک نئی
بولی بولی جاتی ہو، بچّوں کا ادب پیش کرنے
کی راہ میں بہت سی دشواریاں حائل ہیں۔
بہت سے بڑے ادیب اس طرف راغب نہیں
ہوتے۔ ان میں سے بیشتر سے جب دریافت
کیا گیا تو اُنھوں نے یہی دشواری بتائی کہ
ایک تو اُنھیں بچّوں کے لیے لکھنا نہیں آتا
دوسرے ہندوستان میں بچّوں کے ادیبوں
کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ زیادہ پڑھا
لکھا آدمی بچّوں کے لیے لکھے تو اس پر
حیرت ظاہر کی جاتی ہے۔ یہ بات خود مجھے
بچّوں کے مشہور ادیب ڈاکٹر اطہر پرویز
نے بتائی تھی۔ اس حقیقت کو جاننے کے
باوجود پچھلی دو دہائیوں میں بڑے ادیبوں
نے بچّوں کے ادب کی طرف خاص توجّہ دی۔
اِسے زندگی کی ایک ضرورت سمجھا۔ اس لحاظ
سے بچّوں کا آج کا ادب پہلے کے مقابلے میں
کافی مالا مال ہے۔

آج کا بچّوں کا ادب، اگر صرف دیو،
پریوں، شہزادے، شہزادیوں، جنوں، روحوں
اور حیرت انگیز کہانیوں اور نظموں کو ہی مانا
جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ غلط ہوگا۔ کیوں کہ
آج کا بچّہ کانوں سے سننے کے علاوہ آنکھوں سے
بھی کہانیاں پڑھتا ہے۔ پہلے تعلیم کم تھی لیکن
آج عام ہے۔ بچّے کو آج یہ سہولت
حاصل ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کی لائبریری
میں سے اپنی من پسند کہانیاں نکال کر پڑھ
سکتا ہے۔ آج کا زمانہ وہ پُرانا زمانہ نہیں
ہے جب دادیاں اور نانیاں بچّوں کو تھپک تھپک کر
کہانیاں سُنایا کرتی تھیں۔ یہ کہانیاں زیادہ تر
دیو، پریوں اور جانوروں کے گرد گھومتی تھیں۔
بچّہ تصوّر میں دو سینگ والے دیو اور پھیلے
ہوئے پروں والی پری کو دیکھتا تھا۔ جب کوئی
شہزادہ دیو سے ٹکر لیتا تو بچّہ خوشی سے اُچھل
پڑتا۔ وہ سمجھتا تھا گویا وہ خود کہانی کا ہیرو
ہے۔ یہ کہانیاں بچّوں کو بہت پسند آتیں۔
لیکن یہ حقیقت سے بہت دُور تھیں۔ آج کے
سائنسی دور میں بچّے کو ہر موضوع اور ہر قسم
کی کتاب سے دل چسپی پیدا ہو سکتی ہے، آج
کا دیو راکٹ ہے اور پریاں جگمگاتے ہوئے
ستارے۔ اس لیے بچّے کو راکٹ جیسے دیو کا
آسمان میں اُڑ کر جانا اور نئی دنیاؤں کی تلاش
کرنے والی کہانی بھی پسند آتی ہے اور پاتال
کے سینے میں گھس کر کہانی کے ہیرو کا جادوئی
موتی نکال کر لانا بھی اچھا لگتا ہے۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پُرانی
دیو مالائی کہانیاں آج کے بچّوں کو پسند نہیں
آتیں۔ ضرور پسند آتی ہیں۔ مگر آج کے بچّوں
کے ادب میں ایسی کہانیاں بھی پڑھنے کو ملتی ہیں
جو حقیقت سے بہت قریب ہیں اور جن سے
بچّے کا روزمرّہ واسطہ پڑتا ہے۔ بچّے کی زندگی
میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب بچّے
کے لیے اس کی پیاری خیالی دُنیا میں کوئی کشش
باقی نہیں رہتی۔ تب وہ خیالات کے تانے بانے
توڑ کر حقیقت کے عالم میں پہنچ جاتا ہے۔ اس
کی فکر اور سوچ تیز ہو جاتی ہے۔ وہ خیال
سے زیادہ حقیقت کو پسند کرنے لگتا ہے۔ راجہ
فاروق علی خاں "کلیاں ہی کلیاں" نامی کتاب میں
لکھتے ہیں: "جنوں پریوں کے حیرت انگیز
واقعات بچّے کے لیے پُرانے اور دقیانوسی
بن جاتے ہیں۔ وہ انھیں جھوٹ کا ایک طومار
سمجھ کر ان سے نظریں پھیر لیتا ہے۔"

آزادی سے پہلے بچّوں کے ادیبوں اور
شاعروں میں حضرت امیر خسرو، میر تقی میر،
غالب، نظیر اکبرآبادی، تاجور نجیب آبادی،
خواجہ الطاف حسین حالی، محمد حسین آزاد، ڈاکٹر
اقبال، منشی پریم چند، مولوی اسمٰعیل میرٹھی،
برج نارائن چکبست، تلوک چند محروم، صوفی
تبسّم، حامد اللہ افسر اور بہت سے دوسرے
ادیب و شاعر اچانک معدوم ہو گئے ہیں۔
مگر اس دوران میں بچّوں کے لیے لکھنے والوں
کی جو نئی نسل اُبھری ان کی تحریروں نے
پرانی تحریروں کی جگہ خوبی سے پُر کر دی ہے
اس نسل میں ڈاکٹر ذاکر حسین، شفیع الدین نیّر،
یکتا امروہوی، راجا مہدی علی خاں، ڈاکٹر
اطہر پرویز، جگن ناتھ آزاد، کرشن چندر،
عصمت چغتائی، عفت موہانی، جیلانی بانو،
اظہر افسر، راج نرائن راز، رام لعل، مظہر الحق
علوی، زکی انور، ابرار محسن، مظفر حنفی، محمود سعیدی، اندر
جیت لال، انور کمال حسینی، انیس مرزا، خلیق
انجم اشرفی، غلام حیدر، افتخار احمد اقبال،
محبوب راہی، کالیکا پرشاد، قاسم صدیقی،
م ندیم، عشرت امیر اور سراج انور شامل ہیں۔
ان ادیبوں نے بچّوں کے اَن گنت رسالوں
میں لکھا اور آج تک برابر لکھ رہے ہیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین نے بچوں کے لیے حالانکہ کچھ زیادہ نہیں لکھا۔ لیکن جو کچھ بھی لکھا وہ بچوں کے ادب میں ہمیشہ کے لیے زندۂ جاوید ہوگیا۔ ان کی کتابیں ابو خاں کی بکری۔ اور مرغی اجمیر چلی اور کچھوا اور خرگوش بہت مشہور ہیں۔ ذاکر حسین صاحب کو دوسری مصروفیتوں سے وقت نہ ملا ورنہ وہ اور بھی عمدہ کہانیاں لکھتے۔ شفیع الدین نیّر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اُستاد تھے۔ اور بچوں کی نفسیات سے اچھی طرح واقف تھے۔ انھوں نے بچوں کے لیے بہت پیاری نظمیں اور کہانیاں لکھی ہیں۔ اُردو میں بچوں کے ادب کو AGE GROUP میں تقسیم کرنے کا سہرا بھی نیّر صاحب کے ہی سر ہے انھوں نے بچوں کی کہانیوں اور نظموں کو ان کی عمر کے لحاظ سے لکھا۔ پانچ چھ برس کے بچوں کے لیے گلگلے کی دوڑ، مکھن کا ڈبہ اور ہوشیار جن۔ سات آٹھ سال کے بچوں کے لیے تارا کا ڈنڈا، پرستان کی سیر، انار راجا، بطخ شہزادی۔ آٹھ سے گیارہ برس کے بچوں کے لیے چُنن مُنن، ٹلومیاں اور گیارہ سے چودہ سال کے بچوں کے لیے شیر خاں کے معرکے، مزدور کا بیٹا، پیسے کا صابن، ریڈیو کا بھوت، بونے کا انصاف اور غالب کی کہانی۔ جیسی کہانیاں لکھیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ موجودہ زمانے میں بچّہ عمر کی اس قید کا قائل نہیں ہے، پہلے زمانے کے بچّے کے مقابلے میں آج کے بچّے کا ذہن بہت بالغ ہے۔ آج سات سال کی عمر کا بچّہ بھی چودہ سال کی عمر کے بچّے کے لیے لکھی گئی فنٹیسی پڑھتا ہوا نظر آتا ہے۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور آج کے ماحول کا اثر بھی بچوں کے ادب پر بہت گہرا ہوا ہے۔ اب بچّہ جانتا ہے کہ فکشن کسے کہتے ہیں۔ اب وہ جادو کے مقابلے میں ایندھن سے اڑنے والے دیو یعنی راکٹ کو پسند کرتا ہے۔

رام لعل کا نام بچوں کے لیے پابندی سے لکھنے والوں میں شامل ہے۔ ان کی کہانیاں بچوں کے اس طبقے کے لیے لکھی گئی ہیں جو بچپن کی دہلیز پار کر کے لڑکپن کی سرحد میں داخل ہو رہے ہیں۔ ان کی کہانیوں کو پڑھ کر بچوں میں کچھ کر گزرنے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔ بہادر ڈرائیور، لیٹر بکس، میرے بچے، بھولو کا چور اور انوکھے چور جیسی عمدہ کہانیاں ان کے قلم سے نکل چکی ہیں۔ انیس مرزا، خلیق انجم اشرفی اور انور کمال حسینی نے اپنی کہانیوں سے آج کے بچوں کے ادب میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ راج نرائن رازؔ نے کچھ زیادہ نہیں لکھا لیکن فٹ بال کی کہانی اور نظموں کا خوبصورت مجموعہ ادبِ اطفال میں ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ یہ کتابیں بچوں کی دلچسپی کا سامان فراہم کرتی ہیں۔ انیس مرزا نے مقدّس کھوپڑی، کالی گھوڑی کا سوار، تہہ خانے کا قیدی، سمندر کا بھیڑیا اور دیوتا کی آنکھ جیسے ناول اور قصۂ چہار درویش سمندر کا خزانہ، گمشدہ شہزادی، جادو کا محل اور چار دن کا شہزادہ نامی کہانیاں لکھی ہیں۔ ان کہانیوں کو پڑھنے کے بعد بچّے کے ننھے سے دماغ میں وہ تاثرات پیدا ہوتے ہیں جو اسے بھی دنیا میں کوئی کام کر جانے پر اُکساتے ہیں۔ انور کمال حسینی نے بھی اچھی کہانیوں کی تخلیق کی ہے۔ پھول اور شہد، مورا، سب کا ساتھی اور نمک کا تھیلا جیسے ترجمے اور کہانیاں ان کی کاوشوں کی آئینہ دار ہیں۔

ان ادیبوں کے علاوہ کرشن چندر اور سراج انور نے بچوں کے ادب کو فنٹیسی یا ناقابلِ یقین اور حیرت انگیز کہانیوں سے متعارف کرایا ہے۔ کرشن چندر نے الٹا درخت، چڑیوں کی الف لیلہ، ستاروں کی سیر جیسے ناول اور بیوقوفوں کی کہانیاں، سونے کا سیب، شیطان کا تحفہ، سونے کی صندوقچی جیسی کہانیاں پیش کی ہیں۔ ان کی کتابیں طنز اور طلسم دونوں سے بھرپور ہیں۔ اور یکساں طور پر بچوں اور بڑوں دونوں میں مقبول ہیں۔ ڈاکٹر قدوس جاوید نے ایک طویل مضمون میں اور شہاب الدین دسنوی صاحب نے ایک سیمینار میں اس خیال کا اظہار کیا کہ "ابھی اُردو میں بچوں کے لیے رابنسن کروسو اور گلیورس ٹریولز جیسی کہانیاں نہیں لکھی گئی ہیں جو ایک نسل سے دوسری نسل تک پسند کی جائیں۔" میں اس خیال سے اتفاق نہیں کرتا۔ کیوں کہ بچوں کی دلچسپی اور اُن کی نفسیات کو مدِّ نظر رکھ کر کرشن چندر اور راقم الحروف نے عام فہم اور آسان اُردو میں اس نوع کے کئی ناول قلم بند کیے ہیں۔ جن میں ہر ناول کی ضخامت تقریباً ساڑھے چار سو صفحات تک پہنچ گئی ہے۔ اُلٹا درخت، ستاروں کی سیر، چڑیوں کی الف لیلہ، خوفناک جزیرہ، کالی دُنیا، نیلی دُنیا اور دوڑتا جنگل جیسے بچوں کے ناول عجیب و غریب حیرت انگیز واقعات، سسپنس، سائنس، مہم جوئی اور سفر کے دلچسپ حالات و واقعات سے پُر ہیں۔ یہ ناول نہ صرف کئی کئی بار ہزاروں کی تعداد میں شائع ہو چکے ہیں۔ بلکہ دیگر زبانوں میں بھی

ان ناولوں کے ترجمے شائع ہوتے اور مقبولِ
عام رہے۔

آخر میں میں ان اداروں کا تذکرہ بھی
کروں گا جنھوں نے بچّوں کے ادب کو فروغ
دیا ہے۔ ان میں کھلونا بک ڈپو اور رسالہ
کھلونا کا نام پہلے آتا ہے، جنھوں نے لگ بھگ
ہر ادیب اور شاعر سے بچّوں کے لیے لکھوایا۔
پھر مکتبہ جامعہ دہلی ہے جس نے بچّوں کی
کہانیاں ہی نہیں چھاپیں بلکہ ان کے لیے ایک
رسالہ پیامِ تعلیم بھی نکالا۔ کھلونا اور پیامِ تعلیم
ایسے رسالے ہیں جو تقریباً چالیس سال سے
متواتر چھپ رہے ہیں۔ نسیم بک ڈپو لکھنؤ نے
بھی بچّوں کی ان گنت کہانیاں کتابی شکل میں
چھاپی ہیں۔ ان میں زیادہ تر عفّت موہانی،
مظہر الحق علوی اور انجم اعزاز کی طویل کہانیاں
ہیں۔ مظہر الحق علوی کی کہانیاں بھی متنوع موضوعات
سمیٹے ہوئے ہیں۔ ان میں سمندری لٹیرے،
سمندری شیطان، گھر کا بھیدی، فرعون کا خزانہ،
تین جاسوس، دوسری دنیا کی تلاش اور سِکلا طوطا
بہت پسند کی گئی ہیں۔ دلّی کے ترقی اردو بورڈ
نے بھی بچّوں کے لیے خوبصورت اور باتصویر
کتابیں شائع کی ہیں۔ نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا
نے ایک اور اچھا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس
ادارے نے بھارت کی سبھی زبانوں کی کہانیاں
چھاپی ہیں اور ایک زبان کا ترجمہ دوسری زبان
میں ملک کے چُنے ہوئے بچّوں کے ادیبوں سے
کرایا ہے۔ ان کتابوں میں کرکٹ، ہمارا بحری بیڑا،
درندوں کی دُنیا، ہماری ریلیں، چڑیا گھر میں،
مور: سب کا ساتھی، درختوں کی دُنیا، اولمپک
کھیل، ہرن کے بچّے، شیر خاں، لومڑی کے
بچّے، بہادر، سونا کی میر، دس کہانیاں اور
ٹوٹا ہوا پَر۔ قابلِ ذکر ہیں۔ انھیں حسبِ ترتیب
قرۃ العین حیدر، صالحہ عابد حسین، قاسم صدیقی،
احسان الحق، شفیع الدین نیّر، عرش ملسیانی،
مخمور سعیدی، انور کمال حسینی، مظہر الحق علوی،
سید احسان اور سراج انور نے دوسری زبانوں
سے اردو میں منتقل کیا ہے۔ دس کہانیاں نامی
کتاب بچّوں کے لیے عمدہ کہانیوں کا گلدستہ
ہے جس میں بچّوں کے بیشتر نامی ادیب ایک
جگہ جمع ہو گئے ہیں۔

مجھے خوشی ہے کہ گذشتہ چند برسوں
میں اُردو ادبِ اطفال کی طرف ناقدین، مبصرین
اور محققین کی خاطر خواہ توجہ کے نتیجے میں
جامعہ ملیہ اسلامیہ اور میرٹھ یونیورسٹی سے دو
وقیع تحقیقی مقالوں پر جن کا موضوع بچّوں کا
ادب ہے۔ پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری تفویض
کی جاچکی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ
اب ادبِ اطفال کی جانب بیشتر دانشوروں
نے خصوصی توجہ کی ہے۔ ڈاکٹر خوشحال زیدی
نے عملی طور پر کچھ تحقیقی مقالے اُردو کے
مقتدر رسائل میں شائع کرا کے اُردو ادیبوں
اور شعرا کی توجہ بچّوں کے ادب کی جانب
مبذول کرانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ دِ
اُردو اکادمی نے بچّوں کا ماہنامہ اُمنگ
اور ہریانہ اُردو اکادمی نے بچّوں کے لیے
چند اچھی کتابیں شائع کر کے بچّوں کے ادب
کی ایک بڑی کمی کو دُور کیا ہے۔ اس کے
علاوہ یو۔پی اُردو اکادمی کی جانب سے بھی
کچھ اچھی کتابیں بچّوں کے ادب پر شائع
ہوئی ہیں۔

بقیہ: مَلِک محمد جائسی

اس مکان کے پیچھے کی طرف ایک
بڑی چورس زمین پر اب ان کی
ایک شاندار یادگار بن رہی ہے اس کے
علاوہ جائس میں ایک پارک اور ایک
لائبریری بنانے کی بھی تجویز ہے جس پر کام
شروع ہو چکا ہے۔ بھارت سرکار نے
اس یادگار کے بنانے کے لیے ۲۵ لاکھ
روپے دیے ہیں۔ اُمید ہے کہ مَلِک محمد
جائسی کی یہ یادگار بہت جلد عوام و خواص
کی زیارت گاہ بن جائے گی۔ سچ ہے
آدمی اپنے کام سے زندہ رہتا ہے، دولت
اور طاقت سے نہیں۔ ہمارے ملک
میں تلسی داس اور کبیر کے ساتھ ساتھ
مَلِک محمد جائسی کا کلام بھی عام آدمیوں
کے دلوں کو روشن کرتا رہے گا۔

قمر اقبال ـــــ شعلۂ مستعجل

مرہٹواڑہ میں اورنگ آباد اُردو ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ اور آج بھی وجدؔ اور یعقوبؔ عثمانی کے بعد جن شعرا نے اُردو شاعری میں نام کمایا ہے ان میں قاضی سلیم، بشر نواز اور میر ہاشم کے نام نمایاں ہیں۔ اور اس خطے کی شاعرانہ فتوحات کا ذکر ان شعرا کا نام لیے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔

قمر اقبال ایلورہ اجنتا کی سرزمین کے باسی تھے ان کو مرحوم کہتے ہوئے کلیجہ مُنہ کو آتا ہے۔ وہ صحافت کے پیشے سے وابستہ تھے اور شاعری کا اچھا اور ستھرا ذوق رکھتے تھے۔ ان کی غزلوں کا مجموعہ "موم کا شہر" یہ مضمون لکھتے وقت میرے پیش نظر ہے۔ اس مجموعے کی غزلوں میں زندگی اور اس کے مسائل اور انسانی سماج کے گہرے مطالعے کا پرتو نظر آتا ہے۔

آج اُردو شاعری میں شکست و ریخت کے تجربے جس طرح سے ہو رہے ہیں۔ وہ تعمیری رجحان نہیں بلکہ چند من چلے نوجوانوں کا اُردو شاعری کی روایات اور اس کے کلاسیکی انداز سے انحراف ہے جو اُردو شاعری خاص طور پر اُردو غزل کے تہذیبی مزاج اور اس کی مستحکم قدروں سے زیادہ مطابقت نہیں رکھتا۔ ایسے میں قمر اقبال کی غزلوں کا یہ مجموعہ فال نیک ہے۔ وہ کہتا ہے:

دنیا تھی اک طرف تو قلم دوسری طرف
میں نے بڑھا کے ہاتھ قلم کو اٹھا لیا

جو شاعر ہاتھ بڑھا کر قلم اُٹھا لیتا ہے اور پھر وہ اردگرد کے ماحول پر نظر ڈالتے ہوئے آج اور کل کی بات اس طرح کرتا ہے:

خدا کا شکر کہ اس دَور میں کیا پیدا
سُنا ہے اور زمانہ خراب گزرے گا

جب انسان مسلسل جدو جہد کرتا ہے اور اسے آرام نہیں ملتا تو وہ جھلا کر کہتا ہے:

کیسا یہ مسلسل ہے سفر، راہ ہے کیسی
قسمت میں پرندوں کی بھی آرام لکھا ہے

وہ اوتاروں کو تلاش نہیں کرتا۔ بلکہ انسان کو ڈھونڈھنے کی سعی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

اوتار ملے کوئی یہ ارمان کہاں ہے
میں ڈھونڈتا پھرتا ہوں کہ انسان کہاں ہے

آج ہمارے ملک میں فرقہ واریت نے اتنا زور پکڑ لیا ہے کہ انسان سے انسانیت چھن گئی ہے اور وہ حیوان نما انسان دکھائی دیتا ہے۔ اس فرقہ وارانہ جنون پر شاعر کا جو ردِّ عمل ہے وہ ملاحظہ فرمائیے۔

گھروں میں آ سکیں مکتب سے بچے
کم از کم شہر میں تب تک اماں رکھ

شورش کہ ہر طرف حیراں نہ ہوا اے زندگی
شہر میں تیرے سوا ماتم کسی کا بھی نہیں

بجھاتے کیوں ہو جلتی مشعلوں کو
ابھی بستی میں اک گھر رہ گیا ہے

پھر شاعر دُعا مانگتا ہے کہ:

ہٹا دے سارے فتنہ پروروں کو
زمیں قدموں میں سر پر آسماں رکھ

قمر اقبال کے ہاں دُنیا وی دُکھ درد کے ساتھ ساتھ عشق و رومان کا بھی ملا جلا احساس پایا جاتا ہے۔ اور بانکپن کے ساتھ ساتھ لہجے کی نرمی اور انداز بیاں کی ملائمت۔ چنانچہ وہ معشوق سے ملاقات کا حال یوں بیان کرتا ہے کہ:

سانولا رنگ وہ تیکھے سے خدوخال اس کے
تب تو گرویدہ ہوئے ہیں قمر اقبال اس کے
اور بھی لوگ تھے لیکن جو ملی مجھ سے نظر
جانے کیا سوچ کے رخسار ہوئے لال اس کے

شاعر کی رومان پروری کی مثالیں ان اشعار میں بھی ملیں گی:

ملے وہ زلف تو کہنا کہ اب بھی تیرے لیے
گلاب شاخ سے ہر روز توڑتا ہے کوئی

ذہن کچھ دیر تو خوشبو میں بسا رہنے دے
میرے کاندھوں پہ یوں ہی سر کو جھکا رہنے دے

غزل کہہ کر قمر ہوگی خوشی کیا
لبوں تک اس کے جب تحفہ نہ جائے

معشوق کے حُسن کا بیان کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے:

بہت حسین سہی سات رنگ کی یہ دُکاں
مگر وہ بات کہاں تیرے ابروؤں جیسی

اُردو ہال، حمایت نگر، حیدر آباد ۵۰۰۰۲۹

اورنگ آباد کا ذکر نظم نما غزل کے اس مقطع میں جس طرح ہوا ہے وہ داد کے قابل ہے:

نکلے ہو زندگی کو کہاں ڈھونڈھنے قمرؔ
معلوم ہے کہ شہر ہی یہ مقبروں کا ہے

یا پھر غالباً ہیتل کھورا کے غاروں کے بارے میں یوں رقم طراز ہے:

پتھر کے سر چڑھا ہے جو جادو ہے ہاتھ کا
وہ لوگ جا چکے ہیں گپھاؤں میں کچھ نہیں

موجودہ عہد کے لیڈروں پر جس انداز میں طنز کیا ہے وہ خاصے کی چیز ہے:

اگر کبھی تو دیکھ تماشہ یہ اے خدا
تیری زمیں پہ کتنے خداؤں کے ساتھ ہوں

قمر اقبال اپنی تشبیہوں میں قدامت پرست نہیں بلکہ انھوں نے نئی تشبیہوں سے اپنی شاعری کو سجایا ہے۔ اور اس میں ایسا حسن پیدا کر دیا ہے کہ داد دینی پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر بعض نئی تشبیہیں ملاحظہ فرمایئے:

قرب کی خوشبو
آنکھوں کے جگنو
خواب کا قتل
نیند کا عذاب
تنہائی کا زینہ
آوازِ خزاں وغیرہ

اچھا شاعر اپنے نجی تجربات کے معنی خیز پہلوؤں کو اپنی شاعری کی بنیاد بنا کر انھیں الفاظ کے قالب میں ڈھالتا ہے۔ جس کی وجہ سے

اس کی شاعری میں ایک ذہنی ریاضت کا احساس اجاگر ہوتا ہے اور وہ احساس قمر اقبال کی شاعری میں نمایاں ہے۔ وہ جدید اردو غزل کو ایک نئی سمت سے آشنا کر رہا تھا۔ اور اس نے اس کے لیے زبان بھی ایسی استعمال کی تھی جس میں کوئی الجھاؤ نہیں ہے۔ اور یہ بھی اس کی شاعری کی ایک خوبی ہے۔

OO

قمر جہاں

صاحب

اُس کے آتے ہی شہر میں ایک عجیب سی ہلچل مچ گئی تھی، کوئی کہتا "اب اس شہر کا نظام بالکل درست ہو جائے گا۔ بہت دِنوں کے بعد ایسا آدمی اس شہر میں آیا ہے۔" کسی زبان پر تھا:

"بڑا انٹیلکچول ہے۔ باتیں کس قدر سُلجھی ہوئی کرتا ہے، مختلف ممالک کی ڈگریاں ہیں اُس کے پاس..." کوئی اور کہتا:

"کافی عرصے کے بعد اس شہر کو ایک اچھا آدمی ملا ہے، دیکھنے میں پرسنلٹی تو کوئی خاص نہیں ہے مگر اپنی گفتگو سے بہت جلد متاثر کرلیتا ہے۔"

"... قابل آدمی کی پہچان تو اُس کی گفتگو ہے۔" غرض ہر طرف اُس کے چرچے تھے، لوگوں کی زبانیں اُس کی تعریف کرتے نہ تھکتیں اور ہر شخص اُمیدوں کے تاج محل سجائے اس کی دربار داری میں لگا رہتا۔

وہ خود سب سے قدرے الگ تھلگ رہتا کیونکہ اپنی ذہانت اور غیر معمولی پن کا رعب ڈالنے کے لیے اس خیال میں اس کے اور دوسروں کے درمیان مناسب فاصلے ضروری تھے۔

لوگوں میں چہ می گوئیاں ہونے لگیں:

"اس قدر ریزرو رہتا ہے یہ شخص کہ اسے سمجھنے میں بڑی دشواری ہو رہی ہے۔"

"اس کی شخصیت پر تو اتنے پردے پڑے ہیں کہ اس کے اندر جھانکنا بہت مشکل ہے۔"

بہت جلد لوگ اُس کی ذاتیات کی پرتیں اُدھیڑنے میں مصروف نظر آنے لگے:

"اس کی بیوی بچے کہاں ہیں؟ یہ اپنی فیملی کو آخر کیوں نہیں ساتھ رکھتا؟ اب تو اس شہر میں اسے بہت دِنوں تک رہنا ہے۔"

"ارے یار! گھر میں بھی کسی کو ملنے کی اجازت نہیں ہے، کیا یہ شخص اپنی تنہائی سے نہیں گھبراتا...؟ کیسا بور انسان ہے۔"

"بڑے لوگ تو کم آمیز ہوتے ہی ہیں، اور پھر یہ تو بہت مصروف آدمی ہے۔ دیکھتے نہیں بیچارے کو اپنے کاموں سے ہی فرصت کہاں ملتی ہے؟"

"اور جب فرصت ملتی ہے تو کتابوں میں اُلجھ جاتا ہے۔ کہتا ہے کتابیں میری بہترین دوست ہیں جن کا کوئی مطالبہ نہیں۔ یعنی میں مطالبوں سے ڈرتا ہوں، آج کے زمانے میں ایسی بے غرض دوستی کہاں ملے گی؟"

وہ ہر قسم کی چہ می گوئیوں سے الگ تھلگ اپنے آفس کے بڑے سے چیمبر میں صبح سے شام تک فائلوں پر جھکا رہتا۔ وہ وقت کا بڑا پابند تھا اور دوسروں کو بھی اسی طرح پابند دیکھنا پسند کرتا تھا ——— اُس کا چیمبر دالان نما تھا جہاں تمام دریچوں اور دروازوں پر دبیز ریشمی پردے پڑے تھے اور پورا کمرہ نیم تاریکی میں ڈوبا رہتا ——— اچھا خاصہ رُومانی ماحول تھا اُس کے چیمبر کا۔ وہ اپنی اُونچی سی اسپرنگ والی گدّے دار کُرسی پر بڑی رعونت کے ساتھ آکر بیٹھ جاتا تھا، اُس کی کرسی کے دونوں جانب بڑے سلیقے سے قطار اندر قطار کرسیاں لگی ہوتی تھیں اور سامنے میز تھی وسط کی خالی جگہ میں رنگ برنگے پھولوں کے خوبصورت گملے قرینے سے سجائے گئے تھے۔ اُس کے چیمبر کی آرائش اور سجاوٹ سے ہی لوگ اُس کے غیر معمولی ذوق اور نفاستِ طبع کے قائل ہو جاتے تھے۔

میں بھی جب پہلی دفعہ اُس سے ملا تھا تو اُس کی شخصیت کے غیر معمولی پن نے مجھے فوراً متاثر کر لیا تھا ——— شروع میں کافی عرصے تک وہ لوگوں کو سمجھتا رہا، خود چپ رہتا یا صرف "ہوں" "ہاں" کرتا رہتا اور جب اُس نے تمام 'رموزِ مملکت' کو سمجھ لیا تو پھر آرڈر چلانے لگا۔ اُس شہر کے لوگ ایسے حاکمانہ فیصلے سننے کے عادی نہیں تھے، وہ تو اب تک اپنی مرضی کے مطابق ہر نئے آنے والے کو اپنے اختیار میں لینے کے خوگر رہے تھے۔ لیکن اس بظاہر معمولی سی شخصیت کے انسان میں نہ جانے وہ کون سی قوت تھی کہ وہ

ریڈر شعبۂ اردو، سندروتی مہیلا کالج، بھاگلپور (بہار)

خود دوسروں کے اختیار میں نہیں گیا اور
اپنے اختیارات کا بھرپور استعمال کرنے لگا۔
لوگوں کو اس کی یہ ادا ایک دم اچھی نہ لگی:

"... مُنھ بڑے آئے ہم کو غلام بنانے۔
جانتے نہیں کہ ہم لوگ کس مٹی کے بنے
ہیں..."

"... اس شہر کا آدمی ٹوٹ سکتا
ہے لیکن جھک نہیں سکتا..."

"... لیکن یہ غلط قسم کی خود داری
اور انا آپ لوگوں کو برباد کردے گی' بھائی
صاحب! آپ حضرات نے اپنی فلاح و
بہبود کے راستے خود ہی مسدود کر لیے ہیں
اور دوسروں کو دیتے ہیں..."

وہ سمجھانے کی کوشش کرتا مگر یہاں سمجھنے
والا کون تھا۔ انھیں صحیح باتیں' بہترین
مشورے بھی اپنے گرد پھیلاتے ہوئے
جال نظر آتے اور وہ ہمہ وقت اُسے کُترنے
میں لگے رہتے' نتیجہ ظاہر تھا وہ 'انٹیلکچول'
اپنی تمام تدابیر کے باوجود مقامی معاملات
کی صحیح دیکھ بھال نہ کرسکا' اُس کا سارا
جوش وخروش رفتہ رفتہ ٹھنڈا پڑ گیا
اور شہر سے ہی اُسے وحشت ہونے لگی۔
وہ اُکتایا اُکتایا سا رہتا۔ آفس میں بھی اس
کا جی نہ لگتا۔ اُس نے یہ محسوس کرلیا کہ اس
شہر کے لوگ کن چیزوں کے خوگر ہیں' دو چار
جو اُس کی سچے دل سے قدر کرتے تھے اور
اُس کی روش کو پسند کر رہے تھے اُن کی
پسند و ناپسند نقار خانے میں طوطی کی
آواز ثابت ہوئی۔ وہ اسے کوئی سہارا نہیں
دے سکے —— اور وہ ایک لمبی رخصت
پر باہر چلا گیا ——

جب وہ واپس آیا تو قدرے بحال تھا'
اُس نے اب ایک نیا طریقہ اپنایا تھا' وہ اب
لفظ "نہ" کا کہیں استعمال نہ کرتا' ہر بات
پر ہاں کہہ دیتا۔ اس نے دیکھا کہ لوگوں کے
تیور بہت تیزی سے بدلنے لگے۔ وہی لوگ جو
اُس کی اصول پسندی کا مذاق اُڑایا کرتے
اب اُس کی جی حضوری میں لگے ہوتے تھے۔
ہر طرف اُس کی نئی شخصیت کا جادو چل
نکلا:

"آج تو صاحب بہت اچھے موڈ میں
ملے۔ انھوں نے وعدہ کیا ہے میرا کام
ضرور ہو جائے گا۔"

"... خلافِ معمول صاحب کا
موڈ ان دنوں بہت اچھا رہتا ہے' کتنا
ہنس ہنس کر باتیں کرتے ہیں' کہہ رہے تھے:
چنتا بالکل نہ کرو' ہم کو تمھاری پوری فکر ہے'
سب سے پہلے تمھارا کام دیکھیں گے۔"

"... چلیے اتنے دنوں کے بعد صاحب
نے سیدھے راستے پر چلنا تو سیکھا۔ ورنہ
یہ تو ہر بات میں پخ لگایا کرتے تھے۔ ہم
تو عاجز آگئے تھے ان کی پخ لگانے کی
عادت سے..." اُن کے پرائیوٹ سکریٹری
نے مسکراتے ہوئے کہا۔

لوگ باگ اُس کی دربار داری میں
مستعدی سے لگ چکے تھے۔ ساتھ ہی
جائز وناجائز مطالبات کی لمبی چوڑی فہرست
بھی پیش کرتے جاتے ——

لوگوں کی آنکھیں اُس وقت کھلیں
جب انھیں یہ علم ہوا کہ صاحب اُوپر
سے اپنے تبادلے کا آڈر لے آئے ہیں اور
کل صبح وہ اس شہر کو چھوڑ کر جا رہے ہیں۔
لوگوں کو اپنے سنہرے سپنے اور صاحب
کے وعدے یاد تو آئے مگر صاحب
جا چکے تھے۔

○○

رزّاق ارشد

واہمہ ہوں یا کوئی دھوکا ہوں میں
وہ نہیں ہوں جو نظر آتا ہوں میں

اب جدھر لے جائے بے پروا ہوا
شاخ سے ٹوٹا ہوا پتّا ہوں میں

تو گھٹا ہے تو مجھے سیراب کر
دھوپ میں تپتا ہوا صحرا ہوں میں

تو ندی ہے تو چلی آ میرے پاس
منتظر تیرا ہوں کہ دریا ہوں میں

سب ترنگیں اُٹھ چکیں اٹھنا جو تھیں
اب تو بس اِک ٹوٹتا نشّہ ہوں میں

میری چاہت کرکے تم پچھتاؤ گے
جاگ جاؤ نیند کا جھونکا ہوں میں

ٹوٹتے مٹتے تعلّق کا خیال ——!
لاکھ چاہوں، بھول کب پاتا ہوں میں

اپنے ہی گھر کے ہوئے دروازے بند
وہم تھا سب سے نبھا سکتا ہوں میں

کھیر میر عالم خاں، نزد نائب صاحب کی نال، ٹونک ۳۰۴۰۰۱

ہمایوں ظفر زیدی

①

خون روتے گا عمر بھر بے حد
دیکھ! مجھ سے وفا نہ کر بے حد

ایک عالم تھا منتظر جن کا
ان کی قسمت میں تھا سفر بے حد

کیسا مژدہ سُنا گئی ہے ہوا
ہیں پریشاں شجر حجر بے حد

وسعتیں اور دے جنوں کے لیے
یہ زمیں تو ہے مختصر بے حد

کیوں غریب الوطن ہی رہتے ہیں
یاد آتا ہے جن کو گھر بے حد

مصلحت کوش ہوگئی دُنیا
جو دسے لگنے لگا ہے ڈر بے حد

②

راس آجائے یہ سفر شاید
ہم پہنچ جائیں اپنے گھر شاید

کہہ رہی ہے فضائے دشتِ جنوں
اب کے سودا رہے نہ سر شاید

مدّتوں بعد پھر سے یادوں کا
آج دریا ہے باڑھ پر شاید

کہہ رہی ہے قدم کی تیز روی
اب قریب آگیا ہے گھر شاید

دور پر کچھ دھواں سا اٹھتا ہے
ابھی آباد ہے نگر شاید

آج آنکھوں میں خواب اتریں گے
آج آجائے وہ نظر شاید

جان سے ہم گزر گئے کب کے
اُس کو اب تک نہیں خبر شاید

شعبۂ انگریزی، پی۔او۔بی۔ ۶۸۴۵، رُوی، مسقط

ڈاکٹر) مجیب الاسلام

ڈاکٹر عابدہ بیگم

۱۹۷۵ء میں راقم پی ایچ۔ ڈی
یے شعبۂ اُردو دہلی یونیورسٹی میں داخل
تو یہ ڈیپارٹمنٹ تہذیبی اور ادبی اقدار
حامل تھا۔ یہاں پہلی مرتبہ ڈاکٹر عابدہ
ُ سے بات چیت کا موقعہ ملا۔ میں انھیں
عرصے سے جانتا تھا۔ وہ میرے اسکول
ایک اہم جماعت سید زاہد علی کی بڑی بہن
ں۔ جامع مسجد کے شمالی دروازے کے
منے بازار مٹیا محل میں اکثر انھیں آتے جاتے
یکھا کرتا تھا لیکن کبھی سلام دعا نہیں ہوئی
ی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ
حد خوش وضع خوش لباس ہونے کے
تھ ساتھ راہ میں اپنی ہی دھن میں چلی
تی تھیں۔ ان کی پُر وقار شخصیت متاثر
تی تھی۔ نہایت موزوں قد پُر کشش
ولا رنگ، پُرسکون گول چہرہ، بڑی بڑی
لی بولتی ذہین آنکھیں، گھونگھر والے
یاہ بال، ہلکے خوش نما رنگ کا بے داغ
ں، آہستہ آہستہ قدم بڑھاتی ہوئی چلی
ی تھیں۔ اول اول مجھے گمان ہوا کہ یہ
رخاتون ہیں لیکن ان کی خوش گفتاری
بہت جلد اس احتمال کو باطل کر دیا
جب دلی کی تہذیب کو پڑھنے سمجھنے
وقع ملا تو پتا چلا کہ شرفا کا یہی طریقہ
سرِ راہ بولنا تو درکنار قدموں کی آواز
معیوب سمجھی جاتی ہے۔ ڈاکٹر عابدہ
کا تعلق بھی ایک ایسے ہی خاندان سے تھا
جن کے اجداد کئی پشتوں سے دہلی میں مقیم
تھے۔ ان کے دادا سید ذوالفقار علی مرحوم
کہا کرتے تھے کہ میرے باپ دادا بھی
شاہجہاں آباد میں پیدا ہوئے اور یہیں
کی مٹی میں مل گئے۔ دادا کے عہد میں انگریزوں
کا راج تھا اور مسلمانوں میں تعلیم نہ ہونے
کے برابر تھی لیکن سید ذوالفقار علی نے
۱۹۱۸ء میں میٹرک پاس کیا تھا۔ انگریزی
زبان کے دلدادہ اور اس قوم کے رکھ رکھاؤ
کے وہ دل و جان سے قائل تھے۔ کاغذ کا
کاروبار کرتے تھے۔ جامع مسجد کی پُشت پر
چاوڑی بازار میں ایس۔ ایس۔ میاں کے نام
سے بنگال پیپر ملز کی ہول سیل ایجنسی تھی۔
صاحب جائداد تھے اور اپنی املاک کی
قانونی پیروی خود کیا کرتے تھے۔ ان کا
معمول تھا کہ ہر روز علی الصبح انگریزی ٹائپ
رائٹر پر عدالت کے کاغذات خود تیار کرتے۔
غالباً اسی لیے اس زمانے کے بعض پیشہ ور
وکیل ان سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ ان کا
انتقال تقریباً سو برس کی عمر میں ۱۹۶۹ء
میں ہوا۔ انھوں نے عمر بھر چشمہ نہیں لگایا
ہاتھ میں بید نہیں لی مگر پورے گھر میں
ان کا فیصلہ محکم حاکمِ مرگِ مفاجات کا
درجہ رکھتا تھا۔

سید ذوالفقار علی مرحوم کے صاحبزادے
سید شبیر علی تھے یہ بھی میٹرک پاس تھے
درمیانہ قد، گٹھا ہوا جسم، سانولا رنگ جس
پر چہرے کی سرخی کلونس مارتی تھی۔ ہمیشہ
بادامی رنگ کا کرتا بڑی مُہری کا سفید
پاجامہ پہنے، مُنہ میں پان خالی ہاتھ ہلاتے
چلے جاتے تھے۔ ۱۹۳۴ء میں ان کی شادی
دہلی کے مشہور خاندان حاجی علی جان کے
ہاں محترمہ محسن جہاں بیگم سے ہوئی تھی (یہ
معمولی پڑھی لکھی خاتون تھیں مگر دینی تعلیم سے
آراستہ تھیں) سید شبیر علی مالدار باپ کی
اکلوتی اولاد شبیر کاغذی کے نام سے مشہور
تھے۔ ان کو بہت سے شوق تھے جن میں شاعری
کرنا اور کبوتر پالنا خصوصیت رکھتے ہیں۔ ان
کے مزاج میں ہٹ دھرمی تھی اس لیے شاعری
میں کسی سے اصلاح نہیں لی صوفیانہ اور عاشقانہ
شعر کہتے تھے۔

اہلِ دہلی میں شاعری کا شوق و ذوق
ہمیشہ سے رہا ہے۔ پہلے سخن فہمی زیادہ تھی
پھر اس کی جگہ سخن گوئی نے لے لی۔ دیگر
مشاغل میں پرندے پالنا بھی شامل تھا۔
۱۹۴۷ء سے قبل دلی میں کچھ گھروں کو چھوڑ کر
سب ہی جانور اور پرندے رغبت سے
پالتے تھے۔

شبیر کاغذی کو بھی کبوتر پالنے کا شوق
جنون کی حد تک تھا۔ سفید سفید براق کی مانند
موٹے موٹے کبوتر گھر کی چھت پر بڑے جال
میں بند رہتے تھے۔ دور سے دیکھنے پر معلوم ہوتا
تھا جیسے کسی نے برف کے ٹکڑے جال میں
سجا دیے ہوں۔ ٹیلی ویژن کی ایجاد کے

بعد جب اکا دکا گھروں میں ٹی۔وی ہوتا تھا۔ ٹی۔وی والوں نے ان سے کبوتروں پر ایک انٹرویو لیا اور دکھایا تھا۔ گلی گڑھیا میں ان کا آبائی مکان تھا اس کا ایک راستہ گلی مٹیا محل میں بھی کھلتا تھا۔ اسی گلی مٹیا محل میں بے خود دہلوی رہا کرتے تھے اور ان کے پاس بھی اچھی نسلوں کے بیش قیمت کبوتر تھے۔ فرق یہ تھا کہ بے خود صاحب زور وشور سے کبوتر اڑاتے تھے اور شبیر صاحب دانا پانی دینے کے لیے ہی انھیں کھولتے تھے۔ ان کے والد اس شوق کے سخت خلاف تھے۔ وہ مغربی ذہن کے آدمی تھے اور یہ خالص مشرقی۔ یہاں دو تہذیبوں کے درمیان رسہ کشی رہتی تھی۔ وہ نظم و نسق کے ساتھ وقت کی اہمیت اور پابندی کے قائل تھے یہ وقت کی افادیت کو نظر انداز کرکے رواداری اور وضعداری کو نبھاتے تھے تیسری طرف خداترس، دیندار ماں کی تربیت اور خاندانی شرافت تھی۔ ان تینوں اثرات نے آنے والی نسل کو جس سانچے میں ڈھالا اس کی منفرد مثال ڈاکٹر عابدہ تھیں۔

ڈاکٹر عابدہ کی پیدائش ۱۵ راگست ۱۹۴۳ء کو ہوئی۔ یہ سب آٹھ بھائی بہن تھے، چار بھائی چار بہنیں۔ والدہ صوم وصلوٰۃ کی پابند تھیں اور قرآن شریف کے ساتھ ساتھ اردو پڑھنے پر بہت زور دیا کرتی تھیں۔ انھیں پورا محلہ استانجی کہتا تھا۔ بہت رحم دل خاتون تھیں (پیکرِ احساس میں ڈاکٹر عابدہ نے ان کی شخصیت اور سیرت پر اسم بامسمیٰ کے عنوان سے لکھا ہے) عابدہ بیگم نے ۱۹۶۴ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پرائیوٹ ہائی اسکول اور ۱۹۶۵ء میں پنجاب یونیورسٹی سے پری یونیورسٹی پاس کیا۔ بی اے (آنرز اردو) کے لیے دلی کالج میں داخل ہوئیں اور ۱۹۷۱ء میں اس تاریخی کالج سے (جو آج ذاکر حسین کالج کے نام سے مشہور ہے) امتیازی پوزیشن حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور ۱۹۷۳ء میں ایم۔ اے کے بعد تحقیق کی طرف مائل ہوئیں۔ اسی دوران ۱۹۷۴ء میں پوسٹ ایم۔ اے ڈپلوما اردو ٹرانسلیشن کا ایک سال کا کورس بھی کیا۔ ڈاکٹریٹ کے لیے ان کا موضوع "اردو نثر کا ارتقا" طے پایا اور پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی کی نگرانی میں کام شروع کر دیا۔

ان دنوں پی ایچ۔ ڈی کے لیے وہی طلبا داخلہ لیتے تھے جن میں جستجو کا مادہ اور کام کرنے کی لگن ہوتی تھی۔ ڈاکٹر عابدہ بیگم صبح سے شام تک سینٹرل لائبریری میں بڑے انہماک سے کام کرتی تھیں۔ دوسری طرف سینٹرل لائبریری میں ریسرچ فلور پر اردو کے سبھی اسکالرز جمع ہوتے۔ یہاں پڑھنے لکھنے کا ماحول کم اور تفریح طبع کے سامان میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔

کبھی کبھی ڈاکٹر عابدہ بھی ریسرچ فلور پر آجاتیں تو اسکالرز کی اس محفل میں ایک نئی جان پڑ جاتی۔ صبح سے شام تک ادبی باتیں کم اور نیم ادبی گفتگو زیادہ ہوتی تھی۔ عابدہ بیگم اکثر ادبی موضوعات پر اپنے خیالات کا اظہار کرتیں۔ ان کی بات چیت کا انداز کبھی پُر تکلف بھی ہوتا تھا ورنہ اکثر باتوں کے دوران ہنستے ہوئے اپنی بات مکمل کرتیں شائستہ مذاق ان کی شخصیت کا ایک جز تھا جو گھر اور یونیورسٹی میں یکساں ہوتا دونوں جگہ جب ڈاکٹر عابدہ ہوتیں تو یہ ناممکن تھا کوئی شخص آزردہ نظر آئے۔

جب ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی جواہر لال نہرو یونیورسٹی چلے گئے تو ڈاکٹر عابدہ کا ایک قدم یہاں اور دوسرا جے۔ این۔ یو میں ہوتا۔ وہاں کے ماحول پر تبصرہ کرتیں مغربی تہذیب کے وہ خلاف نہیں تھیں لیکن اعتدال کی حد تک۔

۱۹۷۷ء میں ان کی شادی پروفیسر فضل الحق سے ہوگئی اور ڈاکٹر عابدہ ماڈل ٹاؤن میں رہنے لگیں۔ پہلے سے زیادہ ہشاش بشاش نظر آتیں۔ ابھی ازدواجی زندگی کے چھ مہینے بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ وہ مکان جس کے زیر سایہ ایک خاص تہذیب میں ان کی پرورش ہوئی تھی آفت ناگہانی کی نذر ہوگیا۔ مکان کی چھت گری اور والدہ محترمہ بیگم جن سے ڈاکٹر عابدہ کو بے پناہ عقیدت اور جذباتی لگاؤ تھا خدا کو پیاری ہوگئیں پورے علاقے میں اس کے چرچے ہوئے دور سے لوگ اس گرے ہوئے مکان کو دیکھنے آئے مکان کی چھت تو ملبے میں مل گئی لیکن اپنے پیچھے ایک زندہ خاتون کو کفِ افسوس ملنے سسک سسک کر زندگی گزارنے پر مجبور کر ڈاکٹر عابدہ ایک تو تھیں ہی معصوم اور مسکین بھی ہوگئیں۔ اپنے تمام بہن بھائیوں میں وہ سب سے زیادہ حساس تھیں۔ ملول رہنے لگیں۔ ان کے چہرے سے کرب آثار جھلکنے لگے ہر وقت خاموش رہتیں غم آہستہ آہستہ ان کے جسم کو گھن کی طرح کھانے اور صحت پر مضر اثرات ڈالنے نتیجے کے طور پر ۷۷ء کے آخر اور ۷۸ء

یں دو مرتبہ ٹائی فائڈ کا شکار ہوئیں۔
ے سنبھلنے بھی نہ پائی تھیں کہ تھائی رائڈ
ی قوت پر اثر انداز ہو گیا۔ گلے کی یہ
خاندانی تھی۔ ان کی والدہ اور پھوپی
یہ مرض پریشان رکھتا تھا۔ تیمار پور کے
ہسپتال میں اس کا علاج ہوا۔ ۱۹۷۸ء
یں کڈنی انفیکشن ہوا اور لیڈی
ہیں زیرِ علاج رہیں۔
۱۹۷۹ء میں انھیں ڈاکٹریٹ کی
فویض کی گئی اسی سال شعبۂ اُردو
ریسرچ ایسوسی ایشن کے ایما پر انھیں
اُردو دہلی یونیورسٹی میں سرٹیفکیٹ
ی کلاسیں پڑھانے کے لیے دی گئیں۔
ی۔ ڈی کے بعد اسکالر کا تعلق شعبے
حد تک ہی رہتا ہے تاوقتیکہ وہ
ٹ سے منسلک نہ ہو جائے۔ ان دنوں
سرچ ایسوسی ایشن فعال تھی ہر ماہ
ست کا اہتمام کرتی اور تیسرے ماہ
ے جلسے کا انتظام کرتی تھی۔ راقم
ایشن کا سیکریٹری تھا۔ اس سال
سانے کے موضوع پر ایک بڑا جلسہ
ا گیا۔ جس میں عصمت چغتائی
رحمٰن فاروقی اور جوگندر پال کو خاص
رعو کیا گیا تھا۔ شعبۂ اُردو کے تمام
اس میں شریک تھے۔ جب عصمت
نے سگریٹ جلائی اور آہستہ آہستہ
ہوڑنے لگیں تو ڈاکٹر عابدہ نے
میں کہا مجھے یقین آ گیا کہ یہی عصمت
یں لیکن انھوں نے متوسط طبقے کی
، جس طرح خواتین کی مشکلات کو
یا ہے اس کے لیے بڑا دل گردہ چاہیے

دُکھتی رگوں کو چھیڑنا آسان نہیں اور وہ
بھی اتنی خوبصورتی کے ساتھ کہ انسان
پڑھ کر ہکّا بکّا رہ جائے۔ واقعی یہ بڑی
افسانہ نگار ہیں۔ اور پھر جب عصمت چغتائی
نے جلسے میں شامل سبھی خواتین کی طرف اشارہ
کرکے کہا کہ "تم لوگ لکھو جو چاہو لکھو۔ ڈر
اور خوف کو دل سے نکال کر اس زندگی کو
پیش کرو جو سِسک رہی ہے لیکن زندہ ہے
تو دیکھو کیا ہوتا ہے۔" وہیں سے ڈاکٹر عابدہ
کو تحریک ملی علالت اور غموں کو کچھ حد تک
نظر انداز کرکے وہ جلسوں اور سیمیناروں
میں شرکت کرنے لگیں۔

۱۹۸۰ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
کے شعبۂ اُردو نے "اُردو افسانہ روایت
اور مسائل" کے عنوان سے ایک سیمینار منعقد
کیا تھا۔ دہلی یونیورسٹی کے جو ریسرچ اسکالرز
وہاں موجود تھے ان میں ڈاکٹر عابدہ بھی تھیں۔
افتتاحی خطبہ اس وقت کے کیبنٹ منسٹر
نرسمہا راؤ نے دیا جس میں خاص طور پر
ان موضوعات کی نشاندہی کی گئی تھی جن
پر ابھی تک کچھ نہیں لکھا گیا۔ پاکستان سے
ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر وزیر آغا اور انتظار
حسین آئے تھے۔ ان سب کو پہلی مرتبہ دیکھ
کر ڈاکٹر عابدہ بہت خوش ہوئیں۔ افتتاحی
اجلاس کے بعد دوپہر کو کھانے کے وقت
جب پنڈال خالی ہو گیا تو ڈاکٹر
عابدہ نے اپنے بیگ میں سے صاف ستھرا
لنچ باکس نکالا اور ہم تین چار ریسرچ اسکالرز
کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلایا۔ کھانا کھلاتی
جاتی تھیں اور خطبے پر تبصرہ کرتی جاتی تھیں۔
ہم میں سے کسی نے پوچھا کہ کیا آپ کو معلوم تھا کہ
ہم لوگ یوں نظر انداز کر دیے جائیں گے مُسکرا
کر کہنے لگیں۔ ان لوگوں کی بھی تو اپنی مجبوریاں
ہیں سو آدمیوں کے کھانے پر اگر پانچ سو
ٹوٹ پڑیں تو نہ تیرا بھلا نہ میرا۔ اور پھر
تم سب جامعہ میں ہی تو کھانا کھا رہے ہو۔
یہ گھر کا کھانا ہے اور ہم ایک ہی گھر کے لوگ
ہیں وہاں سب الگ الگ کھا رہے ہوں گے
ہم ایک ساتھ کھا رہے ہیں۔ اُن کے ایک
کھانے میں چار پیٹ بھر گئے بات معمولی
ہے لیکن عابدہ بیگم کی شخصیت میں جو پُرخلوص
وضعداری تھی اس کو بڑی حد تک نمایاں
کرتی ہے۔ یہ تین روزہ سیمینار تھا پھر
دوسرے اور تیسرے دن ہم سب کو بھی
کھانے پر مدعو کیا گیا۔

۱۴ر جولائی ۱۹۸۱ء کو ان کا تقرر
شعبۂ اُردو دہلی یونیورسٹی میں مستقل لکچرار
کی حیثیت سے ہو گیا۔ طبیعت بھی سنبھل
گئی تھی۔ علی الصبح یونیورسٹی آتیں کلاسیں
پڑھانے کے بعد کبھی صدر شعبہ کے کمرے
میں اور اکثر اُردو CURICAL میں
بیٹھتی تھیں۔ یہاں ڈاکٹر شمیم نکہت،
ڈاکٹر فرحت فاطمہ
ڈاکٹر طیبہ خاتون اور ڈاکٹر نکہت ریحانہ
بھی ہوتی تھیں۔ صدر شعبہ کے کمرے میں
بڑے رکھ رکھاؤ سے بیٹھتیں اور وہاں غیر
ادبی گفتگو سے گریز کرتیں۔ کبھی اپنے کسی
ساتھی کے خلاف انھوں نے ایک لفظ نہیں
کہا سب کی اچھائیوں کو اُجاگر کرتیں۔ ہم
سب چھوٹوں کے ساتھ شفقت اور ہمدردی
کا لہجہ اختیار کرتیں۔ مثل مشہور ہے جو
خود بیں ہو وہ خدا بیں نہیں ہو سکتا اپنی

ذات کی نفی کرکے جو عاجزانہ رویہ اختیار کرے گا وہ سر بلند ہو گا یہی وجہ ہے کہ ان میں سب کے دُکھ درد کو سمجھنے کا بے پناہ جذبہ تھا۔ لکچرار ہونے کے بعد وہ اکثر زندگی میں جد و جہد کی تلقین کرتیں اور مثالیں دے دے کر حوصلے بڑھاتیں۔

۱۹۸۵ء میں راقم پر ایک بپتا پڑی تھی۔ میں ۸۲ء سے ذاکر حسین کالج (شبینہ) میں پڑھا رہا تھا۔ اس سال جب مستقل جگہ نکلی تو INTERNAL کینڈیڈیٹ ہونے کی وجہ سے سب کی ہمدردیاں میرے ساتھ تھیں۔ تین مرتبہ انٹرویو ہوا اور ہر دفعہ مزید ایک مہینے کے لیے میرا تقرر عمل میں آجاتا۔ چوتھے انٹرویو میں ایک مشفق نے اتنا بڑا کرم کیا کہ میں سڑک پر آگیا۔ دوسرے دن شعبے میں ڈاکٹر عابدہ سے ملاقات ہوئی تو بے حد افسردہ ہو کر کہنے لگیں "قصور تمھارا نہیں تمھارے کرم فرما کا ہے" میری ڈھارس بندھائی، مجھے یاد ہے میرے کسی اپنے نے شاید اتنا حوصلہ نہیں بڑھایا جتنا ڈاکٹر عابدہ کے ہمدردانہ رویّے نے۔ پھر جب ۸۶ء میں میرا تقرر ستیہ وتی کالج میں ہوگیا تو انھیں حیرت زا مسرت ہوئی۔ اتفاقاً کسی دن یونیورسٹی کے دروازے پر ان سے ملاقات ہوئی بہت مسرور تھیں کہنے لگیں اس کالج میں تمھیں کام کرنے کے زیادہ مواقع ملیں گے۔ تم محنتی ہو بس میری ایک بات کا خاص خیال رکھنا جہاں تک ممکن ہو اپنے طلبا کا خیال رکھنا اور ان کی حوصلہ افزائی کرنا۔ یہ یک وقت وہ بزرگوں کا برتاؤ کرکے نصیحت کرتیں اور ظرافت کی پھلجھڑیاں بھی چھوڑ دیتیں حالانکہ ۸۵ء ہی میں سخت ترین بیماری کی وجہ سے کھتری نرسنگ ہوم میں کافی دن زیر علاج رہ کر واپس آئی تھیں۔ کمزوری بڑھ گئی تھی۔ دسمبر ۸۷ء میں پیٹ میں شدید تکلیف ہوئی۔ ٹانگوں میں درد شروع ہوا اور جوڑ دکھنے لگے تیرتھ رام ہسپتال میں داخل ہوئیں جہاں کچھ دن بعد نہ صرف ڈاکٹروں نے جواب دے دیا بلکہ یہ پیش گوئی بھی کردی کہ یہ تو صرف چند گھنٹوں کی مہمان ہیں۔ مایوس ہو کر فضل صاحب نے پنت اسپتال میں داخل کر دیا جنوری ۸۸ء میں ڈاکٹروں نے پیٹ کا آپریشن کیا (اس کی روداد معجزے کے عنوان سے خود ڈاکٹر عابدہ نے لکھی ہے) تکلیف دُور ہوگئی لیکن رفتہ رفتہ وہ اصلی زندگی کے قریب ہوتی گئیں۔

پروفیسر فضل الحق ستیہ وتی کالج کی گورننگ باڈی کے ممبر ہیں۔ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر کے۔ پی۔ بھٹ ہیں جو نہ صرف نظم و نسق کی صلاحیتوں کے مالک ہیں بلکہ اچھے انسان بھی ہیں۔ بعض امور میں وہ جب بھی فضل صاحب سے مشورہ کرنے جاتے ہیں مجھے بھی اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ فضل صاحب کے گھر میں داخل ہونے کے بعد بھٹ صاحب تو ان سے گفتگو میں مصروف ہو جاتے اور راقم ڈاکٹر عابدہ سے باتیں کرتا رہتا۔ اس بیچ میں وہ خاطر تواضع کا بہت اہتمام کرتیں، بڑی نفاست سے میز سجاتیں۔ اس میں تصنع اور نمائش کا دخل نہ ہوتا بلکہ خلوص ظاہر ہوتا۔ دلّی کی خواتین میں یہ خصوصیت ان کی تربیت کا ایک ایسا جوہر ہے جس کی ہر شخص تعریف کرتا ہے۔ ڈاکٹر بھٹ بھی ان کے سلیقے اور شائستگی سے متاثر ہو کر واپس آتے ہوئے بار بار تعریفی کلمات دہراتے۔ علالت کے باوجود ان کا مزاج کبھی بے ٹھکانے نہیں ہوتا تھا مہمانوں کے آنے سے کبھی سراسیمگی کی کیفیت طاری نہیں ہوتی تھی۔ البتہ ایک خاص تبدیلی ان کی طبیعت کا جز بن گئی تھی وہ یہ کہ بیماری کے موضوع پر بات کرنے سے گریز کرنے لگی تھیں۔ انھی دنوں میں انھوں نے اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالے کو شائع کرانے کا فیصلہ کیا ساتھ ساتھ بکھرے احساس (نثری مجموعہ) کو بھی ترتیب دینے لگیں۔ دسمبر ۱۹۸۸ء میں ان کا مقالہ "اُردو نثر کا ارتقا" شائع ہو کر منظرِ عام پر آیا۔

اُردو زبان و ادب کی مستند تاریخ ایک عرصے سے محققین کی توجہ کی محتاج ہے اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ یہ کسی ایک شخص کے بس کا کام نہیں ہے ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس مشکل ترین کام کو جس لگن اور خوبی سے انجام دیا ہے وہ قابلِ تحسین ہے تین جلدوں کے بعد باقی زیرِ قلم اور زیرِ طبع ہیں۔ رام بابو سکسینہ اور حامد حسن قادری کی تاریخ ادب اُردو اور داستان تاریخ اُردو مکمل نہیں ہیں۔ نثر اور نظم پر الگ الگ تاریخ کی اشد ضرورت تھی۔ عابدہ بیگم کے مقالے سے قبل ۱۹۸۵ء میں ڈاکٹر شہناز انجم (جامعہ ملیہ اسلامیہ) کا مقالہ "ادبی نثر کا ارتقا" شائع ہو چکا ہے انھوں نے مذہبی تصانیف تذکروں اور حکایات کو ادب کے دائرے سے باہر رکھا ہے۔ اس طرح یہ مقالہ بھی مکمل نہیں ہے۔ کیونکہ متذکرہ بالا اصناف میں انسانی افکار کی ترجمانی متوازن اور غیر متوازن انداز میں

ہوئی ہے اور نثر کے ارتقا پر اثر انداز ہوئی
ہے۔ انگریزی کی کوئی تاریخ اٹھا کر دیکھیے
اس میں انجیل مقدس، مذہبی اثرات،
طنز نیز قومی افکار کو بھی ادبی تاریخ کے
تناظر میں پیش کیا جاتا ہے۔ ہم نے اپنی آسانی
کے لیے یہ اصول وضع کر لیے ہیں کہ یہ صنف
ادب میں شامل ہے اور یہ نہیں۔ بہرحال تحقیق
سے سروکار رکھنے والے اسکالرز نے جیسے جیسے
ذخیرۂ ادب کو کھنگالا نئے گوشے اُبھر کر
سامنے آئے جن سے تاریخ ادب اُردو میں
اضافہ ہوا اور ہو رہا ہے۔ غالباً اسی ضرورت
کے تحت ڈاکٹر عابدہ نے "اُردو نثر کا ارتقا" میں
۱۸۰۰ء سے ۱۸۵۷ء تک کا جائزہ پیش
کیا ہے۔

اس مقالے میں جن بنیادی ماخذوں
سے کام لیا گیا ہے ان کی ایک طویل فہرست
ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنفہ نے کسی
اہم اور غیر اہم محقق کو نظر انداز نہیں کیا ہے
سات ابواب میں سے پہلے دو شمالی اور جنوبی
ہند میں ۱۸۰۰ء سے قبل کی نثر پر روشنی ڈالتے
ہیں۔ اس میں حضرت امیر خسرو کی زبان میں
جن بھاشاؤں کی رنگ آمیزی ہے اس کا
جائزہ نہ صرف دلچسپ ہے بلکہ نئے نکات
کی جانب توجہ دلاتا ہے۔ صوفیائے کرام کے
ساتھ ساتھ مغل، خلجی، تغلق، قطب شاہی
سلاطین کی ادب دوستی کا بھی مختصراً ذکر
ہے۔ مصنفہ کا خیال ہے کہ قدیم ادب میں
بے شک نظم کا حصہ زیادہ ہے لیکن نثر کا
دامن بھی محدود نہیں ہے۔ اس عہد کے
نثری سرمایے میں تصوف، اخلاقیات اور
صوفیا کے اقوال کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا
کیوں کہ یہی زبان کی ارتقائی منزلوں کی
نشاندہی کرتے ہیں۔

تیسرے اور چوتھے باب میں فورٹ
ولیم اور دلّی کالج کی خدمات پیش کی گئی
ہیں فورٹ ولیم کالج کے اسلوب کے سلسلے میں
مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ بعض قصے جیسے حیدری
کی آرائشِ محفل کا اندازِ بیان سادہ اور سلیس
ہے یہ دہلی کی زبان ہے لیکن لکھنؤ کے روزمرّہ
اور محاورے سے بھی دامن نہیں بچایا گیا ہے۔
دلّی کالج کے باب میں مشرقی شعبے کو زوال
اور مغربی شعبے کو جو فروغ ملا اس کے اسباب
پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

پانچواں باب انفرادی خدمات کے ذکر
پر مشتمل ہے۔ اداروں پر تو ہمارے ہاں کچھ
کام ہوا بھی ہے لیکن انفرادی خدمات کے
ضمن میں بہت سے اہم کارناموں پر اوّل
تو لکھا نہیں گیا اور اگر کچھ لکھا گیا ہے تو نہایت
مختصر، اس باب میں تفصیل کے ساتھ تجزیہ
بھی شامل ہے۔

چھٹا باب اُردو صحافت پر ہے۔ اس
سے کئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً اس زمانے
میں خبریں جو خطوط کے ذریعے جاتی تھیں ان
کا کیا طریقۂ کار تھا۔ اُردو اخبارات کے ایڈیٹرز
لالہ سدا سکھ، مہتمم پربھو دیال، گو بند
رگھوناتھ اور مسٹر فیلن کی خدمات کو بھی پیشِ
نظر رکھا ہے۔

اختتامیے میں ۵۷ برس کی نثر کو
دو حصوں میں تقسیم کیا ہے ایک مذہبی جس
میں قرآن مجید، احادیث اور تفسیروں کے
تراجم، سیرتِ رسول، سیرت صحابۂ کرام،
دینی مسائل اور اخلاقی موضوعات شامل ہیں
دوسرے میں داستانیں ہیں۔

کیا ہی اچھا ہوتا جو اس مقالے میں
تذکروں اور خطوط پر بھی ایک الگ باب ہوتا۔

فروری ۸۹ء میں ان کی دوسری کتاب
"پیکرِ احساس" کے نام سے شائع ہوئی اس
میں چودہ خاکے ہیں کرداروں کی شخصیت
اور سیرت کے ذکر میں ڈاکٹر عابدہ نے لکھا ہے:

"کرداروں کو جیسا اور جتنا دیکھا
سیدھی سادھی زبان میں پیش کر دیا جھوٹ
اور مبالغے کی آمیزش زیبِ داستان کے
لیے بھی نہیں کی گئی بلکہ کبھی کبھی کرداروں کے
بارے میں سچ بولتے ہوئے بھی قلم کپکپاتا
ہے۔ رفتہ رفتہ شاید ہمت پیدا ہو جائے۔
جن لوگوں کو دیکھا نہیں ان پر لکھنا مشکل
ہوتا ہے اور جن کو دیکھا ہے ان پر لکھنا
اور بھی مشکل۔"

اس اقتباس کو سامنے رکھ کر پیکرِ
احساس کا مطالعہ کیا جائے تو بہت سی
باتیں سامنے آتی ہیں۔ مثال کے طور پر
انھوں نے ہر کردار کو بے نام چھوڑ دیا ہے
اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ خاتون ہونے
کے ناتے انھوں نے اپنے آس پاس کی خواتین
کی مشکلات اور مسائل کو پیشِ نظر رکھا۔
وہ بھی اس خوبصورتی کے ساتھ کہ کہیں بھی
پوری طرح کھل کر درپیش مسئلوں کو الفاظ کا
جامہ نہیں پہنایا۔ ڈاکٹر عابدہ کی سیرت میں
یہ بھی ایک خاص بات تھی کہ وہ سب کچھ
محسوس کرتی تھیں زبان سے کبھی کچھ نہیں کہتی
تھیں۔ لہٰذا انھوں نے "پیکرِ احساس" میں بھی
قارئین کی قوتِ احساس کو ابھارنے کی کوشش
کی ہے۔ "حبیب کی ماں" اور "آپا ثمینہ" میں خواتین

معصومیت کے جو نقشے انھوں نے پیش
، ہیں اس دور میں شاذ و نادر ہی دیکھنے ہیں
ہیں گے ۔ نئی تہذیب سے یہ واقف ہوں یا
ہوں مگر یہ جانتی ہیں کہ یہ زمانہ خود غرضی
، چالاکی میں گھر کر تنزل کا شکار ہے ۔ لیکن
ں سیرت میں سادگی اور پاکدامنی کی بدولت
گھریلو زندگی میں خوش ہیں کیوں کہ خاندان
دیگر افراد ان کو گھر کی ذمّے داریوں کو ہر حالت
، پورا کرتے ہوئے دیکھ رہے ہیں MAN
DOMINATING SOCI میں بھرتے
ہرنے کا انداز لیے یہ زندگی کے ہر زہر
خاموشی پی جاتی ہیں ۔ گھر کی چار دیواری
کے لیے فردوس اور روٹی کپڑا ان کی
دی ضروریات ۔ اچھے اور بُرے دن ان کی
گی کی داستان ہیں لیکن ہمّت اور استقلال
ہمارے بُرے دنوں کو گزارتی اور اچھے
ں کو یاد کر کے خوش ہوتی ہیں ۔ شاید
ان کا مقدر ہے ۔ ان کرداروں کو آپ
تو توہم پرست ، ان پڑھ کہہ سکتے ہیں لیکن
کے اندر چھپی ہوئی انسانیت ، ایثار ،
ردی اور سخاوت آپ کے دلوں کو بھی موہ
ی نہ چاہتے ہوئے بھی آپ ان کی جانب
تے چلے جائیں گے اور دل میں ان سے ملنے
منا پیدا ہو جائے گی ۔ یہ ایسی عورتیں ہیں
صرف اپنے لیے بلکہ سب کے لیے جیتی
چھا سوچتی ہیں ۔ کسی کی دل آزاری ان
ن ہی نہیں ہے ۔ ان کی پسند اور ناپسند
اپنے معیار ہیں جو خاندانی شرافت اور
سے جڑے ہوئے ہیں ۔ وقت تو اچھا ہو
آتا ہے اور گزر جاتا ہے لیکن جو کچھ اپنے
چھوڑ جاتا ہے وہ ان دنوں کی یادیں ہیں جو

ان کرداروں کو نئی قوت اور زندہ رہنے کا
حوصلہ عطا کرتی تھیں ۔ گذشتہ دنوں اُردو
اکادمی دہلی کے زیرِ اہتمام دو سیمیناروں میں
جو خاکے پیش کیے گئے تھے ان میں بیگم تیمور
جہاں ، چچی ، بہو ، امّاں اور صدیقہ قدوائی میں
جو صفات اور انسانی اقدار پیش کی گئی ہیں
"پیکرِ احساس" کا ہر کردار ہو بہو انھی خصوصیات
کا حامل نظر آئے گا ۔ "پیکرِ احساس" کے
کردار دِلّی کی پُرانی بوسیدہ گلیوں کے
پروردہ ضرور ہیں مگر انسانیت میں بہت
اعلیٰ ہیں جو حق اور فرض میں ثانی الذکر کو
مقدم مانتے ہیں یہ مسلّمہ اصول ہے کہ فرض
سے غافل رہ کر کوئی بھی حق کا مطالبہ نہیں کر سکتا ۔
ویسے بھی ہمارے معاشرے میں فرض شناس
کو نہ صرف عزّت کی نگاہوں سے دیکھا
جاتا ہے بلکہ ان کا احترام بھی کیا جاتا ہے ۔
مارچ ۱۹۸۹ء میں عابدہ بیگم کی
طبیعت پھر خراب ہوئی تو انھیں ارون
اسپتال میں داخل کرا دیا گیا ، اپریل میں
جب حالت مزید بگڑنے لگی تو گنگا رام
اسپتال میں لے جایا گیا وہاں ۲۴ مئی تک
زیرِ علاج رہیں بہتر سے بہتر دوائیں دی گئیں ۔
بیماری میں دوا اس لیے پی جاتی ہے کہ مرض
دور ہو جائے ۔ دوا پی کر بھی افاقہ نہ ہو تو
یہی کہا جائے گا کہ دوا پینا بیکار ہے لیکن
وہ صابر بندی خدا کی مشیّت پر ایمان
رکھتی تھیں اور اس کی مرضی کے مطابق عمل
کرتی تھیں ۔ ان کا ایمان تھا کہ اللہ کی رضا
کے خلاف چلیں گی تو یہ رب العالمین سے
بغاوت ہوگی ۔ وہ قوتِ ضبط سے کام لیتی رہیں ۔
۲۵ مئی کو ڈاکٹروں نے ان کے ٹھیک ہونے کا

اعلان کر دیا ڈاکٹروں نے فضل صاحب سے
کہا کہ اب فکر کی کوئی بات نہیں انھیں گھر لے
جائیں ۔ فضل صاحب کی ایک عادت ہے کہ وہ
بیشتر باتوں کو سنتے ہی پہلے 'نہیں' کہہ دیتے ہیں ۔
اس روز بھی انھوں نے کہا نہیں ابھی ایک دو
روز اور آرام کرنے دیں ۔ اُسی شام تین بجے
ان کے خون کا دوران اتنا کم ہو گیا کہ سانس لینا بھی
ان کے لیے مشکل تھا ۔ ڈاکٹر ایمرجنسی میں لے
جا رہے تھے تو اس وقت ڈاکٹر عابدہ نے اپنے شوہر سے
کہا آپ کو پریشان ہوتے ہوئے مسلسل آٹھ سال
ہو گئے گھبرایئے نہیں اب یہ پریشانی دور ہو جائے گی ۔
پریشانی تو کیا دُور ہوتی وہ اتنی دُور چلی گئیں
جہاں سے کوئی واپس آیا ہے نہ آئے گا ۔ شام
کو مرحومہ کا جسد خاکی ان کے آبائی مکان میں
لایا گیا ۔ ۲۵ ، ۲۶ اور ۲۷ مئی ۱۹۸۹ء کو
آل انڈیا اُردو یونیورسٹی ٹیچرز ایسوسی ایشن کی
اندور میں کانفرنس تھی ۔ ہندوستان بھر کے
اُردو اساتذہ کے ساتھ راقم بھی ، شبِ مالوہ میں
اُردو کے مستقبل کے بارے میں جو باتیں ہو رہی
تھیں ان میں محو تھا ۔ اِدھر شعبۂ اُردو دہلی یونیورسٹی
کی یہ ستارہ جیسی شخصیت عزیز و اقارب ، اساتذہ
اور طلبا کے کاندھوں پر آخری سفر کے لیے روانہ
ہو رہی تھی ۔ افسوس صد افسوس ۔
ڈاکٹر عابدہ کو بی ۔ اے (آنرز)
میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے پر دہلی
یونیورسٹی کا غالب پرائز دیا گیا تھا پھر
ساہتیہ کلا پریشد دہلی ایڈمنسٹریشن کی
جانب سے ایک اور انعام دیا گیا ۔ اُردو
اکادمی ، دہلی نے ان کی کتاب "اُردو نثر کا
ارتقا" پر انھیں پہلا انعام دیا تھا ۔

OO

نظمیں

خواب

میں نے بھیجیں بند لفافے میں سورج کی کرنیں
کچھ خوشیاں
کچھ خوشبوئیں
کچھ موسم کے تھے رنگ
لیکن!
آج جواب میں آئے راتوں کے اندھیارے
کچھ یادوں کے شول تھے
سوکھے پھول تھے
میلا موسم بھی تھا سنگ

نیچر

لوگ اپنے لانوں میں
آج
پھول کے بدلے
قسم قسم کے کتنے کیکٹس لگاتے ہیں
اور
کیکٹس جیسی ہیں ہماری تہذیبیں
ہم مزاج میں بالکل کیکٹس سے لگتے ہیں
دیکھنے میں اچھے ہیں
پھر بھی کتنا چبھتے ہیں

ملکہ نسیم

۱۲/ ایف، فوریسٹ کالونی، چار املی، بھوپال ۴۶۲۰۱۶

وہ جو پیشانی پہ پڑھ لے حالِ دل کا کون ہے
ہم اکیلے ہیں یہاں اپنا شناسا کون ہے

آب جو ہوں میں چلو میری حقیقت کم سہی
وقت اِک دن یہ بھی طے کر دے گا دریا کون ہے

ہم کو ہے ہر شام کچھ شمعیں جلا لینے کا شوق
کس کو فرصت ہے، یہاں آنے کی، آتا کون ہے

اُنگلیاں چلتے ہوئے ماتھے پہ رکھ دیتا ہے کون
سامنے آتا نہیں میرا مسیحا کون ہے

حالِ دل سب پوچھتے ہیں ہم بتا دیتے ہیں شانؔ
اپنے دل کی کیفیت لیکن سمجھتا کون ہے

سیدہ شانِ معراج

تارین گلی، شاہ جہاں پور (یو۔پی)
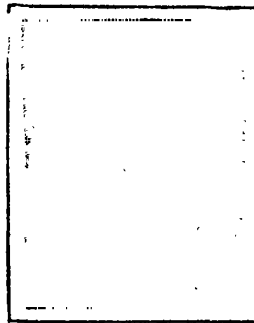
محسوس ہو رہا ہے کہ دُنیا سمٹ گئی
میری پسند کتنے ہی خانوں میں بٹ گئی

تنہائیوں کی برف پگھلتی نہیں ہنوز
وعدوں کے اعتبار کی بھی دھوپ چھٹ گئی

ہم نے وفا نبھائی بڑی تمکنت کے ساتھ
اپنے ہی دم پہ زندہ رہے عمر کٹ گئی

دورِ خرد وہ دورِ خرد ہے کہ کیا کہیں
قیمت بڑھی ہے فن کی مگر قدر گھٹ گئی

ثروتؔ ہر ایک رُت میں لپیٹے رہی جسے
وہ نامراد اُس کی چادر بھی پھٹ گئی

نور جہاں ثروت

وائی۔۲، نوین شاہدرہ، دہلی

نئی مطبوعات

منٹو نامہ

مصنف: جگدیش چندر ودھاون
صفحات: ۵۱۹
قیمت: ۱۸۰ روپے
سال اشاعت: ۱۹۸۹ء
ناشر: "مصنف" ۱۶۲ مکرجی نگر ایسٹ، دہلی ۱۱۰۰۰۹

"منٹو نامہ" کے مندرجات کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

۱۔ پیش لفظ: پروفیسر قمر رئیس، گفتنی: جناب جگدیش چندر ودھاون۔
۲۔ حیات: منٹو کی مختصر سوانح حیات (اسلاف، ولادت، ذات، ابتدائی تعلیم، بمبئی میں قیام، ہجرت پاکستان، وفات)۔
۳۔ شخصیت: (ناک نقشہ، لباس، خوراک، گالی دینے کی عادت، حاضر دماغ، صحت، عشق، شادی خانہ آبادی، نفاست پسندی، لوک گیتوں سے محبت، رند بلانوش، مقدمات کی روداد)۔
۴۔ فن (فن کے تین ادوار، تخلیقی اسلوب اور طریقہ کار، مرقع نگاری، مکتوبات، طنز و مزاح)۔
۵۔ اہم افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ: (بابو گوپی ناتھ، ممد بھائی، سہائے، ممی، شاردا، موذیل، ہتک، خوشیا، نیا قانون، نعرہ، شغل، بانجھ، ڈرپوک، سڑک کے کنارے، ٹوبہ ٹیک سنگھ، کالی شلوار، دھواں، بو، ٹھنڈا گوشت، کھول دو، بغیر عنوان کے)۔
۶۔ کتابیات۔

سعادت حسن منٹو کے فن اور شخصیت کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس کا اندازہ زیر تبصرہ کتاب میں شامل کتابیات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ جگدیش چندر ودھاون کی تصنیف کی کچھ خصوصیات البتہ ایسی ہیں جو اسے اس نوع کی دیگر تحریروں سے منفرد انداز سے ممتاز کرتی ہیں۔ سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک غیر مکتبی، غیر پیشہ ور صاحب نظر منٹو دوست کی تحریر ہے۔ جگدیش چندر ودھاون عمر کی اس منزل پر ہیں جب ہمارے سماج میں رہنے والا شریف شہری، یا تو اپنی روزمرّہ کی ناآسودگیوں اور خرابی طبیعت کی تفصیلات کا میزان تیار کرنے میں مصروف رہتا ہے یا پھر ذہنی اور جذباتی طور پر بنجر خود مرکزیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ جگدیش چندر ودھاون کی تصنیف سے واضح طور پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خدا کے فضل سے ان دونوں خطرات سے محفوظ رہنے میں کامیاب رہے ہیں۔ اور ایک معروضی طریق کار کی مدد سے منٹو کے فن اور شخصیت کا بھرپور، دلآویز، فکر انگیز منظر نامہ پیش کر سکے ہیں۔ زیر تبصرہ تصنیف اس بات کی بھی غماز ہے کہ جگدیش چندر ودھاون کا اسلوب نگارش غیر رسمی ہونے کی وجہ سے "تلمیحاتی بار گراں" اور "تنقیدی تزئین و آرائش" سے پاک ہے اور ترسیل کے مراحل بہ صد خوبی و کامرانی طے کرتا ہے۔

منٹو کے فن کی تنقید کی سب سے بڑی خرابی یہ رہی ہے کہ منٹو کے نقادوں نے منٹو کے فن کا جائزہ لیتے ہوئے منٹو کے فن اور سوانحی تفصیلات کو گڈمڈ کر دیا ہے جگدیش چندر ودھاون نے بجا طور پر اس غلط طریق کار کی جانب اشارہ کیا ہے۔ اور ٹھیک منٹو ہی کی طرح منٹو کے فن کی گہرائیوں سے گوشت پوست کا ایک انسان دریافت کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ منٹو کے مرکزی کردار مرد اور عورت دونوں سماجی نقطۂ نظر سے اکثر اوقات "بدکردار"، "عیّاش" اور "آلودہ" ہوتے ہیں۔ منٹو کی انسان دوستی اور ذہنی اور جذباتی کشادگی کا ثبوت یہ ہے کہ منٹو ان کی "فرشتہ خصلتی" کا جویا ہے۔ جگدیش چندر ودھاون کے تمام تر تجزیے اسی انسان دوست فنکار کی کامیابی کا جشن مناتے ہیں۔

ترقی پسند ادیبوں کی جانب سے منٹو کے تئیں بے اعتنائی، منافق رویہ، منٹو کے خلاف فحاشی کے بے پناہ الزامات پر مبنی مقدمے، سرکاری سطح پر پاکستان میں ان کے ساتھ غیر ہمدردانہ سلوک۔ یہ سب باتیں ادبی تاریخ کا حصہ بن چکی ہیں۔ جگدیش چندر ودھاون نے اس بات کا بھی تفصیل سے

ذکر کیا ہے۔

منٹو کی خاکہ نگاری پنجابی لوک گیتوں اور بولیوں سے ان کی گہری دلچسپی، منٹو کی شخصیت کے یہ دو پہلو ایسے ہیں جن کی طرف اب تک نسبتاً کم توجہ دی گئی ہے۔ جگدیش چندر ودھاون کی تصنیف نے اس کمی کو بھی بخوبی پورا کر دیا ہے۔

'منٹو نامہ' منٹو کے فن اور شخصیت پر بلاشبہ ایک بھرپور دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ جگدیش چندر ودھاون بجا طور پر اس خوبصورت اور کامیاب تصنیف کے لیے مبارکباد کے مستحق ہیں۔

یہ کتاب اُردو اکادمی، دہلی کے تعاون سے شائع ہوئی ہے۔

لوہ سوں کے شاہکار افسانے

مترجم اور ناشر: ارشد مسعود ہاشمی
صفحات: ۱۳۴
قیمت: ۸۰ روپے
سالِ اشاعت: ۱۹۸۹ء
تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

لوہ سوں کا جنم ۱۸۸۱ء میں چین کے صوبہ چیکیانگ میں شاؤسنگ کے مقام پر ہوا۔ ان کا پہلا افسانہ "ایک پاگل کا روزنامچہ" ۱۹۱۸ء میں شائع ہوا۔ لوہ سوں عمر بھر چین کی انقلابی تحریک کے ساتھ کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم کارکن کی حیثیت سے وابستہ رہے۔ اور اس کی کامیابی کے لیے نمایاں رول ادا کیا۔ لوہ سوں کی تصانیف میں افسانوں کے تین مجموعوں (WANDERING, CALL TO ARMS, OLD TALES RETOLD) اور مضامین کے ۱۶ مجموعوں کے علاوہ روسی مصنفین کے اہم ناولوں کے تراجم بھی شامل ہیں۔ انھوں نے قدیم چینی ادب کے کچھ اہم کارناموں کی ترتیب و تدوین بھی کی اور چینی ناول کی ایک مختصر تاریخ بھی لکھی۔ ایک باعمل بھرپور زندگی گزارنے کے بعد ۱۹۳۶ء میں انھوں نے وفات پائی۔

ارشد مسعود ہاشمی کے تراجم کی جو خوبی انھیں دیگر اُردو تراجم سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ارشد مسعود نے یہ سب تراجم انگریزی زبان میں کیے گئے تراجم کی مدد سے اُردو زبان میں کرنے کے بجائے براہِ راست چینی زبان سے کیے ہیں۔ اور چینی زبان و ادب سے وابستہ کچھ دوستوں کی رہنمائی سے بقدر ضرورت استفادہ کیا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب میں "نقش سر تحریر" اور "منہاج فکر و فن" کے عنوان سے شامل دو تعارفی مضامین کے علاوہ لوہ سوں کے چھ مشہور افسانے (ایک پاگل کا روزنامچہ، کانگ ای چھی، دوا، نئی صبح، سفید روشنی، ماضی کا رنج) بھی شامل ہیں۔ تعارفی مضامین لوہ سوں کی ادبی حیثیت، فن کے تجزیے، تقابلی مطالعے اور ترجمے کے مسائل سے متعلق ہیں اور بڑے واضح انداز میں تمام مسائل کا احاطہ کرتے ہیں۔

لوہ سوں کا بیسویں صدی کے چینی ادب میں بڑا اہم مقام ہے اور زیر تبصرہ کتاب میں شامل افسانوں کا شمار ان کے نمائندہ افسانوں میں ہوتا ہے۔ "ایک پاگل کا روزنامچہ" اور "دوا" جاگیردارانہ نظام کے خلاف بغاوت اور جذبۂ انقلاب کے افسانے ہیں۔ دیگر افسانے بھی چینی معاشرے اور سماجی تبدیلیوں کے مختلف پہلوؤں سے متعلق ہیں۔

ارشد مسعود ہاشمی کا ترجمہ ہر قسم کے تصنع اور لسانی کھردرے پن سے پاک ہے ترجمے کی زبان سلیس، آسان اور فطری روانی کا حسن لیے ہوتے ہے۔

دیگر زبانوں کے ادب کو ترجمے کی وساطت سے اُردو زبان میں پیش کرنے کی فعال روایت ہمارے یہاں ایک طویل سلسلے پر پھیلی ہوئی ہے۔ "لوہ سوں کے شاہکار افسانے" کی شکل میں ارشد مسعود ہاشمی کی تازہ ترین کوشش ہر لحاظ سے لائق تحسین ہے۔

کتاب بہار اُردو اکادمی کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔

—— بلراج کومل

آزادی کے بعد دہلی میں اُردو غزل

مرتب: پروفیسر عنوان چشتی
صفحات: ۳۸۴
قیمت: ۴۱ روپے
ناشر: اُردو اکادمی، دہلی۔ گھٹا مسجد روڈ۔ دریا گنج۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

"آزادی کے بعد دہلی میں اُردو غزل" پروفیسر عنوان چشتی کی مرتب کردہ کتاب ہے۔ جس میں ۸۱ شعرا کی غزلوں کا انتخاب شامل ہے۔ اس انتخاب سے دہلی کے

مزاجِ غزل کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ اور شاعروں کے اسلوبِ شعر کے علاوہ دہلی میں اُردو غزل کے ارتقا کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ بقولِ مرتب:

"ایک طرف انتخاب در انتخاب کے اصول پر عمل کرنا پڑا، اور دوسری طرف دہلی کے شاعروں کی خاص تعداد کو نمائندگی دینے کا اصول بھی مدّنظر رکھا۔ اس لیے انتخاب کے پس پردہ معیار اور نمائندگی دونوں محرکات کارفرما ہیں۔"

(مقدمہ، ص ۳۲)

مقدمے میں پروفیسر عنوان چشتی نے آزادی کے بعد دہلی میں اُردو غزل کے اہم رجحانات کا تجزیہ کیا ہے۔ انھوں نے دہلی کی سیاسی اور ثقافتی اہمیت پر روشنی ڈالنے کے بعد جن رجحانات کی نشاندہی کی ہے، ان میں کلاسیکی اور نو کلاسیکی رجحان، فکری رجحان، ترقی پسند رجحان اور جدید رجحان کا جائزہ لیا گیا ہے۔

آزادی کے بعد دہلی کی اُردو غزل نے ادب اور سماج نیز تہذیب و ثقافت کے اثرات قبول کیے ہیں۔ مگر اپنے مزاج کی انفرادیت کو برقرار رکھا ہے۔ جیسا کہ پروفیسر عنوان چشتی نے ترقی پسند رجحان کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ترقی پسندی کے نظریات کی چھوٹ ادب کے دوسرے شعبوں کے ساتھ غزل پر بھی پڑی ہے، لیکن غزل کا اپنا ایک مخصوص مزاج ہے۔ اس کے اپنے مخصوص فنی اور جمالیاتی تقاضے ہیں۔ اس لیے غزل نے برہنہ ترقی پسندی اور نظریاتی جبر کے تصور کو رد کر کے ایک مہذب اور متوازن اندازِ فکر کو قبول کیا ہے۔ اُردو غزل میں یہ کس بل ایک طرف ترقی پسند نظریات سے آیا ہے۔ اور دوسری طرف اُن اخلاقی اور روحانی تحریکوں کی دین بھی ہے، جو ہر اندھیرے اور آندھی کے رُخ پر چراغ رکھنے پر اصرار کرتی ہیں۔"

(ص ۲۴)

متذکرہ بالا اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دہلی میں آزادی کے بعد کی غزل نے ترقی پسند رجحان کے عناصر کو قبول کیا ہے مگر ردّ و قبول کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد۔ اور اُن عناصر کو روحانی اور اخلاقی اقدار سے آمیز کر کے ایک نیا رنگ روپ عطا کیا ہے۔ میں یہ کہنا چاہوں گا کہ دہلی کی غزل میں ترقی پسند عناصر تو ملتے ہیں مگر کوئی نمایاں یا طاقتور رجحان نہیں ملتا۔ اور جس انداز کی ترقی پسندی دہلی کے بعض ترقی پسند غزل گویوں کے یہاں مل جاتی ہے۔ اس نوع کا رنگ و آہنگ جدید شاعروں کے یہاں بھی موجود ہے، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ دہلی کی غزل نے رجائیت، کس بل اور تنقیدِ حیات کا شعور اپنے دَور سے حاصل کیا ہے، محض ترقی پسند نظریہ اس کا محرک نہیں ہے۔

آزادی کے بعد کی دہلی کی اُردو غزل میں جدیدیت کا رجحان بھی ملتا ہے۔ پروفیسر عنوان چشتی نے جدیدیت کے رجحان کا تجزیہ کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

"جدیدیت نے جو مُثبت کام کیا ہے وہ ایک طرف کلاسیکی اصولوں کو لچک دار بنانے کا ہے، اور دوسری طرف ترقی پسندی کی نظریاتی آمریت سے ادب کو نجات دلانے کا ہے۔ جدید شاعروں نے موضوعات کی سطح پر شاعری کا دائرہ وسیع کیا ہے۔ انھوں نے زندگی کے ہر منظر اور ہر مظہر کو شاعری کا محور قرار دیا ہے، انسان کی سائیکی اور اس کی داخلی زندگی کے ہنگاموں اور کیفیتوں کو خاص طور پر شاعری کا سرچشمہ قرار دیا ہے۔ اس طرح جدیدیت نے غزل کے اسلوب کو خاص طور پر متاثر کیا ہے۔"

(ص ۲۷)

مرتب نے صحیح تجزیہ کیا ہے کہ جدیدیت کے رجحان نے کلاسیکی اصولوں کو لچک دار بنانے کا کام کیا ہے۔ اس کام میں بعض جدید شاعروں نے زبان و بیان کی شکست و ریخت بھی کی ہے۔ جدید غزل گویوں میں ایک طرف مظفر حنفی، مخمور سعیدی، بانی، راج نرائن راز اور کچھ دوسرے شعرا ہیں جنھوں نے واقعی کلاسیکی اصولوں کو لچک دار بنایا ہے۔ بہ الفاظِ دیگر توسیعِ روایت کا کام کیا ہے۔ دوسری طرف ایسے شعرا بھی ہیں، جنھوں نے جدیدیت کے جوش میں زبان کی شکست و ریخت کی ہے۔ کونسا رویّہ زیادہ صحیح تھا اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔ لیکن بادی النظر میں زبان و بیان سے کھلواڑ کا کوئی جواز نظر نہیں آتا۔ چونکہ مرتب نے عام طور پر ایسے اشعار کو حذف کر دیا ہے۔ اس لیے اس کتاب کی بنیاد پر اس رویّے پر کوئی واضح رائے نہیں دی جاسکتی۔ جہاں تک جدید غزل کے معنوی پہلو کا تعلق ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ جدید شاعروں نے غزل کو

کوچۂ محبوب سے نکال کر، گھر آنگن، شہر
کی سڑکوں اور زندگی کی داخلی کائنات کے
نہاں گوشوں تک پہنچا دیا ہے۔ اس ضمن میں
چند اشعار پیش کرتا ہوں:

اِک لاپتہ سے شہر کا جیسے ہوں در دہم
کچھ رنگ ہی عجیب ہماری صدا کا ہے
—— من موہن تلخ

جگ مگ کرتی ساری بستی آج دھوئیں کی دلدل ہے
شعلہ بکف آندھی نے چاروں طرف برسائی آگ
—— مخمور سعیدی

جانے یہ کس کی بنائی ہوئی تصویریں ہیں
تاج سر پر ہیں مگر پاؤں میں زنجیریں ہیں
—— امیر قزلباش

تھا شہرِ تصوّر میں عجب خوف کا عالم
تشبیہ بھی لفظوں کے دریچے سے نہ جھانکی
—— شجاع خاور

اوّل و آخر، ظاہر و باطن اللہ ھو
میرا ہونا اور نہ ہونا تیرے نام
—— عنوان چشتی

ان اشعار کے مطالعے سے یہ بھی
ظاہر ہوتا ہے کہ جدیدیت کے رجحان میں
اگر ایک طرف کلاسیکی اندازِ غزل ملتا
ہے، تو دوسری طرف رمزیت کا نیا انداز اور
تخلیقی زبان کے نئے عناصر بھی دکھائی
دیتے ہیں۔

"آزادی کے بعد دہلی میں اُردو
غزل" ایک ایسا جام جہاں نما ہے،
جس میں ہر رنگ کے جلوے بے نقاب
نظر آتے ہیں۔ اور ہر شاعر کا کلام دعوتِ
فکر و نظر دیتا ہے۔ نیز قارئین کے ذہنوں
پر نئے تخلیقی تجربوں کا انکشاف کرتا ہے۔
یہ کتاب کتابت اور طباعت کا بہترین
نمونہ ہے۔ دل کش گرد پوش سے مزین
ہے اور اعلیٰ کاغذ پر شائع ہوئی ہے۔
وہ لوگ جو آزادی کے بعد دہلی میں اُردو
غزل کی سمت و رفتار کا کم وقت میں اندازہ
کرنا چاہیں ان کے لیے یہ کتاب ایک
نادر تحفہ ہے۔

—— نعیم الدین رضوی

ہندوستانی اقتصادی مسائل

مصنّف: سید ساجد علی ٹونکی
صفحات: ۱۴۴
قیمت: ۲۵ روپے
ناشر و تقسیم کار: (۱) سید ارشاد علی، ۲۲۱۷ء، نیا محلہ، دہلی ۱۱۰۰۰۶۔
(۲) علی پبلی کیشنز، علی منزل، محلہ رجبن، ٹونک ۳۰۴۰۰۱ (راجستھان)

ادب کی تخلیق، تفہیم اور تنقید اکہرا
عمل نہیں ہے۔ بلکہ وہ تمام سماجی علوم
جو انسانی زندگیوں کو متاثر کرتے ہیں ادب
کی سمت و رفتار بھی متعیّن کرتے ہیں۔ یہی وجہ
ہے کہ ادب کا ہر طالب علم ان علوم کے
حصول کو ضروری سمجھتا ہے لیکن گذشتہ چند
دہائیوں سے اُردو میں ان علوم پر کتابوں
کی اشاعت کا تناسب کم رہا ہے۔ جس
کی وجہ سے اُردو کے عام قاری اور نوجوان
مصنفین کو یہ شکایت ہونے لگی ہے:
"اُردو اور دیگر دیسی زبانوں میں
سب سے اہم فرق یہ ہے کہ اُردو کی تقریباً
۹۵ فیصد کتب شعر و ادب یا مذہبی امور
پر لکھی گئی ہیں اور صرف ۵ فیصد د
مضامین پر۔ اس کے برعکس دُنیا کی دو
عالمی زبانوں میں شعر و ادب یا مذہب
پر ۵ فیصد اور بقیہ دیگر علوم مثلاً سا
اقتصادیات، فلسفہ، تاریخ، جغرافیہ
سیاسیات اور نفسیات پر لکھی گئی
ایسا کیوں ہوا۔ کیا دنیا کی دوسری زبا
غلط راہ پر گامزن ہیں۔ یا پھر ہما
زبان ابھی سن بلوغ کو نہیں پہنچ
ہے۔"

خوشی کی بات ہے کہ سید سا
علی ٹونکی صاحب نے اپنے ضمیر کی آ
اور اس ضرورت کو محسوس کر
ہوئے اقتصادیات جیسے اہم موضوع
یہ کتاب لکھ کر اہلِ علم و ادب کی توجہ ا
طرف مبذول کرائی ہے۔

علم اقتصادیات ایسا موضوع
جس کے بغیر زندگی کی گاڑی ایک
بھی نہیں چل سکتی۔ اس علم کے بغیر آ
گھسٹ تو سکتا ہے لیکن اپنے پیروں
کھڑے ہوکر باعزّت زندگی نہیں گزار
اور ملکی اور سماجی اقتصادیات جو فرد
کی معاشی حالت کا ہی تعین نہیں کرتی ب
تہذیب و معاشرت، رسم و رواج، رہن
لباس، وضع قطع اور ذہنی و جسمانی سا
پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ جس کا علم
پر انسان تنکے کی طرح سمندر میں بہتا
ہے۔ اس اہم موضوع پر اُردو میں یہ ک
نعمت غیر مترقبہ معلوم ہوتی ہے۔ جس
ہندوستانی اقتصادی مسائل کو مخصوص
میں الجھائے بغیر اختصار کے ساتھ سیدھے سا

لیکن جامع انداز میں اس طرح پیش کر دیا
ہے کہ ہر وہ شخص جو تھوڑی بہت بھی شدبد
رکھتا ہے اس سے بخوبی استفادہ کر سکتا ہے۔

اس کتاب کے اگرچہ اہم موضوعات
کثیر آبادی، بے روزگاری، مہنگائی، خوراک
کا مسئلہ، صنعتی مسائل، بیرونی قرض، زرعی
مسائل، بدعنوانی، دولت کی غیر مساوی تقسیم،
غریبی اور فرقہ وارانہ زہر ہیں۔ لیکن ان کے
علاوہ بھی ایسے کتنے ہی ضمنی و ذیلی اہم مسائل
اس کتاب میں زیر بحث آئے ہیں جن کا علم
روزمرہ کی زندگی کے لیے اور ارد گرد پھیلے
ہوئے سماجی و معاشی تانے بانے کو سمجھنے
کے لیے ضروری ہے۔ یہ تصنیف صرف معلومات
ہی فراہم نہیں کرتی بلکہ عمل کی ترغیب بھی
دلاتی ہے جس میں انفرادی اور اجتماعی اصلاح
کا پہلو بھی شامل ہے۔

دولت کی غیر مساوی تقسیم، غیر ترقی
یافتہ ممالک کے مسائل، اشیائے خوردنی
کا بحران، زراعتی اور صنعتی مزدوروں کے
مسائل اور ان کی سلجھے داری پر زور دیا
گیا ہے۔ اس کے علاوہ ملک کی اہم اور بنیادی
صنعتوں مثلاً کپڑے، جوٹ، لوہے، فولاد،
کھاد، سیمنٹ، کاغذ، مشینی پرزوں
بجلی کے بھاری سامان کے بارے
تفصیلات فراہم کی گئی ہیں۔ اس کتاب
باب ہے "رشوت۔ فرد کے لیے
ملک کے لیے زحمت" ساجد صاحب
موضوع کا تاریخ کے پس منظر
جائزہ لیتے ہوئے ملک اور سماج میں
کے بھیانک اور دوررس نتائج کی
رہی کی ہے اور اس کی مختلف اقسام
رشوت، جبری اور خود اختیاری وغیرہ
کا بھی ذکر کیا ہے۔

یہ کتاب اگرچہ فروری ۹۰ء میں
شائع ہوئی ہے لیکن مصنف نے اس میں
دسمبر ۸۹ء تک کی ضروری معلومات
بھی جمع کر دی ہے۔ یہ کتاب ہندوستانی
اقتصادی مسائل کے ابتدائی اور بنیادی
خاکے کی حیثیت رکھتی ہے جس کے لیے سید
ساجد علی ٹونکی صاحب مبارکباد کے مستحق
ہیں۔ امید ہے کہ ان کی یہ کوشش اردو داں
حلقوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھی جائے گی
اور ساجد علی صاحب اس موضوع پر
اپنے کام کو جاری رکھیں گے۔ طباعت اور
کتابت کے اعتبار سے بھی یہ کتاب
صاف ستھری ہے اور قیمت بھی مناسب ہے۔

——— عظیم الشان صدیقی

ورفعنا لک ذکرک (نعتیہ کلام)
شاعر: ابرار کرتپوری
قیمت: ۶۵ روپے
ملنے کا پتا: مرکز علم و دانش، ۹۳ء،
بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی ۱۳۔

"ورفعنا لک ذکرک" ابرار کرتپوری
کے نعتیہ کلام کا مجموعہ ہے۔ یوں تو
نعتیہ کلام کے مجموعے اکثر شائع
ہوتے رہتے ہیں لیکن اس مجموعے
کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں
شاعر کے نعتیہ کلام کے علاوہ نعتیہ
شاعری کی مختصر سی تاریخ کے ساتھ
عربی اور فارسی کے اہم شعرا کے
نعتیہ کلام کے نمونے بھی دیے گئے
ہیں۔ مثلاً خاندان انصار کی لڑکیوں
کے استقبالیہ اشعار حضرت ابو طالبؓ،
حضرت حمزہؓ، حضرت عبداللہ بن رواحہؓ،
حضرت عباسؓ، حضرت ابو بکر صدیقؓ،
حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ،
حضرت علی مرتضیٰؓ، حضرت
فاطمۃ الزہراؓ وغیرہ کے عربی
نعتیہ کلام کے نمونے اس کتاب میں موجود
ہیں۔

نعت کا فن دیکھنے میں آسان
لگتا ہے لیکن دراصل یہ ایک مشکل ترین
فن ہے۔ بقول شاہ معین الدین ندوی
نعت گو شاعر کا صاحب بصیرت
ہونا لازم ہے۔ ابرار کرتپوری کے
نعتیہ کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد
آپ یقیناً اس نتیجہ پر پہنچیں گے
کہ انھوں نے عقیدت اور فن دونوں
کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے
کی کامیاب کوشش کی ہے۔ چند نمونے
دیکھیے:

مرے حضور حسیں انقلاب لائے تھے
اسی کا نور ہر اک دل میں ڈال دے یارب

مہک سے ذکر کی ہر شعر پھول ہو جائے
ادب کے ساتھ ثنائے رسول ہو جائے

میری حسرت ہے کہ میں شہر مدینہ دیکھوں
پاک دھرتی پہ سماوات کا نقشہ دیکھوں

ابرار کرتپوری ایک خوش ذوق
(بقیہ صفحہ ۵۸ پر)

اُردو خبر نامہ

بزرگ شعرا کا سالانہ مشاعرہ

اُردو اکادمی دہلی کی جانب سے حسبِ سابق، بزرگ شعرا کا مشاعرہ، بتاریخ ۲۲ مارچ ۱۹۹۰ء زیرِ صدارت پروفیسر آل احمد سرور، پیارے لال بھون نئی دہلی میں منعقد ہوا۔ اس ادبی تقریب میں سابق صدر جمہوریہ ہند گیانی ذیل سنگھ بحیثیت مہمانِ خصوصی شریک تھے۔ انھی نے شمعِ محفل روشن کی جس کے فوراً بعد مشاعرہ شروع ہوگیا۔ اتفاق کی بات ہے کہ ۲۲ مارچ کو دہلی میں تین آل انڈیا مشاعرے منعقد ہوئے تھے تینوں مشاعروں کا وقت بھی ایک ہی تھا۔ اطلاع کے مطابق تینوں مشاعرے کامیاب رہے۔ ٹمٹماتے چراغوں کی مدھم روشنی نے بھی کافی پروانوں کو اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا۔ شرکت کرنے والے شعرا کے اسمائے گرامی تھے۔ پروفیسر آل احمد سرور، کیف بھوپالی، ساحر ہوشیار پوری، نذیر بنارسی، کلب علی شاہد، فضا ابن فیضی، ثمر شمسی، علی احمد جلیلی، آفتاب لکھنوی، غلام ربانی تاباں، تاباں نقوی، ناز مانک پوری، روشن لال آنند پشاوری ساز، جرار چھولسی، فتح چند نسیم، معجز سنبھلی، صدرالدین صدر انصاری، حسن نجمی سکندر پوری اور کنور مہندر سنگھ بیدی سحر۔ نظامت کے فرائض مخمور سعیدی نے انجام دیے۔

مائک پر سابق صدر جمہوریہ جناب گیانی ذیل سنگھ افتتاحی تقریر کرتے ہوئے ـــــ شعرا میں دائیں جانب سے صدر مشاعرہ پروفیسر آل احمد سرور، جناب غلام ربانی تاباں، جناب آفتاب لکھنوی، جناب جرار چھولسی اور جناب حسن نجمی سکندر پوری نظر آرہے ہیں۔

(حسن نجمی سکندر پوری)

۲۶ مارچ کو دہلی اُردو اکادمی کی طرف سے جلسۂ تقسیم اسناد رکھا گیا۔ اس جلسے میں اکادمی کے قائم کردہ تعلیم بالغاں مراکز نیز پندرہ روزہ اُردو کورس میں شریک ہونے والے طلبہ اور طالبات کو اسناد دی گئیں۔ پندرہ روز اُردو کورس کے مہتمم بہار کے عزیز الحسن صاحب تھے جنھوں نے دو ہفتے کی مختصر مدت میں طلبہ کو اُردو خواں بنا دیا۔ تصویر میں، دائیں سے : سید شریف الحسن نقوی، ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر جگن ناتھ آزاد اور کاظم علی خاں۔
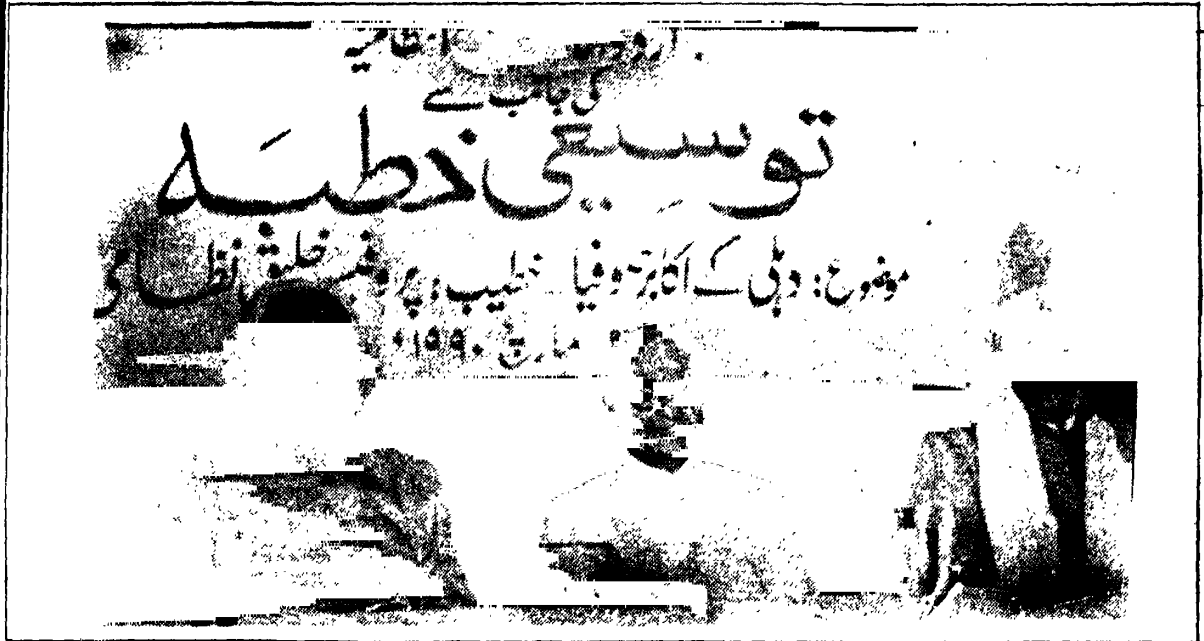
اُردو اکادمی نے تین توسیعی خطبات کا اہتمام کیا۔ پہلا خطبہ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے دیا۔ موضوع تھا "دلّی کے اکابر صوفیا"۔ دوسرا خطبہ پروفیسر علی محمد خسرو نے "نیشنل ازم، سیکولرزم اور رواداری" کے موضوع پر دیا اور تیسرا خطبہ پروفیسر محمد عمر نے "دہلی کے اہلِ حرفہ" کے موضوع پر۔ تصویر میں، دائیں سے : جناب خواجہ حسن ثانی نظامی، جناب حکیم عبدالحمید اور جناب خلیق احمد نظامی۔

پروفیسر اے۔ ایم خسرو ـــــــ پروفیسر محمد عمر
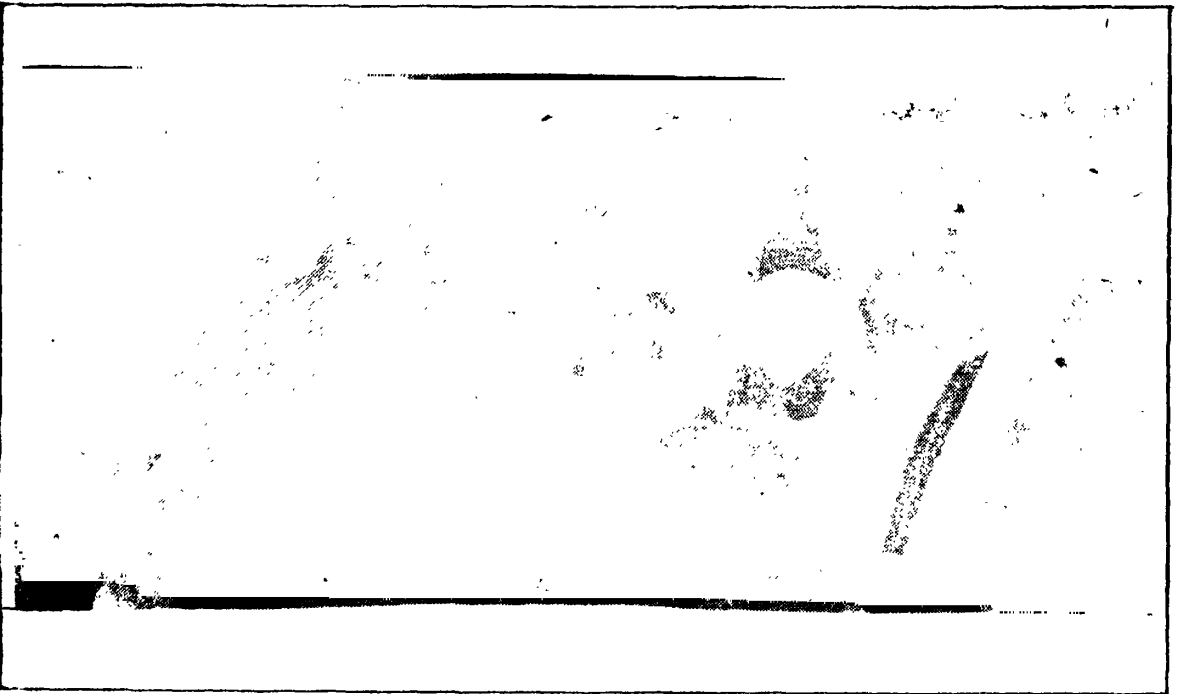
۱۲ ر اپریل کو اُردو اکادمی، دہلی کے چیئرمین ریٹائرڈ ایر چیف مارشل ارجن سنگھ (گورنر دہلی) نے راج نواس میں روزہ کشائی کا اہتمام کیا جس میں ہر مذہب و ملّت کے لوگوں نے شرکت کی۔ تصویر میں دائیں سے: جنابِ حسن ثانی نظامی، حکیم عبدالحمید صاحب، لیفٹننٹ گورنر ارجن سنگھ اور سیّد حامد صاحب (سابق وائس چانسلر، علی گڑھ مُسلم یونیورسٹی) نظر آرہے ہیں۔

(تصاویر: سیّد فدا علی)

ترقی پسند مصنفین کی بین الاقوامی کانفرنس

غالب اکیڈمی، نئی دہلی میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی سہ روزہ کانفرنس کا افتتاحی اجلاس ۲، مارچ ۹۰ء کو ہوا۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت پاکستان سے آئے ہوئے ناول نگار، افسانہ نگار جناب شوکت صدیقی نے کی۔ پروفیسر قمر رئیس نے اپنی رپورٹ پیش کرتے ہوئے کہا "انجمن ترقی پسند مصنفین کی تنظیم شاید ملک کی تمام تنظیموں میں سب سے کمزور رہی ہے۔ اس کا کبھی کوئی مرکزی یا صوبائی دفتر قائم نہیں ہوا۔ اس کا کوئی باضابطہ دستور العمل بھی نہیں بنا۔ اس کی مجلسِ عاملہ اور مجلسِ عام کے جلسے کبھی پابندی سے نہیں ہوتے اور نہ ہی اس کی کوئی باضابطہ رکنیت رکھی گئی۔ اس حقیقت کے باوجود ترقی پسند مصنفین کی تحریک ہر دلعزیز، بارآور اور اپنے اثرات کے لحاظ سے اہم تحریک رہی"۔

پروفیسر مونس رضا نے استقبالیہ کمیٹی کے چیئرمین کی حیثیت سے ملک اور بیرونِ ملک سے آئے ہوئے مندوبین کا استقبال کیا۔

جناب اندر کمار گجرال نے اپنے افتتاحی خطبے میں صنعتی انقلاب کے تین مرحلوں کا ذکر کیا اور کہا کہ جب پہلا صنعتی انقلاب آیا تو ہم غلام تھے اور سامراجی حکمرانوں نے ہمیں اس کی برکتوں سے محروم رکھا۔ دوسرے انقلاب کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ جب یہ انقلاب رونما ہوا اس وقت ہم ذہنی طور پر غلام تھے۔ جناب اندر کمار گجرال نے مزید کہا کہ دوسرے اور تیسرے صنعتی انقلاب نے حب الوطنی کے جس تصور کو جنم دیا وہ ایک نیا تصور تھا اور اس تصور نے علاقائیت کی شکل اختیار کرلی ہے، ہمیں اس پس منظر میں حب الوطنی کا نیا مفہوم تلاش کرنا ہوگا۔

سوویت یونین سے آئی ہوئی لدمیلا وسیلووا نے اپنی تقریر میں کہا کہ یہ کانفرنس ایک ایسے دور میں ہورہی ہے جب تمام دنیا کو ذہنی اور فکری لحاظ سے کئی مشکلوں کا سامنا ہے۔ سوویت روس میں ہونے والی ذہنی اور فکری تبدیلیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے موصوفہ نے کہا کہ گوربا چوف کے اندازِ فکر نے روحانی قدروں کو زندہ کر دیا ہے۔ اب ہماری سوچ کا محور فرد کی ذات ہوتی جارہی ہے۔ اس سوچ کا اثر براہِ راست سیاست پر بھی پڑ رہا ہے۔ موصوفہ نے مزید کہا کہ ہمارا دور ماضی پر نظرِ ثانی کا دور ہے۔ آخر میں موصوفہ نے کہا کہ آنے والے دور کی مہک محسوس کرنے والا ہی سچا ترقی پسند ادیب ہے۔

جناب اصغر علی انجینیئر نے اپنی تقریر میں بعض اہم سوالات اٹھائے۔ انھوں نے پوچھا کہ کیا سوشلزم آج بھی ہمارے لیے کچھ معنیٰ رکھتا ہے۔ کیا فلاحی ریاست ہی سوشلسٹ ریاست ہے؟ سوویت یونین میں مذہب کے تعلق سے جس رویے نے جنم لیا ہے اس نے فرد اور سماج کے بارے میں سوچنے کے لیے بعض نئے سوالات اٹھا دیے ہیں۔ اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ فرد کی ذات ایک محور ہے تو کیا اس طرح ہم اس جدیدیت کا احیاء نہیں کر رہے ہیں جس کی گذشتہ بیس سالوں سے مذمت کرتے آئے ہیں۔

ہندی کے ادیب جناب کملیشور نے اپنی تقریر کی بنیاد اپنی چار کہانیوں پر رکھی اور ان کے توسط سے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ جو ادیب اور فن کار خون کا رنگ بتائے، آنسوؤں کی پہچان بتائے اور چڑیوں کی پرواز کے معنی بتائے بچّے کی بھوک کو محسوس کرے وہی صحیح معنوں میں ترقی پسند ادیب ہے۔

آخر میں جناب شوکت صدیقی نے اپنے خطبۂ صدارت میں سوویت یونین کے حالیہ واقعات کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہا کہ آج نہ صرف پیداواری رشتوں میں ایک نئی تبدیلی آرہی ہے بلکہ ہماری قدروں پر اور خود سوشلزم پر ایک سوالیہ نشان لگ گیا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ یہ وقت خاموش رہنے کا نہیں ہے۔ ہم اپنے ضمیر کے سامنے جوابدہ ہیں۔ ہمیں نئے مسائل پر فراخدلی کے ساتھ بحث کرنا ہوگی اور جو کچھ بھی کہنا ہے کھل کر کہنا ہوگا۔

کانفرنس کا دوسرا اجلاس ۳، مارچ کو منعقد ہوا۔ اس کا موضوع تھا "ادب میں کمٹ منٹ کے نئے تناظر"۔ پہلا مضمون کاوش بدری کا تھا انھوں نے کئی متضاد باتیں کہیں۔

افسانہ نگار حسین الحق نے وابستگی کے تعلق سے کہا کہ یہ کوئی مجرد عمل نہیں ہے بلکہ اندر سے نمو پانے والی حقیقت ہے۔

ادیب کا سفر عوام سے نہیں بلکہ ذات سے شروع ہو کر کائنات تک جاتا ہے۔ حسین الحق کے بعد رفعت سروش نے اپنا مقالہ پڑھا۔ پھر پیغام آفاقی نے "کمٹ منٹ" کے تعلق سے موصوف نے کہا کہ ادب کو کمٹ منٹ کے کسی چرچ میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔

رفیق انور پاشا نے اپنے مقالے میں کہا کہ دُنیا کا کوئی ادب نظریے سے عاری نہیں ہوتا۔ انھوں نے یہ سوال بھی اٹھایا کہ کیا ہم نے پرانے تناظر کی تکمیل کر لی ہے جو اب نئے تناظر کے متلاشی ہیں؟

جوگندر پال صاحب نے مقالہ پڑھنے ی بجائے تقریر کی۔ انھوں نے کہا کہ حالات ی تبدیلی الفاظ کو ایک نئے معنی عطا کرتی ہے۔ ہمارے سامنے سوال یہ ہے کہ کیا وہ مرحلہ گیا ہے جب ہم ادبی ترقی پسندی کا نیا تناظر اش کریں۔ پچھلی دو دہائیوں میں جو تبدیلیاں نما ہوئی ہیں وہ دو صدیوں میں ممکن نہیں یں۔ اس لیے ہمیں غور کرنا ہوگا کہ کیا تبدیلیاں اپنے اندر کچھ نئے مفاہیم رکھتی ۔ فرد اور سماج کے رشتے پر روشنی ڈالتے ئے جوگندر پال نے کہا کہ سماج اور فرد رشتے کو غلط رُخ نہ دیا جائے یہ ایک سرے سے متصادم نہیں ہے بلکہ ایک سرے کا تتمہ ہے۔

جوگندر پال کے بعد اصغر علی انجینئر اپنا مقالہ پڑھا۔ اصغر علی انجینئر حال یں سوویت روس کا دورہ کر کے لوٹے لہٰذا وہاں کی تمام صورتِ حال سے بی واقف ہیں۔ انھوں نے جو سوالات حی اجلاس میں اٹھاتے تھے ان کا اعادہ کرنے کے بعد کہا کہ ادب و شاعر کی حیثیت سے ہماری وابستگی ان اقدار سے ہے جو آفاقی ہیں۔ جیسے اخوت، مساوات، بھائی چارہ، انصاف اور امن وغیرہ۔ انھوں نے بڑھتی ہوئی فرقہ واریت، رجعت پرستی، اور بنیاد پرستی کے خلاف جدوجہد کو ضروری قرار دیا۔ یہ اجلاس تقریباً ڈھائی بجے اختتام پذیر ہوا اور دوسرا اجلاس ۳ بجے کے قریب شروع ہوا۔ موضوع "سیکولرزم کو درپیش خطرات اور ادیب" تھا۔ اس اجلاس میں دو مقالے پڑھے گئے۔ پہلا مقالہ معین اعجاز کا تھا۔ انھوں نے سیکولر قدروں کے استحکام پر زور دیا۔ دوسرا مقالہ غلام ربانی تاباں صاحب کا تھا۔ تاباں صاحب کے بعد حاضرین کو اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی۔ احمد رشید شیروانی صاحب اور جناب کرپال سنگھ نے کہا کہ موجودہ عہد میں فرقہ پرستی نے ایک خوفناک صورت اختیار کر لی ہے اور سیکولرزم کی مدافعانہ کوششیں دم توڑتی جا رہی ہیں۔

جناب راج بہادر گوڑ نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہماری تاریخ فرقہ وارانہ رنگ میں لکھی گئی ہے۔ جس کی وجہ سے فرقہ پرستی پروان چڑھی ہے۔ انھوں نے فرقہ پرستی کے خلاف لڑائی کو آزادی کی دوسری لڑائی قرار دیا۔

جناب کملیشور نے اس اجلاس میں بابری مسجد بہ نام رام جنم بھومی کے مسئلے پر اظہارِ خیال کیا اور تاریخی حقائق سے یہ ثابت کیا کہ وہاں کسی مندر کو توڑے جانے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ انھوں نے کہا کہ والمیکی کی رامائن میں رام چندر جی کا تصور بھگوان کا نہیں ہے۔ والمیکی نے انھیں راجکمار کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ رام چندر جی کو بھگوان کا درجہ دینے میں تلسی داس کا ہاتھ ہے۔ تلسی داس کے عہد ہی سے رام نام کے مندروں کی تعمیر کا آغاز ہوتا ہے۔ اور جب بابر ہندوستان آیا اس وقت تلسی داس کی عمر بہ مشکل دس گیارہ سال رہی ہوگی۔ کملیشور نے مزید کہا کہ اگر بابر نے کوئی مندر تڑواکر اس کی جگہ مسجد تعمیر کی ہوتی تو اس کا ذکر تلسی داس نے کہیں تو کیا ہوتا۔

اس روز شام افسانہ میں محسن خاں، عبدالصمد، قاسم خورشید، سید احمد قادری، اقبال متین، انور خاں، حسین مجید، اور رتن سنگھ نے اپنی اپنی کہانیاں سنائیں۔ اجلاس کا اختتام شب کے ۸ بجے کے قریب ہوا۔

کانفرنس کا آخری اجلاس جس کا موضوع "ترقی پسند فکر کی معنویت عصرِ حاضر میں" تھا ۴ مارچ کو ہوا۔ اس اجلاس میں پہلا مقالہ سوویت یونین کی اسکالر ایرنیا میکس مینکو نے پیش کیا۔ انھوں نے سوویت یونین میں ہونے والی تبدیلیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہ تبدیلیاں اتنی تیز رفتار ہیں کہ ہمارے یہاں کے ادیب اور دانشور ان تبدیلیوں سے ہم آہنگ ہونے کے لیے ادب کے بجائے صحافت سے وابستہ ہوتے جا رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے یہاں اب وہ تخلیقات بھی شائع ہو رہی ہیں جن پر پہلے پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ علاوہ ازیں اب ہمارے یہاں ان موضوعات پر لکھا جا رہا ہے جن پر لکھنا ممنوع قرار دیا گیا تھا۔

دوسرا مقالہ جناب مسلم شمیم کا تھا جو کراچی
سے آئے تھے۔ انھوں نے اپنے مقالے میں
سوویت یونین کی تبدیلی کو مشکوک نقطۂ نظر
سے پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ محض بغاوت
کے جذبے سے متاثر ہوکر لکھنا بھی اتنا ہی غلط
ہے جتنا کہ حکومت کے اشارے پر لکھنا۔ ان
کے بعد کنور سین نے اور پھر سید ضمیر حسن
دہلوی نے اپنا پرچہ پڑھا۔ انھوں نے کہا کہ
۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کا قیام ایک
مستحسن قدم تھا کیوں کہ اس کے توسط سے
اُردو ادب کا رشتہ عالمی ادب سے استوار
ہوا۔ سید ضمیر حسن کے بعد گجرانوالہ (پاکستان)
سے آئے ہوئے جناب رفیق چودھری نے
اپنا مقالہ پیش کیا۔ جو پاکستان میں ترقی
پسند ادبی تحریک کے جائزے اور مسائل پر
مشتمل تھا۔ ان کے بعد کمال احمد صدیقی نے
اپنا مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہم ٹکنولوجی
کی دہشت گردی، بنیاد پرستی کی دہشت
گردی اور نظام پیداوار کی دہشت گردی کے
المیوں سے دو چار ہیں۔ ڈاکٹر بھیشم ساہنی
نے اپنی تقریر میں ترقی پسند ادبی تحریک کی
خدمات پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ
بے شک اس تحریک سے وابستہ اکابرین سے
بعض غلطیاں سرزد ہوئی ہیں مگر اس تحریک
نے جو کچھ ادب کو دیا ہے، اس سے انکار
نہیں کرنا چاہیے۔ دو مقالے اور پڑھے گئے
ان میں سے ایک ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی کا
اور دوسرا علی احمد فاطمی کا مقالہ تھا عاشور
کاظمی نے بحث کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ
نوجوان نسل آزادی سے سوچنے کی صلاحیت
[illegible]

اقتدار نوجوانوں کو سونپ دیں۔ شوکت صدیقی
نے کہا کہ تمام قدروں کا مفہوم بدلتا رہتا
ہے دائمی قدر انسانی محنت کی ہے جس
نے دنیا اور آدمی دونوں کو تبدیل کیا ہے۔
زاہدہ زیدی نے کہا کہ جدیدیت اور ترقی
پسندی کی بحث پرانی ہو چکی ہے اور میں
دونوں تصورات پر یقین رکھتی ہوں جگن ناتھ
آزاد نے کہا کہ اگر اس سیمینار میں پنجاب،
کشمیر اور یو۔پی کے بارے میں زیادہ روشنی
ڈالی جاتی تو بہتر تھا۔ وحید اختر نے کہا کہ
ہم کسی بھی سیاسی آمریت کو قبول نہیں کر سکتے۔
اپنے مسائل کو روس کے حوالے سے نہیں
دیکھا جا سکتا۔ پاکستانی مہمان پروفیسر عتیق
احمد نے کہا کہ روس کی موجودہ تبدیلیوں کا
سہرا نوجوان نسل کے سر ہے۔ آخر میں صدرِ
اجلاس عابد سہیل نے کہا کہ ہم نے تحریک
پر گفتگو نہیں کی ہے بلکہ ترقی پسند فکر کو
موضوع گفتگو بنایا ہے۔ انھوں نے یہ بھی
کہا کہ ہم دوسروں کے مسائل سے چشم پوشی
نہیں برت سکتے۔ اس لیے مشرقی یورپ اور
سوویت یونین کا ذکر ضروری تھا۔

صدر کی تقریر کے بعد انجمن کے نئے
اراکین کا انتخاب عمل میں آیا۔ پروفیسر قمر رئیس
کو متفقہ طور پر انجمن کا جنرل سکریٹری چنا گیا
اور صدر کے لیے جوگندر پال کا نام تجویز کیا
گیا جسے سب نے خوشی کے ساتھ قبول کیا۔

اس کے بعد شام افسانہ کا آغاز ہوا
جس میں مسیح انجم، حسین الحق، کنور سین،
عابد سہیل، کشمیری لال ذاکر، رفیق چودھری،
الیاس احمد گدی، بیگم پروفیسر عتیق احمد،
جوگندر پال اور شوکت صدیقی نے اپنی
کہانیاں پیش کیں۔

(شکیب نیاز)

اکبر الہ آبادی
مشرقی تہذیب کی اعلیٰ قدروں کے علمبر

اُردو کے ممتاز شاعر اور ادیب
مولانا اسماعیل میرٹھی نے ۱۹۰۹ء میں
اسماعیل نیشنل گرلس پی۔جی۔ کالج میر
قائم کیا تھا۔ اس وقت سے آج تک
کالج تعلیم و تہذیب کا سرچشمہ اور ا
ادب کا گہوارہ ہے۔ ۱۲ر مارچ ۹۰ء
اسی کالج میں "اکبر الہ آبادی اور ان کا
کے موضوع پر ایک سیمینار کا انعقاد کیا
جس میں ملک کے ممتاز دانشوروں، نقا
اور ادیبوں نے اکبر کے فکر و فن، حیات
عہد پر بصیرت افروز مقالے پڑھے۔ افت
اجلاس کی صدارت میرٹھ یونیورسٹی کے و
چانسلر جناب پی۔سی۔ گپتا نے کی۔ ا
اجلاس کا افتتاح جامعہ ملیہ اسلامیہ
کے وائس چانسلر جناب ڈاکٹر سید ظہو
نے فرمایا اور پروفیسر عنوان چشتی
کے فکر و فن پر کلیدی خطبہ پیش کیا۔

سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے
سید ظہور قاسم صاحب نے اکبر ا
کی شاعری اور ان کی سیاسی، سماجی،
اور ثقافتی بصیرت پر روشنی ڈالتے
کہا کہ جدید دور میں اکبر کے کلام کی ا
کا از سر نو جائزہ لینے کی ضرورت۔
پروفیسر عنوان چشتی نے کہا کہ جو ا
اکبر الہ آبادی کو محض سر سید تحریک

الف یا قدامت پسند بناکر پیش کرتے ہیں
بر کے دور کے تقاضوں اور اکبر کے بنیادی
نظر کے ساتھ انصاف نہیں کرتے۔ جناب
حیدری نے کہا کہ ہر شاعر کے یہاں کچھ
دی تصوّرات اور خیالات ہوتے ہیں جو
شاعر کے یہاں فری کیونسی کی صورت میں
آتے ہیں۔ ہمیں اکبر کی شاعری میں اُس
کیونسی کو تلاش کرنا چاہیے۔

افتتاحی اجلاس کے بعد پہلا اجلاس
م کے وقفے کے بعد شروع ہوا جس کی
رت جناب کلام حیدری نے فرمائی۔ اِس
س میں خالد حسین خاں لکچرر میرٹھ کالج
اکبر کی شاعری کی خصوصیات پر اپنا مقالہ
کرتے ہوئے کہا کہ اکبر مشرقی اقدار
دلدادہ تھے لیکن مغربی تہذیب کی اچھی
دِں کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔
ڑ صادق ذکی نے اپنا مقالہ صنفِ نازک
اکبر الہ آبادی کے موضوع پر پڑھا اور
اکبر الہ آبادی نے تعلیمِ نسواں پر مشروط
ز میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ ناظمِ جلسہ
ہما مسعود نے مہمانوں اور سامعین کا شکریہ
رتے ہوئے دوسرے اجلاس کا اعلان کیا۔

دوسرے اجلاس کی صدارت اُردو کے
شاعر اور نقّاد جناب مشتاق شارق نے
ور اجلاس میں مولانا نعیم الدّین رضوی (نئی
) مِس ہما مسعود (میرٹھ) اور ڈاکٹر
لحق (دہلی یونیورسٹی) نے اپنے مقالات
س کیے۔ مولانا نعیم الدّین رضوی کے مقالے
نوان تھا "اکبر کی شاعری میں تصوّف
ف"۔ انھوں نے کہا کہ اکبر کے ذہن پر
رف اور اسلامی تعلیمات کے گہرے

اثرات ہیں جن کا اظہار انھوں نے اپنی شاعری
میں کیا ہے"۔ مِس ہما مسعود نے اپنا مقالہ
اکبر کا عہد اور اُن کی شاعری کے سیاسی،
سماجی، ثقافتی اور تعلیمی رشتوں کی بازیافت
پر پڑھا۔ موصوفہ نے کہا کہ اکبر الہ آبادی کا
عہد ایک بحرانی عہد تھا۔ اُس دور میں دو
تہذیبیں، دو نظریے اور دو رویّے ایک
دوسرے سے متصادم تھے۔ ہر رویّہ اپنی
صحت پر اصرار کرنا اور دوسرے کی تکذیب
کرنے پر آمادہ تھا۔ اکبر نے اِس دور
میں اپنا فرض نباہا اور نئی تہذیب جو انگریزی
اقتدار کے سایے میں تیزی سے آگے بڑھ
رہی تھی، اس کی منفی اور مُضر خصوصیات
پر کاری ضرب لگائی۔ انھوں نے مشرقی تہذیب
کی فرسودہ اور بوسیدہ قدروں پر بھی
وار کیا اور ایک معتدل اور متوازن اندازِ
زندگی پر اصرار کیا جس میں اسلامی رنگ
کو خاص وقار حاصل ہے۔ سرسیّد تحریک
مغربی تعلیم و تہذیب کی غیر مشروط حمایت
کرتی تھی۔ اکبر نے اسلامی اصولوں اور
مشرقی تہذیب کی بنیادی قدروں کے
تحفّظ کے لیے اپنی شاعری کو سپر بنایا۔
ڈاکٹر ثریّا رضوی نے اختتامی اجلاس کا اعلان
کیا جس میں بیرونی مندوبین کی طرف سے مولانا
نعیم الدّین رضوی اور مقامی میزبانوں کی طرف سے
جناب مشتاق شارق نے اپنے تاثرات پیش کیے۔

(ہما مسعود)

ہریانہ اُردو اکادمی کی
تقریبِ تقسیم ایوارڈ

ہریانہ اُردو اکادمی کی جانب سے
چنڈی گڑھ کے ہریانہ راج بھون میں تقسیم
سالانہ ایوارڈ کی تقریب کا اہتمام کیا گیا جس ا
میں اُردو زبان و ادب کی مجموعی خدمات کے
لیے ہریانہ کے گورنر جناب ایچ۔ اے۔
براری نے اُردو قلمکاروں کو قومی اور ریاستی
سطح کے ایوارڈ پیش کیے۔ قومی "حالی ایوارڈ"
برائے سال ۱۹۸۸ء محترمہ جیلانی بانو نے
حاصل کیا، ریاستی سطح کا سید مظفر حسین
برنی ایوارڈ سال ۸۷ء کے لیے جناب
مصور سبزواری اور ۸۸ء کے لیے جناب
بالکرشن مضطر کو پیش کیا گیا۔ سال ۸۸ء
کا پہلا ریاستی "خواجہ احمد عبّاس ایوارڈ"
جناب محمد حبیب الرحمان خاں میواتی کو پیش
کیا گیا ان ایوارڈوں کے علاوہ سال ۸۸ء
اور ۸۹ء کے دوران بہترین اشاعتوں کے
لیے ہریانوی قلمکار جناب انجم زیدی، جناب
مہاویر پرساد جین اور جناب بادا کرشن
گوپال مغموم کو بھی ان کی تصنیفات پر فی
کتاب ڈھائی ہزار روپے کا انعام دیا گیا۔
"قومی حالی ایوارڈ" ۳۰ ہزار روپے نقد،
پلیک، شال اور توصیفی سند پر مشتمل ہے۔
یہ ایوارڈ خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی
کے نام سے منسوب ہے۔ ۱۹۸۸ء سے اس
ایوارڈ کا اعلان سرزمینِ حالی یعنی پانی پت
میں موجودہ نائب وزیرِ اعظم چودھری دیو،
لال جی نے فرمایا تھا۔

ریاستی سطح کا "سیّد مظفر حسین برنی
ایوارڈ" جو -/۵۱۰۰ روپے نقد پلیک،
شال اور توصیفی سند پر مشتمل ہے۔ ۱۹۸۷ء
کے لیے جناب مصور سبزواری کو پیش
کیا گیا۔

یہی ایوارڈ ۱۹۸۸ء کے لیے جناب بالکرشن مضطر کو پیش کیا گیا۔ ۸۸ء سے "قومی حالی ایوارڈ" کی طرح ریاستی سطح کا دوسرا "خواجہ احمد عباس ایوارڈ" شروع کیا گیا ہے جو چار ہزار روپے نقد، پلیک اور شال پر مشتمل ہے۔ یہ ایوارڈ جناب حبیب الرحمان خاں میواتی کو پیش کیا گیا۔ میواتی صاحب ایک ادیب ہونے کے ساتھ مدرس اور اپنے علاقے کے امام بھی ہیں۔

اس موقع پر گورنر ہریانہ جناب ایچ۔ اے۔ براری نے ایوارڈ پانے والے قلمکاروں کو اپنی اور حکومتِ ہریانہ کی طرف سے مبارکباد دیتے ہوئے امید ظاہر کی کہ یہ ادیب اسی طرح اُردو زبان و ادب کی خدمت کرتے رہیں گے۔ اپنے خطبۂ صدارت میں ہریانہ کے وزیرِ تعلیم جناب حکم سنگھ نے کہا کہ حکومتِ ہریانہ اُردو کی ترقی کے لیے ہریانہ اُردو اکادمی کو ہر ممکن تعاون دیتی رہے گی۔

صدرِ اکادمی جناب خورشید احمد نے ہریانہ اُردو اکادمی کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے ایوارڈ یافتگان کو مبارکباد پیش کی۔ سکریٹری اکادمی جناب کشمیری لال ذاکر نے اکادمی کے آئندہ اقدامات سے شرکا کو آگاہ کرایا۔

(ناشر نقوی)

مہاراشٹر اسٹیٹ اُردو اکادمی سالانہ انعامات برائے ۹۰-۱۹۸۹ء

ادبی، علمی خدمات کا قومی انعام (ڈاکٹر محمد حسن، نئی دہلی) علمی، ادبی خدمات کا ریاستی انعام (عزیز قیسی، بمبئی) مراٹھی، اُردو خدمات کا ریاستی انعام (رام پنڈت، بمبئی) کو پیش کیا گیا۔

شاعری کی درج ذیل کتابوں پر:
چراغ چشم تر (ظفر گورکھپوری، بمبئی)۔ ما فی الضمیر (ضمیر کاظمی، بمبئی)۔ ورق ورق (سراج النور، مصطفےٰ آبادی)۔

افسانے، ڈرامے کے لیے ان کتابوں پر:
یاد بسیرے (انور خاں، بمبئی)۔ سوچ لیجیے (نور العین علی، بمبئی) زربیل (مقدر حمید، بمبئی) ناٹ آؤٹ (شیخ رحمان اکولوی، اکولہ)۔

ترجمہ، تنقید اور تحقیق پر:
ترجمان اسرار خودی (غلام دستگیر شہاب مرحوم، پونہ) قصہ جدید اُردو افسانے کا (سلیم شہزاد، مالیگاؤں)۔ اُردو افسانے کے ابتدائی نقوش (فیاض رفعت، بمبئی)۔ لکھنؤ کے امی شعرا (فضا لکھنوی، بمبئی) کتھا (خالد اگاسکر، بمبئی) کو انعامات دیے گئے۔

صحافت کے لیے: ہارون بی۔ اے۔ (بے باک، مالیگاؤں) صادق علی جعفری (انقلاب، بمبئی)۔

تدریسی خدمات کے لیے: عبدالرحیم نشتر (امبیت) خالد شاہین (بمبئی)۔

اور خطاطی کے لیے: رشید الدین (انقلاب، بمبئی) محمد اسد خاں (اُردو ٹائمز، بمبئی) محمد علی (بلٹز، بمبئی) کو ایوارڈ پیش کیے گئے۔

(سید وقار حسن قادری)

غیاث احمد گدی کی یاد

اُردو کے مشہور افسانہ نگار غیاث احمد گدی کے فن اور شخصیت پر "گورنمنٹ اُردو لائبریری" پٹنہ میں پندرہ روزہ "نقاد" کی ادبی شاخ "ہم عصر" کے زیرِ اہتمام ایک یک روزہ کل ہند سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ افتتاحی نشست کی شروعات جناب الیاس احمد گدی نے اپنا مقالہ "ملگدھ پوری کا داستان گو" سنا کر کی۔ انھوں نے غیاث احمد گدی کے حالاتِ زندگی کے مختلف گوشوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ——— انھوں نے کہا کہ غیاث نے زندگی بھر اذیت جھیلی اور تنہائی کا کرب برداشت کرتے رہے۔ پھر بھی کبھی رجعت پسندی کا شکار نہیں ہوئے۔ "آخ تھو" جیسے افسانے سماجی ناانصافی اور ظلم و ستم کے خلاف غیاث احمد گدی کی جدوجہد کی عکاسی کرتے ہیں۔

ہندی کے مشہور نقاد اور افسانہ نگار مسٹر رانا پرتاپ نے کہا کہ اُردو اور ہندی میں ابھی تک افسانوی تنقید کو فروغ حاصل نہیں ہوا ہے۔ اور اُردو اس میں اور پیچھے ہے۔ انھوں نے آگے کہا کہ شاید یہی وجہ ہے کہ لوگ غیاث احمد گدی کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکے ہیں۔ اور ان کے افسانوں کو نہیں پرکھا جا سکا ہے۔

مسٹر شوکت حیات نے کہا کہ غیاث احمد گدی بہت بڑا فن کار تھا۔ وہ بہت سادہ لوح تھا۔ اس لیے عظیم بھی تھا کیونکہ عظمت ہمیشہ سادہ ہونے کا مطالبہ کرتی ہے۔

نو بھارت ٹائمز پٹنہ کے مدیر مسٹر آلوک مہتا نے غیاث احمد گدی کے افسانوں کو زیادہ سے زیادہ غیر اُردو داں لوگوں تک پہنچانے کی ضرورت پر زور دیا۔ اور کہا کہ

جن تخلیقات میں انسانی قدروں کو اُجاگر کرنے کی بات کی جاتی ہو، انھیں دوسری زبانوں میں بھی منتقل کر کے زیادہ سے زیادہ منظرِ عام پر لایا جانا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ آج اردو میں بہت اچھے افسانے لکھے جا رہے ہیں، لیکن ہندی والے ان سے محروم رہ جاتے ہیں۔ مسٹر مہتا نے نصابی کتابوں میں غیاث احمد گدی کے افسانوں کو شامل کیے جانے پر بھی زور دیا۔

جناب انیس رفیع، جناب شفیع مشہدی، جناب اختر واصف، جناب علی امام، جناب عبید قمر، جناب احمد یوسف، جناب رحمان شاہی، ڈاکٹر جمشید قمر، جناب شفیع جاوید، جناب اشفاق عادل، ڈاکٹر عبدالصمد، جناب حسن احمد، ڈاکٹر شکیب ایاز، ڈاکٹر جاوید حیات، پروفیسر حسن مجید اور جناب فضل امام ملک وغیرہ نے بھی اپنے تاثرات پیش کیے۔

اس کے بعد دوسرے سیشن کا آغاز ہوا جس کی صدارت جناب کلام حیدری نے کی۔ اور جناب قیصر رضا، ڈاکٹر جاوید حیات اور شوکت حیات نے غیاث احمد گدی کی افسانہ نگاری پر اپنے مقالے پڑھے۔ جناب شفق موجود نہیں تھے۔ لہٰذا ان کا مضمون جناب اختر واصف نے پڑھ کر سنایا۔ اس کے بعد ان مقالوں پر بحث کا دور شروع ہوا۔ بحث میں ڈاکٹر علیم اللہ حالی، ڈاکٹر حسین الحق، پروفیسر جمشید قمر اور احمد یوسف نے حصہ لیا۔

تیسرے سیشن میں پروفیسر جمشید قمر، ڈاکٹر حسین الحق اور احمد یوسف نے الترتیب "طلوع" "تج دو تج دو" اور "پرندہ پکڑنے والی گاڑی" پر تجزیاتی مضامین پڑھے۔ خطبہ صدارت جناب کلام حیدری نے دیا اور جناب اختر واصف کے شکریے کی تجویز کے بعد سیمینار کا اختتام ہوا۔

"دبستاں" کا جلسہ

نئی دہلی کی ادبی تنظیم "دبستاں" کے زیرِ اہتمام پروفیسر عنوان چشتی کی نئی کتاب "حرفِ برہنہ" پر ایک مذاکرہ منعقد ہوا جس کی صدارت پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے کی۔ انھوں نے کہا کہ "حرفِ برہنہ" اسمِ بامسمّیٰ ہے۔ اردو میں تبصروں کی روایت مروّت کی روایت ہے۔ اس روایت سے اردو کے چند نقادوں اور محققوں نے انحراف کیا ہے۔ جن میں پروفیسر عنوان چشتی کا نام بھی شامل ہے۔

پاکستان کے پروفیسر عتیق احمد نے کہا کہ اردو تنقید میں کلیم الدین احمد پر بے لاگ تنقید کی روایت ختم سی ہو گئی تھی لیکن پروفیسر عنوان چشتی نے "حرفِ برہنہ" کی تحریروں سے اس روایت کو اِس دور میں از سرِ نو تازہ کیا ہے۔ جناب کلام حیدری نے کہا کہ پروفیسر عنوان چشتی نے عروض اور فن کے ادق اور پیچیدہ مسائل کو بہت سادہ اور سلیس زبان میں اس سلیقے سے پیش کیا ہے کہ ہر مسئلہ پڑھنے والے کے ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ جناب محمود انصاری ایڈیٹر روزنامہ "منصف" حیدرآباد نے کہا کہ اگر غیر جانب داری سے "حرفِ برہنہ" کا جائزہ لیا جائے تو اس کتاب کی علمی اور فنی اہمیت کا اعتراف کرنا پڑے گا۔ ڈاکٹر توقیر احمد خاں نے اپنے مختصر مقالے میں کہا کہ اِس دور میں کلاسیکی علوم و فنون سے خاص طور پر عروض، معانی اور بیان سے چشم پوشی کی جا رہی ہے۔ پروفیسر عنوان چشتی صاحب کی شخصیت مغتنمات میں سے ہے کہ انھوں نے اِس دور میں عروضی، لسانی اور فنی شمع کو روشن کیا۔ "حرفِ برہنہ" کی تحریریں اِس دور کی شاعری کے مزاج کو پرکھنے کا پیمانہ فراہم کرتی ہیں اور تخلیقی فن کاروں کو دعوتِ فکر و نظر دیتی ہیں۔ آخر میں مولانا نعیم الدین رضوی اور ڈاکٹر سجاد سید نے بھی اظہارِ خیال کیا۔

(نعیم الدین رضوی)

قلمزاد کا مذاکرہ

پیغام آفاقی کے ناول 'مکان' پر نوجوان ادیبوں کی تنظیم "قلمزاد" کی طرف سے غالب اکیڈمی، نئی دہلی میں پروفیسر قمر رئیس کی صدارت میں ایک مذاکرہ منعقد ہوا جس میں ہندوستان پاکستان اور روس کے کئی تخلیق کاروں اور دانشوروں نے حصہ لیا۔ روس کی معروف اردو اسکالر ایرینا میکسی مینکو نے کہا کہ آج کی دنیا میں جب ہر جگہ لوگ تنہائی اور کمزوری محسوس کرتے ہیں یہ ناول ایک ایسا ویژن (VISION) لے کر ابھرا ہے جو انسانی تہذیب کو ایک نئی قوت سے آشنا کرانے میں کامیاب ہے۔ اور اس طرح یہ ناول ادب کا ایک بھرپور عصری جواز اپنے اندر رکھتا ہے۔

نوجوان شاعر فرحت احساس نے

اس ناول میں یہ صاف نظر آتا ہے
رد اور معاشرے کے بیچ جو رشتہ ہوتا
س رشتے کے تئیں کردار کے ذہن میں
ہونے والی ایک معمولی سی تبدیلی کتنے
نتائج پیدا کرسکتی ہے۔ مجتبیٰ حسین نے
اس ناول کی معنوی گہرائی اور گیرائی
ساتھ ساتھ اپنے آپ کو پڑھوانے کی
رت انگیز صلاحیت نے اردو افسانوی
ے منظرنامے کو اچانک بدل کر رکھ
ہے۔ مزاح نگار دلیپ سنگھ نے کہا کہ
ناول کی خوبیوں کا راز اسے ایک
وق قاری کی حیثیت سے پڑھنے پر ہی کھل
تا ہے کیوں کہ یہ ناول نقادوں کے
نہیں ذہین قاری کے لیے لکھا گیا ہے۔

نوجوان افسانہ نگار سید محمد اشرف
ے کہا کہ ناول میں کردار نیرا جس طرح
بکھر ٹوٹتی ہے اور پھر جڑ جاتی ہے' اور
ن طریقے سے وہ اپنی تخلیقی قوتوں کو دوبارہ
حاصل کرلیتی ہے یہی اس کردار کی خوبی
ہے اور یہ کردار آگے چل کر خود ہمارا کردار
ن جاتا ہے جس سے خود ہمیں اپنی زندگی میں
سوئی ہوئی قوتوں سے پھر سے ہمکنار ہونے کا
احساس ہوتا ہے۔ طارق چھتاری نے کہا کہ
ن زمانے میں جب حیرتیں ختم ہوگئی ہیں
ور کوئی بڑی سے بڑی بات ہمیں نہیں چونکا
پاتی۔ اس ناول سے جو حقیقی کردار انسان
کی نئی اور غیر دریافت شدہ قوتوں کے
ساتھ ابھرتے ہیں یہ ہمیں یکایک حیرت
میں ڈال دیتے ہیں۔

افسانہ نگار عبدالصمد نے کہا کہ اس
ناول میں یہ دکھائی دیتا ہے کہ کوئی بھی
واقعہ چاہے وہ ایک مکان کا جھگڑا ہی
کیوں نہ ہو سیدھا سادہ اور بے ضرر نہیں
ہوتا اور آج کی پوری زندگی میں سیاست کا
گہرا دخل ہے اور یہ سیاست جو انسان کے
اندر جاتی ہے اور باہر آتی ہے اس کے
ساتھ سیاست چپکی ہوتی ہے۔

اظہار ندیم نے کہا کہ مکان میں
انسان کا جو تصور قائم ہوتا ہے وہ ہمعصر
مغربی اور مشرقی اُن تمام نظریوں کی نفی
کرتا ہے جس میں انسان محض وقت اور
وجود کے جبر کا ایک لاچار اور بے معنی شکار
نظر آتا ہے۔ بدر عالم خاں نے کہا کہ اس
ناول کا امتیاز یہ ہے کہ یہ حقیقت نگاری
سے آگے بڑھ کر حقیقت سازی اور حقیقت
آفرینی کے دائروں میں قدم رکھتا دکھائی
دیتا ہے جو ایک چونکا دینے والی بات ہے۔

ڈاکٹر آغا سہیل نے کہا کہ اس ناول
کی خوشبو پاکستان میں بھی پھیل چکی ہے۔
ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ مکان بنیادی
طور پر عرفان ذات کی کہانی ہے اور کائنات
میں انسان کی حیثیت پر از سرِ نو روشنی ڈالتا
ہے۔ پاکستان سے آئے ہوئے دوسرے
مہمان شوکت صدیقی نے کہا کہ اس ناول
نے ٹی۔ وی اور سینما کے دئے ہوئے 'چیلنج'
کو کامیابی کے ساتھ قبول کرتے ہوئے یہ دکھایا
ہے کہ تحریری فن میں کتنی قوت اور گرفت ہے۔
اور کس طرح ایک ناول قاری کو اپنے اندر
جکڑ سکتا ہے اور اپنے آپ کو پڑھے جانے
پر مجبور کرسکتا ہے۔

جلسے کے صدر پروفیسر قمر رئیس نے
کہا کہ اس ناول کا فن، ہیئت اور موضوع
سب کچھ نیا اور منفرد ہے اور فنکار زندگی کی
ایک بھرپور بصیرت دینے میں کامیاب
ہوگیا ہے۔

ترقی اُردو بیورو میں لائنو ٹائپ اُردو کمپیوٹر کی تنصیب

ترقی اُردو بیورو سے سالانہ چالیس
پچاس کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ بورڈ نے
اپنے اشاعتی پروگرام کو تیز تر کرنے کے لیے
جدید ٹکنالوجی کو اپنانے کے ارادے سے اُردو
کمپیوٹر حاصل کرلیا ہے۔ اس کے لیے کچھ عرصہ
پہلے ترقی اُردو بورڈ نے ماہرین کی ایک
کمیٹی تشکیل دی تھی کہ وہ بہترین کمپیوٹر کا
انتخاب کرے اس کمیٹی نے تمام دستیاب
کمپیوٹروں کا جائزہ لے کر لائنو ٹائپ کمپنی
لندن کا اُردو نستعلیق کمپیوٹر منتخب کیا، جسے
ترقی اُردو بیورو نے لندن سے درآمد کرلیا
ہے۔ ترقی اُردو بیورو، ہندوستان کا وہ
پہلا سرکاری ادارہ ہے جہاں کمپیوٹر کی مدد
سے اُردو کتابوں کی طباعت و اشاعت کا
سلسلہ شروع ہونے والا ہے۔ بیورو کے
منتخب عملے کو ماہر استاد کی نگرانی میں کمپیوٹر
استعمال کرنے کی ٹریننگ بھی دے دی گئی ہے۔
اس کمپیوٹر میں انگریزی کے ساتھ ساتھ نسخ
اور نستعلیق خطوں میں اُردو عبارت کمپوز کرنے
کی صلاحیت موجود ہے۔

(ابوالفیض سحر، پرنسپل پبلیکیشن آفیسر)

عرب امارات میں اُردو مشاعرے

گذشتہ دنوں لونیکیرونز انٹرنیشنل (امارات)

کی جانب سے برصغیر کے منفرد لہجے کے شاعر جون ایلیا کا جشن منایا گیا اور دو بئی، ابوظہبی اور العین میں شاندار مشاعرے ہوئے۔ جن میں انڈو پاک کے ممتاز شاعروں نے اپنے کلام سے ہزاروں سامعین کو محظوظ کیا۔ جشن کے دوران ڈاکٹر قاسم پیرزادہ کے مجموعۂ کلام "تند ہوا کے جشن میں" اور جون ایلیا کے اوّلین مجموعۂ کلام "شاید" کی رسم رونمائی بھی ادا کی گئی۔ اس موقعے پر ضخیم یادگاری مجلّہ بھی شائع کیا گیا۔

پروگرام کو ترتیب دینے اور کامیاب بنانے والوں میں جناب سلیم جعفری، جناب وسیم الحق چشتی، جناب حبیب خاں اور حاجی انیس دہلوی کے نام نمایاں ہیں۔ جشن جون ایلیا سے قبل یہ ادارہ یادِ فیض، جشن خمار، جشن احمد فراز، جشن سحر کے نام سے بھی عظیم الشان مشاعرے منعقد کرا چکا ہے۔

(الف۔ د)

پروفیسر آزاد گلاٹی کو ایوارڈ

پنجاب سرکار نے اس برس اُردو کے لیے شرومنی ساہتیہ کار ایوارڈ پروفیسر آزاد گلاٹی
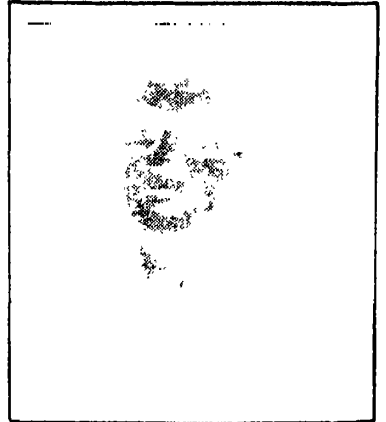
کو دینے کا اعلان کیا ہے۔ اس ایوارڈ میں دس ہزار روپے، طلائی تمغہ، خلعت وغیرہ شامل ہیں۔ "ایوانِ اُردو" اس قدر افزائی پر آزاد صاحب کو مبارکباد پیش کرتا ہے۔

ستارے ڈوبتے جاتے ہیں...

● پچھلے دنوں اُردو دُنیا کئی حادثوں سے دوچار ہوئی۔ ۲۱ مارچ کو جناب مشیر الحسن مشیر جھنجھانوی کا حرکتِ قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۶۵ سال تھی۔

مشیر جھنجھانوی صاحب کا شمار اُردو کے ہردلعزیز شعرا میں تھا۔ وہ ہندوستان بھر کے اچھے مشاعروں میں مدعو کیے جاتے تھے اور سامعین ان کا کلام بڑے ذوق و شوق سے سنتے تھے۔ ان کا سلسلۂ تلمذ جناب دل شاہ جہاں پوری کے واسطے سے امیر مینائی تک پہنچتا تھا۔ کبھی کبھار انھوں نے دوسری اصنافِ سخن میں بھی طبع آزمائی کی لیکن انھیں خصوصی شغف غزل سے تھا۔ وہ غزل کی کلاسیکل روایت کے علمبردار تھے لیکن فکر و فن کے عصری تقاضوں پر بھی ان کی نظر تھی۔ ان کا خاص موضوع حسن و عشق کے معاملات تھے لیکن انھوں نے اپنی غزل سے حالاتِ زمانہ کی ترجمانی کا کام بھی لیا۔ ان کی آخری دور کی غزلوں میں یہ رجحان زیادہ نمایاں ہے ــــ مشیر صاحب ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی کرنے کے بعد اپنے آبائی قصبے جھنجھانہ کو خیرباد کہہ کر دہلی آ گئے تھے اور فتحپوری مسلم ہایر سیکنڈری اسکول میں درس و تدریس کی خدمات انجام دینے لگے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی وہ دہلی ہی میں رہے اور یہاں کی شعری محفلوں کی رونق بڑھاتے رہے۔ اُردو اکادمی، دہلی نے اپنا ۱۹۸۶ء کا سالانہ ایوارڈ برائے اُردو شاعری انھیں پیش کر کے ان کی شاعرانہ خدمات کا اعتراف کیا تھا۔

مشیر صاحب کی زندگی میں ان کا کلام کتابی صورت میں شائع نہیں ہوا۔ اب ان کے معتقدین کا فرض ہے کہ وہ یہ کام انجام دینے کی کوشش کریں۔

● ۲ اپریل کو دہلی کے معروف طنز و مزاح نگار شاعر جناب کشن لال خنداں دہلوی کا ایک لمبی بیماری کے بعد انتقال ہو گیا۔

خنداں صاحب ۲۵ مئی ۱۹۱۴ء کو دہلی کے ایک باعزّت کایستھ گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی شعر گوئی کا آغاز ۱۹۳۳ء میں ہوا اور انھوں نے جنابِ گوپی ناتھ امن لکھنوی کی شاگردی قبول کی جو ان دنوں دہلی میں نو وارد تھے اور خنداں صاحب کے آبائی محلّے پیپل مہادیو میں مقیم تھے۔

خنداں صاحب کھرے دہلی والے تھے اور انھیں دہلوی زبان اور محاورے پر پوری قدرت حاصل تھی۔ انھوں نے اپنی شاعری سے برسہا برس دہلی کی ادبی محفلوں کو زعفران زار بنائے رکھا لیکن ان کا کلام

محض ہنسنے ہنسانے کی چیز نہیں۔ وہ ہنسی ہنسی میں ان سماجی ناہمواریوں اور اس اخلاقی زوال کی نشاندہی بھی کر جاتے ہیں جن کا سامنا آج کے ہر انسان کو کرنا پڑ رہا ہے —— خنداں صاحب لفظوں کے مزاج شناس تھے اور لفظوں کے برمحل اور برجستہ استعمال سے طنز و مزاح کا وہ رنگ پیدا کرتے تھے جو انھی کا حصہ ہے۔ ان کے مزاج میں شائستگی ہے اور وہ عام مزاح گو شاعروں کے برعکس پھکڑپن سے دور ہیں۔ ان کے کلام کا مجموعہ "گلِ خنداں" کے نام سے ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں جنابِ مالک رامؔ، خنداں صاحب کے استادِ محترم جنابِ گوپی ناتھ امنؔ، جنابِ خلیق انجمؔ، جنابِ کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ، جنابِ رفعت سروش اور جنابِ گلزار دہلوی کی ان کے کلام پر رائیں بھی شامل ہیں۔

● جناب مرزا مبارک علی بیگ دلؔ ایوبی نے ۳ر اپریل کو جے پور کے سوائی مان سنگھ اسپتال میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ وہ کچھ مدت سے عارضۂ قلب میں مبتلا تھے۔

دلؔ صاحب کا تعلق ٹونک کی مردم خیز سرزمین سے تھا۔ انھوں نے اپنے وقت کے بڑے بڑے علما، ادبا اور شعرا کی آنکھیں دیکھی تھیں اور ان سے فیض اٹھایا تھا۔ ایوبی وہ اپنے استادِ محترم قاضی محمد ایوب صاحب کی نسبت سے لکھتے تھے جو ایک عالمِ دین ہونے کے ساتھ ساتھ شعر و ادب کا بھی اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ دلؔ صاحب نے ان سے پڑھا بھی تھا اور ابتدائی کلام پر اصلاح بھی لی تھی۔

دلؔ صاحب کے کلام کے دو مجموعے "نذرِ رسالت" اور "رہگذر" کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ "نذرِ رسالت" نعتیہ کلام پر مشتمل ہے جس کے ایک ایک لفظ سے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی بے پایاں عقیدت و محبت ٹپکی پڑتی ہے۔ "رہگذر" غزلیہ کلام پر مشتمل ہے۔ ان کی غزلوں کی معنوی فضائیں تو خاصی رنگا رنگ ہے لیکن غالب رنگ تصوف کا ہے۔ ان کا ایک اور مجموعہ جو قطعات پر مشتمل ہے "جو فروش" کے نام سے مرتب شکل میں موجود ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ان قطعات میں انھوں نے تصوف کے چھوٹے مظاہر پر کڑی نکتہ چینی کی ہے اور خانقاہی فضا سے سخت بیزاری اور برہمی کا اظہار کیا ہے۔ دلؔ صاحب قادر الکلام شاعر تھے اور انھوں نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ امید کی جاسکتی ہے کہ ان کے صاحبزادے ڈاکٹر سخاوت شمیم جو خود بھی اچھے شاعر ہیں، دلؔ صاحب کے باقی ماندہ کلام کو ضائع نہ ہونے دیں گے اور جلد ہی اسے اہلِ ذوق تک پہنچانے کا انتظام کریں گے۔

● کشمیری دہشت پسندوں کی طرف سے پروفیسر مشیر الحق کے اغوا اور ۹ اپریل کو ان کے وحشیانہ قتل کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے۔ پروفیسر مشیر الحق جو گزشتہ تین سال سے کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدے پر کام کر رہے تھے، قطعی طور پر ایک غیر سیاسی اور غیر نزاعی شخصیت تھے۔ وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اسلامک اسٹڈیز کے شعبے کے سربراہ اور پھر ڈین رہے تھے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بھی ان کی وابستگی رہی تھی۔ وہ ان اہلِ علم کی صفِ اول میں تھے جنھوں نے جدید ذہن کے ساتھ اسلامی تعلیمات پر غور کیا اور اپنے نتائجِ فکر سے ایک وسیع حلقے کو متاثر کیا۔ ان کی تصنیفات جن میں "مذہب اور جدید ذہن"، "مسلمان اور سیکولر ہندوستان" اور دوسری کتابیں شامل ہیں جہاں ایک طرف اسلامیات سے ان کی عالمانہ واقفیت کو ظاہر کرتی ہیں وہیں دوسری طرف جدید علوم اور عصری مسائل سے ان کی گہری آگہی کی بھی مظہر ہیں —— پروفیسر مشیر الحق اردو اکادمی، دہلی کے کرم فرماؤں میں تھے۔ اکادمی کی طرف سے منعقد کیے جانے والے اکثر سیمیناروں میں وہ شریک ہوتے رہے تھے اور اکادمی کے رسالے "ایوانِ اردو" کی قلمی معاونت بھی کرتے رہے تھے۔ اس اعتبار سے ان کی دائمی جدائی کا غم ہمارا ذاتی غم بھی ہے۔

ہم مرحومین کے غمزدہ خاندانوں سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں اور ان کے غم میں شریک ہیں۔

سرورق کے اندرونی صفحے کے لیے
موصولہ عنوانات

اپریل ۱۹۹۰ء کے "ایوانِ اُردو دہلی" کے سرورق کے اندرونی صفحے پر جو تصویر چھاپی گئی تھی، اس کے لیے موصول ہونے والے شعری اور نثری عنوانوں میں سے تصویر کی مناسبت سے موزوں سمجھے جانے والے چند عنوان ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں :

شعری عنوانات

سفر ہے شرط مُسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے (خواجہ حیدر علی آتش)

مرسلہ : مقصود حسن خاں گمنامؔ، رائے بریلی

جھپک رہی ہیں زمان و زمین کی آنکھیں
مگر ہے قافلہ آمادۂ سفر پھر بھی (فراق)

مرسلہ : سعید احمد قائد (۷۰۰، مدرسہ حسین بخش، بازار مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی ۱۱۰۰۰۶)

کل صبح کے دامن میں تم ہوگے نہ ہم ہوں گے
بس ریت کے سینے پر کچھ نقشِ قدم ہوں گے (نامعلوم)

مرسلہ : اشتیاق احمد کریمی (معرفت شاکر کریمی، گنج ۱، بتیا، مغربی چمپارن ۸۴۵۴۳۸)

تشکیل کی آگ نے اس آتشِ صحرا میں بھٹکایا
وگرنہ کیوں بیاباں میں تلاش و جستجو کرتے (جلال)

مرسلہ : محمد خالد عمران، بھاگلپور

اپنے سب منظر لٹا کر شام رخصت ہو گئی
تم بھی واپس لوٹ جاؤ ہم بھی اپنے گھر چلے (شمیم فاروقی)

مرسلہ : سید صفدر حسن، گیا

نکل چلو کہ یہ صحرا ہے تپتے لمحوں کا
کہیں نہ ہونٹوں سے باہر زبان نکل آئے (محمد احمد رمز)

مرسلہ : کلیم انصاری، مالیگاؤں

قریبِ شب طلوعِ موج بے شمار دیکھیے
فرازِ خوں کا ڈھلتی رات میں اتار دیکھیے (مصور سبزواری)

مرسلہ : خالد انصاری، مالیگاؤں

کتنے دریاؤں سے گزر آئے
اب سمندر بھی آزمانے دے (پرکاش فکری)

مرسلہ : سعدیہ بانو، مالیگاؤں

کیوں لبھاتے ہیں دور کے منظر
اس تماشے کا بھید پانے دے (پرکاش فکری)

مرسلہ : فرح شمیم محمد فاروق، مالیگاؤں

ہے نقشِ کارواں نہ کہیں گردِ کارواں
منزل کی جستجو میں چلے آئے ہم کہاں (نامعلوم)

مرسلہ : غازی اسلام، کٹیہار

چل رہے ہیں دھوپ سے تپتی ہوئی راہوں پہ لوگ
اور سارے سائباں در سائباں پھیلے ہوئے (تسلیم الٰہی زلفی)

مرسلہ : معین الدین شمسی، گریڈیہہ

گاؤں کو چھوڑ نیرؔ جو جانے لگے
شہر کے کارخانے بلانے لگے (اظہر نیر)

مرسلہ : فرخندہ شاذیہ، دربھنگہ

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا (مجروح)

مرسلہ : اکرام حسین خاں، دھنباد اور فرحت آفرین محمد اظہر، مالیگاؤں

نثری عنوانات

"سرابوں کا سفر" (جیلانی بانو کا افسانہ)

مرسلہ : رضوانہ شبیر احمد (روم نمبر ۹۷۸، ہزار کھولی (ایم۔ ایچ۔ بی۔ کالونی)، گراس لین، مالیگاؤں ۴۲۳۲۰۳، ناسک)

"انسان اور بزمِ قدرت" (اقبال کی نظم)

مرسلہ : معین الدین شمسی، گریڈیہہ

"زندگی" (علامہ اقبال کی نظم)

مرسلہ : محمد مستحسن اختر معصوم، گاچھپاڑہ

"محنت و مشقت" (اقبال کی نظم)

مرسلہ : محمد خالد عمران، بھاگلپور

"اندھیری رات کے مسافر" (نسیم حجازی کا ناول)

مرسلہ : محمد صدیق، علی گڑھ

"غیر آباد علاقوں کا سفر" (مقالہ: مخمور سعیدی)

مرسلہ : محمد احفاظ الرحمٰن، بھاگلپور

"ایک مٹھی ہندوستان" (سید شمیم اشرف کا ناول)

مرسلہ : سلمان منیر، بمبئی

"جھیل کے اُس پار" (گلشن نندہ کی کہانی)

مرسلہ : سلطانہ شبیر احمد، مالیگاؤں

"روزی کا سوال" (واجدہ تبسم کا افسانہ)

مرسلہ : سعید احمد قائد، دہلی۔ اور خان عشرت پرویز، لکھیم پور کھیری۔

"چلکا جھیل کی ایک شام" (اظہر نیر کی نظم)

مرسلہ : ابوذر ہاشمی، دربھنگہ

"سمندر کا بلاوا" (مصور سبزواری کا ڈراما)

مرسلہ : احسان اللہ عمیر، دربھنگہ

"گلدستہ" دوسرے اور تیسرے نمبر پر درج شعری عنوان اور پہلے نمبر پر درج نثری عنوان بھیجنے والے کو ارسال کیا جا رہا ہے۔

آپ کی رائے

) فروری ۱۹۹۰ء کے "ایوانِ اُردو" صفحہ ۳۸ پر امروز صاحب کے نام جو غزل شائع کی گئی ہے وہ غزل ںِ ہے۔ یہ غزل دو سال قبل میں نے تھی اور سکندرآباد کے بے شمار لوگ کے گواہ ہیں۔

——— یعقوب بدر، سکندرآباد

) مارچ ۹۰ء کے "حرفِ آغاز" کے ت ڈاکٹر خلیق انجم کے حوالے سے جو سئلہ اُردو والوں کے سامنے پیش کیا ہے اور جس انداز میں اس پر ہی کا اظہار ہوا ہے، وہ کسی قدر دُرست یمکمل طور پر دُرست کہنے سے اس ریز کر رہا ہوں کہ اُردو کا دامن ان رعات سے یکسر خالی نہیں ہے۔ زراعت ب کی دہلی سے ہی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ اُردو بورڈ نے بھی اس ضمن میں کام کیا اُردو بازار والوں نے اس غریب ن کو غلط جگہ روانہ کیا۔ مجھے یقین ہے کاشت کار کا مسئلہ اُردو بازار ہی مل ہو سکتا تھا مگر اُردو کتابوں کی ں پر جس ذہنیت کے سیلزمین ی دیتے ہیں خود ان کی ذات سے پڑھنے والے اکثر و بیشتر مایوس تے ہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ بک رز کتابوں کو موضوعاتی سیکشن میں تقسیم کریں ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھیں کہ کس سیکشن میں کس موضوع پر کون کون سی کتب موجود ہیں۔ جس اُردو بازار کے سیلزمینوں کی عدم واقفیت کی بنا پر "حرفِ آغاز" میں یہ مسئلہ پیش کیا گیا ان سے ماہ ناموں کی بابت دریافت کیا جائے تو رعونت سے جواب ملتا ہے کہ اندر جا کر تلاش کر لیں۔

——— علی امام نقوی، بمبئی

○ "ایوانِ اُردو" (مارچ ۹۰ء) کے شمارے میں "حرفِ آغاز" اور "آپ کی رائے" کے تحت شائع شدہ چند مکتوبات پڑھنے سے اُردو زبان کی محرومی کا احساس بڑھ گیا۔ آپ نے جو کچھ لکھا وہ بھی صحیح ہے، اور مراسلہ نگاروں نے جن خیالات و احساسات کا اظہار کیا ہے، وہ بھی بجا۔ اصل میں اس صورتِ حال کی پوری ذمّہ داری ہم اُردو والوں پر عائد ہوتی ہے۔ اُردو زبان کو اس کے دشمنوں سے اتنا نقصان نہیں پہنچا جتنا کہ نام نہاد بہی خواہانِ اُردو سے پہنچا ہے۔ البتّہ اس بات سے میں اختلاف کرتا ہوں کہ اُردو زبان میں جدید علوم کا سرمایہ نہیں ہے۔ بہت سے لوگ جانتے ہیں کہ حیدرآباد میں جامعہ عثمانیہ کبھی اُردو ذریعۂ تعلیم کی یونیورسٹی رہی ہے۔ میڈیکل سائنس، انجینیئرنگ اور قانون کی تعلیم کا وہاں بندوبست تھا۔ ان علوم سے متعلق سارا سرمایہ اُردو زبان میں دستیاب تھا، اس کے علاوہ ایک "دارالترجمہ" بھی تھا، جس کے ذمّے عصری علوم کو اُردو زبان میں منتقل کرنے اور اصطلاحات وضع کرنے کا کام تھا۔ لیکن بدقسمتی سے جامعہ عثمانیہ کا ذریعۂ تعلیم بدل گیا اور "دارالترجمہ" بند ہو گیا۔ اردو والوں نے اس کام کو آگے بڑھانے کی ذمّہ داری قبول نہیں کی جس کی وجہ سے آج اُردو زبان کے لیے مشکلات اور مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ وہ زبان اپنی افادیت کھو دیتی ہے جس کا روزگار سے رشتہ منقطع ہو جاتا ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس کی ذمّہ داری کسی پر عائد ہوتی ہے۔ اُردو والوں نے حکومت کی طرف سے فراہم کردہ سہولتوں سے کس حد تک استفادہ کیا ہے، اُردو اکیڈمیوں کا بس یہی ایک کام رہ گیا ہے کہ شعرا کو ان کے مجموعوں کی طباعت میں مدد دیں اور انعامات تقسیم کریں۔ اُردو زبان کا دم بھرنے والے کیا اپنے بچّوں کو اُردو میڈیم سے تعلیم دِلوانا پسند کریں گے؟ یہ اور اس طرح کے کئی مسائل ہیں جن پر سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر کی ضرورت ہے۔

——— حسینی جاوید، حیدرآباد

○ مارچ کے "حرفِ آغاز" میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ ہمارے مصنّفین اور قارئین کے لیے واقعی لمحۂ فکریہ فراہم کرتا ہے۔ ایسے افراد جو دیگر موضوعات کی کتابیں چاہتے ہیں وہ بے شک اُردو رسائل اور کتب کیوں خریدنے لگے لیکن یہ خیال کہ اُردو میں ایسے قارئین کی تعداد کتنی ہے؟ کچھ زیادہ وزنی نہیں

ہے کیوں کر یہ ہمارے رسائل کے مُدیران ، ہیں جو قارئین کے خیالات کو مہمیز لگاتے ں۔ رہی یہ بات کہ اگر" اُردو ہماری روزمرّہ ، زندگی میں آج بھی وہی جگہ حاصل کرلے اُسے کبھی حاصل تھی تو اس کی ترقّی کی وریں خود بہ خود پیدا ہو جائیں گی۔" اس ے" اگر" نے اُردو کو آزادی کے بعد سے ست الثریٰ' میں دھکیل دیا ہے۔ اگر ہم ،" اگر" سے نکل جائیں تو جملہ مسائل حل سکتے ہیں۔

"ایوانِ اُردو" اور" اُمنگ" کی قیمتوں ، کمی کے لیے ہم انتظامیہ اور اُردو اکادمی فعّال احباب کے شکر گزار ہیں۔

—— ابن اسحٰق بنگلوری، نئی کیرہ

○ مارچ کے "حرفِ آغاز" میں جو کچھ کہا یا ہے توجہ طلب ہے۔ ضرورت اس بات ہے کہ اُردو زبان و ادب سے متعلق جو زی اور صوبائی ادارے ہیں وہ اپنے وسائل صرف ں تصنیفات و تالیفات' نیز شاعروں ۔ ادیبوں کو انعامات پر ہی صرف —— ردیں بلکہ ان کا کچھ حصّہ ایسے لٹریچر کی ری پر بھی خرچ کریں جو زندگی کی عملی رورتیں پوری کرتا ہو۔ اس طرح جو نے لوگ صرف اُردو زبان ہی جانتے ، انگریزی یا ہندی نہیں جانتے' ان کی کلات دُور کی جاسکتی ہیں اور اُردو کو ک کارآمد زبان بنایا جاسکتا ہے۔

زراعت' باغبانی' پھلوں اور دلوں کی کاشت' صنعت و حرفت' ئنس اور ٹکنالوجی' کمپیوٹر سائنس' ٹوگرافی' فوٹو اسٹیٹ' فنِ تعمیر' سیاسی معلومات جیسے لوک سبھا' راجیہ سبھا' ودھان سبھا' ودھان پریشد کے اصول اور ضابطے' مرکزی سکریٹریٹ اور صوبائی سکریٹریٹ سے متعلق ابتدائی جانکاری کی باتیں' عدالتی چارہ جوئی اور محکمہ جاتی کارروائی کے لیے رہنما اصول ۲۰ نکاتی ۱۵ نکاتی پروگرام اور امداد باہمی سے متعلق معلومات کوآپریٹو سوسائٹیز کے اصول اور ضابطے اصلاح اراضیات سے متعلق جانکاری اور متعلقہ آفیسروں کے اختیارات' زمینی سروے' چک بندی' نقشہ' کھتیان کے بارے میں پوری پوری جانکاری' اقلیتوں' پسماندہ طبقوں' ہریجنوں کے لیے جو مراعات ملتی رہتی ہیں ان کی تفصیل اور حصول کے طریقے' دیہی و شہری ترقیاتی پروگرام کے تحت قرض لینے کی سہولتیں' سب سڈی کی رعایتیں جو خاص طبقوں کے لیے ہوا کرتی ہیں' مکان یا دکان کرایے پر دینے یا لینے کے بارے میں مختلف صوبوں کے قوانین وغیرہ وغیرہ —— یہ ایسے موضوعات ہیں جن پر اُردو میں لٹریچر کی سخت ضرورت ہے۔ جو اہلِ قلم یہ کام انجام دے سکیں ان کا شمار اُردو کے محسنوں میں ہوگا اور وہ اہلِ وطن کے ایک بڑے حصّے کی طرف سے شکر گزاری کے مستحق ٹھہریں گے۔

—— اختر نیا گنجوی' پٹنہ

○ مارچ ۹۰ء کا شمارہ میرے سامنے ہے۔ اس بار افسانوی حصّہ کسی تخلیقی تاثر سے خالی تھا۔ یہی حال منظومات کا بھی ہے۔ کاظم علی خاں کی " مثنوی حُزنِ اختر: منظر پس منظر" کوئی نئی بات سامنے لانے سے قاصر رہی ہے۔ اس موضوع پر سہ ماہی اکادمی' نیا دَور لکھنؤ اور دوسرے جرائد میں کافی کچھ لکھا جا چکا ہے۔ شمس کنول کا رئیس امروہوی پر تحریر کردہ مضمون زیادہ معیاری ہوتا اگر اُس میں ہر جگہ وہ خود جلوہ گر نہ ہوتے۔ ان کے تمام مضامین میں' ان کی اپنی "انا" ہمیشہ شخصیت مذکورہ پر غالب نظر آتی ہے۔ پورے شمارے میں صرف ثریّا ہاشمی کا مضمون" اُردو مرقع نگاری" خاکہ نویسی کا ایک مکمل اور جامع جائزہ ہے۔ " ہم طرح اشعار" کا سلسلہ کسی طرح بھی کارآمد و مفید نہیں۔ اس کے بجائے آپ نفسیات' فلسفہ' معاشیات اور سائنس کے موضوعات سے کسی ایک کے لیے دو صفحات وقف کر دیں۔" آپ کی رائے" میں محترمی نامی انصاری نے مولانا آزاد کی مادری زبان عربی قرار نہ دے کر اُسے اُردو ثابت کرنے کی سعی کی ہے جبکہ خود مولانا نے' ایک ملاقات میں مجھ سے اپنی مادری زبان عربی ظاہر کی تھی۔ علاوہ ازیں مولانا کی والدہ عرب تھیں اور مادری زبان' یعنی ان کی ماں کی زبان بہر حال عربی تھی۔ خبر نامے کی کچھ خبروں میں کسی قدر اختصار سے کام لیا جانا چاہیے تھا۔

"حرفِ آغاز" میں آپ نے ایک بے حد تلخ حقیقت کو بھرپور تاثر کے ساتھ اُردو داں اصحاب کے سامنے پیش کیا ہے —— کاش اس ضمن میں ابتدا بھی آپ ہی کریں کیوں کہ آپ کے پاس صرف" ایوانِ اُردو" ہی نہیں ایک مکمل فعّال ادارہ بھی ہے۔

—— ایم۔ جمال علوی' لکھنؤ

○ "ایوانِ اُردو" برابر مل رہا ہے، شکریہ آپ کی جدوجہد قابلِ تحسین ہے۔ اب ہر مضمون دلچسپ اور پڑھنے والا ہوتا ہے مارچ کے شمارے میں شمس کنول کا مضمون "رئیس امروہوی" پڑھنے کو ملا۔ یقین کیجیے مرحوم رئیس امروہوی کی صورت آنکھوں میں پھر گئی۔ فیاض رفعت کی کہانی "شرمیلا" بے حد اثر انگیز ہے۔

—— انیس دہلوی، دہلی

○ مارچ ۹۰ء کا "ایوانِ اُردو" دیکھا۔ مضامین کارآمد ہیں۔ کاظم علی خاں نے مثنوی "حزنِ اختر" کے پس منظر کو بڑے سلیقے سے پیش کیا ہے۔ مگر ثریا ہاشمی کا مضمون ذرا مبہم سا لگا۔ انھوں نے مرقع اور خاکے میں کوئی تمیز کیا ہے۔ جبکہ خاکہ صرف ظاہری ہوتا ہے گویا اسے OUT LINE کہہ سکتے ہیں۔ مرقع میں کچھ رنگ آمیزی ہوتی ہے اور شخصیت کے چند اوصاف ملتے ہیں۔ گویا ایک پینسل اسکیچ ہے تو دوسرا کیمرے کے ذریعے لیا گیا فوٹو۔

—— محبوب اقبال فرحان، پٹنہ

○ مارچ کے شمارے میں رئیس امروہوی پر جناب شمس کنول کا مضمون بہت پسند آیا۔ رئیس امروہوی کے متعلق بہت کچھ معلومات اس مضمون سے حاصل ہوئی۔

اُردو مرقع نگاری بھی اچھا مضمون ہے مگر مضمون نگار نے کچھ ایک خاکہ نگاروں کے نام نہیں لیے۔ مثلاً غلام رضوی گردش صاحب، جن کے شخصیاتی خاکوں کا پہلا مجموعہ "پراگندہ طبع لوگ" آٹھویں دہائی کی ابتدا میں منظرِ عام پر آچکا ہے۔ دوسرا مجموعہ "مہرباں کیسے کیسے" بھی ۱۹۸۶ء میں منظرِ عام پر آچکا ہے۔ تیسرا مجموعہ "صاحب نظراں" کے نام سے ۱۹۸۹ء میں چھپا ہے۔

افسانوی حصے میں فیاض رفعت کا افسانہ "شرمیلا" عمدہ افسانہ ہے۔ "ہاشم کی بیوی" گجراتی افسانے کا یہ ترجمہ بے حد پسند آیا۔ اُمید ہے آئندہ بھی دوسری ہندوستانی زبانوں کے تراجم نظم و نثر اشاعت پذیر ہوں گے۔

—— روشن لال روشن بنارسی، وارانسی

○ اپنی تمام جلوہ سامانیوں کے ساتھ مارچ کا "ایوانِ اُردو" نظر نواز ہوا۔ سرورق پر مغل آرٹ کا نمونہ اور قیمت سابقہ کا اعلان دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ رئیس امروہوی پر مضمون اور محمد مانکڈ کا افسانہ حاصلِ شمارہ ہیں۔ مخمور سعیدی صاحب کے لیے اپنی شعری و نثری تخلیقات کو "ایوانِ اُردو" میں شائع کرانے پر کیا مکمل پابندی لگی ہوئی ہے؟[1]

—— محمد ابراہیم صدیقی، الہ آباد

(۱) یہ پابندی خود عائد کردہ ہے اور اس کا سبب ہے دفتر میں اشاعت کی منتظر نگارشات کا ہجوم۔ مخمور سعیدی

○ مارچ کے "ایوانِ اُردو" میں "رئیس امروہوی ایک انسان دوست شاعر" معلوماتی اور دلچسپ مضمون ہے۔ خصوصاً خطوط کے انتخاب میں اُن کی تحریر کا بے باکانہ اور ساتھ ہی سحر کارانہ رنگ ایک مستند شاعر کے جادو اثر نثری اسلوب کی بھی غمازی کرتا ہے۔ لفظ لفظ سے اُن کی ذہانت کا اندازہ ہوتا ہے:

اُٹھ گئی ہیں سامنے سے کیسی کیسی صورتیں

کہانی "ہاشم کی بیوی" میں زبیدہ کے معصوم اور گلرنگ چہرہ دیکھ کر کس کا دل نہیں پھٹ پڑے گا۔ سیتا کی پوترتا اور مریم کے تقدس کی ایسی نہ جانے کتنی جیتی جاگتی مثالیں آج بھی اس دھرتی پر موجود ہیں جو اپنے پتی کی چوکھٹ کو ہی جنت کا دروازہ سمجھ کر اُس سر کے آنگن میں پیار، محبت اور ایثار و وفا کے خوش رنگ و خوش نما گلاب کھلاتے کھلاتے اپنے جیون کی انتم سانسیں بھی وار دیتی ہیں

اُردو میں ایسے رسائل کی سخت ضرورت محسوس کی جا رہی ہے جو نئی نسل کو ادب کے علاوہ زندگی کے دوسرے شعبہ جات اور علمی میدان میں تمام مقابلہ جاتی امتحانات سے نبرد آزمائی کا حوصلہ فراہم کر سکیں۔ یہ احساس خوش کن ہیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اس طرح کے رسائل کو سینے سے لگانے والوں کی تعداد ہم میں کتنی ہے ——؟ اس معاملے میں ہندی اور انگریزی کے رسائل واقعی خوش قسمت ہیں کہ اُن کے پاس وسائل بھی ہیں اور سرکولیشن بھی ماشاء اللہ خوب ہے۔ لیکن اُردو کے ساتھ تو ٹریجڈی یہ ہے کہ خود اسی کے آدمی اس سے دغا کر رہے ہیں۔ ایک بھاری تعداد تو ایسے لوگوں کی ہے جو اُردو کے رسائل میں محض چٹپٹی چیزیں تلاش کرتے ہیں پھر ادب کے علاوہ دیگر صحت مند اور مقصدی چیزیں تو اُن کے لیے بڑا ہی روکھا نوالہ ہوئیں نا ——؟ صورتِ حال کچھ اس قدر تشویش ناک ہے کہ ایسے میں قلم کار اور ناشرین دونوں کی بے چارگی پر ترس آتا ہے۔

—— فراق جلال پوری، فیض آباد

) مارچ کے شمارے میں سرورق کے اندرونی
کے لیے جو اشعار شائع ہوتے ہیں ان میں
ب محمد صدیق علی گڑھی کی طرف سے روانہ
ہوا ایک شعر ہے جس کے خالق کا نام نہ
ے کر نامعلوم لکھا ہے میں ان کی اور قارئین
اطلاع کے لیے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ
رجۂ ذیل شعر جناب حق بنارسی کا ہے
کانپور میں قیام پذیر ہیں :

د تو ہر چہرے کو آئینہ بنا دیتی ہے
ے غریبی کوئی رکھے ترا پردا کیسے

—— مشتاق کانپوری، کانپور

) "ایوانِ اُردو" کے مارچ کے شمارے
جناب طفیل احمد خاں صاحب، مستی پور
یک خط شائع ہوا ہے جس سے افسانہ
روں کی غیر ذمہ داریوں کا پتا چلتا ہے
ایک نازیبا سوال پر ایڈیٹر محترم کی
یت اور زیادہ حیرت انگیز ہی نہیں
تکلیف دہ بھی ہے ۔

یں جناب طفیل احمد خاں صاحب
ایک سوال کرتا ہوں کہ جب تخلیق کار کو
ی تخلیق کی اشاعت کی اطلاع نہ دی
ے یا اُسے وہ شمارہ نہ بھیجا جائے اور
ق سے وہ شمارہ اُس کی نظر سے نہ
رے تو اور کون سے ذرائع ہیں جس
اُسے معلوم ہو جائے گا کہ اُس کی فلاں
ں یا اُس کا فلاں افسانہ شائع ہو چکی یا
چکا ہے ۔ چندی گڑھ سے نکلنے والے
سرکاری رسالے کے شمارۂ دسمبر
ء میں میرا ایک افسانہ شائع ہوا ۔ اشاعت
طلاع مجھے نہیں ملی اور نہ شمارہ ہی ملا
چھ کرم فرماؤں نے بتایا اور بہت بعد
میں شمارہ دستیاب ہوا ۔

۱۹۸۲ء میں دہلی کے ایک مشہور
سرکاری ماہنامے کے مدیرِ محترم کا خط ملا
کہ میرا ایک افسانہ اشاعت کے لیے پسند
کر لیا گیا ہے مگر وہ آج تک شائع نہیں
ہوا ۔ میں نے دو خطوط بطور یاد دہانی
ارسال کیے لیکن خاموشی ہی حاصلِ سعی رہی ۔

۸۷ء میں دہلی ہی کے ایک اور سرکاری
رسالے کے سب ایڈیٹر نے میرے ایک
افسانے کے قریبی شمارے میں شائع کر دیے
جانے کی اطلاع دی ۔ انھیں بھی دو خطوط
ارسال کر چکا ہوں مگر جواب نہ ملا ۔

۵ فروری ۹۰ء کو بھاگل پور کے
فسادات سے متاثر ہو کر میں نے ایک افسانہ
'نباتات بولتے ہیں' لکھا ۔ کچھ اخبارات
کو ارسال کیا گیا ۔ ۲۴ فروری کو جب
الہ آباد ایک بارات کے سلسلے میں جانا ہوا
تو کچھ لوگوں کے بتانے پر مجھے معلوم ہوا کہ
افسانہ شائع ہو چکا ہے مگر کسی اخبار
کے ایڈیٹر نے میری درخواست کے باوجود
کہ اشاعت کی اطلاع ضرور دیں، مطلع
نہیں کیا ۔[1]

مجھے یہ لکھتے ہوئے افسوس ہے کہ اُردو
اخبارات اور رسائل بڑے بڑے اخلاقی نعرے
تو لگا سکتے ہیں لیکن انھیں برت نہیں سکتے
اور پھر جن رسالوں کا ذکر ہوا ہے ان کے ایڈیٹر
صاحبان کے خطوط کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں
آپ کے اطمینان کے لیے ارسال کی جا رہی ہیں ۔

—— عین الحق بلیاوی، بلیا

(۱) دوسرے اخبارات و رسائل کا طریقِ کار کیا ہے،
اس بارے میں ہم کچھ کہنے سے قاصر ہیں ——

"ایوانِ اُردو" میں اشاعت کے لیے جو تحریریں منتخب
کی جاتی ہیں، ان کے بارے میں قلمکار حضرات کو اطلاع
بھی دی جاتی ہے اور شائع ہونے پر متعلقہ شمارہ اور
تحریر کا معاوضہ بھی ارسال کیا جاتا ہے ۔

—— ادارہ

○ فروری ۹۰ء میں شائع شدہ ڈاکٹر
جمیل جالبی کے گراں قدر مضمون "میرا جی :
ایک مطالعہ" سے متعلق حوالہ نمبر ۲۲ میں
ایک فروگذاشت ہے ۔ محمد حسن عسکری کا
مرتب کردہ مجموعہ "میری بہترین نظم" کتابستان
الہ آباد نے ۱۹۴۲ء میں شائع کیا تھا نہ کہ
ساقی بک ڈپو دہلی نے ۱۹۴۴ء میں ۔ یہ کتاب
میرے ذاتی کتب خانے میں موجود ہے ۔

میرے مضمون "نصف صدی پہلے کا
ایک نایاب ادبی جریدہ" (اپریل ۹۰ء)
میں چند غلطیاں راہ پا گئی ہیں ۔ ان کی
نشان دہی ضروری ہے ۔

صفحہ ۱۶، کالم ۱، سطر ۶ ۔ "صدائے
عام" کی جگہ "صلائے عام" ۔

صفحہ ۱۶، کالم ۳، سطر ۲ ۔ "۳۵ء"
کی جگہ "۳۴ء" ۔

صفحہ ۱۷، کالم ۱، سطر ۱ ۔ "اعجاز
بستوی" کی جگہ "اعجاز نستوی" (نستہ
NISTA دربھنگا ضلع کا ایک گاؤں ہے) ۔

صفحہ ۱۷، کالم ۲، سطر ۱۳ ۔ "جمیل
احمد کندھانپوری" کی جگہ "جمیل احمد کندھاپوری" ۔

صفحہ ۲۰، کالم ۱، سطر ۶ ۔ "نغمہ و نالہ"
کی جگہ "نالہ و نغمہ" ہونا چاہیے ۔

—— مظہر امام، دربھنگا

○ "ایوانِ اُردو" بابت اپریل ۹۰ء میں
آپ نے اس خاکسار کے مضمون "اُڑیسہ میں
اُردو —— نشیب و فراز" کو اشاعت کی

سعادت بخشی ہے۔۔ اس عنایت کے لیے میں تہِ دل سے شکر گزار ہوں۔

افسوس کہ مضمون نقل کرواتے وقت اس کا ایک اہم پیراگراف سہواً مجھ سے چھوٹ گیا۔ مضمون شائع ہوکر آیا تو میں انگشت بدنداں رہ گیا ـــــ آپ سے گزارش ہے کہ براہِ کرم منسلک پیراگراف "ایوانِ اردو" کے زیرِ ترتیب شمارے میں میرے اس خط کے ساتھ قارئین کی رائے کے کالم میں شایع کردیں۔

اردو کے نامور شاعر جناب مظہر امام ۱۹۵۸ء میں آل انڈیا ریڈیو کٹک میں پروگرام ایگزی کیوٹیو کی حیثیت سے فائز ہوتے ہوئے موصوف کا قیام ۱۹۵۸ سے ۱۹۶۳ء تک شہر کٹک میں رہا۔ مظہر امام کی آمد سے شہر کٹک کی ادبی فضا میں ایک نئی تحریک کا آغاز ہوا اور انھوں نے اپنے ترقی پسند خیالات اور جدید اندازِ فکر سے اڑیسہ کے شاعروں کو متاثر کیا اور ادب کے جدید رجحانات سے انھیں روشناس بھی کرایا۔ ان کی تحریک پر کرامت علی کرامت نے اڑیسہ اردو پبلشرز کی بنیاد ڈالی۔ اس ادارے کی اوّلین اشاعت کے طور پر امجد نجمی کا شعری مجموعہ "طلوعِ سحر" منظرِ عام پر آیا جس کا پیش لفظ خود مظہر امام نے لکھا تھا۔ مظہر امام نے اپنے دورانِ قیام کٹک میں "یومِ جگر" کی تقریب کا اعلا پیمانے پر اہتمام کیا تھا۔

۱۹۶۲ء میں ہندوستان پر چین کے جارحانہ حملے کی مذمت کے لیے بزمِ سخن کے زیرِ اہتمام ایک مشاعرہ منعقد ہوا جس میں پیش کردہ نظمیں مظہر امام نے "صدائے ہمالہ" کے نام سے مرتب کر کے شائع کیں۔

موصوف نے کٹک کے نوجوانوں کے ادبی ذوق کی آبیاری میں نمایاں کارنامے انجام دیے۔ اردو کے معروف شاعر خالد رحیم اور کٹک کے متعدد شعرا نے اسی دور میں ان سے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔

مظہر امام کا اوّلین شعری مجموعہ "زخمِ تمنا" اڑیسہ اردو پبلشرز سے شائع ہوا اور موصوف کے اصرار پر ہی کرامت علی کرامت نے اڑیسہ کے اردو شعرا کا تذکرہ "آبِ خضر" مرتب کرکے شائع کیا۔ مظہر امام ماہنامہ "شاخسار" کٹک اور نجمی اکیڈمی کے مشیر رہے ہیں۔

ـــــ حفیظ اللہ نیولپوری، بھدرک

○ قیمت بڑھانے کے بعد پھر گھٹا دینا ایک غیر معمولی کام ہے جو آپ نے کر دکھایا۔

ـــــ (ڈاکٹر) محمد فاروق اعظم، بھاگا

○ قیمت میں اضافے کے بعد پھر سابقہ قیمت بحال کرنے پر مبارکباد قبول فرمائیں۔

ـــــ محمد اختر عادل عثمانی، کلا

OO

بقیہ: نئی مطبوعات

شاعر ہیں اور انھیں زبان و بیان پر دسترس حاصل ہے۔ ان کی یہ نعتیں دل سے نکلی ہوئی آواز معلوم ہوتی ہیں۔ فنّی لحاظ سے انھوں نے نئی زمینوں کا انتخاب کیا ہے۔

توقع ہے کہ ابرار کرتپوری کی یہ مقدس پیشکش قدر و منزلت کی نظر سے دیکھی جائے گی۔

ـــــ اسد رضا

OO

اردو اکادمی، دہلی کا ماہانہ رسالہ

فون نمبر: ۳۲۶۳۴۴۸، ۳۲۷۶۲۱۱

ایوانِ اردو دہلی

ادارۂ تحریر:
سید شریف الحسن نقوی، مخمور سعیدی

جلد: ۴ شمارہ: ۲ فی کاپی ۵۰ر۲ روپے، سالانہ قیمت ۲۵ روپے جون ۱۹۹۰ء

ماہنامہ "ایوانِ اُردو دہلی" میں شائع ہونے والے افسانوں میں نام، مقام اور واقعات سب فرضی ہیں، کسی اتفاقیہ مطابقت کے لیے اِدارہ ذمہ دار نہیں۔
مضمون نگاروں کی آرا سے اِدارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتا
ماہنامہ ایوانِ اُردو دہلی
اُردو اکادمی، دہلی ـــ گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

خوشنویس: تنویر احمد

سید شریف الحسن نقوی (ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر) نے سیما آفسیٹ پریس دہلی ۱۱۰۰۰۶ سے چھپوا کر دفتر اُردو اکادمی، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا

پچھلے دنوں وزیرِ خارجہ جناب اندر کمار گجرال اکادمی کے دفتر میں ایک استقبالیہ تقریب میں شریک ہوئے جو انھی کے اعزاز میں رکھی گئی تھی۔ اس تقریب کی صدارت اکادمی کے چیئرمین اور دہلی کے لفٹننٹ گورنر سابق ایئر چیف مارشل جناب ارجن سنگھ نے کی۔

ہم نے اپریل کے شمارے میں لکھا تھا کہ محترمہ اندرا گاندھی کی وزارتِ عظمیٰ کے زمانے میں اُردو کے مسائل کا جائزہ لینے کے لیے گجرال صاحب کی سربراہی میں جو کمیٹی قائم کی گئی تھی، اس کی پیش کردہ سفارشات ایسی تھیں کہ اگر ان پر عملدر آمد ہو جاتا تو اُردو والوں کے بہت سے مطالبات پورے ہو سکتے تھے اور ایک قومی زبان جن ناانصافیوں کا شکار ہو رہی تھی، ان کی تلافی ہو سکتی تھی۔ ہم نے اس پر اطمینان کا اظہار کیا تھا کہ موجودہ حکومت نے گجرال کمیٹی کی سفارشات کو قبول کر لیا ہے اور ان کے عملی نفاذ پر غور کرنے کے لیے ایک نئی کمیٹی قائم کی ہے جس میں اُردو دُنیا کی جانی پہچانی شخصیتیں شریک ہیں۔

استقبالیہ تقریب میں اکادمی کی تحقیقاتی اور اشاعتی سب کمیٹی کے چیئرمین پروفیسر قمر رئیس نے اپنی تقریر میں زور دے کر یہ بات کہی کہ ملک کے موجودہ حالات میں جب ہر طرف تفریق پسند طاقتیں سر اُٹھا رہی ہیں، قومی یک جہتی کے احساس کو تقویت پہنچانے کے لیے اُردو زبان کو بڑھاوا دینا ضروری ہے کیوں کہ اس زبان کا خمیر ہی گروہی اتحاد اور مختلف الخیال لوگوں کے درمیان باہمی رواداری کے تصورات سے اٹھا ہے۔

محترم گجرال صاحب نے موجودہ حکومت کی قائم کردہ نئی کمیٹی کا ذکر کیا اور اُمید ظاہر کی کہ یہ کمیٹی جلد ہی ایسی تدابیر سامنے لائے گی جو اُردو کے فروغ میں موثر طور پر معاون ہو سکیں۔ انھوں نے کہا کہ حکومت کا موقف اس معاملے میں بالکل واضح ہے۔ ہم ایک قومی زبان کے طور پر اُردو کی اہمیت اور افادیت کو محسوس کرتے ہیں۔ اُردو کا دائرۂ اثر دوسری کئی ہندوستانی زبانوں سے زیادہ وسیع ہے، نہ صرف یہ کہ یہ ملک کے بیشتر حصّوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے بلکہ بعض بیرونی ممالک میں بھی اس کا چلن عام ہوتا جا رہا ہے اس لیے یہ ہمارے لیے بین الاقوامی رابطے کی زبان بھی ہے۔

حکومتِ ہند کے ایک اہم وزیر کے ان اُمید افزا خیالات کی روشنی میں ایک بار پھر ہم اُردو کے ان عمائدین سے جو گجرال کمیٹی کی سفارشات پر عملدر آمد کے ذمّہ دار ٹھہرائے گئے ہیں، یہ گزارش کرتے ہیں کہ وہ اس کام کی اہمیت کو صحیح طور پر سمجھیں اور جلد از جلد اپنی تدابیر حکومت کو پیش کر دیں۔ تساہل کی اس وقت ذرا بھی گنجائش نہیں ہے۔ بیورو کریسی میں ایسے افراد موجود ہو سکتے ہیں جو حکومت کی صاف دِلی اور نیک نیتی کے باوجود اس معاملے کو پس پشت ڈال دینے میں دلچسپی رکھتے ہوں۔ ہماری غفلت یا تساہل انھیں من مانی کرنے کا موقع دے سکتا ہے۔

—— سیّد شریف الحسن نقوی

بلراج کومل

رقص

ایک موسم تھا شمالی، ایک موسم تھا جنوبی
ایک موسم مشرقی
ایک موسم مغربی
اور کچھ ایسے بھی تھے اطراف میں، پہچان کے آزار میں اُلجھے ہوئے
سرد، یخ بستہ ہوائیں
جسم و جاں کو چیرتی برہم صدائیں
نرم بارش
تیز بارش
دھوپ شفقت سے بھری
دھوپ دہشت سے بھری
دشت میں جلتی ہوا
سبز پیڑوں میں گھرے اک گاؤں میں بادِ صبا
آسماں میں دُور تک اُڑتے پرندے
مضطرب بپھرے سمندر، تیز شور
بستیوں کی سمت تیزی سے جھپٹتے لامکانی غوطہ خور

موسموں کا سلسلہ تو تھا مگر
ایک موسم تھا یہاں تو دوسرا موسم وہاں
کوہ ساروں، وادیوں، اُونچے درختوں
جنگلوں، ندیوں، پریشاں ساحلوں کے درمیاں
اجنبی بے رحم سیّاروں، ستاروں کا اسیر

تم جزیرہ ہو، مرے دل میں، درخشندہ و تابندہ
تمھارا نام ہے قوسِ قزح
دور تک سرسبز کھیتوں، مرغزاروں، آبشاروں
برگ و گل کا معجزہ
پربتوں کی چوٹیاں، آتش فشاں خفتہ نشیب
صبح دم، موجِ صبا، سورج کے پہلے لمس کا جشنِ ضیا
دوپہر کی دھوپ، دھندلی شام کے سایوں کی مدّھم سی صدا
شبنمی بارش کی سرگوشی
یکایک شور کرتی، تیز سرگم چیختی پاگل ہوا
آسماں، رنگوں، بدلتے نت نئے رنگوں میں ڈھلتا آسماں
چار سو آفاق تک نیلا سمندر
وسعتوں میں دور اور نزدیک کے
طائرانِ خوش نوا

موسموں کے سارے چہرے
عالم وارفتگی میں ایک ساتھ
رقص کرتے تھے تمھارے آئنے میں روز و شب
قرب کے اعجاز میں
کون کس کا عکس تھا
تم سے ملتے ہی میں سارے موسموں کے ساتھ محوِ رقص تھا

ای ۱۳۹، کالکا جی، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۹

ساجدہ زیدی

عہدِ طفلی اور ذہنی آزادی

اوائل عمر کی نفسیاتی کیفیات میں سے اگر بہ فرضِ محال کسی ایک کیفیت کا انتخاب کیا جائے، جس پر انسان کی ذہنی صحت کا دارومدار ہو سکتا ہے، اور عہدِ شباب اور دورِ بلوغت میں فرد اپنی زندگی سے مطمئن رہ سکتا ہے، تو جذباتی آسودگی و تحفظ کے علاوہ وہ تجربہ آزادیِ ذہن کا ہوگا ___ آزادیِ ذہن و فکر ایک ایسا انسانی ATRI-BUTE- ہے جس کے بغیر اگر ایک طرف قومیں زوال پذیر ہو جاتی ہیں اور معاشرہ بنجر ہو جاتا ہے تو دوسری طرف انفرادی زندگی معنویت اور رنگ و آہنگ سے محروم رہ جاتی ہے اور اس میں ٹھہرے ہوئے پانی کی سی کثافت در آتی ہے، یعنی ایک ایسی نفسیاتی گھٹن جس کا ازالہ نہ عیش و آرام سے ممکن ہے نہ ہی قوت و دولت کی فراوانی سے۔

اس انسانی صفت کی بنیادیں پڑتی ہیں بچپن اور نوعمری میں۔ اور آزادی کی بنیاد آزادی ہی ہوتی ہے پابندی نہیں۔

ہمارا معاشرہ بڑی حد تک بالغ زندگی کے تقاضوں اور مسائل پر مبنی ہے۔ بلکہ یہ کہنا مبالغہ آرائی نہ ہوگا کہ دنیا کے زیادہ تر معاشروں میں یہی صورتِ حال ہے، کہنے کا مدعا یہ ہے کہ ہمارے معاشرے کی اقدار، رویّے، آداب و اطوار، قواعد و ضوابط مسائل اور ان کے حل، منصوبے اور ان پر عمل، مقاصد و معیارات سب کا تانا بانا، بالغ زندگی کے تقاضوں سے بُنا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عہدِ طفلی سے عنفوانِ شباب تک کا زمانہ مستقبل کی تیاری کا زمانہ سمجھا جاتا ہے۔ اور اس عرصۂ حیات میں بچوں اور نوجوانوں کو معاشرے کی ان تمام اقدار و رجحانات کا تابع بنانے کی کوشش کی جاتی ہے جو بزرگوں، اساتذہ، اور دیگر اہم شخصیات کی نظر میں ان کی آئندہ زندگی کی کامیابی، خوشحالی اور آسودگی کی ضمانت ہوتے ہیں۔ یعنی بچوں کو ایک کامیاب 'شہری' بنانے اور 'سماج' سے مطابقت پیدا کرنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

ہر چند کہ اس نقطۂ نظر کے بھی اپنے جواز موجود ہیں اور اس کی افادیت ثابت کرنے کے لیے متعدد دلائل پیش کیے جا سکتے ہیں اور پیش کیے جاتے ہیں۔ لیکن اس جوش میں ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ بچوں کی اپنی الگ دُنیا ہوتی ہے۔ اس دنیا کے اپنے تقاضے، اپنی آسودگیاں، اپنے مسائل اور اپنے دباؤ ہوتے ہیں۔ سماجی اور نفسیاتی دونوں قسم کے۔ اس کے علاوہ تعلیمی اور نفسیاتی اعتبار سے بچے زمانۂ حال میں زندہ رہتے ہیں، نہ کہ مستقبل میں۔ ان کی ذہنی آزادی، جذباتی آسودگی، اور جسمانی ترقی کے لیے لمحۂ موجود کی، اس "شاندار مستقبل" سے کہیں زیادہ اہمیت ہوتی ہے جو ان کے لیے سماج یا بزرگوں نے طے کر رکھا ہے۔ اور جس کی تیاری میں ان کے معصوم آزاد اور بے فکر بچپن کے خوشگوار برس بے کیفی اور بوریت کی نذر ہو جاتے ہیں۔

علاوہ بریں یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ ___ اگر ہم یہ مان لیں کہ عہدِ طفلی میں تعلیمی و تربیتی سلسلہ محض مستقبل کی زندگی کی تیاری ہے، یعنی ہمیں اپنے بچوں کے ذہنوں کو محض طے شدہ اقدار، رویّوں اور اطوار کی تربیت دینی ہے؛ تو اس صورت میں فرسودہ فکری سانچوں میں دراڑیں کون ڈالے گا؟۔ ان مقررہ رویّوں کی نفی کون کرے گا جو ہمارے غیر اخلاقی اور مذموم سماج کا حصہ بن چکے ہیں۔ ان اقدار میں شگاف کون ڈالے گا جن کی بدولت محض دولت و قوت کا حصول زندگی کی معراج بن چکا ہے؟ اور جن کی بالادستی کی بنا پر سماج میں ذہنی، اخلاقی اور تخلیقی سطحوں پر ارتقا اور تبدیلی کی گنجائش محدود ہو گئی ہے! کیا ہم تاریخی پس منظر میں اس حقیقت سے انکار کر سکتے ہیں کہ:

ہر کس کہ شد صاحب نظر
دینِ بزرگاں خوش نہ کرد

اور:

[illegible] دودھ پور، علی گڑھ (یو۔پی)

گفت رومی، ہر بنائے کہنہ کاں باداں کنند
می ندانی اوّل آں بنیاد را ویراں کنند

مدعا یہ ہے کہ بچّے ذہنوں کو کسی مقرّرہ سانچے میں فٹ کرنا اور کسی مخصوص سماجی فریم میں جڑ دینا، ذہن کے اس ارتقا، بالیدگی اور صحت کی نفی کرنا ہے، جو آزادی کی فضاؤں ہی میں پروان چڑھ سکتے ہیں۔

سب سے پہلے تو ہمیں یہ نکتہ سمجھنے کے لیے ذہنی آزادی کا رشتہ نفسیاتی طور پر ایک بھرپور زندگی سے جوڑنا ہوگا۔ یہ سمجھنا ہوگا کہ عہدِ طفلی اور عنفوانِ شباب کے تقاضے کیا ہیں؟ بچّوں میں کیا کیا صلاحیتیں ہو سکتی ہیں؟ اور ان کی نشو و نما کے کیا طریقے ہیں؟ اور نفسیاتی طور پر آسودہ و بالیدہ زندگی، محروم، مجبور اور محدود زندگی کے مقابلے میں کس طور پر ذہنی اور فکری آزادی کی ضامن ہو سکتی ہے۔

تعلیمی نفسیات کی رو سے بچّوں کی شخصیت کے گوناگوں پہلوؤں کا اظہار، ابتدا ہی سے، ان کے کھیلوں، مشاغل، دوستیوں، محبتوں، بیزاریوں اور دلچسپیوں وغیرہ کے ذریعے ہوتا رہتا ہے۔ شخصیت کے ان پہلوؤں میں بچّوں کی مخصوص صفات، (مثلاً ہمدردی یا بے دردی، سخاوت یا کنجوسی، ملنساری یا خود کفالت وغیرہ) ان کے رویّے (مثلاً دوستانہ، مخلصانہ، لاپرواہی وغیرہ) ان کے مخصوص رجحانات (مثلاً کھلنڈرا پن، سنجیدگی، فارملزم، تخلیقیت وغیرہ) اور ان کا میلانِ طبع وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔ جن کا سلسلہ بہت طویل ہوتا ہے۔ اکثر رویّوں اور اقدار کی تشکیل، عمر کے ارتقا کے ساتھ ساتھ، ماحول کے زیرِ اثر بعد میں ہوتی ہے۔ شخصیت کے یہ پہلو ایک طرف تو بچّوں کی ذہنی، جذباتی، جسمانی، تخیلی، تخلیقی اور سماجی ابعاد کا احاطہ کرتے ہیں۔ اور دوسری طرف بچّوں کی جبلّتوں، صلاحیتوں، اوصاف، رُجحانات، میلانات اور رویّوں وغیرہ کا متعدد شکلوں اور مختلف سطحوں پر اظہار ہوتے ہیں۔ یہ تمام پہلو، بچّوں کی شخصیت کے آسمان پر کہکشاں کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ یعنی دیکھنے میں تو ایک روشنی کا اٹوٹ سلسلہ سا، مگر دراصل، اور بہ نظرِ غائر مشاہدے کی صورت میں لاتعداد ستاروں (پہلوؤں) کا مجموعہ ——— یہ رُجحانات و میلانات اور جبلتیں اور صلاحیتیں وغیرہ اتنے قوی ہوتے ہیں کہ اپنے اظہار کے مختلف راستے ہمیشہ تلاش کرتے رہتے ہیں۔ ان پر بند باندھ کر ان کا رُخ تو متعیّن کیا جا سکتا ہے، لیکن شخصیت کے ان سرچشموں کو گھونٹ کر ان کو مقید نہیں کیا جا سکتا، کہ ایسی صورت میں یہ سرچشمے کسی اور جگہ سے پھوٹ پڑیں گے۔ بہ الفاظِ دیگر اگر انھیں اپنے اظہار کے آزادانہ اور مناسب راستے نہیں ملیں گے تو وہ نیوراتی شکل میں اور تخریبی کارروائیوں میں اپنی راہِ معکوس ڈھونڈ نکالیں گے جو سماج اور متعلقین کے لیے ناپسندیدہ و تکلیف دہ اظہارات ہوں گے اور سب سے بڑی بات یہ کہ یہ غیر صحت مند اور مریضانہ اظہارات بچّوں کی شخصیت کو مسخ کر دیں گے ——— چنانچہ ہم اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کر سکتے کہ اگر ان ابعادِ شخصیت کے سمجھنے میں کوتاہی کی جاتی ہے یا ان نفسیاتی تقاضوں پر بے جا جذباتی دباؤ ڈالا جاتا ہے تو بچّوں کی ذہنی نشو و نما، شخصی بالیدگی اور جذباتی زندگی پر اس کے بہت مضر اثرات پڑتے ہیں۔ بے جا دباؤ کی صورت میں بچّوں کے سامنے دو ہی صورتیں ہوتی ہیں:

(۱) یا تو وہ ماحول اور معاشرے کے جبر اور والدین اور استادوں کے اقتدار کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے ہیں، اپنے نفسیاتی تقاضوں کے اظہار اور اثبات سے ڈرنے لگتے ہیں، اور اس طرح رفتہ رفتہ اپنی ذات اور اس کے امکانات سے دور ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ خارجی اور معاشرتی توقعات کے سانچوں میں ڈھل کر وہ اپنی ذات سے بیگانہ، اور اپنی ذہنی و جذباتی زندگی سے اجنبی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اور یہ حادثہ انسانی قوّتوں کی موت کا حادثہ ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے امکانات کی دُنیا سکڑ اور سمٹ جاتی ہے۔

دوسرا ردِّ عمل، بے جا نفسیاتی دباؤ کا یہ ہوتا ہے کہ بچّے ماحول کے نفسیاتی جبر کے خلاف بغاوت کر دیتے ہیں۔ یہ بغاوت بیشتر صورتوں میں سماجی یا سیاسی نہیں بلکہ نفسیاتی ہوتی ہے۔ اس کا مظاہرہ نہ صرف منفی رویّوں مثلاً شدید غصّہ، نفرت، کدورت، جارحیت، تخریب کاری، حکم عدولی اور ایک قسم کی جاری و ساری منافرت کی شکل میں ہوتا ہے، بسا اوقات اس کا رُخ خود اپنی شخصیت کی

جانب مڑ جاتا ہے۔ بچہ خود اپنی ذات سے برسرِ پیکار ہو جاتا ہے، اور خود شکستگی، احساسِ کمتری اور احساسِ بے مائیگی میں مبتلا ہو کر اپنی نفی و تخریب آپ کرنے پر مائل ہو جاتا ہے۔ اگر کسی بچے کی طبیعت میں نرمی ہوتی ہے تو یہ خود اذیتی ایک قسم کی دبی دبی جھنجلاہٹ کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے جو بالآخر نیوروسس کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔ اور یہ سانحہ بھی انسانی امکانات کی پسپائی کا سانحہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب صورتیں، یعنی ذات سے فرار، ذات کا جارحانہ اظہار یا خود تخریبی، ذہنی آزادی اور شخصی نشوونما کی ضد ہیں۔

ہمارے سامنے سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ ذہنی آزادی کی تربیت یا رہنمائی کس طرح ممکن ہے؟ میرا خیال ہے کہ اس ضمن میں سب سے پہلے تو ہمیں بچوں کے ان عام رُجحانات کو سمجھنے کی ضرورت ہے جو بالکل انفرادی تو نہیں ہوتے لیکن تھوڑے بہت ردّ و بدل کے ساتھ تقریباً تمام نوعمروں میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً کھیل اور تفریح کی طرف رجحان اور اس وسیلے سے اپنے مختلف جذباتی تقاضوں کی تسکین مثلاً ذوقِ تجسس اور اس کے ذریعے چیزوں کی نوعیت و ماہیت جاننے کی خواہش، نامعلوم کی طرف کشش، سوالات کرنے کی عادت، مثلاً جودتِ طبع اور اس کی مدد سے ماحول پر اپنی طبیعت کے مطابق انوکھے طریقوں سے ردِّ عمل۔ مثلاً مجرد خیالات اور باضابطہ تحریکات کی بہ نسبت عملیت، حسیت اور ٹھوس حقائق کی طرف رجحان ـــ مثلاً معروضیت کے مقابلے میں موضوعیت کی طرف جھکاؤ وغیرہ ... ان عام رجحانات کا علم و ادراک، بچوں کی ذہنی تربیت کے سلسلے میں ہماری بڑی دُور تک معاونت کر سکتا ہے۔

ان عام رجحانات کے علاوہ ہمیں خالص انفرادی رجحانات اور مخصوص صلاحیتوں کو سمجھنے کی بھی کوشش کرنی چاہیے۔ مثال کے طور پر بعض بچوں کا جھکاؤ فنونِ لطیفہ کی طرف ہوتا ہے۔ یعنی انھیں رنگ و بو، ترنم و آہنگ۔ الفاظ و صوری حسن زیادہ متاثر کرتے ہیں، اور بعض کا جھکاؤ سائنس کی طرف ہوتا ہے۔ یعنی انھیں اشیا کی ماہیت جاننے کی جستجو بے چین رکھتی ہے۔ ٹھوس حقائق متاثر کرتے ہیں، اور فطرت کے حسن کے بمقابلہ فطرت کی نوعیت جاننے کی خواہش نمایاں ہوتی ہے۔ علاوہ بریں بعض بچوں میں عملی صلاحیت مخصوص طور پر نمایاں ہوتی ہے بعض میں فکری۔ بعض لیڈرشپ کی طرف مائل ہوتے ہیں تو بعض تخلیقی اظہار کی طرف، بعض میں لسانی صلاحیتیں فطری طور پر ظاہر ہوتی ہیں تو بعض میں مصوری و نقاشی وغیرہ کی غرض نفسیاتی طور پر بچے بہت اوائل عمر ہی میں اپنی انفرادی خصوصیات کا اظہار کر دیتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم انھیں دیکھنے کے لیے نظر پیدا کریں، ان کی نشوونما، اظہار، تربیت، ارتفاع کرنے اور ان کا صحیح رُخ متعین کرنے کے کوشاں رہیں کہ ذہنی آزادی نہ تو نفسیاتی خلا میں پرورش پاتی ہے اور نہ ہی جذباتی گھٹن اور ذہنی ناآسودگی کی فضاؤں میں پروان چڑھتی ہے۔ ذہنی آزادی کی نشوونما کے لیے ایک بھرپور شخصیت اور تربیت یافتہ ذہن کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور یہ خصوصیات صرف بالغوں ہی حصّہ نہیں ہوتیں، جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ ایک شاداب، مطمئن اور جذباتی طور پر محفوظ و مامون بچپن کی بھی پہچان ہیں۔

والدین اور اساتذہ گھر، اور تعلیم گاہوں کے ماحول کو بچوں کے لیے جتنا سازگار بنائیں گے، اسی حد تک یہ ادارے عہدِ طفلی کے ناپختہ ذہن اور نرم و نازک جذباتی زندگی کی صحت مند نشوونما کے ضامن ہوں گے۔

سازگار ماحول میں بزرگوں اور بالغوں اساتذہ اور دیگر اہم شخصیات کے اقتدار اور آمریت کا دور دورہ نہیں ہوتا، بلکہ بچوں کو اپنے جذبہ و خیال کے آزادانہ اظہار کی سہولت میسّر ہوتی ہے۔ ایسا آزادانہ اظہار جس میں جارحیت اور خود نمائی کے عناصر کی کارکردگی نہ ہو بلکہ نامحسوس طور طریقوں سے تربیت اور رہنمائی بھی جاری رہے اور بچوں کی دلچسپیوں کا صحت مند اور قابلِ قبول انداز سے رُخ بھی متعین ہوتا رہے۔ یہ ضروری ہے کہ بچوں کو اس بات کا احساس دلایا جائے کہ وہ اپنے خیالات کے اظہار میں دلچسپیوں کے انتخاب میں، اور صلاحیتوں کے مظاہرہ میں آزاد ہیں۔ ان کی رائے کی اہمیت ہے ان کی شخصیت کی قدر ہے۔ وہ بڑوں کے تابعِ مہمل کی حیثیت سے نہیں، بلکہ اپنی

انفرادی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ انھیں ایک ایسی جذباتی آسودگی کا احساس ہونا ضروری ہے جس کی بنیاد محفوظیت کا احساس اور محبّت و دلجوئی کا رویّہ ہوتا ہے۔ تاکہ بچّے یہ باور کرسکیں کہ ان کی نگہداشت، بڑوں کی عنایت و احسان نہیں بلکہ ان کا اپنا پیدائشی حق ہے اور یہ کہ یہ نگہداشت دپرداخت ایک فطری عمل ہے، یعنی وہ ایک آزادانہ فضا میں پروان چڑھیں۔ نفسیاتی طور پر اس نوع کی آسودہ و مطمئن زندگی ہی ایک ایسے ذہن کی پرواخت کی ضامن ہوسکتی ہے، جو آزادیٔ خیال و آزادیٔ اظہار کے قابل بن سکے۔ ذہنی تربیت کا یہ انداز خاصا دشوار گزار لیکن ناگزیر ہے۔

اس گفتگو سے ہم چند ایسے نتائج اخذ کرسکتے ہیں، جو بظاہر تو عام بات معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن جن کا اثبات کرنے کے سلسلے میں والدین اور اساتذہ کو علم و ادراک کے علاوہ بڑے نفسیاتی ریاض کی ضرورت ہوتی ہے:

- ذہنی آزادی ایک ایسا انسانی ATRIBUTE ہے جس کی غیر موجودگی میں قوموں کی زندگی زوال پذیر اور افراد کی زندگی حسن و معنویت، بے باکی و بے ساختگی سے عاری ہوجاتی ہے۔
- ذہنی آزادی کی بنیاد نوعمری، بلکہ اوائل طفلی ہی میں پڑتی ہے۔
- ذہنی آزادی کا نفسیاتی آسودگی و ذہنی تربیت سے گہرا رشتہ ہے۔
- ذہنی تربیت دراصل بچّوں اور نوعمروں کی ذات کے نفسیاتی تقاضوں کو سمجھنے، ان کی پذیرائی کرنے، اور بچّوں کی ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا دوسرا نام ہے۔
- یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم اس امر کا شعوری ادراک اور اعتراف کریں کہ بچّوں کی اپنی دنیا ہوتی ہے، جس کے تقاضے بچّوں کی ذہنی و جذباتی زندگی سے منسلک ہوتے ہیں، نہ کہ بالغوں کے فرسودہ امر و نہی کے تصورات سے۔ بچّے چھوٹے چھوٹے مرد اور عورتیں نہیں ہوتے بلکہ ایک جیتی جاگتی، محسوس کرتی تخیّلی اور تخلیقی مخلوق ہوتے ہیں۔
- بچّوں کا ایک ایسے سازگار ماحول میں پروان چڑھنا ضروری ہے، جس میں ان کی شخصیت اور انفرادیت کو کھلے ذہن کے ساتھ قبول کیا جائے۔
- ایک بھرپور، آزاد، آسودہ، اور صحت مند نفسیاتی زندگی اور جذباتی تسکین کے اسباب مہیا کرنا ہی ذہنی تربیت ہے۔ اور یہی ذہنی تربیت ذہنی آزادی کا سرچشمہ ہے۔
- بچّوں کی ذہنی آزادی سے انکار اور اس کی نفی، قوتِ حیات کی موت ہے۔ اور یہ ایسا سانحہ ہے، جس کے نتیجے کے طور پر امکانات کی دنیا سکڑ اور سمٹ جاتی ہے۔

○○

غزلیں

منظور ہاشمی

اب لفظ ہوئے مشکبو معانی ہوئے
سخن کیا تو فضاؤں کے رنگ دھانی ہوئے

ہوا میں اُڑنے لگے اس کے ذکر پر الفاظ
خرامِ ابر ہوئے موج کی روانی ہوئے

اب اس کے بعد کی منزل نجانے کیا ہوگی؟
کہ اک زمانہ ہوا ہے لہو کو پانی ہوئے

مرے قدیم چراغوں میں، کیا کرامت تھی
کہ بجھے، تو نئی صبح کی نشانی ہوئے

ہمارے دن بھی تھے راتیں بھی تھیں زمانہ بھی
مگر وہ گردشِ دوراں کی ترجمانی ہوئے

کہیں کہیں کوئی کردار اب بھی زندہ ہے
اگرچہ دیر ہوئی ختم وہ کہانی ہوئے

مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (یوپی)

رئیس الدّین رئیس

رہے گا رنگِ شفق محوِ گفتگو تجھ سے
زمین پائے گی میرے لہو! نمو تجھ سے

غبارِ اشک مری چشمِ بے خطا سے نکل
مرے غنیم کریں گے یہاں وضو تجھ سے

نہ ضربِ سنگ تجھے میں نے خیرباد کہا
شرابِ درد نہ خالی ہوئے سبو تجھ سے

بنائے رکھنا سدا صبر کو سپر اپنی
شکست پائیں گے اِک روز جنگجو تجھ سے

ثبوتِ فتح رئیسؔ اور کیا ملے تجھ کو
پناہ مانگ رہا ہے ترا عدو تجھ سے

رئیس الدّین رئیس
۱۷۲۵/۱۰، دہلی گیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ (یو۔پی)

شاہد عزیز

پتّھروں میں جاں رکھ دے
درد کی زباں رکھ دے

جھوٹ موٹ ہی اِک دن
سر پہ آسماں رکھ دے

ان اُداس چہروں پر
اب تو سرخیاں رکھ دے

زخم زخم آنکھوں پر
اپنی اُنگلیاں رکھ دے

پیڑ سوکھ جائیں گے
سبز پتّیاں رکھ دے

تلخیاں ہٹا دے سب
پیار درمیاں رکھ دے

۱۷۹، ملّاح تلائی، اودے پور ۳۱۳۰۰۱ (راجستھان)

علی امام نقوی

ضرورت

درشن سنگھ نے کچھ اس انداز سے بستر چھوڑا جیسے نادیدہ ہاتھوں نے اس کے پورے وجود کو جھنجوڑ دیا ہو۔ سیدھے کھڑے ہوتے ہوتے پائجامے کی الاسٹک درست کرنے کے بعد وہ موری کی طرف بڑھا۔ مگّے سے پانی نکالنے کے بعد اس نے دو چار چلّو پانی سے چہرہ دھویا۔ ہلکی سی طمانیت پیدا ہوتے ہی وہ تیزی سے کھڑکی کی طرف بڑھ گیا۔ چند لمحوں بعد کرسی کھینچ کر اس پر بیٹھتے ہوئے اس نے سامنے والی بلڈنگ پر نگاہ ڈالی۔ وہ کھڑکی آج بند تھی۔ اور کھڑکی کے بند پٹوں پر نظر پڑتے ہی اسے پچھلی شام یاد آگئی۔ وہ ہنگامہ یاد آیا جو اسے پھر سے کھلے آسمان کے نیچے زندگی گزارنے پر مجبور کر دیتا۔ بے نیل و مرام نگاہوں کی واپسی کے دوران اس نے نکڑ کی چھوٹی سی بند دکان کو دیکھا۔ یہ حکیم صاحب کا مختصر سا مطب تھا جہاں سورج غروب ہوتے مریض کم اردو کے شاعر اور ادیب زیادہ تعداد میں جمع ہوا کرتے تھے۔ خود حکیم صاحب بھی شعر کہا کرتے تھے اور حکیم صاحب کے طفیل ہی درشن کو یہ مکان کرائے پر مل سکا تھا۔ سراپا شفیق حکیم صاحب۔ لیکن کل —— ان کا انداز کتنا ذلیل کرنے والا تھا۔

"اوئے سردار۔"

اس نے محسوس کیا، ہوا کے دوش پہ اڑتا حکیم صاحب کا تضحیک آمیز لہجہ اس کے کانوں میں پگھلتے سیسے کی مانند اتر گیا ہے۔ سر کو جھٹکنے کے بعد پھر ایک مرتبہ اس نے کھڑکی کو دیکھا۔ پٹوں کی جھری سے روشنی باہر آرہی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ جاگ گئی۔ دبلی، پتلی، سانولی ایک عام سی لڑکی۔ کیا وہ مجھے اب دکھائی دے گی اس سوال نے جونہی اس کے دماغ میں سر ابھارا تو اس کی نگاہوں کا زاویہ تبدیل ہوگیا۔ اس نے سامنے کی عمارت کے دوسرے منزلے پر نظر ڈالی۔ وہاں وہی منحوس شکل اسے دکھائی دی جس کی شکایت پر پچھلی شام ہنگامہ ہوا تھا۔ وہ لڑکا بڑے غور سے درشن کو دیکھ رہا تھا۔ نفرت کا احساس شدید ہوتے ہی اس نے تھوڑا سا لعاب منہ میں گھولا اور جھک کر سڑک پر تھوک دیا۔ سر اٹھاتے ہوئے اس نے پھر لڑکے کو دیکھا۔ وہ اب مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔ لڑکے کی مسکراہٹ اس کے خلاف نفرت کے احساس کو زائل نہ کرسکی تو کھڑکی بند کر کے وہ پھر موری کی سمت بڑھا۔

آلتی پالتی مارے، موری میں بیٹھ کر نہاتے ہوئے اسے اپنا گاؤں یاد آنے لگا۔ بھٹوڑہ خالص سکھوں کی آبادی پر مشتمل۔ ادھر سے ادھر تک بس ایک ہی رنگ تھا۔ کھڑونچے کی چھوٹی چھوٹی سڑکیں تھیں۔ بڑے بڑے پختہ اور نیم پختہ مکانات۔ خاصے بڑے کمروں کے آگے دالان اور دالان کے سا[illegible] ماں کے دل کی طرح پھیلا ہوا صحن، بیچوں[illegible] نیم کے درخت یا بوڑھے برگد۔ دیوار[illegible] پاس یا قدرے فاصلے پر کٹی کاٹنے کی مشی[illegible] برسوں پہلے جب وہ چھوٹا سا تھا تب ا[illegible] بابا کو دستی مشین سے کٹی کاٹتے دیکھا کرتا[illegible] اس کی ماں مخالف سمت سے چری کی چھو[illegible] کا گچھا مشین میں دیا کرتی تھی۔ لیکن پچھلے پند[illegible] بیس برسوں سے وہ ٹریکٹر کی مدد سے کٹ[illegible] کاٹا کرتے تھے۔ ڈنگروں کی سانی سے نمٹنے کے بعد دن چڑھے جب وہ چھکڑا مار کر نہلا[illegible] بیٹھتا تب اس کے مکان پر خاموشی چھا جا[illegible] سارا دن اونچی اونچی آواز میں باتیں کرنے والا اس کا بابا سورج ڈھلتے ہی ایک [illegible] چپ ہو جاتا۔ کیوں کہ سورج ڈھلتے ہی مار[illegible] اپنا پیتل کا لوٹا اٹھا کر دالان میں گڑھی کے کنارے بیٹھ کر پہلے پیروں کو دھویا کرتی پھر ہاتھوں کو پہنچے پہنچے، کلیاں کرتی۔ چلّو کا پانی نتھنوں . . .

اسے یاد آیا کہ روز دن ڈھلے اپنی بیوی کو ہاتھ منہ دھوتے دیکھ کر اس کا بابا کسی گہری فکر میں ڈوب سا جاتا۔ اس کی خاموشی میں کون سا راز چھپا ہوا تھا؟ ہزار کوششوں کے بعد بھی اسے معلوم نہ ہوتا لیکن ایک روز سویرے جب اس کی آنکھ کھلی تو اس پر وہ راز منکشف ہوگیا۔ اور اس کے بعد تو سارا معاملہ ہی اس کی سمجھ میں آگیا تھا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اس نے

معرفت ایران قونصل، ۴۷۔ نے پین سی روڈ، بمبئی ۳۶...

باپ کے خلاف کچھ سوچا تھا۔۔۔

پھر اُسے جالندھر کالج کا زمانہ یاد آیا۔ اِک الگ ہی دُنیا تھی وہ بھی کھیتوں کھلیانوں سے وہاں تک لاتعداد پگڈنڈیاں پہنچتی تھیں۔ کتنے پیارے تھے وہ دن۔ پتا ہی نہیں کہاں چلے گئے ؟ گرو جی کی بیڑ پہ جلتی دھوپ کے دھوئیں سمان لیکن ایک دن دھوئیں کی واپسی ہو ہی گئی۔ اب کے جو دھواں آیا تو اپنے ساتھ چنگاریاں لیتا ہوا آیا۔ کب وہ چنگاریاں شعلوں میں تبدیل ہوں پتا ہی نہیں چلا۔ ہوش آیا تو ماں اور بابا کی جلی ہوئی لاشیں سامنے پڑی تھیں۔ دہلی کے ترلوک پوری میں بھی اس نے تباہی پھیلائی تھی۔ ہیرا اور سوہنی کی بستی اب انسانی لہو اور آگ کے شعلوں سے پہچانی جانے لگی ہے۔ آگ، دھواں اور لہو ـــــ

دہلی سے لُٹ پٹ کر وہ بیدر پہنچا۔ خالصہ کالج میں ملازمت بھی مل گئی۔ لیکن اس کے پیچھے آگ بھی پہنچ گئی پھر خون بہا۔ پھر دُھواں اٹھا اور ایک روز ـــــ آگ، دھوئیں اور خون سے بچتا بچاتا وہ پُونے کے اسٹیشن پر موجود تھا۔ پریشان حال۔

"جو چھٹ گیا۔ اس پہ کڑھنا بے کار ہے میاں۔ خدا کا شکر ادا کرو۔ جان بچ گئی۔"

پلیٹ فارم پر اتفاقاً حکیم صاحب سے ملاقات ہو گئی تھی۔ کچھ دیر بعد جب انھیں پتا چلا کہ وہ خالصہ کالج میں لیکچرار تھا تو ان کی ہمدردی نے دوسرا رُخ اختیار کر لیا۔ انھوں نے ڈھارس ہی نہیں بندھائی بلکہ اپنے ساتھ لے کر مطب پہنچے۔ مطب کے سامنے والی عمارت میں اُس کے رہنے کا انتظام کرا دیا اور ہوٹل والے سے اُس کے لیے چائے بنوا کر بھی خود ہی لائے۔

"چائے پیو میاں۔ مارا ماری ہے یہ۔ نہیں سمجھے۔ ہمارے لیے ہوٹل والے اسپیشل چائے بناتے ہیں۔ اس کا نام انھوں نے مارا ماری رکھا ہے۔ گلے پہ جا کے کوئی بھی کہہ دے، دو مارا ماری بس پانچ منٹ بعد چائے باوا کے سامنے۔ لو چائے پیو۔ بیدر کو بھول جاؤ۔ میں نے کہا تھا نا۔ جو ۔۔۔ چھٹ گیا اس پر کڑھنا بیکار ہے۔ اب تو یوں سوچو، پروردگار اس کے بدلے کچھ اور دینے والا ہے۔"

یہ حکیم صاحب کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ درشن نے سوچا۔ کیا انھوں نے گرو گرنتھ پڑھی ہے ؟ مگر وہ تو میں نے کہاں اس طرح پڑھی۔ جیسے پڑھنا چاہیے شاید اسی لیے مجھے حکیم صاحب کی زبانی یہ سب سُن کر حیرت ہو رہی ہے۔

حکیم صاحب عرف بابا نے اپنے آس پاس ادیبوں اور شاعروں کا مجمع لگا رکھا تھا۔ سب ان کی عزت کیا کرتے تھے۔ انھی میں سے ایک کے ذریعے حکیم صاحب نے درشن کی ملازمت کا انتظام کر دیا تھا۔ دن بھر اسکول کی مصروفیت میں اپنے کو فراموش کرنے کے بعد شام ڈھلے وہ ساچہ پیر اسٹریٹ کی طرف بڑھتا۔ گھر میں داخل ہوتا تو اسے اپنے کمرے کی دیواریں بڑی اُداس اور ملول سی لگا کرتیں کئی مرتبہ اُس نے ارادہ کیا کہ ان دیواروں پر قوس قزح کی مانند رنگ کروائے۔ لیکن جب بھی اُس نے اس بارے میں سوچا فوراً وہ کانپ بھی گیا۔ کیوں کہ گرم ہوائیں چل رہی تھیں۔ آگ اور دُھواں نز... کب ۔۔۔

ایک دن اُداس اور برہنہ دی... سے نظریں چرا کر بلا ارادہ ہی وہ ک... پہ جا کھڑا ہوا تھا۔ اور اتفاقاً اُس... نظر سامنے چلی گئی۔ سانولی سلونی ناز... لڑکی تھی وہ۔ دوپٹہ اس نے بالائی پہ لپیٹ رکھا تھا اور اس پہ نگاہ پڑتے وہ اک دم آگ، دھوئیں اور خون کے د... عبور کرتا ہوا، اپنے گاؤں پہنچ گیا۔ گرد... کے کنارے پیپل کا لوٹا اسے شدت سے آنے لگا۔

اُس کے بعد تو بلا ناغہ چوبیس گھنٹ... میں دو مرتبہ وہ اسے ضرور دیکھتا۔ دو... میں مستور اس کا سراپا اُسے بڑا پیارا لگ... جتنی بھی دیر تک وہ کھڑکی میں کھڑا اُسے دیکھتا رہتا۔ ساچہ پیر اسٹریٹ کی گہما گہ... کو بھلا دیتا۔ وہ تو اس شر پسند لڑکے کے وجود سے بھی بے خبر تھا جو پچھلے کئی دنوں سے اس کی حرکات و سکنات کا جا... لے رہا تھا۔ اس پر تو اس لڑکے کی شرپسند... اس دن آشکار ہوئی جب دن بھر کی تھکن سے نڈھال چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا و... ساچہ پیر اسٹریٹ میں داخل ہوا تھا۔ حکیم صاحب کو سلام کرنے کے ارادے سے جو... اس نے ہاتھ اٹھایا تو انھوں نے بدلے ہوئے لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

"اوئے سردار۔ ادھر آ"۔

حفظ مراتب کا خیال رکھنے والے حکیم صاح...

عرف باوا کا نیا انداز اس نے فوراً محسوس کر لیا۔ اس نے مطب کے سامنے بچھے باکڑے پر بیٹھے تمام جانے پہچانے چہروں کو دیکھا۔ آج کسی چہرے پر مسکراہٹ نہ تھی۔ سب ہی کے چہروں کے نقوش کرخت سے لگے۔

"کیا بات ہے باوا؟"

"اچھا' ایسا ہے ــــ تیری معصومیت کا ڈراما' اب نہیں چلے گا سردار"

"معصومیت' ڈراما۔ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔"

"بلی دودھ پیتے ہوئے آنکھیں بند کرتی ہے اور یہ بھی سمجھتی ہے کہ دُنیا نہیں دیکھ رہی۔"

"آپ تو پہیلیاں بجھوانے لگے۔"

"آپ پکچر سے ہٹ جاؤ باوا۔ کان کے نیچے دو چماٹ پڑیں گے۔ سب یاد آجائے گا۔" محلے کا وہی شر پسند لڑکا حکیم صاحب سے بولا۔

"تم چُپ رہو۔"

پہلی مرتبہ ایک اجنبی آواز پر درشن نے اسے دیکھا۔ یہ چہرہ کئی مرتبہ وہ اُسی کھڑکی میں دیکھ چکا تھا جہاں وہ سانولی سلونی سی لڑکی اسے نظر آتی رہی تھی۔

"اپنے کو کیا چاچا۔ تمھارا لباچہ ہے یہ۔۔۔ تم سلٹو۔ اپن تو فرض پورا کر دیا۔"

"مہربانی ہے تمھاری میاں۔"

"مہربانی وہربانی کاہے کی۔ سالا زمانہ بدل گیا۔ گھر کے باہر اٹھی دُنیا کو خبر لگ جاتی ہے۔ نہیں لگتی تو بس ماں باپ کو۔ کہ اپنی چھوکری وناس ہونے والی ہے۔"

"اُس کی خبر رکھنے کو قوم میں تمھارے جیسے جوان موجود ہیں۔" حکیم صاحب نے شر پسند لڑکے کو ٹوکتے ہوئے سردار درشن سنگھ کو گھورا' پھر قدرے بلند آواز میں بولے۔

"تم یہ مکان خالی کر رہے کہ ہم اس کا بندوبست کریں۔"

"مگر حکیم صاحب معاملہ کیا ہے۔ میری۔۔۔ میری خطا کیا ہے؟"

"خطا ــــ بتاؤ دلدار۔ تم بتاؤ سردار کو۔ اس کی خطا کیا ہے بتاؤ۔ یہ۔۔۔ یہ سیدھا شکار پور سے آرہا ہے۔"

"باوا تک تمھاری شکایت پہنچی ہے کہ تم گھروں میں تانک جھانک کرتے ہو۔"

"اوہ ــــ" درشن نے اس شخص کو دیکھا جو غالباً لڑکی کا باپ تھا۔ اُدھر دلدار کہہ رہے تھے۔

"ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ تم سے کمرہ خالی کرا لیا جائے۔"

"ہوں۔" درشن نے ایک لمبی ہنکاری بھری۔ ایک ایک چہرے کو غور سے دیکھا' پھر اطمینان بھرے انداز میں قدرے بلند آواز میں سب سے مخاطب ہوا۔

"آپ سب ہی میرے محسن ہیں۔ آپ کو فیصلے کا اختیار بھی ہے اور۔۔۔ مجھے آپ کا ہر فیصلہ منظور ہے۔ لیکن میں یہ چاہوں گا کہ آپ سب اس پورے مسئلے کو اس کے صحیح پس منظر میں کم سے کم ایک بار ضرور دیکھنے کی کوشش کریں۔ آپ' آپ یا آپ۔ کوئی بھی مجھے یہ بتائے کہ میں نے ان بی بی کو کبھی کوئی اشارہ کیا۔ ان سے کچھ کہا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ روز صبح اور رات کو میں ان بی بی کو غور سے دیکھتا رہا ہوں کیونکہ انھیں دیکھنا میری ضرورت ہے۔"

"ضرورت ہے۔" حکیم صاحب کا لہجہ مزید تلخ ہو گیا۔

"جی ہاں باوا ــــ میں جانتا ہوں۔ پرائے مکان میں تاکنا اخلاقی گناہ ہے۔ پر میں کیا کروں۔ اپنے کو اس گناہ پر مجبور پاتا ہوں میں کیوں کہ ہاتھوں کو کانوں پہ رکھنے' جھکنے اور زمین پر سیس ٹیکنے کے بیچ ہی۔ مجھے اس بی بی کے سراپے میں اپنی ماں دکھائی دے جاتی ہے اور میں۔۔۔

کپڑے پہن کر کھڑکی بند کرنے کی خاطر اس نے ہاتھ بڑھائے تو دیکھا سامنے والی کھڑکی کے پٹ کھلے ہوئے ہیں۔ ایک کنارے پر اس بی بی کا باپ کھڑا ہوا تھا۔ کھڑکی خود اسی نے کھولی تھی اور وہ بی بی دوپٹے میں لپٹی سینے پہ ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔

○○

سید حسین

غالب کی سرگذشت سیر و سیاحت

(اُردو خطوط کی تاریخی ترتیب)

مرزا غالب کے حالات و سوانح کی بنیاد بیشتر ان کے خطوط اُردو و فارسی پر اور دستنبو پر رکھی گئی ہے۔ بعض معاصرین نے کچھ روایات سے بھی مدد لی ہے۔

خواجہ الطاف حسین حالی کی رائے ہے

"انھوں نے غالباً ۱۸۵۰ء کے بعد سے اُردو میں خط لکھنے شروع کیے! ... غالباً اُردو میں تحریر اختیار کرنے کو مرزا نے اول اول اپنی شان کے خلاف سمجھا ہوگا مگر بعض اوقات انسان اپنے جس کام کو حقیر اور کم وزن خیال کرتا ہے وہی اس کی شہرت اور قبولیت کا باعث ہو جاتا ہے! جہاں تک دیکھا جاتا ہے' مرزا کی عام شہرت ہندوستان میں جس قدر ان کی اُردو نثر کی اشاعت سے ہوئی ہے ویسی نظم اُردو' نظم فارسی اور نثر فارسی سے نہیں ہوئی!

مرزا کی اُردو خط و کتابت کا طریقہ فی الواقع سب سے نرالا ہے۔ نہ مرزا سے پہلے کسی نے کتابت میں یہ رنگ اختیار کیا اور نہ ان کے بعد کسی سے اس کی پوری تقلید ہو سکی!

انھوں نے القاب و آداب کا پرانا اور فرسودہ طریقہ اور بہت سی باتیں جن کو مترسلین نے لوازم نامہ نگاری میں قرار دے رکھا تھا مگر در حقیقت فضول اور دور از کار تھیں سب اُڑا دیں۔ وہ خط کا کبھی میاں' کبھی برخوردار اور کبھی بھائی صاحب' کبھی مہاراج کبھی کسی اور مناسب لفظ سے آغاز کرتے ہیں اور اکثر بغیر اس قسم کے الفاظ کے سرے ہی سے مدعا لکھنا شروع کر دیتے ہیں ادائے مطلب کا طریقہ بالکل ایسا ہے جیسے دو آدمی بالمشافہ بات چیت یا سوال و جواب کرتے ہیں بعض جگہ مکتوب الیہ کو خطاب کرتے کرتے اس کو غائب فرض کر لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ جو لوگ مرزا کے انداز بیاں سے واقف نہیں وہ اس کو مکتوب الیہ کا غیر سمجھ لیتے ہیں۔"

(یادگار غالب)

اُردو خطوط کی تاریخی ترتیب اُس اہم کام کے تعلق سے اظہار یہ ہے:

"اب اگر پھر سے جیتا جاگتا' چلتا پھرتا' اپنے کارناموں سے دُنیائے ادب کو مغلوب کرتا ہوا غالب دیکھنا ہے تو غالب کے اُردو شعری کلام کی تاریخی ترتیب کے بعد ہمیں جہاں تک ہو سکے غالب کے اُردو خطوط' فارسی خطوط اور فارسی شعری کلام کی تاریخی ترتیب کی طرف دھیان دینا چاہیے!"

(کالی داس گپتا رضا' آج کل جنوری ۶۸)

اُردو خطوط کی تاریخی ترتیب کا کام ڈاکٹر خلیق انجم انجام دے رہے ہیں۔ فارسی خطوط اور غالب کے کلام کی تاریخی ترتیب کا بیڑا جناب کالی داس گپتا رضا نے اٹھایا ہے میں نے یہاں چند خطوط اپنے مطلب کے چن لیے ہیں۔ ان خطوں میں غالب نے جو وارداتیں' جو رودادیں اور جو مفصل تفصیلات تحریر کی ہیں ان کی مدد سے تاریخی ترتیب بخوبی سمجھ میں آتی ہے!

تاریخی ترتیب کے سلسلے میں تقدیم تاخیر کا مسئلہ رکاوٹ بن سکتا ہے' اس لیے تقدیم و تاخیر کے مسئلے کو آئندہ کسی مناسب وقت پر چھوڑ دینا مناسب معلوم ہوا۔

غالب نے اپنی زندگی میں مختلف اوقات میں چھوٹے بڑے مقامات کی سیاحت کی ہے۔ دو لمبے سفر کلکتے اور رامپور کے کیے کلکتے کے سفر کے دوران چند ماہ یا ہفتے لکھنؤ' باندہ' بنارس میں رہے۔ میرٹھ اور بھرت پور وغیرہ بھی گئے۔ عجب نہیں اگر سے دلی آتے جاتے معروف مقامات پر دو چار دن گزارے ہوں جن کا ذکر کرنا ضروری نہ سمجھا گیا ہو۔ تاریخی ترتیب کے لیے تمام خطوط' کاغذات یا خارجی ذرائع سے شواہد اور ثبوت تلاش کرنے کی ضرورت پڑتی ہے غالب کے زیادہ تر خطوں میں تاریخ' مہینہ اور سال درج نہیں ہے۔ ان باتوں کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے تقدیم و تاخیر کا تعین یا لحاظ آئندہ مناسب وقت پر کرنا ناگزیر معلوم ہوا۔ جو خطوط پیش نظر ہیں اور جن میں عموماً تاریخ' ماہ و سال کا اندراج بھی ہے انھیں کو پیش کرنا اچھا جانا "غالب کی سرگذشت سیر و سیاحت" کے عنوان

۲۱۹' ساوتھ صدر بازار' نزد پلٹن مسجد' کیمپ اسکول' شولاپور ۴۱۳۰۰۳ (مہاراشٹر)

سے سفر رامپور ۱۸۶۰ء اور ۱۸۶۵ء کے
متعلق خطوط کی تاریخی ترتیب امید ہے
پسند کی جائے گی!

> "جس شخص کو جس شغل کا ذوق ہو
> اور وہ اس میں بے تکلف عمر بسر کرے،
> اس کا نام عیش ہے!"
> "میں سیر و سیاحت کو بہت دوست
> رکھتا ہوں ۔۔۔ اگر سیر و سیاحت میسر
> نہیں نہ سہی، سرگزشت سیر و سفر ہی
> سہی!"
> (غالب)

سفر رامپور ۱۸۶۰ء　له

(۱)

بنام منشی ہرگوپال تفتہ
مورخہ ۲۱ جنوری ۱۸۶۰ء

بھائی، میں نے دلّی کو چھوڑا اور
رامپور چلا۔
پنجشنبہ ۱۹ کو مراد نگر اور جمعہ ۲۰
کو میرٹھ پہنچا۔ آج شنبہ ۲۱ کو بھائی مصطفیٰ
خاں کے کہنے سے مقام کیا۔ یہاں سے یہ
خط تم کو لکھ کر بھیجا۔
کل شاہ جہاں پور پرسوں گڑھ مکٹیسر
رہوں گا۔ پھر مراد آباد ہوتا ہوا رامپور جاؤں گا۔
اب جو خط بھیجو، رامپور بھیجنا۔ سرنامہ رامپور
کا نام اور میرا نام کافی ہے۔
اب اسی قدر لکھنا کافی ہے۔ باقی جو کچھ
لکھنا ہے وہ رامپور سے لکھوں گا!

راقم
غالب

(مرقومہ چاشتگاہ ۲۱ جنوری ۱۸۶۰ء)

(۲)

بنام عضد الدولہ حکیم غلام نجف خاں
مورخہ ۲۱ جنوری ۱۸۶۰ء

میاں، میں تم سے رخصت ہو کر اس
دن مراد نگر میں رہا۔ دوسرے دن یعنی جمعہ
کو میرٹھ پہنچا۔ نواب مصطفیٰ خاں نے ایک
دن رکھ لیا۔ آج شنبہ ۲۱ جنوری یہاں مقام
ہے۔ نو بج گئے ہیں بیٹھا ہوا یہ خط لکھ رہا
ہوں۔ مفت کا کھانا ہے خوب پیٹ بھر کر
کھاؤں گا۔
کل شاہ جہاں پور، پرسوں گڑھ مکٹیسر
رہوں گا، مراد آباد سے پھر تم کو خط لکھوں گا۔
لڑکوں کے ہاتھ دو خط لکھے ہوئے،
ان کی دادی کو بھجوا دیے ہیں۔ تم اس اپنے
نام کے خط کو لے کر ڈیوڑھی پر جانا اور اپنی
استانی جی کو پڑھ کر سنا دینا اور خیر و عافیت
کہہ دینا۔
جناب خاں صاحب کو میرا سلام نیاز،
ظہیر الدین احمد کو دعا کہہ دینا ۔۔۔ ہاں بھائی
میں از روئے مصلحت اپنے کو مقامات
مختلف کا عازم کہہ آیا ہوں۔ اب جو شخص تم
سے پوچھا کرے اس سے پردہ نہ کرنا اور صاف
کہہ دینا کہ رامپور گیا ہے۔ یعنی سب کو
معلوم ہو جائے اور کوئی تذبذب میں
نہ رہے۔

(مرقومہ چاشتگاہ شنبہ ۲۱ جنوری ۱۸۶۰ء)

(۳)

بنام عضد الدولہ حکیم غلام نجف خاں
مورخہ ۳ فروری ۱۸۶۰ء

برخوردار سعادت و اقبال نشان حکیم
نجف خاں کو میری دعا پہنچے۔ تمھاری تحریر پہنچی
تم جداگانہ خط کیوں لکھا کرو؟ خط لکھا اور بیرنگ
یا پوسٹ پیڈ جس طرح چاہا اپنے آدمی کے ہاتھ
ڈاک گھر بھیج دیا۔ مکان کا پتا ضروری نہیں
ڈاک گھر میرے گھر کے پاس، ڈاک منشی میرا
آشنا۔ اب تم ایک کام کرو ۔۔۔ آج یا کل
ڈیوڑھی پر جاؤ اور جتنے خط جمع ہیں وہ لو
اور مالسنگی مضبوط کاغذ کا لفافہ کرو اور بیرنگ
لکھ کر کلیان کے ہاتھ ڈاک گھر بھجوا دو اور اپنے
خط میں جو حال شہر میں نیا ہو وہ مفصل لکھو۔
جناب حکیم صاحب کو سلام نیاز اور
ظہیر الدین احمد خاں کو دعا کہنا۔ اب میرا
حال سنو ۔۔۔ تعظیم و توقیر بہت، ملاقاتیں
تین ہوئی ہیں۔ ایک مکان کہ وہ تین چار مکانوں
پر مشتمل ہے رہنے کو ملا ہے۔ یہاں پتھر تو
دوا کو بھی میسر نہیں۔ خشتی مکان گنتی کے
ہیں۔ کچی دیواریں اور کھپریل۔ سارے شہر کی
آبادی اسی طرح پر ہے۔ مجھ کو جو مکان ملے
ہیں وہ بھی ایسے ہیں۔
ہنوز کچھ گفتگو درمیان نہیں آئی۔ میں
خود ان سے ابتدا نہ کروں گا۔ وہ بھی مجھ
سے بالمشافہ نہ کہیں گے مگر بواسطہ کار
پردازان سرکار ۔۔۔ دیکھوں کیا کہتے ہیں؟
اور کیا مقرر کرتے ہیں؟
میں سمجھتا تھا کہ میرے پہنچنے کے بعد
جلد کوئی صورت قرار پائے گی لیکن آج تک
کہ جمعہ آٹھواں دن میرے پہنچنے کو ہے کچھ
کلام نہیں ہوا۔
کھانا دونوں وقت سرکار سے آتا ہے
اور وہ سب کو کافی ہوتا ہے۔ غذا میری بھی

ـ طبع نہیں۔ پانی کا شکر کس منہ سے
روں؟ ایک دریا ہے کوسی، سبحان اللہ
یٹھا پانی کہ پینے والا گمان کرے کہ یہ
ا شربت ہے۔ صاف، سبک، گوارا،
، سریع النفوذ ــــ اس آٹھ دن میں
و انقباض کے صدموں سے محفوظ ہوں۔
لو بھوک خوب لگتی ہے۔ لڑکے بھی
رست، آدمی بھی توانا مگر ہاں عنایت اللہ
ن سے کچھ بیمار ہے خیر اچھا ہو جائے گا۔

والدعا

(جمعہ ۳، فروری ۱۸۶۰ء)

(۴)

میر مہدی حسین مجروح

اقیاس مورخہ ۳، فروری ۱۸۶۰ء

اہاہاہا، میرا پیارا میر مہدی آیا!
عائی، مزاج تو اچھا ہے؟ بیٹھو یہ رامپور
دارالسرور ہے۔ جو لطف یہاں ہے وہ
ہاں ہے؟ پانی، سبحان اللہ۔ شہر سے
مو قدم پر ایک دریا ہے اور کوسی اس
م ہے۔ بے شبہ چشمہ آب حیات کی
سوت اس میں ملی ہے۔ خیر اگر یوں بھی
بھائی آب حیات عمر بڑھاتا ہے لیکن
نہ ریس کہاں؟ ــــ تمھارا خط پہنچا۔
عبث۔ میرا مکان ڈاک گھر کے قریب
اک منشی میرا دوست۔ نہ عرف لکھنے
جت نہ محلے کی حاجت۔ بے وسواس
بھیج دیجیے اور جواب لیا کیجیے۔ یہاں
ں سب طرح خوب ہے اور صحبت
ب ہے۔ اس وقت مہمان ہوں۔ دیکھوں
و تا ہے؟

تعظیم و توقیر میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں ہے۔ لڑکے دونوں میرے ساتھ آئے ہیں۔

اس وقت اس سے زیادہ نہیں لکھ سکتا۔

(۵)

بنام عضدالدولہ حکیم غلام نجف خاں

مورخہ سہ شنبہ ۱۴، فروری ۱۸۶۰ء

میاں تم نے برا کیا کہ لفافہ کھول کر پڑھ نہ لیا۔ بارے آج سہ شنبہ ۱۴، فروری، صبح کے وقت یہ لفافہ پہنچا اور اسی وقت پڑھوایا گیا۔

یہ خط لفٹننٹ گورنر بہادر کا نہیں، یہ خط نواب گورنر جنرل بہادر کے چیف سکرتر کا ہے ترجمہ اس کا یہ ہے:

"از دفتر خانۂ سکرتر اعظم۔ حکم دیا جاتا ہے عرضی دینے والے کو، کہ جواب اس عرضی کا نواب لفٹننٹ بہادر بعد دریافت کے ارشاد فرمائیں گے۔ از کیمپ لودھیانہ ۲۸، جنوری ۱۸۶۰ء۔"

یہاں کا یہ حال ہے کہ نواب لفٹننٹ بہادر آگرہ، مراد آباد آیا چاہتے ہیں ــ مراد آباد یہاں سے بارہ کوس ہے۔ نواب صاحب دورے کو اپنے ملک کے گئے ہیں۔ دو چار دن میں پھر آئیں گے۔ اگر ان کی ملاقات کو مراد آباد جاویں گے میں بھی ساتھ جاؤں گا۔ اگرچہ گورنر غرب و شمال کو دلی سے کچھ علاقہ نہیں مگر دیکھوں کیا گفتگو درمیان میں آتی ہے۔ جو واقع ہو گا تمھیں لکھوں گا۔ یہ تم کیا لکھتے ہو کہ گھر میں خط جلد جلد لکھا کرو۔ تم کو جو لکھتا ہوں گویا تمھاری اُستانی جی کو لکھتا ہوں۔ کیا تم سے اتنا نہیں ہو سکتا کہ جاؤ اور پڑھ کر سناؤ؟ اب ان کو خیال ہوگا کہ اس انگریزی خط میں کیا لکھا ہے؟ تم یہ خط میرا ہاتھ بہ ہاتھ لیے جاؤ اور حرف بہ حرف پڑھ کر سناؤ۔ لڑکے دونوں اچھی طرح ہیں۔ کبھی میرا دل بہلاتے ہیں کبھی مجھ کو ستاتے ہیں۔ بکریاں، کبوتر، بٹیریں، تکل، کنکوا، سب سامان درست ہے۔ فروری مہینے کے دو دو روپے لے کر دس دن میں اٹھا ڈالے۔ پھر پرسوں چھوٹے صاحب آئے کہ دادا جان کچھ ہم کو قرض حسنہ دو ــــ ایک روپیہ دونوں کو قرض حسنہ دیا گیا۔ آج ۱۴ ہے، مہینہ دور ہے۔ دیکھیے کے بار قرض لیں گے؟

یہاں کا رنگ نواب صاحب کے آنے پر جو ہو گا اور جو قرار پائے گا وہ مفصل تم کو لکھوں گا اور تم اپنی والدہ کو سنا دینا۔ اور ہاں بھائی یہ بھی گھر میں پوچھ لینا کہ کیدار ناتھ نے اندر باہر کی تنخواہ بانٹ دی؟ میں نے تو وفادار اور حلال خوری تک کی بھی تنخواہ بھیج دی ہے۔

(سہ شنبہ ۱۴، فروری ۱۸۶۰ء)

(۶)

بنام منشی ہرگوپال تفتہ

مورخہ ۱۴، فروری ۱۸۶۰ء

میری جان آخر لڑکے ہو، بات کو نہ سمجھے۔ میں اور تفتہ کا اپنے پاس ہونا غنیمت نہ جانوں؟ میں نے یہ

لکھا تھا کہ بشرطِ اقامت بلالوں گا اور
پھر لکھتا ہوں کہ اگر میری اقامت یہاں
ٹھہری تو بے تمھارے نہ رہوں گا۔
منشی بالمکند بے صبر کا خط بلند شہر
سے دِلّی اور دِلّی سے رامپور پہنچا۔ تلف
نہیں ہوا۔ اگر میں یہاں رہ گیا تو یہاں
سے اور اگر دِلّی چلا گیا تو وہاں سے اصلاح
دے کر ان کے اشعار بھیج دوں گا۔ بے صبر
کو اب کی بار مہینہ بھر صبر کرنا چاہیے۔ وہ
لفافہ بدستور رکھا ہوا ہے۔ از بسکہ یہاں
کے حضرات مہربانی فرماتے ہیں اور ہر
وقت آتے ہیں۔ فرصتِ مشاہدۂ اوراق نہیں
ملی۔ تم اسی رقعے کو ان کے پاس بھیج دینا۔

غالب

(سہ شنبہ ۱۴ فروری ۱۸۶۰ء)

(۷)

بنام منشی ہرگوپال تفتہ
مورخہ یکم مارچ ۱۸۶۰ء

برخوردار سعادت آثار، منشی ہرگوپال
سلمہٗ اللہ تعالیٰ ـــــ اس سے آگے تم
کو حالاتِ مجمل لکھ چکا ہوں ـــ ہنوز کوئی
رنگ قرار نہیں پایا۔ بالفعل نواب لفٹننٹ گورنر
بہادر مراد آباد اور وہاں سے رامپور آئیں گے۔
بعد ان کے جانے کے کوئی طور اقامت یا
عدم اقامت کا ٹھہرے گا ـــ منظور مجھ
کو یہ ہے کہ اگر یہاں رہنا ہوا تو فوراً تم کو
بلالوں گا۔ جو دن زندگی کے باقی ہیں وہ باہم
بسر ہو جائیں۔

والدعا
غالب

(یکم مارچ ۱۸۶۰ء)

(۸)

بنام منشی شیونرائن صاحب
مورخہ سہ شنبہ ۳ مارچ ۱۸۶۰ء

برخوردار منشی شیونرائن کو دعائے
دوامِ دولت پہنچے۔

کل تمھارا خط پہنچا۔ دل خوش ہوا۔
باقر علی خاں[۱۲] اور حسین علی خاں[۱۳] یہ دو میرے
پوتے ہیں اور تم بھی میرے پوتے ہو۔ لیکن
چوں کہ تم عمر میں بڑے ہو تو پہلے تم اور بعد
تمھارے یہ۔

میں حسب الطلب نواب صاحب
کے دوستانہ یہاں آیا ہوں اور اپنی
صفائی گورنمنٹ سے بذریعہ ان کے چاہتا
ہوں۔ دیکھوں کیا ہوتا ہے؟
کتاب اور عرضی۔ اواسط[۱۴] ماہ جنوری
میں ولایت کو روانہ کر کے یہاں آیا ہوں
چھ ہفتے میں جہاز پہنچتا ہے۔ یقین ہے کہ
پارسل ولایت پہنچ گیا ہوگا۔

بہ بینم کہ تا کردگار جہاں
دریں آشکارا چہ دارد نہاں[۱۵]

اپنے والد کو میری دُعا کہہ دینا۔ میرزا
یوسف علی خاں کو میری دُعا کہہ دینا اور
کہنا کہ میں تمھاری فکر سے فارغ نہیں ہوں۔
اگر خدا چاہے تو کوئی راہ نکل آوے۔

غالب

(سہ شنبہ ۳ مارچ ۱۸۶۰ء)

(۹)

بنام منشی شیونرائن صاحب
مورخہ ۱۴ مارچ ۱۸۶۰ء

برخوردار اقبال آثار منشی شیونرائن
کو بعد دعا کے معلوم ہو کہ ایک نسخہ
'بغاوتِ ہند' کا اور ایک دو ورقہ
'معیار الشعرا' کا معرفت برخوردار مرزا
شہاب الدین خاں کے پہنچا اور آج چہار
شنبہ ۱۴ مارچ کی ہے کہ ایک نسخہ 'بغاوتِ
ہند' کا بھیجا ہوا تمھارا' رامپور پہنچا۔ خدا
تم کو جیتا رکھے۔
اب میں شنبہ کے دن ۱۷[۱۶] مارچ کو
دِلّی روانہ ہوں گا۔ تم کو بطریق اطلاع لکھا
ہے۔ اب بدستور ارسال خط دِلّی کو رہے'
یہاں نہ بھیجنا۔

ہاں بھائی، ان دنوں میں، برخوردار
مرزا یوسف علی خاں وہاں آئے ہوئے ہیں۔
آج ہی ان کا خط مجھ کو پہنچا ہے۔ تم ضرور ان
سے ملنا۔ منشی امیر علی صاحب کے ہاں وہ
اُترے ہوئے ہیں۔ ان کو بلا کر میری دعا کہنا اور
کہنا کہ اچھا ہے دِلّی چلے آؤ۔ وہاں جو مجھ سے
ملوگے تو زبانی سب کلام رہے گا۔ اور اگر
وہ ہاتھرس گئے ہوں تو یہ رقعہ جو تمھارے
نام کا ہے، ایک کاغذ لپیٹ کر ٹکٹ لگا کر
ہاتھرس کو شیخ کریم بخش چوکیدار کے وقعہ دار
کے گھر کے پتے سے بھیج دینا۔ ضرور ضرور۔

غالب

(رواں داشتہ چہار شنبہ ۱۴ مارچ ۱۸۶۰ء
وقت دوپہر)

(۱۰)

بنام خواجہ غلام غوث بے خبر
قرین[۱۷] قیاس ۲۴ مارچ ۱۸۶۰ء

حضور، پہلے خدا کا شکر پھر آپ کا

شکر بجالاتا ہوں کہ آپ نے خط لکھا اور میرا
حال پوچھا۔ یہ پرسش حکم نشتر رکھتی ہے۔ اب
رگِ قلم کی خونابہ فشانی دیکھو۔

گورنر اعظم نے میرٹھ دربار کا حکم دیا۔
صاحب کمشنر بہادر دہلی نے سات جاگیرداروں
میں سے جو تین بقیۃ السیف تھے ان کو حکم
دیا اور دربار عام میں سے سوائے میرے کوئی
باقی نہ تھا یا چند مہاجن۔ مجھ کو حکم نہ پہنچا جب
میں نے استدعا کی تو جواب ملا کہ اب نہیں
ہو سکتا۔ جب یہ سرزمین مخیم خیام گورنری
ہوئی میں اپنی عادتِ قدیم کے موافق خیمہ گاہ
میں پہنچا۔ مولوی اظہار حسین خاں صاحب
سے ملا۔ چیف سکرتر بہادر کو اطلاع کی۔
جواب آیا کہ فرصت نہیں۔ میں سمجھا کہ اس
وقت فرصت نہیں دوسرے دن پھر گیا۔
میری اطلاع کے بعد حکم ہوا کہ ایام غدر میں
تم باغیوں سے اخلاص رکھتے تھے۔ اب
گورنمنٹ سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟ اس
دن چلا آیا۔

دوسرے دن میں نے انگریزی خط
ان کے نام کا لکھ کر ان کو بھیجا۔ مضمون یہ
کہ باغیوں سے میرا اخلاص مظنّہ محض ہے۔
امیدوار ہوں کہ اس کی تحقیقات ہو تاکہ میری
صفائی اور میری بے گناہی ثابت ہو ——
یہاں کے مقامات پر جواب نہ ہوا۔ اب ماہ
گذشتہ یعنی فروری میں پنجاب کے ملک
سے جواب آیا کہ لارڈ صاحب بہادر فرماتے
ہیں کہ ہم تحقیقات نہ کریں گے۔ بس یہ مقدمہ
طے ہوا۔ دربار، خلعت موقوف، پنشن مسدود،
وجہ نامعلوم! لاموجود الااللہ، ولامؤثر فی الوجود
الااللہ۔

۱۸۵۵ء میں نواب یوسف علی خان
بہادر والی رامپور کہ میرے آشنائے قدیم
ہیں اس سال یعنی ۱۸۵۵ء میں میرے
شاگرد ہوئے۔ ناظم ان کو تخلص دیا گیا۔
بیس پچیس غزلیں اردو کی بھیجتے ہیں۔
اصلاح دے کر بھیج دیتا ہوں۔ گاہ گاہ کچھ
روپیہ ادھر آتا رہتا۔ قلعے کی تنخواہ جاری۔
انگریزی پنشن کھلی ہوئی۔ ان کی عطایا فتوح
گنے جاتے تھے۔ جب وہ دونوں تنخواہیں جاتی
رہیں تو زندگی کا مدار ان کے عطیہ پر رہا۔
بعد فتح دہلی وہ ہمیشہ میرے مقدم کے خواہاں
رہتے تھے۔ میں غدر کرتا تھا۔ جب جنوری
۱۸۶۰ء میں گورنمنٹ سے وہ جواب پایا جو
اوپر لکھ آیا ہوں تو میں آخیر جنوری میں
رامپور گیا۔ چھ سات ہفتے وہاں رہ کر دلی
آیا۔ یہاں آپ کا خط محررہ ۸ مارچ پایا۔
جواب بھیجا جاتا ہے۔

(۱۱)

بنام منشی ہرگوپال تفتہ
مورخہ ۳۱ مارچ ۱۸۶۰ء

میرزا تفتہ۔ اس غمزدگی میں مجھ
کو ہنسانا تمھارا ہی کام ہے۔
بھائی 'تضمین گلستاں' چھپوا کر کیا
فائدہ اٹھایا ہے جو انطباع 'سنبلستان'
سے نفع اٹھاؤ گے؟ روپیہ جمع رہنے دو
آمد اچھی چیز ہے اگرچہ قلیل ہو۔ اور اگر
روپیہ لینا منظور ہے تو ہرگز اندیشہ نہ
کرو اور درخواست دے دو۔ بعد نو مہینے
کے روپے تم کو مل جائے گا! یہ میرا ذمّہ
کہ اس نو مہینے میں کوئی انقلاب واقع نہ
ہوگا۔ اگر احیاناً ہوا بھی تو ہوتے ہوتے
اس کو مدت چاہیے۔ رستخیز بیجا ہو چکا
اب ہو تو رستخیز ہو، یعنی قیامت۔ اور
اس کا حال معلوم نہیں کہ کب ہوگی؟
اگر اعداد کے حساب سے دیکھو تو بھی
رستخیز کے ۱۲۷۷ ہوتے ہیں۔ احتمال
فتنہ سال آئندہ پر رہا، سو بھی موہوم۔

میاں میں جو آخر جنوری کو رامپور
جا کر آخیر مارچ میں یہاں آ گیا ہوں تو کیا
کہوں کہ یہاں کے لوگ میرے حق میں کیا کچھ
کہتے ہیں؟ ایک گروہ کا قول ہے کہ یہ شخص
والی رامپور کا استاد تھا۔ اور وہاں گیا تھا
اگر نواب نے کچھ سلوک نہ کیا ہوگا تو بھی پانچ
ہزار روپے سے کم نہ دیا ہوگا۔ ایک جماعت
کہتی ہے کہ نوکری کو گئے تھے مگر نوکر نہ رکھا،
ایک فرقہ کہتا ہے کہ نواب نے نوکر رکھ لیا تھا
دو سو روپے مہینہ کر دیا تھا۔ نواب لفٹننٹ
گورنر الہ آباد جو رامپور آئے اور دن کو غالب
کا وہاں ہونا معلوم ہوا تو انھوں نے نواب
صاحب سے کہا کہ اگر ہماری خوشنودی
چاہتے ہو تو اس کو جواب دو۔ نواب نے
برطرف کر دیا۔ یہ تو سب سن لیا۔ اب تم
اصل حقیقت سنو۔

نواب یوسف علی خاں بہادر بیس تیس
برس کے میرے دوست اور پانچ چھ برس
سے میرے شاگرد ہیں۔ آگے گاہ گاہ کچھ
بھیج دیا کرتے تھے۔ اب جولائی ۱۸۵۹ء
سے سو روپے ماہ بماہ بھیجتے ہیں۔ بلاتے
رہتے ہیں۔ اب میں گیا۔ دو مہینے رہ کر
چلا آیا۔ بشرطِ حیات، بعد برسات کے
پھر جاؤں گا۔ وہ سو روپے مہینہ یہاں

رہوں۔ وہاں رہوں، خدا کے ہاں سے میرا مقرر ہے۔

غالب

(۳۱ مارچ ۱۸۶۰ء)

(۱۲)

بنام یوسف مرزا

مورخہ ۲ اپریل ۱۸۶۰ء

میاں تمھارا خط رامپور پہنچا اور رامپور سے دِلّی آیا۔

میں ۲۲ شعبان کو رامپور سے چلا اور ۲۳ شعبان کو دِلّی پہنچا۔ اسی دن چاند ہوا۔ یکشنبہ رمضان کی پہلی۔ آج دوشنبہ ۹ رمضان کی ہے۔ سونواں دن مجھے یہاں آئے ہوئے ہے۔ میں نے حسین مرزا صاحب کو رامپور سے لکھا تھا کہ یوسف مرزا کو میرے آنے تک ”اور“ نہ جانے دینا۔ اب ان کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ میرا خط ان کو تمھاری روانگی کے بعد پہنچا۔ تم جو مجھ کو اپنے ماموں کے مقدمے میں لکھتے ہو، کیا مجھ کو ان کے حال سے غافل اور ان کی فکر سے فارغ جانتے ہو؟ کچھ بنا ڈال آیا ہوں۔ اگر خدا چاہے تو کوئی صورت نکل آئے۔

اب تم کہو کہ کب تک آؤ گے؟ صرف تمھارے دیکھنے کو نہیں کہتا شاید تمھارے آنے پر کچھ کام بھی کیا جائے۔ مظفر مرزا کا اور ہمشیرہ صاحبہ کا آنا کچھ ضرور نہیں۔ شاید آگے بڑھ کر کچھ حاجت پڑے۔ بہر حال جو ہو گا سمجھ لیا جائے گا۔ تم چلے آؤ، ہمشیرہ عزیزہ کو میری دُعا کہہ دینا مظفر میرزا کو دُعا پہنچے۔

بھائی تمھارا خط رامپور پہنچا۔ ادھر چلنے کی فکر، جواب نہ لکھ سکا۔

بخشی صاحبوں کا حال یہ ہے کہ آغا سلطان پنجاب کو گئے۔ جگراوی میں منشی رجب علی کے مہمان ہیں۔ صفدر سلطان اور یوسف سلطان وہاں ہیں۔ نواب مہدی علی خاں بقدر قلیل بلکہ اقل کچھ ان کی خبر لیتے ہیں۔ میر جلال الدین خوشنویس اور وہ دونوں بھائی باہم رہتے ہیں۔ میں وہیں تھا کہ صفدر سلطان دلّی کو آئے تھے اب جو میں یہاں آیا تو سُنا کہ وہ میرٹھ گئے۔ خدا جانے رامپور جائیں یا کسی اور طرف کا قصد کریں؟ تباہی ہے، قہرِ الٰہی ہے مجھ کو لڑکوں نے بہت تنگ کیا، ورنہ چند روز رامپور میں رہتا۔

راقم

غالب

(مرقومہ دوشنبہ ۹ رمضان/۲ اپریل ۱۸۶۰ء)

(۱۳)

بنام میر مہدی حسین مجروح

مورخہ جمعہ ۱۶ اپریل ۱۸۶۰ء

میر مہدی، تم میری عادت کو بھول گئے۔ ماہ مبارک رمضان میں کبھی مسجد جامع کی تراویح ناغہ ہوئی ہے؟ میں اس مہینے میں رامپور کیوں رہتا۔ نواب صاحب مانع رہے اور بہت منع کرتے رہے۔ برسات کے آموں کا لالچ دیتے رہے۔ مگر بھائی میں ایسے انداز سے چلا کہ چاند رات کے دن یہاں آ پہنچا۔ یکشنبہ کو غرۂ مقدس ہوا۔ اسی دن سے ہر صبح کو حامد علی خاں کی مسجد میں جا کر جناب مولوی جعفر علی صاحب سے قرآن سنتا ہوں۔ شب کو مسجد جامع جا کر نماز تراویح پڑھتا ہوں کبھی جو جی میں آتا ہے تو وقت افطار مہتاب باغ میں جا کر روزہ کھولتا ہوں اور سرد پانی پیتا ہوں۔ واہ واہ کیا اچھی طرح عمر بسر ہوتی ہے ـــــ اب اصل حقیقت سُنو۔

لڑکوں کو ساتھ لے گیا تھا۔ وہاں انھوں نے میرا ناک میں دم کر دیا۔ تنہا بھیج دینے میں وہم آیا کہ خدا جانے اگر کوئی امر حادث ہو تو بدنامی عمر بھر رہے۔ اس سبب سے جلد چلا آیا۔ ورنہ گرمی برسات وہاں کاٹتا۔ اب بشرط حیات جریدہ بعد برسات جاؤں گا اور بہت دن تک یہاں نہ آؤں گا۔

قرار داد یہ ہے کہ نواب صاحب جولائی ۱۸۵۹ء سے کہ جس کو یہ دسواں مہینہ ہے سو روپے مجھے ماہ بہ ماہ بھیجتے ہیں۔ اب جو میں وہاں گیا تو سو روپے مہینہ بنام دعوت اور دیا۔ یعنی رامپور میں رہوں تو دو سو روپے مہینہ پاؤں اور دِلّی رہوں تو سو روپے۔ بھائی سو دو سو میں کلام نہیں ـــــ کلام اس میں ہے کہ نواب صاحب دوستانہ و شاگردانہ دیتے ہیں۔ مجھ کو نوکر نہیں سمجھتے ہیں ـــــ ملاقات بھی دوستانہ رہی بمعانقہ و تعظیم جس طرح احباب میں رسم ہے وہ صورت ملاقات کی ہے ـــــ لڑکوں سے میں نے نذر دلوائی تھی بس بہر حال غنیمت ہے رزق کے اچھی طرح ملنے کا شکر چاہیے۔ کمی کا شکوہ کیا؟ ـــــ انگریز کی سرکار سے دس ہزار روپے سال ٹھہرے۔ اس میں سے مجھ کو

ملے ساڑھے سات سو روپے سال۔ ایک صاحب نے نذر دیے مگر تین ہزار روپے سال۔ عزّت میں وہ پایا جو رئیس زادوں کے واسطے ہوتا ہے بنا رہا۔

خان صاحب بسیار مہربان دوستان القاب، خلعت سات پارچہ اور جیغہ و سرپیچ و مالائے مروارید۔ بادشاہ اپنے فرزندوں کے برابر پیار کرتے تھے۔ بخشی، ناظر، حکیم سب ہی توقیر کم نہیں۔ مگر فائدہ وہی قلیل۔ تو میری جان، یہاں وہی نقشہ ہے۔ کوٹھری میں بیٹھا ہوں۔ ٹٹی لگی ہوئی ہے۔ ہوا آرہی ہے۔ پانی کا جھجھر دھرا ہوا ہے۔ حقّہ پی رہا ہوں۔ یہ خط لکھ رہا ہوں ــــ تم سے باتیں کرنے کو جی چاہا۔ یہ باتیں کرلیں۔

میر سرفراز حسین اور میرن صاحب اور نصیر الدین صاحب کو یہ خط پڑھا دینا اور میری دعا کہہ دینا۔

غالب

(جمعہ ۱۶ اپریل ۱۸۶۰ء)

حواشی:

۱ ۱ تا ۱۳ خطوط، اُردوئے معلےٰ از مرزا اسد اللہ خاں غالب، نیشنل پریس الہ آباد باہتمام رمضان علی شاہ سے نقل کیے گئے ہیں (سنہ یا تاریخ اشاعت کتاب میں درج نہیں)۔

۲، ۵، ۶، ۷، ۹ تا ۲۳ : خطوط کی عبارتوں سے واضح ہے کہ مرزا غالب ۱۹ جنوری ۱۸۶۰ء کو رامپور کے سفر کے لیے دلّی سے روانہ ہوئے اور ۲۷ جنوری ۱۸۶۰ء کو رامپور پہنچے۔ ۱۷ مارچ ۱۸۶۰ء کو رامپور سے نکلے اور ۲۴ مارچ ۱۸۶۰ء کو دلّی واپس آئے۔ جس دن دلّی پہنچے اس دن رمضان کا چاند نظر آیا اور نماز تراویح شروع ہوئی۔

۳ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ۔ بقول نیاز فتحپوری (مرحوم) شیفتہ فارسی و اُردو کے نہایت اچھے شاعر تھے اور غالب کے شاگردوں میں اس مرتبہ کا کوئی دوسرا نہیں ہوا۔ یہ نواب سرفراز الملک مرتضیٰ خاں کے بیٹے تھے۔ ۱۲۲۱ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ تریسٹھ سال کی عمر میں ۱۲۸۶ھ میں انتقال کیا۔ ان کا کلیات فارسی و اُردو ان کے بیٹے نواب محمد اسحاق خاں نے شائع کیا تھا۔

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ فارسی میں تخلص حسرتی تھا۔ ولادت ۱۸۰۶ء وفات ۱۸۶۹ء (ستمبر/اکتوبر ۱۸۶۹ء) شیفتہ کے بڑے صاحبزادے (نواب حاجی محمد اسحاق خاں صاحب خلق الصدق حضرت مصنّف) ۱۸۴۴ء تا ۱۸۹۹ء رشکی تخلص کرتے تھے۔ غالب کے شاگرد تھے۔ (کالی داس گپتا رضا، آج کل، نومبر ۱۹۸۶ء)۔

۴، ۱۲، ۱۳ : باقر علی خاں تخلص کامل، حسین علی خاں تخلص شاداں، امراؤ بیگم زوجہ غالب کے بھانجے زین العابدین عارف کے بچے تھے جنھیں غالب اور امراؤ بیگم نے پالا تھا۔

۵، ۶، ۱۱ : دادی، استانی جی اور والدہ سے مراد امراؤ بیگم زوجہ غالب سے ہے۔

۸ عنایت اللہ، مرزا غالب کا ملازم۔

۹ اس خط بنام میر مہدی حسین مجروح کی عبارت خط نمبر ۳ بنام عضد الدولہ حکیم غلام نجف خاں مورخہ ۳ فروری ۱۸۶۰ء میں بھی پائی جاتی ہے اس لیے قرین قیاس ہے کہ یہ خط بھی ۳ فروری ۱۸۶۰ء کا ہے۔

۱۰، ۱۸ مرزا غالب کا بیان ہے (خط نمبر ۱۱) "نواب یوسف علی خاں بہادر بیس تیس برس کے میرے دوست اور پانچ چھ برس کے میرے شاگرد ہیں"... (خط نمبر ۱۰) "۱۸۵۵ء میں نواب یوسف علی خاں والیٔ رامپور کہ میرے آشنائے قدیم ہیں، اس سال یعنی ۱۸۵۵ء میں میرے شاگرد ہوئے۔ ناظم ان کو تخلص دیا گیا"... کالی داس گپتا رضا کی تحقیق ہے کہ "نواب یوسف علی خاں ناظم والیٔ رامپور ۵ فروری ۱۸۵۷ء کو غالب کے شاگرد ہوئے"۔ (آج کل فروری ۱۹۸۸ء)

۱۴ اواسط ماہ جنوری ۱۸۶۰ء سے غالباً ۱۹ جنوری ۱۸۶۰ء یا اس کے کچھ پہلے مراد ہے۔

۱۵ یہ ہنگامہ کرتا کردگار ان : دیکھوں دُنیا کا کام بنانے والا خدا اس ظاہر میں کیا پوشیدہ رکھتا ہے۔

(بقیہ صفحہ ۴۶ پر)

آج پھر

آج پھر
شور ہے
شہر میں
قتل کا
آج پھر
وحشتیں
رقص فرما ہوئیں
اور منایا گیا
جشن
انسان کے خون سے
آج پھر
زندگی
روئی ہے!!

ایک تصویر

جون کی
چلچلاتی ہوئی
دھوپ میں
مٹّی کے ڈھیر پر
ایک مزدور کے
مٹّی کھاتے ہوئے
ننھے سے
بچّے کو دیکھ کر
ایک تصویر
یاد آگئی
روح کو
اور تڑپا گئی!!

●

پرکاش تیواری

۱۹۹، سیکٹر ۱۲، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۲

صابر فخرالدین

(۱)
عصرِ حاضر نے
طنابیں کھینچ لیں تو
عہدِ ماضی کے
کئی مُنہ زور گھوڑے
گر پڑے!!

(۲)
پرندے
آشیانے ڈھونڈنے
نکلے تو ہیں لیکن
کہیں خود
کھو نہ جائیں!!

(۳)
جاگتے
سورج کو
سوتی آنکھ سے
کیوں
دیکھیے!!

(۴)
اسیرِ رنگ
جتنے ہیں،
وہی
بے رنگیوں سے
خوف کھاتے ہیں!!

(۵)
وہ اپنی
راہ کے پتھر
ہٹا چکے ہیں مگر
نشان
باقی ہیں!!

ابوہر، ہریانہ

کیسا عالم ہے یہ کیسی بے حسی ہے
زندگی میں زندگی ہی کی کمی ہے

اک فضا ہے دم بدم آنکھوں میں رقصاں
ہاں ابھی کچھ فرصتِ نظارگی ہے

ڈھونڈتے ہیں کوچہ و بازار میں ہم
ایک شے جو گھر کے اندر کھو گئی ہے

انتہائے فکر کی آئینہ داری
سوچتی پلکوں پہ آکر سو گئی ہے

بے نیازانہ اداؤں میں سجی سی
لغزشِ پا اک کہانی کہہ رہی ہے

سامنے ہے اب کھلا سا ایک منظر
چاندنی شاید نہا کر سو گئی ہے

ذائقہ ہے پھر کسی حرفِ تہی کا
سامنے اک رخ بدلتی بے رخی ہے

کرشن مراری
بی — ۵، نظام الدین ایسٹ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

عقیل نعمانی

پہلی سی چاہتوں کے زمانے بھی آئیں گے
روٹھے ہوؤں کو لوگ منانے بھی آئیں گے

یہ میرے سر تلک ہی نہیں پتھروں کی دوڑ
زد میں تمھارے آئینہ خانے بھی آئیں گے

بیٹی مآلِ کار غریبوں میں جائے گی
دہلیز تک امیر گھرانے بھی آئیں گے

نوخیز بالیوں کو نہ کھیتوں سے توڑیے
ان بالیوں کی گود میں دانے بھی آئیں گے

بیٹھے ہیں دل گرفتہ یہاں ریڈیو نہ کھول
اس پر پرانی فلموں کے گانے بھی آئیں گے

وہ میری بے بسی پہ تڑپ جائے گا عقیل
آنکھوں میں آنسوؤں کے خزانے بھی آئیں گے

شجاعت پور، میر گنج، بریلی ۲۴۳۵۰۴ (یو. پی)

چلنے نکلی ہے گھر سنگ شناسی مہ
روشنی چھوڑ دے آنکھوں میں ذرا سی م

ہر برے وقت میں چاندی سے بدن والو
کام آئی ہے تو بوسیدہ لباسی م

جانے ان لوگوں کی نظروں میں حقیقت کیا
جن کو سچائی بھی لگتی ہے قیاسی م

لفظ سیراب پڑھا جائے نہ لکھا جا
ہے زباں خشک تو تحریر بھی پیاسی م

یاد ہے اس نے ازل میں یہ کہا تھا مجھ
جیسے دنیا کی ہر اک چیز ہے داسی م

اشک آجائیں گے جس وقت قلم کی زد
سب کے چہروں پہ لکھی ہوگی اداسی م

زندگی تلخ نوائی میں جو گزری ہے نظ
موت ممکن ہے کہ ہو جائے سیاسی م

نظیر باقری
۱۶۴، وال کیشور روڈ، بمبئی ۶

پرویز یداللہ مہدی

دعوت نامہ

تقریبات کے بہانے دعوتوں کا اہتمام کرنا ہمارے تمدن کا تقاضا بھی ہے اور ہمارا تہذیبی ورثہ بھی، چنانچہ اس تقاضے کو کماحقہٗ پورا کرنے اور اس تہذیبی ورثے کی بھرپور نمائش کرنے کے لیے ہمارے مہذب سماج اور اس کے ٹھیکیداروں نے اولادِ آدم کو روایات، رسومات اور بدعات کے خوبصورت جال میں چاروں طرف سے اس قدر الجھایا کہ بے چارہ انسان تقریب کچھ تو بہر رسومات چاہیے کے مواقع ڈھونڈنے پر مجبور ہوگیا۔ نتیجتاً آبا و اجداد سے ترکے کی صورت جو بھی مال و متاع ہاتھ لگتا، اس تہذیبی ورثے کو سنبھالنے، پروان چڑھانے میں ٹھکانے لگ جاتا، یوں باپ دادا کا نام ضرور روشن ہو جاتا لیکن خود اس کی اپنی آل اولاد کے لیے ورثے میں جائداد، املاک ــــ اور بینک بیلنس کی جگہ قرضوں اور قرقیوں، کے انبوہِ کثیر کے سوا کچھ نہ بچتا ــــ کہاوت ہے کہ قرض، محبت کی قینچی ہے، اور دعوتیں اس قینچی کی دھار کو تیز کرنے والی گرائینڈنگ مشین (GRINDING MACHINE) ــــ!

دعوتوں کو ان کے معیار اور پیمانوں کے مطابق دو زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، پہلے زمرے میں وہ دعوتیں آتی ہیں جن میں بطور خاص "تناول طعام" کا اہتمام کیا جاتا ہے، جب کہ دوسرے زمرے کی دعوتیں تناولِ طعام کے لمبے چوڑے پروگرام سے محروم ہوتی ہیں۔ گویا یہ دعوتیں برائے طعام نہیں، برائے نام، ہوتی ہیں۔ اس طرح کی دعوتوں میں مہمان کو چائے بسکٹ اور چند موسمی پھلوں کی قاشوں پر ٹرخا دیا جاتا ہے اور اگر کہیں میزبان کے اپنے "پیٹ بھر" بچے ہوئے تو پھر مہمان بے چارہ "خالی پیٹ" ہی رہ جاتا ہے، کیونکہ بسکٹ اور دیگر لوازمات، پر میزبان کی تخلیق کردہ، فوجِ ظفر موج، ٹوٹ پڑتی ہے، مہمان کے حصّے میں صرف "پانی" آتا ہے، اسی لیے ایسی بے بھروسہ دعوتیں، "چائے پانی" کی دعوتیں کہلاتی ہیں، البتہ میزبانوں کی اصطلاح میں یہ سُوکھی دعوتیں "عصرانہ" کہلاتی ہیں عصرانوں کا عرصۂ حیات بھی ان کے محدود و مختصر اہتمام ہی کی طرح قلیل، ہوتا ہے، اور یہ اہتمام عموماً اِک ترے کھانے سے پہلے، اِک ترے کھانے کے بعد والے مختصر وقفے تک محدود ہوتا ہے جب کہ تناولِ طعام، والی اعلیٰ پیمانے کی ضیافتیں کافی طویل وقفے پر محیط ہوتی ہیں۔ اگر صبح میں ایسی دعوتوں کا اہتمام کیا جائے تو پھر ان کے اوقات ازصبح تا نصف النہار کا احاطہ کیے ہوتے ہیں، چنانچہ ایسی ضیافتوں میں بریک فاسٹ، اور لنچ، اس طرح ایک دوسرے میں سما جاتے ہیں کہ مہمانوں کی اکثریت "برنچ" (BRUNCH) مزے لوٹتی ہے، اور جب ایسی پُرتکلف دعوتوں کے لیے شام کے اوقات کا انتخاب کیا جاتا ہے تو پھر یہ مُرغن و مُتنجن سلسلہ افطار سے سحر تک چلتا ہے اور رات بھر یہ نقشہ پیش کرتا ہے: کھائیں تمام رات، کھلائیں تمام رات . . . !

تناولِ طعام والی دعوتوں کو ان کے اندازِ نشست و برخاست کی مناسبت سے تین مختلف خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلے خانے میں قدیم طرز کی دعوتوں کا شمار ہوتا ہے۔ جن میں خالص ہندوستانی اسٹائل کی فرشی نشست کا اہتمام کرکے محمود و ایاز دونوں کو ایک ہی 'صف' میں بٹھا دیا جاتا ہے ــــ دوسرے خانے میں وہ دعوتیں آتی ہیں جن میں صاحبِ خانہ فرشی نشست کی جگہ 'چوکیوں' یا 'میز کرسیوں' کا اہتمام کرکے مدعوئین کو کھانے سے پہلے "میوزیکل چیئر" (MUSICAL CHAIR) کھلاتے ہیں، ہر چوکی اپنے آپ میں ڈیڑھ اینٹ کی مسجد کا نعم البدل ہوتی ہے ــــ تیسرے خانے کے تحت آنے والی دعوتیں، انتہائی جدید اور ماڈرن قسم کی ہوتی ہیں ان میں نہ فرشی نشست ہوتی ہے نہ چوکیوں اور میز کرسیوں کا بکھیڑا، بلکہ ایک طویل و عریض میز پر انواع و اقسام کے کھانے چُن دیے جاتے ہیں اور مہمان حضرات و خواتین اپنے اپنے ظرف ــ اور

ڈی ــ ۲۶، چوتھی منزل، بہ ام، باندرہ ایسٹ، بمبئی ۴۰۰۰۵۱

اپنی اپنی استطاعت کے مطابق اپنی اپنی پلیٹیں بھرتے ہیں اور پھر کھڑے کھڑے ہی "کھڑے پیر" کا روزہ افطار کرتے ہیں۔
ایستادہ اسٹائل کی ان دعوتوں کو 'بوفے لنچ' یا 'بوفے ڈنر' کہا جاتا ہے ___ لیکن ہمیں اوّل الذکر اسٹائل کی دعوتیں زیادہ پسند ہیں، کیوں کہ ان میں مرغن غذاؤں اور تر نوالوں کے ساتھ بڑے ہی تر بتر قسم کے مزیدار واقعات بھی دیکھنے کو ملتے ہیں' گویا ایک ٹکٹ میں دو تماشوں کا مزہ آتا ہے' ایک ایسا ہی مزے دار واقعہ پیش ہے' دعوت ظاہر ہے فرشی نشست والی تھی اور جس دستر خوان پر کھانا چُنا گیا تھا' اس پر نقش و نگار' بیل بوٹے بھی بنے ہوئے تھے اور اُردو اور فارسی اشعار کی بھرمار بھی تھی۔ کھانے کا پہلا راؤنڈ' جیسے ہی اختتام کو پہنچا' ایک پیشہ ور قسم کے مہمان' جو تیسرے حکم تک ___ ڈٹ کر کھا چکے تھے' دستر خوان پر بیٹھے بیٹھے کھانے میں کیڑے نکالنے لگے' جب یہ کیڑے کلبلاتے ہوئے میزبان کے کانوں تک پہنچے تب انھوں نے جوابی کارروائی کے طور پر فوراً معترض کی توجہ دستر خوان پر جلی حرفوں میں چھپے اس شعر کی طرف مبذول کروا دی :

شکر بجا مالک کا اے مہمان تو
کھا کے مت برائی کر بے ایمان تو

اُس روز ہمیں پہلی بار دستر خوانوں پر زیورِ طبع سے آراستہ اشعار کی صحیح غرض و غایت کا اندازہ ہوا۔
تناول طعام والی پُر تکلف دعوتیں اس قدر پُر کشش ہوتی ہیں کہ ہر ایرا غیرا نتھو خیرا بن بُلائے مہمان کے طور پر دستر خوان تک پہنچنے کے لیے طرح طرح کی تگڑم میں لڑا تا ہے' اسی لیے ہم نے شروع سے یہ اصول بنا رکھا ہے کہ دعوت میں سب سے پہلے پہنچو' تا کہ پہلے دستر خوان پر سب سے پہلے جگہ ملے' لیکن ایک مرتبہ بد قسمتی سے پہلے پہنچ کر بھی پہلے دستر خوان پر اس لیے جگہ نہیں مل سکی کہ اُس دعوت میں شہر کے تقریباً تمام پہلوان معہ اپنے اکھاڑوں کے مدعو تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خرانٹ قسم کے پیٹو حضرات جو دستر خوانوں پر صحرائی خیموں کی طرح میخیں گاڑھ کر بیٹھ جاتے تھے' انھیں بھی ان پہلوانی اکھاڑوں نے چٹکیوں میں اکھاڑ کے پھینک دیا۔ کافی دھینگا مشتی کے بعد ہمارا نمبر لگا ضرور' لیکن تب تک اچھا خاصا 'نان ویجیٹیرین' دستر خوان 'ویجیٹیرین' دستر خوان میں تبدیل ہو چکا تھا' ایک ایک بوٹی کے لیے لوگ ایک دوسرے کی تکا بوٹی کرنے پر اُتر آئے تھے' اُس پر طرّہ یہ کہ بد انتظامی کی وجہ سے بن بلائے مہمان بھی کافی تعداد میں گھس آئے تھے' چنانچہ داعی حضرات نے کسٹم والوں کی طرح دروازے پر ہی جھاڑا جھڑتی اور باز پُرس شروع کر دی' جس کسی کے انداز' اطوار' چال ڈھال پر ذرا بھی شبہہ ہو رہا تھا' سختی سے اس کی خبر لی جانے لگی' ایک شاطر قسم کے بزرگوار نظر بچا کر اندر گھسے ہی تھے کہ محافظوں کے دستے نے انھیں بے دست و پا کر کے انکوائری کمیشن کا [illegible] آغاز کیا۔
"آپ کس طرف سے آئے ہیں قبلہ [illegible]"
بڑے میاں نے پُر اعتماد لہجے میں جواب دیا" دلہن والوں کی طرف سے ___
ایک پہلوان نے آنکھیں نکال کر دہاڑ لگائی "کیا ___؟"
بڑے میاں سٹپٹا کر بولے "معاف کرنا غلطی ہو گئی میں دراصل دولہا والوں کی طرف سے آیا ہوں ___!"
پہلوان نے پھر دہاڑ لگائی "کیا بولا ___؟"
اب بڑے میاں کی سٹّی گم ہو گئی کانپتے ہوئے بولا "جی وہ میں دونوں طرف سے مدعو ہوں ___!"
اب کے پہلوان نے ان کی گردن دبوچ کر کہا "اب پکڑ میں آیا ہے' بچو جہلم کی دعوت میں دُلہا دُلہن دونوں کی طرف سے آیا ہے ___!!"
ایک اور بن بلایا مہمان' دُور ہی سے بڑے میاں کی درگت بنتی دیکھ کر سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنا ہی چاہتا تھا کہ پہلوانوں نے اُسے بھی چھاپ دیا' [illegible] ایک پہلوان نے اس کے چپت رسید کرتے ہوئے پوچھا "بول تو کس کی طرف سے آیا ہے ___؟"
وہ گھگھیا کر بولا "کسی نے بھی نہیں بُلایا مائی باپ' میں خود اپنی طرف سے آیا ہوں ___!"
جہاں یہ تماشا ہو رہا تھا' قاطع برہا[illegible] قسم کے ایک اور بزرگ بڑی تُرہ دبار[illegible] کا مظاہرہ کرتے ہوئے کھڑے تھے پہلوا[illegible] کا دستہ اوّل الذکر [illegible]

مہمانوں سے نپٹ کر آخرالذکر کی طرف
متوجّہ ہوا "جناب کی تعریف؟"
"میری کیا تعریف میاں، تعریف
تو مرحوم کی ہونی چاہیے جن کا آج جہلم
ہے ——!"
"اچھا تو آپ مرحوم کو جانتے
تھے، ذرا نام بتائیے مرحوم کا —— ؟"
"کیسے بتاؤں میاں —— نام لیتے
ہوئے کلیجہ مُنہ کو آرہا ہے، کل تک جس
کا شمار زندوں میں ہوتا تھا، اب اس
کے نام کے ساتھ مرحوم بھی کہنا پڑے گا،
اور یہ مجھ سے نہیں ہوگا ——!"
"مرحوم کی عمر کیا تھی —— ؟"
"ابھی مرنے کی نہیں تھی میاں ——!"
"مرحوم بچّہ تھے یا بوڑھے —— ؟
"بچّوں میں بالکل بچے تھے، اور
بوڑھوں میں ایک دم بوڑھے ——!"
"مرحوم، مرد تھے یا عورت —— ؟"
"قول و فعل کے معاملے میں سچّے
مرد، اور رحم دلی و خدا ترسی کے سلسلے میں
بالکل عورت —— !"
"مرحوم کس بیماری سے فوت ہوئے؟"
"بیماری نہیں میاں، بہانہ کہو، بلاوا
آیا چلے گئے —— !"
"مرحوم سے آپ آخری بار کب
ملے تھے —— ؟"
"میاں تم داعی ہو یا داعیِ اجل؟
اتنے سوال تو منکر نکیر نے بھی مرحوم سے
نہیں پوچھے ہوں گے قبر میں —— خدا
کے لیے اب یہ سوال جواب کا سلسلہ ختم

بریانی ختم ہوگئی تو مرحوم کی روح کو میرے
آگے خواہ مخواہ شرمندہ ہونا پڑے گا ——!"
اتنا کہہ کر بڑے میاں ایک شانِ بے نیازی
کے ساتھ آگے بڑھ گئے ——!!
دعوتیں وصول کرنا اپنی جگہ یقیناً
ایک آرٹ ہے لیکن، دعوت کے دسترخوان
پر پہنچ کر اپنی خوش خوراکی کے جھنڈے
گاڑنا اس سے بھی بڑا آرٹ ہے۔ ہمارے
اجداد نے تو اس سلسلے میں نہایت ہی
سائنٹفک 'ٹائم ٹیبل' مرتب کر رکھا تھا۔
داعی حضرات جس قدر اعلیٰ پیمانے پر دعوتوں
کا اہتمام کرتے جواباً یہ بھی اتنے ہی اعلیٰ
پیمانے پر دعوت کے پردے میں لذّتِ
کام و دہن کی مرغن آزمائش سے کامیابی
کے ساتھ نبرد آزما ہونے کی زبردست
تیاریاں کرتے۔ اس اہتمام میں ظاہری
صفائی پر کم سے کم اور باطنی یعنی اندرونی
صفائی پر زیادہ سے زیادہ توجّہ صرف
کی جاتی، خاص طور سے پیٹ کے محکمۂ
صفائی پر پورا دھیان دیا جاتا۔ کھانے پینے
کے روزمرّہ ٹائم ٹیبل میں ردّ و بدل کرکے
تین وقت کی جگہ صرف دو وقت کے
کھانے پر اکتفا کرتے اور جب دعوت
میں صرف چوبیس گھنٹے کا وقفہ رہ جاتا،
کھانا بالکلیہ بند کر دیتے اور مکمّل فاقہ
کرتے، اس طرح فاقہ کرنے سے معدے
کو 'افاقہ' ملتا، جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ
دعوت کے دسترخوان پر پہنچتے ہی خالص
گھی سے تیار کردہ کھانوں اور خالص معدوں
میں ایسا گھمسان کا رن پڑتا کہ دسترخوان پر

والے تھکتے، نہ کھلانے والے، لیکن آج کل
چوں کہ مِلاوٹ ہمارا قومی شعار بن چکی
ہے اس لیے اب دعوتیں بھی مِلاوٹی ہوگئی
ہیں اور کھانے والوں کے معدے بھی،
لہٰذا اب نہ تو کھانے میں کچھ مزہ ہے نہ
کھلانے میں، اس کے باوجود ہم چوں کہ
اپنے آبا و اجداد کی آل اولاد ہیں اس
لیے دعوتیں ہمیں بے حد مرغوب ہیں ——
ہمارے ایک رشتے کے ماموں، جو بے شمار
مِلاوٹی دعوتیں کھانے کے باوجود بفضلِ
تعالیٰ بقیدِ حیات ہیں، اجداد کی اس
مخصوص روایت کو بڑی شان سے زندہ
رکھے ہوئے ہیں۔ جب بھی موصوف کا
جی دعوت کھانے کو مچلتا ہے، فوراً اپنی
"جیبی جنتری" سے رجوع فرماتے ہیں،
جس کا نام ہم نے "رجسٹرِ حیات و ممات"
رکھ چھوڑا ہے، کیوں کہ اس میں رشتے داروں،
دوستوں، پڑوسیوں یہاں تک کہ اہلِ محلّہ
کے ہاں ہونے والی ولادتوں اور اموات کی
تفصیلات تاریخ وار درج ہیں، چنانچہ اپنی
جیبی جنتری کی نشاندہی پر کسی نہ کسی پڑوسی
کے گھر پہنچ جاتے ہیں اور پھر صاحبِ خانہ
کو مطلع فرماتے ہیں کہ پرسوں آپ کے
فلاں دادا مرحوم کی برسی ہے جنھوں نے
موسیٰ ندی کی بڑی طغیانی میں ڈوب کر
جامِ شہادت نوش فرمایا تھا، مرحوم کی
موت کو چوں کہ پورے پچھتر برس ہو چکے ہیں
اس لیے، اس مرتبہ ان کی برسی کا اہتمام شاندار
پیمانے پر ہونا چاہیے، آخر "پلاٹینم جوبلی"
برسی ہے کوئی مذاق نہیں —— !تناولِ طعام

کمزوری ہیں جس دن کوئی دعوت نامہ انھیں کہیں سے موصول نہیں ہوتا اُس دن کو منحوس ترین دِن قرار دیتے ہیں اور بے مہریِ دنیا پر یوں تبصرہ فرماتے ہیں "میاں یہ سب قربِ قیامت کے آثار ہیں، تب ہی تو دنیا سے اخوّت محبّت، ایثار، میل مِلاپ، تقریبیں، دعوتیں سبھی کچھ اُٹھ گئی ہیں ——!!"

پچھلے کچھ برسوں سے بتدریج بڑھتی ہوئی مہنگائی کے پیشِ نظر، یار لوگوں نے شادیوں کے اجتماعی تناولِ طعام کو شادی کے اگلے روز ولیمہ ڈنر کی شکل میں منتقل کر کے اس کی وسعت کو محدود کردیا ہے، چنانچہ اب شادیوں کے دعوت نامے بھی دو قسم کے چھپنے لگے ہیں، ایک عام، دوسرا خاص عام دعوت نامے کے ذریعے صرف "شرکت" کی درخواست کی جاتی ہے، جب کہ وزیٹنگ کارڈ، سائز کا تناولِ طعام والا مختصر دعوت نامہ صرف قریبی احباب اور رشتے داروں ہی میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ماموں صاحب مؤخر الذکر مختصر دعوت نامے کو اپنی مخصوص اصطلاح میں "راشن کارڈ" سے تعبیر کرتے ہیں، چنانچہ جس عام دعوت نامے کے ساتھ راشن کارڈ منسلک نہیں ہوتا، ایسی دعوت کو وہ دعوت کے پردے میں "عداوت" گردانتے ہیں —— اس سے پہلے کہ دعوتوں کے تعلق سے اس قدر مرغن تفصیلات سن کر آپ میرے ہی بتاتے ہوئے گُر کو مجھ پر استعمال کرکے کوئی دعوت ہتھیا کر مجھ سے عداوت کریں، یہ عرض کرتے ہوئے رخصت ہوتا ہوں کہ یار زندہ "دعوت" باقی ——!!!

○○

ادیب اختر

آہٹ

گاؤں میں سوکھا پڑ گیا تھا۔ گلیاں سنسان پڑی تھیں۔ کئی گھروں کے دروازے مقفل تھے۔ بیساکھیوں کے سہارے سوامی اپنے خستہ حال، ویران گھر سے ایک گلی کے نکڑ پر پہنچ کر ہانپنے لگے۔ بیماری کی وجہ سے عرصہ ہوگیا تھا انھیں گھر سے نکلے۔ اس مدت میں لوگوں نے انھیں بتایا تھا کہ سوکھا پڑ جانے سے غریبوں کی حالت ناگفتہ ہوگئی ہے۔ کئی غریب تنگ آکر گاؤں چھوڑ گئے ہیں۔ لوگوں کی باتوں پر انھیں یقین نہ آیا تھا، لیکن اب خود اپنی آنکھوں سے گاؤں کی ویرانی دیکھ کر آنسوؤں کو روکنا اُن کے لیے محال ہوگیا تھا۔

اُداس نظروں سے انھوں نے فرلانگ بھر پرے پہاڑ کی چوٹی پر واقع مندر کو دیکھا، جس کا سنہرا کلس طلوع ہوتے ہوئے سورج کی قرمزی کرنوں میں جگمگا رہا تھا۔

سوامی آگے بڑھ گئے، پہاڑ کے نیچے پہنچ کر انھوں نے مندر تک جانے والی سیڑھیوں کو دیکھا۔ آخری بار مندر وہ کب گئے تھے یہ انھیں خوب یاد تھا۔ اس دن کوئی تہوار تھا۔ اُسی دن انھوں نے مندر کے آگے پیپل کی ایک ٹہنی سے ایک نیا گھنٹہ ٹنگوایا تھا۔ ایشور جی کے مندر میں انھیں پجاری کے فرائض انجام دیتے ہوئے ایک لمبی مدت ہوگئی تھی۔ گھنٹے کی کمی انھیں شدت سے محسوس ہوتی تھی۔ لہٰذا انھوں نے گاؤں والوں سے چندہ اکٹھا کر کے اس کمی کو دُور کر دیا تھا۔

بیساکھیوں کے سہارے سوامی نے سیڑھیاں طے کیں اور پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر پیپل کی ٹہنی سے ٹنگے گھنٹے کو بجایا۔ خاموش فضا میں گھنٹے کی آواز گونج کر لرزنے لگی۔ مندر کا دروازہ کھولنے کے بعد انھوں نے مرجھائے پھولوں کی مالا پہنے ایشور کی مورتی کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ اُن کے دل میں پرارتھنا کے سوتے سوکھ گئے تھے۔ جانے انھیں کیوں بھگوان سے کچھ مانگنے کی تمنا نہ ہوئی اور اُن کے دل میں یہ شک سر اٹھا رہا تھا کہ بھگوان سے پرارتھنا کرنے سے کچھ ملے گا نہیں۔ نہیں ... نہیں بھگوان سے مایوس نہیں ہونا چاہیے انھوں نے اپنے آپ کہا۔

گاؤں میں سوکھا پڑ گیا ہے ...

شاید یہی بھگوان کی مرضی ہو۔ ساری عمر بھگوان کی مرضی کو وہ مانتے آئے تھے۔ بچپن میں یتیم ہوگئے تو اُسے انھوں نے بھگوان کی مرضی سمجھا تھا۔ رام ناتھ نے انھیں پروان چڑھایا تھا۔ سولہ سال کی عمر ہوگی جب رام ناتھ بھی دنیا سے سدھار گئے تو اسے بھی سوامی نے بھگوان کی مرضی سمجھا تھا۔ جوانی میں ایک حادثے میں اُن کے پاؤں پر گاڑی کا پہیہ گزر جا۔ سے وہ اپاہج ہوگئے تو تب بھی انھوں نے اس کو بھگوان کی مرضی سمجھا تھا۔ سوامی کی اُداس آنکھوں سے آنسوؤں کا آبشار گرنے لگا۔ چند لمحے بعد اُن کا ساٹھ سالہ چہرہ آنسوؤں سے گیلا ہوگیا تھا۔

پوجا سے فارغ ہوکر وہ ایک چٹان پر آبیٹھے۔ جہاں وہ بیٹھے تھے وہاں سے سارا گاؤں دکھائی دیتا تھا۔ اُن کی اُداس نظریں گھومتی گھومتی گاؤں سے پرے جانے والی کچی سڑک پر ٹھہر گئیں۔ اس وقت کچی سڑک پر کافی گہما گہمی تھی۔ سامان سے لدی ایک بیل گاڑی کے پیچھے پیچھے مرد، عورتیں، بچے دھیرے دھیرے دھول کے بادل اُڑاتے ہوتے بڑھتے جارہے تھے۔

سوامی نے مُنہ پھیر لیا، جب قافلہ آگے بڑھ کر آنکھوں سے اوجھل ہوگیا تو وہ سیڑھیوں کی طرف ہوگئے۔ گاؤں پہنچے تو سنسان گلیوں میں اُن کی سانس گھٹنے لگی۔ یہی وہ گلیاں تھیں جہاں لوگ امن سے رہتے تھے۔ جس گلی سے بھی سوامی گزرتے اُن کے ججمان انھیں گھیر لیتے۔ ہر ایک کی تمنّا، سوامی کو اپنے گھر میں کھانا کھلانے کی ہوتی۔ لیکن آج اُسی گلی میں سوامی نے غور کیا ہر ایک اُن سے نظر بچا کر جانے کی سعی کر رہا ہے۔ ایک گھر کے چبوترے پر بیٹھ کر سوامی نے آواز دے کر پانی لے آنے کو کہا، کئی بار انھوں نے آواز دی،

معرفت خان محمد، بنّور ۱۰۱/۵۷۱، ضلع میسور، کرناٹک

آخر ایک لڑکی گھر سے نکلی اور اس نے بتایا کہ پانی نہیں ہے اس کی ماں پانی لانے ۲ دو میل پرے گئی ہے۔

"گاؤں کے کنویں سوکھ گئے کیا؟" انھوں نے پوچھا۔

"ہاں" لڑکی جواب دے کر وہاں سے نکل گئی۔

آگے بڑھتے ہوئے سوامی رک گئے، ایک ویران گلی سے گھنٹی کی آواز سنائی دی، دوسرے لمحے گھنٹی پر چوٹ پڑنے کا شور بھی سنائی دیا۔ ایک سیکنڈ بعد انھوں نے شنکر کو ایک چھوٹی گھنٹی کھیلتے ہوئے دیکھا، سوامی کی آنکھیں پانی پانی ہوگئیں۔ شنکر سے وہ سدا نفرت کرتے آئے تھے کیوں کہ وہ چور تھا۔ کیا شنکر کو بھوک نے اتنا تنگ کر دیا ہے کہ وہ کسی مندر کی گھنٹی چرانے پر مجبور ہو جائے، سوامی اتنا سوچ کر آگے بڑھے تو اُن کا سامنا دو چار آدمیوں سے ہوا، جو آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے "کیا بات ہے بھائی" سوامی نے پوچھا۔

"راگھو مر گیا سوامی، کھانے کو کچھ بھی نہ تھا بھوک سے مر گیا۔"

سوامی کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہوگئیں وہ آگے بڑھ گئے۔

اُسی دن شیام نے سوامی کو گاؤں چھوڑ دینے کا مشورہ دیا تو انھیں بہت بُرا لگا، حالاں کہ شیام نے صحیح مشورہ دیا تھا۔ جان بچانے کے لیے گاؤں چھوڑنے کے سوا کوئی راہ نہ تھی، لیکن انھوں نے اس کی رائے سے اتفاق نہیں کیا، اُن کے گاؤں چھوڑ دینے سے مندر میں ویرانی چھا جانے کا اندیشہ تھا۔

"فاقوں سے موت بھی آ جائے تو کوئی بات نہیں مر جاؤں گا۔"

اُس واقعہ کے چار دن بعد، صبح سویرے سوامی مندر جانے لگے تو انھیں بہت بھوک لگی تھی۔ کل دوپہر سے وہ بھوکے تھے۔ سیڑھیاں طے کر کے مندر تک پہنچے تو وہ اتنے نڈھال ہوگئے کہ ہاتھوں میں گھنٹہ بجانے کی سکت بھی نہ رہی۔ دروازہ کھولنے کی بجائے وہ دیوار سے ٹیک لگا کر آنکھ بند کر کے بیٹھ گئے۔ چند لمحے بعد انھوں نے آنکھیں کھولیں تو سب سے پہلے اُن کی نظر گھنٹے پر پڑی اُن کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اُن کے دماغ میں گھنٹے کی آواز گونجنے لگی۔

آہستہ سے وہ اُٹھ بیٹھے، چند لمحے سستانے کے بعد وہ کھڑے ہو کر پیپل کی طرف بڑھ گئے۔ پیپل کی ڈال پر چڑھ کر، انھوں نے گھنٹے کو زنجیر سمیت کھول دیا۔ گھنٹہ زنجیر سمیت زمین پر گر پڑا۔ پیپل سے نیچے اُتر کر انھوں نے گھنٹے کو زنجیر سے الگ کر لیا۔ وہاں سے رخصت ہوتے وقت انھوں نے ایشور کی مورتی کے آگے ہاتھ جوڑ کر آنسو بہاتے ہوئے دل ہی دل میں کہا "بھگوان مجھے شما کر دینا!"

پہاڑ کے نیچے پہنچ کر، انھوں نے گھنٹے کو ایک چٹان پر رکھ دیا۔ اور دونوں ہاتھوں سے ایک بڑا سا پتھر اٹھا کر گھنٹے کو توڑنے لگے۔ گھنٹہ ٹوٹ گیا۔ سوامی نے پتھر دُور پھینک دیا اور اُن کی نظروں میں آسمان زمین گڈمڈ ہونے لگے... اور سوامی نے نیچے گر کر دم توڑ دیا!

ٹوٹے ہوئے گھنٹے کو بیچ کر وہ اپنی بھوک مٹانا چاہتے تھے۔

سوامی چونک اٹھے۔ اُن کا سپنا ٹوٹ گیا!

سوامی نے سب سے پہلے گھنٹے کو پیپل کی ٹہنی سے ٹنگے صحیح و سلامت دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا۔ لیٹے لیٹے بھگوان کی مورتی کی طرف مُنہ کر کے ہاتھ جوڑ کر پرارتھنا کرنے لگے۔ اُٹھ بیٹھنے کی لاکھ کوشش کے باوجود بھی وہ اپنی جگہ سے ذرّہ برابر بھی ہل نہ سکے۔ بھوک تو انھیں لگی ہی تھی لیکن اب سخت پیاس بھی لگی تھی اور انھیں یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ گھڑی بھر کے مہمان ہیں۔ "کوئی کھانا لے آئے گا" سوامی سوچنے لگے۔ گرمی کے دنوں میں صبح وہ ناشتہ کر کے مندر آجاتے تو شام ڈھلے گاؤں لوٹتے تھے۔ دوپہر کا کھانا گاؤں کے کسی نہ کسی گھر سے آجاتا تھا۔

چاروں طرف خاموشی چھائی تھی، اس لیے وہ کسی کے قدموں کی آہٹ سن سکتے تھے اگلے لمحے انھیں یقین بھی ہوگیا کہ وہ قدموں کی آہٹ سُن رہے ہیں، قدموں کی آہٹ قریب سے قریب تر آرہی تھی۔

سوامی بڑے اعتماد سے قدموں کی آہٹ سننے لگے۔

موت کے قدموں کی آہٹ!

OO

ساحل احمد

شخصیت میری سراپا یاس ہے
خود کو کھو دینے کا اب احساس ہے

مٹ گئیں موسم کی ساری رنجشیں
جب سے میری مٹھیوں میں گھاس ہے

منزلیں قدموں سے لپٹی ہیں مگر
اب سمندر ہے نہ دریا پاس ہے

اب کہاں سے یہ نحوست آگئی
ہر طرف پھیلی یہ کیسی باس ہے

دھوپ، مٹّی، روشنی، ساؔحل ہوا
آسماں میری زمیں کے پاس ہے

صدر شعبۂ اُردو، یوئینگ کرسچین کالج، الٰہ آباد

ہم سے دیوانوں کو عصری آگہی ڈستی رہی
کھوکھلی تہذیب کی فرزانگی ڈستی رہی

ہوں نجانے کتنے جنموں کا میں پیاسا دوستو!
رہ کے دریا میں بھی مجھ کو تشنگی ڈستی رہی

دامنِ شب کو وہ کرتا کس طرح سے تار تار
جی کو دن کی روشنی میں تیرگی ڈستی رہی

آپ کے ہونٹوں پہ جو عرصے سے ہے چھائی ہوئی
درد میں ڈوبی ہمیں وہ خامشی ڈستی رہی

شعلۂ نفرت تو بھڑکا چند لمحوں کے لیے
مدّتوں پھر شہر کو اک تیرگی ڈستی رہی

موت کی ناگن سے اب ہرگز وہ ڈر سکتا نہیں
جس کو ساری عمر خود یہ زندگی ڈستی رہی

ہر گھڑی چہرے پہ جو چہرہ لگاتا ہی رہا
عمر بھر اُس کو اسؔد بے چہرگی ڈستی رہی

اسد رضا

۴۷/۱۱-ای، حوض رانی، مالویہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۷

روشن لال روشؔن بنارسی

وہ اگر تیغ و سپر رکھتے ہیں
خیر سے ہم بھی تو سر رکھتے ہیں

ہم بھی کیا رختِ سفر رکھتے ہیں
ایک اُمّید مگر رکھتے ہیں

خاک کو صورتِ خوں دیتے ہیں
ہم بھی کیا خوب ہُنر رکھتے ہیں

کیا زمیں ہے کہ دھنسے جاتے ہیں
پاؤں ہم لوگ جدھر رکھتے ہیں

کچھ دِکھائی نہیں دیتا روشؔن
یوں تو کہنے کو نظر رکھتے ہیں

D 47/110 - A، راما پورہ، وارانسی ۲۲۱۰۰۱

امام مصطفٰی

ہندوستانی سنگیت اور بھنڈی بازار گھرانہ

اقبال نے موسیقی کو غذائے روح اور نفس کو اس کا بدن کہا ہے۔ جس طرح جسم کی توانائی کے لیے غذا ضروری ہے اسی طرح روح کی بالیدگی اور پاکیزگی کے لیے موسیقی بھی اتنی ہی اہم ہے۔ صوفیانِ کرام کے یہاں وجد و سماع کی محفلیں اسی لیے منعقد ہوتی تھیں کہ روح کو تازگی ملے۔ خوش آوازی اور خوش الحانی چوں کہ فطری عمل اور قدرت کی طرف سے ایک بخشش ہوتی ہے اسی لیے اس کا ہر خاص و عام پر اثر ایک فطری امر ہے۔ اچھی اور سریلی آواز قدرت کا عطیہ ہوتی ہے۔ اسے حاصل کرنا ناممکن نہ سہی مشکل ضرور ہوتا ہے۔ مسلسل ریاض اور مشق سے آواز پر قدرت حاصل کرلی جاتی ہے لیکن اس کے لیے مبتدی کو دقت طلب مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے جب کہ فطری طور پر خوش گلو شخص کے لیے یہ قدرے آسان ہوتا ہے۔

موسیقی کا تعلق، فنونِ لطیفہ سے ہے۔ دیگر فنون جیسے مصوری، فنِ تعمیر وغیرہ کا تعلق انسان کی قوت ناظرہ سے ہے جبکہ موسیقی وہ فن ہے جو دکھائی نہیں دیتا صرف اسے قوت سامعہ سے محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اسی لیے اس فن کے معلم کو گانے کی تعلیم دینے کے لیے بڑے صبر آزما دور سے گزرنا پڑتا ہے۔

موسیقی ایک مشکل ترین فن ہے۔ اس پر عبور حاصل کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ لفظی اعتبار سے بھی موسیقی اسی طرف اشارہ کرتی ہے۔ موسیقی دراصل سریانی زبان (یہ زبان آج کل ناپید ہے) کا لفظ ہے: 'مو' یعنی ہوا اور 'سیقی' یعنی گرہ باندھنا۔ گویا جب کوئی مغنی اپنے فن کو پیش کرتا ہے تو وہ ہوا میں گرہ باندھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس سے مقصود یہ بتانا ہے کہ موسیقی کا فن اتنا ہی مشکل ہے جتنا ہوا میں گرہ لگانے کی کوشش کرنا ــــــ!

ہندوستانی سنگیت دُنیا کی تمام موسیقی سے زیادہ مشکل اور تکنیکی لحاظ سے زیادہ سائنٹفک اور بااصول ہے۔ اس کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ ہندو مت اور عقیدے کے مطابق اس کی ایجاد کائنات کے خالق برہما (ब्रह्मा) نے کی۔ اس کا ذکر ان کی چاروں الہامی کتابوں: رگ وید، سام وید، اتھروید اور یجروید میں موجود ہے۔ اسی لیے اہلِ ہنود کے یہاں سنگیت کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے جو ان کی مذہبی رسوم، سماجی اور معاشرتی جلسوں تہواروں میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

ہندوستانی سنگیت تین فنون پر مشتمل ہے: گانا، بجانا اور ناچ۔ ان میں گانا چوں کہ مشکل ترین فن ہے اس لیے اسے اُتم مانا گیا ہے اور اسی لیے گویّوں کو زیادہ عزت اور اہمیت دی جاتی ہے۔ جنھیں قدرت نے اچھی آواز سے نہیں نوازا وہ کوئی ساز بجانے میں مہارت حاصل کرلیتے ہیں کیوں کہ گانے کے مقابلے میں یہ قدرے آسان ہوتا ہے۔ ناچ کو مقابلتاً آسان ترین فن سمجھا گیا ہے۔ مسلم ماہرانِ فن کے نزدیک ایک چوتھی چیز بھی ہے جو ان تینوں سے مشکل ہے اور وہ ہے ان فنون کی تعلیم دینا۔ ان کے نزدیک سنگیت سیکھنے سے زیادہ مشکل اس کا سکھانا ہے کیوں کہ جیسا کہا گیا ہے یہ وہ فن ہے جو دکھائی نہیں دیتا صرف محسوس کیا جاتا ہے۔ اس لیے جب تک اس کا طالب علم سُروں کی شناخت اپنے کان سے نہیں کرسکتا اور تال کو صحیح طور پر سمجھ نہیں سکتا اس کے علاوہ سامعین کی بھی اس فن سے تھوڑی بہت واقفیت ضروری ہے۔ مطلب یہ کہ دونوں کے لیے اس فن کی تعلیم ضروری ہے! شاید یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی سنگیت میں "گرو شِشیہ پرمپرا" (गुरु-शिष्य परंपरा) یعنی اُستادی شاگردی کے سلسلے کو بہت مقدس مانا جاتا ہے۔ اس لیے ہر فن کار

ایڈوکیٹ، ۲۷، نظام اسٹریٹ، بمبئی ۴۰۰۰۰۳

اپنے فن کا مظاہرہ کرنے سے پہلے اپنے گرو یا استاد (جو اگر مسلم ہو تو اسے خاں صاحب کہتے ہیں) کی اجازت اور اس کے بسبر چھونا اپنا فرض سمجھتا ہے چاہے وہ فنکار اب کتنے ہی اعلیٰ مقام پر کیوں نہ فائز ہو ۔۔۔!

ہندوستانی سنگیت کو مندروں، راجا مہاراجاؤں اور امرا کی محفلوں سے نکال کر عوام تک لانے کا سہرا مسلمانوں کے سر ہے۔ حضرت امیر خسروؒ سے لے کر آج تک مسلم موسیقاروں اور استادوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد نے یہاں کے سنگیت پر چھائے ہوئے جمود کو توڑا اور اس کے لیے ترقی کی نئی نئی راہیں کھولیں۔ ان کی دلچسپی سنگیت کی دو اصناف: گانا اور بجانا سے تھی۔ ناچ کو انھوں نے یکسر نظر انداز کر دیا کیوں کہ وہ ان کی طبیعت سے میل نہیں کھاتا تھا۔ صرف واجد علی شاہ کے دور میں اس کی ترقی ہوئی۔ عام طور پر مسلمانوں نے اس فن کو علم سے زیادہ عملی طور پر اپنایا۔ اس فن کی ادائیگی اور عملی طور پر پیشکش کی تعلیم دینے میں انھوں نے اپنی خدا داد قابلیت کا مظاہرہ کیا۔ ان کا تعلیم دینے کا طریقۂ کار اور گانے بجانے کا انداز اور ڈھنگ بھی جداگانہ تھا۔ ان کی تخلیق کارانہ صلاحیتوں نے اس فن کو جلا بخشی۔ سنگیت میں نئی نئی اختراعات آنے لگیں۔ دھرپد، دھمار کے قدیم طریقے کی جگہ خیال، ترانہ، قول نے لے لی۔ عام طبقے کی دلچسپی کے لیے ٹھمری، دادرا اور غزل کو رائج کیا گیا۔ آلات موسیقی میں وینا، بانسری، سارنگی، ڈھول وغیرہ کی جگہ ستار، طبلہ ڈھولک وغیرہ آ گئے۔ ان اختراعوں میں ایک خاص بات کا یہ خیال رکھا گیا کہ اس سے ہندوستان کے قدیم سنگیت کی روح متاثر نہ ہو۔ بنیادی اصول اور پدھتی (طریقہ) وہی رہی جو قدیم زمانے سے چلتی آ رہی تھی صرف اس کے طریقۂ تعلیم اور پیشکش کے ڈھنگ کو آسان اور عام فہم کر دیا گیا۔

صوتی موسیقی میں گویوں نے بیش بہا خدمات انجام دیں۔ اپنے علم و فن کو وہ سینہ بہ سینہ منتقل کرتے رہے۔ ان میں بہتیرے تقلید کے قائل نہیں تھے۔ ان کی سیمابی طبیعت نے انھیں مجبور کیا کہ وہ اپنے فن کو اپنے ہم عصروں سے ممتاز کر کے پیش کریں۔ اس طرح سنگیت میں "گھرانے" نے جگہ لی۔ گھرانے دراصل ہندوستانی سنگیت کے مکتب یا اسکول ہیں۔ ہر گھرانے کا اپنا ایک جداگانہ طرز ادائیگی اور گانے بجانے کا ڈھنگ ہوتا ہے۔ مثلاً ایک ہی راگ کو دو گھرانے الگ الگ طریقے سے گاتے بجاتے ہیں۔ ایک راگ کئی متضاد کیفیتوں کا حامل ہوتا ہے۔ ایک گھرانہ اگر اس کی کسی ایک کیفیت کو اجاگر کرتا ہے تو دوسرا اس کی دیگر خصوصیات پر زور دیتا ہے۔ اس طرح گھرانوں سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ راگ کی مخفی خوبیاں سامنے آنے لگیں جس سے سنگیت کو وسعت ملی۔

ایک عجیب بات یہ تھی کہ ان گھرانوں کے نام ان کے بانیوں کے نام سے منسوب نہیں تھے بلکہ ان کے آبائی وطن یا شہر ان کے جائے رہائش سے موسوم تھے۔ اس سے بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ ان کو اپنی ذاتی شہرت مقصود نہیں تھی بلکہ ان کے نزدیک سنگیت کی ترقی مقدم تھی اور یہ نام بھی انھوں نے خود نہیں اختراع کیے تھے بلکہ لوگوں نے سہولت اور امتیاز کی خاطر انھیں اسی نام سے پکارنا شروع کر تھا۔ ان گھرانوں کا ہندوستانی سنگیت پر بڑا احسان ہے ان گھرانوں کو آج سنگیت سے الگ کرنا گویا سنگیت کو کئی سو سال پیچھے دھکیل دینا ہے۔ ہندوستانی سنگیت کے چند اہم گھرانے یہ ہیں: آگرہ گھرانہ دہلی گھرانہ، کرانہ گھرانہ، گوالیار گھرانہ، جھج گھرانہ، پٹیالہ گھرانہ، اترولی گھرانہ، اندور گھرانہ اور بھنڈی بازار گھرانہ۔

بھنڈی بازار گھرانے کے بانی تین بھائی تھے: جھجو خاں، نذیر خاں اور خادم حسین خاں۔ یہ لوگ ضلع مراد آباد کے شہر بجنور کے رہنے والے تھے انیسویں صدی کے اواخر میں یا شاید اس صدی کے شروع میں یہ تینوں بھائی ذریعۂ معاش کی خاطر بمبئی چلے آئے اور بمبئی کے مشہور علاقے بھنڈی بازار میں سکونت پذیر ہو گئے ایک مکان کرایے پر لے لیا اور موسیقی کی تعلیم دینا شروع کی۔

بھنڈی بازار عروس البلاد بمبئی کا وہ مشہور علاقہ ہے جہاں اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ چوں کہ یہ تینوں بھائی اس علاقے میں رہتے تھے اس لیے یہ بھنڈی بازار والے کہلانے لگے۔ ان کے سنگیت سکھانے کا طریقہ، گانے کا اسٹائل اور خیال

گائیکی میں ندرت نے سنگیت کی دُنیا میں ایک نئے "گھرانہ" کی بنیاد رکھی۔ جو آگے چل کر "بھنڈی بازار گھرانہ" کے نام سے جانا پہچانا جانے لگا۔ حقیقتاً اس گھرانے کو اتنی مقبولیت نہیں ملی جتنی دوسرے گھرانوں کو ملی اس کی وجہ شاید یہ بھی کہ اس گھرانے کے لوگ پبلک جلسوں اور موسیقی کی محفلوں میں شرکت سے احتراز کرتے تھے۔ انھوں نے خود کو سنگیت کی تعلیم تک محدود کر دیا تھا۔ ان کے نزدیک سنگیت 'ناد برہما' یا 'نادُ اپاسنا' کا درجہ رکھتا تھا۔ اس لیے ان کا سنگیت صرف انھیں لوگوں تک محدود تھا جو صحیح معنوں میں کلاسیکی موسیقی کی سوجھ بوجھ رکھتے تھے۔ اس زمانے میں ایسے سنگیت فہم لوگوں کی کوئی کمی نہیں تھی پھر بھی اس گھرانے کی تعلیم کی مشقت برداشت کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ کچھ سنگیت پنڈت اس گھرانے کو سرے سے کوئی گھرانہ ہی نہیں تصور کرتے اور اپنی کتابوں میں بھنڈی بازار گھرانہ کے بجائے بھنڈی بازار والے کہتے ہیں۔ اس کا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس گھرانے کی ترقی و ترویج میں اس گھرانے کے شاگردوں نے کوئی اہم کردار ادا نہیں کیا۔ وہ سنگیت کو آج بھی بھکتی اور راستی کا ایک ذریعہ سمجھ کر اپنا حلقہ محدود کیے ہوئے ہیں۔ اس کے باوجود آج بھی سنگیت کلاکاروں کا ایک بہت بڑا طبقہ اس گھرانے کی اہمیت سے واقف ہے!

اس گھرانے کے بانی چھجو خاں، نذیر خاں اور خادم حسین خاں اپنے زمانے کے مایۂ ناز گویّے اور اُستاد تھے۔ تینوں نے فن موسیقی کے الگ الگ شعبوں میں مہارت حاصل کی تھی۔ چھجو خاں نے دھرپد، دھمار اور ہوری میں نام پیدا کیا۔ نذیر خاں نے سارنگی اور خیال گائیکی پر عبور حاصل کیا تھا۔ ان کی خوبی یہ تھی کہ وہ ایک سانس میں استھائی اور دوسری سانس میں انترہ گاتے تھے۔ اس کے علاوہ لے کاری کے بھی ماہر تھے۔ خادم حسین خاں گائیکی میں سُوت، مینڈ اور گمک پر زیادہ زور دیتے تھے۔ یہ تینوں بھائی اپنی ترتیب دی ہوئی چیزوں (بندشوں) میں اپنا قلمی نام آمر ضرور رکھتے تھے جو اس گھرانے کی پہچان بن گئی۔ بعد میں آنے والوں نے بھی اسے اپنانا شروع کر دیا۔ اس خاندان کے اُستاد امان علی خاں (جن کا ذکر آگے آئے گا) کی سینکڑوں چیزوں میں یہی قلمی نام آمر استعمال کیا گیا ہے۔

غالباً ۱۸۸۴ء میں یہ تینوں بھائی ایک سنگیت منڈلی میں شامل ہو گئے۔ بمبئی کے چند پارسی سرمایہ داروں نے سنگیت کے ایک کلب کی بنیاد رکھی تھی جسے "گیان اُتیجک منڈلی" کے نام سے موسوم کیا گیا تھا۔ باوجود اس کے کہ پارسی قوم نے خود کو بہت زیادہ مغرب زدہ کر لیا تھا لیکن جہاں تک ہندوستانی سنگیت کا تعلق تھا انھوں نے اس کو پھیلانے کے لیے بہت کچھ کیا اور کر رہے ہیں۔ اس منڈلی کے روح رواں پنڈت وشنو نارائن بھاتکھنڈے جی تھے۔ بھاتکھنڈے جی نے ہندوستان کے سنگیت کے قدیم اثاثے کو یکجا کر کے اسے باضابطہ طور پر تدوین کر کے منضبط تحریر کیا سینکڑوں راگ راگنیوں کو انھوں نے دس ٹھاٹوں میں محفوظ کر دیا۔ بہت سی ایسی چیزیں اور بندشیں جو پنڈتوں اُستادوں اور سنگیت گُنیوں کے سینے میں محفوظ تھیں انھیں بھی ضبط تحریر میں کر لیا۔ اس کام کے لیے انھیں بہت سے اُستادوں سے روابط قائم کرنے پڑے۔ کئی ایک اُستادوں کے وہ شاگرد بھی بنے تاکہ ان سے ان کے گھرانوں کا علم جو ان تک سینہ بہ سینہ پہنچا ہے سیکھیں اور اس کا نوٹیشن (NOTATION) تحریر موسیقی کر لیں۔ اس طرح "لکشن گیت سنگرہ" اور "کرامک پُستک مالیکا" جیسے رسالے اور مقالے (TREATISES) کو شائع کر کے سنگیت کو بکھرنے سے بچا لیا۔ ٹھاکر نواب علی کی معارف النغمات پنڈت بھات کھنڈے کی ہی کتابوں پر مبنی ہے۔ اس کام کے لیے انھوں نے جن اُستادوں کی مدد لی ان میں بھنڈی بازار گھرانے کے اُستاد نذیر خاں بھی تھے۔ نذیر خاں نے اپنی خاندانی چیزیں جو ان تک سینہ بہ سینہ آئی تھیں، اور راگ راگنیوں سے متعلق اپنی مفید معلومات سے کافی مواد بھات کھنڈے جی کو دیا۔ بعد میں کسی بنا پر دونوں میں ان بن ہو گئی اور نذیر خاں نے اپنے تعلقات بھات کھنڈے جی سے قطع کر لیے۔ نتیجتاً انھوں نے اپنی مطبوعات میں نذیر خاں اور ان کے دونوں بھائیوں اور بھنڈی بازار گھرانہ کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی حتیٰ کہ ان تینوں بھائیوں کے نام تک محض خانہ پری کی حد تک لیے گئے ہیں۔

ان تینوں بھائیوں سے اگر صحیح معنوں میں کسی نے فیض اُٹھایا تو وہ تھیں انجنی بائی مال پیکر (ANJANIBAI MALPEKAR) (۱۸۸۳ء - ۱۹۷۸ء) - یہ یوں تو اُستاد نذیر خاں کی شاگرد تھیں لیکن چھجو خاں اور خادم حسین خاں بھی انھیں تعلیم دینے آتے تھے۔ اس نے بہت ہی کم عمر میں اس گھرانے سے تعلیم لینا شروع کی اور جب صرف سولہ سال کی عمر میں ہی پہلا پبلک پروگرام اسٹیج پر پیش کیا تو سنگیت کی دُنیا میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ اس سارے کریڈٹ کے مستحق بھنڈی بازار گھرانے کے یہ تینوں اُستاد تھے۔

انجنی بائی کے لیے اُستاد نذیر خاں کا طریقۂ تعلیم بہت سخت تھا۔ روز بارہ گھنٹے ریاض کرواتے تھے، اور وہ بھی صرف ایک راگ یمن کا۔ تین سال تک انھوں نے راگ یمن اور ڈیڑھ سال تک راگ بھیرو کا ریاض کروایا۔ اُستاد صبح چار بجے آجاتے تھے اور ریاض شروع ہو جاتا جو صبح گیارہ بجے تک چلتا اس درمیان بادام ملا ہوا دُودھ اور سُوپ پیتی تھیں لیکن تان پورہ (طنبورہ) پر سے ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں تھی۔ روز سنگیت کے ایک ہزار پلٹے (تانیں) گانے پڑتے چھجو خاں اور خادم حسین خاں ان کو تعلیم دینے رات کو آتے تھے۔ اس طرح ان تینوں بھائیوں کا علم و فن انھوں نے حاصل کیا۔ انجنی بائی اس گھرانے کی صحیح معنوں میں نمائندہ تھیں۔ ان کی آواز میں جادو تو تھا ہی اس پر ان ماہر اُستادوں کے زیرِ سایہ تربیت ملی تھی جس نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ انجنی بائی کی خوبی ان کا راگ میں الاپ تھا جو اچھے اچھے سازندوں اور بین کاروں کے لیے چیلنج تھا۔ ان کی مینڈ کی تان قلب کی گہرائیوں میں اتر جاتی تھی۔ تینوں اُستادوں کو اپنی اس شاگردہ پر فخر تھا، لیکن افسوس کہ جب انجنی بائی کی مقبولیت کا شباب تھا انھوں نے گانے کا تیاگ کر کے سنیاس لے لیا اور روحانیت اور تصوّف کی دُنیا میں کھوگئیں۔ عمر کے آخری حصّے میں انھوں نے اس گھرانے کی خدمت کے طور پر تعلیم دینا شروع کیا تھا۔ ان سے فیض پانے والوں میں کمار گندھرو کشوری امونکر، پنڈت جنو دیکر قابلِ ذکر ہیں۔ ٹھمری اور ہلکی پھلکی موسیقی کی گائیکہ نینا دیوی اور بیگم اختر کی بھی رہبری کی!

ان بھائیوں کے ایک اور مشہور شاگرد تھے استاد جھنڈے خاں۔ اُستاد جھنڈے خاں پنجاب کے تھے اور ان کا تعلق اردو ناٹکوں اور فلم میں موسیقی دینے سے تھا۔

شریمتی انجنی بائی مال پیکر

میوزک ڈائرکٹر کی حیثیت سے ان کا لوہا
آج بھی مانا جاتا ہے۔ اپنی علم کی پیاس
بجھانے یہ بمبئی چلے آئے اور اس گھرانے
کے ان تینوں بھائیوں کے شاگرد ہو گئے۔
ان کو اپنے استادوں سے بے پناہ عقیدت
تھی۔ مشہور فلمی میوزک ڈائرکٹر فیروز نظامی
نے جب ان سے ان تینوں بھائیوں کے بارے
میں کچھ جاننا چاہا تو ان کی آنکھوں سے عقیدت
کے آنسو نکلنا شروع ہو گئے اور بھرائی ہوئی
آواز میں کہنے لگے: "بیٹا ان لوگوں کے گانے
کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔ آج ان
لوگوں کا گانا سہانا خواب معلوم ہوتا ہے۔
بس یہ سمجھ لو کہ میرے استاد علم کا سمندر
تھے اور میں ان کے مقابلے میں صرف ایک
حقیر قطرہ ہوں۔"

یہ اسی گھرانے کا فیض تھا کہ استاد
جھنڈے خاں نے فلمی دنیا میں اپنے کلاسیکی
سنگیت سے ایک ایسا مقام بنا لیا جو آج
تک کوئی نہیں بنا سکا۔ ان کی علمی و فنی صلاحیتوں
کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ انھوں نے
فلم "چترلیکھا" کی موسیقی میں ایک ایسا کمال
دکھایا جو پھر کسی اور سے ممکن نہ ہو سکا۔
انھوں نے اس فلم کے تمام گانوں (جو تقریباً
سترہ اٹھارہ ہوں گے) کی دھنیں بھیرویں
راگنی میں ترتیب دیں لیکن اس میں خوبی یہ
تھی کہ سننے والوں کو یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ
سب گانوں کے سُر ایک ہی ہیں۔ انھیں یہی
گمان ہوتا کہ ہر گانے کی دھنیں الگ الگ
راگ میں بنائی گئی ہیں۔ اس کارنامے کی
مشہور موسیقار نوشاد علی اکثر تعریف کیا
کرتے ہیں جنھیں نہ صرف ان کے ساتھ
کام کرنے کا فخر حاصل ہے بلکہ میوزک ڈائرکٹر
کی حیثیت سے انھیں جھنڈے خاں کے ہی
سامنے انٹرویو کے لیے پیش کیا گیا تھا اور
سلیکٹ کر لیے گئے تھے۔

اس گھرانے کے ایک اور شاگرد تھے
واڈی لال شیورام۔ یہ گجراتی ناٹکوں میں
سنگیت دیتے تھے۔ استاد نذیر خاں نے
انھیں سنگیت شاستر سیکھنے کے لیے پنڈت
بھات کھنڈے جی کے پاس بھیج دیا تھا۔
جس زمانے میں واڈی لال نذیر خاں سے
تعلیم لے رہے تھے اسی زمانے میں ان کی
ملاقات نتھن خاں کے لڑکے محمد خاں سے
ہو گئی جو خود بھی بھنڈی بازار کے علاقے ہی
میں رہتے تھے۔ بعد میں ان دونوں کی دوستی
ہو گئی۔ ایک روز بھنڈی بازار میں ہی محمد
خاں نے انھیں جے پور کے محمد علی خاں کے
لڑکے عاشق علی خاں سے ملوایا جن کے
پاس سنگیت کے علم کا خزانہ تھا لیکن ان
کی مالی حالت بہت خراب تھی۔ واڈی لال
انھیں بھات کھنڈے کے پاس لے گئے
جنھوں نے ان کی مالی امداد ضرور کی لیکن
سنگیت کا قیمتی ذخیرہ ان سے حاصل کر لیا۔
اس پر عاشق علی خاں کے والد بہت خفا
ہوئے۔ بھات کھنڈے ان کے پیروں پر
روتے ہوئے گر پڑے اور کہا کہ آج سے
میں آپ کا شاگرد ہوں!

اس گھرانے کے دوسرے شاگردوں
میں استاد مِمّن خاں، سمیر خاں (والد استاد
امیر خاں) مبارک حسین، محمد خاں، کلن
بخش، میاں جان خاں، قادر بخش
قابلِ ذکر ہیں۔ ان تینوں بھائیوں نے
تعلیم اپنے والد استاد دلاور خاں سے حاصل
کی تھی۔ بعد میں سنسکرت اسکالر عنایت
خاں کے بھی شاگرد بنے۔ عنایت خاں
سنسکرت اسکالر استاد بہرام خاں ڈھرو
کے پوتے تھے۔ انھی بہرام خاں کے شاگرد
کے سلسلے سے ایک استاد تجمّل حسین خاں تھے
جن کا تعلق بھی ایک طرح سے بھنڈی بازار
گھرانے سے رہا ہے۔ تجمّل حسین خاں گویے
ہونے کے ساتھ ساتھ سنگیت کے فن کے
ماہر اور بہترین معلّم تھے جن کا تعلیم دینے
کا طریقہ بھنڈی بازار گھرانے کا ہی رہینِ منت
تھا۔ ان کے شاگردوں میں ریڈیو آرٹسٹ
شاردا دھولیکر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے اپنے
اکلوتے صاحبزادے استاد تاج احمد خاں
اپنے والد ہی کی طرح بہترین معلّم ہونے کے
ساتھ خیال گائیکی کے ماہر اور غزل کمپوزیشن
میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ انھوں نے آواز
کی بہت سائنٹفک طریقے پر اسٹڈی کی
ہے جو سنگیت کی تعلیم دینے میں کافی ممد
ثابت ہوتی ہے۔ ان کے شاگردوں میں مشہور
غزل سنگر طلعت محمود، میوزک ڈائرکٹر کلیان جی
کمل باروٹ، سُشما شریسٹھ اور شوبھا جوشی
کا شمار ہوتا ہے۔

چھجو خاں کے دو بیٹے تھے: فدا حسین
خاں اور امان علی خاں۔ نذیر خاں کے
ایک لڑکے تھے مبارک علی جو کم عمری ہی میں
انتقال کر گئے۔ کیرانہ گھرانے کے استاد وحید
خاں سے ان کے بہت قریبی مراسم تھے۔
اس خاندان کے استاد امان علی خاں نے
اس گھرانے کی نمایاں خدمات انجام
دیں۔

استاد امان علی خاں (۱۸۸۱ء-۱۹۵۳ء)
نے سنگیت کی تعلیم اپنے والد چھجو خاں اور
اپنے چچا نذیر خاں اور خادم حسین خاں سے
حاصل کی۔ استاد امان علی خاں ایک سلجھے ہوئے
موسیقار اور اعلیٰ درجے کے گویّے تھے۔ مشہور
پلے بیک سنگر لتا منگیشکر ان کی شاگردہ رہ
چکی ہیں۔ اپنے گھرانے کو قائم رکھنا ان کا مشن
تھا۔ خاندان سے ملے ہوئے سنگیت کے
ورثے کو وہ یوں ہی ضایع نہیں کر دینا چاہتے
تھے۔ اور نہ ہی اسے اپنے سینے میں دفن
کیے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ سنگیت اور
اپنے فن کو پھیلانا بغیر شاگردوں کے ممکن
نہیں تھا۔ لیکن اس میں بھی ان کا طریقۂ کار
الگ تھا۔ وہ ہر کس و ناکس کو اپنا شاگرد نہیں
بناتے تھے۔ جو واقعی سنگیت کا چاہنے والا
ہو اور جس کے دل میں سنگیت کو سیکھنے کی لگن
ہو، اور جو سخت محنت، مشق اور ریاض کرنے
کی قوت رکھتا ہو وہی ان کا شاگرد بن سکتا
تھا۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ ان کا فن صحیح لوگوں
تک پہنچا۔ باقاعدہ شاگرد وہ بہت کم بناتے
تھے۔ باقاعدہ شاگرد بننے کو سنگیت کی زبان
میں گنڈا بندھوانا" کہتے ہیں۔ یوں تو ان کا
علم ہر کسی کے لیے تھا لیکن گنڈا وہ ہر کسی
کو نہیں باندھتے تھے۔

ان کے لاتعداد غیر مسلم شاگرد تھے۔
یوں بھی مہاراشٹر کے لوگ سنگیت کے
قدردان اور استاد (جنھیں عام طور پر وہ
خاں صاحب کہتے ہیں) کی بہت عزت کرتے
ہیں اور اپنے خاں صاحب کے لیے ان میں
گہری عقیدت ہوتی ہے۔ استاد امان علی خاں
کا مسلم شاگرد شاذو نادر رہی کوئی ہوگا!
انھیں ہمیشہ اس بات کا افسوس رہا کہ ان
کے علم و فن کو حاصل کرنے کا شوق خود ان
کے فرقے کے لوگوں میں نہیں ہے باوجود اس
کے کہ وہ ایک ایسے علاقے میں رہتے ہیں
جہاں اکثریت ان کے فرقے کے لوگوں کی
ہے۔ راقم کے والد محمد میاں صاحب
(نور محمد بینڈ والے) کے یہاں وہ اکثر آتے
رہتے تھے اور شکایت کرتے تھے کہ مسلم بچے
گلیوں میں کھیلتے اور آوارہ گردی کرتے
رہتے ہیں اور اپنا قیمتی وقت یوں ہی
ضایع کرتے ہیں اگر یہ میرے پاس آجایا
کریں تو میں انھیں تعلیم دینا اور سکھانا
اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا —!

استاد امان علی خاں صاحب کمال
موسیقار تھے۔ ان کی استعداد سنگیت کی
تعلیم دینے تک محدود نہیں تھی۔ وہ صاحب
قلم بھی تھے۔ سنسکرت اور برج بھاشا پر
کافی عبور حاصل تھا حالاں کہ ان کی خود اپنی
مادری زبان اردو تھی لیکن چوں کہ سنگیت کا
پرانا ذخیرہ سنسکرت میں ہے اور ان کے

استاد امان علی خاں

خاندان میں سلسلہ بہ سلسلہ ہندی، برج بھاشا یا سنسکرت میں بندشیں عموماً موجود تھیں اس لیے انھوں نے انھی زبانوں کو اپنی قلمی کاوشوں کے لیے استعمال کیا تاکہ ان کے شاگرد جو اُردو سے ناواقف تھے انھیں یاد کر سکیں۔ اپنے خاندانی قلمی نام آمر سے انھوں نے راگوں میں سینکڑوں چیزیں کمپوز کیں۔ ان کا مطالعہ کافی وسیع تھا۔ انھوں نے ایک بہت ہی ضخیم کتاب سنگیت پر لکھی تھی جن میں خود ان کی ترتیب دی ہوئی سینکڑوں چیزیں اور نئے نئے راگوں کا ذخیرہ شامل تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے یہ بھی تحقیق کی تھی کہ انسانی آواز موسیقی کی صرف ۱۰۴ مختلف آوازیں ہی نکال سکتی ہے اس سے زیادہ نہیں اگر اس سے زیادہ نکالنے کی کوشش کی گئی تو وہ انھی ۱۰۴ آوازوں میں سے کسی کا ایک پر تو ہوگی۔ لیکن افسوس کہ اس کتاب کا سارا مسودہ نذرِ آتش ہوگیا۔ جس مکان میں وہ رہتے تھے اس میں آگ لگ گئی اور سب کچھ جل کر خاک ہوگیا۔ اس طرح موسیقی پر ایک بہت ہی اہم مواد ضایع ہوگیا۔ زندگی بھر ان کو اس کا افسوس رہا کہ ان کی زندگی بھر کی محنت رائگاں گئی۔

بھنڈی بازار گھرانے کی اور خاص طور پر اُستاد امان علی خاں کی گائیکی کی خصوصیت تھی الاپی (الاپ) جو گمک، سوت، لے کاری اور مینڈ سے مزین تھی۔ الاپی یا بلمپت میں بول بانٹ یعنی گیت کے الفاظ کو مختلف انداز میں لے اور تال سے سجانا اس خاندان کا خاص طرز تھا۔ اس فنکاری سے راگ کی شکل و صورت واضح طور پر سامنے آتی تھی۔ دھیمی لے سے جب راگ کی مخفی خوبیوں کو پیش کیا جاتا تھا تو راگ کا صحیح ماحول اور موڈ سامعین پر طاری ہو جاتا تھا۔

ان کے یہاں جلد بازی یا جارحانہ انداز جو آگرہ گھرانے میں پایا جاتا ہے، بالکل نہیں تھا۔ یہی بات کرانہ گھرانے میں بھی پائی جاتی ہے۔ امان علی خاں کا انداز معتدلانہ تھا۔ ان کے یہاں نزاکت، لطافت اور راگ کی باریکیوں کو بہتر انداز میں پیش کرنے کا سلیقہ تھا۔ یہی بات ان کی دُرت (تیز لے) میں گت، تان، پلٹے، بول تان اور پھرت میں بھی قائم رہتی تھی۔ ایک اور چیز جو بہت کم گویّوں میں پائی جاتی ہے اور جو ان میں تھی وہ ہے میر کھنڈ یعنی سروں کو باقاعدگی سے آراستہ کرنا جس سے ایک زنجیر بن جائے۔ یہ خوبی اُستاد امیر خاں میں بھی تھی۔ جو خود تو اندور گھرانے سے تھے لیکن اُن کے والد شمیر خاں کا تعلّق بھنڈی بازار گھرانے سے رہا تھا۔ شاید یہ انھی کی دین ہو۔!

اکثر دیکھا گیا ہے کہ گویّے استھائی یا انترہ کے الفاظ کو بہت کم اہمیت دیتے ہیں اور یہ ایک طرح سے بجا بھی ہے کیوں کہ الفاظ ہمارے شاستریہ سنگیت میں صرف اضافی طور پر استعمال کیے جاتے ہیں تاکہ استھائی اور انترہ کی پہچان ہو سکے۔ اگر شبد (الفاظ) نہ بھی استعمال کیے جائیں تو گویّا گھنٹوں بغیر الفاظ کے گا سکتا ہے لیکن اُستاد امان علی خاں نے شبدوں کو بھی خاص اہمیت دی۔ ان کی خیال گائیگی میں سُر، شبد اور لے ان تینوں کا بہت خوبصورت امتزاج موجود ہوتا تھا۔ بول بانٹ، سرگم، اچک سمیٹ، زمزمہ، لے کاری، گٹکری کے ساتھ ساتھ شبدو[ں] کو بھی معنوی طور پر بڑی خوبی سے استعما[ل] کیا جاتا تھا۔

ان کا کرناٹک سنگیت کا مطالعہ بھی حیرت انگیز تھا۔ انھوں نے جنوبی ہند کے کئی راگوں سے شمالی ہند کے سنگیت کو روشناس کرایا۔ راگ ہنس دھونی (جو کرنا[ٹک] راگ ہے) کی "واتاپی گنپتی" کو بہت خوبصو[رت] طریقے سے ہندی بندش "لاگی لگن" میں ڈھالا ہے ——— کرناٹک سنگیت انھوں [نے] جنوبی ہند کے کرشنا اپّا سے سیکھا تھا۔ ا[ن] کی بنائی ہوئی چیزیں "ہتوا مانے ناہی" کافی راگ میں یا گنکلی میں "جے تری تشنہ" ہیم کلیان میں "لاگے ہو بھجن" اور "بھیرا[...] میں" اب کرم کیجیے آج بھی سنگیت کی دُنیا میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

ان کے شاگردوں میں چند مشہور نام یہ ہیں: شیو کمال شکل، وامن راؤ دیش پانڈے (مراٹھی سنگیت اسکالر وسنت راؤ دیش پانڈے (مراٹھی ناٹک اور گویّے)، پانڈو رنگ امبیکر (جن کی شاگردہ شبھا جوشی اعلیٰ درجہ کی مغنیہ اور غزل سنگر ہیں اور جو آج کل اُستاد تاج ا[حمد] خاں سے غزل کی تعلیم لے رہی ہیں) اور بزرگ سنگیت کار ماسٹر نورنگ۔ رمیشر ناڈکرنی پنڈت جنوریکر اور مشہور پلے بیک سنگ[ر] لتا منگیشکر کو بھی ان کی شاگردی کا شرف حاصل ہے۔ لتا کو ۱۹۴۵ء میں مراٹھی کے مشہور پروڈیوسر اور ڈائرکٹر ماسٹر ونایک اُستاد

امان علی خاں کے پاس لاتے تھے اور اُستاد
سے تعلیم حاصل کرنے کے لیے وہ دو سو
روپے کا وظیفہ بھی ہر ماہ دینے پر تیار تھے
لیکن خود دار لتّا نے وظیفہ لینے سے انکار کر دیا
خود لتّا کی مالی حالت اس وقت بہت خراب
تھی ـــــ !

اُستاد ایک کامیاب گویّے اور موسیقار
ہونے کے علاوہ ایک نیک دل انسان اور
دین دار شخص تھے۔ دولت کی طمع اور شہرت
کی ہوس سے بے نیاز! زندگی اور سنگیت ان
کے لیے لازم و ملزوم تھے۔ سنگیت سمیلن اور
موسیقی کی محفل میں شرکت سے عام طور پر
احتراز کرتے تھے۔ اس زمانے میں آل انڈیا
ریڈیو بمبئی کے اسٹیشن ڈائرکٹر ذوالفقار علی
بخاری (۱۹۴۰ء) نے انھیں ریڈیو پر گوانے
کی بہت کوشش کی لیکن یہ اکثر ٹال گئے۔
اُن کا آخری پبلک پروگرام دہلی کے
کانسٹی ٹیوشن ہال میں ۱۹۵۲ء میں ہوا
تھا۔ ہال کھچا کھچ سامعین سے بھرا ہوا تھا۔
پنڈت روی شنکر، ڈاکٹر بھٹ اور مسز ڈاکٹر
کیسکر جیسے سنگیت کے ماہر موجود تھے۔ پنڈت
روی شنکر کو حیرت تھی کہ اس گھرانے کے
بزرگ موسیقار کس خوبی سے روایتی طریقے
کو قائم رکھتے ہوئے سنگیت میں تخلیقانہ
فنکاری کو پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے
ہیں ـــــ! بقول ان کے ان کی آواز نازک
اور سریلی اور مائیکرو فون کے لیے موزوں
تھی۔ ان میں جمالیاتی حس اور فنکاری تھی
خاص طور پر کرناٹک اسٹائل میں سرگم
واقعی زبردست تھی۔
اُستاد کی زندگی سنگیت کے لیے وقف
تھی۔ ان میں سادگی اور مزاح کی ملی جلی آمیزش
تھی۔ ایک مرتبہ اپنے شاگرد رمیش ناڈکرنی
کے ساتھ بمبئی کے تاردیو علاقے سے ماہم بس
سے جا رہے تھے تو کنڈکٹر سے کہنے لگے: "دو
ماہم آدھا ٹکٹ"۔ اس پر وہ بے چارہ ہنسنے
لگا۔ اسی طرح جب آخری مرتبہ وہ دہلی
جانے لگے تو بمبئی سینٹرل اسٹیشن پر اپنے
شاگردوں سے جو انھیں رخصت کرنے آئے
تھے کہنے لگے: "میں ریلوے والوں کو بے وقوف
بنانے والا ہوں۔ میں نے رٹرن ٹکٹ لی ہے
لیکن میں واپس نہیں آؤں گا ـــــ!" اور
وہ واقعی واپس نہیں لوٹے۔ کچھ مہینوں بعد
ہی ان کا دہلی میں انتقال ہو گیا۔ اس طرح
بھنڈی بازار گھرانے کا ایک درخشاں باب
ختم ہو گیا ـــــ!

آج اُستاد امان علی خاں کو گزرے ۳۵
سال بیت چکے ہیں۔ ان کی نہ تو برسی منائی
جاتی ہے اور نہ ہی ان کی سالگرہ۔ لیکن ابھی
حال ہی میں بمبئی میں دو روزہ "بھنڈی بازار
گھرانہ سنگیت سمیلن اور سیمینار" منعقد ہوا
تھا جس میں اس گھرانے کی یاد تازہ کی گئی
اور اُستاد کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔
ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی بنائی
اور ترتیب دی ہوئی چیزیں اور بندشیں
جو ان کے شاگردوں اور شاگردوں کے
شاگردوں کے سینے میں محفوظ ہیں انھیں
ریکارڈ کر کے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا
جائے تاکہ سنگیت کے اس گھرانے کا
ذخیرہ بکھرنے اور ضایع ہونے سے
بچ جائے۔

غزلیں

آر۔ پی۔ شوخ

ملتی ہے بار بار ملے غم سے زندگی
لیکن کبھی ملے تو سہی ہم سے زندگی

دُنیا کے غم تھے پہلے کہاں اِتنے دلفریب
ہر غم کو مل گئی ہے ترے غم سے زندگی

تھی زندگی عزیز مگر اُس کے واسطے
مانگی نہ جس نے بھول کے بھی ہم سے زندگی

چہرے کے ریگ زار میں رونق اُگا گئی
اُتری کبھی جو دیدۂ پر نم سے زندگی

وہ غم کی ابتدا تھی، مگر انتہا ہے یہ
پہلے تھا زندگی سے غم اب غم سے زندگی

ایم۔ این۔ کالج، شاہ آباد، مارکنڈہ ۱۳۲۱۳۵ (ہریانہ)

زرد پتے ہی کریں گے داستانِ غم بیاں
کیوں تھکی ماندی حیاتِ ناتواں کھولے زباں

ہم نے پینسٹھ سال تک دیکھا ہے ظالم وقت نے
کر دیے برباد کتنے ہی زمین و آسماں

گو بظاہر ادھ کھلے پھولوں کی آنکھیں بند تھیں
دل متاعِ نور سے تھا کہکشاں در کہکشاں

کیوں تو دم سادھے پڑی ہے اے حیاتِ مختصر
ٹوٹنے کو ہے کسی لمحے ترا خستہ مکاں

زندگی سے کم نہیں، سوچو تو اک نعمت ہے موت
خضر کو راس آگئی ہو گی حیاتِ جاوداں

جنسِ اُلفت کا کوئی بازار میں گاہک نہیں
لاغرؔ ایسے میں یہ دولت لے کے ہم جائیں کہاں

اوم پرکاش لاغر

۱۷۔ بی، نہرو گراؤنڈ، نزد پنجاب نیشنل بینک این۔ آئی۔ ٹی، فرید آباد ۱۲۱۰۰۱

شاکر انصاری

اپنی منزل کی طرف پاؤں بڑھاتے رہ[ئے]
راہ میں آئیں جو پتھر وہ ہٹاتے رہ[ئے]

کوئی جاگے کہ نہ جاگے یہ مقدر اس [کا]
آپ کا فرض ہے آواز لگاتے رہ[ئے]

لوگ فٹ پاتھ پہ سونے کے بھی عادی ہیں مگ[ر]
آپ کوٹھی کو قرینے سے سجاتے رہ[ئے]

آپ اِس گردِ سیاست میں نہ کھو جائیں کہی[ں]
اپنی تہذیب کے دامن کو بچاتے رہ[ئے]

ظلمتیں آپ کی راہوں میں نہ ہوں گی شاک[ر]
خونِ دل اپنا چراغوں میں جلاتے رہ[ئے]

مکان نمبر ۳۸۸، انصاریان، سکندرآباد، ضلع بلند شہر (یو۔پی)

ورشید پرویز صدّیقی

مولانا آزاد کی گرفتاریاں اور سزائیں

"ایوانِ اُردو" کے "مولانا ابوالکلام آزاد
بر" لغایت دسمبر ۱۹۸۸ء میں جناب
بد اللطیف اعظمی کا مضمون "مولانا آزاد کی
رفتاریاں اور سزائیں" شائع ہوا ہے۔

صاحبِ مضمون کا یہ کہنا درست ہے
"مولانا نے غبارِ خاطر کے ایک خط ۱۱ اگست
۱۹۴ء میں اپنی گرفتاریوں اور سزاؤں کی
مجموعی مدّت لکھی ہے، وہ محض تخمینی ہے،
گر چوں کہ لوگوں کے سامنے اس کے علاوہ اور
دئی تفصیل نہیں ہے، اس لیے مجبوراً اسی
حوالہ دیتے ہیں، جس کی وجہ سے غلطیوں
ں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔"

شکر ہے اعظمی صاحب نے اس کمی
سمجھا اور اخبارات سے تحقیق کرنے کے
د جملہ گرفتاریوں اور سزاؤں کی تفصیل
یں فراہم کرنے کی زحمت کی۔ اعظمی صاحب
جو تفصیل تحریر کی ہے، اس میں اُن
ے کئی جگہوں پر سہو ہوا ہے۔ لہٰذا اس
تصحیح ضروری ہے تاکہ آئندہ "غلطیوں
ا اضافہ نہ ہوتا رہے۔"

اعظمی صاحب کے مطابق مولانا آزاد
گرفتاریوں اور سزاؤں کی تفصیل یوں
ہے۔

رانچی کی نظر بندی : اواخر مارچ ۱۹۱۶ء
رہائی　:　یکم جنوری ۱۹۲۰ء
تقریباً ۳ سال ۹ ماہ

۲۔ گرفتاری : ۱۰ دسمبر ۱۹۲۱ء
سزا　:　۹ فروری ۱۹۲۲ء
رہائی　:　۶ جنوری ۱۹۲۳ء
مقدمے کی مدّت شامل کر کے تقریباً
ایک سال ایک ماہ

۳۔ گرفتاری : ۲۱ اگست ۱۹۳۰ء
رہائی　:　۲۷ جنوری ۱۹۳۱ء
تقریباً ۶ ماہ

۴۔ گرفتاری : ۱۲ مارچ ۱۹۳۲ء
رہائی　:　۱۱ مئی ۱۹۳۲ء
۲ ماہ

۵۔ گرفتاری : ۳ جنوری ۱۹۴۱ء
رہائی　:　۴ دسمبر ۱۹۴۱ء
تقریباً ۱۱ ماہ

۶۔ گرفتاری : ۹ اگست ۱۹۴۲ء
رہائی　:　۱۵ جون ۱۹۴۵ء
۳ سال ۲۴ دن

کُل مدّت : ۹ سال ۷ ماہ ۲۴ دن
یعنی : ۳۵۱۹ دن
عمر کی کُل مدّت : ۶۸ سال ۷ ماہ ۹ یا ۱۰ دن
یعنی : ۲۵۰۴۰ دن تقریباً [۱]

مذکورہ بالا تفصیل میں مولانا کی پہلی نظر بندی کے ماسوا دیگر تمام گرفتاریوں کی تاریخیں دُرست ہیں۔ لیکن مدّت کے تعیّن میں اعظمی صاحب سے ہر جگہ سہو ہوا ہے۔ انھوں نے گرفتاری اور رہائی کے مقامات کا ذکر نہیں کیا ہے، جو ضروری تھا۔

مولانا کی اوّلین نظر بندی کی تاریخ کے بارے میں لوگ عام طور پر غلطی کرتے رہے ہیں۔ اواخر مارچ ۱۹۱۶ء میں حکومتِ بنگال نے مولانا کو حدودِ صوبہ سے نکل جانے کا نوٹس دیا تھا۔ محققین اس نوٹس کے جاری ہونے کی تاریخ سے یا پھر رانچی میں مولانا کے قیام کے ایک ہفتہ بعد یعنی اپریل ۱۹۱۶ء کے پہلے ہفتے سے مولانا کی نظر بندی کی مدّت شروع کرتے ہیں۔ یہ ایک بنیادی غلطی ہے۔ اور اعظمی صاحب سے بھی یہی غلطی سرزد ہوئی ہے۔

مولانا "غبارِ خاطر" میں اپنے خط ۱۱ اگست ۱۹۴۲ء کے حاشیے پر لکھتے ہیں
"۷ اپریل ۱۹۱۶ء کو حکومتِ بنگال نے ڈیفنس آرڈیننس کے ماتحت مجھے بنگال سے خارج کر دیا۔ میں رانچی گیا اور شہر سے باہر مورا باری میں مقیم ہو گیا۔ پھر کچھ دِنوں کے بعد مرکزی حکومت نے وہیں قید کر دیا اور اس کا سلسلہ ۱۹۲۰ء تک چلتا رہا۔" اس سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا ۷ اپریل ۱۹۱۶ء کو رانچی وارد ہوئے اور پھر کچھ دِنوں کے بعد حکومت نے قید کر دیا "کتنے دِنوں کے بعد" اس کی صراحت مولانا نہیں کرتے ہیں۔ یہ بات آگے صاف ہو گی۔

محترم مالک رام کا کہنا ہے کہ "مولانا رانچی میں تقریباً پانچ ماہ تک آزاد رہے، ۸ جولائی ۱۹۱۶ء کو انھیں نظر بند کیا گیا۔

دریا پور، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴ (بہار)

چار سال کے بعد وہ ۲۷ دسمبر ۱۹۱۹ء کو رہا ہوئے۔[۱۵]"

مالک رام صاحب حقیقت کے کافی قریب تو ضرور پہنچے لیکن راہ میں کئی ٹھوکریں کھا گئے۔ مولانا چار سال نہیں بلکہ تین سال دو ماہ اور کچھ دِنوں کے بعد رہا ہوئے، اور وہ ۲۷ دسمبر ۱۹۱۹ء کو نہیں بلکہ یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو رہا ہوئے۔ ۲۷ دسمبر کی تاریخ مالک رام صاحب خدا جانے کہاں سے اور کیسے لائے۔ مولانا رانچی میں پانچ ماہ تک آزاد رہے، اس سلسلے میں مالک رام صاحب حقیقت کے کافی قریب ہیں۔ مولانا پانچ نہیں بلکہ چھ ماہ تک آزاد رہ کر اکتوبر ۱۹۱۶ء کی کسی تاریخ کو نظر بند ہوئے۔

اپنی نظر بندی کا تذکرہ کرتے ہوئے "قولِ فیصل" میں مولانا خود ہی کہتے ہیں:

"مجھے یاد ہے کہ جب میں اکتوبر ۱۹۱۶ء میں نظر بند کیا گیا اور بہار گورنمنٹ کے حکام اور پولیس افسر (جس کا تعلق اُردو زبان کے بمقابلہ بنگالی سے زیادہ ہے) تلاشی کے لیے آئے تو انھوں نے میری تمام کتابوں کو بھی ایک خوفناک لٹریچر سمجھ کر نہایت احتیاط کے ساتھ قبضے میں کر لیا۔ یہ تمام کتابیں عربی اور فارسی زبانوں میں تھیں۔ اور تاریخ، فقہ، فلسفے کا معمولی مطبوعہ ذخیرہ تھا، جو بازاروں میں فروخت ہوتا رہتا ہے۔ صرف ایک کتاب 'مطالب عالیہ' نامی قلمی تھی۔ جو سب سے پُر اسرار سمجھی گئی۔ لطف یہ ہے کہ ان کی فہرست ڈپٹی کمشنر کی درخواست سے مجھے ہی مرتب کرنی پڑی۔[۱۶]"

مولانا کو اپنی نظر بندی کا نہ صرف مہینہ یاد ہے بلکہ کتابوں کی فہرست اور قلمی کتاب کا نام تک مولانا نے لکھ دیا ہے۔ جس اعتماد اور تفصیل کے ساتھ انھوں نے اپنی نظر بندی کا ذکر کیا ہے اس کے بعد کسی شک و شبہے کی گنجائش نہیں رہ جاتی ہے کہ انھیں اکتوبر ۱۹۱۶ء کی کسی تاریخ کو نظر بند کیا گیا نہ کہ اواخر مارچ یا اپریل کے پہلے ہفتے میں۔

غالباً ۸ اکتوبر ۱۹۱۶ء کو مولانا نظر بند کیے گئے۔ مالک رام صاحب شاید ۸ اکتوبر کی جگہ ۸ جولائی لکھ گئے۔ بہرحال تاریخ میں اختلاف ہو سکتا ہے، لیکن مولانا کے بیان سے اتنی بات طے ہو گئی کہ وہ اواخر مارچ یا اپریل ۱۹۱۶ء کے پہلے ہفتے میں نظر بند نہیں کیے گئے۔

اگر ۸ اکتوبر ۱۹۱۶ء مولانا کی تاریخ نظر بندی تسلیم کر لی جائے، تو کل مدت نظر بندی ۳ سال ۲ ماہ ۲۵ دن ہوتی ہے۔ اعظمی صاحب نے مولانا کی پہلی نظر بندی کی مدت (غالباً ۷ اپریل ۱۹۱۶ء سے) ۳ سال ۹ ماہ تحریر کی ہے، یہ غلط ہے۔ اگر ۷ اپریل ۱۹۱۶ء ہی کو مولانا کی اوّلین نظر بندی کی تاریخ تسلیم کر لیا جائے تو بھی نظر بندی کی مدت ۳ سال ۸ ماہ ۲۵ دن ہوتی ہے نہ کہ ۳ سال ۹ ماہ جیسا کہ اعظمی صاحب نے لکھا ہے۔ مولانا رانچی ہی میں نظر بند ہوئے اور وہیں سے رہا بھی ہوئے۔

اعظمی صاحب کے حساب سے مولانا کی اوّلین نظر بندی کی کل مدت ۱۳۶۵ دن تھی۔ اور میرے (اکتوبر ۱۹۱۶ء کے مطابق) حساب سے ۱۱۸۱ دن مولانا نظر بند رہے۔

مولانا کی باقی پانچ گرفتاریوں اور سزا کی تاریخیں اعظمی صاحب نے دُرست لکھی ہیں۔ لیکن مدت کے حساب میں اُن سے سہو ہوا ہے۔

مولانا کی دوسری گرفتاری ۱۰ دسمبر ۱۹۲۱ء کو اُن کے مکان (کلکتہ) سے ہوئی۔ اور وہ ۳۹۳ دِن یعنی ایک سال ۲۸ دِنوں کے بعد علی پور جیل کلکتہ سے رہا ہوئے۔ لطیف صاحب نے قید کی کل مدت ۳۹۵ دِن یا ایک سال ایک ماہ بتائی ہے، جو غلط ہے کیوں کہ اس میں دو روز کا اضافہ ہے۔

تیسری گرفتاری کلکتہ میں میرٹھ ضلع مجسٹریٹ کے جاری کردہ وارنٹ پر ۲۱ اگست ۱۹۳۰ء کو ہوئی۔ کچھ دنوں تک وہ میرٹھ جیل میں رہے پھر گونڈہ جیل منتقل کر دیے گئے۔ جہاں سے وہ ۱۶۰ دِن یعنی ۵ ماہ ۸ دِن کی کل سزا کاٹ کر رہا ہوئے۔ اعظمی صاحب نے قید کی مدت ۶ ماہ لکھی ہے، جو غلط ہے۔ ہاں سزا البتہ چھ ماہ کی ہوئی تھی۔

چوتھی بار دہلی میں گرفتار اور وہیں سے رہا ہوئے۔ سزا کی مدت دو ماہ رہی۔

۳ جنوری ۱۹۴۱ء کو الٰہ آباد اسٹیشن پر مولانا پانچویں بار گرفتار ہوئے۔ گیارہ ماہ تین دن یعنی ۳۳۶ دِن کی سزا کاٹ کر مولانا شام ساڑھے چار بجے نینی جیل سے رہا ہوئے۔ اعظمی صاحب کے

مطابق قید کی مدّت "تقریباً گیارہ ماہ" تھی۔

مولانا چھٹی اور آخری بار بمبئی میں گرفتار ہوئے اور ۲ سال ۱۰ ماہ ۸ دن یعنی ۱۰۴۱ دن کے بعد بانکوڑا جیل سے رہا ہوئے۔ اعظمی صاحب نے قید کی مدّت ۳ سال ۲۴ دن یا ۱۱۱۹ دن لکھی ہے، جو قطعی غلط ہے۔ پنڈت نہرو کے مطابق بھی وہ ۱۰۴۱ دن قید رہ کر مولانا کے ساتھ ہی، لیکن دوسری جیل سے رہا ہوئے اور یہی دُرست ہے۔

اعظمی صاحب سے میزان میں بھی غلطی ہوئی ہے۔ انھوں نے کُل مدّت قید ۹ سال ۷ ماہ ۲۴ دن یعنی ۳۵۱۹ دن تحریر کی ہے۔ جب کہ اُن کی دی گئی تفصیل کے مطابق اسے ۹ سال ۵ ماہ ۲۴ دن یعنی ۳۴۵۹ دن ہونا چاہیے۔ اسے کتابت کی غلطی نہیں تسلیم کیا جا سکتا، کیونکہ اگر کاتب کی غلطی سے بجائے "۵ ماہ" کے "۷ ماہ" لکھا گیا تو کم از کم "۳۴۵۹ دن" صحیح لکھا جانا چاہیے تھا، نہ کہ "۳۵۱۹ دن" جیسا کے لکھا گیا ہے۔ لہٰذا یہ کاتب کی نہیں بلکہ اعظمی صاحب کی غلطی ہے یا پھر انھوں نے حساب برابر رکھنے کے لیے جان بوجھ کر "غلطی" کی ہے۔

اعظمی صاحب نے مولانا کی عمر کی کل مدّت ۶۸ سال ۷ ماہ ۹ یا ۱۰ دن لکھی ہے۔ یہ بھی غلط ہے۔ اس لحاظ سے مولانا کی تاریخ پیدائش ۱۲ رمئی ۱۸۸۹ء نکلتی ہے۔ مولانا کی تاریخ پیدائش ۱۷ یا ۲ راگست ۱۸۸۸ء ہے۔ اس اعتبار سے مولانا کی عمر ۶۹ سال ۴ ماہ ۵ دن یعنی ۲۵۳۰۵ ہوئی۔ معلوم نہیں کہاں سے اعظمی صاحب نے مولانا کی تاریخ پیدائش ۱۲ رمئی ۱۸۸۹ء نکالی ہے وہی جانیں۔ مولانا کل ۲۵۳۰۵ دن زندہ رہے نہ کہ بقول اعظمی صاحب ۲۵۰۴۰ دن۔

مولانا کی جملہ گرفتاریوں اور سزاؤں کی تفصیل ذیل میں تحریر کرتا ہوں:

۱۔ رانچی کی نظر بندی: ۸ راکتوبر ۱۹۱۶ء
رہائی: یکم جنوری ۱۹۲۰ء
۳ سال ۲ ماہ ۲۵ دن

۲۔ گرفتاری: ۱۰ ردسمبر ۱۹۲۱ء
رہائی: ۶ رجنوری ۱۹۲۳ء
۱ سال ۲۸ دن

۳۔ گرفتاری: ۲۱ راگست ۱۹۳۰ء
رہائی: ۲۷ رجنوری ۱۹۳۱ء
۵ ماہ ۸ دن

۴۔ گرفتاری: ۱۲ رمارچ ۱۹۳۲ء
رہائی: ۱۱ رمئی ۱۹۳۲ء
۲ ماہ

۵۔ گرفتاری: ۳ رجنوری ۱۹۴۱ء
رہائی: ۴ ردسمبر ۱۹۴۱ء
۱۱ ماہ ۳ دن

۶۔ گرفتاری: ۹ راگست ۱۹۴۲ء
رہائی: ۱۵ رجون ۱۹۴۵ء
۲ سال ۱۰ ماہ ۸ دن

کل مدّت قید: ۸ سال ۸ ماہ ۱۲ دن
یعنی: ۳۱۷۲ دن
عمر کی کُل مدّت: ۶۹ سال ۴ ماہ ۵ دن
یعنی: ۲۵۳۰۵ دن

بہرحال اس حساب سے بھی (تقریباً) وہی نتیجہ نکلا یعنی مولانا کی زندگی کا ہر ساتواں دن کم و بیش قید خانے کے اندر گزرا۔ لیکن زیادہ بہتر ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ زندگی کا ہر آٹھواں دن جیل میں گزرا۔ مولانا کی پہلی نظر بندی کی تاریخ کے قطعی تعیّن میں دو ایک روز کا فرق ہوسکتا ہے، اس سے زیادہ کا امکان نہیں ہے۔

حوالے:

۱۔ مولانا آزاد کی گرفتاریاں اور سزائیں (عبداللطیف اعظمی) صفحہ ۴۲، ماہنامہ ایوانِ اُردو، دہلی۔ ابوالکلام آزاد نمبر، دسمبر ۱۹۸۸ء

۲۔ غبارِ خاطر، صفحہ ۳۵ کا حاشیہ، تیسرا ایڈیشن، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی۔

۳۔ مولانا آزاد بحیثیت صحافی (مالک رام) صفحہ ۸۵، ماہنامہ آج کل، مولانا آزاد نمبر، نومبر ۱۹۸۸ء۔

۴۔ قولِ فیصل (مولانا آزاد) صفحہ ۲۲۸، مولانا ابوالکلام آزاد نمبر، ماہنامہ ایوانِ اُردو، دہلی۔ دسمبر ۱۹۸۸ء

۵۔ DISCOVERY OF INDIA: JAWAHAR LAL NEHRU, THE SIGNET PRESS CA-LCUTTA, FST. ED. 1946, P. 692.

OO

شاہد رضا

کردار کی تلاش میں

آئیے اندر تشریف لے آئیے۔

معاف کیجیے گا آپ کو تھوڑا انتظار کرنا پڑا۔ حالاں کہ میں آپ ہی کا منتظر تھا۔ گھنٹی کی آواز میں نے فوراً سن لی تھی۔ لیکن روشنی کا بندوبست کر رہا تھا۔ جب گھر میں کوئی مہمان آئے تو تھوڑی بہت روشنی ضرور ہونا چاہیے۔ یہ کیا کہ ہر طرف اندھیرا۔ ہر گوشے میں تاریکی ___ آئیے آئیے روشنی کم ضرور ہے مگر آپ کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی یہاں۔ ذرا دیکھ کر۔ یہاں گندی نالی بھی ہے اور زمین بھی کچھ ہموار نہیں ہے۔ ابھی جب میں آپ کو لینے جا رہا تھا تو یہیں پر لڑکھڑایا تھا۔ حالاں کہ اتنا اندھیرا ابھی نہیں ہے۔ اور پھر میں تو یہاں برابر آیا کرتا ہوں لیکن ایسا ہوتا ہے کبھی کبھی اس جگہ ٹھوکر لگتی ہے جہاں اس کی قطعاً امید نہ ہو۔ پھر بھی آئیے میں آپ کا ہاتھ تھام لوں۔ یہ دیکھیے یہاں سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں لیکن جس مسالے سے اینٹیں جوڑ کر ان کو بنایا گیا تھا وہ بہہ گیا۔ اب کے بارش بھی تو خوب ہوئی۔

ارے آپ رک کیوں گئے۔ اپنا ہاتھ بھی چھڑا لیا آپ نے۔ آپ کا چہرہ کیوں بگڑ رہا ہے۔ اوہ، اب سمجھا۔ یہ آوازیں۔ آپ ڈریے نہیں۔ اور پھر جس شخص سے ملاقات کے لیے آپ آتے ہیں یہ اسی کی آوازیں ہیں۔ بڑی بھیانک ہیں نا۔ پاگلوں کی طرح چلا رہا ہے وہ۔ لیکن آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ تھوڑی دیر میں قبرستان جیسی خاموشی چھا جائے گی یہاں۔ میں نہیں ڈرتا ان آوازوں سے۔ ایک مدت سے سنتا آرہا ہوں۔ پڑوس میں ہی رہتا ہوں میں۔ وہ ٹوٹی ہوئی دیوار ہے اس کے دوسری طرف۔ ایک چھوٹا سا میدان بھی ہے ہمارے گھر اور اس دیوار کے درمیان۔ لیکن جب یہ شور بلند ہوتا ہے تو اُس ٹوٹی ہوئی دیوار کو پار کر کے، میدان کے خلا کو پُر کرتا ہوا میرے گھر کی دیواروں سے نیچے اتر جاتا ہے۔ یقین کیجیے یہ شور سن کر میرے گھر کے در و بام بھی خاموش ہو جاتے ہیں۔ ہاں کیوں نہیں آس پاس اور لوگ بھی رہتے ہیں۔ ایسی بات نہیں ہے یہ انسانوں کی ہی بستی ہے لیکن اس مشینی دور نے ہم کو ایک دوسرے سے بے تعلق کر رکھا ہے۔ یہ برق رفتار راہیں۔ یہ راتوں رات منزل پا لینے کی خواہش ہمیں ارد گرد دیکھنے کی مہلت ہی کہاں ملتی ہے۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ اب آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔ جب یہ آوازیں بند ہو جائیں گی تب ہی اس سے ملاقات ہو سکے گی۔ میرے خیال میں کھڑے ہو کر انتظار کرنے سے بہتر ہے کہ بیٹھا جائے۔ آئیے ادھر اس کمرے میں آجائیے۔

کیا کروں ان آوازوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے کھڑکیاں بھی بند نہیں کر سکتا۔ کس قدر سخت گرمی ہے۔ موسم بھی بڑا عجیب ہے۔ ہر چیز اپنی طاقت کے مظاہرے پر آمادہ ہے بادل سمندروں سے پانی لے کر دریاؤں پر برستے ہیں۔ دریا اپنے سینے میں اٹھنے والے نفرت کے شعلوں کو کناروں پر اگل دیتا ہے ہوائیں اپنے ساتھ نہ جانے کیا کیا اڑا لے جاتی ہیں اور سورج وہ تو سب سے زیادہ ظالم ہے۔ راستوں کو اس قدر گرم کر دیتا ہے کہ چلنا دشوار ہو جاتا ہے۔

اور ہاں، ایک بات اور بتانا ہے کہ یہ دورہ کبھی کبھی بہت طویل ہو جاتا ہے ___ ساری ساری رات گزر جاتی ہے۔ کئی کئی دن گزر جاتے ہیں۔ لیکن آپ فکرمند نہ ہوں۔ یہاں آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ سوائے اس کے کہ یہ آوازیں آپ کی سماعت سے ٹکراتی رہیں۔ وہ بھی اگر بجلی آگئی تو میں یہ کھڑکیاں اور دروازہ بند کر دوں گا۔

آپ کھڑے کیوں ہو گئے۔ بیٹھیے نا آرام سے بیٹھیے۔ جانا چاہ رہے ہیں آپ۔ اپنے کردار سے ملے بغیر۔ ارے صاحب ناحق ناراض

۷، مہمند جنگہ، شاہ جہاں پور ۲۴۲۰۰۱

ہو رہے ہیں آپ ۔ میں آپ کی ملاقات کسی پاگل سے نہیں کروا رہا ہوں ۔ ہاں اِس گھر میں اور لوگ بھی رہتے ہیں لیکن اِس وقت یہاں موجود نہیں ہیں ۔ اور اگر ہوتے بھی تو اِن آوازوں کو بند کروانے کی کوشش کوئی نہ کرتا ۔ آپ کو یہ بے رنگ دیواریں اچھی نہیں لگ رہیں ۔ آپ کو اِن سے کیا لینا دینا ۔ آپ تو اپنے کردار سے ملنے آئے ہیں بس ۔

ٹھیک ہے اگر آپ بضد ہیں تو ضرور جائیے لیکن بس اِتنا ٹھہر جائیے کہ میں آپ کو ایک کہانی سُنا سکوں ۔ اختصار کے ساتھ ۔ لیجیے بجلی بھی آگئی ۔ میں یہ دروازہ اور کھڑکیاں بند کیے دیتا ہوں ۔

ویسے تو وہ انسان اپاہج ہوتا ہے جس کا کوئی عضو بیکار ہو ۔ لیکن اِن کے علاوہ کچھ ایسے لوگ بھی انھی میں شمار کیے جاتے ہیں جو مکمّل ہوتے ہیں ۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو ہاتھ پاؤں سلامت ہوتے ہوئے بھی وہاں نہیں پہنچ پاتے جہاں اُن کی ضرورت ہو ۔

ارے آپ پھر ناراض ہونے لگے ۔ میں آپ کو نصیحت نہیں کر رہا نہ ہی کوئی تقریر کر رہا ہوں ۔ یہ الفاظ آپ کے کردار کی زبان سے ادا ہوتے تھے لیکن بہت پہلے ۔ جب یہ شخص بالکل ٹھیک تھا ۔ ہم لوگ ہم جماعت ہونے کے ساتھ ساتھ گہرے دوست بھی تھے ۔

قدرت نے اعجاز کو بہت اچھا ذہن عطا کیا تھا ۔ وہ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے شہر آیا تھا ۔ غریب والدین کی اولاد تھا لیکن ماموں نے اس کی زندگی سنوارنے کا عہد کیا تھا ۔ وہ بہت خوش تھا شہر آکر کھلی فضا حسین خواب سجانے کے لیے خوبصورت ماحول ۔ سبھی کچھ تھا شہر میں ۔

پھر تھوڑے دِنوں کے بعد یہ راز کھلا کہ ماموں اُس کی نہیں بلکہ اپنی اپاہج بیٹی کی زندگی سنوار رہے ہیں ۔ اعجاز نے ہی بتایا تھا کہ عندلیب کا ایک ہاتھ بیکار ہے ۔ گہری ہمدردی کا اظہار کیا تھا اُس نے ۔ پھر ایک دن اُس نے بتایا کہ وہ عندلیب کے لیے اپنے دِل میں محبّت کا بیج پھوٹتا ہوا محسوس کر رہا ہے ۔ یہ محبّت بھی عجیب جذبہ ہے ۔ دل میں چپ چاپ اُتر جاتا ہے ۔ بغیر اجازت لیے بغیر کچھ کہے ۔ اور اگر کبھی اس کو ایسا کرنے میں کوئی دشواری پیش آنے کا خدشہ ہو تو ہمدردی کا روپ دھار کر دِل میں اتر جاتا ہے پھر سب کے سامنے لباس اس طرح تبدیل کرتا ہے کہ کسی کو کچھ بھی نظر نہیں آتا ۔

میں کہانی سے تھوڑا ہٹ گیا تھا معافی چاہتا ہوں ۔ ہاں تو پھر میں نے دیکھا کہ اعجاز کے دِل کا وہ پودا جوان ہو گیا ہے ۔ اور میں نے ہی نہیں بلکہ اُس کے ہر ساتھی نے دیکھا ہوگا ۔ کیوں کہ اُس کی سبز سبز ڈالیاں اعجاز کی آنکھوں سے باہر جھولتی نظر آتی تھیں ۔ اُس کی رفتار میں ایک نشہ سا محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی خوشبوؤں کے شہر سے گزر رہا ہو ۔

اس کے بعد اعجاز پہلے سے زیادہ محنت کرنے لگا تھا ۔ وہ اکثر کہا کرتا کہ اب میں اپنے لیے نہیں عندلیب کے لیے سب کچھ کرتا ہوں ۔ وہ کہتا تھا کہ عندلیب بہت اُداس رہتی ہے ۔ چھوٹی بہنوں کے لیے رشتے آتے ہیں لیکن اس کے لیے کوئی رشتہ نہیں آتا ۔ جیسے وہ موجود ہی نہ ہو ۔

پھر ایک دن اعجاز نے اس کے ہاتھ کا بُنا ہوا سوئٹر مجھے دکھایا تھا ۔ بہت خوبصورت تھا وہ ۔ اس کو دیکھ کر تصوّر میں ایک پیکر اُبھرا تھا ۔ لیکن عندلیب اُس سے بہت زیادہ حسین تھی ۔ کچھ چہرے ایسے ہوتے ہیں جن پر پڑتے ہی نگاہیں عقیدت سے جھک جاتی ہیں ۔ ایسا ہوتا ہے نا ۔ عندلیب بھی ایسی ہی تھی ۔ پاکیزہ پاکیزہ سی ۔ منوّر چہرے والی ۔

اعجاز نے اپنے ماموں کو اور عندلیب کو بھی یقین دلایا تھا کہ وہ بے وفائی نہیں کرے گا ۔ پھر ہم لوگ الگ ہو گئے تھے ۔ کامیاب زندگی گزارنے کے لیے کسی خاص میدان کا انتخاب ضروری تھا ۔ اور اتّفاق سے گہرے دوست ہوتے ہوئے بھی ہم لوگوں نے الگ الگ میدانوں کا انتخاب کیا ۔

ایک سال پہلے جب اِس شہر میں قدم رکھا تو اُمید بھی نہیں تھی کہ اعجاز سے ملاقات ہوگی ۔ اور وہ بھی اِس حالت میں ۔ اچھا ہوتا اگر اعجاز مجھے نہ ملتا ۔

یہاں وہ ایک چوراہے پر ملا تھا ۔ پہچاننا مشکل تھا اُس کو ۔ لیکن میں نے اس کے چہرے کا ہر نقش بہت قریب سے دیکھا تھا اس لیے فوراً پہچان لیا ۔ اُس کا اور کوئی پُرانا ساتھی شاید نہ پہچان پاتا ۔ بڑھا ہوا شیو ۔ ہاتھ میں چھڑی ۔ گرمیوں کے دِن تھے لیکن اُس کے جسم پر سوئٹر تھا ۔ وہی سوئٹر جو عندلیب نے بنایا تھا ۔ لیکن اس کی جان نکل چکی تھی سارے رنگ اُڑ چکے تھے ۔ دامن اعجاز کے بار بار کھینچنے کے سبب

گھنٹوں تک پہنچ رہا تھا۔ حالاں کہ وہ اس وقت بھی پاگل نظر آرہا تھا مگر اب سے بہتر تھا۔

اُسی نے مجھے بتایا تھا کہ جب وہ ایم۔بی۔بی۔ ایس کے آخری سال میں تھا تو اسے خبر ملی کہ عندلیب نے خواب آور گولیاں کھا کر خودکشی کر لی۔ اُسے کسی نے اعجاز کی طرف سے بدگمان کر دیا تھا اور اُس کی زندگی کی ڈور تو اعجاز کے وعدے سے ہی بندھی تھی۔ اس نے اپنا وعدہ توڑا اُس کی زندگی کی ڈور ٹوٹ گئی۔

اُس دِن کے بعد اعجاز بالکل خاموش رہنے لگا تھا۔ اور اب تو اُس کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ وہ خود کو اپاہج کہتا ہے۔ حالاں کہ وہ بالکل ٹھیک ہے۔ اُس کے جسم میں اب بھی اتنی ہی طاقت ہے جتنی ایک عام آدمی کے جسم میں ہونا چاہیے۔

ارے آپ ایک دم کھڑے ہو گئے۔ ابھی کہانی ختم کہاں ہوئی ہے۔ اب آپ ایک لفظ نہیں سن سکتے۔ مگر کیوں۔ آپ کو چھڑی لادوں۔ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔ ارے بیٹھ جائیں ورنہ گر پڑیں گے۔

بیچارہ کردار کی تلاش میں آیا تھا۔ اپنے پیروں سے چل کر۔ بغیر کسی سہارے کے۔ لیکن واپسی پر قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ چھڑی ہاتھ میں تھی پھر بھی اُس کو دیوار کا سہارا لینا پڑا۔ نجانے کیوں۔ وہ اعجاز سے ملے بغیر کیوں چلا گیا۔ جاتے وقت اُس کا لباس بھی پسینے سے تر تھا۔ نجانے کیوں۔ پہنچا تو پوری رفتار سے چل رہا تھا۔ اور وہ چیخیں کیسی تھیں۔ جو اس کے دروازے سے نکلتے ہی فضا میں ارتعاش پیدا کرتی ہوئی، لمحہ لمحہ مجھ سے دور ہوتی جا رہی تھیں۔

نسیم زہرہ نقوی

طبعی عمر کی حد

کچھ عرصہ قبل کرمان میں ایک ایسے بوڑھے شخص کو دیکھا گیا جو ماہِ رمضان کے روزے رکھنے پر قادر نہ ہونے کی وجہ سے فدیا کی بابت پوچھ رہا تھا جب اُس کی عمر کے بارے میں دریافت کیا گیا تو اُس نے اپنی عمر ایک سو اُنتیس (۱۲۹) برس بتائی۔

ہمارے روزمرّہ کے مشاہدے میں طویل عمر کے افراد بے حد کم آتے ہیں، عام طور پر طویل عمر سو ایک برس ہوتی ہے۔ ابتدا میں کرمان کے جس ضعیف کا ذکر آیا اس طرح کے افراد کو ہم نوادرات و عجائبات میں شمار کر سکتے ہیں۔

لیکن طویل عمر کے مسئلے پر ہمارے ذہن میں جو پہلا سوال جنم لیتا ہے وہ یہ کہ کیا طبعی عمر کے لیے کوئی حد معیّن ہے؟ آج کی فزیالوجی اس بارے میں کیا کہتی ہے؟ ماہرین کہتے ہیں کہ ایک چھوٹی سی بیٹری کی عمر معیّن ہے۔ مثلاً چوبیس گھنٹوں کے مسلسل استعمال سے اُس کی توانائی ختم ہو جاتی ہے۔ ایک بلب ہزار گھنٹے جلنے کے بعد فیوز ہو جاتا ہے۔ یعنی انسان کی بنائی ہوئی چیزوں کی عمر معیّن ہے۔ لیکن اگر ان کی اچھی طرح دیکھ بھال ہو تو عمر کچھ اور بڑھ جاتی ہے۔

دنیائے طبیعیات میں بھی مختلف قسم کی عمریں موجود ہیں۔ ایٹم کے دل میں کچھ اس قسم کے ذرّات پائے جاتے ہیں جن کی عمر سیکنڈ کا ہزارواں حصّہ ہے۔ اور کبھی تو ان کی عمر صرف سیکنڈ کا سوملینواں حصّہ ہوتی ہے لیکن اس کے مقابلے میں کرۂ ارض کی عمر کا اندازہ پانچ ہزار ملین سال لگایا جاتا ہے۔ آئیے اب دیکھیں کہ کیا طبیعیات کے دامن میں پرورش پانے والے موجودات کی عمر بھی صنعتی مصنوعات کی عمر کے مانند ہے؟ مثلاً ایک انسان کی عمر اوسطاً ۸۰ برس، کبوتر کی ۵ برس، کیڑے کی چند مہینے، چنار کے درخت کی عمر ۱۵۰ سال، پھول کے پودے اور بیل کی عمر ۶ ماہ ہے۔

ماضی میں کچھ دانش وروں کا خیال تھا کہ زندہ موجودات میں طبعی عمر کا ایک نظام موجود ہے۔ مثلاً پاولوف کے خیال میں انسان کی طبعی عمر ننّو سال، میچینکوف کے خیال میں ڈیڑھ سو سال جرمن ڈاکٹر کوفلاند انسان کی طبعی عمر کو دو سو برس قرار دیتا ہے، مشہور فزیولوجسٹ فلوگر کا اعتقاد تھا کہ انسان چھ سو سال زندہ رہ سکتا ہے اور انگریز فلسفی بیکن نے اس کو بڑھا کر ایک ہزار سال تک پہنچا دیا۔ لیکن اس دور کے ماہرینِ علم الاعضا نے ان خیالات کی تردید کر کے یہ ثابت کر دیا کہ انسان کی طبعی عمر کی حد معیّن کرنا غلط ہے۔

کولمبیا یونیورسٹی کے استاد پروفیسر اسمیس کہتے ہیں "جس طرح صوتی دیوار ٹوٹ گئی اور آواز کی سرعت سے بھی زیادہ تیز رفتار سواریاں اور ذرائع نقل و حمل ایجاد ہو گئے اسی طرح ایک دن انسانی عمر کی حدیں بھی ٹوٹ جائیں گی اور ہم نے اب تک جتنی عمر کا مشاہدہ کیا ہے وہ اُس سے بھی آگے بڑھ جائے گی۔"

اس کو ثابت کرنے کے لیے جو دلیل پیش کی جا سکتی ہے وہ بعض سائنسدانوں کے وہ تجربے ہیں جو انھوں نے مختلف جیوانوں اور نباتات پر اپنی لیبارٹریز میں انجام دیے انھوں نے تجربہ گاہ کی ایک مخصوص فضا اور کیفیت میں زندہ موجود کی عمر کو بارہ گنا بڑھانے میں کامیابی حاصل کی۔ مثلاً جس پودے کی عمر معمولاً دو ہفتے سے زیادہ نہیں اس پر جو تجربے کیے گئے ان سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ اُس کی عمر کو چھ مہینے تک بڑھایا جا سکتا ہے۔

دوسری آزمائش پھلوں پر بیٹھنے والی ایک مکھی پر کی گئی۔ جس کی عمر بہت ہی کم ہے سائنس داں اس کی عمر کو نو سو گنا بڑھانے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ انسانوں کی عمر میں بھی اگر اس قسم کا عجیب اور خارق العادت اضافہ کر دیا جائے تو ایک انسان ہزاروں برسوں تک زندہ رہ سکتا ہے۔ البتّہ عام طور سے لوگوں کو اتنی طولانی زندگی کی آرزو نہیں ہے۔ بالفرض اگر ہم اتنی طولانی عمر کو قبول کرنے پر آمادہ بھی ہو جائیں تو زمین اتنے بہت سے طویل العمر انسانوں کو قبول کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ اس کے باوجود علم الحیات کے ماہرین انسانی عمر

۳۲۷/۱، کھالا پار ساداتہ، مظفر نگر ۵۱۰۰۲،

ـنے کے مسئلے پر انتہائی محنت سے تحقیق
ـہے ہیں۔ اگر یہ ممکن نہ ہوتی اور عمر کی
ـد معیّن ہوتی تو یہ ساری تحقیق اور محنت
ـ، و بے ہودہ معلوم ہوتی۔

غذائی امور کے ماہرین کا کہنا ہے کہ
ـ عمر، تغذیہ کے طریقے اور اقلیمی شرائط
ـریبی تعلق رکھتی ہے۔ وہ لوگ شہد کی
ـی ملکہ پر، جو دوسری شہد کی مکھیوں
ـی گنا زیادہ عمر رکھتی ہے تحقیقی کام کرکے
ـس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اُس کی طویل عمر کا
ـہ ہے کہ مزدور شہد کی مکھیاں اپنی ملکہ کی
ـر شہد کا جوہر فراہم کرتی ہیں جب کہ خود
ـ لیے عام طور پر شہد پر انحصار کرتی ہیں۔
ـنچہ غذائی امور کے ماہرین کا خیال ہے کہ
ـ غذا "جوہر شہد" کو زیادہ مقدار میں فراہم
ـے انسانی عمر کو کئی گنا بڑھایا جاسکتا
ـے۔

ماہر نفسیات کہتے ہیں کہ انسان کی
ـل عمر، کافی حد تک، اُس کے طرز فکر اور
ـائد سے وابستگی رکھتی ہے تعمیری، مطمئن،
ـدہ اور پرسکون افکار و عقائد کے
ـیعے انسان کی عمر میں اضافہ ممکن ہے۔

بعض ڈاکٹروں کا عقیدہ ہے کہ بڑھاپا
ـ طرح کی بیماری ہے، جو انسان کے بدن
ـشریانوں یا فنا بولیسم میں اختلال کی بنا
ـپیدا ہوتی ہے، اگر ہم غذا کے صحیح استعمال
ـر موثر دواؤں کے ذریعے ان اسباب و علل
ـغالب آجائیں تو بڑھاپے کو شکست
ـے کر ایک طولانی عمر کے مالک بن سکتے ہیں۔

آج جب کہ انسان کے لیے آسمان
ـ، دروازے کھل چکے ہیں اور خلائی سفر
کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا ہے طولِ عمر کے
مسئلے پر اور بھی زیادہ توجہ کے ساتھ تحقیق
شروع کردی گئی ہے کیوں کہ یہ بات تقریباً
طے ہو چکی ہے کہ ہماری مختصر عمر میں افلاک کے
فاصلوں کو طے کرتے میں حارج ہیں۔ بعض
اوقات اس بے کراں کائنات میں صرف ایک
چھوٹا سا قدم اٹھانے کے لیے موجودہ خلائی
سفینوں کے ذریعے کئی ہزار سال عمر کی
ضرورت ہے، لہٰذا بعض سائنسداں عمر کو
دوسرے طریقوں سے بڑھانے کے بارے
میں سوچ رہے ہیں۔ اور وہ اس کام کے
لیے انجمادی نظام کو استعمال کرنا چاہتے ہیں۔

اس کا انکشاف انسان پر پہلی مرتبہ
ان زندہ موجودات کے مشاہدے سے ہوا
جو طبعی انجماد کی حالت میں اپنی حیات کو
باقی رکھے ہوتے تھے۔ مثلاً کچھ عرصے
قبل قطبی برف کے تودوں کے درمیان ایک
منجمد مچھلی ہاتھ آئی، اس پر جمی ہوئی برف
کی پرتوں کی حالت بتا رہی تھی کہ اس
مچھلی کی عمر پانچ ہزار برس ہے۔ پہلے یہ
خیال ہوا کہ مچھلی مرچکی ہے لیکن جب اسے
معتدل پانی میں ڈالا گیا تو ناظرین نے حیرت
سے دیکھا کہ وہ مچھلی تیرنے لگی۔ معلوم یہ
ہوا کہ مذکورہ مچھلی پانچ ہزار برسوں میں
زندہ رہی، اگرچہ زندگی کی برائے نام رمق
کے ساتھ۔ یہیں سے محققین اس فکر میں
پڑے کہ اگر یہی چیز انسان کے لیے بھی
انجام دی جاسکے تو کتنا اچھا ہو مثلاً خلائی
سفینہ کے مسافروں کو ان کے کیبن میں منجمد
کردیں، وقت مقررہ پر خود کار نظام کے
ذریعے آہستہ آہستہ انھیں سابقہ حالت
میں لے آئیں۔ بعض معالج اس فکر میں
ہیں کہ اس نظام کو ان بیماروں کے لیے
پیش کریں جن کے امراض کی دوائیں ابھی
منکشف نہیں ہوسکی ہیں۔ مثلاً کینسر کے
مریضوں کو انجمادی طریقے کار کے سبب گہری
نیند سلا دیا جائے اور دو سو برس بعد جب
حتماً اس مرض کی دوا ایجاد ہو چکی ہو تب
انھیں دوبارہ سابقہ حالت میں پلٹا کر ان
کا علاج کردیا جائے، ان تمام منصوبوں،
پیش کشوں اور تحقیقات سے پتا چلتا ہے
کہ اس دور کے علم اور سائنس کے نقطۂ
نظر سے انسان اور زندہ موجودات کے
طول عمر کے لیے کوئی حد معیّن نہیں کی
جاسکتی، بلکہ انسان خود ہی اس کی مقدار
کو گھٹا اور بڑھا سکتا ہے۔

○○

اس مضمون کی تیاری میں ایرانی عالم ناصر
مکارم شیرازی کی کتاب "بہارِ انقلاب" سے مدد لی گئی ہے

ـــــ ن۔ ز۔ نقوی

بقیہ:

غالب کی سرگذشتِ سیر و سیاحت

ـکلہ خط نمبر ۱۰ بنام بیخبر۔ غالب سفر رامپور
کے لیے ۱۹ر جنوری ۱۸۶۰ء کو روانہ ہوئے۔
۲۷ر جنوری کو رامپور پہنچے اور ۱۷ر مارچ
رامپور سے نکلے اور ۲۴ر مارچ ۱۸۶۰ء کو
دِلّی واپس آئے۔ کہتے ہیں... "چھ سات ہفتے
وہاں رہ کر دلّی آیا۔ یہاں آپ کا خط محررہ
۸ر مارچ پایا۔" اس لیے قرین قیاس ہے کہ
یہ خط ۲۴ر مارچ ۱۸۶۰ء کا ہوگا جو بیخبر
کے مورخہ ۸ر مارچ ۱۸۶۰ء کے جواب میں لکھا گیا۔

نئی مطبوعات

خلیل الرحمٰن اعظمی

(ترقی پسندی سے جدیدیت تک)

مصنّف : ڈاکٹر اسلام عشرت

قیمت : ۵۰ روپے، ڈِلکس ایڈیشن ۷۰ روپے

ناشر : دانش پبلیکیشنز، جی۔ ۹۵، پی سی۔ کالونی، کنکر باغ، پٹنہ ۲۰۔

خلیل الرحمٰن اعظمی کی شخصیت اور ان کے فن نقد دونوں پر بحث کے دروازے کھلے تو پھر بند نہ ہوئے۔ آج بھی جہاں ایک طرف اپنے خیمے میں خلیل کی تنقیدی بصیرتوں کا اعتراف کرنے والے ترقی پسند ناقدین محض سیاسی ترجیحات کی بنا پر "فکرِ جدید" کو خلیل الرحمٰن کی رجعت پسندی اور انحطاط پرستی کا جنون قرار دینے میں تامل نہیں کرتے تو دوسری طرف خلیل کے پیروؤں کا عالم یہ ہے کہ ان کے پاس فکر جدید کی آفاقی ہیئت، اُردو ادب میں اُس کی لازمیت تخلیقی ادب میں اُس کی ناگزیریت کی نشاندہی کرنے کا تنقیدی شعور پیدا نہیں ہوا ہے۔ جدیدیت کے دامن میں تہجید (SUBLIMATION) اور تشدید (INTENSIFICATION) کی خاصی کمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر صورتوں میں جدیدیت جمالیاتی معیاروں کے حصار میں مقید ایک تخیلی پرواز سے زیادہ کچھ ثابت نہیں ہو پاتا۔ خلیل نے خود کہا ہے :

"صالح قسم کی جدیدیت وہ ہے جو وقت اور ماحول کے فطری تقاضوں اور ادب کے اپنے احساس و تجربے سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ جدیدیت خلا میں لٹکی ہوئی نہیں ہوتی بلکہ اس کی جڑیں روایت میں ہوتی ہیں۔"

("نئے شعری رجحانات" مضامین نو)

ڈاکٹر مغنی خلیل کو جدیدیت کا پیش رو تسلیم کرتے ہیں مگر علمبردار نہیں مانتے۔ میری سمجھ سے اُردو ادب میں جدیدیت کی علمبرداری خلیل کا حق ہے کہ انھوں نے اُردو ادب کو سیاسی شعور اور بصیرت کے ساتھ ساتھ وقتی اور جماعتی سیاست سے بلند کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ ڈاکٹر عشرت اسلام نے خلیل کے حالاتِ زندگی کی روشنی میں ان کی غزل گوئی اور نظم نگاری اور اسلوب و بیان کی نشاندہی کی ہے اور ان کے ادبی نقطۂ نظر کا سنجیدہ تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ خلیل کو ویسے تو بہت لوگ جانتے ہیں اور ان کے نام سے واقف ہیں لیکن انھیں ان کے تخلیقی کارناموں کی بنیاد پر پہچاننے کے خواہش مند حضرات کو یہ کتاب پسند آئے گی۔ جدید ادب سے تعلق رکھنے والوں کے لیے یہ ایک ایسی کتاب ہے جو ان کے مطالعے کی میز پر ان کی دوست ثابت ہوسکتی ہے۔

——— شاہد رحیم

فکرِ نو

ایڈیٹر : سیّد نیاز احمد

صفحات : ۱۹۶

قیمت : درج نہیں ہے

سالِ اشاعت : ۱۹۸۸ء

ملنے کا پتا : ذاکر حسین کالج، اجمیری گیٹ، دہلی ۱۱۰۰۰۶۔

"فکرِ نو" کا زیرِ نظر شمارہ تین برسوں (۸۶—۱۹۸۵ء، ۸۷—۱۹۸۶ء اور ۸۹—۱۹۸۸ء) کا مشترکہ شمارہ ہے اس لحاظ سے اس کی حیثیت ایک یادگار جریدے کی ہوگئی ہے۔ اس کے بیشتر صفحات گوشۂ جاوید وششٹ پر مشتمل ہیں جو اس کا[لج] کے طالبِ علم بھی تھے اور پھر ۳۵ برس (۸۵ — ۱۹۵۰ء) تک شعبۂ اُردو [کے] اُستاد رہے۔ جاوید وششٹ نہ صرف ایک اچھے شاعر، ناقد اور ماہرِ دکنیات ہیں بلکہ ایک اچھے انسان بھی ہیں۔

مضمون نگاروں میں ضیا فتح آبادی مرحوم، ستیش بترا مرحوم، خموش سرحدی، سیّد شریف الحسن نقوی، پروفیسر ظہیر [احمد] صدیقی، ڈاکٹر ذکیہ انجم، سید ضمیر حسن دہلوی، اندر جیت لال وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ [ان] کے مضامین میں جاوید صاحب کی شخصیت اور ان کے ادبی و علمی کام پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ خود جاوید صاحب کا مضمون "اینگلو عربک کالج سے ڈاکٹر ذاکر حسین کالج تک" بہت ہی معلوماتی ہے۔ ڈاکٹر افتخار [ا]ور ڈاکٹر نسیم اجملی نے منظوم خراجِ عقیدت

ـس کیا ہے۔

میرے محترم اُستاد ڈاکٹر ظہیر احمد یقی نے اپنے مضمون کا عنوان "رفتید ولے ز دلِ ما" رکھا ہے جہاں تک میرا خیال یہ الفاظ اس وقت استعمال ہوتے ہیں ہ کوئی اللہ کو پیارا ہو جاتا ہے۔

کتابت کی بہت غلطیاں ہیں کہیں کہیں ملے کے جملے حذف ہوگئے ہیں۔ مضمون نگار ام تک بھی نہیں لکھا گیا۔ بہتر ہوگا کہ اسے بارہ شائع کیا جائے تاکہ قارئین بہتر طور پر ت اندوز ہوسکیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کا مضمون "میرامن سر سید تک" اور پروفیسر محمد ذاکر کا مون اُردو میں رپورتاژ بڑی دیدہ ریزی محنت سے لکھے گئے ہیں۔

—— دلیپ بادل

ظہارِ خیال (تنقیدی مضامین)
صنف: ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی
صفحات: ۱۸۴
مت: ۵۰ روپے
تسیم کار: مکتبہ جامعہ، دہلی علی گڑھ بمبئی

فکشن کی تنقید کے شعبے میں ڈاکٹر ظیم الشان صدیقی کا نام جانا پہچانا ہے۔ ں سے قبل ان کی تنقیدی کتاب "افسانوی ب" شہرت پا چکی ہے۔ عظیم الشان صاحب بید کے جس مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں ترقی پسندانہ ہوتے ہوئے بھی اس معنی ں دیگر ترقی پسند ناقدین سے مختلف ہے ان کے یہاں تنقید میں فلسفیانہ سماجیاتی مواد کافی ہے۔ اس لیے اس کتاب کا متن آہستہ آہستہ پڑھنے اور غور کرنے کا متقاضی ہے۔ سرسری گزرنے والے کے لیے اس کی تفہیم یک دم آسان نہیں ہے۔ تاہم ایسا بھی نہیں کہ زبان مفرس یا معرب اور مفاہیم گنجلک ہوں بلکہ مصنف اپنے افکار اور نظریات کی ترسیل میں پوری طرح کامیاب ہے۔

اس مجموعے میں پندرہ مضامین شامل ہیں جو اُردو داستان، ناول اور افسانے پر مصنف کے خیالات کے عکاس ہونے کے ساتھ متنوع پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں۔ مثلاً اس میں ایک مضمون سیرت فریدیہ پر ہے۔ یہ کتاب سر سید کی تصنیف ہے اور ان کے نانا خواجہ فریدالدین کی زندگی سے متعلق ہے۔ مضمون سے علم ہوتا ہے کہ سیرت فریدیہ انیسویں صدی کے سیاسی و معاشی حالات کے علاوہ مشرقی تہذیب کے نایاب نمونوں کی بھی نشاندہی کرتی ہے۔ اس میں سر سید کی شخصیت کے ابتدائی خد و خال بھی نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر صدیقی کا ایک اور حقیقت افروز مضمون ترقی پسند تحریک کے مستقبل کے بارے میں ہے۔ انھوں نے ترقی پسند تحریک کے اغراض و مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے اس تحریک کے اہم کارناموں کا تجزیہ کیا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ آج کی ترقی پسندی، اور ترقی پسند ادیبوں کے غیر ترقی پسندانہ رویّوں کی نکتہ چینی کرتے ہوئے واضح طور پر لکھا ہے:

"ترقی پسند تحریک نے ادب کو عوامی زندگی کا ترجمان بنانے کا نعرہ بھی لگایا تھا۔ جس پر کسی حد تک عمل بھی کیا گیا ہے لیکن اس حقیقت کو کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے کہ وہ ادیب و شاعر جو خود کو عوام سے وابستہ کر دینے کا دعویٰ کرتے ہیں ان میں سے بیشتر اپنے تجربے، مشاہدے اور فکر و فلسفہ نیز اظہار و اسلوب کے اعتبار سے قطعی عوامی نہیں ہیں۔ ان کا طبقاتی شعور اور شہری زندگی کا پس منظر بار بار ان کی راہ میں حائل ہو گیا ہے۔ جس کے باعث ان کی تخلیقات روایات کی تجدید، جمود، گھٹن اور تنگ دامنی کے دائروں کو توڑنے میں ناکام رہی ہیں۔"

"اظہارِ خیال" میں چار مضامین برصغیر کی اہم شخصیات سے متعلق ہیں —— مولانا محمد علی کی سیاسی خدمات، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، سیدین صاحب کی ادبی خدمات اور جسٹس بشیر احمد سعید۔ ان میں سے آخری نام ایسا ہے کہ شمال کے زیادہ تر اُردو داں اس سے آشنا نہیں ہیں لیکن جنوب کے لوگ ان کی شخصیت اور تعلیم کے شعبے میں ان کی بیش بہا خدمات سے اچھی طرح واقف ہیں۔

اس کتاب میں اُردو کے اہم زندہ شاعر اختر الایمان کی شاعری کے چند نئے پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اختر الایمان کسی مخصوص تحریک یا مکتبۂ فکر سے تعلق نہ رکھتے ہوئے بھی بہت سے نامور ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں سے زیادہ ترقی پسند مزاج کے حامل ہیں اور یہ فکر ان کی ذاتی زندگی میں بھی نمایاں نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر صدیقی نے اختر الایمان کے فن پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"یہاں ہر رنگ دوسرے رنگوں کے مقابلے میں پھیکا اور ہر زخم جگر دوسروں کے ناسوروں سے کچھ زیادہ ہی گہرا اور کاری نظر آتا ہے۔ اور یہی ذاتی تجربہ اور شاعرانہ احساس جب اجتماعی درد میں ڈھل جاتا ہے تو سماجی اور سیاسی طنز، غصّے اور احتجاج کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اور زخم دل کی خلش آسودگی کی تلاش میں ماضی کے جھروکوں میں جھانکنے پر مجبور کر دیتی ہے۔"

مُصنّف کے مطابق وہ دراصل اختر الایمان کا ماضی ہے جس کی کڑوی کسیلی یادیں ان کی فکر و احساس کے لیے خام مواد فراہم کرتی ہیں۔

"اظہارِ خیال" میں ایک اہم تحقیقی مضمون رتن ناتھ سرشار کے آخری ناول "چنچل نار" سے متعلق ہے۔ سرشار کا یہ ناول ان کی زندگی میں مکمّل نہیں ہو سکا۔ اسے بعد میں ریاست حیدرآباد کے وزیرِ اعظم مہاراجہ کشن پرشاد نے اپنے نام سے شائع کرایا تھا۔ لیکن ڈاکٹر صدّیقی نے تحقیقی شواہد کے ذریعے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ ناول مکمّل کرنے والے فنکار دراصل اختر مینائی ہیں لیکن "چنچل نار" کا وہ حصّہ جو 'دبدبۂ آصفی' میں شائع ہوا تھا، سرشار کی تصنیف ہے۔ آفسیٹ پر مطبوعہ اس کتاب کا گیٹ اپ خوبصورت اور قیمت واجبی ہے۔

—— (ڈاکٹر) خالد اشرف

خبر نگاری

مُصنّف : شافع قدوائی
قیمت : ۳۵ روپے
ملنے کا پتا : نصرت پبلشرز، کپور مارکیٹ، امین آباد، لکھنؤ (یو۔پی)

یہ کتاب فنِ صحافت پر ہے۔ جس میں صحافت کے ابتدائی مراحل اور ضرورتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب میں خاص طور پر اُردو صحافت کے بتدریج ارتقا اور اُردو صحافت میں پیش آنے والی دقتوں اور دشواریوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب فنِ صحافت کے جدید طریقوں اور اصولوں سے ناواقف اخبار نویسوں یا اخباری نمائندوں کے لیے بہت کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ جن میں خبر کی تعریف، خبر کے حصول کے ذرائع، رپورٹر کی تعریف، خبر نگاری کی قسمیں اور خبر نگاری کے خصوصی شعبہ جات شامل ہیں۔ ہر باب میں مفصل تشریح اور وضاحت مثالوں کے ذریعے کی گئی ہے۔ ان ابواب میں خبر کے مفہوم اور تعریف و لوازم سے لے کر عناصر و اقسام تک، اخبار نویسی کے رہنما اصولوں سے رپورٹر کی صلاحیت اور اوصاف تک عمومی رپورٹر سے پارلیمانی اور غیر ملکی نامہ نگاری تک غرض تمام نکات پر عام فہم انداز میں معلومات فراہم کی گئی ہے۔

اس کتاب کے مطالعے کے بعد رپورٹر سے لے کر ایڈیٹر کا کام انجام دینے والے حضرات تک روایتی اور دشوار گزار طریقوں کو چھوڑ کر صحافت کے جدید اور آسان طریقے اپنا کر کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔ کتاب میں ملک و بیرونِ ملک کے تجربے کار صحافیوں کے تجربات و خدمات کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ جن کتابوں اور جن حضرات کے تعاون سے مُصنّف نے فائدہ اٹھایا ہے ان سب کا تذکرہ بھی کتاب میں موجود ہے۔ مثالیں بہت ہی واضح اور سلیس زبان میں قلمبند کی گئی ہیں۔ کتاب کا تمام تر مواد مُصنّف کی مسلسل جستجو اور محنت کا آئینہ دار ہے —— صحافتی اصطلاحوں کے اُردو متبادل تلاش کرنے میں بھی مُصنّف کامیاب رہا ہے۔

اُتر پردیش اُردو اکادمی کے تعاون و اشتراک سے شائع شدہ شافع قدوائی صاحب کی یہ کتاب اپنی اہمیت و افادیت کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔

—— قمر رضا نقوی

آنکھوں دیکھی

مُصنّف : مناظر عاشق ہرگانوی
صفحات : ۱۲۰
قیمت : ۲۵ روپے
ملنے کا پتا : کوہسار، برہ پورہ، بھاگلپور ۸/۲۰۰۱ (بہار)

"آنکھوں دیکھی" ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی نثری نظموں اور آزاد نظموں کا مجموعہ ایک ایسی دستاویز ہے جو ہر پڑھنے والے کو قتل، غارت گری اور تباہی و بربادی کی داستان سناتی رہے گی۔ اس مجموعے کی ہر نظم مائکرو فلم کی طرح ہے اور ذہن کی وسعتوں میں، ٹی۔ وی اسکرین کے روشن نقطۂ آغاز کی طرح پھیلتی چلی جاتی ہے اور ہر طرف آگ، دھویں، معصوموں کے خون، مرگھٹ میں چڑچڑاتی ہوئی کھال، چٹخنی ہوئی ہڈیوں اور تعفن کے مناظر سامنے

لے آتی ہے۔

ویڈیو کیسٹ کی دنگا فساد، خون خرابے اور مار دھاڑ سے بھرپور فلمیں اسکرین پر دیکھنے کے بعد ہم صرف اتنا تاثر لیتے ہیں کہ فلموں میں دیکھا جانے والا سُرخ اور گاڑھا گاڑھا خون ناظرین کا ایک بال بھی گیلا نہیں کر سکتا جب کہ "آنکھوں دیکھی" کی ہر ایک نظم سے اُبلتے ہوئے خون کا سیلاب نہ صرف بھارت اور پاکستان کے بلکہ ساری دُنیا کے انسانوں کو اپنے بھنور میں ڈال کر دُور تک لے جا سکتا ہے۔ بعض نظمیں خون کے بھنور کی آنکھ میں جلتے ہوئے وہ چراغ ہیں جو ڈوبنے سے پہلے آسمانِ فکر پر روشن ستارہ بن کر اندھیری راتوں میں دمکتے رہیں گے اور بھاگلپور میں قتل و غارتگری اور تباہی کے مرتکب بلوائیوں کے مکروہ چہروں کو دکھاتے رہیں گے تاکہ ساری دُنیا کے لوگ ان کی بے جواز وحشت اور بربریّت کا قیاس کر کے قیامت تک ان کے مُنہ پر تھوکتے رہیں۔

مناظر عاشق ہرگانوی نے بھاگلپور کے بھیانک فساد کے بیان کے لیے چھوٹی چھوٹی نظموں کا جو میڈیم اختیار کیا ہے وہ ہر اعتبار سے موزوں دِکھائی دیتا ہے۔ اُردو کے شعری ادب میں یہ تصنیف موضوع کے اعتبار سے منفرد ہے۔

—— ماجد الباقری

رنگ ہزاروں خوشبو ایک

بیکل اتساہی کے قبولِ عام میں صرف ان کی وضع قطع اور اُن کے دِلکش ترنم کو دخل نہیں، اس میں ان کی شاعرانہ انفرادیت کا بھی حصّہ ہے۔

بیکل صاحب نے پرانی فنّی رکھ رکھاؤ والی غزل سے اپنے شعری سفر کا آغاز کیا تھا لیکن اس راہ پر وہ زیادہ دور تک نہیں گئے اور اپنے طبعی رجحان کے تقاضے سے انھوں نے ایک نیا راستہ کھوج نکالا جو دیہات کی غیر مکلّف اور سادہ زندگی کے دُکھ سکھ سے جنم لینے والے جذبات واحساسات کی ترجمانی کا راستہ ہے۔ ان جذبات واحساسات کی ترجمانی میں انھوں نے دیہی اور برج کے گیتوں، دوہوں اور چوپائیوں، بھوجپوری دو پدوں اور کبیتاؤں کے روپ رس کو اس طرح اپنے اسلوب میں سمویا ہے کہ اس کی مثال ہمعصر اُردو شاعری میں کہیں اور مشکل ہی سے تلاش کی جا سکے گی۔

بیکل صاحب کے ترنم کی نقالی آج کے بہت سے مشاعرہ باز شاعر کرنے لگے ہیں لیکن بیکل صاحب کے ترنم میں ان کی شاعرانہ شخصیت کا جو آہنگ شامل ہے وہ انھی کا حصّہ ہے اور ان کی ہی پہچان بن چکا ہے۔

عوامی زندگی کے روپ رنگ اور لوک سنگیت کے آہنگ سے بھرپور شاعری۔

شاعر : بیکل اتساہی
صفحات : ۱۵۲
قیمت : ۲۸ روپے

مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضامین

مرزا فرحت اللہ بیگ کی ادبی شخصیت بڑی ہمہ جہت تھی۔ وہ ایک اچھے مزاح نگار، باریک بین ادبی محقق، شگفتہ قلم انشا پرداز اور ایک کامیاب خاکہ نگار تھے۔ ان کا اسلوب نگارش انتہائی دلکش تھا۔ وہ دِلّی والے تھے اس لیے دِلّی کی ٹکسالی زبان لکھتے تھے لیکن ایسی ٹکسالی زبان نہیں جس میں محاوروں کی جا و بے جا ٹھونس ٹھانس ہو۔ انھوں نے دِلّی کے روزمرہ کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا تھا اور اُن کے وہ مضامین خصوصیت سے دل چسپی اور نشاطِ مطالعہ کے حامل ہیں جن میں انھوں نے دِلّی کی تہذیبی اور ثقافتی روایات، دِلّی والوں کے طرزِ معاشرت، ان کے عادات واطوار اور ان کے مشاغل کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ جو لوگ زبان اور تہذیب کے باہمی تعلق کو سمجھتے ہیں وہ اس نکتے کو بھی جانتے ہیں کہ کسی تہذیب کی صحیح عکاسی اس کی اپنی زبان ہی میں ہو سکتی ہے۔

اردو اکادمی کی جانب سے تقسیمِ ہند سے پہلے کی دِلّی کے ادبی اور ثقافتی سرمائے کی بازیافت کی جو کوششیں جاری ہیں یہ کتاب انھی کا ایک حصّہ ہے۔ اس کتاب میں مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضامین کی سات جلدوں کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ اور انتخاب کرتے ہوئے یہ کوشش کی گئی ہے کہ مرزا فرحت اللہ بیگ کی ادبی شخصیت کی تمام جہات سامنے آجائیں۔

مرتّب : ڈاکٹر اسلم پرویز
صفحات : ۲۷۵
قیمت : ۴۷ روپے

اُردو اکادمی، دہلی سے طلب کریں

اُردو خبر نامہ

جناب اندر کمار گجرال کا خیر مقدم

۱۲ مئی کو دہلی انتظامیہ اُردو اکادمی دہلی نے جناب اندر کمار گجرال کے اعزاز میں اپنے دفتر میں ایک استقبالیہ تقریب کا اہتمام کیا، جس میں اکادمی کے ممبران اور دوسرے عمائدین شہر کے علاوہ اکادمی کے چیئرمین لفٹننٹ گورنر دہلی جناب ارجن سنگھ نے بھی شرکت کی۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے جناب اندر کمار گجرال نے کہا کہ ملک کے سوشلسٹ اور جمہوری نظام کی تعمیر میں مسلمانوں کے رول کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے انتباہ دیا کہ مذہب کے نام پر اگر ملک کو تقسیم کرنے کی کوشش کی گئی تو سیکولر روایت کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ وزیرِ خارجہ نے زور دے کر کہا کہ ملک کا ہر مسلمان ملک کی یک جہتی اور سالمیت کا حامی ہے اور یہی مشترکہ تہذیب ہمارے اتحاد کی علامت ہے۔ مسٹر گجرال نے اُردو اخبارات کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ اپنے آغاز سے اُردو پریس نے ملک کی سالمیت کی ہمیشہ وکالت کی ہے جس سے دوسروں کو سبق لینا چاہیے۔ وزیرِ خارجہ نے ملک میں بڑھتی ہوئی فرقہ پرستی پر افسوس کا اظہار کیا اور کہا کہ مذہب کے نام پر کچھ لوگ دانستہ طور سے ایسے مسائل ابھار رہے ہیں جن سے کشیدگی کو بڑھاوا ملتا ہے۔ موجودہ صورتِ حال کے پیشِ نظر جذباتی معاملے نہ اُٹھانا ہی ہندوستان اور ہندوستانی عوام کے مفادات کا تقاضا ہے۔ جموں و کشمیر میں تخریبی سرگرمیوں پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے مسٹر گجرال نے کہا کہ ہندوستان میں
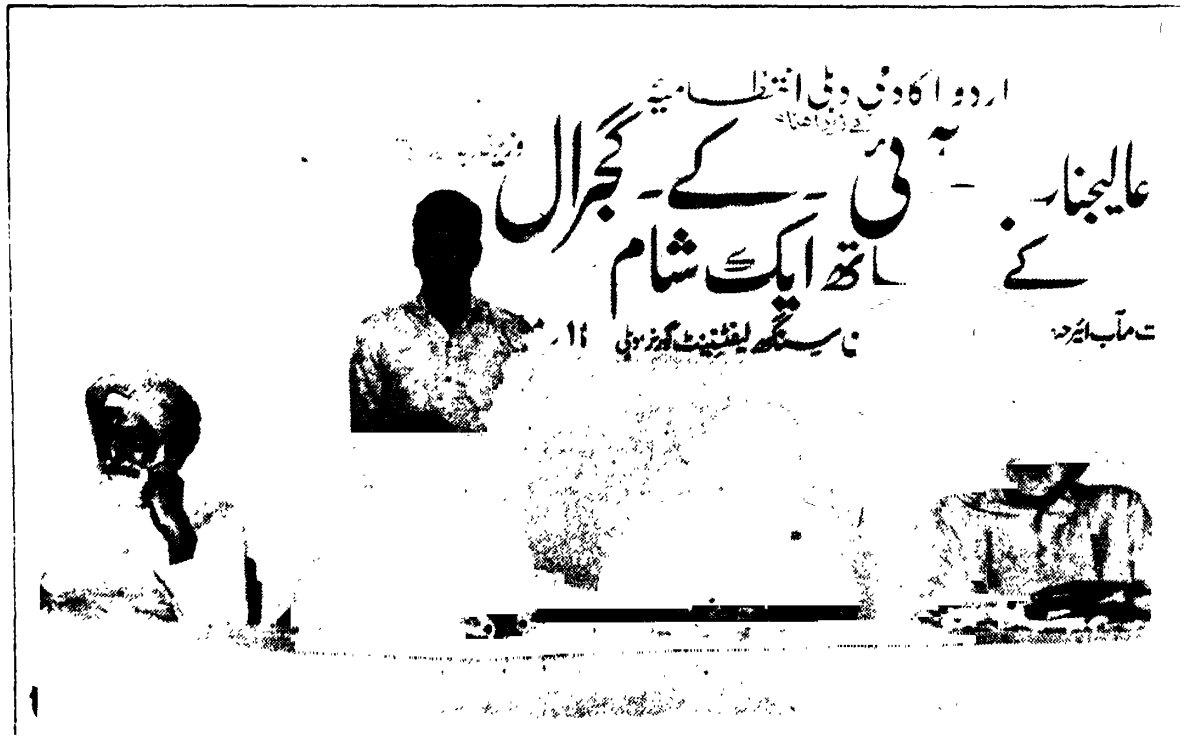
...میں سے : لفٹننٹ گورنر جناب ارجن سنگھ، وزیرِ خارجہ جناب اندر کمار گجرال، بیگم گجرال اور اکادمی کے وائس چیئرمین جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر۔

جموں وکشمیر کے ۴۰ لاکھ مسلمانوں کو گمراہ کرکے کچھ بیرونی طاقتیں مذہب کی دہائی دیتی ہیں۔ مسٹر گجرال نے کہا کہ انڈونیشیا کو چھوڑ کر دنیا کے تمام ملکوں سے زیادہ مسلمان ہندوستان میں ہیں اور ان کو اپنا وطن دوسروں سے کم عزیز نہیں ہے اُردو کے بارے میں مسٹر گجرال نے امید ظاہر کی کہ نئی کمیٹی جلد سے جلد سفارشات پیش کرے گی اور حکومت انھیں نافذ کرے گی۔

دہلی کے لفٹننٹ گورنر اُردو اکادمی کے چیئرمین سابق ایئر چیف مارشل جناب ارجن سنگھ نے کہا کہ اکادمی کے باقاعدہ فنکشن ہیں محسوس کرتے ہیں۔ مسٹر ارجن سنگھ نے اُردو اکادمی دہلی کی سرگرمیوں اور سید شریف الحسن نقوی کی کوششوں کی ستائش کی۔ پروفیسر قمر رئیس نے کہا کہ اتحاد کی قوتوں کو مضبوط کرنے کے لیے اُردو کے فروغ کی ضرورت زیادہ ہے۔ انھوں نے مسٹر گجرال سے اپیل کی کہ اُردو والوں کی توقع پوری کرنے کے لیے وہ پہلے سے زیادہ دلچسپی لیں۔ ہریانہ اُردو اکادمی کے سکریٹری مسٹر کشمیری لال ذاکر نے اُردو کو جائز درجہ دیے جانے کی وکالت کی۔ طنز و مزاح نگار مسٹر مجتبیٰ حسین نے کہا کہ اُردو والوں کے اعتماد کا نام مسٹر اندر کمار گجرال ہے۔ مسٹر اینس دہلوی نے شکریہ ادا کیا۔ اردو اکادمی کے سکریٹری سید شریف الحسن نقوی نے نظامت کی۔ تقریب میں کرنل بشیر حسین زیدی، ہومی جے طالع یار خاں (ایم پی) مسٹر شکیل الرحمان (ایم۔پی) مسٹر م۔ افضل (ایم پی) ڈاکٹر صدیق الرحمان قدوائی، مسٹر پیغام آفاقی، مسٹر جگن ناتھ آزاد، مسٹر اختر الواسع، ڈاکٹر اسلم پرویز، مسٹر یونس دہلوی، مسٹر رحمٰن نیر، مسٹر ارشد علی قدوائی، مسٹر عبدالرب صدیقی، بیگم ممتاز میرزا، مسٹر منورما دیوان، مسٹر رضوان احمد، مسٹر قمرالدین سمیت متعدد سرکردہ ادیب اور دانشور موجود تھے۔

راج نواس میں لفٹننٹ گورنر جناب ارجن سنگھ نے اُردو اکادمی کی مطبوعات ملاحظہ کیں۔ تصویر میں موصوف "ایوانِ اُردو" کی خصوصی اشاعتیں "مولانا ابوالکلام آزاد نمبر" اور "پنڈت جواہر لال نہرو نمبر" ہاتھوں میں لیے نظر آرہے ہیں۔ بائیں طرف کھڑے ہیں اکادمی کے سیکریٹری سید شریف الحسن نقوی۔ (تصاویر: سید فدا...

اُردو آبادی کے مسائل پر تجاویز و مطالبات

اُردو بھون، پٹنہ میں انجمن ترقی اُردو
ی مجلس عاملہ کا ایک جلسہ زیرِ صدارت
عبدالمغنی، منعقد ہوا، جس میں ریاست
ر اضلاع اور علاقوں سے نمائندہ ارکان
دعوئین نے شریک ہو کر مختلف مسائل پر
فکر کے بعد اُردو آبادی کے مطالبات پر
ں تجویزیں اتفاقِ رائے سے منظور کیں ۔
کے شروع میں صدر نے موجودہ حالات کا
الے کر اُردو دوستوں کو خبردار کیا کہ وہ
ے زیادہ مستعدی و سرگرمی کے ساتھ
مسائل کے حل کے لیے ہر قسم کی جمہوری و
کوششیں جاری رکھیں، ورنہ ان کی غفلت
ستی بنتے ہوئے کام بگاڑ سکتی ہے۔ جلسے
ریں انجمن کے جنرل سکریٹری جناب سیّد
یدر نے حاضرین کا شکریہ ادا کرنے
تھ توقع ظاہر کی کہ اُردو کے سپاہی اپنی
جاری رکھیں گے اور کسی دشمن کو اس
کا موقع نہیں دیں گے کہ انجمن کے عزائم
یں مزاحم ہو یا اس کے کارناموں کو
کرنے کی کوشش کرے۔
جلسے میں سب سے پہلی تجویز باقی ماندہ
ضلاع میں اردو کی سرکاری حیثیت کے
ابر عمل درآمد کے لیے درکار مزید آٹھ
ردو مترجم، نائب مترجم اور ٹائپسٹ کے
جلد تقرر پر منظور کی گئی اور حکومت سے
کیا گیا کہ وہ اس سلسلے میں ٹال مٹول
کیا کہ اردو داں عملے کی شرح تنخواہ میں پے ریویژن
کمیشن کی سفارشات کے مطابق اضافے کے
احکام بلا تاخیر جاری کیے جائیں۔ تیسری تجویز میں
بہار پبلک سروس کمیشن کے امتحانات مقابلہ میں
اُردو ذریعۂ امتحان کی اجازت کے فیصلے پر پوری
طرح عمل کرنے، خاص کر اُردو داں اسکرپٹ
اگزامنروں کے تقرر کا مطالبہ کیا گیا۔ چوتھی تجویز
کے مطابق اقلیتی اسکولوں کے اساتذہ و ملازمین
کو قومیائے ہوئے اسکولوں کے اساتذہ و ملازمین
کے برابر، وقت پر اور براہِ راست تنخواہوں اور
دیگر تمام سہولتوں کی ادائیگی کا مطالبہ کیا گیا۔
ایک اہم تجویز ۱۹۹۱ء کی مردم شماری میں
زبان کے اندراج کے متعلق منظور کی گئی جس
میں سب سے پہلے ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے اعداد و
شمار بر وقت اور صحیح طور پر شایع نہ کرنے کے
لیے حکومت پر سخت تنقید کی گئی، اس کے
بعد مطالبہ کیا گیا کہ آئندہ زبان کے جاننے میں
اندراج بولنے والے کے بیان کے مطابق ٹھیک
کیا جائے اور اسے جلد سے جلد شایع بھی کیا
جائے۔ آخر میں اُردو آبادی سے ۱۹۸۱ء کی طرح
ایک بار پھر اپیل کی گئی کہ وہ ۱۹۹۱ء کی مردم شماری
کے موقع پر زبان کے خانے میں پہلی زبان کی
حیثیت سے اُردو کا اندراج کرائے۔ اس
سلسلے میں صدر انجمن نے بتایا کہ وہ زبان کے
صحیح اندراج کے لیے صدر جمہوریہ، وزیراعظم ہند،
وزیر داخلہ، گورنر بہار اور وزیر اعلیٰ بہار کو
مراسلات بھی تحریر کر چکے ہیں اور پچھلی بار کی طرح
جس کا اعتراف سرکاری طور پر کیا جا چکا ہے،
اس بار بھی صحیح مردم شماری کے لیے انجمن ترقی اُردو
بہار نے ہر ممکن تعاون کی پیشکش کی ہے۔

راجستھان اُردو اکادمی کا سالانہ جلسہ اور کُل ہند سیمینار

راجستھان اُردو اکادمی کا سالانہ جلسہ
اور خواتین کے عالمی سال کے سلسلے میں "اُردو
کی خواتین افسانہ نگار" موضوع پر ایک کُل ہند
سیمینار جے پور میں منعقد کیا گیا۔ اسی موقع
پر اکادمی کی جانب سے محترمہ عصمت چغتائی
کا اعزاز بھی کیا گیا۔ اکادمی کے چیئرمین ڈاکٹر
ثاقب رضوی اور دیگر اراکین نے موصوفہ کی
گل پوشی کی اور اکادمی کی جانب سے ان کی
خدمت میں تحفہ پیش کیا۔
جلسے کی افتتاحی تقریب میں محترمہ
عصمت چغتائی نے مہمان خصوصی کی حیثیت
سے شرکت کی اور پروفیسر شمیم حنفی نے جلسے
کی صدارت کی۔ جناب خداداد خاں صاحب
مونس کنوینر تقریبات نے باہر سے تشریف
لائے ہوئے مہمانوں کا تعارف کرایا۔ مجلس
استقبالیہ کے صدر جناب وید ویاس چیئرمین
راجستھانی بھاشا اکادمی (بیکانیر) نے اپنی
مختصر استقبالیہ تقریر میں اکادمی کی کارکردگی کو
سراہتے ہوئے زبانوں کے باہمی رشتوں کو
مضبوط بنانے پر زور دیا اور کہا کہ وہی
زبانیں پھلتی پھولتی اور پنپتی ہیں جن کا رشتہ
عوامی زندگی سے جڑا ہوتا ہے۔
ڈاکٹر ثاقب رضوی نے اس بات پر اظہار
افسوس کیا کہ گذشتہ سال حکومت نے ہم سے
دو وعدے کیے تھے ایک اکادمی کی عمارت کے
لیے جے پور میں قطعۂ زمین فراہم کرنے کا اور
دوسرا اسکھاڑیا یونیورسٹی اودے پور میں

دس کروڑ مسلمان ہیں اور ان کے مقابلے میں جموں و کشمیر کے ۴۰ لاکھ مسلمانوں کو گمراہ کر کے کچھ بیرونی طاقتیں مذہب کی دہائی دیتی ہیں۔ مسٹر گجرال نے کہا کہ انڈونیشیا کو چھوڑ کر دنیا کے تمام ملکوں سے زیادہ مسلمان ہندوستان میں ہیں اور ان کو اپنا وطن دوسروں سے کم عزیز نہیں ہے اُردو کے بارے میں مسٹر گجرال نے امید ظاہر کی کہ نئی کمیٹی جلد سے جلد سفارشات پیش کرے گی اور حکومت انھیں نافذ کرے گی۔

دہلی کے لفٹننٹ گورنر اُردو اکادمی کے چیئرمین سابق ایئر چیف مارشل جناب ارجن سنگھ نے کہا کہ اکادمی کے باقاعدہ فنکشن میں ان کی یہ پہلی شرکت ہے اور اس پر وہ خوشی محسوس کرتے ہیں۔ مسٹر ارجن سنگھ نے اُردو اکادمی، دہلی کی سرگرمیوں اور سید شریف الحسن نقوی کی کوششوں کی ستائش کی۔ پروفیسر قمر رئیس نے کہا کہ اتحاد کی قوتوں کو مضبوط کرنے کے لیے اُردو کے فروغ کی ضرورت زیادہ ہے۔ انھوں نے مسٹر گجرال سے اپیل کی کہ اُردو والوں کی توقع پوری کرنے کے لیے وہ پہلے سے زیادہ دلچسپی لیں۔ ہریانہ اُردو اکادمی کے سکریٹری مسٹر کشمیری لال ذاکر نے اُردو کو جائز درجہ دیے جانے کی وکالت کی۔ طنز و مزاح نگار مسٹر مجتبیٰ حسین نے کہا کہ اُردو والوں کے اعتماد کا نام مسٹر اندر کمار گجرال ہے۔ مسٹر شارب ردولوی نے مہمانوں کا خیر مقدم اور مسٹر انیس دہلوی نے شکریہ ادا کیا۔ اُردو اکادمی کے سکریٹری سید شریف الحسن نقوی نے نظامت کی۔ تقریب میں کرنل بشیر حسین زیدی، ہومی جے طالع یار خاں (ایم۔پی) مسٹر شکیل الرحمان (ایم۔پی)، مسٹر م۔ افضل (ایم۔پی) ڈاکٹر صدیق الرحمان قدوائی، مسٹر پیغام آفاقی، مسٹر جگن ناتھ آزاد، مسٹر اختر الواسع، ڈاکٹر اسلم پرویز، مسٹر یونس دہلوی، مسٹر رحمٰن نیرّ، مسٹر ارشد علی قدوائی، مسٹر عبدالرب صدیقی، بیگم ممتاز میرزا، مسٹر منورما دیوان، مسٹر رضوان احمد، مسٹر قمر الدین سمیت متعدد سرکردہ ادیب اور دانشور موجود تھے۔

انجمن ترقّی اردو بہار کی طرف سے اُردو آبادی کے مسائل پر تجاویز و مطالبات

اُردو بھون، پٹنہ میں انجمن ترقّی اُردو
ہار کی مجلسِ عاملہ کا ایک جلسہ زیرِ صدارت
اکٹر عبدالمغنی، منعقد ہوا، جس میں ریاست
کے اکثر اضلاع اور علاقوں سے نمائندہ ارکان
ور مدعوئین نے شریک ہوکر مختلف مسائل پر
ور وفکر کے بعد اُردو آبادی کے مطالبات پر
شتمل تجویزیں اتّفاقِ رائے سے منظور کیں۔
لسے کے شروع میں صدر نے موجودہ حالات کا
ئزہ لے کر اُردو دوستوں کو خبردار کیا کہ وہ
لے سے زیادہ مستعدی و سرگرمی کے ساتھ
پنے مسائل کے حل کے لیے ہر قسم کی جمہوری و
ینی کوششیں جاری رکھیں، ورنہ ان کی غفلت
رستی بنے ہوئے کام بگاڑ سکتی ہے۔ جلسے
آخر میں انجمن کے جنرل سکریٹری جناب سیّد
ی حیدر نے حاضرین کا شکریہ ادا کرنے
ساتھ توقع ظاہر کی کہ اُردو کے سپاہی اپنی
ائی جاری رکھیں گے اور کسی دشمن کو اس
ت کا موقع نہیں دیں گے کہ انجمن کے عزائم
راہ میں مزاحم ہو یا اس کے کارناموں کو
رت کرنے کی کوشش کرے۔

جلسے میں سب سے پہلی تجویز باقی ماندہ
م اضلاع میں اردو کی سرکاری حیثیت کے
ان پر عمل درآمد کے لیے درکار مزید آٹھ
اُردو مترجم، نائب مترجم اور ٹائپسٹ کے
از جلد تقرر پر منظور کی گئی اور حکومت سے
سے کام نہ لے۔ ایک اور تجویز کے ذریعے مطالبہ کیا
گیا کہ اُردو داں عملے کی شرح تنخواہ میں پے ریویژن
کمیشن کی سفارشات کے مطابق اضافے کے
احکام بلاتاخیر جاری کیے جائیں۔ تیسری تجویز میں
بہار پبلک سروس کمیشن کے امتحانات مقابلہ میں
اُردو ذریعۂ امتحان کی اجازت کے فیصلے پر پوری
طرح عمل کرنے، خاص کر اُردو داں اسکرپٹ
اگزامنروں کے تقرر کا مطالبہ کیا گیا۔ چوتھی تجویز
کے مطابق اقلیتی اسکولوں کے اساتذہ و ملازمین
کو قومیائے ہوئے اسکولوں کے اساتذہ و ملازمین
کے برابر، وقت پر اور براہ راست تنخواہوں اور
دیگر تمام سہولتوں کی ادائیگی کا مطالبہ کیا گیا۔

ایک اہم تجویز ۹۱ء کی مردم شماری میں
زبان کے اندراج کے متعلّق منظور کی گئی، جس
میں سب سے پہلے ۸۱ء کی مردم شماری کے اعداد و
شمار بروقت اور صحیح طور پر شایع نہ کرنے کے
لیے حکومت پر سخت تنقید کی گئی، اس کے
بعد مطالبہ کیا گیا کہ آئندہ زبان کے جاننے میں
اندراج بولنے والے کے بیان کے مطابق ٹھیک
کیا جائے اور اسے جلد سے جلد شایع بھی کیا
جائے۔ آخر میں اُردو آبادی سے ۸۱ء کی طرح
ایک بار پھر اپیل کی گئی کہ وہ ۹۱ء کی مردم شماری
کے موقعے پر زبان کے خانے میں پہلی زبان کی
حیثیت سے اُردو کا اندراج کرائے۔ اس
سلسلے میں صدر انجمن نے بتایا کہ وہ زبان کے
صحیح اندراج کے لیے صدر جمہوریہ، وزیر اعظم ہند،
وزیرِ داخلہ، گورنر بہار اور وزیر اعلیٰ بہار کو
مراسلات بھی تحریر کر چکے ہیں اور پچھلی بار کی طرح
جس کا اعتراف سرکاری طور پر کیا جا چکا ہے،
اس بار بھی صحیح مردم شماری کے لیے انجمن ترقی اُردو

راجستھان اُردو اکادمی کا سالانہ جلسہ اور کُل ہند سیمینار

راجستھان اُردو اکادمی کا سالانہ جلسہ
اور خواتین کے عالمی سال کے سلسلے میں "اُردو
کی خواتین افسانہ نگار" موضوع پر ایک کُل ہند
سیمینار جے پور میں منعقد کیا گیا۔ اسی موقعے
پر اکادمی کی جانب سے محترمہ عصمت چغتائی
کا اعزاز بھی کیا گیا۔ اکادمی کے چیئرمین ڈاکٹر
ثاقب رضوی اور دیگر اراکین نے موصوفہ کی
گُل پوشی کی اور اکادمی کی جانب سے ان کی
خدمت میں تحفہ پیش کیا۔

جلسے کی افتتاحی تقریب میں محترمہ
عصمت چغتائی نے مہمان خصوصی کی حیثیت
سے شرکت کی اور پروفیسر شمیم حنفی نے جلسے
کی صدارت کی۔ جناب خداداد خاں صاحب
مونس کنوینر تقریبات نے باہر سے تشریف
لائے ہوئے مہمانوں کا تعارف کرایا۔ مجلس
استقبالیہ کے صدر جناب وید ویاس چیئرمین
راجستھانی بھاشا اکادمی (بیکانیر) نے اپنی
مختصر استقبالیہ تقریر میں اکادمی کی کارکردگی کو
سراہتے ہوئے زبانوں کے باہمی رشتوں کو
مضبوط بنانے پر زور دیا اور کہا کہ وہی
زبانیں پھلتی پھولتی اور پنپتی ہیں جن کا رشتہ
عوامی زندگی سے جڑا ہوتا ہے۔

ڈاکٹر ثاقب رضوی نے اس بات پر اظہار
افسوس کیا کہ گذشتہ سال حکومت نے ہم سے
دو وعدے کیے تھے ایک اکادمی کی عمارت کے
لیے جے پور میں قطعۂ زمین فراہم کرانے کا اور

مولانا آزاد چیئر قائم کرنے کا مگر اس سلسلے میں
خاطر خواہ پیش رفت نہیں ہو سکی۔ ان معاملات میں
ہماری کوششیں جاری ہیں۔

اکادمی کے سیکریٹری ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی
نے اکادمی کی سال ۹۰-۱۹۸۹ء سے متعلق
کارکردگی کی رپورٹ پیش کی۔

مہمانِ خصوصی محترمہ عصمت چغتائی نے
اپنی زندگی کے مختلف واقعات اور ادبی دُنیا
کے تجربات پر روشنی ڈالتے ہوئے جلسے کے
افتتاح کا اعلان کیا۔

اس موقعے پر اکادمی کی جانب سے راجستھان
کے حسبِ ذیل شعرا و ادبا کی خدمات کا اعتراف
کرتے ہوئے ان کا اعزاز کیا گیا اور ایک ایک
توصیف نامہ، شال اور اعزازی رقم ان کی خدمات
میں پیش کی گئی:

۱۔ جنابِ ابن احسن بزمی ٹونکی (ٹونک)
۲۔ جنابِ ممتاز راشد (اجمیر) مقیم بمبئی
۳۔ جنابِ محمد حسن اختر قادری (اُودے پور)
۴۔ جنابِ انصار محشر عباسی (جے پور)

مذکورہ حضرات میں سے جنابِ بزمی ٹونکی
اور ممتاز راشد صاحب جلسے میں تشریف نہیں
لا سکے۔ اعزازات کے بعد اکادمی کی حسبِ ذیل
مطبوعات کا مختلف مہمانوں کے ذریعے اجرا کرایا گیا:

انتخابِ کلام قابل اجمیری (مرتبہ سید
فضل المتین)۔ صدا کے کالبد (انتخاب کلام خوشتر
مکرانوی)۔ بیٹی کی خوشبو (مرتبہ ممتاز شکیب)۔
شعر و شعور (مجموعۂ غزلیات صائب ٹونکی مرحوم)۔
تلاشِ محور (انتخاب کلام مدان ہوش)۔

(تلاشِ محور کی طباعت کے لیے اکادمی کی
جانب سے مصنف کو مالی امداد دیا گیا تھا)

ادیبوں کو ان کی مطبوعہ تصانیف پر اکادمی کی
جانب سے ۹۰-۱۹۸۹ء کے لیے دو دو ہزار
روپے کے انعام کا چیک پیش کیا گیا:

۱۔ جنابِ شبیر الدین قریشی (جے پور) افکار
۲۔ جنابِ مظفر صدیقی (بانسواڑہ) ارتعاش

آخر میں محترمہ عصمت چغتائی نے کہا کہ
اُردو زبان کی ترقی کے لیے سب ہی کو مل جل کر
کوشش کرنی چاہیے اور اسے عام لوگوں تک
پہنچانا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ ہم اپنی بات
ملک کی کسی بھی زبان میں پیش کریں اس میں اگر
اُردو زبان کے الفاظ کا استعمال کیا جائے تو
اُردو کی مقبولیت میں اضافہ ہوگا اور یہ زبان
عام لوگوں تک پہنچ جائے گی۔ اس کو کسی پر
تھوپا نہ جائے بلکہ یہ کوشش کی جائے کہ لوگ
خود اس کو اپنانے میں دلچسپی لیں۔

سیمینار کے پہلے اجلاس میں حسبِ ذیل
خاتون افسانہ نگاروں نے اپنی افسانوی تخلیقات
پیش کیں:

محترمہ ڈاکٹر شمیم نکہت (دہلی) محترمہ
شانتا بالی (جے پور) محترمہ صغریٰ مہدی (دہلی)
محترمہ مسرور جہاں (لکھنؤ) محترمہ جیلانی بانو (حیدرآباد)۔

جلسے کی صدارت ڈاکٹر شارب ردولوی نے
کی اور نظامت کے فرائض ممتاز شکیب صاحب
نے انجام دیے۔

دوسرے اجلاس کی صدارت محترمہ
جیلانی بانو نے کی۔ حسبِ ذیل حضرات نے
مقالات پیش کیے:

ڈاکٹر شمیم حنفی (دہلی) ڈاکٹر ارتضیٰ
کریم (دہلی) ڈاکٹر فضل امام (الٰہ آباد) جنابِ
سید فضل المتین (اجمیر) جنابِ ممتاز

ادب میں تجربات ضروری لیکن...

"کوئی بھی ادب کسی خارجی ماحول ک
بغیر تخلیق نہیں پا سکتا" ادب اور شاعری کسی
طرح پورے معاشرے کا اظہار کرتے ہیں
لیے جدید شعرا پر زندگی اور سماج سے انحراف
فرار کا الزام لگانا درست نہیں ہے۔" گلبرگہ
انجمن ترقی اُردو کے زیرِ اہتمام جناب جمیل کے
شعری مجموعے "احاطہ" کی رسم اجرا انجام دیتے
ہوئے جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے اس خیال
کا اظہار کیا۔ سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے
جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے کہا کہ ہر ادب
میں تجربات ضروری ہیں۔ تجربہ ہمیشہ امکانات
راہ دکھاتا ہے۔ لیکن کوئی شاعری اپنی روایت
کی میراث سے انکار نہیں کر سکتی۔ اُردو میں
پسند تحریک نے اپنی روایت کی میراث
انکار کیا۔ ترقی پسندوں کا استدلال تھا
چوں کہ پرانی شاعری میں انقلابی شعور نہ
تھا اس لیے اس کے ورثے کو مسترد کیا گیا
سے ترقی پسند شعرا نے غزل کی مخالفت کی
سہرا مخدوم کے سر جاتا ہے جنھوں نے غز
ذریعے وراثت کا تحفظ کیا اور نئے انقلا
بھی پیش کیے۔ بعد میں دوسرے ترقی پسند
غزل کی طرف راغب ہوئے۔ جنابِ شمس
فاروقی نے کہا کہ ۱۹۶۶ء کے بعد اُردو
شعری روایت کی دریافتِ نو ہوئی بظاہر
شکست و ریخت محسوس ہوئی لیکن نئے
نے الفاظ اور ہیئت کے امکانات کو کھنگ
انھیں بروئے کار لائے۔ جدید شاعری

قابلے میں زیادہ متنوع، رنگا رنگ، شخصی
اجتماعی تجربات کا اظہار ہے۔ انھوں نے
شعری لفظیات کے حوالے سے کہا کہ الفاظ
بغیر شعر نہیں بن سکتا۔ نئے شعرا نے لفظ کی
حیثیت کو دوبارہ بحال کیا ہے۔ اس موقعے
جناب وہاب عندلیب، جناب سیّد مجیب الرحمٰن،
جناب احمد جلیس، محترمہ لئیق خدیجہ، اور جناب
اکمل نے بھی اظہار خیال کیا اور جبار جمیل
شاعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔
جنابِ محمد عبد العظیم (صدر انجمن ترقی
اردو گلبرگہ) نے اپنی صدارتی تقریر میں جناب
جبار جمیل کو کامیاب اور باصلاحیت شاعر قرار
دیتے ہوئے نوجوانوں کو مشورہ دیا کہ وہ عصری
ادب اور کلاسیکی ادب کی پوری روایات کو اس
کے پس منظر کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کریں۔

(امجد جاوید)

افتتاح جناب گیانی ذیل سنگھ سابق صدر جمہوریہ
ہند نے کیا اور صدارت جناب سیّد مظفر حسین
برنی چیئرمین مینارٹی کمیشن نے۔ جناب ساحر
ہوشیار پوری مہمانِ خصوصی تھے۔ سوسائٹی کے
سیکریٹری نے ساحر صاحب کو سپاس نامہ
پیش کیا۔ اور آخر میں گیانی ذیل سنگھ صاحب
کے دستِ مبارک سے انھیں ایوارڈ (زرّیں
طشت، شال اور توصیف نامہ) دیا گیا۔ جنابِ
ساحر ہوشیار پوری نے اظہارِ تشکر کرتے ہوئے
سامعین کی فرمائش پر اپنی غزلیات سے بھی نوازا۔

اعزازات

● ساؤتھ ایشین پرفارمنگ آرٹس کونسل
آف امریکا (شکاگو) نے اپنے ایک حالیہ
اجلاس میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد کو کونسل
کا پیٹرن منتخب کیا ہے۔ آرٹس کونسل کے
دیگر پاکستان کے نوجوان شاعر افتخار نسیم
اور چودھری نعیم، جان بینی گاس، پال
ہوئل سن، اعجاز نسرین، نسیم سرور، رضیہ
فصیح احمد اور ڈاکٹر محمد نسیم مجلس عاملہ
کے رکن ہیں۔ (نامہ نگار)

● حافظ عبد العزیز میموریل سوسائٹی (دہلی)
کی طرف سے پچھلے دنوں ایک پُر وقار تقریب
[illegible]

● مغربی بنگال اُردو اکادمی کی مجلسِ
عاملہ نے ہندوستان گیر پیمانے پر ادب
نوازوں کی رائے شماری کے بعد ممتاز شاعر
اور نقاد ڈاکٹر مظفر حنفی (اقبال پروفیسر
شعبۂ اُردو کلکتہ یونیورسٹی) کو ان کی ادبی خدمات
پر دس ہزار روپے کا پرویز شاہدی ایوارڈ
۸۸ء دینے کا اعلان کیا ہے۔
اس سے پہلے موصوف کو نیشنل ایوارڈ
فار چائلڈ ایجوکیشن (نئی دہلی)، میر تقی میر ایوارڈ
(لکھنؤ) ملک حیدر ایوارڈ (گیا) کے علاوہ یو۔پی
اُردو اکادمی، مغربی بنگال اُردو اکادمی، بہار
اُردو اکادمی، آندھرا پردیش اُردو اکادمی اور
اُردو اکادمی، دہلی کے مختلف انعامات مل چکے ہیں۔

● مغربی بنگال اُردو اکادمی نے مغربی
بنگال گورنرس اُردو خطّاطی کل ہند ایوارڈ
برائے سال ۱۹۸۸ء خطّاطی کے بہترین
نمونے پر جناب محمد رفیق عالم، کتاب
منزل گوی محلّہ، ہبلی (کرناٹک) کو دینے
کا فیصلہ کیا ہے۔ انعام کی رقم پانچ ہزار
روپے ہے۔ (سکریٹری)

بقیہ:
آپ کی رائے

○ اپریل ۹۰ء کا "ایوانِ اُردو" زیرِ مطالعہ
رہا۔ ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری کا معلوماتی مضمون
"اُڑیسہ میں اُردو..." نظر سے گزرا۔ موصوف
نے خوش اسلوبی کے ساتھ اُڑیسہ میں اُردو کے
نشیب و فراز کی عکّاسی کی ہے۔ اُڑیسہ کے دورِ
قدیم و دورِ جدید کے بزرگ و نوخیز قلمکاروں
کے اسمائے گرامی کو قلمبند کیا ہے مگر چند
قلمکاروں مثلاً عبدالروف سرور بھاگلپوری، محمد
اصغر علی حبیبی گدا، مشرف عالم، مطیع اللہ
نازش، امتیاز ندیم اور مجھ خاکسار کے نام
کو فراموش کر دیا ہے۔
عبدالحلیم حلیم کی تاریخ وفات ۲۹
دسمبر ۸۹ء ہے۔ شاید محترم مضمون نگار
تاریخ وفات سے واقف نہیں ہیں۔ شاعر
مرحوم کے مختصر مجموعۂ کلام کا نام صرف "موجِ نسیم" نہیں
"موجِ نسیم کلام حلیم" ہے۔ اُردو زبان کی
ترویج و فروغ کے لیے اُڑیسہ میں جو ادارے
سرگرم عمل ہیں ان میں ایک نام "آزاد ہند لائبریری"
بالوبیشی کا بھی ہے۔

——— عبدالشکور شکور، کٹک

○ مئی کے شمارے میں بچّوں کے ادب سے متعلق
سراج انور کا مضمون چھپا ہے۔ اس سے پہلے
بک اسٹال پر ایک کتاب غالباً خوشحال زیدی کی
تالیف اسی موضوع پر نظر آئی تھی۔ کتنے تعجّب اور
افسوس کی بات ہے کہ خوشحال زیدی اور سراج انور
دونوں نے کہیں بھی مائل خیرآبادی کا نام تک نہیں
لیا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس ایک شخص نے بچّوں کے لیے
نثر و نظم کا ایک پورا کتب خانہ اپنی خداداد لیاقت سے تخلیق
[illegible]

سرورق کے اندورنی صفحے کے لیے

موصولہ عنوانات

مئی ۱۹۹۰ء کے "ایوانِ اُردو دہلی" کے سرورق کے اندرونی صفحے پر جو تصویر چھاپی گئی تھی، اس کے لیے موصول ہونے والے شعری اور نثری عنوانوں میں سے تصویر کی مناسبت سے موزوں سمجھے جانے والے چند عنوان ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں:

شعری عنوانات

ہر منزلِ غربت پہ گماں ہوتا ہے گھر کا
بہلایا ہے ہر گام بہت دربدری نے (فیض احمد فیض)

مرسلہ: غازی اسلام (خریداری نمبر ۸۳۷)

جب کہیں عہدِ نو کو سمجھو گے
پہلے گزری ہوئی صدی سے ملو (رشید قریشی)

مرسلہ: شبانہ عبدالکریم (سندھودرگ)

بدل کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں (غالب)

مرسلہ: اشتیاق احمد کریمی (بتیا)، احسان اللہ عمیر (دربھنگہ)، مقصود حسن خاں گمنام پہریموی (رائے بریلی)۔

ہم آئیں گے اس طرح سے بھیس بدلے
تمھاری نظر کو خبر بھی نہ ہوگی (ظفر احمد صدیقی)

مرسلہ: طلعت فاطمہ کریمی (بتیا)

شکم کی آگ لیے پھر رہی ہے شہر بہ شہر
سگِ زمانہ ہیں، ہم کیا ہماری ہجرت کیا (افتخار عارف)

مرسلہ: جاوید عزیزی (پرگنہ)

وہ جو پیشانی پہ پڑھ لے حالِ دل کا کون ہے
ہم اکیلے ہیں یہاں اپنا شناسا کون ہے (سیدہ شانِ معراج)

مرسلہ: اُمّ صالی ریاض الدین سید (بمبئی)

اِک لاپتہ سے شہر کا جیسے ہوں درد ہم
کچھ رنگ ہی عجیب ہماری صدا کا ہے (من موہن تلخ)

دعا دیتی ہیں راہیں آج تک مجھ آبلہ پا کو
مرے قدموں کی گلکاری بیاباں سے چمن تک ہے (مجروح سلطانپوری)

مرسلہ: خان اسد مُلک (جے پور)

اسیرانِ ستم نے اور ہی کچھ سوچ رکھّا ہے
کریں آخر بسر بھی کرنے والے یوں بسر کب تک (فراق گورکھپوری)

مرسلہ: عذرا انجم انصاری (دیوبند)

کاندھے پہ اُٹھائے ہوئے ہستی کا جنازہ
ہم خانہ بدوشوں کی طرح گھوم رہے ہیں (نامعلوم)

مرسلہ: شبینہ مسرور کریمی (بتیا)

پتّھر کی مورتوں کو بھی کہتے ہیں شاہکار
جسموں کا اعتبار نہ کر گدگدا کے دیکھ (کیف بھوپالی)

مرسلہ: اے علی (برہانپور)

عصرِ نو! مجھ کو نگاہوں میں چھپا کر رکھ لے
ایک مٹتی ہوئی تہذیب کا سرمایہ ہوں میں (تعلّی)

مرسلہ: مسعود پرویز وکیل (نصیر آباد)

جس طرف دیکھیے بہروپیے آتے ہیں نظر
لوگ پھرتے ہیں لیے چہرے پہ چہرے کتنے

مرسل اور شاعر: مقبول نصیر آبادی (نصیر آباد)

کس نے سوچا تھا کڑی دھوپ کے ساتھی میرے
قربِ سایوں کا جو پایا تو بکھر جائیں گے (خلش دہلوی)

مرسلہ: معین الدین شمسی (گریڈیہہ)

ہم میں نہ محبّت کی گرمی، ہم میں نہ شرافت کی نرمی
انساں کہیں کیوں سب ہم کو ہم چلتے پھرتے سائے ہیں (رضا مظہری)

تقدیر منزلوں کی جگاتے چلے چلو
اے رہ روانِ راہِ محبّت بڑھے چلو (فراقؔ گورکھپوری)

مرسلہ: موسیٰ انصاری (دیوبند)

زندگی کی رہ میں چل لیکن ذرا بچ بچ کے چل
یہ سمجھ لے کوئی مینا خانہ بارِ دوش ہے (اقبال)

مرسلہ: عبدالرؤف خاں (اودنی کلاں)

نثری عنوانات

"یہ ہے میرا ہندوستان" (خضر برنی کا مجموعۂ کلام)

مرسلہ: سعید احمد قائد (۱۰۰۷، مدرسہ حسین بخش، بازار مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی)

"بھارت ایک کھوج" (پنڈت نہرو کی کتاب)

مرسلہ: ابنِ اسحٰق بنگلوری (تری کیرہ)

"زندگی کے رنگ کئی" (رفعت شاہین کا افسانہ)

مرسلہ: شیخ عبدالرشید، نصیر آباد

"دھوپ کا سفر" (اظہار صہبائی کا افسانہ)

مرسلہ: معین الدین شمسی (گریڈیہہ)

"چراغِ چشمِ تر" (ظفر گورکھپوری کا شعری مجموعہ)

مرسلہ: اسلم خاں بشیر خاں (بمبئی)

"شکاری" (کرشن چندر کا ناول)

مرسلہ: انعام اللہ شارق (دربھنگہ)

"تہذیب" (سر سیّد احمد خاں کا مضمون)

مرسلہ: اختر صوفیہ، قمر رضوی جامی (نواده)

"گلدستہ" پہلے اور دوسرے نمبر پر درج شعری عنوان اور پہلے نمبر پر درج نثری عنوان بھیجنے والے کو ارسال کیا رہا ہے۔

آپ کی رائے

○ "نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں، نہ کسی کے دل کا قرار ہوں" غزل کے سلسلے میں جناب حنیف نقوی کا حالیہ انکشاف واقعی چونکا دینے والا ہے کہ یہ شعر:

میں کہاں رہوں میں کہاں بسوں، نہ یہ مجھ سے خوش نہ وہ مجھ سے خوش
میں زمیں کی پیٹھ کا بوجھ ہوں، میں فلک کے دل کا غبار ہوں

مضطر خیر آبادی کا نہیں بلکہ آغا حشر کاشمیری کی فکر کا نتیجہ ہے۔

ڈاکٹر خلیل اللہ خاں نے اپنی تصنیف "مضطر خیر آبادی" میں ماہنامہ "مجلس" لاہور، ستمبر و اکتوبر ۱۹۶۴ء کے حوالے سے اسے مضطر صاحب کی تخلیق بتایا تھا، لیکن جناب نقوی کا مراسلہ شائع ہونے کے بعد مزید تحقیق و جستجو کی تو ایک بیاض میں مضطر خیر آبادی کی متذکرہ بالا غزل مقطعے کے ساتھ موجود پائی، جس میں یہ شعر شامل نہیں ہے۔ اس کے بجائے ایک دوسرا شعر دیکھنے کو ملا۔ شعر حاضرِ خدمت ہے:

نہ دوائے دردِ جگر ہوں میں، نہ کسی کی میٹھی نظر ہوں میں
نہ ادھر ہوں میں نہ ادھر ہوں میں، نہ شکیب ہوں نہ قرار ہوں

غزل کے کچھ اشعار خلیل تنویر صاحب پہلے ہی "سرودِ رفتہ" کے تحت پیش کر چکے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ مختلف کتابوں اور رسالوں میں اس غزل کے اشعار میں جا بجا لفظی اختلافات پائے جاتے ہیں۔

بہر حال تحقیق کی راہیں کھلی ہوئی

ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔

—— رفعت عزمی، ردولی (بارہ بنکی)

○ "آپ کی رائے" تبادلۂ خیال کے لیے بڑا ہی مفید کالم ہے۔ فروری ۹۰ء کے شمارے میں شائع شدہ جمیل جالبی کے مضمون "میرا جی: ایک مطالعہ" پر اپریل کے شمارے میں کچھ خیالات پڑھنے کو ملے۔ ان خطوط میں میرا جی کے فن سے زیادہ ان کی نجی زندگی پر تبصرہ کیا گیا ہے، مثلاً "وہ ژولیدہ ذہن تھے، خالی پیٹ شراب پیتے تھے، بستر گیلا کرتے تھے، غلاظتوں میں زندگی بسر کرتے تھے" وغیرہ۔ ایک صاحب نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ "بیمار ذہن سے صحت مند خیالات کی توقع ہی فضول ہے۔"

میں ان قارئین کا دھیان سعادت حسن منٹو کے ان تاثرات کی طرف مبذول کراؤں گا:

"حسن بلڈنگز (سعادت حسن منٹو کا مکان) کے فلیٹ نمبر ایک میں میرا جی، گول مٹول شعر کہنے والا شاعر، مجھ سے بڑے صحیح قدوقامت اور بڑی صحیح نوک پلک کی باتیں کر رہا تھا، جو میرے افسانوں کے متعلق تھیں۔ وہ تعریف کر رہا تھا نہ تنقیص۔ ایک مختصر سا تبصرہ تھا ایک سرسری سی تنقید تھی، مگر اس سے پتا چلتا تھا کہ میرا جی کے دماغ میں مکڑی کے جالے نہیں۔ اس کی باتوں میں الجھاؤ نہیں تھا اور یہ چیز میرے لیے باعث

آگے میرا جی کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "میں سمجھتا ہوں کہ اس کا کلام بڑی عمدہ کھاد ہے جس کی افادیت ایک نہ ایک دن ضرور ظاہر ہو کر رہے گی۔ اس کی شاعری ایک گمراہ انسان کا کلام ہے جو انسانیت کی عمیق ترین پستیوں سے متعلق ہونے کے باوجود دوسرے انسانوں کے لیے اونچی فضاؤں میں مرغ باد کا کام دے سکتا ہے۔" منٹو نے مزید تحریر کیا ہے کہ "بحیثیت انسان کے وہ بڑا دلچسپ تھا، پرلے درجے کا مخلص جس کو اپنی اس قریب قریب نایاب صفت کا مطلقاً احساس نہیں تھا۔ میرا جی نے شاعری کی بڑے خلوص کے ساتھ، شراب پی، بڑے خلوص کے ساتھ، بھنگ پی وہ بھی بڑے خلوص کے ساتھ، لوگوں سے دوستی کی اور اسے نبھایا۔" (منٹو: فن اور شخصیت، ترتیب و انتخاب برہم گوپال متل، صفحات ۲۹۵ سے ۳۰۰ تک)۔

ان مختصر اقتباسات سے، وہ حضرات جو میرا جی پر انگشت نمائی کر رہے ہیں، اتفاق کریں یا نہ کریں لیکن ان کی شخصیت، شاعری اور انسان دوستی، ابھر کر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ بستر گیلا کرنا اور شراب پینا تو وقتی چیزیں ہیں، ان سے فن اور ادب پر کوئی مستقل اثر نہیں پڑتا۔ میں میرا جی کی شاعری اور شخصیت پر اعتراض کرنے والوں سے پوچھنا چاہوں گا کہ کیا ان کے پاس انسانیت کی کوئی جامع تعریف ہے؟ اگر ہے تو اس پر دوسرے ادبا و شعرا کو بھی جانچیں۔ میرے خیال سے لاتعداد حضرات

ں دکشمیر کے ۴۰ لاکھ مسلمانوں کو گمراہ کر کے
۔ بیرونی طاقتیں مذہب کی دہائی دیتی ہیں۔
سٹر گجرال نے کہا کہ انڈونیشیا کو چھوڑ کر دنیا
تمام ملکوں سے زیادہ مسلمان ہندوستان
ں ہیں اور ان کو اپنا وطن دوسروں سے
عزیز ہیں ہے اُردو کے بارے میں مسٹر
ال نے امید ظاہر کی کہ نئی کمیٹی جلد سے جلد
مارشات پیش کرے گی اور حکومت انھیں
فذ کرے گی۔

دہلی کے لفٹننٹ گورنر اُرد، اکادمی کے
یرمین سابق ایئر چیف مارشل جناب ارجن
گھ نے کہا کہ اکادمی کے باقاعدہ فنکشن ہیں

محسوس کرتے ہیں۔ مسٹر ارجن سنگھ نے اُردو
اکادمی، دہلی کی سرگرمیوں اور سید شریف الحسن
نقوی کی کوششوں کی ستائش کی۔ پروفیسر قمر
رئیس نے کہا کہ اتحاد کی قوتوں کو مضبوط کرنے
کے لیے اُردو کے فروغ کی ضرورت زیادہ ہے۔
انھوں نے مسٹر گجرال سے اپیل کی کہ اُردو والوں
کی توقع پوری کرنے کے لیے وہ پہلے سے زیادہ
دلچسپی لیں۔ ہریانہ اُردو اکادمی کے سکریٹری
مسٹر کشمیری لال ذاکر نے اُردو کو جائز درجہ
دیے جانے کی وکالت کی۔ طنز و مزاح نگار
مسٹر مجتبیٰ حسین نے کہا کہ اُردو والوں کے
اعتماد کا نام مسٹر اندر کمار گجرال ہے۔ مسٹر

مسٹر انیس دہلوی نے شکریہ ادا کیا۔ اُردو
اکادمی کے سکریٹری سید شریف الحسن نقوی
نے نظامت کی۔ تقریب میں کرنل بشیر حسین
زیدی، ہومی جے طالع یار خاں (ایم. پی) مسٹر
شکیل الرحمان (ایم۔پی)، مسٹر م۔ افضل (ایم.پی)
ڈاکٹر صدیق الرحمان قدوائی، مسٹر پیغام آفاقی
مسٹر جگن ناتھ آزاد، مسٹر اختر الواسع، ڈاکٹر
اسلم پرویز، مسٹر یونس دہلوی، مسٹر رحمٰن نیر
مسٹر ارشد علی قدوائی، مسٹر عبدالرب صدیقی،
بیگم ممتاز میرزا، مسٹر منورما دیوان، مسٹر
رضوان احمد، مسٹر قمرالدین سمیت متعدد
سرکردہ ادیب اور دانشور موجود تھے۔

راج نواس میں لفٹننٹ گورنر جناب ارجن سنگھ نے اُردو اکادمی کی مطبوعات ملاحظہ کیں۔ تصویر میں موصوف "ایوانِ اُردو" کی
خصوصی اشاعتیں "مولانا ابوالکلام آزاد نمبر" اور "پنڈت جواہر لال نہرو نمبر" ہاتھوں میں لیے نظر آرہے ہیں۔ بائیں طرف کھڑے ہیں اکادمی
کے سکریٹری سید شریف الحسن نقوی۔ (تصاویر: سید فدا علی)

انجمن ترقی اردو بہار کی طرف سے اُردو آبادی کے مسائل پر تجاویز و مطالبات

اُردو بھون، پٹنہ میں انجمن ترقی اُردو ...ہار کی مجلسِ عاملہ کا ایک جلسہ زیرِ صدارت ...ٹر عبدالمغنی، منعقد ہوا، جس میں ریاست ...، اکثر اضلاع اور علاقوں سے نمائندہ ارکان ...ر مدعوئین نے شریک ہوکر مختلف مسائل پر ...ر و فکر کے بعد اُردو آبادی کے مطالبات پر ...تمل تجویزیں اتفاقِ رائے سے منظور کیں۔ ...سے کے شروع میں صدر نے موجودہ حالات کا ...زہ لے کر اُردو دوستوں کو خبردار کیا کہ وہ ...، سے زیادہ مستعدی و سرگرمی کے ساتھ ...نے مسائل کے حل کے لیے ہر قسم کی جمہوری و ...ینی کوششیں جاری رکھیں، ورنہ ان کی غفلت ...ر سستی بنے ہوئے کام بگاڑ سکتی ہے۔ جلسے ...آخر میں انجمن کے جنرل سکریٹری جناب سیّد ...ن حیدر نے حاضرین کا شکریہ ادا کرنے ...ساتھ توقع ظاہر کی کہ اُردو کے سپاہی اپنی ...ی جاری رکھیں گے اور کسی دشمن کو اس ...ن کا موقع نہیں دیں گے کہ انجمن کے عزائم ...راہ میں مزاحم ہو یا اس کے کارناموں کو ...ت کرنے کی کوشش کرے۔

جلسے میں سب سے پہلی تجویز باقی ماندہ ...اضلاع میں اردو کی سرکاری حیثیت کے ...ن پر عمل درآمد کے لیے درکار مزید آٹھ ...، اُردو مترجم، نائب مترجم اور ٹائپسٹ کے ...ر جلد تقرر پر منظور کی گئی اور حکومت سے ...لبہ کیا گیا کہ وہ اس سلسلے میں ٹال مٹول سے کام نہ لے۔ ایک اور تجویز کے ذریعے مطالبہ کیا گیا کہ اُردو داں عملے کی شرح تنخواہ میں پے ریویژن کمیشن کی سفارشات کے مطابق اضافے کے احکام بلا تاخیر جاری کیے جائیں۔ تیسری تجویز میں بہار پبلک سروس کمیشن کے امتحانات مقابلہ میں اُردو ذریعۂ امتحان کی اجازت کے فیصلے پر پوری طرح عمل کرنے، خاص کر اُردو داں اسکریپٹ اگزامنروں کے تقرر کا مطالبہ کیا گیا۔ چوتھی تجویز کے مطابق اقلیتی اسکولوں کے اساتذہ و ملازمین کو قومیائے ہوئے اسکولوں کے اساتذہ و ملازمین کے برابر، وقت پر اور براہِ راست تنخواہوں اور دیگر تمام سہولتوں کی ادائیگی کا مطالبہ کیا گیا۔

ایک اہم تجویز ۱۹۹۱ء کی مردم شماری میں زبان کے اندراج کے متعلق منظور کی گئی، جس میں سب سے پہلے ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار بروقت اور صحیح طور پر شایع نہ کرنے کے لیے حکومت پر سخت تنقید کی گئی، اس کے بعد مطالبہ کیا گیا کہ آئندہ زبان کے جاننے میں اندراج بولنے والے کے بیان کے مطابق ٹھیک کیا جائے اور اسے جلد سے جلد شایع بھی کیا جائے، آخر میں اُردو آبادی سے ۱۹۸۱ء کی طرح ایک بار پھر اپیل کی گئی کہ وہ ۱۹۹۱ء کی مردم شماری کے موقعے پر زبان کے خانے میں پہلی زبان کی حیثیت سے اُردو کا اندراج کرائے۔ اس سلسلے میں صدر انجمن نے بتایا کہ وہ زبان کے صحیح اندراج کے لیے صدر جمہوریہ، وزیر اعظم ہند، وزیر داخلہ، گورنر بہار اور وزیر اعلیٰ بہار کو مراسلات بھی تحریر کر چکے ہیں اور پچھلی بار کی طرح جس کا اعتراف سرکاری طور پر کیا جا چکا ہے، اس بار بھی صحیح مردم شماری کے لیے انجمن ترقی اُردو بہار نے ہر ممکن تعاون کی پیش کش کی ہے۔

راجستھان اُردو اکادمی کا سالانہ جلسہ اور کُل ہند سیمینار

راجستھان اُردو اکادمی کا سالانہ جلسہ اور خواتین کے عالمی سال کے سلسلے میں "اُردو کی خواتین افسانہ نگار" موضوع پر ایک کُل ہند سیمینار جے پور میں منعقد کیا گیا۔ اسی موقعے پر اکادمی کی جانب سے محترمہ عصمت چغتائی کا اعزاز بھی کیا گیا۔ اکادمی کے چیئرمین ڈاکٹر ثاقب رضوی اور دیگر اراکین نے موصوفہ کی گل پوشی کی اور اکادمی کی جانب سے ان کی خدمت میں تحفہ پیش کیا۔

جلسے کی افتتاحی تقریب میں محترمہ عصمت چغتائی نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی اور پروفیسر شمیم حنفی نے جلسے کی صدارت کی۔ جناب خداداد خاں صاحب مونس کنوینر تقریبات نے باہر سے تشریف لائے ہوئے مہمانوں کا تعارف کرایا۔ مجلس استقبالیہ کے صدر جناب وید ویاس چیئرمین راجستھانی بھاشا اکادمی (بیکانیر) نے اپنی مختصر استقبالیہ تقریر میں اکادمی کی کارکردگی کو سراہتے ہوئے زبانوں کے باہمی رشتوں کو مضبوط بنانے پر زور دیا اور کہا کہ وہی زبانیں پھلتی پھولتی اور پنپتی ہیں جن کا رشتہ عوامی زندگی سے جڑا ہوتا ہے۔

ڈاکٹر ثاقب رضوی نے اس بات پر اظہار افسوس کیا کہ گذشتہ سال حکومت نے ہم سے دو وعدے کیے تھے ایک اکادمی کی عمارت کے لیے جے پور میں قطعۂ زمین فراہم کرانے کا اور دوسرا اسکھاڑیا یونیورسٹی اُودے پور میں

دس کروڑ مسلمان ہیں اور ان کے مقابلے میں جموں وکشمیر کے ۴۰ لاکھ مسلمانوں کو گمراہ کر کے کچھ بیرونی طاقتیں مذہب کی دہائی دیتی ہیں۔ مسٹر گجرال نے کہا کہ انڈونیشیا کو چھوڑ کر دنیا کے تمام ملکوں سے زیادہ مسلمان ہندوستان میں ہیں اور ان کو اپنا وطن دوسروں سے کم عزیز نہیں ہے اُردو کے بارے میں مسٹر گجرال نے امید ظاہر کی کہ نئی کمیٹی جلد سے جلد سفارشات پیش کرے گی اور حکومت انھیں نافذ کرے گی۔

دہلی کے لفٹننٹ گورنر، اُردو اکادمی کے چیئرمین سابق ایئر چیف مارشل جناب ارجن سنگھ نے کہا کہ اکادمی کے باقاعدہ فنکشن میں ان کی یہ پہلی شرکت ہے اور اس پر وہ خوشی محسوس کرتے ہیں۔ مسٹر ارجن سنگھ نے اُردو اکادمی، دہلی کی سرگرمیوں اور سید شریف الحسن نقوی کی کوششوں کی ستائش کی۔ پروفیسر قمر رئیس نے کہا کہ اتحاد کی قوتوں کو مضبوط کرنے کے لیے اُردو کے فروغ کی ضرورت زیادہ ہے۔ انھوں نے مسٹر گجرال سے اپیل کی کہ اردو والوں کی توقع پوری کرنے کے لیے وہ پہلے سے زیادہ دلچسپی لیں۔ ہریانہ اُردو اکادمی کے سکریٹری مسٹر کشمیری لال ذاکر نے اُردو کو جائز درجہ دیے جانے کی وکالت کی۔ طنز و مزاح نگار مسٹر مجتبیٰ حسین نے کہا کہ اُردو والوں کے اعتماد کا نام مسٹر اندر کمار گجرال ہے۔ مسٹر شارب ردولوی نے مہمانوں کا خیر مقدم اور مسٹر انیس دہلوی نے شکریہ ادا کیا۔ اُردو اکادمی کے سکریٹری سید شریف الحسن نقوی نے نظامت کی۔ تقریب میں کرنل بشیر حسین زیدی، ہومی جے طالع یار خاں (ایم۔پی) مسٹر شکیل الرحمان (ایم۔پی)، مسٹر م۔ افضل (ایم۔پی) ڈاکٹر صدیق الرحمان قدوائی، مسٹر پیغام آفاقی، مسٹر جگن ناتھ آزاد، مسٹر اختر الواسع، ڈاکٹر اسلم پرویز، مسٹر یونس دہلوی، مسٹر رحمن نیر، مسٹر ارشد علی قدوائی، مسٹر عبدالرب صدیقی، بیگم ممتاز میرزا، مسٹر منورما دیوان، مسٹر رضوان احمد، مسٹر قمر الدین سمیت متعدد سر کردہ ادیب اور دانشور موجود تھے۔

راج نواس میں لفٹننٹ گورنر جناب ارجن سنگھ نے اُردو اکادمی کی مطبوعات ملاحظہ کیں۔ تصویر میں موصوف "ایوانِ اُردو" کی خصوصی اشاعتیں "مولانا ابوالکلام آزاد نمبر" اور "پنڈت جواہر لال نہرو نمبر" ہاتھوں میں لیے نظر آرہے ہیں۔ بائیں طرف کھڑے ہیں اکادمی کے سیکریٹری سید شریف الحسن نقوی۔

(تصاویر: سید فدا علی)

انجمن ترقی اردو بہار کی طرف سے اُردو آبادی کے مسائل پر تجاویز و مطالبات

اُردو بھون، پٹنہ میں انجمن ترقی اُردو
ر کی مجلسِ عاملہ کا ایک جلسہ زیرِ صدارت
ٹر عبد المغنی، منعقد ہوا، جس میں ریاست
اکثر اضلاع اور علاقوں سے نمائندہ ارکان
مدعوئین نے شریک ہوکر مختلف مسائل پر
رو فکر کے بعد اُردو آبادی کے مطالبات پر
مل تجویزیں اتفاقِ رائے سے منظور کیں۔
ے کے شروع میں صدر نے موجودہ حالات کا
زہ لے کر اُردو دوستوں کو خبردار کیا کہ وہ
سے زیادہ مستعدی و سرگرمی کے ساتھ
ے مسائل کے حل کے لیے ہر قسم کی جمہوری و
ی کوششیں جاری رکھیں، ورنہ ان کی غفلت
ستی بنے ہوئے کام بگاڑ سکتی ہے۔ جلسے
خر میں انجمن کے جنرل سکریٹری جناب سیّد
حیدر نے حاضرین کا شکریہ ادا کرنے
ساتھ توقع ظاہر کی کہ اُردو کے سپاہی اپنی
جاری رکھیں گے اور کسی دشمن کو اس
کا موقع نہیں دیں گے کہ انجمن کے عزائم
ہ میں مزاحم ہو یا اس کے کارناموں کو
ت کرنے کی کوشش کرے۔

جلسے میں سب سے پہلی تجویز باقی ماندہ
اضلاع میں اردو کی سرکاری حیثیت کے
ن پر عمل در آمد کے لیے درکار مزید آٹھ
اردو مترجم، نائب مترجم اور ٹائپسٹ کے
ز جلد تقرر پر منظور کی گئی اور حکومت سے
بہ کیا گیا کہ وہ اس سلسلے میں ٹال مٹول
سے کام نہ لے۔ ایک اور تجویز کے ذریعے مطالبہ کیا گیا کہ اُردو داں عملے کی شرح تنخواہ میں پے ریویژن کمیشن کی سفارشات کے مطابق اضافے کے احکام بلا تاخیر جاری کیے جائیں۔ تیسری تجویز میں بہار پبلک سروس کمیشن کے امتحاناتِ مقابلہ میں اُردو ذریعۂ امتحان کی اجازت کے فیصلے پر پوری طرح عمل کرنے، خاص کر اُردو داں اسکرپٹ اگزامنروں کے تقرر کا مطالبہ کیا گیا۔ چوتھی تجویز کے مطابق اقلیتی اسکولوں کے اساتذہ و ملازمین کو قومیائے ہوئے اسکولوں کے اساتذہ و ملازمین کے برابر، وقت پر اور براہِ راست تنخواہوں اور دیگر تمام سہولتوں کی ادائیگی کا مطالبہ کیا گیا۔

ایک اہم تجویز ۱۹۹۱ء کی مردم شماری میں زبان کے اندراج کے متعلق منظور کی گئی جس میں سب سے پہلے ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار بروقت اور صحیح طور پر شایع نہ کرنے کے لیے حکومت پر سخت تنقید کی گئی، اس کے بعد مطالبہ کیا گیا کہ آئندہ زبان کے خانے میں اندراج بولنے والے کے بیان کے مطابق ٹھیک کیا جائے اور اسے جلد سے جلد شایع بھی کیا جائے۔ آخر میں اُردو آبادی سے ۱۹۸۱ء کی طرح ایک بار پھر اپیل کی گئی کہ وہ ۱۹۹۱ء کی مردم شماری کے موقع پر زبان کے خانے میں پہلی زبان کی حیثیت سے اُردو کا اندراج کرائے۔ اس سلسلے میں صدر انجمن نے بتایا کہ وہ زبان کے صحیح اندراج کے لیے صدر جمہوریہ، وزیر اعظم ہند، وزیر داخلہ، گورنر بہار اور وزیر اعلیٰ بہار کو مراسلات بھی تحریر کر چکے ہیں اور پچھلی بار کی طرح، جس کا اعتراف سرکاری طور پر کیا جا چکا ہے، اس بار بھی صحیح مردم شماری کے لیے انجمن ترقی اُردو بہار نے ہر ممکن تعاون کی پیش کش کی ہے۔

راجستھان اُردو اکادمی کا سالانہ جلسہ اور کُل ہند سیمینار

راجستھان اُردو اکادمی کا سالانہ جلسہ اور خواتین کے عالمی سال کے سلسلے میں "اُردو کی خواتین افسانہ نگار" موضوع پر ایک کُل ہند سیمینار جے پور میں منعقد کیا گیا۔ اسی موقعے پر اکادمی کی جانب سے محترمہ عصمت چغتائی کا اعزاز بھی کیا گیا۔ اکادمی کے چیئرمین ڈاکٹر ثاقب رضوی اور دیگر اراکین نے موصوفہ کی گل پوشی کی اور اکادمی کی جانب سے ان کی خدمت میں تحفہ پیش کیا۔

جلسے کی افتتاحی تقریب میں محترمہ عصمت چغتائی نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی اور پروفیسر شمیم حنفی نے جلسے کی صدارت کی۔ جناب خداداد خاں صاحب مونس کنوینر تقریبات نے باہر سے تشریف لائے ہوئے مہمانوں کا تعارف کرایا۔ مجلس استقبالیہ کے صدر جناب دید ویاس چیئرمین راجستھانی بھاشا اکادمی (بیکانیر) نے اپنی مختصر استقبالیہ تقریر میں اکادمی کی کارکردگی کو سراہتے ہوئے زبانوں کے باہمی رشتوں کو مضبوط بنانے پر زور دیا اور کہا کہ وہی زبانیں پھلتی پھولتی اور پنپتی ہیں جن کا رشتہ عوامی زندگی سے جڑا ہوتا ہے۔

ڈاکٹر ثاقب رضوی نے اس بات پر اظہار افسوس کیا کہ گذشتہ سال حکومت نے ہم سے دو وعدے کیے تھے ایک اکادمی کی عمارت کے لیے جے پور میں قطعۂ زمین فراہم کرانے کا اور دوسرا اسکھاڑیا یونیورسٹی اُودے پور میں

مولانا آزاد چیئر قائم کرنے کا مگر اس سلسلے میں خاطر خواہ پیش رفت نہیں ہوسکی۔ ان معاملات میں ہماری کوششیں جاری ہیں۔

اکادمی کے سیکریٹری ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی نے اکادمی کی سال ۹۰-۱۹۸۹ء سے متعلق کارکردگی کی رپورٹ پیش کی۔

مہمانِ خصوصی محترمہ عصمت چغتائی نے اپنی زندگی کے مختلف واقعات اور ادبی دُنیا کے تجربات پر روشنی ڈالتے ہوئے جلسے کے افتتاح کا اعلان کیا۔

اس موقعے پر اکادمی کی جانب سے اجستھان کے حسبِ ذیل شعرا و ادبا کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کا اعزاز کیا گیا اور ایک ایک توصیف نامہ، شال اور اعزازی رقم ان کی خدمات میں پیش کی گئی:

۱۔ جنابِ ابن احسن بزمی ٹونکی (ٹونک)
۲۔ جنابِ ممتاز راشد (اجمیر) مقیم بمبئی
۳۔ جنابِ محمد حسن اختر قادری (اُودے پور)
۴۔ جنابِ انصار محشر عباسی (جے پور)

مذکورہ حضرات میں سے جناب بزمی ٹونکی اور ممتاز راشد صاحب جلسے میں تشریف نہیں لاسکے۔ اعزازات کے بعد اکادمی کی حسبِ ذیل مطبوعات کا مختلف مہمانوں کے ذریعے اجرا کرایا گیا:

انتخابِ کلام قابل اجمیری (مرتبہ سیّد فضل المتین)۔ صدا کے کالبد (انتخاب کلام خوشتر مکرانوی)۔ مٹی کی خوشبو (مرتبہ ممتاز شیب)۔ شعور و شعور (مجموعۂ غزلیات صائب ٹونکی مرحوم)۔ تلاشِ محور (انتخاب کلام مدان ہوش)۔

(تلاشِ محور کی طباعت کے لیے اکادمی کی جانب سے مصنّف کو مالی تعاون دیا گیا تھا)

کتابوں کی رسمِ اجرا کے بعد حسبِ ذیل ادیبوں کو ان کی مطبوعہ تصانیف پر اکادمی کی جانب سے ۹۰-۱۹۸۹ء کے لیے دو دو ہزار روپے کے انعام کا چیک پیش کیا گیا:

۱۔ جنابِ مشیر الدین قریشی (جے پور) افکار
۲۔ جنابِ مضطر صدیقی (بانسواڑہ) ارتعاش

آخر میں محترمہ عصمت چغتائی نے کہا کہ اُردو زبان کی ترقی کے لیے سب ہی کو مل جل کر کوشش کرنی چاہیے اور اسے عام لوگوں تک پہنچانا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ ہم اپنی بات ملک کی کسی بھی زبان میں پیش کریں اس میں اگر اُردو زبان کے الفاظ کا استعمال کیا جائے تو اُردو کی مقبولیت میں اضافہ ہوگا اور یہ زبان عام لوگوں تک پہنچ جائے گی۔ اس کو کسی پر تھوپا نہ جائے بلکہ یہ کوشش کی جائے کہ لوگ خود اس کو اپنانے میں دلچسپی لیں۔

سیمینار کے پہلے اجلاس میں حسبِ ذیل خاتون افسانہ نگاروں نے اپنی افسانوی تخلیقات پیش کیں:

محترمہ ڈاکٹر شمیم نکہت (دہلی) محترمہ شانتا بالی (جے پور) محترمہ صغریٰ مہدی (دہلی) محترمہ مسرور جہاں (لکھنؤ) محترمہ جیلانی بانو (حیدرآباد)۔

جلسے کی صدارت ڈاکٹر شارب ردولوی نے کی اور نظامت کے فرائض ممتاز شکیب صاحب نے انجام دیے۔

دوسرے اجلاس کی صدارت محترمہ جیلانی بانو نے کی۔ حسبِ ذیل حضرات نے مقالات پیش کیے:

ڈاکٹر شمیم حنفی (دہلی) ڈاکٹر ارتضیٰ کریم (دہلی) ڈاکٹر فضل امام (الٰہ آباد) جناب سیّد فضل المتین (اجمیر) جناب ممتاز شکیب (جے پور)۔

ادب میں تجربات ضروری لیکن...

"کوئی بھی ادب کسی خارجی ماحول کے بغیر تخلیق نہیں پاسکتا، ادب اور شاعری کسی بھی طرح پورے معاشرے کا اظہار کرتے ہیں۔ اسی لیے جدید شعرا پر زندگی اور سماج سے انحراف اور فرار کا الزام لگانا درست نہیں ہے۔" گلبرگہ میں انجمن ترقی اُردو کے زیرِ اہتمام جبّار جمیل کے اولین شعری مجموعے "احاطہ" کی رسمِ اجرا انجام دیتے ہوئے جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے اس خیال کا اظہار کیا۔ سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے کہا کہ ہر ادب میں تجربات ضروری ہیں۔ تجربہ ہمیشہ امکانات کی راہ دکھاتا ہے۔ لیکن کوئی شاعری اپنی روایت کی میراث سے انکار نہیں کرسکتی۔ اُردو میں ترقی پسند تحریک نے اپنی روایت کی میراث سے انکار کیا۔ ترقی پسندوں کا استدلال تھا کہ چوں کہ پُرانی شاعری میں انقلابی شعور نہیں تھا اس لیے اس کے ورثے کو مسترد کیا گیا۔ بہ... سے ترقی پسند شعرا نے غزل کی مخالفت کی لیکن ... سہرا مخدوم کے سر جاتا ہے جنھوں نے غزل ... ذریعے وراثت کا تحفظ کیا اور نئے انقلابی ... بھی پیش کیے۔ بعد میں دوسرے ترقی پسند ... غزل کی طرف راغب ہوئے۔ جناب شمس الر... فاروقی نے کہا کہ ۱۹۶۶ء کے بعد اُردو ... شعری روایت کی دریافتِ نو ہوئی بظاہر ... شکست و ریخت محسوس ہوئی لیکن نئے ... نے الفاظ اور ہیئت کے امکانات کو کھنگا... انھیں بروئے کار لائے۔ جدید شاعری ... پسند شاعری کے یک رخے پن اور نظریاتی ...

مقابلے میں زیادہ متنوع، رنگا رنگ، شخصی اجتماعی تجربات کا اظہار ہے۔ انھوں نے شعری لفظیات کے حوالے سے کہا کہ الفاظ بغیر شعر نہیں بن سکتا۔ نئے شعرا نے لفظ کی زیت کو دوبارہ بحال کیا ہے۔ اس موقعے ناب وہاب عندلیب، جناب سید مجیب الرحمٰن، ب احمد جلیس، محترمہ لئیق خدیجہ اور جناب مد اکمل نے بھی اظہار خیال کیا اور جناب جمیل ناعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔

جناب محمد عبدالعظیم (صدر انجمن ترقی و گلبرگہ) نے اپنی صدارتی تقریر میں جناب جمیل کو کامیاب اور باصلاحیت شاعر قرار ے ہوئے نوجوانوں کو مشورہ دیا کہ وہ عصری ے اور کلاسیکی ادب کی پوری روایات کو اس س منظر کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کریں۔

(امجد جاوید)

اعزازات

● ساؤتھ ایشین پرفارمنگ آرٹس کونسل ا امریکا (شکاگو) نے اپنے ایک حالیہ س میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد کو کونسل ٹرن منتخب کیا ہے۔ آرٹس کونسل کے ، پاکستان کے نوجوان شاعر افتخار نسیم ور چودھری نعیم، جان بینی گاس، پال نل سن، اعجاز نسرین، نسیم سرور، رضیہ ع احمد اور ڈاکٹر محمد نسیم مجلس عاملہ رن ہیں۔ (نامہ نگار)

● حافظ عبدالعزیز میموریل سوسائٹی (دہلی) ن سے پچھلے دنوں ایک پُروقار تقریب ال انڈیا مشاعرہ منعقد ہوا۔ جس کا افتتاح جناب گیانی ذیل سنگھ سابق صدر جمہوریہ ہند نے کیا اور صدارت جناب سید مظفر حسین برنی چیئرمین مینارٹی کمیشن نے جناب ساحر ہوشیار پوری مہمانِ خصوصی تھے۔ سوسائٹی کے سیکریٹری نے ساحر صاحب کو سپاس نامہ پیش کیا۔ اور آخر میں گیانی ذیل سنگھ صاحب کے دستِ مبارک سے انھیں ایوارڈ (زرّیں طشت، شال اور توصیف نامہ) دیا گیا جناب ساحر ہوشیار پوری نے اظہار تشکر کرتے ہوئے سامعین کی فرمائش پر اپنی غزلیات سے بھی نوازا۔

● مغربی بنگال اُردو اکادمی کی مجلسِ عاملہ نے ہندوستان گیر پیمانے پر ادب نوازوں کی رائے شماری کے بعد ممتاز شاعر اور نقاد ڈاکٹر مظفر حنفی (اقبال پروفیسر شعبۂ اُردو کلکتہ یونیورسٹی) کو ان کی ادبی خدمات پر دس ہزار روپے کا پرویز شاہدی ایوارڈ ۸۸ء دینے کا اعلان کیا ہے۔

اس سے پہلے موصوف کو نیشنل ایوارڈ فار چائلڈ ایجوکیشن (نئی دہلی)، میر تقی میر ایوارڈ (لکھنؤ)، ملک حیدر ایوارڈ (گیا) کے علاوہ یو۔پی اُردو اکادمی، مغربی بنگال اُردو اکادمی، بہار اُردو اکادمی، آندھرا پردیش اُردو اکادمی اور اُردو اکادمی دہلی کے مختلف انعامات مل چکے ہیں۔

● مغربی بنگال اُردو اکادمی نے مغربی بنگال گورنرس اُردو خطاطی کُل ہند ایوارڈ برائے سال ۱۹۸۸ء خطاطی کے بہترین نمونے پر جناب محمد رفیق عالم، کتاب منزل گوی محلہ، ہبلی (کرناٹک) کو دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ انعام کی رقم پانچ ہزار روپے ہے۔ (سکریٹری)

●●

بقیہ:

آپ کی رائے

○ اپریل ۹۰ء کا "ایوانِ اُردو" زیر مطالعہ رہا۔ ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری کا معلوماتی مضمون "اڑیسہ میں اُردو..." نظر سے گزرا۔ موصوف نے خوش اسلوبی کے ساتھ اڑیسہ میں اُردو کے نشیب و فراز کی عکاسی کی ہے۔ اڑیسہ کے دورِ قدیم و دورِ جدید کے بزرگ و نوخیز قلمکاروں کے اسمائے گرامی کو قلمبند کیا ہے مگر چند قلمکاروں مثلاً عبدالرؤف سرور بھاگلپوری، محمد اصغر علی حبیبی گدا، مشرف عالم، مطیع اللہ نازش، امتیاز ندیم اور مجھ خاکسار کے نام کو فراموش کردیا ہے۔

عبدالحلیم حلیم کی تاریخ وفات ۲۹؍ دسمبر ۸۹ء ہے۔ شاید محترم مضمون نگار تاریخ وفات سے واقف نہیں ہیں۔ شاعر مرحوم کے مختصر مجموعۂ کلام کا نام صرف "موجِ نسیم" نہیں "موجِ نسیم کلام حلیم" ہے۔ اُردو زبان کی ترویج و فروغ کے لیے اڑیسہ میں جو ادارے سرگرم عمل ہیں ان میں ایک نام "آزاد ہند لائبریری" بالوبیشی کا بھی ہے۔

——عبدالشکور شکور، کٹک

○ مئی کے شمارے میں بچوں کے ادب سے متعلق سراج انور کا مضمون چھپا ہے۔ اس سے پہلے بک اسٹال پر ایک کتاب غالباً خوشحال زیدی کی تالیف اسی موضوع پر نظر آئی تھی۔ کتنے تعجب اور افسوس کی بات ہے کہ خوشحال زیدی اور سراج انور دونوں نے کہیں بھی مائل خیر آبادی کا نام تک نہیں لیا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس ایک شخص نے بچوں کے لیے نثر و نظم کا ایک پورا کتب خانہ اپنی خداداد لیاقت سے تخلیق کردیا ہے۔

——رئیس نعمانی، علی گڑھ

سرورق کے اندرونی صفحے کے لیے
موصولہ عنوانات

مئی ۱۹۹۰ء کے "ایوانِ اردو دہلی" کے سرورق کے اندرونی صفحے پر جو تصویر چھاپی گئی تھی، اس کے لیے موصول ہونے والے شعری اور نثری عنوانوں میں سے تصویر کی مناسبت سے موزوں سمجھے جانے والے چند عنوان ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں :

شعری عنوانات

ہر منزلِ غربت پہ گماں ہوتا ہے گھر کا
بہلایا ہے ہر گام بہت دربدری نے (فیض احمد فیض)

مرسلہ : غازی اسلام (خریداری نمبر ۸۳)

جب کہیں عہدِ نو کو سمجھو گے
پہلے گزری ہوئی صدی سے ملو (رشید قریشی)

مرسلہ : شبانہ عبدالکریم (سندھودرگ)

بدل کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں (غالب)

مرسلہ : اشتیاق احمد کریمی (بتیا)
احسان اللہ عمیر (دربھنگہ)، مقصود حسن خاں گمنام پہر یموی (رائے بریلی)

ہم آئیں گے اس طرح سے بھیس بدلے
تمھاری نظر کو خبر بھی نہ ہوگی (ظفر احمد صدیقی)

مرسلہ : طلعت فاطمہ کریمی (بتیا)

شکم کی آگ لیے پھر رہی ہے شہر بہ شہر
سگِ زمانہ ہیں، ہم کیا ہماری ہجرت کیا (افتخار عارف)

مرسلہ : جاوید عزیزی (پرگنہ)

وہ جو پیشانی پہ پڑھ لے حالِ دل کا کون ہے
ہم اکیلے ہیں یہاں اپنا شناسا کون ہے (سیدہ شان معراج)

مرسلہ : اُمّ ھانی ریاض الدین سید (بمبئی)

اک لاپتہ سے شہر کا جیسے ہوں درد ہم
کچھ رنگ ہی عجیب ہماری صدا کا ہے (مِن موہن تلخ)

مرسلہ : سلمان منیر (بمبئی)

دعا دیتی ہیں راہیں آج تک مجھ آبلہ پا کو
مرے قدموں کی گلکاری بیاباں سے چمن تک ہے (مجروح سلطانپوری)

مرسلہ : خان اسد ملک (جے پور)

اسیرانِ ستم نے اور ہی کچھ سوچ رکھا ہے
کریں آخر بسر بھی کرنے والے یوں بسر کب تک (فراق گورکھپوری)

مرسلہ : عذرا انجم انصاری (دیوبند)

کاندھے پہ اٹھائے ہوئے ہستی کا جنازہ
ہم خانہ بدوشوں کی طرح گھوم رہے ہیں (نامعلوم)

مرسلہ : شبینہ مسرور کریمی (بتیا)

پتھر کی مورتوں کو بھی کہتے ہیں شاہکار
جسموں کا اعتبار نہ کر گُدگُدا کے دیکھ (کیف بھوپالی)

مرسلہ : اے علی (برہانپور)

عصرِ نو مجھ کو نگاہوں میں چھپا کر رکھ لے
ایک مٹتی ہوئی تہذیب کا سرمایہ ہوں میں (نعلی)

مرسلہ : مسعود پرویز وکیل (نصیر آباد)

جس طرف دیکھیے بہروپیے آتے ہیں نظر
لوگ پھرتے ہیں لیے چہرے پہ چہرے کتنے

مرسل اور شاعر : مقبول نصیر آبادی (نصیر آباد)

کس نے سوچا تھا کڑی دھوپ کے ساتھی میرے
قربِ سایوں کا جو پایا تو بکھر جائیں گے (خلش دہلوی)

مرسلہ : معین الدین شمسی (گریڈیہہ)

ہم ہیں نہ محبت کی گرمی ہم میں نہ شرافت کی نرمی
انساں کہیں کیوں سب ہم کو ہم چلتے پھرتے سائے ہیں (رضا مظہری)

مرسلہ : خورشید عالم قریشی (پرگنہ)

تقدیرِ منزلوں کی جگاتے چلے چلو
اے رہ روانِ راہِ محبت بڑھے چلو (فراق گورکھپوری)

مرسلہ : موسیٰ انصاری (دیوبند)

زندگی کی رہ میں چل لیکن ذرا بچ بچ کے چل
یہ سمجھ لے کوئی میناخانہ بار دوش ہے (اقبال)

مرسلہ : عبدالرؤف خاں (اودئی کلاں)

نثری عنوانات

"یہ ہے میرا ہندوستان" (خضر برنی کا مجموعۂ کلام)

مرسلہ : سعید احمد قائد (۱۰۰۷، مدرسہ حسین بخش، بازار مٹیا محل، جامع مسجد دہلی ۶)

"بھارت ایک کھوج" (پنڈت نہرو کی کتاب)

مرسلہ : ابن اسحٰق بنگلوری (تری کیرہ)

"زندگی کے رنگ کئی" (رفعت شاہین کا افسانہ)

مرسلہ : شیخ عبدالرشید، نصیر آبا[د]

"دھوپ کا سفر" (اظہار صہبائی کا افسانہ)

مرسلہ : معین الدین شمسی (گریڈیہہ)

"چراغِ چشمِ تر" (ظفر گورکھپوری کا شعری مجموعہ)

مرسلہ : اسلم خاں بشیر خاں (بمبئی)

"شکاری" (کرشن چندر کا ناول)

مرسلہ : انعام اللہ شارق (دربھنگہ)

"تہذیب" (سرسید احمد خاں کا مضمون)

مرسلہ : اختر صوفیہ قمر رضوی جامی (نوا...)

"گلدستہ" پہلے اور دوسرے درج شعری عنوان اور پہلے نمبر پر درج نثری عنوان بھیجنے والے ارسال کیا رہا ہے۔

آپ کی رائے

○ "نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں، نہ کسی کے دل کا قرار ہوں" غزل کے سلسلے میں جناب حنیف نقوی کا حالیہ انکشاف واقعی چونکا دینے والا ہے کہ یہ شعر:

میں کہاں رہوں میں کہاں بسوں نہ یہ مجھ سے خوش نہ وہ مجھ سے خوش
میں زمیں کی پیٹھ کا بوجھ ہوں میں فلک کے دل کا غبار ہوں

مضطر خیرآبادی کا نہیں بلکہ آغا حشر کاشمیری کی فکر کا نتیجہ ہے۔

ڈاکٹر خلیل اللہ خاں نے اپنی تصنیف "مضطر خیرآبادی" میں ماہنامہ مجلس، لاہور، ستمبر و اکتوبر ۱۹۶۴ء کے حوالے سے اسے مضطر صاحب کی تخلیق بتایا تھا، لیکن جناب نقوی کا مراسلہ شائع ہونے کے بعد مزید تحقیق و جستجو کی تو ایک بیاض میں مضطر خیرآبادی کی متذکرہ بالا غزل مقطعے کے ساتھ موجود پائی، جس میں یہ شعر شامل نہیں ہے۔ اس کے بجائے ایک دوسرا شعر دیکھنے کو ملا۔ شعر حاضرِ خدمت ہے:

نہ دوائے دردِ جگر ہوں میں نہ کسی کی میٹھی نظر ہوں میں
نہ ادھر ہوں میں نہ اُدھر ہوں میں نہ شکیب ہوں نہ قرار ہوں

غزل کے چھ اشعار خلیل تنویر صاحب پہلے ہی 'سرودِ رفتہ' کے تحت پیش کر چکے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ مختلف کتابوں اور رسالوں میں اس غزل کے اشعار میں جا بجا لفظی اختلافات پائے جاتے ہیں۔

بہر حال تحقیق کی راہیں کھلی ہوئی ہیں کیوں کہ مضطر خیرآبادی کا بیشتر کلام ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔

—— رفعت عزمی، ردولی (بارہ بنکی)

○ "آپ کی رائے" تبادلۂ خیال کے لیے بڑا ہی مفید کالم ہے۔ فروری ۹۰ء کے شمارے میں شائع شدہ جمیل جالبی کے مضمون "میراجی: ایک مطالعہ" پر اپریل کے شمارے میں کچھ خیالات پڑھنے کو ملے۔ ان خطوط میں میراجی کے فن سے زیادہ ان کی نجی زندگی پر تبصرہ کیا گیا ہے، مثلاً "وہ ژولیدہ ذہن تھے، خالی پیٹ شراب پیتے تھے، بستر گیلا کرتے تھے، غلاظتوں میں زندگی بسر کرتے تھے،" وغیرہ۔ ایک صاحب نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ "بیمار ذہن سے صحت مند خیالات کی توقع ہی فضول ہے،" میں ان قارئین کا دھیان سعادت حسن منٹو کے ان تاثرات کی طرف مبذول کراؤں گا: "حسن بلڈنگز (سعادت حسن منٹو کا مکان) کے فلیٹ نمبر ایک میں میراجی، گول مٹول شعر کہنے والا شاعر، مجھ سے بڑے صحیح قدوقامت اور بڑی صحیح نوک پلک کی باتیں کر رہا تھا، جو میرے افسانوں کے متعلق تھیں۔ وہ تعریف کر رہا تھا نہ تنقیص۔ ایک مختصر سا تبصرہ تھا ایک سرسری سی تنقید تھی، مگر اس سے پتا چلتا تھا کہ میراجی کے دماغ میں مکڑی کے جالے نہیں۔ اس کی باتوں میں الجھاؤ نہیں تھا اور یہ چیز میرے لیے باعث حیرت تھی۔" اسی مضمون میں منٹو نے آگے میراجی کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "میں سمجھتا ہوں کہ اس کا کلام بڑی عمدہ کھاد ہے جس کی افادیت ایک نہ ایک دن ضرور ظاہر ہو کر رہے گی۔ اس کی شاعری ایک گمراہ انسان کا کلام ہے جو انسانیت کی عمیق ترین پستیوں سے متعلق ہونے کے باوجود دوسرے انسانوں کے لیے اونچی فضاؤں میں مرغ باد کا کام دے سکتا ہے۔" منٹو نے مزید تحریر کیا ہے کہ "بحیثیت انسان کے وہ بڑا دلچسپ تھا پرلے درجے کا مخلص جس کو اپنی اس قریب قریب نایاب صفت کا مطلقاً احساس نہیں تھا۔ میراجی نے شاعری کی بڑے خلوص کے ساتھ، شراب پی، بڑے خلوص کے ساتھ، بھنگ پی وہ بھی بڑے خلوص کے ساتھ، لوگوں سے دوستی کی اور اسے نبھایا۔" (منٹو: فن اور شخصیت، ترتیب و انتخاب بریم گوپال متل، صفحات ۲۹۵ سے ۳۰۰ تک)۔

ان مختصر اقتباسات سے، وہ حضرات جو میراجی پر انگشت نمائی کر رہے ہیں، اتفاق کریں یا نہ کریں لیکن ان کی شخصیت، شاعری اور انسان دوستی، ابھر کر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ بستر گیلا کرنا اور شراب پینا تو وقتی چیزیں ہیں، ان سے فن اور ادب پر کوئی مستقل اثر نہیں پڑتا۔ میں میراجی کی شاعری اور شخصیت پر اعتراض کرنے والوں سے پوچھنا چاہوں گا کہ کیا ان کے پاس انسانیت کی کوئی جامع تعریف ہے؟ اگر ہے تو اس پر دوسرے ادبا و شعرا کو بھی جانچیں۔ میرے خیال سے لاتعداد حضرات ان کے بنائے ہوئے دائرے سے باہر آجائیں گے۔

...ہی شخص کسی کے لیے اچھا اور کسی
...برا ہو سکتا ہے۔

—— ارشاد احمد، برہسریا (سیوان)

"ایوانِ اردو" کے مارچ کے شمارے
...اب محمد عبدالحلیم نے "سرودِ رفتہ"
...بیان میرٹھی کی ایک غزل، تاریخ وصال
...و وفات دیے ہیں۔ دراصل جناب سیّد محمد
...اردو میں بیان اور فارسی شاعری میں
...خلص کرتے تھے ان کی وفات ۱۳ مارچ
...ء بمقام میرٹھ ہوئی لیکن ان کی
...ولادت مختلف فیہ ہے اور اکثر محققین
...طابق بیان ۱۸۵۰ء میں جھانسی میں
...نانا کے ہاں جو وہاں ڈپٹی کلکٹر تھے
...ہوئے جب کہ خم خانۂ جاوید جلد اوّل
...۱۸۴۰ء اور قاموس المشاہیر میں
...۱۸ء۔ آج کل دہلی (۱۹۷۰ء) میں
...۱۸ء قندیل حرم میں ۱۸۵۰ء روزنامہ
...وز کراچی (۴ ستمبر ۱۹۵۰ء) میں ۱۸۵۶ء
...نامہ مخزن (مارچ ۱۹۰۴ء) میں ۱۸۶۰ء
...ان کی پیدائش ظاہر کی گئی ہے مزید تفصیلات
...لیے ڈاکٹر محمد اشرف الدین ساحل ناگپوری
...کتاب "بیان میرٹھی حیات و شاعری" کا
...مطالعہ کرنا چاہیے۔

اسی شمارے میں جناب شمس کنول
...مضمون "رئیس امروہوی: ایک انسان
...دوست شاعر" بھی شائع ہوا ہے مگر صاحبِ
...مضمون نے عنوان کے ساتھ پورا انصاف
...نہیں کیا ہے اور اپنی یادداشت اور خطوط کو
...بنیاد بنا کر مضمون تحریر کیا ہے۔ رئیس کی
...زندگی کے آخری دور کی ایک اہم نظم کا جو
...انھوں نے ہند پاک دوستی کے نام تحریر کی
ہے صرف ایک شعر دیا ہے۔۔۔ اس کے چند
اشعار اس طرح ہیں:

جب سے بچھڑ گئے ہیں اس خلدِ رنگ و بو سے
محروم ہو گئے ہیں دل شوق و آرزو سے
باز آئیں گے مسافر کیا ذوقِ جستجو سے
اب تک وہی ہے رشتہ دِلّی سے لکھنؤ سے
وہ خاک جس پہ ہم نے بچپن کے دن گزارے
اب تک بسی ہوئی ہے احساس میں ہمارے
کیوں کر نہ یاد آئیں کیوں ہوں نہ دل کو پیارے
اس سرزمیں کے ذرّے اس آسماں کے تارے

—— منظور مظلوم کشمیری، سری نگر

○ "حرفِ آغاز" اپریل ۱۹۹۰ء میں گجرال
سفارشات کی خبر خوش آئند ہے، "سرودِ رفتہ"
میں انور دہلوی کی جو غزل پیش کی گئی ہے
اس کے مطلع کا دوسرا مصرعہ زبان زدِ
عام ہے۔ رحمت امروہی کی نظم "حساب"
لائق تحسین ہے۔ دوہے کا سلسلہ بھی خوبصورت
ہے اور اردو میں اس صنف کو فروغ ملنا
ہی چاہیے۔

جان گلکرائسٹ کے املا کا اس سے
صاف اور خاصا بہتر نسخہ، انڈیا آفس
لائبریری اور برٹش میوزیم وغیرہ میں بھی
موجود ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ ایسی
تمام لسانی دستاویزات کی فوٹو کاپیاں یہاں
لائی جائیں۔ زاہدہ زیدی نے "چیخوف کی
ایک غیر دلچسپ کہانی" پر سیر حاصل تبصرہ
کیا ہے شفیق کا افسانہ "زندانی" ایک متاثر
کرنے والا خوبصورت افسانہ ہے۔ "تازہ خون
میں ملی ہوئی مٹی" مہاجرین اور تقسیم ہند پر
ایک اچھا اشاریہ ہے۔ "لائن میں" شفیقہ فرحت
کا حالاتِ حاضرہ پر ایک عمدہ طنز ہے لیکن
یہ افسانہ قدرے مختصر ہوتا تو اس کے حسن میں
اور اضافہ ہو جاتا کیوں کہ قاری کو انجام کا
احساس قبل از وقت ہو جاتا ہے۔ "ہم طرح
اشعار" کا سلسلہ ختم کرنے کے ضمن میں آپ
واقعی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ میں اس سے
قبل کے اپنے پچھلے دو خطوط میں آپ کی توجہ
اس جانب مبذول کرا چکا ہوں۔

—— ایم۔ جمال علوی، لکھنؤ

○ فروری کا رسالہ نظر نواز ہوا محترمہ زاہدہ
زیدی کا چیخوف کی ایک کہانی پر مضمون بے حد
اچھا ہے۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر صاحب کی
غزلوں کے رنگ و آہنگ کے بارے میں مجھ
جیسوں کا کچھ کہنا چھوٹا منہ بڑی بات جیسا ہے
ہم تو اُن کی درازیٔ عمر کے لیے دعاگو اور ان
کے اسی طرح کے کلام کی زیارت کے متمنی رہتے ہیں۔
مصوّر سبزواری اور اظہر عنایتی کی
غزلوں سے ایک لطف کے ساتھ ذہن کو تازگی سی
میسّر ہوئی

—— شمس فرخ آبادی، لکھنؤ

○ مئی ۹۰ء کا شمارہ سامنے ہے مضامین
میں "رباعی کا بنیادی وزن" اور "آج کا
بچوں کا نثری ادب" خصوصی طور پر پسند
آئے۔ "قمر اقبال: شعلۂ مستعجل" مضمون ہے
یا تبصرہ؟ شعری حصّہ بہتر ہے۔

—— محمد منظور کمال، بیگوسرائے

○ ماہنامہ "ایوانِ اردو" ماہ اپریل میں
جناب مظہر امام کا مضمون ایک دستاویزی
حیثیت رکھتا ہے۔ اُمید ہے کہ آنے والے
محققین کے لیے کارآمد ثابت ہوگا۔

اظہر نیّر، بھلائی نگر

(بقیہ صفحہ ۵۵ پر)

اردو اکادمی، دہلی کا ماہانہ رسالہ

فون نمبر: ۳۲۷۶۲۱۱، ۳۲۶۳۴۴۸

ادارۂ تحریر:
سید شریف الحسن نقوی، مخمور سعیدی

جلد: ۴ ● شمارہ: ۳ ● فی کاپی ۵۰ر۲ روپے، سالانہ قیمت ۲۵ روپے ● جولائی ۱۹۹۰ء

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتا
ماہنامہ ایوانِ اُردو دہلی
اُردو اکادمی، دہلی ——— گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

خوشنویس: تنویر احمد

سید شریف الحسن نقوی (ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر) نے سیما آفسیٹ پریس، دہلی ۱۱۰۰۰۶ سے چھپوا کر اُردو اکادمی، نئی دہلی ۲: ... سے شائع کیا

حرفِ آغاز

اُتر پردیش کے وزیرِ اعلیٰ جناب ملائم سنگھ یادو ان سیاستدانوں میں ہیں جو اپنی بات دو ٹوک لفظوں میں کہہ دینے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ انگریزی غیر ملکی زبان ہے اور ہندوستان میں اس کی بالادستی ہمیں اپنے ایّامِ غلامی کی یاد دلاتی ہے اس لیے اب اس زبان کو اہمیت دیے جانے کا سلسلہ بند ہونا چاہیے۔ انھوں نے متعدد موقعوں پر اپنے اس ارادے کا بھی اظہار کیا ہے کہ ان کی حکومت اُتر پردیش سے انگریزی کو جلد ہی نکال باہر کرے گی۔ ایک دوبار انھوں نے یہ اشارہ بھی دیا ہے کہ انگریزی کی جگہ جنوبی ہندوستان کی کسی زبان کو دی جاسکتی ہے۔

انگریزی بین الاقوامی رابطے کی زبان ہے اور سائنسی علوم سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے بھی بحالاتِ موجودہ اس زبان کا جاننا ضروری ہے اس لیے بہت سے لوگ ہوں گے جو وزیرِ اعلیٰ اُتر پردیش سے اس معاملے میں غیر متفق ہوں گے۔ یہ سوال بھی اٹھایا جاسکتا ہے کہ جب پورے ملک میں انگریزی کا چلن باقی رہے گا اور اُتر پردیش کے طلبہ انگریزی سے نابلد رہیں گے تو کیا اس سے کچھ نئی پیچیدگیاں پیدا نہ ہوں گی؟

لیکن ہم محترم وزیرِ اعلیٰ کی توجہ ایک اور طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں۔ انگریزی کی جگہ جنوبی ہندوستان کی کسی زبان کو دے دینے کا خیال انھیں غالباً اس وجہ سے آیا کہ اس سے وہ لسانی تعصب دُور ہو سکے گا جو ہندی کے خلاف جنوبی ریاستوں میں پایا جاتا ہے۔ لیکن ہمیں اس پر حیرت ہے کہ اس سلسلے میں محترم وزیرِ اعلیٰ کا دھیان اُردو کی طرف کیوں نہیں گیا جو اُتر پردیش کی اپنی زبان ہے اور جس کا خمیر ہی ثقافتی اور لسانی ہم آہنگی سے اُٹھا ہے۔

ہم جنوبی ہندوستان کی زبانیں شمالی ہند کے طلبہ کو پڑھائے جانے کے خلاف ہرگز نہیں، اس سے یقیناً ذہنی مفاہمت اور جذباتی ہم آہنگی کے عمل کو تقویت حاصل ہوگی لیکن خود شمالی ہند کی ایک ایسی زبان کو، جس کا دائرۂ اثر ہمیشہ سے ملک گیر رہا ہے اور اب عالمگیر ہوتا جارہا ہے، اس کے اپنے گھر میں مناسب مقام نہ دینا کسی طرح قرینِ انصاف نہیں۔

موجودہ ہندوستان کی دو ہی زبانیں، ہندی اور اُردو ایسی زبانیں ہیں جو پورے ملک کی تہذیبی اور تمدّنی زندگی کی ترجمان کہی جاسکتی ہیں۔ دوسری زبانیں اپنی پرشکوہ تاریخ اور شاندار ادبی سرمایے کے باوجود علاقائی اثرات سے خود کو باہر نہیں نکال سکی ہیں۔ ہندی کو سرکاری زبان کا بلند منصب مل چکا ہے اس لیے اس کی ترویج و ترقی کے راستے از خود ہموار ہوتے جائیں گے لیکن اُردو کی بقا اور ترقی کے لیے یہ ضروری ہے کہ عوام کے علاوہ برسرِ اقتدار طبقہ بھی اس زبان کی افادیت اور اہمیت کو سمجھے اور اس کی جو حق تلفیاں اب تک ہوتی رہی ہیں، ان کے ازالے کی ہر سطح پر مخلصانہ کوشش کی جائے۔

——— سیّد شریف الحسن نقوی

○

ہوا ہے تیز، سمندر بپھرنے والا ہے
بلائے جاں ہے جو لمحہ، گزرنے والا ہے

بدن کی سطح پہ رکھّا سنبھال کر، جس کو
وہ شخص ٹوٹ کے اندر بکھرنے والا ہے

شبِ سیہ کے مسافر کو الوداع کہو
سمندروں میں سفینہ اُترنے والا ہے

فلک کی سمت نہ دیکھو، افق کی بات کرو
سُنا ہے، چاند زمیں پر اترنے والا ہے

چلو سجی ہے عدالت پھر آج مدّت میں
وہ اپنی بات سے یعنی مکرنے والا ہے

○

آنکھوں میں کرب، دِل میں مزے رتجگوں کے ہیں
ان انگلیوں میں لمس جو دُکھتی رگوں کے ہیں

یادوں کی یہ امیں ہیں انھیں مت بجھائیو
آنکھوں میں جو چراغ ابھی رتجگوں کے ہیں

بچّوں کو جانیے نہ الگ اپنی ذات سے
انگشتری سے درد کے رشتے نگوں کے ہیں

گزرا تھا، ایک "نُور نژاد آدمی" کبھی
آکاش پر نشان ابھی تک پگوں کے ہیں

بچّوں نے کچّی نیند سے یہ چونک کر کہا
جو مسئلے ہیں گھر میں وہ سب رتجگوں کے ہیں

عنوان چشتی

بی ۔ ۱۱۷، (اُردو سماج) جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

مظفّر حنفی

یوں چھاؤں میں جلتا رہوں کب تک مرے مولا
سایہ ابھی پہنچا نہیں سب تک مرے مولا

پھر بھی مری قسمت کے ستارے رہیں بیدا
سو جائیں اگر دستِ طلب تک مرے مولا

چھوڑا تھا کنارہ کہ ذرا شغل رہے گا
محصور ہوں گرداب میں اب تک مرے مولا

بچّوں کا نہیں ذکر کہ تہذیب و ادب سے
بیگانہ ہیں کچھ اہلِ ادب تک مرے مولا

پتّھر تو سرافراز کے اوپر ہی چلیں گے
فریاد نہ آئی مرے لب تک مرے مولا

دن گرد اُڑانے کے لیے تھا سو اُڑا لی
پھر آگیا ویرانۂ شب تک مرے مولا

اِک بار مظفّر کو بھی توفیق عطا کر
مزدور بھی جاتے ہیں عرب تک مرے مولا

اے ۔ ۲، یونیورسٹی ٹیچرس کوارٹرس، کالکوگاچھی، کلکتہ ۵۴۰۰۰

ڈاکٹر نریش

مولانا آزاد کی سوانح نگاری ـــ غبارِ خاطر

مرزا غالب نے اپنی خطوط نگاری کے بارے میں کہا تھا کہ "میں نے خط کو مکالمہ بنا دیا ہے۔" جب کسی کا خط آتا تھا تو غالب اسے "نصف ملاقات" سے معنون کرتے تھے اور اس سے خلوت میں جلوت کا مزہ لیتے تھے۔ مگر مولانا آزاد کی خطوط نگاری میں مکالمے کی ان گنجائشوں کو دخل حاصل نہ تھا جو مرزا غالب کی خطوط نگاری کو حاصل تھیں۔ سبب یہ کہ غالب کی دوستوں، عزیزوں اور دیگر متعلقین سے خط وکتابت ہوا کرتی تھی جبکہ مولانا ایک طویل زمانے تک صرف کتابت ہی کرتے رہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مولانا قلعہ احمد نگر میں قید تھے اور جن خطوط کو انھوں نے رقم کیا، ان کے بارے میں وہ جانتے تھے کہ یہ خطوط مکتوب الیہ تک نہیں پہنچیں گے۔ اس لیے مولانا کے ان خطوط میں خطوط نگاری کے بنیادی تقاضے یعنی دوطرفہ مکالمے سے احتراز کیا گیا ہے۔ لہٰذا مولانا کے خطوط میں وہ متعدد اشارے ناپید ہیں جن کی بنا پر انھیں خالص خطوط کہا جا سکتا ہو۔ خطوط نگاری کی بنیادی شرط مکالمہ ہے جو بظاہر تو یک طرفہ ہوتا ہے لیکن اس میں متعدد ایسے اشارے مضمر ہوتے ہیں جن سے مکالمہ کے دوطرفہ ہونے کا پتا چل جاتا ہے۔ مثلاً خط لکھنے والا جب اپنے خط میں مکتوب الیہ کے کسی خط کا ذکر کرتا ہے، کسی ملاقات یا کسی موضوع پر ہوئی گفتگو کا حوالہ دیتا ہے یا اپنی ہی تحریر میں اس ردِ عمل کو شامل کر لیتا ہے جو اس کے یقین کے مطابق مکتوب الیہ کا ردِ عمل ہونا چاہیے، تب یہ مکالمہ یک طرفہ نہیں رہتا۔ اس بنا پر مولانا کے یہ خطوط تبادلۂ خیال نہ ہو کر اظہارِ خیال بن گئے ہیں، جسے خود کلامی کہنا بہتر معلوم ہوتا ہے۔

مولانا کے خطوط میں رہائی کے بعد کا ایک خط، جو انھوں نے ۳ ستمبر ۱۹۴۵ء کو قیامِ سری نگر کے دوران لکھا تھا، غبارِ خاطر میں شامل ان کے زمانۂ قید کی مکتوب نگاری کا پس منظر اس طرح بیان کرتا ہے:

"چائے دم دی۔ فنجان سامنے رکھا اور اپنے خیالات میں ڈوب گیا۔ خیالات مختلف میدانوں میں بھٹکنے لگے تھے۔ اچانک وہ خط جو ۳ اگست کو ریل میں لکھا تھا اور کاغذات میں پڑا تھا، یاد آ گیا۔ بے اختیار جی چاہا کہ کچھ دیر آپ کی مخاطبت میں بسر کروں اور آپ سُن رہے ہوں یا نہ سُن رہے ہوں مگر روئے سخن آپ ہی کی طرف رہے۔ چنانچہ اس عالم میں ایک مکتوب قلمبند ہو گیا اور اس کے بعد ہر دوسرے تیسرے دن مکتوبات قلمبند ہوتے رہے... قید خانے کے باہر کی دُنیا سے اب سارے رشتے کٹ چکے تھے اور مستقبل پردۂ غیب میں مستور تھا۔ کچھ معلوم نہ تھا کہ مکتوبات کبھی مکتوب الیہم تک پہنچ بھی سکیں گے یا نہیں۔ تاہم ذوقِ مخاطبت کی طلبگاریاں اس طرح دلِ مستمند پر چھا گئی تھیں کہ قلم اٹھا لیتا تھا تو پھر رکھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ لوگوں نے نامہ بری کا کام کبھی قاصد سے لیا، کبھی بالِ کبوتر سے، میرے حصے میں عنقا آیا۔"[1]

اس پس منظر پر غور کیا جائے تو دو باتیں سامنے آتی ہیں۔ اول یہ کہ مولانا نے یہ خطوط اپنے ذہن کی مختلف کیفیات اور مختلف موضوعات پر اپنے قلمبند کرنے کی غرض سے لکھے تھے اور انھیں اس سے سروکار نہیں تھا کہ یہ خطوط مکتوب الیہم تک پہنچتے ہیں یا نہیں۔ دوسرے یہ کہ ان خطوط کو لکھنے میں مولانا کی طبیعت کے اُس زور کو دخل حاصل تھا، جسے "لکھنے کی مجبوری" کہا جا سکتا ہے۔ چوں کہ مولانا کو معلوم تھا کہ وہ ان خطوں میں اپنی زندگی کی تلخ حقیقتیں رقم کر رہے ہیں اور اپنی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈال رہے ہیں، اس لیے وہ ان خطوط کو احتیاط سے جمع کرتے رہے اور ان کی فائل بناتے رہے۔ اور جب قید خانے سے رہا ہونے کے بعد ان خطوط کے مکتوب الیہ تک پہنچنے کی راہ بھی ہموار ہو گئی تو مولانا نے انھیں قلمی مکتوبات کے بجائے مطبوعہ مجموعے کی صورت میں بھیجنا ہی مناسب خیال کیا۔ چوں کہ مولانا کو معلوم تھا کہ ان خطوط کی اشاعت سے اُردو کے قارئین مکتوب نگاری کی ایک نئی طرز سے واقف ہو سکتے ہیں اور انھیں مولانا کی شخصیت کے مختلف گوشوں سے واقفیت حاصل ہو سکتی ہے، اس لیے مولانا نے نہ صرف ان مکتوبات

پروفیسر جدید ادب، بھائی ویر سنگھ چیئر، پنجاب یونیورسٹی، پٹیالہ

کو کتابی صورت میں شائع کرنے پر ہی رضامندی کا اظہار کیا بلکہ "مدینہ" اخبار کے ایڈیٹر کو انھیں اپنے اخبار میں شائع کرنے کی اجازت بھی دے دی۔

ان حقائق کی روشنی میں میں مولانا آزاد کے خطوط کو "سوانحی خطوط" کہنا پسند کروں گا، جن کے ذریعے سے اُردو میں سوانح نگاری کی صنف میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوتا ہے۔

اپنے ان خطوط میں مولانا آزاد نے اپنے خاندان، اپنے بچپن، لڑکپن، جوانی، اپنے مزاج اور اپنی طبیعت کے تعلق سے اپنی شخصیت کے مختلف گوشوں کی طرف اشارہ کیا ہے اور اپنے اعتقادات کی وضاحت میں اس پس منظر سے بھرپور فائدہ بھی اٹھایا ہے۔

مولانا کے خطوط میں بعض خطوط ایسے بھی ہیں جنھیں بلا تامل "کہانیاں" کہا جا سکتا ہے۔ خود مولانا کو اعتراف رہا ہے کہ وہ ان خطوں کے ذریعے افسانہ سرائی کرتے رہے ہیں۔ بقول مولانا:

"افسانہ سرائی سے اپنے کو باز نہیں رکھ سکا"[2]

ایک خط کے اختتام پر مولانا لکھتے ہیں:

"ہاتھ بڑھاتا ہوں اور یہ افسانہ سرائی ختم کرتا ہوں"[3]

ایک دوسرے خط میں مولانا لکھتے ہیں:

"اپنی طبیعت کو دیکھتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے داستان سرائیوں سے تھکنا بالکل بھول گئی ہو۔ داستانیں پھیلتی جاتی ہیں اور ذوقِ داستان سرائی اتنا ہی بڑھتا جاتا ہے"[4]

ایک خط میں جہاں مولانا داستان سرائی سے ہٹ کر چمن آرائی کو طول دے بیٹھتے ہیں تو یکایک انھیں احساس ہوتا ہے کہ جملۂ معترضہ بلا قصد ہی طول پکڑ گیا اور وہ فوراً داستان کی طرف لوٹ آتے ہیں۔

"اب اصل حکایت کی طرف واپس ہونا چاہیے"[5]

شاید یہی سبب ہے کہ مولانا کے بعض خطوں کو اس طرح کے عنوانات دیے گئے ہیں جن سے ان کا کہانی ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ ۱۷ مارچ ۴۳ء کے خط کو غبارِ خاطر میں "چڑیا چڑے کی کہانی" کے عنوان سے شائع کیا گیا ہے۔ اسی طرح ان کے ۲ مارچ ۴۳ء کے خط کو "حکایتِ زاغ و بلبل"، ۲۷ اگست ۴۲ء کے خط کو "حکایتِ بادہ و تریاک" اور ۱۰ اگست ۴۳ء کے خط کو "داستانِ بے ستون و کوہ کن" عنوان دیا گیا ہے۔

چوں کہ ان کہانیوں، داستانوں یا حکایتوں کو مولانا نے اپنی زندگی کے ساتھ وابستگی دے کر اس طرح رقم کیا ہے کہ ان کی انفرادی حیثیت سوانحی واقعات کی اضافی حیثیت کی سی ہو گئی ہے، اس لیے ان خطوط کو "افسانوی خطوط" کہنے پر اصرار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ مولانا کا دلکش طرزِ تحریر ہے کہ ان کے روز مرّہ کے واقعات کے بیان میں ایسا موثر کہانی پن موجود ہے کہ قاری اس کے مطالعے سے کہانی کا مزہ بھی لیتا ہے اور مولانا سے متعلق اس کی معلومات میں اضافہ بھی ہوتا ہے۔

مولانا آزاد کی خطوط نگاری کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ انھوں نے اپنے خطوط کے ذریعے سے "ڈائری" لکھ دی ہے۔ ڈائری لکھنے میں جس احتیاط کے ساتھ مقامات اور معاملات کی تفصیل کو مدِّ نظر رکھا جاتا ہے مولانا کی نظر نے اس سے انحراف نہیں کیا ہے۔ قلعہ احمد نگر میں قید مولانا آزاد جب اپنے ایک خط میں احمد نگر کی تاریخ بیان کرتے ہیں اور اس علاقے کے موسموں کا تفصیل سے ذکر کرتے ہیں، تو وہ درحقیقت ڈائری نگاری کا حق ادا کر رہے ہوتے ہیں۔ اسی طرح اپنی روز مرّہ کی مصروفیات اور مختلف مواقع سے متعلق اپنے ردِّ عمل کو تاریخ وار تحریر کرنا بھی ان کے اکثر خطوط کو ڈائری نگاری کے زمرے میں لے آتا ہے۔ ڈائری نگاری کی ایک مثال دیکھیے۔ مولانا اپنے ۱۱ اپریل ۴۳ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"اخبار یہاں بارہ بجے سے ایک بجے کے اندر آیا کرتے ہیں۔ میرے کمرے کے سامنے دوسری طرف سپرنٹنڈنٹ کا دفتر ہے۔ جیلر وہاں سے اخبار لے کر سیدھا کمرے میں آتا ہے۔ جونہی اس کے دفتر سے نکلنے اور چلنے کی آہٹ آنا شروع ہوتی تھی، دل دھڑکنے لگتا تھا کہ نہیں معلوم آج کیسی خبر اخبار میں ملے گی لیکن پھر میں فوراً چونک اٹھا۔ میرے صوفے کی بیٹھ دروازے کی طرف ہے۔ اس لیے جب تک ایک آدمی آکے میرے سامنے کھڑا نہ ہو جائے میرا چہرہ دیکھ نہیں سکتا۔ جب جیلر آتا تھا تو میں حسبِ معمول مُسکراتے ہوئے اشارہ کرتا کہ اخبار ٹیبل پر رکھ جاؤ"[6]

مولانا کی خطوط نگاری کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ مولانا نے اپنے بعض خطوط سے "مضمون نگاری" کا کام لیا ہے۔ غبارِ خاطر

، شامل چند خطوط ایسے بھی ہیں جن کی ابتدا
سید سے مضمون سے ہوتی ہے خطوط نگاری
عام روش یعنی سلام دعا یا ابتدائی جملے
، ان خطوں میں مفقود ہیں۔ ایسا محسوس
تا ہے کہ جیسے مولانا کی طبیعت کا زور انھیں
ں تمام تر توجہ صرف اور صرف اس موضوع
مرکوز کرنے پر مجبور کر رہا ہے جس پر لکھنے
لیے مولانا نے قلم اٹھایا ہے۔ ایسے خطوط کو
طوط کہنے میں تامل ہوتا ہے اور بلا تامل ان
مضامین قرار دیا جاسکتا ہے۔ مولانا کے
ن خطوط کو مندرجہ ذیل عنوانات دیے
سکتے ہیں۔ اگر ان خطوط پر سے "صدیقِ مکرم"
تخاطب ہٹا دیا جائے اور بعض ابتدائی
لے ان میں سے خارج کردیے جائیں تو ان
بڑی آسانی سے مضامین قرار دیا جاسکتا
۔ ملاحظہ ہوں مجوزہ عنوانات :-

اگست ۴۲ء کے خط کو ۔ علم اور مذہب
اکتوبر ۴۲ء کے خط کو ۔ افکار و اعمال
ا، اکتوبر ۴۲ء کے خط کو ۔ شخصی تصور کے مختلف مدارج
دسمبر ۴۲ء کے خط کو ۔ چائے
جنوری ۴۳ء کے خط کو ۔ انانیت
ستمبر ۴۳ء کے خط کو ۔ فنِ موسیقی
ر
دسمبر ۴۳ء کے خط کو ۔ اسلام اور عیسائیت

یسے عنوانات دیے جاسکتے ہیں۔
مضمون نگاری بھی چوں کہ کسی موضوع
مربوط خیالات کا اظہار ہوا کرتی ہے، اور
وں کہ مولانا آزاد نے بھی ان تحریروں کے
ریعے ارادی طور پر مختلف موضوعات پر
اظہارِ خیال کیا ہے، اس لیے ان مضامین کو
بھی مولانا کے سوانحی خطوط ہی تسلیم کیا
جاسکتا ہے۔

جس طرح خطوں پر مشتمل افسانے کو
خطوط نگاری نہ کہہ کر افسانہ نگاری ہی کا
نام دیا جاتا ہے، اسی طرح مولانا آزاد کی خطوط
نگاری کو بھی سوانح نگاری کہا جاسکتا ہے۔
سوانح نگاری کے ضمن میں "سوانحی خطوط" کی
اصطلاح کو شامل کر کے یقیناً ہم مولانا آزاد
کی ان تحریروں کے توسل سے ایک نئے باب
کا اضافہ کرسکتے ہیں، جس سے نہ صرف سوانح
نگاری کی صنف کو ایک عظیم دانشور کے قلم کا لمس
نصیب ہوتا ہے بلکہ سوانح نگاری کے لیے ایک
دلکش ادبی اندازِ تحریر کی اعلیٰ مثال بھی
حاصل ہوتی ہے اور جس پر اردو ادب
بجا طور پر فخر کرسکتا ہے۔

حوالے :

۱۔ غبارِ خاطر، ابوالکلام آزاد، صفحہ ۳۱
۲۔ " ، " ، صفحہ ۵۷
۳۔ " ، " ، صفحہ ۷۸
۴۔ " ، " ، صفحہ ۲۳۷
۵۔ " ، " ، صفحہ ۲۱۹
۶۔ " ، " ، صفحہ ۲۵۴

ستیہ پال آنند

صبح ہونے تک
(مونولاگ)

منظر

ایک کمرہ۔ نیم متوسط طبقے کے گھر کا ضروری اور غیر ضروری سامان۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ ایک چھوٹی تپائی، جس پر کنگھی اور شیشے سے لے کر بچوں کی کاپیاں اور کتابیں تک۔ ساتھ ہی ایک پرانی کرسی پر متفرق کپڑے۔ دونوں سامنے کی دیواروں کے ساتھ سٹ کر لگی ہوئی دو چارپائیاں۔ جن پر رضائیاں اوڑھے بچے سوئے پڑے ہیں۔ ان چارپائیوں کے نیچے پرانے، بغیر روغن کے لوہے کے بکس اور دیگر سامان ٹھسا پڑا ہے۔ باہر جانے کا دروازہ ایک بچے کی چارپائی کی پائنیتی کے ساتھ ہے۔ اس وقت یہ دروازہ بھڑا ہوا ہے۔ دائیں ہاتھ کا دروازہ اندر کے چھوٹے کمرے میں کھلتا ہے، اور اس وقت اس کے دونوں در وا ہیں۔ باہر کی سمت کھلنے والی دونوں کھڑکیاں بند ہیں اور اس کمرے کے دوسری منزل پر ہونے کا پتا دیتی ہیں۔ وقت رات کا ہے۔ اسٹیج پر صرف ایک کمزور بلب کی روشنی ہے۔

پردہ اٹھتا ہے تو بیس سیکنڈ کی مکمل خاموشی کے بعد باہر کسی کے زینے پر چڑھنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ محسوس یہ ہوتا ہے کہ جیسے آنے والا، آہستہ آہستہ پنجوں کے بل خاموشی سے اوپر آ رہا ہے۔

باہر کا دروازہ کمال آہستگی سے کھلتا ہے۔ زینے سے روشنی کی کچھ کرنیں اندر آجاتی ہیں اور ان میں نو وارد دکھائی دیتا ہے۔ تیس برس کا پریشاں حال نوجوان، چہرے پر بڑھی ہوئی داڑھی۔ میلے روکھے بال اور عینک۔ ان سب کی ایک جھلک کے بعد وہ اندر داخل ہوتا ہے۔ اسی جھجک، ڈر اور آہستگی سے دروازہ بند کرتا ہے۔ پھر چور نظروں سے داہنی طرف کی چارپائی کو دیکھتا ہے اور پنجوں کے بل چلتا ہوا اندر کے دروازے میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہ دروازہ بھی اسی طرح خاموشی اور آہستگی سے بند ہو جاتا ہے۔ بجلی کے بٹن دبانے کی آواز کے ساتھ اندر کمرے میں روشنی ہو جاتی ہے۔ شیشے سے چھن کر آئی ہوئی اسی روشنی سے اب ہم پہلا کمرہ بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔ داہنی چارپائی پر بچے نہیں ہیں، ایک عورت سوئی ہوئی ہے۔ رضائی ہلتی ہے سونے والی کروٹ بدلتی ہے، پھر آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے۔

بیوی: (اندر کے دروازے کو مخاطب کرکے) آ گئے؟ میں نے کہا، آج کی رات باہر کاٹنے میں خطرہ ہی کیا تھا؟ (باہر کے دروازے کو دیکھتے ہوئے) اور آئے بھی بالکل چوروں کی طرح... کہ کسی کو آنے کا پتا ہی نہ چلے۔ تم سمجھتے ہو، میں گھوڑے بیچ کر سوتی ہوں... لیکن میں نے تمھیں نیچے چوکیدار کو جگا کر دروازہ کھلواتے سنا۔ پھر ڈیوڑھی میں سائیکل رکھنے کی آواز آئی۔ پھر تم چوروں کی طرح زینے پر چڑھے۔ آخری سیڑھی پر آکر ذرا سا دم لیا۔ آدھ منٹ رکے۔ کان لگا کر سنا کہ میں سوئی ہوئی ہوں یا نہیں۔ پھر آہستہ سے دروازہ کھولا اور اندر آ گئے۔ میں نے جان بوجھ کر نہیں بلایا۔ صرف اسی لیے کہ دیکھوں کرتے کیا ہو! (ایک جماہی لیتی ہے) اتنی رات کو آئے۔ باہر جھکڑ ہے، آندھی ہے۔ شیر کا کلیجہ کانپتا ہے اس موسم میں اور ایسی اندھیری رات میں! تم اتنی دیر تک کرتے کیا رہتے ہو۔ میں بھی تو سنوں! اتنا کیا کام رہتا ہے؟ بینک پانچ بجے بند ہو جاتا ہے۔ اوور ٹائم کے بھی اپنے اصول ہیں... تم ہی نے تو بتایا تھا کہ دو گھنٹے سے زیادہ ایک دن میں اوور ٹائم کا اندراج نہیں ہو سکتا... گویا کل سات بجے تک بینک میں کام ہو سکتا ہے۔ پھر اس کے بعد اگر ایک گھنٹہ سیر یا تفریح کے لیے بھی نکال لیا جائے، تو آٹھ بجے تک... میں کہتی ہوں، تم اندر کر کیا رہے ہو؟ جواب کیوں نہیں دیتے؟ منہ سی تو نہیں لیا ہے تم نے؟ اب اگر بولوں تو میں سودائن۔ نہ بولوں تو گھر کی گائے... لیکن گائے بھی تو دانہ پانی چارہ گھاس مانگتی ہے۔ نہ دو تو بولتی ہے۔ اپنے لیے مانگتی ہے۔ اپنے بچھڑے کے لیے مانگتی ہے... اور ادھر یہ حال ہے کہ چھوٹو کے کپڑے پھٹ گئے ہیں تو نئے لانے کے لیے روپے نہیں۔ ڈالی بیٹے کے لیے سویٹر بننا ہے تو اون نہیں ہے۔ روپے گھر میں ہوں تو یہ سب چیزیں آئیں۔ تنخواہ

ای — ۱/۹۲، سیکٹر ۱۴، چنڈی گڑھ ۱۶۰۰۱۴

ٹوٹ ٹوٹ کر آتی ہے۔ کبھی پچاس روپے، کبھی ساٹھ روپے۔۔۔ کبھی مانگنے پر دس بیس روپے نکال کر دے دیتے ہو۔ سرکاری بینک ہے۔ آخر دیوالہ تو نکلنے سے رہا۔۔۔ اور ہاں، یاد آیا۔ یہ بینک سے چوری والا قصّہ کیا ہے؟ مجھے تو تم باہر کی کوئی بات ہی نہیں بتاتے! رام ناتھ کا چھوٹا بھائی آیا تھا۔ تم سے ملنا چاہتا تھا۔ بتا رہا تھا کہ رام ناتھ خود بہت پریشان ہے۔ پولیس ابھی تک پتا نہیں لگا سکی کہ کس کا کام ہے۔ بینک سے چوری نہ دیکھی، نہ سُنی۔۔۔ ہے رام، نہ معلوم کیسا زمانہ آگیا ہے! (باہر سے بجلی کی چمک اور پھر کڑک) لو، بجلی کڑکنے لگی۔۔۔ میرا تو کلیجہ دہلتا ہے، اور تم ہو کہ کوئی اثر ہی نہیں ۔۔۔ بھئی میں تو سوتی ہوں۔۔۔ بتی بجھا دو اور سو جاؤ! (منہ رضائی کے اندر کر لیتی ہے) آخر کب تک باتیں کرتی رہوں۔ ایک تم ہو کر اندر کے کمرے میں ٹہلتے جاتے ہو اور جواب تک نہیں دیتے۔ (رضائی ہٹا کر) ہاں، یاد آیا۔ آج مہینے کی پچیس تاریخ ہے۔ بنیے کا آدمی آیا تھا۔ روپے مانگتا تھا۔ گپتا کی بیوی مکان کے کرائے کا تقاضا کر رہی تھی۔ آخر کب تک کوئی انتظار کرے! تین ماہ ہونے کو آئے۔ انھیں ایک پھوٹی کوڑی تک نہیں دی۔۔۔ وہ تو میری ساکھ بنی ہوئی ہے رکھ رکھاؤ ہے جو لوگ ـــــ اُونچی آواز میں تقاضا نہیں کرتے۔ عزت ــ بنی ہوئی ہے ـــــ کوئی اور ہوتا تو کب ــــ کا مکان خالی کرنے کو کہہ چکے ہوتے۔۔۔ رام ناتھ کا بھائی بہت پریشان تھا۔ کہتا تھا کہ یہ بینک کی چوری بہت سنگین معاملہ ہے۔ دو لاکھ روپے سیف لاکر میں ہی گنتی میں کم ہیں۔ وہ تم سے مل کر کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔۔۔ ہے تو کسی اندر کے آدمی کا ہی کام۔۔۔ کہہ رہا تھا، باہر کا آدمی سات تالوں کے اندر سے رقم نکال کر کیسے لے جا سکتا ہے؟ اور پھر سیف کی چابیاں تو دو الگ الگ آدمیوں کے پاس رہتی ہیں، تمھارے پاس اور رام ناتھ کے پاس ۔۔۔ (باہر سے بجلی کی چمک، کڑک اور جھکڑ کا شور) اُف کتنی تیز آندھی ہے۔ پیپل کے پتے شائیں شائیں کر رہے ہیں۔ میں کہتی ہوں آج دیوتا لوگ سخت غصے میں ہیں۔ ضرور کسی پر مصیبت آئی ہے۔ ضرور کسی گھر کی تباہی ہوگی!۔۔۔ (ذرا رک کر) منّی کو رضائی میں اچھی طرح سے ڈھک دو اور اب سو جاؤ۔ بتی بجھا دو۔ کل اتوار ہے۔ چھٹی کا دن۔ دفتر جانا نہیں ہوگا۔ میں بھی ذرا مندر تک جاؤں گی۔ تم بچوں کو دیکھنا۔ یہاں تو گھر گرہستی میں ایک گھڑی کا وقت بھی نہیں ملتا کہ سگے سمبندھیوں سے ہی مل لیا جائے۔ شاردا کی شادی ہے۔ کچھ نہ کچھ تو بھیجنا ہی پڑے گا۔ بہن جی کے بچے کا منڈن بھی تو ہونا ہے اگلے ماہ۔۔۔ تم کوئی ٹیوشن ہی کر لو تو دو چار سو روپے مل جائیں۔ آخر کب تک گزارہ چلے گا ایسے ہی؟ (اندر سے فرش پر ٹہلنے کی آواز آتی ہے) تم سو گئے نہیں کیا؟ رات گہری ہوتی جا رہی ہے۔ باہر بارش ہے۔ ہے بھگوان، کبھی کبھی تو میں سوچتی ہوں، ایسی راتوں میں اُن لوگوں کا کیا ہوتا ہوگا جو پھونس کی جھگی جھونپڑیوں میں رہتے ہیں؟ وہ لولے، لنگڑے بھکاری جو ریل کے پل کے پاس بیٹھتے ہیں۔ جن کے پاس جھونپڑیاں بھی نہیں ہیں۔ وہ ایسی کالی، اندھیری، طوفانی رات کیسے کاٹتے ہوں گے! اب کے تنخواہ ملے تو میں انھیں روٹیاں بانٹنے جاؤں گی، بیرے کاکو کے سر کے صدقے، میں یتیم خانے میں بھی کچھ کپڑے بھیجوں گی! ہے رام، وہ بچے کس طرح گزر بسر کرتے ہوں گے۔ جن کے سروں پر ماں باپ کا سایہ نہیں ہے۔۔۔ نیند تو اب جیسے آنکھوں سے اُڑ ہی گئی ہے۔ بُرے بُرے خیال آ رہے ہیں۔ ڈالی بیٹے کے دست پیچش ٹھیک ہو جائیں، نیچے کے چار دانت نکال لے تو چھ سات ماہ تک اس کے منڈن کی رسم بھی کر ڈالیں۔ خوب دھوم دھڑکے سے۔ جیسے کاکو کا کیا تھا، ویسے نہیں! چاہے قرض ہی کیوں نہ لینا پڑے۔ میں تو اپنی دو چھوٹی بہنوں کو ضرور بلواؤں گی۔ انھیں بیاہے ہوئے دو برس ہونے کو آئے۔ آکر رہیں گی تو کچھ لے جائیں گی۔ اُن کا حق ہے۔ چھوٹی بہنوں کا حق ہوتا ہے۔ اُن کے سسرال میں ہماری نیک نامی ہوگی۔۔۔ بارش ابھی ہو رہی ہے۔ کھڑکیاں ٹھیک طرح بند ہیں نا! (اُٹھ کر بیٹھتی ہے) دیکھ ہی لوں (دیکھتی ہے) ٹھیک بند ہیں۔ دوسری کھڑکی کی چٹخنی کا پتا نہیں، کب کھل جائے۔ کھل گئی تو کمرے میں آفت آ جائے گی۔ (پھر لیٹ جاتی ہے) میں کہتی ہوں تم کیا صبح تک یونہی ٹہلتے رہو گے؟ تم بتی بجھا کر سو جاتے تو مجھے بھی کچھ آرام ملتا۔ (اندر سے برتن فرش پر رکھنے اور اسٹول گھسیٹنے کی آواز آتی ہے) کھانا کھا لیا؟ اچھا کیا۔ برتن کونے میں رکھ دو۔ پانی کا گلاس اسٹول پر رہی ہے۔ اسے مت کھینچو۔ گر جائے تو فرش پر پڑی ہوئی سب چیزیں بھیگ

جائیں گی . . . اب سو جاؤ ۔ رات ابھی بہت پڑی ہے ۔ صبح اتوار ہے ۔ جا کر بال کٹوا آنا تمھارے بال کتنے بڑھ گئے ہیں! دو دِنوں سے شیو بھی نہیں کی تم نے؟ نہ جانے تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ یہ میں کئی دنوں سے دیکھ رہی ہوں ۔ شادی سے پہلے دو برسوں میں بھی تم یوں ہی کرتے تھے ۔ جب تمھیں سٹّہ بازار جانے کی بُری عادت پڑ گئی تھی . . . (چند لمحے خاموشی ۔ پھر تیزی کے ساتھ) میں نے کہا، کہیں پھر تو وہی عادت نہیں پڑ گئی؟ بولو نا! جواب دو! کہیں بینک سے چھٹّی کے بعد وہاں تو نہیں جاتے؟ (خاموشی . . . چند لمحوں کے بعد) نہیں، میں بھی کتنی مُورکھ ہوں . . . اب تم اُس بازار میں جاؤ گے بھی تو کیسے؟ روپے کہاں ہیں تمھارے پاس سٹّہ کھیلنے کے لیے؟ بغیر روپے کے تو بھگوان بھی نہیں مِلتا ۔ سٹّہ کھیلنا تو دُور کی بات رہی ۔ ہائے رام، وہ دن یاد آتے ہیں تو کلیجہ مُنہ کو آتا ہے ۔ چھاتی دہلتی ہے ۔ ماں باپ کے چھوڑے ہوئے تین لاکھ نقد، میرے مائیکے سے لائے ہوئے روپے، زیور اور کپڑے، سبھی تو اُس پاپی بازار کی بھینٹ چڑھ گئے تھے! آدھی آدھی رات کے بعد آتے تھے ۔ تو شراب کے نشے میں دھت، بال روکھے، داڑھی بڑھی ہوئی ۔ مُنہ پر کالک . . . شراب اور سگریٹ کی مِلی جُلی بُو سے میرا تو سر چکرا جاتا تھا! اُلٹی آ جاتی تھی . . . اور جب مجھے پتا چلا تھا کہ تم دوستوں کے ساتھ گپ بازی میں وقت نہیں گنواتے ۔ سٹّہ کھیلتے ہو تو میں کتنا روئی تھی! میں ماں بننے والی تھی اُن دِنوں . . . اب تو وہ دِن اس طرح گزر گئے ہیں، جیسے خواب ہوں یا بھیانک ڈراؤنے بھوت ہوں . . . شکر ہے، وہ دن گزر گئے ۔ مجھے تو یہ رُوکھی سُوکھی پسند ہے ۔ سب کچھ لٹانے کے بعد بھی اگر ٹھیک راستہ مِل جائے تو اچھا ہے . . . ہے بھگوان، تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے . . . اِس سٹّہ بازار نے کتنے گھر تباہ کیے ہیں بچپن میں کہانیاں پڑھا کرتے تھے ۔ سٹّہ بازوں کے بچّے یتیم رہ جاتے ہیں ۔ جب ہار جاتے ہیں تو گلے میں پھندا ڈال لیتے ہیں ۔ آگے پیچھے کی بالکل نہیں سوچتے . . . (اندر سے لگاتار کھٹکے کی آوازیں) کیا کر رہے ہو؟ میں کہتی ہوں، ٹہلنا ہو تو کمرے کے ایک طرف ٹہلو . . . یہ چھت کے کُنڈے کی رسّی بڑی مشکل سے ڈالی ہے ۔ نکل گئی تو کل تمھیں پھر لٹکانی پڑے گی ۔ پلنگ پر اسٹول رکھ کر بڑی مشکل سے باندھی ہے ۔ کل پالنا لٹکا دوں گی تو منّا آرام سے پڑا رہے گا ۔ سارا دن تو روتا رہتا ہے ۔ (بجلی کی تیز چمک اور کڑک) اب سو ہی جاؤ تو اچھا ہے ۔ (رضائی مُنہ پر کر لیتی ہے) میں بھی سونے لگی ہوں (اندر سے لگاتار کھٹکے کی آوازیں سُنائی پڑتی ہیں) کیا کر رہے ہو؟ (ایک دم رضائی اٹھا کر اُچھل پڑتی ہے) ہے بھگوان، یہ کیا؟ (اندر سے اسٹول کے گرنے اور ایک لمبی، دم بدم گھٹتی ہوئی چیخ کی آواز آتی ہے ۔ اس کے ساتھ ہی کھڑکی کھُل جاتی ہے اور ہوا کا ریلا طوفان کی طرح کمرے کی چیزوں کو تتر بتر کر دیتا ہے ۔ اندر کے دروازے کو پیٹتی ہے) دروازہ کھولو! دروازہ کھولو! (چیختی ہے ۔ بال نوچتی ہے) او 'لوگو' میں لُٹ گئی! میرا سہاگ! میرے بچّے! (دروازہ زور زور سے پیٹتی ہے ۔ دروازے کے ساتھ سر ٹکراتی ہے ۔ پھر چیختی ہے) او لوگو! کوئی مدد! کوئی مدد!"

(کمرے میں طوفان کا شور ۔ بچّوں کے رونے اور عورت کے چیخنے کی آوازیں ۔ زینے پر دھڑا دھڑ لوگوں کے چڑھنے کا شور) ۔

—— پردہ ——

نظمیں

میں الہامی صحیفوں کو لبوں سے چوم کر پھر دیکھتا ہوں

(مشرقی یوروپ کے واقعات سے متاثر ہو کر)

خزاں دیدہ درختوں کی شکیبائی کا ساماں کس سے ممکن ہے؟
میں الہامی صحیفوں کو لبوں سے چوم کر پھر دیکھتا ہوں!

وہ آئے گی!
پہاڑوں کی بلندی سے
چمکتا اِستوائی آفتاب اُس کا نشانِ رہ گزر ہو گا
وہ آئے گی!
ہوا کو کس نے روکا ہے!
ہوا معصوم بچوں کا تبسم بن کے آئے گی
مرے بیٹے، ہنسو، کلکاریاں مارو
گھڑی کو توڑ ڈالو
پھینک دو ساری کتابوں کو
ہوا کو کس نے روکا ہے؟
ہوا کو کون روکے گا
ہوا کے زیر و بم میں نوکِ خنجر کون گھونپے گا؟

میں الہامی صحیفوں کو لبوں سے چوم کر پھر دیکھتا ہوں،
ہمارے عہد کا مقسوم پورا ہو چکا ہے ـــ

صہبا وحید

سیکٹر ۴ ۱۱۴۴/۱۲ آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۲

نئے پرانے چہروں کے درمیان

نئے پرانے ہزاروں چہرے
نہ جانے کس شخص سے ہیں منسوب
کون جانے؟
تمام چہروں سے اجنبیت ٹپک رہی ہے
مری نگاہیں کسی کو پہچانتی نہیں ہیں
مگر مشابہ ہیں میرے چہرے سے سارے چہرے
تو پھر یہ چہرے مرے لیے اجنبی نہیں ہیں
مرا اور ان کا اٹوٹ رشتہ
ازل سے ہے تا ابد رہے گا
تو یہ تماشا نگاہ کا ہے
نگاہ تو اِک فریبِ دائم میں ہے مقیّد
کبھی ندی کو سراب جانے
کبھی چمکتے سراب کو اِک وشال ساگر
تو یہ بھی اِک خوف ہے ـــــ کسی دن
مری نگاہیں ـــ مجھے ہی پہچاننے سے
اِنکار کر نہ جائیں

شاہد کلیم

دودھ کٹورہ، آرہ ۸۰۲۳۰۱

شہاب الدین انصاری

رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف گریٹ برٹین اینڈ آئرلینڈ

علم کی دُنیا میں تحقیق و جستجو کے کارواں کو آگے بڑھانے میں یونیورسٹیوں کے ساتھ علمی انجمنوں نے جو قابلِ ذکر رول ادا کیا ہے اُسے فراموش کر دینا علمی دیانت داری سے پہلو تہی کرنے کے مترادف ہوگا۔ سچ تو یہ ہے کہ علم کی ترویج میں ان انجمنوں نے نہ صرف تعاون کیا ہے بلکہ اکثر لحاظ سے یہ یونیورسٹیوں پر سبقت لے گئی ہیں۔ علمی تحقیق کے نتائج کی اشاعت کے لیے ایک رسالہ جاری کرنے کا خیال سب سے پہلے رائل سوسائٹی کی تولیت میں ہی عمل کا جامہ پہن سکا اور روداد (Transactions) کے نام سے پہلا علمی رسالہ ۱۶۶۵ء میں انگلینڈ سے شایع ہوا۔ ان انجمنوں نے یونیورسٹیوں کو تحقیقی کاموں کے لیے ترغیب دلائی ہے، مالی امداد فراہم کی ہے، اور بیش بہا مراجع و مآخذ شایع کیے ہیں۔

ماضی قریب میں ان علمی انجمنوں نے کس طرح یہ خدمات انجام دی ہیں اس کا اندازہ ہمیں رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف گریٹ برٹین کی تاریخ اور کارناموں پر نظر ڈالنے سے ہوتا ہے۔ ۱۸۲۳ء میں یہ سوسائٹی لندن میں مشرقیات کے مطالعہ کے واسطے قایم ہوئی۔ مشرقی علوم کا مطالعہ کرنے کے لیے دُنیا میں سب سے پہلی انجمن ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال ہے جو ۱۷۸۴ء میں قایم ہو چکی تھی لیکن اپنے دائرہ اثر، اشاعتی پروگرام اور تحقیق کے کارناموں کو آگے بڑھانے میں کامیابی کے اعتبار سے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی حیثیت مقدم ہے۔

سوسائٹی کے قیام کا خیال پہلی بار ۸ جنوری ۱۸۲۳ء کو لندن کی ایک علمی مجلس میں آیا جہاں یہ سوچا گیا کہ ایک ایسی سوسائٹی قایم کی جائے جس میں "ہندوستان نیز کیپ گڈ ھوپ کے مشرق میں واقع ممالک میں سائنس، ادب اور فنون کی ہمت افزائی کی جائے" اس سلسلے کی ایک دوسری میٹنگ میں چارلس وٹیکن ولیمس ون کو سوسائٹی کا صدر نامزد کیا گیا۔ ولیمس ون اس وقت کے برطانوی نظام حکومت میں وزیر برائے امور ہند کے مساوی عہدے پر مامور تھے۔ سوسائٹی کی تیسری میٹنگ ۱۵ مارچ ۱۸۲۳ء کو ہوئی جس کی صدارت ہنری تھومس کولبروک کر رہے تھے۔ کولبروک جلدی ہی ہندوستان میں ملازمت کر کے لوٹے تھے۔ اپنے ہندوستان کے دوران قیام وہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے ۱۸۰۶ء تا ۱۸۱۵ء تک صدر رہ چکے تھے۔ وہ نہ صرف ہندوستان کی تاریخ و ثقافت سے پورے طور پر باخبر تھے بلکہ سنسکرت زبان پر عبور حاصل کر لینے کی بدولت یورپ کے ماہرین مشرقیات میں شمار کیے جاتے تھے۔ سوسائٹی کو شاہی فرمان جون ۱۸۲۳ء میں حاصل ہوا۔

اپنے ابتدائی دَور میں سوسائٹی نے جو وقار و مرتبہ حاصل کر لیا تھا اس کا کچھ اندازہ سوسائٹی کے اراکین کے ناموں سے ہوگا۔ چنانچہ ڈیوک آف ولنگٹن، لارڈ کیننگ سر رابرٹ پیل، سابق گورنر جنرل لارڈ ولیم بنٹنگ، لارڈ ایمہرسٹ، سابق وائسرے ارل لٹن، مارکوئس رپن، مارکوئس کرزن، شاہ بیلجیم، شاہ سویڈن، امریکہ کے سابق صدر مارٹن وان برین، سر رابندر ناتھ ٹیگور، ٹراونکور، بڑودہ، بردوان، میسور، پٹیالہ، گوالیار، جے پور، جودھپور، جھالوار، اودے پور، بیکانیر کے مہاراجگان، نواب صاحب رام پور، کوچین، یالار کی میڈی کے راجگان اور ٹھاکر صاحب گونڈل اس کے ممبروں میں شامل تھے۔ شاہ اودھ اور راجہ تنجور کو سوسائٹی نے اپنا اعزازی ممبر منتخب کیا تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ اور شاہزادہ ایران عباس مرزا بھی سوسائٹی کے اعزازی ممبران میں شامل تھے۔ شروع کے دَور میں خواتین سوسائٹی کی ممبر نہیں تھیں لیکن تیس سال بعد مسز کر پہلی خاتون ممبر قبول کی گئیں۔ صدی کے ختم ہونے تک سوسائٹی کے ممبران میں سترہ خواتین تھیں۔

رائل ایشیاٹک سوسائٹی اپنے

ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری، جامعہ ملیہ اسلامیہ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

مقاصد کی ترویج کے لیے درج ذیل پانچ طریقے اپناتی ہے۔

۱۔ میٹنگ منعقد کر کے جس میں علمی موضوعات پر گفتگو اور بحث و مباحثہ ہوتا ہے۔

۲۔ کتابوں اور رسالہ کی اشاعت کے ذریعہ۔

۳۔ کتب خانہ کے قیام کے ذریعہ۔

۴۔ مشرقیات کے میدان میں علمی کارناموں کے لیے میڈل اور انعامات تقسیم کر کے اور۔

۵۔ علمی کاموں کی ترغیب کے لیے اخلاقی سطح پر اُن کی حمایت کے ذریعہ۔

سوسائٹی کی میٹنگ مہینہ میں ایک بار ہوتی ہے جس میں لندن میں موجود ممبران شریک ہو کر علمی گفتگو کرتے ہیں اور سوسائٹی کے کاموں کو آگے بڑھانے کی منصوبہ بندی کرتے ہیں۔

رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے اپنے شروع کے دور میں اشاعتی پروگرام کو اپنے جلسوں کے روئداد کی اشاعت تک محدود رکھا، جو غیر متعین وقفہ سے شائع ہوتی تھیں۔ ان میں ایچ۔ ٹی کولبرک، جیمس ٹاڈ اور سر جان میلکم وغیرہ کے مضامین شایع ہوتے تھے سب سے پہلا مضمون جو روئداد میں شایع ہوا وہ چین پر تھا لیکن بعد کے سالوں میں شایع مضامین میں اکثریت ہندوستان سے متعلق مضامین کی ہے۔ اپنے دائرہ کے اعتبار سے یہ مضامین سماجیات، طبیعیات، نیچر اور طب جیسے موضوعات پر ہوتے ہیں۔ ۱۸۳۴ء میں سوسائٹی نے ایک رسالہ شایع کرنا شروع کیا۔ اس کی وقفہ اشاعت تین مہینہ تھی اس کے پہلے شمارہ میں ایک مضمون "ہندوؤں کے نظام تعلیم پر نظر" کے عنوان سے تھا۔ اس کے علاوہ "دریائے سندھ پر مقالہ" "سورت میں ایک قابل ذکر اسپتال برائے حیوانات" وغیرہ مضامین بھی تھے۔ سوسائٹی کے رسالہ میں کسی خاتون کے مضمون کی ابتدا مسز میبل بوڈے کے مضمون "بودھی اصلاحات کی خواتین لیڈر" سے ہوتی ہے جو ۱۸۹۳ء کے رسالہ میں شایع ہوا تھا۔ رسالہ کی اشاعت کے پہلے سو برسوں میں صرف ہندوستان پر شایع مضامین کی تعداد دوسرے تمام ملکوں پر شایع مضامین کی مجموعی تعداد کے برابر رہی ہے۔ آج کل یہ رسالہ سال میں دو بار شایع ہوتا ہے۔

سوسائٹی کی کتابیں پانچ اشاعتی سلسلوں کے تحت شایع ہوئی ہیں۔ ہر ایک اشاعتی سلسلہ کے لیے علیحدہ ٹرسٹ قایم کیا گیا، جس نے مالی امداد فراہم کی ہے۔ ان میں قدیم ترین مشرقیات ترجمہ فنڈ ہے جو ۱۸۲۸ء میں قایم ہوا اور جس کے تحت ۱۸۷۹ء تک ۱۷ کتابیں شایع کی گئیں کچھ مدت کے التوا کے بعد اشاعت کا سلسلہ دوبارہ ۱۸۸۸ء میں شروع ہوا جس کے تحت ۴۵ مزید کتابیں شایع ہو چکی ہیں۔ مشرقیات کے متن کی اشاعت کا فنڈ ۱۸۴۱ء میں قایم ہوا اور اس کے تحت علم مشرقیات کی معروف تصانیف کے مخطوطات کی تدوین کر کے انھیں شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ آیندہ آٹھ برسوں میں اس فنڈ کی مدد سے عربی، فارسی، سنسکرت اور سیریائی زبانوں کی سترہ کتابوں کو شایع کیا گیا۔ انعامی اشاعتی فنڈ کا مقصد ہندوستان کی تاریخ و جغرافیہ کے موضوعات پر اعلا سطحی کتابوں کی اشاعت تھا۔ اس فنڈ کے لیے رقم مدراس صوبہ میں ملکہ وکٹوریہ کی گولڈن جوبلی تقریبات کے سلسلے میں جمع کی گئی تھی۔ اس سلسلہ کی سب سے پہلی کتاب ۱۹۰۹ء میں شایع ہوئی اور اب تک ۲۲ کتابیں شایع ہو چکی ہیں۔ ۱۹۰۴ء میں مونوگراف اشاعتی فنڈ کا قیام عمل میں آیا اور رائل جغرافیائی سوسائٹی کے تعاون سے اس سلسلہ کی پہلی کتاب ۱۹۰۹ء میں شایع ہوئی۔ اس کلام پر "مشرقی ایشیا کے جغرافیہ پر بطلیموس کی تحقیقات" ہے۔ بدھ مذہب پر ایک کتاب بی سی لا فنڈ کے تحت اور ۲۹ کتابیں جیمس آر فورلانگ فنڈ کے تحت شایع ہوئی ہیں۔ ان مستقل اشاعتی سلسلوں کے تحت شایع مطبوعات کے علاوہ بھی سوسائٹی نے کئی اہم کتابیں شایع کی ہیں چنانچہ فارسی مخطوطات کے ماہر سی۔ اے اسٹوری کی معروف تصنیف "فارسی ادب: ایک سوانحی و کتابیاتی جائزہ" اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جس کی اب تک تین جلدیں شایع ہو چکی ہیں۔

علمی کاموں کی پیش رفت میں کتب خانہ کی ضرورت و اہمیت کے پیش نظر ایک کتب خانہ قایم کرنے کا منصوبہ سوسائٹی کے پیش نظر پہلے دن سے ہی رہا ہے، لیکن مالی وسائل اس راہ کی بڑی رکاوٹ ر۔

ہیں۔ چنانچہ سوسائٹی کو اپنے ذخیرہ کتب کے لیے ان عطیات پر اکتفا کرنا پڑا جو اس کے ابتدائی دَور میں اراکین نے پیش کیے۔ کتب خانہ میں ہندوستان سے متعلق ذخیرے کی ابتدا کرنل جیمس ٹاڈ کے اپنے ذاتی ذخیرہ کے عطیہ سے ہوتی ہے۔ ٹاڈ سوسائٹی کے پہلے لائبریرین ہندوستان سے واپسی پر اپنے ساتھ قیمتی مخطوطات لائے ان میں بیشتر راجستھان کی تاریخ کے لیے ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان مخطوطات میں مہابھارت کا ایک نادر مخطوطہ بھی شامل ہے۔ انھیں یہ مخطوطات مہارانا اُودے پور نے دیے تھے۔ ۱۸۳۳ء میں کیپٹن ہارکنیس سوسائٹی کے کُتب خانہ کے لیے ۲۹ تاڑ کے پتّوں پر لکھے ہوئے مخطوطات دیے۔ یہ مخطوطات سنسکرت، تامل، تلگو اور ملیالم زبانوں میں تھے۔ بی۔ ایچ ہاجسن نے اپنے نیپال کے دَوران قیام میں جمع کیے ہوئے ۷۹ سنسکرت زبان کے مخطوطے کُتب خانہ کو پیش کیے۔ ۱۹۳۶ء میں سی ایم وِہش نے مدراس سے جمع کیے ہوئے ۲۰۰ مخطوطات کا ذخیرہ کُتب خانہ میں جمع کرا دیا۔ ۱۸۴۹ء میں بھرت پور پر قبضہ کے دوران قلعہ سے ملے مخطوطات بھی یہاں موجود ہیں۔ کُتب خانہ میں فارسی کے مخطوطات کی تعداد ۳۵۰ ہے۔ ان میں شاہ نامہ کا وہ نسخہ جو ہرات میں شاہ رُخ کے لیے تیار کرایا گیا، شاہ اَودھ کی پیش کی ہوئی لُغت ہفت قلزم کا نسخہ اور رشید الدین کی جامع التواریخ کا نسخہ شامل ہیں۔

میوزیم بھی تھا جس میں نوادرات اور تاریخی اعتبار سے غیر معمولی اہمیت کی اشیا اکٹھا کی گئی تھیں۔ میوزیم میں جیڈ پتّھر کا بنا ہوا وہ پیالہ بھی تھا جو کبھی جہانگیر بادشاہ کے استعمال میں رہ چُکا تھا۔ سوسائٹی نے میوزیم کا جملہ سامان انڈیا آفس کو منتقل کر دیا۔

مشرقیات کے مُطالعہ کی ترغیب:

ایشیاٹک سوسائٹی نے انگلستان میں مشرقیات کے مطالعہ کو وسعت دینے میں نہایت اہم رول ادا کیا ہے۔ اس کام کے لیے کتابوں کی اشاعت کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ ماہرین مشرقیات کو ان کے کام میں درکار سہولت فراہم کرنا، حکومت کو آثاریات کی کُھدائی کے لیے آمادہ کرنا، قدیم آثار کو محفوظ رکھنا، میوزیم اور گیلری کا قیام، یونیورسٹیوں میں مشرقیات کے مُطالعہ کے واسطے بند و بست کرنا اور سب سے اہم لندن یونیورسٹی میں مشرقیات کے مُطالعہ کے واسطے ایک اِدارہ کے قیام کی کوشش میں تعاون دینا شامل ہیں۔ ۱۸۷۶ء میں تاریخ طبری کے ڈی گوئجے ایڈیشن کی طباعت اور رانا ڈے کی انگریزی، مراٹھی ڈکشنری کی طباعت میں حکومت سے مالی امداد کا بند و بست کرانا نیز پالی، انگریزی ڈکشنری کی اشاعت کا مالی خرچ برداشت کرنا چند مثالیں اشاعتی فروغ کی ہیں۔ سوسائٹی نے مشرقی زبانوں کے صحیح تلفّظ کی ترویج کے پیشِ نظر نشان تلفّظ کا تعیّن کرایا اور سنسکرت کو رومن میں لکھنے کے طریقے کے تعیّن کے

ہندوستان کے قدیم تاریخی ورثہ کا تحفّظ بھی سوسائٹی کے پیشِ نظر رہا ہے چنانچہ سوسائٹی کی تحریک پر ۱۹۰۲ء میں ایک بین الاقوامی ہندوستان تحقیق فنڈ کا قیام عمل میں آیا۔ مشرقی علوم کے کتابی ذخیرہ کے تحفّظ کی سوسائٹی کی کوششوں کی ایک مثال ایسٹ انڈیا کمپنی کے ختم ہونے ۱۸۶۰ء میں اس کے کتابی ذخیرہ کی انڈیا ہاؤس لائبریری میں منتقلی کی وکالت ہے۔ سوسائٹی کی ہی کوششوں سے ۱۸۶۷ء میں کیمبرج یونیورسٹی میں سنسکرت کے مطالعہ کے واسطے ایک پروفیسر کی اسامی قایم ہوئی۔

عِلمی دنیا میں لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز کی مشرقیات میں تعلیم و تحقیق کے لیے جو حیثیت ہے وہ محتاج تعارف نہیں۔ ہندوستان میں لسانیات، ادب، تاریخ اور سماجیات کے میدان میں کام کرنے والا کون ہے جو اس اِدارہ سے کسی نہ کسی شکل میں مستفید نہیں ہوا ہے لیکن شاید کم لوگوں کو اس بات کا عِلم ہوگا کہ اس ادارہ کے قیام کے لیے کوشش کی ابتدا سوسائٹی ہی کے پلیٹ فارم سے ۱۸۸۷ء میں ہوئی تھی اور تیس سال کی جد و جہد کے بعد ۱۹۱۷ء میں اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز کے نام سے ایک اِدارہ لندن یونیورسٹی میں قایم ہوا۔

ایشیاٹک سوسائٹی نے لارڈ میکالے کی لسانیاتی نوآبادیات کے تصور کی مُکمل حمایت سے نہ صرف احتراز کیا بلکہ ۱۸۳۶ء

زبانوں میں طباعت میں مالی امداد دینے کی پالیسی کو ختم کیا تو سوسائٹی نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ ہندوستان کے جغرافیائی علاقوں کے ناموں کو بدلنے کی روایات کے خلاف بی۔ ایچ ہاجسن نے ایک مضمون لکھا اس مضمون کا پس منظر ہمالیہ کی سب سے بلند چوٹی کو ماؤنٹ ایورلیسٹ کا نام دینا تھا۔

پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے بعد سوسائٹی نے اپنے کاموں کے دائرے کو محدود کرنا شروع کیا اس کی ایک وجہ تو مالی وسائل کی کمی تھی دوسری وجہ یونیورسٹیوں میں مشرقیات کے مطالعہ کے لیے بڑھتی ہوئی سہولتیں تھیں۔ مضامین کے اعتبار سے سوسائٹی نے اپنی توجہ اب لسانیات، ادب اور تاریخ تک محدود کرلی ہے جغرافیائی دائرے کے اعتبار سے افریقہ اور آسٹریلیا سوسائٹی کے مطالعہ کی حدود میں نہیں رہ گئے لیکن اس کے ارکان کا دائرہ اب بھی بین الاقوامی ہے چنانچہ جہاں یورپ کے ممبروں کی تعداد ۷۷ ہے وہاں برِصغیر ہندوستان سے ۱۲۹ افراد سوسائٹی کے ممبر ہیں۔ ممالک متحدہ امریکہ میں سوسائٹی کے ممبروں کی تعداد ۱۱۲ ہے۔

آج کے دور میں بھی جبکہ یونیورسٹیوں نے مشرقیات کی تعلیم و تحقیق کے کاموں کو اپنے دائرے میں سمیٹ لیا ہے ایشیاٹک سوسائٹی جیسی انجمنوں کے قایم رکھنے کی ضرورت باقی ہے۔ مالی وسائل میں پورے طور پر حکومت کی دست نگر ہونے کی بدولت اپنے تحقیق کے موضوعات سے انتخاب میں یونیورسٹیوں کو وہ آزادی نصیب نہیں ہوسکتی جو ایسی خود اختیار انجمنوں کو حاصل ہے۔ مزید یہ کہ اس طرح کی علمی انجمنیں ایسے علمی مزاج کے افراد کے لیے جن کا تعلق کسی یونیورسٹی سے نہیں ہوتا کام کرنے کی سہولت فراہم کرتی ہیں، نئے کام کی ترغیب دلاتی ہیں اور علمی دُنیا میں انھیں وہ وقار حاصل کرنے میں معاون ہوتی ہیں جو اُن کا جائز حق ہیں۔

نوٹ: مضمون کی بیشتر معلومات سائمن اور ڈیگبی کی تصنیف: "رائل ایشیاٹک سوسائٹی" سے لی گئی ہیں۔

تیج بہادر

وہ بچّی

چھوٹے سے دروازے کو پار کرتے ہی میں نے سیڑھیوں کے اندھیرے میں دوست کی پیٹھ گم ہوتے دیکھی۔ سیڑھیاں ایسی تھیں کہ چڑھتے وقت بدن کو کافی آگے جھکانا پڑتا تھا۔ کوئی سایہ بڑی تیزی سے اندھیرے میں نیچے اُتر رہا تھا۔ جب تک میں سنبھلوں سایہ مجھے جھٹکا دے کر چہار سو پھیلے اندھیرے میں غائب ہو گیا اور میں اپنا توازن برقرار رکھنے کے لیے دیوار سے چمٹ گیا۔ سیڑھیوں کی گھٹی گھٹی فضا میں دیوار کی نم سطح چہرے پر بھلی محسوس ہوئی۔ ہاتھ سے چھوا تو گھن آئی شاید پان کی پیک تھی۔ میں اپنا چہرہ نوچ کے رہ گیا۔ کس جہنم میں میرا دوست مجھے کھینچ لایا ہے۔ جی میں آیا کہ واپس بھاگ جاؤں۔ لیکن ذہن میں کرید کرتی موہوم خواہش نے پیٹھ پھیرنے پر آمادہ نہ کیا۔ ذہن میں خیال جم گیا کہ جس ماحول سے دُنیا نفرت کرتی ہے۔ پرہیز کرتی ہے۔ وہ کیا ہے۔ کیسا ہے۔ نفرت کرنے کے قابل ہے یا نہیں ہے۔ دیکھا تو جائے۔

رُومال سے مُنہ پونچھتے ہوئے میں سیڑھیاں چڑھ گیا۔ سیڑھیاں اُوپر ایک کھلی چھت پر ختم ہو گئی تھیں۔ جس کے تین اطراف کمرے تھے اور چوتھی طرف دیوار... دیوار کے اُس طرف بھی شاید کوئی ایسی ہی چھت تھی۔ دیوار کے عین اُوپر ایک بہت بڑا بجلی کا لمپ پوری عریانیت سے چمک رہا تھا۔ جس کی تیز روشنی میں فرش پر پھیلے پان کی پیک کے لاتعداد دھبّے، کاغذ اور سگریٹ کے ادھ جلے ٹکڑے، مسلی بیڑیوں کے سرے چھینٹ جیسی بہار پیدا کر رہے تھے۔

کمروں کے دروازوں پر میلی چِٹی بانس کی چقیں تنی ہوئی تھیں اور دروازوں کے آگے بہت سارے لوگ اِدھر سے اُدھر اُدھر سے اِدھر گھوم رہے تھے۔ دھکم دھکا کر رہے تھے۔ کبھی ہنس دیتے۔ کبھی چلا اٹھتے اور کبھی کوئی فحش گالی فضا میں پرواز کر کے لمحہ بھر کے لیے سکتہ سا پیدا کر دیتی تھی۔ اور ساتھ ہی کوئی نسوانی قہقہہ گالی کا پیچھا کرتے ہوئے سکتے کو توڑ دیتا تھا۔ اتنی بھیڑ بھاڑ دیکھ کر میں بُری طرح سے گھبرا گیا۔ دوست بھی نہ معلوم کہاں گم ہو گیا تھا اِس طوفانِ بدتمیزی میں... کوئی میری طرف بڑھا میرے سامنے رنگین بُش شرٹ اور سفید پتلون میں ایک نوجوان مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا رہا تھا۔ چہرے سے بلا کی ملائمیت ٹپک رہی تھی۔ میں نے پہچاننے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ گھبراہٹ میں اپنے آپ کو پہچاننا مشکل ہو رہا تھا۔ بہر حال وہ مجھے غیبی سہارا دکھائی دیا۔

"جی... جی میرا دوست..." میں بغیر تمہید کے اُبل پڑا" آپ نے تو نہیں دیکھا کہ کہاں گیا۔ میں تو پریشان کہ کسی نے یکایک جھٹکے سے مجھے اپنی طرف کھینچا۔ اور میں بات ادھوری ہی چھوڑ کر اپنے آپ کو سنبھالنے پر مجبور ہو گیا۔ میرا دوست مجھے بڑی بے دردی سے اوپر ایک اور منزل کی جانب چڑھتی سیڑھیوں کی طرف گھسیٹ رہا تھا میں بدحواس ہو گیا۔

"بڑے بدتمیز ہو یار۔ کسی سے بات کرتے وقت یوں کھینچا جاتا ہے۔ کچھ تو لحاظ کیا ہوتا میری پوزیشن کا۔"

دوست ہنس دیا "تم اُسے جانتے ہو کیا؟"

"نہیں تو... شاید وہ مجھے جانتا ہو۔ بے چارہ خود آ گیا تھا بات کرنے کے لیے۔"

"وہ دلال ہے..." میرے دوست نے کہا اور میں ایک بار پھر گرتے گرتے رہ گیا۔ وہ... اور دلال... میرے ذہن نے کام کرنا چھوڑ دیا۔

"دیکھ کے چلو... آگے سیڑھیاں ہیں" دوست نے سمجھایا اور میں چُپ چاپ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ سیڑھیوں کے موڑ پر ایک چھوٹی سی پان سگریٹ کی دُکان دیوار میں نکالی گئی تھی جس میں جلتا گرد سے اٹا بجلی کا لمپ سیڑھیوں کے اندھیرے میں ویران سی روشنی بکھیر رہا تھا۔

سیڑھیاں اُوپر ایک اور چھت سے منسلک تھیں لیکن یہ چھت نیچے والی چھت سے ذرا چھوٹی تھی۔ یہاں بھیڑ بھاڑ بھی زیادہ

۷، پوربی مارگ، وسنت وہار، نئی دہلی ۱۱۰۰۵۷

نہ تھی۔ فرش بھی قدرے صاف تھا اور چاروں
طرف کمروں کے دروازوں پر میلی چیتھڑوں کے
بدلے رنگین پردے آویزاں تھے۔ کہیں سے
ہارمونیم کی ہلکی سی آواز گھٹے ماحول میں مٹھاس
گھولنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

"یہ ہے میرا یار..." میرے دوست
نے کسی سے کہا۔ میں نے نگاہیں اٹھا کے دیکھا
اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ سامنے عورت نہ تھی
کوئی مورتی تھی جسے سنگتراش نے لال ساڑی
میں ہی ملبوس تراشا تھا۔ لال ساڑی میں
وہ مجسّم زندگی تھی جسے شاید یہ دلکش خم،
قوس، زاویے مُقید کیے ہوئے تھے۔ کانوں
میں ٹمٹماتے جھمکے ہر جنبش پر مچل مچل جاتے۔
پاؤں میں کالے سینڈل گورے رنگ کو واضح
کر رہے تھے۔ میں سانس روکے منتظر رہا۔

گلاب کی کلی چٹکنے لگی "یہ بچّے تو نہیں
لگتے..." کلی چٹک کر پھول بن گئی۔ ملگجے
میں موتیوں کی لڑی بکھر گئی۔ میرا ہاتھ پکڑا
گیا۔ پردہ ہٹا کے مجھے اندر لے جایا گیا۔
واقعی میں بچہ تھا شاید... !

کمرے کی دیواروں پر پیلا ڈسٹمپر تھا۔
جس کے تضاد سے دیواروں پر ٹنگی دیوی دیوتاؤں
کی تصویریں پھوٹی سی پڑ رہی تھیں۔ کرشن،
رام، شنکر... ایک بڑا کلینڈر جس میں بدھ
عیسیٰ اور گاندھی گڈمڈ ہوتے دکھائی دے
رہے تھے سارے کمرے پر حاوی نظر آ رہا تھا

"بیٹھیے..." گھنگھروؤں کی آواز نے
مجھے چونکا سا دیا۔ میری نگاہیں پاس پڑی ایک
ہی کرسی پر پڑیں جس پر میرا دوست براجمان
تھا۔ اور لوٹ کر کمرے کے ایک طرف بچھے پلنگ
پر جم کر [illegible] جس پر بہت ہی خوبصورت
پلنگ پوش پھیلا ہوا تھا۔ پلنگ پوش کے
ایک کونے میں کوئی چیز ڈھکی چھپی زیر و بم
کر رہی تھی۔ شاید کوئی بچّہ تھا۔ میں نے
مورتی کی طرف دیکھا۔ وہ منتظر یوں کھڑی
تھی جیسے کوئی دیوی دیوتا کے سامنے کھڑی
ہو۔ ایک تیز گرم لہر میرے گالوں کو چھو گئی
اور میں ہڑبڑا کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔

"میں ابھی آئی..." بجلی چمک کر
دوسرے کمرے کی اور لپکی اور میں نے ایک
لمبا سانس لیا۔

"یہ کون ہے..." میں نے پلنگ کے
کنارے ڈھکے چھپے ڈھیر کی طرف اشارہ کر کے
پوچھا۔

"یہ کملا کی بچّی ہے..." دوست نے
جواب دیا۔

"اس کا باپ..." میرے مُنہ سے
یونہی نکل گیا۔

"تم پاگل تو نہیں ہو..." دوست
نے شانے جھٹک دیے اور میں چُپ ہو گیا۔
کمرے پر بوجھل خاموشی طاری ہونے لگی لیکن
کملا کا نام میرے ذہن میں اودھم مچانے لگا۔
سوچ سمجھ کر نام رکھا تھا کسی نے۔ کیچڑ میں ہی
تو کمل اُگ آتے ہیں۔ کملا... کمل... میری
زبان ان الفاظ کو تولنے لگی۔ یہ نام غیر مانوس
نہ تھا۔ میں نے یاد کرنے کے لیے اس نام کی
مالا جپنی شروع کی۔ کملا... کمل... کمل
اور کمو... ارے ٹھیک ہی تو ہے۔ کملا تو
میری پڑوسن تھی جسے اُس کا خاوند پیار
سے کمو کہہ کر پکارتا تھا۔ میں نے کملا کا چہرہ
کبھی نہ دیکھا تھا۔ ایک ننھی منّی سانولی سی
گڑیا کو دیکھا تھا۔ [illegible]
گھونگھٹ نکال لیتی تھی۔ سُنا تھا اُس کا پتی کلرک
ہے۔ دونوں میاں بیوی شریف تھے۔ اُن کے
دو بچّے تھے اور ہمارے ہاں آتے جاتے تھے۔
میری بیوی سے بہت مانوس تھے۔ بیوی بھی
اُن کو بڑے پیار چاؤ سے کھلاتی پلاتی تھی۔ اُن سے
گھنٹوں کھیلا کرتی تھی۔

میں بیوی کو خوش کرنے کے لیے کبھی کبھی
کہہ اُٹھتا "بڑے خوبصورت اور اچھے بچے ہیں
... ہیں نا" لیکن بیوی خواہ مخواہ مجھ پر برس
پڑتی "جس گھر میں بچّے نہیں وہ گھر شمشان
ہے... سُنا آپ نے" اور میں جھینپ کر مُنہ
پھیر لیا کرتا تھا۔

کمو اب میری پڑوسن نہیں۔ روزگار
کے چکر میں، میں وہ شہر کب کا چھوڑ چکا ہوں۔
کمو اور اُس کے بچوں کو بھول چکا ہوں لیکن
آج... اس کمرے میں کملا کا نام سُن کر وہ
میرے ذہن کے دُھندلے پردے پر پھر
ایک بار اُبھر آئی۔ اور میں غیر ارادی طور پر
دونوں گھروں کا مقابلہ کرنے میں اُلجھ گیا۔

دونوں گھروں کی مالکنیں ایک نام کی تو
تھیں۔ لیکن دونوں کی شخصیت متضاد تھی۔
کمو کے گھر میں شانتی کا راج تھا سکون کی فضا
تھی اور اس گھر میں جذبات کے ہیجان انگیز
تھپیڑوں کا طوفان۔ وہ گھر شرم و حیا کا گہوارہ
تھا۔ اور یہاں شرم و حیا کے پردے کو بھی
عُریانیت اُبھارنے کے لیے پیش کیا جاتا تھا۔
محبّت اور عقیدت کے بجائے بناوٹ اور
دکھاوٹ اس گھر کا شیوہ تھا۔ حتیٰ کہ دیوی
دیوتاؤں کی تصویریں بھی اس گھر میں گاہکوں
کو دکھانے کے لیے ٹانگی گئی تھیں۔ واقعی بہت
[illegible]

صادر کرنا چاہا۔ یکایک پلنگ پر سوئی بچی جاگ
پڑی اور رونے لگی جیسے میری بھول پر ماتم کر رہی
ہو۔ دونوں گھر بالکل متضاد نہیں۔ دونوں مائیں
تھیں۔ دونوں کے بچے تھے اور دونوں کے
ہوں میں ممتا کا سمندر موجزن تھا۔ میں نے
بچی کو اٹھا کر چمکارا۔ بچی سہمی... ہکلائی
ر پھر میری قمیص کے بٹنوں کے ساتھ کھیلنے لگی۔
ملا ملحق کمرے میں سے پان کی تھالی لے کر
ئی۔

"لائیے مجھے دے دیجیے بچی کو... آپ
نوش فرمایئے" کملا نے تھالی آگے بڑھائی۔

"کوئی بات نہیں..." میں نے تھالی
سے پان اٹھا کے منہ میں ٹھونس لیا" بڑی
ی بچی ہے۔ کیا نام ہے اس کا" میں
پوچھا۔

"نام تو ابھی نہیں رکھا۔ جب آپ لوگ
گئے تو نام بھی رکھ لیں گے" کملا نے
سے کہا۔

"جی... جی..." مجھے پان بہت
لگا۔ شاید کتھا زیادہ تھا۔ میں گھبرا کر
طرف دیکھنے لگا۔ شاید میرا چہرہ مضحکہ
مذنک ٹیڑھا ہو گیا تھا۔ بچی کھلکھلا کر
پڑی۔ مجھے اس معصوم ہنسی سے تسکین
۔

"سگریٹ..." دوست کی آواز نے
سے آنکھیں ملانے سے نجات دلا دی
تھال لے کر واپس چلی گئی۔

"کیا خیال ہے تمھارا..." دوست نے
ھر کر سگریٹ کے دھوئیں کا مرغولہ میری
بکتے ہوئے کہا۔

یسا خیال..." میں ہڑبڑا گیا۔

"میں نے کہا۔ کیا خیال ہے تمھارا اس
کی ماں کے متعلق" دوست نے بچی کی طرف
اشارہ کیا۔ میرے بازو بے تحاشہ بچی کے
ارد گرد حمائل ہو گئے جیسے کسی تیز چوٹ کا
انتظار ہو۔

"بھئی مجھے معاف ہی کر دو... تمھاری
بھابی کے کان میں بھنک پڑ گئی تو سمجھو خدا
حافظ..."

"تمھاری مرضی..." دوست نے ایک
بار پھر شانے جھٹک دیے۔ نہ معلوم کیوں مجھے یہ
حرکت کراوی سی لگی۔

"میں ذرا اندر تک ہو آؤں... اگر
اجازت ہو تو..." دوست کھسیانی ہنسی ہنستے
ہوئے اٹھ گیا۔

"ضرور... ضرور... جلدی کرنے
کی ضرورت نہیں۔ میں یہیں بیٹھا رہوں گا"
میں طنز کیے بغیر نہ رہ سکا۔

دوست کے جانے کے بعد میں نے
گھڑی کی طرف دیکھا۔ آٹھ بج گئے تھے۔
بچی کی نگاہیں بٹنوں پر سے پھسل کر میری کلائی
میں بندھی گھڑی پر رکیں اور پھر میرے چہرے
کو تاکنے لگیں۔ میں نے گھڑی کھول کر اس کی
ننھی منی مٹھی میں تھما دی اور وہ خوش خوش
گھڑی کو الٹنے پلٹنے لگی۔ میرے دل میں ہوک
سی اٹھی۔ کاش میری ایک ایسی ہی بچی ہوتی
تو شاید میری بیوی کی آنکھوں کی ویرانی کچھ کم
ہو جاتی۔ لیکن میری ایسی قسمت کہاں۔ اور
ہو بھی تو بد قسمت باپ کی طرح جیسے دن رات
خون پسینہ ایک کر کے بھی دو وقت کی روٹی
میسر نہیں، میری بچی بھی بد قسمت ہوتی۔
میں بد قسمت جو اس وقت بھی اپنے گھر اور
بیوی سے دور ایک رنڈی کے کوٹھے پر وقت
ضائع کر رہا تھا۔ تاکہ اپنے دوست پر واضح
کر سکوں کہ اس کے پیار اور خلوص سے متاثر
ہو کر اس سے ملنے چلا آیا ہوں۔ اخبار
والوں سے تقاضہ کرنے نہیں آیا جنھوں نے
میرے کچھ افسانے چھاپ کر اپنے ٹکے تو کھرے
کر لیے لیکن مجھے خالی خولی باتوں سے بہلاتے
رہے۔ نہیں... یہ بچی میری بد قسمت بچی سے
زیادہ خوش قسمت ہے۔ مجھ جیسے غریب باپ
کی بد قسمت اولاد کو دودھ میسر نہ ہو گا۔ اور
اس بچی کی ماں ایک اشارہ کرے تو دودھ
کی نہریں بہا دیں گے لوگ۔ میرے بچے کو کھلونے
نہیں ملیں گے اور یہ بچی کسی کی طلائی انگوٹھی
کو کھلونا سمجھ لے تو اس کی ماں کی خاطر
طلائی انگوٹھیوں کے ڈھیر لگ جائیں گے۔
بہت خوش قسمت ہے یہ بچی۔ دنیا کے
ہر بچے سے زیادہ خوش قسمت جتنے کرشن
چندر جیسے انسان دوست افسانہ نگار کے
بچے سے بھی زیادہ خوش نصیب۔ کرشن چندر
نے خود اعتراف کیا ہے کہ وہ آج کی دنیا
میں اپنے بچے کا نام رکھ کر
بچے کے گلے میں پھانسی کا پھندا نہیں ڈال
سکتا۔ لیکن اس بچی کا نام رکھنے کے لیے کسی
کو کوئی ڈر نہیں۔ جشن ہو گا۔ نذرانے گزارے
جائیں گے۔ ہر کوئی اپنا پسندیدہ نام پیش
کرے گا۔ کوئی اسے نیلم سمجھے گا اور کوئی پیار
سے نیلا پکارے گا۔ ہر ایک نام خوبصورت
رومال کی طرح اس کے گلے کو زینت بخشے گا
لباس تبدیل کیا تو نام بھی تبدیل کیا۔ واقعی اس بچی کے
لیے نام پھانسی کی رسی نہیں، ریشمی رومال
ہے۔

نہ ہی یہ کرشن چندر کے دوست کے بچے کی طرح حرامی کہلائیں گی۔ بلکہ ہر کوئی اِس کی ماں کی خوشی کے لیے اِس کا باپ بننے میں فخر محسوس کرے گا۔

بچی سو گئی ... میری گود میں سو گئی۔ شاید اپنے باپ کی گود میں سو گئی۔ ہر فکر، ہر غم سے بے نیاز جیسے یہ رات اِس کی اپنی رات ہے۔ لیکن جب یہ جوان ہو جائے گی تو شاید اُس کی راتیں اپنی راتیں نہ رہیں گی۔ اِس کے یہ ننھے ننھے ہاتھ پانو ناچ ناچ کر تھکاوٹ سے لڑکھڑا جائیں گے۔ سہارا دینے والے ہاتھ بڑھیں گے بھی تو نوچنے کے لیے۔ یہ چیخ پڑے گی تو سازوں کی جھنکار چیخوں کو ڈبو دے گی۔ بغاوت اداؤں کا رُوپ دھارن کرے گی ... یہ معصوم پیاری بچی ... جو اِس وقت میرے بازوؤں پر بدن پھیلائے نیند میں مست پریوں سے کھیل رہی ہے۔ جس کے ننھے ننھے اعضا خواہ مخواہ چوم لینے پر اُکساتے ہیں۔ جس کے یہ سنہرے بال کلابتوں کے نرم لچھے سے لگ رہے ہیں۔ اور چہرے کے گرد ہالہ سا بنے ہوئے ہیں۔ نہیں جانتی کہ اُس کی ماں کچھ ٹکوں کے لیے اپنا جسم لٹا رہی ہے۔ ہو سکتا ہے ماں مجبور ہو اُس کی۔ حوادث نے پھینکا ہو ماں کو اِس دلدل میں۔ دُنیا کی کٹھور روایتوں نے جکڑ رکھا ہو اِس گھناؤنے ماحول میں رہی کچھ تو کہا جاتا ہے۔ سُنا جاتا ہے۔ پر ماں کے کمائے ہوئے ٹکے اِس بچی کے لیے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ جسم بیچ کے کمائے گئے ٹکے عیاشی کے بدلے اِس کی بہبودی پر صرف کیے جا سکتے ہیں۔ اِس کے لیے ایک نیا اور مختلف مستقبل خرید سکتے ہیں [illegible] بازوؤں، کے حوالے کرنے کے بجائے مجھ سے دُور رکھنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ میں کہ گاہک ہوں اِس بچی کا ... !

ٹن، ٹن، ٹن، کہیں سے گھڑی نے نو بجا دیے۔ میں نے بچی کو پلنگ پر لٹا دیا۔ دو روپے کا نوٹ اُس کے ہاتھ میں تھما کر پلنگ پوش سے ڈھک دیا۔

میرا دوست اور کملا ساتھ کمرے میں آگئے۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا۔

"اب چلو بھی ... بہت دیر ہو گئی ہے" میں دوست سے مخاطب ہوا۔

"پان تو کھا کے جائیے ..." کملا نے تھالی آگے بڑھائی۔ میں نے پان اٹھا کے مُنہ میں ٹھونسا۔ کملا مجھے ایک ٹک گھورے جا رہی تھی۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔ کملا کے چہرے پر ہنسی پھوٹ پڑی۔ شاید اُسے یقین نہ تھا کہ میں اُس کے حسن کی۔ اور زیادہ توہین کروں گا۔ میں نے جیب سے رومال نکال لیا اور ہونٹ صاف کرنے لگا۔ کملا کا مُنہ پھیکا پڑ گیا۔ میں نے مُنہ پھیر کر دروازے کا پردہ ہٹایا۔

"ٹھہریے ..." کملا کی آواز نہ تھی۔ چُھری تھی جو مجھے پیٹھ میں اُترتی محسوس ہوئی میں نے مُڑ کر دیکھا۔ کملا کی آنکھوں سے شرارے برس رہے تھے۔ ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اور سارے بدن میں جُھرجُھری سی ہو رہی تھی۔ وہ کہنے لگی "آپ کو بُرا لگا ہے رنڈی کے گھر آنا۔ پھر بھی ہم اِنسان ہیں۔ اِس گھر سے آپ نفرت کرتے ہوں گے لیکن کوئی چیز تو پسند آئی ہو گی اِس گھر میں"۔

میرے دل نے کہا رنڈی ... سراپا رنڈی۔ پہلے اپنے جسم کے دام طے کر رہی تھی اب اپنے دام بھی طے کر رہی ہے۔

"جی ایک چیز ..." مجھے اُس پر رحم سا آگیا۔

"کیا چیز ..." وہ بدستور کانپ رہی تھی۔

"وہ بچی ..." اور میں پردہ ہٹا کر باہر نکل آیا۔

اگرچہ ہوگئیں آسان مُشکلیں تن کی
مگر بڑھا گئیں کچھ اور اُلجھنیں من کی

ہوائیں اِن کو اُڑا کر کہیں نہ لے جائیں
جھکی تو ہیں مری جانب گھٹائیں ساون کی

یہ کس نے میرے دل و جاں میں آگ بھڑکا دی
ابھی تو بادِ خنک میہماں ہے گلشن کی

ہزار طیش میں آئے یہ برف کا طوفاں
لکھی ہے میرے مقدّر میں دھوپ آنگن کی

لہو لہان پرندو تمھیں زباں کھولو
یہ شکل کس نے بنادی ہے میرے مدھوبن کی

میں جانتا ہوں ایودھیا کا راستہ، لیکن
مزاج تو سمجھے یہ فوج راون کی

نوں کی کونسی منزل ہے یہ دلِ ناداں
اسے مانگ رہا ہے ہوا جو دامن کی

اندر سروپ دت ناداںؔ

مہندر پرتاپ چاندؔ

رہینِ درد و الم، وقفِ رنج و یاس ہوا
بچھڑ کے تجھ سے مزاجی بہت اُداس ہوا

سجاؤں کیوں نہ سر آنکھوں پہ خاکِ پاک اِس کی
اِسی دیار میں دِل غم سے روشناس ہوا

تمھیں بُھلا کے بھی کھو یا سکونِ قلب، مگر
تمھاری یاد سے بھی میں اُداس اُداس ہوا

ازل سے عشق کی تقدیر میں تھی محرومی
مگر اُسی کی تپش سے یہ غم شناس ہوا

سمجھ سکا نہ کوئی اُس کے دردِ پنہاں کو
وہ قہقہہ، مرے اشکوں کا جو لباس ہوا

پلٹ کر آئے گا وہ میرے پاس، آخرِ کار
ذرا بھی اُس کو جو میری وفا کا پاس ہوا

عزیز تر نہ ہو کیوں چاندؔ اِس کی یاد مجھے
وہ سانحہ جو مری فکر کی اساس ہوا
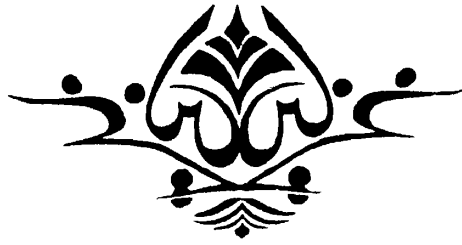
سامنے اِک کتاب اَدھ کُھلی اور میں
بے سبب شمع جلتی ہوئی اور میں

کچھ پرند آسماں سے اُترتے ہوئے
لطف اندوز جن سے ندی اور میں

جسم پر رینگ اٹھیں بے بدن چیونٹیاں
پھر وہی دھوپ سی چاندنی اور میں

بے صدا ایک نغمے کے ہیں منتظر
دف بجاتی ہوئی خامشی اور میں

وقت کی شاخ پر خوشنما پھول تھے
وہ گلی، حسن کی سادگی اور میں

جسم دھنسنے لگا رات کی قبر میں
پھر وہی خواب کی آگہی اور میں

محفلِ رنگ و بُو، مشعلیں اور تو
بے کراں اِک خلا، تیرگی اور میں

اسلم حنیف

B-3/36، پچھم وہار، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۳

ڈپٹی یونیورسٹی لائبریرین، کورو کشیتر یونیورسٹی، کورو کشیتر (ہریانہ)

پوسٹ آفس گنوّر، ضلع بدایوں ۲۰۲۵۲۲ (یو۔پی)

نظمیں

خلیل تنویر

(۱)

تُم نے
اپنے خوابوں
اپنے خیالوں کو
تصویروں میں قید کیا تھا
لیکن اب تم کو
ہنستی، گاتی، چلتی پھرتی
تصویروں نے قید کیا ہے

(۲)

ہر ممکن کوشش کی گئی مگر
آندھی بہت تیز تھی
اُکھڑ گئے وہ درخت
جو آسمان کی طرف دیکھتے تھے

(۳)

عجیب رات تھی
احساسِ گُم شدہ کی رات
شجر سے لپٹا تھا لیکن
کوئی خیال نہ تھا

کیوریٹر، گورنمنٹ میوزم، اُودے پور ۳۱۳۰۰۱ (راجستھان)

ساغر ملک

انتباہ

جس روشنی کے پیچھے
تم دوڑتے ہو لوگو!
کالے سمندروں سے
اس کا سِرا مِلا ہے

احساس کی چیخ

خوب صورت سے پھول کو جب بھی
جھونک دیتا ہے آگ میں کوئی
ہر نفس رایگاں سا لگتا ہے
سارا عالم دُھواں سا لگتا ہے
دل میں اُٹھتی ہے ہوک سی میرے
درد الفاظ میں جھلکتا ہے
زخمی احساس چیخ اُٹھتا ہے

تلولی، پڈگھا، تھانے ۴۲۱۱۰۱ (مہاراشٹر)

محبوب اقبال

فرار ـــــ ایک جائزہ

دیوان بریندر ناتھ ظفر پیامی کا شمار اُردو ادب میں کئی جہتوں سے ہوتا ہے۔ وہ ایک اچھے ادیب، صحافی اور رپور تاژ نگار تھے۔ صحافت ان کی گھٹی میں پڑی تھی، سیاحت ان کی ضرورت تھی اور یہ ناول اس اعتبار سے وقیع ہے کہ صحافت، سیاحت اور ادب تینوں کا مجموعہ ہے۔

ناول "فرار" کا مرکزی کردار سید افتخار حسین ہاشمی عرف تاری ہے۔ لیکن آفتاب چندر چودھری جو تاری کا دوست ہے، مصنف کا اپنا کردار لگتا ہے۔ آفتاب کا کردار بے حد دلکش اور زندگی سے بھرپور ہے۔ وہ دوست کی خاطر کچھ بھی کرسکتا ہے اور کرتا ہے۔

مذکورہ ناول کے واقعات بنگلہ دیش کے قیام اور پھر بہاریوں/ہندوستانیوں کے وہاں سے فرار کی داستان پر مشتمل ہیں۔ ظفر پیامی ایک صحافی کی حیثیت سے دنیا کے کئی جنگی محاذوں پر جاچکے تھے حالات کے مختلف نشیب وفراز دیکھ چکے تھے۔ لیکن اس ناول میں وہ نرے رپورٹر یا خشک مزاج اور سخت دل صحافی نہیں بلکہ ایک حساس اور دردمند ادیب کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ ان کا ذہن واقعات سے متاثر ہی نہیں ہوتا، ان کا تجزیہ بھی کرتا ہے اور اس تجزیے سے جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے وہ صفحۂ قرطاس پر آبدار موتیوں کی طرح سجتا چلا جاتا ہے۔

ناول کے پیش لفظ "راہ فرار" میں کہتے ہیں:

"... سچ تو یہ ہے کہ فرار کا کوئی بھی چہرہ کسی دوسرے کا نہیں، اپنا ہے، اسی اپنے چہرے کی پہچان کی کوشش کا نام فرار ہے کہ اپنے چہرے کو پہچاننا ہی سب سے مشکل کام ہے بلکہ ویسے ہی جیسے سچ بولنا بہت آسان لیکن سچ سننا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے..." (ص ۷)

ناول "فرار" کو لکھنے کا محرک بتاتے ہوئے ظفر پیامی نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا:

"جہاں تک اس ناول کے محرک کا سوال ہے وہ یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو سمجھیں۔ دونوں ملکوں کے درمیان محبت اور خلوص پیدا کریں۔ اپنی نسل کو تو ہم نے برباد کرلیا لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے بچوں کی نسل کو تباہ ہونے سے بچالیں۔ انھیں اچھے پڑوسیوں کی طرح زندگی گزارنے کی ترغیب دیں۔ انسانیت اور ایثار کا سبق پڑھائیں ہم ہی آپس میں کیوں لڑتے ہیں۔ آخر دنیا میں اور بھی تو پڑوسی ممالک ہیں ـــــ"

حقیقت یہ ہے کہ یہ ناول ہمیں اسی رجحان کی طرف توجہ دلاتا ہے اور ذہنوں میں اس احساس کو جگاتا ہے کہ ہم ایک ہیں، ہمارے آباواجداد ایک تھے اور ہماری رگوں میں ایک ہی لہو دوڑ رہا ہے۔

ناول پڑھتے ہوئے بعض مقامات پر ظفر پیامی اور قرۃ العین حیدر کے یہاں مماثلت نظر آتی ہے۔ قرۃ العین حیدر کے ناول "آخر شب کے ہمسفر" اور "فرار" میں نہ صرف مکانی جہت سے مماثلت ہے، بلکہ کردار بھی مشابہہ دکھائی دیتے ہیں۔ سوچنے کا انداز بھی ملتا جلتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ قرۃ العین حیدر کے یہاں عمق اور گیرائی ہے جبکہ آخرالذکر کے یہاں صحافتی رنگ غالب ہے۔ حقایق کا تجزیہ اور اسے پیش کرنے کا انداز یقیناً ظفر پیامی کے یہاں پختہ ہے۔ "آخر شب کے ہمسفر" اور "فرار" دونوں کا موضوع تقسیم ملک ہے فرق صرف زمان کا ہے، مکان میں وحدت ہے۔ المناکی بھی یکساں ہے۔ "فرار" کا تاری اور "آخر شب کے ہمسفر" کے ریحان الدین احمد کی ذہنیت میں یکسانیت ملتی ہے۔ فرق حالات اور ان کے ردعمل کے تحت عمل کا ہے۔ "فرار" کی سحر ہاشمی تو نہ صرف اندازِ فکر بلکہ اندازِ بیان سے بھی "آخر شب کے ہمسفر" کی کردار ناصرہ نجم السحر سے گہری مشابہت رکھتی ہے۔ دونوں باغی ہیں، اپنے ماحول کی، اپنے معاشرے کی، اپنے ماضی کی، اپنی موجودہ حکومت کی، اپنے والدین اور بزرگوں کی اور ساتھ ہی اپنی ذات کی بھی۔ ان دونوں کا

بی ــ ۵، آشیانہ منزل، رمنہ روڈ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴

یقین صرف عمل پر ہے۔ دونوں ہی نوجوان ہیں اور بزرگوں کو شرم دلاتی ہیں انھیں فراری اور بزدل کہتی ہیں، مطلبی اور خود غرض بھی کہہ دیتی ہیں۔ واقعات کا تجزیہ انھیں سچا ثابت کردیتا ہے۔ لیکن قرۃ العین حیدر کے کرداروں کی پیچیدگی اور تہہ داری ظفر پیامی کے کرداروں سے زیادہ ہے۔ وہاں کرداروں کے جذبے زیادہ شوریدہ سر ہیں جبکہ دوسری طرف سحر ہاشمی تنہا ایک پورے معاشرے سے لڑائی لڑتی ہے۔ اس کا ساتھ صرف ڈاکٹر نینا شری واستو دیتی ہے اور بعد میں کنول نارائن ایڈووکیٹ بھی شامل ہو جاتا ہے — یہاں بھی وہی ذہنیت کارفرما ہے جو نئی نسل کو پرانی نسل کے سامنے باغی ثابت کرتی ہے۔ سحر ہاشمی کہتی ہے:

"انکل (کنول نارائن) میں ہر بھگوڑے کے لیے واپسی کا حق نہیں مانگتی کہ میں جانتی ہوں کہ جو لوگ چور دروازوں سے بھاگے تھے (کیوں بھاگے تھے اور کیسے بھاگے تھے اس سے بحث نہیں) وہ اب ڈیوڑھیوں پر کھڑے ہو کر آرتی نہیں اتروا سکتے۔ جو چلے گئے سو چلے گئے مگر جو یہاں کے ہیں وہ نہیں جاسکتے۔ آج کے یگ میں سیتا کو دوبارہ بن باس نہیں دیا جاسکتا —"
('فرار' ص ۱۴۴)

دراصل یہ سحر ہاشمی کی ہی آواز نہیں بلکہ اس لہو کی آواز ہے جو اپنوں پہ ظلم ہوتے دیکھ کر چیخ پڑتا ہے اور یہی چیخ پھیل کر پورے ملک کے عوام کی چیخ بن جاتی ہے۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ سحر ہاشمی دراصل اپنی نسل کی نمائندگی کر رہی ہے۔ جس طرح قرۃ العین حیدر کی کردار ناصرہ نجم السحر اپنے وقت کی باغی کردار دیپالی سرکار سے باتیں کرتے ہوئے کہتی ہے:

"... مگر ہم لوگ آپ سے زیادہ تیز فہم ہیں۔ ہم کھرا کھوٹا پہچان لیتے ہیں۔۔"
('آخر شب کے ہمسفر' ص ۲۹۰)

جب دیپالی سرکار اسے سمجھاتے ہوئے کہتی ہے:

"ناصرہ! ... کل کے باغی آج کے Establishment میں شامل ہو چکے ہیں۔ تم آج کی باغی ہو۔ ممکن ہے تم کل کے Establishment میں شامل ہو جاؤ۔"
(ایضاً)

تو ناصرہ دیپالی سرکار کا استہزا اڑاتے ہوئے بول اٹھتی ہے:

"... آپ کی عمر اس اسٹیج پر پہنچ چکی ہے جہاں انسان Cynicism کو ایک دفاعی ہتھیار، ایک زرہ بکتر کی طرح استعمال کرتا ہے۔ اس کا زاویۂ نگاہ بدل جاتا ہے ..." (ایضاً)

دراصل یہ دو نسلوں کا المیہ ہے کہ پرانی نسل نئی نسل کو باغی سمجھتی ہے جب کہ نئی نسل کا پرانی نسل کے متعلق یہ خیال ہے کہ:

"سر چور کی کوئی نہ کوئی مجبوری ہوتی ہے۔ خصوصاً آپ کی نسل کے چور کی — میری نسل میں ہزاروں خرابیاں سہی، مگر نہ تو وہ چور ہے اور نہ مجبور —"
('فرار' ص ۷۵)

سحر ہاشمی نے یہ جملے آفتاب کو اس وقت کہے جب وہ سحر ہاشمی کو اس کے فراری باپ سید افتخار حسین تاری کی مجبوری بتاتا ہے کہ کس طرح تاری کو ملک چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور کیا گیا، سحر کی ماں کو کس طرح بلوائیوں نے مکان کے ساتھ زندہ جلا ڈالا۔ مگر سحر اس بات کو ماننے سے انکاری ہے وہ کہتی ہے کہ یہ کوئی مجبوری نہیں۔ تاری سے وہ ایک بار کہتی بھی ہے:

"آپ جی نہیں رہے پپا آپ بھاگ رہے ہیں ایک فرار سے دوسرے فرار کی طرف ڈر کر بھاگنے والے کبھی جیتے نہیں صرف ڈر کر مرتے ہیں —" ('فرار' ص ۲۲۶)

سحر کے منہ سے ادا ہوئے یہ جملے اپنے اندر بے پناہ معنویت رکھتے ہیں۔ مصنف کے نظریات جا بجا مختلف کرداروں کے ذریعے قارئین کے سامنے آتے ہیں۔ سحر ایک لازوال کردار ہے جو ذہنوں پر انمٹ نقش چھوڑ جاتا ہے۔ اپنے وطن، اپنی سرزمین سے محبت کا بے پناہ جذبہ سحر کے اندر موجود ہے وہ یہ ماننے کو بھی تیار نہیں کہ ہمارا وطن، ہماری دھرتی ہمارا ملک اندھیروں کا ملک ہے اور اگر ایسا فرض بھی کر لیا جائے تو اس پر صبح اتارنا بھی ہمارا ہی فرض بنتا ہے۔ سحر ایک جگہ گکو مرزا سے کہتی ہے:

"پپا جس رات کے اندھیروں میں کھوئے رہتے ہیں اس رات کی صبح کی تمنا کیوں نہیں کرتے، اس سرزمین پر بھی تو کوئی سورج، کوئی صبح کبھی لائے گا —" ('فرار' ص ۲۲۸)

اور یہ سرزمین ہمارا ہندوستان ہے

ناصرہ نجم السحر بھی اپنی زمین کے لیے کٹ مرنے کو تیار ہے، کہتی ہے:

"... مغربی پاکستان جو ہمارا استحصال کر رہا ہے اس سے متنفر ہیں تو اس وجہ سے ہم انڈیا سے جاملیں گے ہرگز نہیں۔ جہاں انڈیا سے مقابلے کا سوال پیدا ہوا ہم پاکستان کی حفاظت اور سالمیت کے لیے کٹ مریں گے..."

('آخر شب کے ہمسفر' ص ۲۹۷)

کوکب جہاں عرف ککو مرزا نیپال میں سحر ہاشمی کو ترغیب دیتی ہے کہ وہ تاری اور کوکب کے ہمراہ لندن چلے، کہ کراچی بھی تاری کے لیے مخدوش جگہ ہے اور ہندوستان میں رہ نہیں سکتا۔ لیکن سحر انکار کر دیتی ہے۔ دونوں میں بحث ہوتی ہے، سحر کا کہنا ہے:

"آنٹی! مگر میں وہاں نہیں جاسکتی، کچھ دیر تک بالکل نہیں چند روز کے لیے بھی نہیں۔

مگر کیوں؟

صرف اس لیے کہ میں بھاگنا نہیں چاہتی۔

تو مرنا چاہتی ہو یا سڑنا؟

نہ مرنا نہ سڑنا بلکہ جینا ——
سر اٹھا کر جینا۔ اپنے لوگوں کے ساتھ۔"

('فرار' ص ۲۲۰)

یہ "اپنے لوگ" ہندوستانی ہندو، مسلم اور سکھ ہیں جو صدیوں سے ساتھ رہتے آئے ہیں۔

ظفر پیامی نے مختلف کرداروں اور واقعات کے تال میل سے ایک خوبصورت کہانی پیش کی ہے۔ ہر چند اس کہانی کی بنیاد ایک بڑے المیے پر ہے۔ یہ وہ المیہ ہے جس نے ہزاروں، لاکھوں انسانوں کو بے گھر کیا، ان کے پرانوں کی آہوتی لی، بے شمار بچوں کو یتیم اور عورتوں کو بیوہ کیا۔ یہ وہ المیہ ہے جس نے پورے برصغیر کو ایک نئے انقلاب سے آشنا کیا۔ وہ نسل جس نے تقسیم ہند کے لرزہ خیز واقعات کو محض کہانی کے طور پر سُنا تھا، اس سے بھی کہیں زیادہ بہیمانہ اور ناقابل یقین مظالم اپنے پیاروں پر ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھے، ان کی چیخیں، کراہیں اور سسکیاں اپنے کانوں سے سنیں، انسانیت نے حیوانیت کا وہ ننگا ناچ دیکھا کہ جسے دیکھنے سے قبل آنکھیں اندھی ہوجاتیں تو اچھا تھا، کان بہرے ہوجاتے تو بہتر تھا۔

مصنف نے حقیقت کے تلخ مشروب کو ناول کے خوبصورت اور منقش جام میں پیش کیا ہے لیکن جام کا حسن بھی اس کی تلخی کو کم کرنے میں ناکام رہا ہے۔ مصنف کا اعتراف بھی ہے کہ:

"... یہ ناول محبتوں اور نفرتوں کا خوبصورت اظہار ہے..." (انٹرویو)

دوسری طرف کہتے ہیں:

"فرار نہ تو آپ بیتی ہے اور نہ جگ بیتی صرف من بیتی ہے اور من بیتی سنانے کا بہترین ذریعہ میرے نزدیک وہ کہانی ہے جسے عرف عام میں ناول کہتے ہیں ——"

('فرار' ص ۷)

اس ناول کا ایک پہلو یہ ہے کہ مصنف ناول کے بیشتر واقعات کا ناظر ہے۔ بقول مصنف:

"دسمبر۔ جنوری ۷۲-۱۹۷۱ء میں تین ہفتے ڈھاکہ میں اور چھ ہفتے اگست ستمبر ۱۹۷۲ء میں کراچی، لاہور اور اسلام آباد میں گزارے، فرار اور قرار کی انھیں منزلوں کو طے کرتے ہوئے بار بار دیارِ دوستانِ دل یعنی موجودہ بنگلہ دیش کی زیارت کی اور پاکستان بھی گیا اور نیپال بھی..."

('فرار' ص ۶، ۷)

اس اعتراف کو پڑھنے کے بعد اس خیال کو مزید تقویت حاصل ہوتی ہے۔ "فرار" کا کردار آفتاب چندر چودھری بذاتِ خود مصنف کا کردار ہے اور یہ اعتراف ناول کی قدر و قیمت میں مزید اضافے کا سبب بنتا ہے رائج الوقت اسلوب میں ناول "فرار" اپنی اہمیت کا احساس باذوق اور باشعور قاری کو کراتا ہے۔ اشاروں کنایوں میں بڑی بڑی باتیں کہہ جانا اگرچہ قدیم اندازِ سخن ہے اور غزلوں کے لیے آج بھی مخصوص ہے مگر ناول میں اس اندازِ تحریر کو بھی فروغ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ شعور کی رو اور خود کلامی کے سہارے یہ ناول مشرقی پاکستان کے عدم اور بنگلہ دیش کے وجود کے سارے اہم اور فوری رونما ہونے والے واقعات کا مع جزئیات احاطہ کرتا ہے بالفاظ دیگر "بھائی سے قصائی" بننے کے مکمل عمل پر یہ ناول خاطر خواہ روشنی ڈالتا ہے۔ اس کا حسن اس کے اندازِ بیان کی کڑواہٹ اور روانی میں ہے۔ اور اسی وصف کو اس ناول کی عظمت اور ابدیت کا ضامن کہا جاسکتا ہے

○○

محمد منظور کمال

جوتا

جوتے کے بغیر انسان خود کو آدھا ادھورا محسوس کرتا ہے۔ اسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے تخلیق کار اسے تخلیقی مراحل ہی میں چھوڑ کر کسی اور کام میں مشغول ہو گیا ہو اور پھر ذہن سے یہ بات ہی نکل گئی کہ اس نے کسی کو ادھورا چھوڑ دیا ہے۔ لہٰذا اس کمی کو وہ جوتا پہن کر پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ جب ایک شخص نیا جوتا پہن کر گھر سے نکلتا ہے تو اس کی عجب شان ہوتی ہے۔ جوتے کی چچ چچ کی آواز اسے ایسے خوش کن لمحات سے آشنا کرتی ہے کہ خود بخود اس کی گردن تن جاتی ہے۔ سینہ فخر سے پھول جاتا ہے۔ ہونٹوں پر ایک دلفریب مسکراہٹ کھیلتی نظر آتی ہے۔ خود کو فاتح اور زمین کو مفتوح تصور کرتا ہے۔ انبساط و سرور کی لہر رگ و پے میں دوڑتی محسوس ہوتی ہے۔ آسمان نزدیک معلوم ہونے لگتا ہے اور زمین دور اور پھر:

زیر پا چاند ستاروں کی ردا ہو جیسے
وہ تو اس شان سے چلتا ہے خدا ہو جیسے

لیکن جوتا خدا نخواستہ ناپ سے چھوٹا ہو تب بھی پہننے والا ایک عجیب کیفیت سے دوچار ہوتا ہے مگر یہ کیفیت پہلے تجربے سے ذرا مختلف ہوتی ہے۔ چچ چچ کی آواز ذہن پر ہتھوڑے برساتی محسوس ہوتی ہے۔ گردن کے ساتھ کمر بھی کچھ آگے کو جھک آتی ہے۔ چال کچھ اس طرح بگڑتی ہے کہ لوگوں کو اس کے چلن پر شبہ ہونے لگتا ہے۔ ہونٹوں پر اب بھی مسکراہٹ کھیلتی بلکہ رینگتی نظر آتی ہے لیکن زخم خوردہ۔ خود کو چغد اعظم تصور کرتا ہے۔ اذیت و کرب کی زیریں لہر اس کے دل و دماغ کی شریانوں کو جھنجوڑتی محسوس ہوتی ہے۔ منزل دور اور جوتا سنگ رہ منزل نظر آتا ہے۔

کچھ لوگوں کے خیال میں انسان کی طرح جوتے کی بھی تین قسمیں ہیں۔ ایک جوتا دوسری جوتی تیسرا جوتا نما جسے انگریزی میں ہاف شو کہتے ہیں۔ ویسے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حقیقتاً جوتے کی ایک ہی قسم ہے۔ جہاں تک جوتی اور جوتا کا سوال ہے تو یہ پہننے والوں پر منحصر ہے۔ اگر مرد کے پیروں میں ہے تو جوتا کہلائے گا اور عورت کے پیروں میں ہے تو جوتی کہلائے گی۔ ویسے حیوان ظریف کے قبیلے کے ایک معتبر فرد کا خیال ہے کہ اگر وہ (جوتا) کسی کے سر پر زور سے پڑے تو جوتا ہے اور ہلکے پڑے تو جوتی ہے۔

ایک انسان کو کسی بھی حال میں جوتے سے مفر نہیں۔ جس طرح ایک انسان کے ساتھ دکھ سکھ لگا رہتا ہے۔ اسی طرح جوتا بھی شاہراہ حیات پر سنگ میل کی طرح قدم قدم پر گڑا نظر آتا ہے۔ بچپن میں ماں باپ سے جوتا کھانا پڑتا ہے۔ اسکول میں داخل ہوتا ہے تو استاد اسے صراط مستقیم پر گامزن کرنے کے لیے یا بہتر مستقبل بنانے کی خاطر جوتے کو بطور آلۂ ہدایت استعمال کرتا ہے۔ جوانی میں بیوی کی جوتی سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے اور اگر یہ جوانی زیادہ مُنہ زور ہوئی تو محلّے والوں سے بھی جوتے کھانے کی نوبت آ جاتی ہے۔ حتیٰ کہ عہد پیری میں بھی جوتے سے نجات نہیں بعض نیک اور صالح اولاد ماں باپ کی تواضع اسی جوتے سے کرتی نظر آتی ہے۔

کبر و نخوت ابن آدم کی سرشت میں تبرکاً ودیعت کر دیا گیا ہے تاکہ وہ عرفانِ خودی کے جذبے سے ہمہ وقت سرشار رہے اور اسے مجبور محض ہونے کا احساس شدت سے نہ ہو لیکن یہ جذبہ جب اپنے حدود سے تجاوز کر جاتا ہے تب وہ خدا سے بغاوت پر آمادہ نظر آتا ہے بلکہ بعض اوقات خدائی تک کا دعویٰ کر بیٹھتا ہے اول الذکر کی مثال کے لیے ابلیس کا واقعہ کافی ہے۔ جب کہ مؤخر الذکر کی مثال کے لیے نمرود جس کے دماغ کی چولیں جوتے کی پٹائی ہی سے درست ہوتی تھیں ـــ کبر و نخوت دراصل ایک ایسا موذی مرض ہے جس کا واحد علاج تاریخی واقعہ کی روشنی میں جوتا ہے۔ یہ بھی خوب لطیفہ ہے کہ غرور و تکبر کا سبب بھی جوتا ہے اور اس کا نشہ اتارنے کا بھی واحد ذریعہ جوتا ہی ہے۔ اسی کو کہتے ہیں زہر کا تریاق بھی زہر ہی ہے۔ اس خاص تیر بہدف نسخے کا استعمال اب عامۃ الناس بھی فراخد

اقبال اُردو لائبریری، محلہ پوکھریا، پوسٹ وضلع بیگوسرائے
۸۵۱۱۰۱ (بہار)

سے ہر شعبۂ زندگی میں کرنے لگی ہے۔ جہاں کسی حاکم یا آفیسر نے حاکمانہ یا آفیسرانہ شان دکھائی اور ماتحت نے جوتا نکال کر چندیا پلپلی کر دی۔ اس جوتے بازی کی ایک اعلیٰ و ارفع خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک ایسی دوا ہے جس کا Side Effect نہیں ہوتا۔ آفیسر مذکور کبھی نہ چاہے گا کہ اس جوتے بازی کی داستان جائے حادثہ سے باہر سنی جائے۔ اور نہ وہ یہ چاہے گا کہ اس حرکت فی البدیہہ کی سرزنش کے لیے کورٹ جائے۔ کیوں کہ وکیل مخالف کٹہرے میں کھڑا کر کے جب جوتے کا ناپ، اس کا وزن، مارنے کا انداز یعنی رک رک کر جوتے کی بارش ہو رہی تھی یا موسلا دھار، جوتا نیا تھا یا پرانا، نرم تھا یا سخت، فقط سر پر ضرب کا احساس ہو رہا تھا یا جوتے کی دھمک آنکھوں کی روشنی پر بھی اثر انداز ہو رہی تھی، جوتا کھانے کا یہ پہلا اتفاق ہے یا ماضی میں بھی اس سے بہرہ ور ہو چکے ہیں، اس قبیل کے سوالات کی بوچھار کرے گا تو سوائے خفت اٹھانے کے کوئی چارہ نہ ہوگا۔ اور پھر یوں بھی کون سا خوشگوار واقعہ ہے جس کا تذکرہ برسرِ عام کیا جائے۔ بلکہ عتاب زدہ شخص یہی خواہش رکھے گا کہ:

یادِ ماضی عذاب ہے یا رب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

اور بفرضِ محال ان سارے مراحل سے وہ ستم رسیدہ اور جوتا گزیدہ، شخص گزر بھی جائے اور کورٹ نے اس کے حق میں فیصلہ بھی کر دیا۔ پھر بھی اس کا کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکلے گا بلکہ جوتے بازی کا خطرہ از سرِ نو پیدا ہو سکتا ہے۔ مان لیجیے کہ کورٹ نے ملزم پر پانچ سو یا ایک ہزار کی رقم جرمانے کے طور پر عائد کر دی۔ اب اگر ملزم ستم ظریف ہوا تو وہ بخوشی پانچ سو یا ایک ہزار کی جگہ دگنی رقم دینے کے لیے تیار ہو جائے گا اور کورٹ سے خواستگار ہوگا کہ اسے ایک بار پھر نادر موقعہ جوتے بازی کے کرتب دکھانے کا دیا جائے۔ رقم وہ بطور ایڈوانس جمع کرانے کے لیے تیار ہے بلکہ کورٹ سے سیزنل لائسنس (Seasonal Licence) کا بھی طلب گار ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس طرح بعض سانپ کا کاٹا پانی نہیں مانگتا ہے اسی طرح جوتے کا مارا آہ وا نہیں کر سکتا۔

ہمارے ملک میں عاشق اور بے روزگار کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ دونوں کے حرکات و سکنات بھی قریب قریب ملتے جلتے ہوتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ عاشق شبِ ہجر تارے گن گن کر معشوق کا انتظار کرتے ہوئے صبح کر دیتا ہے۔ جب کہ بے روزگار دن گن گن کر نوکری کے انتظار میں شام کر دیتا ہے بلکہ ایک دن سرِ شام زندگی کی بھی شام ہو جاتی ہے۔ اگر ایک کوچۂ عشق میں شربتِ دیدار کے لیے اکثر مٹر گشتی کرتا اور بیشتر جوتے کھاتا نظر آتا ہے تو دوسرا کوچۂ شہر میں روزگار پانے کے لیے جوتی چٹخاتا اور دھکے کھاتا نظر آتا ہے۔ ایک کا نعرہ ہوتا ہے ہائے چھوکری (معذرت کے ساتھ) جب کہ دوسرے کا نعرہ ہوتا ہے ہائے نوکری۔ ایک کو دل رکھنے کے باوجود چھوکری نہیں ملتی دوسرے کو سرٹی فیکیٹ رکھتے ہوئے نوکری نہیں ملتی۔ ہاں قسمت میں جوتا ضرور ہوتا ہے۔ وہ اس طرح کہ ایک کی ساری زندگی جوتے کھاتے گزرتی ہے دوسرے کی ساری زندگی جوتے گانٹھتے۔ یہ نہ صرف عاشق اور بے روزگار کی قسمت سنوارنے یا بگاڑنے میں اہم رول ادا کرتا ہے بلکہ شاہ و گدا کے لیے بھی یکساں اہمیت کا حامل ہے، اب بھگوان رام کو ہی لے لیجیے جو بادشاہ بھی تھے، جب چودہ سال کا بن باس ملا تو یہی جوتا (اس وقت کھڑاؤں کی شکل میں تھا) قائم مقام بنا۔ اور جب تک واپسی نہ ہوئی تخت پر بحیثیت تاج متمکن رہا۔ نواب واجد علی شاہ اسی جوتے کے عین وقت پر گم ہو جانے کی وجہ سے فرار نہ ہو سکے۔ گداگری کے لیے پھٹے حال کے ساتھ پھٹے جوتے کی شرط لازمی ہے۔ چوروں کا اولین درس اسی جوتے کے چرانے سے شروع ہوتا ہے۔ بلکہ شادی کے موقعہ پر کنواری لڑکیوں سے نوشے کا جوتا چرانے کی مشق بھی ابتدائی درس کے طور پر اسی لیے کرائی جاتی ہے تاکہ بعد میں دل چرانے کا کام وہ بخوبی انجام دے سکیں۔

جوتا چرانے کے لیے مناسب ترین جگہ مسجد ہے۔ کیوں کہ یہاں عموماً لوگ جوتے کی چوری اور چور دونوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ خیال ہے کہ کوئی بات نہیں آخرت میں ایک کی جگہ ستر مل جائیں گے۔ جوتے کی اہمیت کا اندازہ آپ اسی سے کر سکتے ہیں کہ عبادت خانے میں لوگوں کے بیٹھنے کے لیے معقول جگہ نہ ہو لیکن جوتا رکھنے کی معقول جگہ ضرور ہوتی ہے خواہ جوتا کسی نامعقول آدمی ہی

کیوں نہ ہو۔ بلکہ ایک چوکیدار بھی مقرر کردیا جاتا ہے تاکہ جوتے کا خاص خیال رکھا جاسکے۔ کوئی چور (بلکہ عاشق بھی کہہ لیجیے) جب کسی گھر میں بغیر لائی سنس کے داخل ہونا چاہتا ہے تو سب سے پہلے وہ پیروں سے جوتا نکال کر جیب میں رکھ لیتا ہے۔ اس کے بعد ہی وہ چہار دیواری پھاندنے کی کوشش کرتا ہے۔ کیوں کہ جوتا چھوڑ کر بھاگنے کو وہ عزتِ نفس کے خلاف تصور کرتا ہے۔ چوری یا عاشقی کرنے کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ اپنے وقار کو بھی داؤں پر لگا دے۔ بعض چور اس ذلیل جوتے کے چرانے میں بھی اپنے وقار کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ اس چابک دستی سے جوتا چراتے ہیں کہ بے ساختہ منہ سے واہ نکل جاتی ہے۔ جس کا اندازہ ذیل کے واقعے سے بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ ایک بار ایک شخص کا لکھنؤ جانا ہوا۔ لکھنؤ میں بنے سلیم شاہی جوتے کی شہرت سن کر شخص مذکور نے ایک جوڑا جوتا خاص آرڈر دے کر بنوایا۔ اسے پہن کر حضرت بازار کی سیر کو نکلے۔ بازار میں ایک شناسا کی دکان پر پہنچے اور داہنے پیر سے جوتا نکال کر گفتگو میں مشغول ہوگئے (ہوسکتا ہے لاشعور میں یہ بات رہی ہو کہ دورانِ گفتگو جوتے کی ضرورت پڑ سکتی ہے) خیر جب چلنے کی غرض سے جوتا تلاش کیا تو معلوم ہوا کہ کسی نے غائب کر دیا ہے۔ بکتے جھکتے جوتے کی دکان پر پہنچے اور داہنے پیر کا جوتا بنانے کا آرڈر دے دیا۔ دو تین گھنٹے کے بعد جب دکان پر پہنچے تو دکاندار کی زبانی معلوم ہوا کہ ایک گھنٹہ قبل ہی آپ کا آدمی یہ کہہ کے جوتا لے گیا کہ کھویا ہوا جوتا مل گیا۔ (نوٹ: اس واقعے سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ جوتا چور صرف لکھنؤ میں ہی پایا جاتا ہے)

کھیل کا میدان ہو یا سیاست کا، بیرون در ہو یا اندرون خانہ، ہم ہر جگہ جوتے کا جائز اور معقول مصرف نکال لیتے ہیں۔ چوں کہ ہم جمہوری ملک کے باشندے ہیں اس لیے نہ صرف انفرادی طور سے بلکہ اجتماعی طور سے بھی جوتے بازی کے فروغ کے لیے کوشاں رہتے ہیں کھیل کے میدان میں ہم اکثر فٹ بال یا ہاکی کھیلتے کھیلتے جوتے سے کھیلنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس وقت عجب سماں ہوتا ہے کسی کا جوتا کسی کا سر کی جلتی پھرتی تصویر پورے میدان میں دکھائی دیتی ہے سیاست کے میدان میں اس دلچسپ کھیل کا مظاہرہ عموماً پارلیمنٹ میں کیا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جوتے بازی کی اس شاندار روایت کو تھوڑا اور جدید زمانے سے ہم آہنگ کیا جائے۔ مثلاً ووٹ دینے ہی کی تکنک کو دیکھا جائے۔ کاغذ پہ ٹھپا مار کر اپنے پسندیدہ امیدوار کو ووٹ دینا نہ صرف معقولیت سے پرے ہے بلکہ بعض اوقات خطرناک بھی ہے۔ اس کی جگہ یہ ہونا چاہیے کہ ہر شخص کو اپنے اپنے پسندیدہ امیدوار کے لیے ایک جوڑا جوتا، جس پر امیدوار کا نام چسپاں ہو، ووٹ بکس میں گرانے کی اجازت ہو۔ جن امیدوار کے نام زیادہ جوتے نکلیں اسے کامیاب امیدوار قرار دیا جائے۔ یا یہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ پولنگ بوتھ پر سبھی امیدواروں کا (کئی پولنگ بوتھ کی صورت میں قائم مقام بھی نامزد کیا جاسکتا ہے) جمگھٹا ہو اور ہر ووٹر اپنے امیدوار کی پیٹھ پر ٹھپے کی جگہ جوتا مار کر پسندیدگی کا اظہار کرے۔ اس کے کم از کم دو فائدے ضرور ہیں۔ اوّل تو یہ کہ اتنی بڑی تعداد میں ڈالے گئے جوتوں سے کم از کم الکشن کا خرچ تو نکل ہی سکتا ہے۔ دوم یہ کہ الکشن کے بعد سیاسی رہنما عوام کو جو خالی خولی ٹھینگا دکھا دیتے ہیں اس کے بدلے میں جوتا دکھائیں گے اور یہ کہہ کر کہ آپ نے ہم کو جوتا بھیجا بدلے میں ہم نے بھی آپ کو جوتا دکھایا۔ حساب برابر کر دیں گے۔ مزید براں حکومت جو عوام کو جوتے کی نوک پر رکھتی ہے اس کا بھی معقول جواز پیدا ہو جائے گا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جوتا انسانی زندگی کے معمولات میں بے حد دخیل ہے۔ یہ انسان کا سب سے بڑا رفیق بھی ہے اور رقیب بھی۔ یہ جہاں ہوش ٹھکانے لگانے کا فریضہ حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیتا ہے۔ وہیں ہوش اڑانے کا بھی۔ یہ رفع شر اور رفع خیر دونوں کے لیے یکساں مفید ہے اور جہاں جہاں اسے اپنی کارگزاری دکھانے کے مواقع نہیں ملتے وہاں وہاں بھی یہ اپنی حیثیت اپنے بل پر منوانے میں ید طولیٰ رکھتا ہے۔

اب آیئے ذرا چلتے چلتے اس کی پیدائش کے سبب پر بھی غور کرتے چلیں۔ جہاں تک جوتے کی ایجاد کا سوال ہے تو قیاسی گھوڑا ہی دوڑایا جاسکتا ہے۔ آیئے ذرا چشم تصوّر وا کریں اور دیکھیں کہ ابن آدم کو پہلی بار کیونکر جوتے کی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی۔ وہ دیکھیے ایک ٹیلے کے قریب چند نیم مہذب انسان بیٹھے نظر آرہے ہیں۔ غالباً کسی مسئلے پر بات چیت میں مشغول ہیں۔ آہا وہ دیکھیے بغل سے

گزرتے ہوئے ہرن پر ایک شخص کی نظر پڑتی ہے اور وہ ہتھیار لے کر شکار کے پیچھے دوڑ پڑتا ہے۔ مگر یہ کیا؟ وہ شخص ایک چیخ مار کر زمین پر دھم سے بیٹھ رہتا ہے۔ آیئے ذرا قریب چل کے دیکھیں کیا ہوا؟ گھبرایئے نہیں نیم مہذب ضرور ہے مگر بے سبب آپ پر حملہ آور نہ ہوگا۔ وہ اس کا ایک پیر زخمی ہو گیا ہے۔ غالباً کسی جانور کی ہڈی تلوے میں گھس گئی ہے۔ اب وہ کیا کر سکتا ہے سوائے حسرت بھری نگاہ سے شکار کو فرار ہوتے ہوئے دیکھنے کے۔ غالباً یہی حادثہ ہوگا جس نے اس عہد کے انسان کو ایک نئی سوچ دی ہوگی اور اس نے پیروں کی حفاظت کے خیال سے پہلی بار چھال یا کھال سے خام جوتا تیار کیا ہوگا۔ وہ دن اور آج کا دن یہ جوتا انسان کا پاؤں پکڑ پکڑ کے منت وسماجت کرتا رہتا ہے کہ حضور مجھے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھیں اس لیے کہ میں ہی ایک بغیر لائسنس کا ہمہ وقت کام آنے والا خود حفاظتی ہتھیار ہوں۔

OO

کلیاتِ مکاتیبِ اقبال (جلد اوّل)

اقبال ایک عظیم شاعر ہی نہیں اپنے عہد کے ایک بڑے دانشور اور مفکر بھی ہیں ان کے خطوط ان کی شاعری ہی کی طرح ان کی فکر و دانش کا مرقع ہیں بلکہ خطوط میں ان کی ہمہ جہت شخصیت کے بہت سے ایسے پہلو بھی نمایاں ہوئے ہیں جن کا اظہار اس اکملیت کے ساتھ ان کے کلام میں نہیں ہو سکا ہے۔

اقبال کا حلقۂ تعارف بہت وسیع تھا۔ ان کے سینکڑوں مکتوب الیہم میں والیانِ ریاست، فاضلانِ عصر اور رہنمایانِ وقت سے لے کر ان کے خادم خاص علی بخش تک کا نام شامل ہے۔ ان کے لکھے ہوئے تقریباً ڈیڑھ ہزار خطوط اب تک دریافت ہو چکے ہیں اور یہ سلسلہ ابھی جاری ہے۔

جناب مظفر حسین برنی نے علامہ اقبال کے خطوط کو تاریخی ترتیب سے جمع کیا ہے۔ جن خطوط کی تاریخیں بعض مجموعوں میں غلط چھپ گئی تھیں نئی تحقیق کی روشنی میں وہ درست کر دی گئی ہیں۔ جن خطوط پر تاریخ درج نہیں تھی ان کا زمانۂ تحریر اندرونی اور بیرونی شہادتوں کی مدد سے متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

"کلیاتِ مکاتیبِ اقبال" کی جلد اوّل میں علامہ اقبال کے ۱۸۹۹ء سے ۱۹۱۸ء تک لکھے ہوئے تین سو انیس (۳۱۹) خطوط شامل ہیں۔ ان میں سے ایک سو تینتیس (۱۳۳) خطوط کے عکس بھی دیے گئے ہیں اور ایک خط غیر مطبوعہ ہے۔

یہ خطوط نہ صرف علامہ اقبال کی فکر و دانش کا مرقع اور ان کی عالمانہ شخصیت کا آئینہ ہیں بلکہ ان میں ان کی نجی زندگی کے وہ گوشے بھی نمایاں ہو گئے ہیں جن تک کسی اور ذریعے سے رسائی مشکل تھی۔

مرتب : سید مظفر حسین برنی

صفحات : ۱۲۰۸

قیمت : ۱۷۰ روپے

انشاءِ ہادی النساء
مع
تحریر النساء

یہ کتاب اردو کی شہرۂ آفاق لغت "فرہنگِ آصفیہ" کے نامور مرتب منشی سید احمد صاحب دہلوی کی تصنیف ہے جو انھوں نے مسلم گھرانوں کی لڑکیوں اور عورتوں کو آدابِ خطوط نویسی سکھانے کے لیے لکھی تھی۔

اس کتاب کی پانچ فصلیں ہیں۔ پہلی فصل میں بڑی بوڑھیوں کے نام خط اور ان کے جواب ہیں۔ اس فصل میں چند خط میاں بیوی کے بھی ہیں۔ دوسری میں بہنوں کے خط اور ان کے جواب، تیسری میں برابر والیوں کے نام خط اور ان کے جواب، چوتھی میں اناّ، ماما، اصیل وغیرہ کے نام خط اور ان کے جواب اور پانچویں فصل میں رشتہ دار مردوں کے نام خط اور ان کے جواب ہیں۔ بیچ بیچ میں موقع و محل کی مناسبت سے نظمیں اور اشعار بھی درج کیے گئے ہیں اور حاشیے میں ان الفاظ و محاورات کی وضاحت بھی کر دی گئی ہے جو عورتوں کی مخصوص زبان کا حصہ ہیں اور مردوں کو انھیں سمجھنے میں دشواری پیش آ سکتی ہے۔

یہ کتاب بظاہر خطوط نویسی کے آداب پر ہے لیکن درحقیقت یہ اس سے زیادہ قدر و قیمت کی حامل ہے۔ اس کتاب سے عورتوں کے خانہ داری کے کل معاملات، ان کے دلی خیالات، روزمرہ کے برتاؤ اور باہمی معاملات، رسم و رواج، بچوں کی تفریح و تربیت کے ڈھنگ، کہاوتیں، پہیلیاں، طعنے مہنے، غرض زنانہ زندگی کا ہر پہلو بخوبی ظاہر ہوتا ہے ——— دہلی کی بیگماتی زبان میں کی گنگا جمنی معاشرت اور گھریلو ماحول کا منہ بولتا مرقع ہے۔

مصنف : منشی سید احمد دہلوی

صفحات : ۱۳۲

قیمت : ۳۲ روپے

اردو اکادمی، دہلی سے طلب کریں

نظمی سکندر آبادی

حقیقتوں کے جب آئینہ دار ہم بھی نہ تھے
یہاں کسی کی طبیعت پہ بار ہم بھی نہ تھے

جو تم صبا کی طرح تھے تو راہ میں ہم بھی
تھے سنگِ میل کی صورت، غبار ہم بھی نہ تھے

دُکھوں کو بانٹ ہی سکتے تھے شہر میں رہ کر
غریب شہر تھا وہ شہر یار ہم بھی نہ تھے

گلوں کے ساتھ ہمیں بھی تھی فکرِ جامہ دری
کہ ناشناسِ مزاجِ بہار ہم بھی نہ تھے

زمانے بھر سے چھپا لیتے رازِ دل اپنا
جہاں میں اتنے سلیقہ شعار ہم بھی نہ تھے

تجھے تھا کون دفاؤں سے روکنے والا
تری نظر میں جو بے اعتبار ہم بھی نہ تھے

بس اک صفت تھی بہم قدرِ مشترک نظمی
وہ سادہ دل تھے بہت ہوشیار ہم بھی نہ تھے

مکان نمبر ۸۵، گلی نمبر ۱۶، نارتھ گھونڈہ، دہلی ۵۳

رہگیر ہوں تجھ سے مرا رشتہ بھلا کیا ہے
وہ پیڑ ہے تو جو پسِ دیوار کھڑا ہے

ہر چند وہ اک آہنی دیوار تھی لیکن[1]
جُڑتے ہوئے رشتوں نے اُسے توڑ دیا ہے

آتا نہیں اُس کو ابھی سہمے ہوئے رہنا
لگتا ہے کہ اس شہر میں وہ شخص نیا ہے

انگریز مؤرخ کی گواہی پہ مرا عہد
ناکردہ گناہوں کی سزا کاٹ رہا ہے

کھڑکی سے تو بلوا لیا اُس نے مجھے درویش
میں نے بھی مگر سر کو نہیں جھکنے دیا ہے

ضمیر درویش

[1] دیوارِ برلن (جرمنی)

ای - ۵۱ - بی، ریلوے کالونی (نارتھ) مراد آباد ۲۴۴۰۰۱

عابد کرہانی

جب بھی اپنے سر سے اپنا قد سوا لگنے لگے
مت سمجھ لینا کہ تم سب کو خدا لگنے لگے

تو مری آواز میں کیوں اس طرح شامل ہوا
میں کسی کو دوں صدا، تیری صدا لگنے لگے

اُس کے چہرے پر جو پڑ جائے ترے چہرے کا عکس
شاخ سے ٹوٹا ہوا پتہ ہرا لگنے لگے

دیکھ کر تم کو سبھی منہ پھیرتے ہیں خوف سے
ایسا لگتا ہے کہ ہم بھی آئینہ لگنے لگے

میں نے شیشوں کی تجارت اس لیے تو کی نہ تھی
پتھروں کو خود مرا چہرہ برا لگنے لگے

وقت اچھا ہو تو دشمن سایہ بن کر ساتھ دے
وقت پڑ جائے، تو سایہ بھی جدا لگنے لگے

عام رستے سے ذرا سا ہٹ کے عابد فکر کی
اور تم سب سے الگ، سب سے جدا لگنے لگے

۱۷۶۸، حوض، سوئیوالان، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

محمد رضوان احمد خاں

احمد جمال پاشا

پاشا صاحب کو ان کی تحریروں کے توسط سے جانتا تو پہلے سے تھا مگر ان سے ملنے کا اتفاق پہلی بار اس وقت ہوا جب وہ خدا بخش لائبریری کی جانب سے منعقدہ خدا بخش توسیعی خطبات ۱۹۸۷ء میں شریک ہوئے۔ یہ خطبات پروفیسر کلیم الدین احمد نے دیے تھے۔ عنوان تھا "میری تنقید۔ ایک باز دید" اس کے بعد موقع بہ موقع ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ آخری ملاقات جنوری ۱۹۸۷ء کے آخری ہفتے میں اس وقت ہوئی جب وہ قاضی عبد الودود مرحوم کی برسی کے موقع پر خدا بخش لائبریری میں منعقدہ "اُردو ریسرچ کانگریس" میں شرکت کے لیے پٹنہ آئے۔ اُردو ریسرچ کانگریس کا انعقاد قاضی صاحب مرحوم کے قایم کردہ "ادارۂ تحقیقات اُردو" اور خدا بخش لائبریری کے اشتراک سے عمل میں آیا تھا۔ پاشا صاحب بھی مذکورہ ادارے کے اراکین میں ایک تھے۔ اس کے بعد ان سے میری ملاقات نہیں ہو سکی اور ۲۸ ستمبر کی شام کے ساڑھے سات بجے پٹنہ ریڈیو نے اپنے مقامی خبرنامے میں یہ روح فرسا اطلاع دی کہ پاشا صاحب کا انتقال ہو گیا۔ نہ کبھی بیماری کی خبر سنی نہ ہی مجھے یہ اطلاع تھی کہ مرحوم نے:

اپنی خوش فکریوں کے پردے میں
قلب افسردہ پال رکھا ہے!

ذہن کو شدید جھٹکا لگا۔ دو دنوں تک گویا سکتے کا عالم رہا۔ تیسرے دن پٹنہ روانہ ہوا کہ کچھ تو حال کھلے کہ یہ سب اچانک کیسے ہوا؟ سانحۂ ارتحال سے چوبیس گھنٹے پہلے کے واقعات ڈاکٹر اعجاز علی ارشد نے چشم دید گواہ کی حیثیت سے "کتاب نما" نومبر ۸۷ میں قلم بند کر دیے ہیں۔ یہاں ان کی تکرار لاحاصل ہے۔ مجھے جن باتوں نے قلم اُٹھانے پر مجبور کیا ان میں بعض ایسی ہیں جو شاید ناگفتہ رہ جائیں اگر میں نہ لکھوں۔

پاشا صاحب ابتدائی سطح پر صحافی اور ثانوی سطح پر مزاح نگار تو تھے ہی، ان کی شخصیت کی ان دو سطحوں کے مابین ایک سطح اور بھی زیریں لہر کے طور پر ساتھ ساتھ چل رہی تھی اور وہ تھی تحقیقی سطح جس کا اظہار، سیوان آنے کے بعد "پاشا اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ" کی شکل میں ہوا۔

قصہ یوں ہے کہ پاشا صاحب نے اپنے احباب کو کچھ سمجھنے بوجھنے اور کہنے پوچھنے کا موقع تو دیا نہیں۔ بس چپکے سے رخصت ہو گئے اور ایک اہم مسئلہ لاینحل رہ گیا۔ وفات کی صحیح ترین تاریخ (۲۸ ستمبر ۱۹۸۷ء) تو سب نے نوٹ کر لی بلکہ وفات کا صحیح ترین وقت (دن کے دس بجکر بیس منٹ) بھی مگر تاریخ ولادت تحقیق طلب رہ گئی جس کی ضرورت دراصل موت کی خبر کے ساتھ ہی پیش آجاتی ہے کہ ہر سننے والا مرنے والے کی عمر پہلے دریافت کرتا ہے۔

۲۸ ستمبر کی شام ساڑھے سات بجے پٹنہ ریڈیو نے مرحوم کے انتقال کی خبر کے ساتھ ان کی عمر ۵۲ برس بتائی۔ بلٹز (بمبئی) نے اپنے شمارہ ۱۰ اکتوبر ۸۷ء کے آخری صفحے پر مرحوم کی تصویر شائع کی اور اسی کے نیچے یہ خبر بھی کہ "مشہور و مستند طنز و مزاح نگار احمد جمال پاشا جن کا پچھلے دنوں ۵۴ سال کی عمر میں اچانک انتقال ہو گیا" بہار اُردو اکادمی کا خبرنامہ شمارہ ۹۵ بابت ماہ ستمبر ۱۹۸۷ء ملا تو پہلے صفحے پر فکر تونسوی اور پاشا کے انتقال کی خبریں نظر آئیں۔ آخر الذکر سے متعلق خبر میں سال پیدائش ۱۹۳۶ء درج تھا یہاں صرف سن پیدائش درج تھا، تاریخ پیدائش ہنوز تحقیق طلب رہی۔ پھر اسی خبر کے اس فقرے نے کہ "بوقت مرگ ان کی عمر ۵۸ سال تھی" مزید الجھن پیدا کر دی۔ مرنے والے کی عمر جو مرنے کے دن صرف ۵۲ سال تھی کس آسانی سے محض دو تین ہفتوں کے بعد ۵۸ سال ہو گئی ہے! میں نے مرحوم کی اہلیہ کو ایک خط لکھا جو تعزیت نامہ بھی تھا سوالنامہ بھی۔ تحقیق کے لیے احتیاط لازم ہے یہ سوچ کر اپنے ایک دوست کو جو ذکیہ آفاق اسلامیہ کالج، سیوان میں استاد ہیں اور جہاں خود پاشا مرحوم بھی ۱۹۷۵ء سے اُستاد کے فرائض انجام دیتے رہے تھے یہ اصرار لکھا کہ مرحوم سے متعلق ضروری معلومات دفتر سے حاصل کر کے مجھے فراہم کریں۔ اُدھر سے کوئی جواب نہیں آیا البتہ دہلی سے کتاب نما اور ایوان اُردو کے

صدر شعبۂ اُردو، فارسی، ایس۔ کے۔ آر۔ کالج، بربیگھہ، مونگیر

شمارے (نومبر ۸۷ء) آئے۔ کتاب نما نے اپنے اداریے میں پاشا صاحب کی عمر "باون ترپن برس کی" لکھی۔ اسی شمارے میں "اپنی یادیں بھی بھاؤ" کے زیرِ عنوان اعجاز علی ارشد کا مضمون ہے۔ ارشد صاحب کو مرحوم سے خاصی قربت تھی۔ تاریخ پیدائش کے سلسلے میں انھوں نے اس مضمون میں لکھا کہ "کسی محفل میں ہم دونوں کے ایک مشترک شاگرد نے ان کی تاریخ پیدائش کے سلسلے میں کچھ جرح کی تو کہنے لگے: "اصل میں ہم سب سولہ سترہ بھائی بہن تھے اس لیے ہماری امی جان ایک کی تاریخ پیدائش کو ہمیشہ دوسرے سے Confused کر دیتی تھیں ایسی حالت میں مجھے اپنی تاریخ پیدائش کیسے معلوم ہو سکتی ہے؟"

ماہنامہ "ایوانِ اردو دہلی" نے اپنے اردو خبرنامہ میں "رفتید ولے نہ از دلِ ما" کے ذیلی عنوان کے تحت کئی شخصیتوں کے سانحۂ ارتحال کی خبریں شایع کی ہیں جن میں سب سے پہلے احمد جمال پاشا ہی کا ذکر ہے۔ لکھا ہے:

"۲۸ ستمبر ۸۷ء کو اردو کے مشہور طنز نگار پروفیسر احمد جمال پاشا کا پٹنہ میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہوگیا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۵۵ سال تھی۔

پاشا اردو طنز و مزاح میں ایک منفرد حیثیت کے مالک تھے۔ یکم جون ۱۹۳۲ء کو خلد آباد الٰہ آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد الٰہ آباد میں جج کے عہدے پر فائز تھے۔ والد کے ریٹائر ہونے کے بعد ان کا خاندان لکھنؤ میں آباد ہوگیا۔ یہیں سے احمد جمال پاشا نے بی۔ اے پاس کیا اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم۔ اے کر کے درس و تدریس کو اپنا وسیلۂ معاش بنایا۔ کچھ عرصہ تک لکھنؤ کے روزنامہ "قومی آواز" کے شعبۂ ادارت سے بھی وابستہ رہے۔ ۱۹۷۵ء میں بہار یونیورسٹی کے اسلامیہ کالج سیوان کے شعبۂ اردو میں اُستاد مقرر ہوئے۔

۱۹۵۰ء سے انھوں نے لکھنا شروع کیا اور بہت جلد اردو ادب میں اپنا مقام بنالیا۔ اودھ پنچ کے لطیفے، مجاز کے لطیفے اور انتخاب نثر اکبر الٰہ آبادی ان کی مشہور کتابیں ہیں۔"

ان سطور سے ظاہر ہے کہ "ایوانِ اردو" نے قدرے محتاط انداز میں قلم اُٹھایا ہے محتاط انداز تو بہار اردو اکادمی کے خبرنامے کا بھی تھا مگر اس نے تاریخ پیدائش (۱۹۳۶ء) اور تاریخ وفات (۱۹۸۷ء) کا فرق معلوم کرنے میں زبردست غلطی کی اور لکھ دیا کہ "بوقت مرگ ان کی عمر ۵۸ سال تھی۔" ایوانِ اردو نے یہ غلطی نہیں کی لیکن قاری اس مخمصے میں ضرور پھنس گیا کہ باون، ترپن، چوون، پچپن اور اٹھاون میں صحیح کسے سمجھا جائے۔ میرے پیشِ نظر اردو کے تمام اخبارات و رسائل نہیں ہیں اس لیے نہیں کہہ سکتا کہ اس ضمن میں اور بھی کتنی روایتیں کہاں کہاں نقل ہوئی ہیں۔ جو کچھ سامنے آیا اس کے پیشِ نظر جو صورتِ حال ظہور پذیر ہوئی ہے اس کا خاکہ میں نے پیش کر دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ پاشا صاحب کی صحیح عمر بوقت مرگ پچپن سال تین مہینے اٹھائیس دن کی تھی۔ "ایوانِ اردو" کی نقل کردہ تاریخ پیدائش یکم جون ۱۹۳۲ء صحیح ہے۔ بہار اردو اکادمی کے خبرنامے نے جو تاریخ پیدائش ۱۹۳۶ء لکھی ہے وہ اگرچہ اوّل الذکر سے مختلف ہے تاہم غلط نہیں کہ یہ مرحوم کی "سرکاری تاریخ پیدایش ہے"۔ اس حقیقت کا انکشاف پاشا صاحب نے اُستاذی پروفیسر سید محمد حسنین کے نام اپنے ایک خط میں کیا تھا۔ پاشا صاحب کے الفاظ یہ ہیں:

"یکم جون ۱۹۳۶ء کو الٰہ آباد میں پیدا ہوا۔ دراصل یہ سرکاری تاریخ پیدائش ہے۔ میں اس سے چار سال قبل یکم جون ۱۹۳۲ء میں باقاعدہ پیدا ہو چکا تھا۔"

احمد جمال پاشا قلمی نام تھا۔ اصل نام بہ روایت اعجاز علی ارشد "آغا محمد نزہت پاشا" اور والد کا نام "آغا شجاعت پاشا" تھا (بحوالہ "انشائیے" مرتبہ ڈاکٹر اعجاز علی ارشد و مطبوعہ لیبل آرٹ پریس، شاہ گنج، پٹنہ باراوّل نومبر ۱۹۸۱ء)۔

شہر سیوان سے پاشا کا تعلق ۱۹۶۶ء میں استوار ہوا جب انھوں نے سرور جمال پاشا سے پیمانِ وفا باندھا۔ ذکیہ آفاق اسلامیہ کالج کی تاسیس غالباً ۱۹۷۲ء میں ہوئی۔ ابتداءً ناصر رضا خاں جلالی شعبۂ اردو کے اُستاد مقرر ہوئے۔ ۱۹۷۳ء میں انھوں نے بہار اردو اکادمی پٹنہ کی ریسرچ اسکالرشپ قبول کرلی اور پروفیسر کلیم الدین احمد کے زیرِ نگرانی "کلیات شاد" پر کام کرنے لگے۔ کالج میں ان کی جگہ نشاط افزا صاحبہ کا تقرر ہوا جو ہنوز اپنے عہدے پر برقرار ہیں۔ پاشا صاحب ۱۹۷۵ء میں موصوفہ کے شریک کار بنے۔ ۱۹۸۲ء میں ایک ناگوار واقعہ پیش آیا۔ پاشا صاحب کو تمباکو نوشی کی عادت ہی نہیں لت تھی۔ اکثر پائپ اور کبھی کبھار سگریٹ پیتے تھے۔ کالج کے سکریٹری کو اطلاع ملی کہ پاشا صاحب کلاس

روم میں بھی سگریٹ پیتے ہیں۔ بس اسی بات
پر انھیں Suspend کر دیا۔ اس واقعہ کا
علم مجھے اسی کالج کے ایک اُستاد کی زبانی ہوا۔
انھوں نے یہ بھی کہا کہ اس واقعے سے ہم سب
کو ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ہم میں جو انتشار تھا وہ
ختم ہوگیا اور ہم پوری طرح متحد ہو گئے، ہمارا
احساس حمیّت بیدار ہو گیا جس کے نتیجے میں
چند ماہ (تقریباً چھ مہینے) بعد پاشا صاحب
تو اپنی جگہ پر آ ہی گئے، ہمارے دوسرے
مسائل بھی بحسن وخوبی سلجھنے لگے۔ انھوں نے
قدرے جذباتی ہو کر کہا کہ "اسے میں ذاتی طور
پر پاشا صاحب کی نیک اور دلکش شخصیت
کی دین سمجھتا ہوں"۔

پاشا صاحب نے طبیعت بڑی لاابالی پائی
تھی۔ نعمت اولاد سے محروم رہے لیکن اس
باب میں اپنی دل گرفتگی کا اظہار کبھی نہیں
ہونے دیا۔ ۱۹۸۵ء میں اچانک سُنا کہ سفر
حج پر روانہ ہو گئے۔ دل میں سوچا۔ حاجی
احمد جمال پاشا! یا للعجب!! مگر نہیں صاحب
واپسی پر ملاقات ہوئی تو سر پر تبلیغیوں والی
گول ٹوپی اور ہنستے ہوئے نورانی چہرے پر
حسین خشخشی! اب دل نے سوچا: ایں سعادت
بزورِ بازو نیست!

پاشا صاحب اعلیٰ علمی ذوق رکھتے تھے۔
انھیں کتابیں تو عزیز تھیں ہی، خواہ ان کا
موضوع کچھ بھی ہو، اہل علم کی صحبت میں
بیٹھنے اور ان سے معلومات حاصل کرنے کا
ذوق بھی کچھ ایسا تھا کہ ایسے موقعوں پر وہ
طالب علم بن جاتے تھے۔ جنوری ۸۷ء کے
آخری ہفتے میں، اُردو کانگریس کے موقع پر
میرے کمرے میں پروفیسر فرخ جلالی (مسلم
یونیورسٹی، علی گڑھ) بھی قیام پذیر تھے۔ رات
کے کھانے کے بعد پاشا صاحب جن کا کمرہ بغل
کے دو کمروں کے بعد تھا ہم لوگوں کے کمرے
میں آ گئے۔ گفتگو کا سلسلہ لطایف سے شروع
ہو کر مختلف جہتوں سے سفر کرتا ہوا تاریخ پر
آ ٹھہرا۔ قدیم تواریخ اور زمانۂ ماقبل تاریخ
کے حالات وکوائف، قیاسات وحقایق اور
مطالعات وتحقیقات سے متعلق عجایبات ومطایبات
کا سلسلہ چلا تو بس چلتا ہی رہا یہاں تک کہ رات
کے دو بج گئے۔ ہمیں تو اس حقیقت کا علم نہ
تھا کہ پاشا صاحب مریض ہیں اور مستقل
دوائیں لیتے ہیں مگر خود انھیں تو اس بات
کا علم تھا اور ان کے معالج نے رات دیر
گئے تک اس طرح جاگتے رہنے سے منع ضرور
کیا ہوگا مگر انھیں ان باتوں کی پروا ہی
کب تھی؟ وہ تو بس "غنیمت جانیے مل بیٹھنے کو"
کے قایل تھے۔

یوں تو دُنیا اتفاقات کی جگہ ہے مگر
کبھی کبھی یہ اتفاقات بعض شخصیتوں کے
گرد کچھ اس طرح یکجا ہو جاتے ہیں کہ عقل
حیران رہ جاتی ہے۔ غیب کا علم فقط اللہ
کو ہے۔ عقل انسانی توجیہہ وتصریح میں
غلطاں ہوتی ہے مگر قاصر رہتی ہے۔ پاشا
صاحب کے گرد بھی اتفاقات کی یکجائی کچھ
ایسی ہوئی کہ عقل کو حیرت ہے ——
سیوان میں ان کی قیام گاہ "کوٹھی نشاط افزا"
اور کالج میں ان کی صدر شعبہ "محترمہ نشاط
افزا" —— جائے پیدائش خلد آباد (الٰہ آباد)
اور جائے وفات باقی پور (عظیم آباد) مگر
مدفن وہی سیوان جہاں ان کے ایک انشائیے
"میڈم اور مرغ" کا ہیرو ... "مرغ اصیل"
دفن ہے جس کی شہ زوریوں نے انھیں انشائیہ
لکھنے پر مجبور کیا تھا۔ قصّہ یوں ہوا کہ ایک
میڈم نے ایک مرغ پالا۔ وہ اتفاق سے "شریر"
اور "کٹکھنا" نکل آیا۔ پاس پڑوس کے بچے،
بکرے، مرغ، مُرغیاں سب اس کی زد میں آنے
لگے۔ ایک دن اس نے پڑوس کی ایک ننھی
بچّی کو زخمی کر دیا جو اپنے والدین کی اکلوتی بچّی
تھی۔ پڑوسی نے جب میڈم سے مرغ کو سنبھال کر
رکھنے کی شکایت آمیز گزارش کی تو جواب ملا کہ
آپ اپنی بچّی کو سنبھالیے۔ بات آگے بڑھی اور
پاشا کو ایک دلچسپ موضوع مل گیا۔ انھوں
نے اپنے مخصوص انداز میں انشائیہ ان جملوں
سے شروع کیا:

"میڈم نے مُرغ اس طرح پالا جیسے مغرب
جنوبی افریقہ کو۔ کالونی میں مُرغ کا آنا تھا کہ نو تعمیر
فلیٹوں کی قیمتیں گرنے لگیں۔ مخالفین خوار اور
پڑوسی لہولہان ہونے لگے ....."

چند دن بعد کسی حادثۂ ناگہانی کے
سبب یہ مُرغ مر گیا۔ اہل خانہ نے باضابطہ سوگ
منایا اور اہتمام کے ساتھ اسے دفن کیا۔ انشائیے
کا اختتام ان جملوں پر ہوا:

"چلتے چلاتے میں نے فرمایش کر دی۔
میڈم اس بار آپ لکھنؤ سے مُرغ اصیل منگوائیے،
سب کے دماغ ٹھیک کر دے گا۔"
"مرحوم مُرغ اصیل ہی تھا"۔

یہاں تک تو خیر قصّہ ہوا۔ اب اتفاقات
دیکھیے کہ چند ماہ بعد وہ بچّی بھی اللہ کو پیاری
ہو گئی جسے اس مُرغ نے زخمی کیا تھا اور جس کے سبب
بات انشائیے تک آئی تھی۔ پھر یہ بھی کہ یہ
انشائیہ ماہنامہ "آج کل" کے شمارہ ستمبر ۱۹۸۶ء
[illegible]

اللہ کو پیارے ہوگئے۔ "دماغ ٹھیک" کر دینے والی بات بھی کچھ کم بلاغت کی حامل نہیں۔

بُزرگوں سے سُنتا آیا ہوں کہ اگر کوئی شخص استطاعت ہوتے ہوئے حج کیے بغیر دُنیا سے کوچ کر جائے تو اللہ پاک کو اس کی کچھ پروا نہیں کہ وہ یہودی مرے کہ نصرانی! نیز یہ بھی کہ بعد از حج انسان گُناہوں سے ایسا ہی پاک ہو جاتا ہے جیسے بطنِ مادر سے وہ پیدا ہوا تھا۔ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ اٹل ہے کہ موت اپنے وقت معیّنہ سے نہ تو ایک ساعت پہلے آتی ہے اور نہ ایک ساعت بعد! پاشا کی معیادِ قیدِ حیات بھی پوری ہو چکی تھی۔

— سفرِ حج سے پہلے جنوری ۸۵ میں مرحوم نے اپنے مضامین کے تازہ ترین مجموعے "پتّیوں پر چھڑکاؤ" کی ترتیب کے دوران "جڑوں کی تلاش" کے زیرِ عنوان لکھا تھا کہ:

"خاکسار گوشہ نشیں قسم کا انسان ہے... صحبت ناملائم دیکھ کر کنارہ کش ہو جاتا ہے۔ ادب اور عاقبت سے ڈرتا اور پڑھتا لکھتا ہے...."

خوشی کی بات ہے کہ عاقبت سے ڈرنے والے اس نیک طینت انسان کو مرنے سے پہلے حج کی سعادت بھی نصیب ہو گئی اور نہ صرف یہ بلکہ ظاہر و باطن، گفتار و کردار اور اعمال و اطوار ہر اعتبار سے دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اب وہ پورے طور پر حاجی احمد جمال پاشا بن چکے ہیں۔

"پتّیوں پر چھڑکاؤ" ۱۹۸۶ء میں شایع ہوئی اور اس کا انتساب "فکر تونسوی کے نام" ہے۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ فکر تونسوی نے بھی سفرِ آخرت کے لیے ۸۷ء کا ماہ ستمبر ہی منتخب کیا اور پاشا مرحوم سے دو ہفتے پہلے دُنیا کو خیرباد کہہ گئے۔ یوسف ناظم نے لکھا:

"ابھی فکر تونسوی کو ہم ٹھیک سے رُخصت بھی نہ کر پاتے تھے کہ پٹنہ سے یہ خبر آئی کہ احمد جمال پاشا چل بسے۔ فکر کو گزرے جملہ پندرہ ہی دن ہوتے تھے۔ پندرہ دنوں میں دو مزاح نگار۔ یہ تو کوئی انصاف نہیں ہوا۔ ستم ظریفی ہوئی" (بلٹز، بمبئی شمارہ ۱۰ اکتوبر ۸۷ء صفحہ ۴۲)۔

فکر کا ذکر آ ہی گیا تو یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ "ایوانِ اُردو" دہلی (نومبر ۸۷ء) نے ان کا ایک طنزیہ بعنوان "دوستوں سے" شایع کیا ہے اور اداریے میں اس سے متعلق یہ خبر دی ہے کہ:

"اس شمارے میں فکر تونسوی صاحب کا جو طنزیہ شایع ہو رہا ہے، وہ انھوں نے اپنے انتقال سے چند ہی روز پہلے ہمیں ارسال کیا تھا۔ یہ غالباً ان کے قلم کی آخری تحریر ہے جسے آپ کا محبوب رسالہ شایع کر رہا ہے۔"

فکر کے اس مضمون کا انداز ذکی انور کے ان افسانوں جیسا ہے جو خطوط پر مشتمل ہوا کرتے تھے۔ پہلا خط "مستور غزنوی کے نام" دوسرا "کے۔ کے۔ ــــ کے نام" تیسرا "مسٹر سرہندی کے نام" چوتھا "لم سلیمے کے نام" پانچواں "صابری صاحب کے نام" اور چھٹا "مسز شردتا کے نام" ہے۔ ان میں پہلا خط جو "مستور غزنوی کے نام" ہے، اتفاق سے اپنے ابتدائی جملوں میں حرف بہ حرف "پاشا کے نام" بن گیا ہے۔ جسے پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ جملے فکر نے عالمِ برزخ سے تحریر کیے ہیں۔ آپ بھی دیکھیے! صرف اتنی زحمت کے ساتھ کہ ذہن میں "مستور" کی جگہ "پاشا" ہو:۔

"مستور میاں!

یہ تو اچھا ہوا کہ تم انتقال کر گئے۔ اِنتقِ... ہیں اگرچہ تم لیٹ ہو گئے۔ آٹھ دس سال بعد انتقال فرماتے تو بے حد پچھتاتے۔

تمھارے انتقال سے ایک تو تمھاری رُوح کو نجات ملی۔ نہ جانے کس وقت سے وہ تمھارے باطن سے نبھا رہی تھی۔ تمھاری نیک طینتی، تمھارے خلوصِ قلب اور تمھارے بے ساختہ دانشورانہ جملوں سے وہ بیحد نالاں تھی..."

فکر کے یہ جملے تو محض اتفاقی ہیں جنھیں مَیں نے پاشا کے احوال پر منطبق کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اعجاز علی ارشد کا یہ جملہ اتفاقی ہرگز نہیں کہ:

"شدّتِ احساس کی جس کیفیت میں احمد جمال پاشا مبتلا تھے، اس کے ساتھ زیادہ دنوں تک زندہ رہنا مشکل ہی تھا" (کتاب نما نومبر ۸۷ء، صفحہ ۱۸)۔

بہرکیف! یہ باتیں ضمناً آ گئیں۔ مَیں ذکر کر رہا تھا سفرِ حج کے بعد پاشا کی شخصیت میں محسوس کی جانے والی تبدیلیوں کا۔ ایک معتبر راوی کے مطابق حج سے واپسی کے بعد کالج کے اوقات کے علاوہ پاشا کا زیادہ وقت مدرسہ سراج العلوم کے دینی و رُوحانی ماحول میں گزرتا تھا۔ ۸ ستمبر کو ڈاکٹر کلیم عاجز (جو صوبہ بہار میں تبلیغی جماعت کے امیر ہیں) سیوان گئے اور پاشا صاحب کے یہاں قیام کیا۔ دوسرے دن صبح ۹ بجے وہاں بارہ چودہ احباب جمع ہو گئے جن میں بیشتر ذاکر آفاق اسلامیہ کالج اور مدرسہ سراج العلوم کے اساتذہ تھے۔ تبلیغ میں وقت دینے کی بات چلا

نکلی۔ پاشا صاحب نے امیر موصوف سے اچانک سوال کیا کہ: "تبلیغ میں مزا ملتا ہے؟ کھانے پینے کی کوئی دقت تو نہیں ہوتی؟" یہ سن کر کلیم عاجز صاحب نے جواباً کہا کہ: "پہلے چل کر تو دیکھیے کہ مزا ملتا ہے یا مزا کرکرا ہوتا ہے؟ رہا کھانے کا سوال تو آپ میرے ساتھ چلیں انشاء اللہ دقت نہیں ہوگی۔" تب پاشا صاحب نے کہا کہ "ٹھیک ہے! میں نے بھی وقت دیا۔" بعدہٗ یہ طے پایا کہ ۲۷ ستمبر کو پٹنہ کے تبلیغی مرکز "نوری مسجد" میں ہونے والے "مشورے" میں شریک ہونا ہے جہاں جماعتیں تشکیل پائیں گی اور سمت سفر کا تعین ہوگا۔

ذہن اس سلسلے میں سفر کے لیے پہلے سے آمادہ تھا ہی، جب چند روز باقی رہ گئے تو ایک اور بہانہ یہ مل گیا کہ آل انڈیا ریڈیو پٹنہ نے پاشا کے نام ایک کنٹریکٹ ارسال کر دیا جس پر ریکارڈنگ کی تاریخ ۲۶ اکتوبر ۸۷ء درج تھی مگر جیسا کہ عجلت میں اکثر ہوا کرتا ہے، پاشا نے اسے ۲۶ ستمبر ۸۷ء سمجھا اور ۲۷ کی بجائے ۲۶ ہی کو پٹنہ چلے آئے۔ پہلی فرصت میں وہ ریڈیو اسٹیشن پہنچے۔ ریکارڈنگ کے لیے نہیں بلکہ یہ معذرت کرنے کے لیے کہ اتنی قلیل مہلت میں مضمون کی تیاری ممکن نہیں لہٰذا تاریخ بڑھا دی جائے۔ ڈاکٹر عبدالخالق نے مجھے بتایا کہ انھوں نے جب پاشا صاحب کی توجہ کنٹریکٹ پر دی ہوئی تاریخ کی جانب مبذول کراتے ہوئے یہ کہا کہ تاریخ بڑھانے کی ضرورت نہیں، ابھی تو ایک ماہ باقی ہے۔ یہ ریکارڈنگ آج نہیں بلکہ آئندہ ماہ کی ۲۶ کو ہوگی۔ تب وہ اپنے اس عاجلانہ اقدام پر شرمندہ بھی ہوئے اور ریکارڈنگ کی صحیح تاریخ کے انکشاف پر مطمئن بھی کہ وقت ابھی کافی ہے۔ انھیں کیا پتہ تھا کہ وقت اب بچا ہی کہاں ہے؟

پاشا جب پٹنہ آتے تو ضروری کاموں سے فراغت کے بعد پہلی فرصت میں خدا بخش لائبریری پہنچتے اور ڈاکٹر عابد رضا بیدار سے ضرور ملتے اس روز بھی ایسا ہی کیا۔ ریڈیو اسٹیشن سے نکلے تو لائبریری پہنچے۔ وہاں ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے انھیں بتایا کہ شام میں ادارۂ تحقیقات اردو کی میٹنگ ہے اور بعد مغرب پروفیسر سید حسن (سابق صدر شعبۂ فارسی، پٹنہ یونیورسٹی) کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں ایک ادبی نشست بھی شام ہونے والی تھی۔ تین بج چکے تھے۔ بیدار صاحب نے ازراہ مہمان نوازی ایک کمرے میں کچھ دیر آرام کر لینے کا انتظام کر دیا اور ریک شلف سے ایک نئی کتاب نکال کر دے دی کہ اسے دیکھیے گا۔ اسرار جامعی بھی ساتھ تھے۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ مذکورہ کتاب کے سرورق پر دل کی تصویر تھی۔ پاشا صاحب لیٹے رہے، باتیں کرتے رہے اور بار بار نہ جانے کیوں اس تصویر کو دیکھتے رہے۔ کتاب کھولی تک نہیں۔ پھر ادارۂ تحقیقات اردو کی میٹنگ کا وقت ہو گیا لہٰذا شرکت کے لیے دونوں باہر آ گئے۔ یہ میٹنگ مغرب تک چلی۔ بعدہٗ سید حسن صاحب کے اعزاز میں نشست کا آغاز ہوا۔ اس سے فرصت ملی تو رات ہو چکی تھی۔ سبزی باغ آئے۔ بُک امپوریم کے مالک حمید صاحب نے مجھے بتایا کہ پاشا صاحب جب اُن کی دکان پر آئے تو چہرہ عرق آلود تھا اور بشرے سے پریشانی ظاہر تھی۔ انھیں دکان کے اندر بٹھایا اور پنکھے کا رخ ان کی جانب کر دیا۔ قدرے سکون ہوا تو پوچھا "قیام کہاں ہے؟" انھوں نے پٹنہ سٹی میں کسی دوست کا نام بتایا۔ کچھ دیر وہاں رُکے پھر رخصت ہو گئے۔

پٹنہ سٹی میں پاشا کے ایک شاگرد ظفر کمالی رہتے ہیں جو ڈاکٹر اعجاز علی ارشد کی نگرانی میں پاشا کی حیات اور کارناموں کے موضوع پر تحقیقی کام کر رہے ہیں۔ اسرار جامعی نے بتایا کہ ایک موقع پر ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے پاشا صاحب کی موجودگی میں تحقیق کے اس موضوع پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ زندوں پر تحقیق کے کیا معنی؟ وہ تو خود ہی سب کچھ لکھوا دیں گے پھر تحقیق کیا ہوئی؟ لیجیے صاحب! پاشا کی موت نے اس اعتراض کی گنجائش بھی باقی نہیں رہنے دی۔ یہ بھی ایک اتفاق ہی ہے۔ بہرکیف! پاشا اپنے پٹنہ کے سفر میں جب کسی ہوٹل میں نہیں ٹھہرتے تو اپنے اسی شاگرد کے یہاں قیام کرتے تھے۔ اس رات بھی انھوں نے وہیں قیام کیا۔ دوسری صبح جب وہ اعجاز علی ارشد کے یہاں پہنچے اس کے بعد کی تفصیل خود ارشد صاحب کی زبانی کتاب نما میں شایع ہو چکی ہے جس کا حوالہ گزشتہ صفحات میں گزر چکا۔

۲۷ کو پاشا صاحب کے دوسرے احباب بھی سیوان سے آ گئے جنھیں نوری مسجد کے "مشورے" میں شریک ہونا اور

تبلیغی دَورے پر جانا تھا۔ ان لوگوں نے پہلے تو پاشا کو ان ہوٹلوں میں تلاش کیا جہاں وہ عموماً قیام کرتے تھے مگر ناکامی ہوئی۔ نوری مسجد گئے۔ وہاں بھی نہیں پایا۔ جب کافی دیر ہوگئی اور وہ نہیں آئے تو تشویش ہوئی۔ اتنے میں کسی نے بتایا کہ انھیں دل کا دَورہ پڑا ہے اور وہ پٹنہ میڈیکل کالج کے اندرا گاندھی انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیالوجی میں داخل کر دیے گئے ہیں۔ عیادت کرنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ دُعائیں کی جاتی رہیں، دوائیں دی جاتی رہیں ہوش اور بے ہوشی کے وقفے آتے رہے، جاتے رہے۔ جب آنکھیں کھولتے اور چہرے پر مسکراہٹ لیے کچھ بولنا چاہتے تو کہا جاتا کہ ڈاکٹر نے منع کیا ہے۔ چُپ ہو جاتے۔ مگر انھیں چُپ رہنا گوارا ہی کب تھا؟ ہنستے ہوئے بولے کہ: "میرے نہ بولنے سے قضا تھوڑی ہی ٹل جائے گی؟ بالآخر وہی ہوا بھی! سفرِ تبلیغ ان کے لیے سفرِ آخرت بن گیا۔

اسرار جامعی ہر مرحلے پر ساتھ رہے۔ انھوں نے بتایا کہ آخری لمحوں میں دِل کی حرکت بتانے والی مشین کے پردے پر رقصِ حیات کا نقشہ پیش کرنے والا نقطہ جب وحشیانہ تیزی کے ساتھ حرکت کرنے لگا تو میں گھبرا گیا اور سوچا کہ شاید یہ اس رقص کا نقطۂ عروج ہے جس کے بعد جلد ہی اختتام کی منزل آنے کو ہے۔ عین اسی لمحہ پاشا بھی گھبرائے ہوئے سے اُٹھ بیٹھے اور کلمۂ لا الٰہ الا اللہ کا ورد کرتے ہوئے پھر لیٹ گئے۔ اور اب جو لیٹے تو کبھی نہ اُٹھنے کے لیے ـــ ڈاکٹر آئے۔ دِل کو پھر سے حرکت میں لانے کی کوشش کیں مگر بے سود!

گزشتہ صفحات میں "عاقبت سے ڈرنے" والی بات گزر چکی ہے۔ ڈاکٹر اعجاز علی ارشد نے پاشا سے متعلق اپنے مضمون محولہ بالا میں ایک جگہ لکھا ہے کہ:

"ابھی پچھلے دنوں بہار کے مختلف علاقوں میں خوفناک سیلاب آیا تو ریلیف کے کپڑے خود اپنے کندھوں پر لاد کر مصیبت زدگان کو پہنچائے کسی نے ہمدردی جتائی تو کہا ـــ "پل صراط طے کرنے کی پریکٹس کر رہا ہوں"۔

جنازے کے ساتھ بہت سے جماعتی احباب نے سیوان جانا چاہا مگر پھر سو[ال] ہی کیا ہے؟ دُعائے مغفرت تو کہیں [بھی] کی جا سکتی ہے بلکہ بہ حالت سفر زیاد[ہ] چنانچہ ان کی جماعت رانچی گئی جس [میں] کلیم عاجز بھی شامل تھے اور جن کے [ساتھ] پاشا صاحب کو بھی جانا تھا پوری جم[اعت] رانچی کی مختلف مسجدوں میں سینکڑ[وں] بندگان خدا کے ساتھ کئی دنوں تک" والے" کے لیے دُعائے مغفرت کرتی ر[ہی]

مرگ مجنوں سے عقل گم ہے میر
کیا دِوانے نے موت پائی ہے

رنگ ہزاروں خوشبو ایک

بیکلؔ اتساہی کے قبولِ عام میں صرف ان کی وضع قطع اور اُن کے دلکش ترنم کو دخل نہیں، اس میں ان کی شاعرانہ انفرادیت کا بھی حصّہ ہے۔

بیکلؔ صاحب نے پرانی فنّی رکھ رکھاؤ والی غزل سے اپنے شعری سفر کا آغاز کیا تھا لیکن اس راہ پر وہ زیادہ دور تک نہیں گئے اور اپنے طبعی رجحان کے تقاضے سے انھوں نے ایک نیا راستہ کھوج نکالا جو دیہات کی غیر متکلف اور سادہ زندگی کے دُکھ سکھ سے جنم لینے والے جذبات و احساسات کی ترجمانی کا راستہ ہے۔ ان جذبات و احساسات کی ترجمانی میں انھوں نے اودھی اور برج کے گیتوں، دوہوں اور چوپائیوں، بھوجپوری دو پدوں اور کبیتاؤں کے روپ رس کو اس طرح اپنے اسلوب میں سمویا ہے کہ اس کی مثال ہمعصر اردو شاعری میں کہیں اور مشکل ہی سے تلاش کی جا سکے گی۔

بیکلؔ صاحب کے ترنم کی نقالی آج کے بہت سے مشاعرہ باز شاعر کرنے لگے ہیں لیکن بیکلؔ صاحب کے ترنم میں ان کی شاعرانہ شخصیت کا جو آہنگ شامل ہے وہ انھی کا حصّہ ہے اور ان کی نجی پہچان بن چکا ہے۔

عوامی زندگی کے روپ رنگ اور لوک سنگیت کے آہنگ سے بھرپور شاعری۔

شاعر : بیکلؔ اتساہی
صفحات : ۱۵۲
قیمت : ۲۸ روپے

اُردو اکادمی، دہلی سے طلب کریں

ی ٹونکی

نابینا چشم دید گواہ

صبح دس بجے کا وقت ہے۔
بہت مصروف سڑک ہے موٹر گاڑیاں
سے آ، جا رہی ہیں۔ موٹر سائیکل اسکوٹر
ل، سب پر عجلت سوار ہے۔
اچانک ایک کار سائیکل سے ٹکراتی
سائیکل سوار اچھل کر آگے گرتا ہے۔ کار
بلتی ہوئی تیزی سے بھاگ جاتی ہے۔
سے آنے والی گاڑیاں، زخمی سائیکل سوار
باتی ہوئی آگے بڑھ جاتی ہیں۔ کھڑکیوں
نکلتے ہیں، زخمی آدمی کو دیکھتے ہیں پھر
ریک جاتے ہیں۔
زخمی آدمی تڑپ رہا ہے۔ پورا سر خون
بہ تر ہے۔ اس کی سائیکل ٹیڑھی میڑھی
یک طرف پڑی ہے۔ ٹفن، سائیکل سے
سڑک پر بکھر گئی ہے۔ سبزی اور روٹی
ںیں سے نکل گئی ہے۔ زخمی آدمی تڑپ
ہے۔ اس کے چاروں طرف دس بارہ آدمی
و گئے ہیں۔ دوسرے لوگ بھی تیزی سے
رف بڑھ رہے ہیں۔
بھیڑ میں سے آوازیں ابھرتی ہیں:
"ارے بے چارہ بہت زخمی ہوگیا
،
"بُری طرح تڑپ رہا ہے۔ اسے
ل لے جانا چاہیے۔"
"ہاں اسے اسپتال لے جانا چاہیے۔"
"کوئی گاڑی روکو ——"

"کوئی ٹیکسی روکو ——"
"ٹیکسی ٹیکسی ——"
کئی ہاتھ ایک ٹیکسی کے سامنے ہلتے
ہیں۔ لیکن بھری ٹیکسی گزر جاتی ہے کئی گاڑیاں
نکلنے کے بعد ایک کار رکتی ہے۔
"کیا بات ہے؟" ڈرائیور پوچھتا ہے۔
"ایک آدمی زخمی ہوگیا ہے۔ اسے اسپتال
لے جانا ہے۔"
"میری گاڑی فالتو نہیں ہے۔" وہ
ایک دم ایکسی لیٹر دبا دیتا ہے۔ بھیڑ دیکھتی
رہ جاتی ہے۔
ایک دوسرے کے منہ کھلتے ہیں:
"لو حد ہو گئی بے رحمی کی ——"
"کمال ہے —— ہمدردی کا جذبہ ذرا
بھی نہیں ہے ——"
"لوگ تو جانور ہو گئے ہیں جانور ——"
"روکو روکو —— دیکھو وہ گاڑی آرہی
ہے۔ شاید خالی ہے۔"
"ہاں خالی ہے ——"
"روکو روکو ——"
کئی ہاتھ پروں کی طرح پھڑپھڑاتے
ہیں۔ لیکن وہ گاڑی نہیں رکتی ہے۔ دو تین
گاڑیاں اور گزر جاتی ہیں پھر ایک کار
رکتی ہے۔
"کیا بات ہے ——؟"
"ایکسیڈینٹ میں ایک آدمی زخمی

ہو گیا ہے۔ اسے اسپتال لے جانا ہے۔"
"دیکھتے نہیں نئی گاڑی کی کنڈیشن
شوروم سے لا رہا ہوں ——"
کار آگے بڑھ گئی۔ بھیڑ کی وہی غصے
بھری باتیں اور تاسف —— زخمی بری طرح
تڑپ رہا ہے۔
"پولیس کو ٹیلیفون کرو ——"
"ہاں، پولیس کو ٹیلیفون کرو ——"
"مگر فون کہاں ہے ——؟"
"ارے صاحب۔ وہ سامنے میڈیکل اسٹور
میں ٹیلیفون ہے۔"
زخمی آدمی تڑپ رہا ہے۔ بھیڑ بڑھ
رہی ہے۔ ایک گاڑی رکی جاتی ہے۔
"کیا بات ہے" ڈرائیور سیٹ سے
عزاہٹ بھیڑ کے چہروں پر ٹپکتی ہے۔
"ایکسیڈینٹ ہو گیا ہے۔ زخمی آدمی
کو اسپتال لے جانا ہے۔"
ڈرائیور تقریباً بھونکتا ہے "دیکھتے
نہیں منسٹر صاحب کی کار ہے۔ ان کے بچے
کے لیے کرکٹ بال خریدنے جا رہا ہوں ——"
کھڑکی کی طرف جھکے چہرے پیچھے ہٹ
جاتے ہیں۔ کار آگے بڑھ جاتی ہے دو تین
گاڑیوں کے بعد ایک گاڑی روک لی جاتی ہے۔
وہی سوال وہی جواب:
ڈرائیور کہتا ہے "اسپتال لے تو
جاؤں گا مگر وہاں بھرتی کون کرائے گا؟ دوا
دارو کون لائے گا؟ اسپتال میں پوری دوائیں
ملتی کب ہیں ——"
بھیڑ میں سے کوئی جواب نہیں دیتا۔

مبارک منزل، پانچ بتی، ٹونک ۳۰۴۰۰۱ (راجستھان)

آپس میں کُھسر پُھسر ہوتی ہے۔ اس بیچ
گاڑی کھسک جاتی ہے لوگ پھر ایک گاڑی
کو روکتے ہیں۔ وہی سوال وہی جواب:
ٹیکسی ڈرائیور تجربے کار ہے کہتا ہے
"زخمی آدمی اگر راستے میں مر گیا تو ___؟ لاش
کہاں جمع کراؤں گا ___؟ تھانے میں رپورٹ
کون کرے گا ___؟ پولیس کی کارروائی کا پھندا
اپنے گلے میں کون ڈالے گا ___؟ گواہی میں
عدالت کے چکر کاٹ کر اپنی روزی کھوٹی کون
کرے گا ___؟"

صحیح سوالوں کے ہتھوڑے بھیڑ کے
دماغوں پر پڑتے ہیں۔ بچاؤ کے ہاتھ کسی
کے پاس نہیں ہیں۔ بھیڑ چپ ہے۔ اچانک
پیچھے سے کئی آوازیں اُچھلتی ہیں:

"مر گیا، مر گیا ___"

بھیڑ کے چہرے پیچھے پلٹتے ہی لاش
کو دیکھنے کے لیے۔ ٹیکسی دھواں چھوڑ کر اپنی
جان چھڑاتی ہے۔

بھیڑ زیادہ ہو گئی ہے۔ لوگ گھیرا
بنائے کھڑے ہیں اور بیچ میں ہے ہاتھ پاؤں
پھیلائے ایک لاش ___ جس کا اوپری دھڑ
پوری طرح سے خون سے رنگا ہوا ہے۔ اُس
کے چاروں طرف خون پھیل کر جمنے لگا ہے۔
ایک پاؤں کی چپل دور اوندھی پڑی ہے۔
دوسری چپل اُس کے دائیں پیر میں ہے جو
آدھی مُڑی ہوئی ہے۔ کچھ گز آگے مُڑی تُڑی
سائیکل پڑی ہے اور کچھ دور پر ٹفن کے
خانے اور کھانا بکھرا پڑا ہے۔

اب زیادہ تر لوگ خاموش ہیں۔ ایک
کہتا ہے:

"پولیس کو ٹیلیفون کرو ___"

"پولیس کو ٹیلیفون کر تو دیا ___"

"پھر اب تک کیوں نہیں آئی ___"

"کیا ننھے بچے ہو ___؟ پولیس ہمیشہ
حادثہ ہو جانے کے بعد آتی ہے اور اگر جلدی
آتی ہے تو مارنے آتی ہے۔"

سب ہنسنے لگتے ہیں۔ پھر کوئی ایک
افسوس ظاہر کرتا ہے:

"بے چارہ ___ گھر سے جب چلا ہوگا
تو اُسے کیا خبر ہوگی کہ میں زندہ واپس نہیں
لوٹوں گا۔"

"ٹفن بتاتی ہے کہ یہ سرکاری ملازم
ہے۔"

"کسی فیکٹری کا مزدور بھی ہو سکتا
ہے۔"

نہیں ___ یہ مزدور نہیں ہے"۔ بھیڑ
میں سے ایک نے کہا" میں جس فرم میں کام
کرتا ہوں اُس کے برابر ہی ایک سرکاری
دفتر ہے۔ اُسی میں یہ بابو تھا۔"

"تو یہ بے چارہ دفتر جا رہا تھا کہ بس
کے نیچے آ گیا ___" کسی نئے آنے والے نے
کہا۔

"نہیں صاحب ___ بس نے نہیں،
کار نے ٹکر ماری ہے۔"

"تو یہ رانگ سائڈ پر آ گیا ہوگا۔"

"بالکل نہیں ___ میں نے خود دیکھا
ہے یہ تو اپنی سائڈ سے جا رہا تھا کہ پیچھے
سے ایک کار نے ٹکر مار دی۔"

"ہاں بالکل صحیح ہے ___ میں نے
بھی دیکھا تھا اس بے چارے کی کوئی غلطی نہیں
تھی۔"

"میں نے بھی دیکھا تھا۔ کار میں کوئی
نوجوان جوڑا بیٹھا تھا۔ لڑکی کا سر مرد
شانے پر ٹکا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کر
لہرائی اور اس سائیکل سوار سے جا ٹک

"چ چ چ ___ اُن کی اُمنگوں
ڈالا ___ آج کل جسے دیکھو بغل میں
بٹھائے کار ہوا میں اُڑائے چلا جا رہا
یونہی تو حادثات زیادہ ہوتے ہیں۔
کی قربت میں بھلا ہوش کسے رہتا ہے

"گھر والوں کو تو اس کی خبر بھی
ہوگی۔ انھیں کیا پتا تھا کہ بھلا چنگا
ہے اور مرا ہوا آئے گا۔"

"چ چ چ ___"

"ارے پولیس آ گئی"۔ پیچھے
چیخا۔ بھیڑ میں کھلبلی مچتی ہے۔

جیپ بھیڑ کے پاس آ کر رکتی
اُس میں سے ایک انسپکٹر، چار کانسٹ
ایک فوٹو گرافر اُترتا ہے۔

"ہٹو ہٹو ___ راستہ دو ___

بھیڑ راستہ دیتی ہے۔ انسپکٹ
کے قریب آتا ہے۔ سپاہی بھیڑ کے گھیر
دور کرتے ہیں۔ فوٹو گرافر لاش کے فو
کی تیاری کرتا ہے۔ ایک سپاہی لکھ
رائٹنگ پیڈ انسپکٹر کو لاکر دیتا ہے
میں سادہ کاغذ لگے ہوتے ہیں۔ انس
نکال کر کھنکھارتا ہے:

"ہاں بھئی ___ آپ میں
کون جانتا ہے؟"

بھیڑ کی کُھسر پُھسر ایک دم خ
ہو جاتی ہے۔ انسپکٹر چاروں طرف
گھما کر بھیڑ کو دیکھتا ہے۔ لوگوں
دھڑکنے لگتے ہیں۔ کچھ لوگ بھیڑ میں

اش کرتے ہیں جس نے کہا تھا کہ
ے برابر گورنمنٹ کا ایک دفتر
بابو تھا ـــــ مگر وہ شخص دکھائی

پکٹر پھر کہتا ہے "اسے کسی نے ٹکر
یا اس نے گاڑی کے نیچے آکر خودکشی
س نے دیکھا ـــــ؟"
ڑ میں کھلبلی مچ گئی ہے۔ کوئی جواب
ہے۔ جن لوگوں نے یہ حادثہ دیکھا
پچھلی صف میں پہنچ گئے ہیں۔
ہے ـــــ اسے کس نے ٹکر ماری
نے، کار نے، ٹیکسی نے؟ اور
، سے آئی تھی، کس طرف گئی؟"
بکٹر کے پیچھے سے لوگ کھسکنے لگے
ر پھر سوال کرتا ہے:
یے بھئی ـــــ کسی کو معلوم ہو تو
ـــــ یہ کون ہے؟ کس جگہ کام
اسے کس گاڑی نے ٹکر ماری یا
اڑی کے نیچے آگیا؟"
ر میں سے بہت سے لوگ کھسک
ڑ لوگ اب تک بھاگ نہیں سکے

ہوتے ہیں۔
ے آپ لوگ اتنی دیر سے یہاں
ـــــ کچھ تو دیکھا ہوگا؟"
تو ـــــ ہم تو ابھی آئے ہیں"
نظریں بچاتے ہوئے لوگ پیچھے

لاش کے پاس پولیس کے سوا
ہے۔ البتہ بھیڑ اب بہت
ی جائے حادثہ کو دیکھ رہی

"کمال ہے ـــــ" انسپکٹر مونڈھے اُچکاتا ہے "کسی نے تھانے ٹیلیفون کیا کہ ایک آدمی کو موٹر نے کچل دیا ہے مگر اب یہاں کوئی کچھ بھی بتانے والا نہیں ہے۔"

"میں بتاتا ہوں ـــــ" اچانک ایک آواز اُس کے پیچھے سے آتی ہے۔ پولیس انسپکٹر گھومتا ہے۔

"تم ـــــ؟ مگر تم تو اندھے ہو ـــــ"

اندھا مسکراتا ہے ـــــ "آنکھوں والے صحیح بات بتانے سے بچنے کے لیے اندھے بن کر بھاگ گئے ہیں تو اب نابینا آدمی ہی چشم دید گواہ ہو سکتا ہے۔"

OO

آپس میں کھُسر پھُسر ہوتی ہے۔ اس بیچ
گاڑی کھسک جاتی ہے لوگ پھر ایک گاڑی
کو روکتے ہیں۔ وہی سوال وہی جواب:
ٹیکسی ڈرائیور تجربے کار ہے کہتا ہے
"زخمی آدمی اگر راستے میں مرگیا تو —؟ لاش
کہاں جمع کراؤں گا —؟ تھانے میں رپورٹ
کون کرے گا —؟ پولیس کی کارروائی کا پھندا
اپنے گلے میں کون ڈالے گا —؟ گواہی میں
عدالت کے چکر کاٹ کر اپنی روزی کھوٹی کون
کرے گا —؟"

صحیح سوالوں کے ہتھوڑے بھیڑ کے
دماغوں پر پڑتے ہیں۔ بچاؤ کے ہاتھ کسی
کے پاس نہیں ہیں۔ بھیڑ چپ ہے۔ اچانک
پیچھے سے کئی آوازیں اُچھلتی ہیں:

"مرگیا، مرگیا —"

بھیڑ کے چہرے پیچھے پلٹتے ہی لاش
کو دیکھنے کے لیے ٹیکسی دھواں چھوڑ کر اپنی
جان چھڑاتی ہے۔

بھیڑ زیادہ ہوگئی ہے۔ لوگ گھیرا
بنائے کھڑے ہیں اور بیچ میں ہے ہاتھ پاؤں
پھیلائے ایک لاش — جس کا اوپری دھڑ
پوری طرح سے خون سے رنگا ہوا ہے۔ اُس
کے چاروں طرف خون پھیل کر جمنے لگا ہے۔
ایک پاؤں کی چپل دور اوندھی پڑی ہے۔
دوسری چپل اُس کے دائیں پیر میں ہے جو
آدمی مُڑی ہوئی ہے۔ کچھ گز آگے مُڑی تُڑی
سائیکل پڑی ہے اور کچھ دور پر ٹفن کے
خانے اور کھانا بکھرا پڑا ہے۔

اب زیادہ تر لوگ خاموش ہیں۔ ایک
کہتا ہے:

"پولیس کو ٹیلیفون کرو —"

"پولیس کو ٹیلیفون کر تو دیا —"

"پھر اب تک کیوں نہیں آئی —"

"کیا ننھے بچے ہو —؟ پولیس ہمیشہ
حادثہ ہو جانے کے بعد آتی ہے اور اگر جلدی
آتی ہے تو مارنے آتی ہے۔"

سب ہنسنے لگتے ہیں۔ پھر کوئی ایک
افسوس ظاہر کرتا ہے:

"بے چارہ — گھر سے جب چلا ہوگا
تو اُسے کیا خبر ہوگی کہ میں زندہ واپس نہیں
لوٹوں گا۔"

"ٹفن بتاتی ہے کہ یہ سرکاری ملازم
ہے۔"

"کسی فیکٹری کا مزدور بھی ہوسکتا
ہے۔"

نہیں — یہ مزدور نہیں ہے"۔ بھیڑ
میں سے ایک نے کہا" میں جس فرم میں کام
کرتا ہوں اُس کے برابر ہی ایک سرکاری
دفتر ہے۔ اُسی میں یہ بابو تھا۔"

"تو یہ بے چارہ دفتر جارہا تھا کہ بس
کے نیچے آگیا —" کسی نئے آنے والے نے
کہا۔

"نہیں صاحب — بس نے نہیں،
کار نے ٹکر ماری ہے۔"

"تو یہ رانگ سائڈ پر آگیا ہوگا۔"

"بالکل نہیں — میں نے خود دیکھا
ہے یہ تو اپنی سائڈ سے جارہا تھا کہ پیچھے
سے ایک کار نے ٹکر مار دی۔"

"ہاں بالکل صحیح ہے — میں نے
بھی دیکھا تھا اس بے چارے کی کوئی غلطی نہیں
تھی۔"

"میں نے بھی دیکھا تھا۔ کار میں کوئی
نوجوان جوڑا بیٹھا تھا۔ لڑکی کا سر مرد
شانے پر ٹکا ہوا تھا میں نے دیکھا کر
لہرائی اور اس سائیکل سوار سے جا ٹکرا

"چہ چہ — اُن کی اُمنگوں نے
ڈالا — آج کل جسے دیکھو بغل میں
بٹھائے کار ہوا میں اُڑائے چلا جارہا
یونہی تو حادثات زیادہ ہوتے ہیں۔
کی قربت میں بھلا ہوش کسے رہتا ہے"

"گھر والوں کو تو اس کی خبر بھی
ہوگی۔ انھیں کیا پتا تھا کہ بھلا چنگا
ہے اور مرا ہوا آئے گا۔"

"چہ چہ چہ —"

"ارے پولیس آگئی"۔ پیچھے سے
چیخا۔ بھیڑ میں کھلبلی مچتی ہے۔

جیپ بھیڑ کے پاس آکر رُکتی
اُس میں سے ایک انسپکٹر، چار کانسٹب
ایک فوٹو گرافر اُترتا ہے۔

"ہٹو ہٹو — راستہ دو —"

بھیڑ راستہ دیتی ہے۔ انسپکٹر
کے قریب آتا ہے۔ سپاہی بھیڑ کے گھیر
دُور کرتے ہیں۔ فوٹو گرافر لاش کے فوٹو
کی تیاری کرتا ہے۔ ایک سپاہی لکڑ
رائٹنگ پیڈ انسپکٹر کو لاکر دیتا ہے
میں سادہ کاغذ لگے ہوتے ہیں۔ انسپ
نکال کر کھنکھارتا ہے:

"ہاں بھئی — آپ میں سے
کون جانتا ہے؟"

بھیڑ کی کھُسر پھُسر ایک دم خ
ہو جاتی ہے۔ انسپکٹر چاروں طرف
گھما کر بھیڑ کو دیکھتا ہے۔ لوگوں
دھڑکنے لگتے ہیں۔ کچھ لوگ بھیڑ میں

ں کو تلاش کرتے ہیں جس نے کہا تھا کہ
فرم کے برابر گورنمنٹ کا ایک دفتر
ں میں بابو تھا ۔۔۔ مگر وہ شخص دکھائی
دیتا ۔

انسپکٹر پھر کہتا ہے " اسے کسی نے ٹکر
ہے یا اس نے گاڑی کے نیچے آکر خودکشی
، ؟ کس نے دیکھا ۔۔۔ ؟"

بھیڑ میں کھلبلی مچ گئی ہے ۔ کوئی جواب
یتا ہے ۔ جن لوگوں نے یہ حادثہ دیکھا
ہ اب پچھلی صف میں پہنچ گئے ہیں ۔

" ارے ۔۔۔ اسے کس نے ٹکر ماری
بیپ نے ، کار نے ، ٹیکسی نے ؟ اور
طرف سے آئی تھی ، کس طرف گئی ؟"

انسپکٹر کے پیچھے سے لوگ کھسکنے لگے
سپکٹر پھر سوال کرتا ہے :

" بتایئے بھئی ۔۔۔ کسی کو معلوم ہو تو
۔۔۔ یہ کون ہے ؟ کس جگہ کام
ے ؟ اسے کس گاڑی نے ٹکر ماری یا
ہی گاڑی کے نیچے آگیا ؟"

بھیڑ میں سے بہت سے لوگ کھسک
، ۔ جو لوگ اب تک بھاگ نہیں سکے
ئے ہوتے ہیں ۔

" ارے آپ لوگ اتنی دیر سے یہاں
ہیں ۔۔۔ کچھ تو دیکھا ہوگا ؟"

" ہم تو ۔۔۔ ہم تو ابھی آئے ہیں"
سے نظریں بچاتے ہوئے لوگ پیچھے
یں ۔

ب لاش کے پاس پولیس کے سوا
یں ہے ۔ البتہ بھیڑ اب بہت
سٹری جائے حادثہ کو دیکھ رہی

" کمال ہے ۔۔۔" انسپکٹر منڈھے
اچکاتا ہے " کسی نے تھانے ٹیلیفون کیا
کہ ایک آدمی کو موٹر نے کچل دیا ہے مگر اب
یہاں کوئی کچھ بھی بتانے والا نہیں ہے ۔"

" میں بتاتا ہوں ۔۔۔" اچانک ایک
آواز اس کے پیچھے سے آتی ہے ۔ پولیس انسپکٹر
گھومتا ہے ۔

" تم ۔۔۔ ؟ مگر تم تو اندھے
ہو ۔۔۔"

اندھا مسکراتا ہے ۔۔۔ " آنکھوں
والے صحیح بات بتانے سے بچنے کے لیے
اندھے بن کر بھاگ گئے ہیں تو اب نابینا
آدمی ہی چشم دید گواہ ہو سکتا ہے ۔"

OO

ساجد علی ٹونکی

صائب ٹونکی

لسانی یک جہتی کا علمبردار شاعر

> آئین کی رو سے یوں تو ہندی ہی بھارت کی قومی زبان ہے جس کا رسم الخط دیوناگری تسلیم کیا گیا ہے لیکن چوں کہ اس پر پراکرت، سنسکرت، فارسی، عربی وغیرہ کے اثرات نمایاں طور پر پائے جاتے ہیں لہٰذا اُردو اور ہندی میں بنیادی فرق صرف رسم الخط کا ہی رہ جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہندی اور اُردو دو ہمشکل جڑواں بہنیں ہیں جن کا صرف لباس علیحدہ ہے اُردو پر فارسی کا اور ہندی پر سنسکرت کا غلبہ ہو جانے کی وجہ سے یہ دونوں زبانیں جُدا ہوگئیں۔ جہاں تک صائب ٹونکی کی زبان کا تعلق ہے انھوں نے نہ صرف عربی، فارسی کے مشکل الفاظ کا بلکہ سنسکرت اور انگریزی الفاظ کا استعمال بھی بڑی مہارت سے اپنی شاعری میں کیا ہے۔
>
> ——— ساجد علی ٹونکی

راجستھان کا لکھنؤ، باغوں کا شہر، راجپوتانہ کی مسلم ریاست، خربوزوں کی نگری، قدیم محمد آباد، ٹونکرہ اور اب ٹونک کے نام سے مشہور یہ شہر کبھی بہادر نوابوں کی وجہ سے تو کبھی علما فضلا ادبا اور شعرا کی وجہ سے مشہور رہا ہے۔ اس ریاست کا قیام ۱۸۱۷ء میں عمل میں آیا۔ بانیِ ریاست نواب امیر الدولہ بہادر نہ صرف یہ کہ خود ایک عالم تھے بلکہ علم کے قدرداں بھی یہی وجہ ہے کہ ریاست کے قیام کے ساتھ ساتھ ہی ملک اور بیرون ملک سے جیّد علما ٹونک کی پُر امن فضا میں چین کی سانس لینے کی غرض سے آ آکر آباد ہونے لگے اور یہ سلسلہ ان کے بعد بھی جاری رہا۔

۱۸۵۷ء کی ناکام بغاوت کے بعد دلّی اور لکھنؤ میں جب افراتفری کا عالم پیدا ہوا تو اس وقت متعدد ادیب اور شاعر یہاں آکر آباد ہوئے۔ نواب وزیر الدولہ نے ان کی قدر دانی کی۔ صائب صاحب کے جدِّ امجد بھی سیّد احمد شہید کی بیوہ کے ساتھ ایک قافلے میں شریک ہوکر ٹونک تشریف لائے اور محلّہ قافلہ میں آباد ہوئے۔ حضرت صائب کی تاریخِ پیدائش ۱۹ر جولائی ۱۹۱۹ء ہے۔ ان کا نام محمد صدّیق رکھا گیا۔ تعلیم و تربیت ٹونک کے نامور علما و فضلا کے زیرِ نگرانی ہوئی۔ اساتذہ میں پروفیسر محمود خاں شیرانی، سیّد طلحہ میاں حسینی، مولوی محمد علی، مولوی امین، حافظ عبید اللہ البصیر، محمد میاں، قاری صبغت اللہ خاں وغیرہ شامل ہیں۔ صائب صاحب نے فارسی میں منشی کامل کرنے کے علاوہ طب اور ادویات سے متعلق متعدد اسناد بھی حاصل کیں۔

جہاں تک صائب ٹونکی کی شاعری کا تعلق ہے، انھوں نے تقریباً سبھی اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کی ہے لیکن بنیادی طور پر انھیں غزل گو شاعر ہی مانا گیا ہے۔ غزلیات کا ایک مجموعہ "حرفِ معتبر" کے نام سے منظرِ عام پر آچکا ہے۔ اس کے علاوہ ۱۹۸۶ء میں جنابِ اکبر شہابی نے ایک سہ ماہی جریدہ "صائب" جاری کیا جس کا پہلا شمارہ "صائب نمبر" شائع ہوا۔ لیکن بدقسمتی سے یہ رسالہ جلد ہی بند ہوگیا۔ صائب صاحب کا چار بیتیوں کا مجموعہ بھی راجستھان اُردو اکادمی کو اشاعت کے لیے دیا گیا ہے۔ کلیات مخطوطے کی شکل میں آپ کے صاحبزادے جناب محمد شفیق صاحب کے پاس موجود ہے۔

ٹونک کے آخری نواب اسمٰعیل علی خاں تاج نے انھیں "نباض الشعرا" اور صاحبزادہ افتخار علی خاں نے "فہیم الشعرا" کے خطاب سے سرفراز کیا تھا۔ صائب صاحب نے ایک ادبی انجمن "ادبستانِ صائب" قائم کی تھی جس کے تحت اب تک کم و بیش ایک درجن کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔

پروفیسر ظہیر احمد صدّیقی نے صائب صاحب کی شاعری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

"جنابِ صائب کی ولادت ۱۹۱۹ میں ہوئی یہ وہ زمانہ ہے جب ہندوستا پہلی جنگِ عظیم کے خاتمے کا اعلان سن چ تھا۔ مگر جنگ کے اثرات لوگوں کے دل ود

علی منزل، محلّہ رجبن، ٹونک (راجستھان)

ـطاری تھے اور جب جناب صائب نے شاعری
ی ابتدا کی یہ وہ زمانہ تھا کہ دوسری
نگِ عظیم کے بادل پھٹ پڑے تھے ان دو
ہم واقعات کی نشاندہی اس لیے کر رہا
وں کہ شاعر کے نفسیاتی تجزیے میں سہولت
ر اور اس طرح شاید شاعر کے اس انداز
ماطب کو سمجھنے میں آسانی ہو۔"

(صائب کی شاعری، صائب نمبر ص۱۹)

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی کے بقول کسی
عر کے نفسیاتی تجزیے کے لیے اس دور
اہم تاریخی واقعات کا جاننا بے حد ضروری
۔ یہ قول مارکس کے مادی نظریے سے ایک
ہنک میل کھاتا ہے۔ لیکن جن واقعات کا ذکر
ئب صاحب کی شاعری اور اس پر پڑنے
لے اثرات کے ضمن میں پروفیسر ظہیر احمد
یقی نے کیا ہے۔ وہ دراصل پہلی اور
سری جنگِ عظیم کے بعد کے واقعات
ر کر انھی ادوار کے دو اہم دیگر واقعات
تعلق ہیں۔ پہلا واقعہ ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء
مرتسر کے جلیان والا باغ میں بسنت پنچمی
وقعے پر پیش آیا۔ جب جنرل ڈائر کے
سے سینکڑوں ہندوستانیوں کو موت کی
سلا دیا گیا۔ اس واقعے نے تحریکِ
زیِ وطن میں جان ڈال دی۔ اس
ے کے بعد ہی خلافت تحریک میں ہندو
سلم کاندھے سے کاندھا ملا کر شامل
ے۔ یہ واقعہ صائب صاحب کے
ولادت میں رونما ہوا۔ استاد صائب
ں کا اثر پڑنا ضروری تھا۔

دوسرا واقعہ جس کا ذکر ظہیر احمد
نی نے دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے کی
شکل میں کر کے صائب کے کلام کا تجزیہ کیا ہے۔
میرے خیال میں اس تجزیے کے لیے ہندوستان
کی آزادی اور تقسیم کا سال یعنی ۱۹۴۷ء
کا تعین کرتے تو بہتر تھا۔ کیوں کہ ہندوستانی
ادیبوں اور شاعروں کو جتنا آزادی اور تقسیم
کے واقعات نے متاثر کیا تھا اتنا دوسری
جنگِ عظیم نے نہیں کیا۔

صائب صاحب نے وہ دور بھی دیکھا
تھا جب ہندو اور مسلمان مل جل کر ملک کی
تحریکِ آزادی میں حصہ لے رہے تھے لیکن جب
آزادی کا وقت قریب آیا تو اقتدار حاصل
کرنے کی غرض سے سیاسی جماعتوں نے مذہبی
منافرت پھیلا کر ملک کے بھائی چارے کو
کمزور کر دیا۔ آزادی کے فوراً بعد ہندو مسلم
آپس میں ایک دوسرے کے خون سے ہولی
کھیلنے لگے۔ وہ ہندو جو پاکستان میں آباد
تھے اپنا وطن چھوڑ کر ہندوستان چلے آئے
اور لاکھوں مسلمان ہندوستان کو خیرباد
کہہ کر پاکستان جا بسے۔ فرقہ وارانہ کشیدگی
ملک کی آزادی کے چالیس سال بعد بھی
کسی نہ کسی شکل میں برقرار ہے۔ صائب کے
کلام میں ان تمام ملکی حالات اور مسائل کا
ذکر جا بجا موجود ہے۔ جیسا کہ ابتدا میں واضح
کر دیا گیا ہے صائب نے اپنی شاعری میں ہندی
اور انگریزی الفاظ کا استعمال بڑی مہارت
سے کیا ہے۔ چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ فرمائیں:

ممنون ہیں مجسم انساں کی اس ابج کے
پتھر سے گھڑتے گھڑتے اوتار بن گئے ہم

چھوڑ آیا تھا جنھیں پچھلے جنم میں صائب
ذہن میں آج ان ارمانوں کا لشکر جاگا

سو گیا اوڑھ کے خورشید شفق کی چادر
دیپ گھر گھر میں جلے شام کا منظر جاگا

دھرتی ماتا تجھے سوگند اہنسا کی بتا
خون آلود رہے گا ترا داماں کب تک

اسی طرح انگریزی زبان کے الفاظ
کا استعمال بھی صائب نے سلیقے کے ساتھ
اپنی شاعری میں کیا ہے:

ڈھونڈنا ہے لاحاصل بے دلوں کی بستی میں
حسن و عشق ملتے ہیں ناولوں کی بستی میں

وہ ماسٹر جو پڑھا کر کلاس نکلے ہیں
وہ پڑھنے والوں سے دب کر اداس نکلے ہیں

جو مدتوں سے تھے اپنے شعور پر نازاں
وہ ہپیوں کی طرح بے لباس نکلے ہیں

پا پیادہ آج ہیں فٹ پاتھ پر
زندگی میں جو نہ اترے کار سے

پڑھو نہ مخرب اخلاق کوئی لٹریچر سے
نگاہ پاک رکھو ناولوں سے دور رہو

اردو زبان کا یہ خاصہ رہا ہے کہ اس
میں ہر زبان کے الفاظ کو اپنے آپ میں
ڈھالنے کی صلاحیت موجود ہے۔ ایسے وقت
میں جب ہندوستان جیسے وسیع و عریض
ملک میں قومی زبان اور علاقائی زبانوں کے
مابین کشمکش جاری ہے۔ صائب ٹونکی نے
اپنی شاعری میں سنسکرت، ہندی، انگریزی،

عربی، فارسی وغیرہ کے الفاظ اور تراکیب کو ہم آمیز کر کے آنے والی نسلوں کے لیے لسانی فراخدلی کا ایک نمونہ پیش کیا ہے۔

یہ سچ ہے کہ انگریزوں نے پونے دو سو سالہ دَور حکومت میں ہندوستان کو بہت سی اچھی چیزیں دیں جن میں جدید سائنسی آلات، نئی صنعتیں، سائنسی اندازِ فکر وغیرہ شامل ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ ہندوستانی سماجی، اخلاقی اقدار کو تباہ بھی کر گئے۔ رشوت خوری، منافع خوری اور کالا بازاری جیسی دلدل میں ہماری نسلوں کو دھکیل گئے۔ سماج میں پھیلی ہوئی انھی بُرائیوں کا ذکر صائب ٹونکی نے اپنی شاعری میں کیا ہے۔ اس کے ساتھ حکّام کی بے حسی پر انھوں نے طنز بھی کیا ہے۔ کس طرح بہت سے کاغذی منصوبے صرف فائلوں تک ہی محدود رہ جاتے ہیں۔ سرِ عام قتل اور ڈاکہ زنی کی وارداتیں نیز لال فیتا شاہی کا ذکر ان کے کلام میں جا بجا ملتا ہے:

آپ ہی ہوئیں پیدا خود ہی مر گئیں اب تک
جانے کتنی اسکیمیں فائلوں کی بستی میں

کالا بازار ہے کالے ہی خریدار بھی ہیں
ہاتھ سے ہاتھ بدلتا ہے یہاں دھن کالا

اب دیکھیے طے ہوتا ہے کس طرح مقدمہ
حکّام کی زد میں کبھی تو ہے کبھی میں ہوں

براج مان ہیں نا کردہ کار کرسی پر
کسی سوال کا تفصیل سے جواب نہیں

شاید نہ مل سکے گی کڑی دھوپ سے اماں
آندھی کی اپنے پھوس کے چھپر سے جنگ ہے

ٹیلی ویژن بھی ہو، وی ڈی او بھی ہو ریڈیو بھی
قرض کے بل پہ نکالو گے یہ ارماں کب تک

صائب صاحب کی شاعری میں ہمیں بھائی چارے، محبت اور اتحاد کا پیغام بھی ملتا ہے:

جلاؤ دیس میں مل کے سہائتا کے دیپ
کہ آگے بڑھنے کا رستہ دکھائی دینے لگے

لگاؤ آنکھ میں اب ایکتا کا وہ کاجل
کہ ہر آدمی تمھیں تم سا دکھائی دینے لگے

صائب ٹونکی کی دور رس نظر صرف ملکی مسائل تک محدود نہیں تھی بہت سے اہم عالمی مسائل پر غور و فکر کے بعد انھوں نے ان مسائل کو شاعری کے لباس سے آراستہ کیا ہے۔ ان میں جوہری جنگ کا خطرہ، تخفیفِ اسلحہ، خلائی جنگ وغیرہ شامل ہیں۔ دو اشعار ملاحظہ ہوں:

جوہری جنگ کا خطرہ ہے مسلّط سب پر
اب مخالف کوئی کن کا ہے نہ تیروں کے خلاف

مکّے پر جب چڑھائی کھلی، فیل سے ہوئی
اسٹار وار پہلی، ابابیل سے ہوئی

مکّے پر فیل کی چڑھائی اور ابابیل سے اسٹار وار تلمیح ہے اس واقعے کی طرف جس کا ذکر قرآنِ کریم میں سورۂ فیل میں آیا ہے۔

○○

نئی مطبوعات

شناخت (افسانوی مجموعہ)
مصنف: شفق
قیمت: ۳۰ روپے
ملنے کا پتا: شفق، کبیر گنج، سہسرام (بہار)

جدید اردو افسانے کا ایک معتبر نام شفق ہے۔ شفق نئی نسل کے ایک ایسے فنکار ہیں جن کی تحریریں قاری کے قیمتی اوقات کے چند لمحات چرانے میں امتیاز رکھتی ہیں، ان کی تحریروں میں ایسی دلکشی اور جاذبیت ہوتی ہے کہ قاری خود بخود کھنچتا چلا جاتا ہے، ان کی کہانیوں کو پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ فن کار کے پاس کہنے کو کچھ ہے اور وہ کچھ اس کا اپنا ہے اور نئے ڈھنگ کا ہے، موضوعات کا انتخاب جس چابکدستی سے شفق کرتے ہیں اس کی مثال ان کے معاصروں میں کم ملتی ہے، پھر موضوعات کے ساتھ ان کا Involment بھی نرالا اور اچھوتا ہوتا ہے۔ شفق علامتی کہانیاں بھی لکھتے ہیں لیکن ان افسانوں میں افسانویت کے عنصر کو پس پشت نہیں ڈالتے۔ انہیں علامتی پیرایۂ اظہار پر مکمل قدرت حاصل ہے۔

"شناخت" کی اشاعت سے پہلے ہی شفق کی شناخت ہو چکی ہے پھر بھی شناخت کی اشاعت سے ان کی شناخت کا رنگ کچھ اور گہرا ہوگیا ہے۔

"شناخت" سترہ خوبصورت کہانیوں کا ایسا گلدستہ ہے جس کا ہر پھول انفرادیت کا حامل ہونے کے باوجود ایک مکمل اکائی کی شناخت نظر آتا ہے، ان کہانیوں میں سماجی قانون پر نشتر زنی ملتی ہے، رشتوں کے درد سے واسطہ پڑتا ہے، دہشت گردی اور فساد کی ہولناکی کا احساس ہوتا ہے، پڑوسی ملک کی نئی نسل کے نوجوانوں کے سوچنے کا انداز بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ غرض یہ کہ بہت سارے ملکی معاشرتی اور بین الاقوامی مسائل ہیں جن پر شفق نے قلم اٹھایا ہے۔ کرداروں کی تراش خراش پر پوری توجہ صرف کی ہے، پلاٹ سازی اور واقعات نگاری میں شفق نے دانش مندی کا ثبوت دیا ہے، ان تمام جزئیات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے جن سے کہانی کا مجموعی تاثر قائم کرنے میں مدد ملتی ہے۔

چٹکی بھر زندگی، اوٹ لٹ، شناخت، لہو رنگ سویرا، مہاجر، مجموعے کی بہترین کہانیاں ہیں، ان کہانیوں کا اندازِ بیان، لب و لہجہ اور موضوع سب کا سب شفق کا اپنا ہے **اور ان میں شفق کے خونِ جگر کی آمیزش ہے۔**

کتاب دیدہ زیب اور خوبصورت ہے سرورق نفیس اور معنی خیز ہے، قیمت مناسب ہے۔

توقع ہے "شناخت" کی پذیرائی ہوگی۔

—(ڈاکٹر) محفوظ الحسن

رنگ ترنگ (شعری مجموعہ)
شاعر: کرشن مراری
صفحات: ۱۲۸
قیمت: ۵۰ روپے
ملنے کا پتا: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

"سازِ رگِ جاں" اور "شعلۂ احساس" کے بعد زیر نظر کتاب کرشن مراری صاحب کی تیسری پیش کش ہے۔ اپنے شعری مجموعے کو صحیح نام دینا بھی ایک فن ہے اور یہ اسی فنی رویے کا آئینہ دار ہوتا ہے جس کے تحت شاعر کی تخلیقات معرض وجود میں آتی ہیں۔ "رنگ" اور "ترنگ" **دو سادہ سے الفاظ** کرشن مراری کی ساری **شعری کائنات** کا کلیدی اشاریہ ہیں۔ **گویا ترنگ موصوف** کے یہاں تخیل اور **جذبات کے محرک** کے مترادف ہے تو "رنگ" اسلوب کی کارفرمائی ہے۔

سنسکرت ادبیات میں شعری فن پارے کو الفاظ کے صوتی آہنگ اور ان کے معانی کا سنگم بتایا گیا ہے۔ اسی سنگم کی بدولت "ساہتیہ" معرضِ وجود میں آتا ہے اور ان دونوں کے ایک ہو جانے سے شعری فن پارے میں احساسِ نشاط کا وجدانی سلسلہ میسّر آتا ہے۔

کرشن مراری کی رومانی سوچ سے

ان کی تخلیقات کا خمیر اٹھا ہے اور جمالیاتی سج دھج کے ساتھ منظرِ عام پر آیا ہے۔ رومانی فکر و نظر اور جمالیاتی اظہار کی فضا جس میں انھوں نے اپنے انفرادی اسلوب کی تلاش کی ہے وہ اس گہرے اور وسیع مطالعے کا حاصل ہے جو سنسکرت کے کلاسیکی شعرا اور انگریزی ادب کے رومانی شعرا (Lake Poets) کا احاطہ کرتا ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں شامل غزلیں ہوں کر دوہے، موصوف کے اسلوب و آہنگ کی انفرادیت کی بدولت فکر و نظر کی ایک ایسی عمیق اور پرت دار کائنات فراہم کرتے ہیں جس میں ایک طرح کا Romantic Realism کارفرما ہے اور جو شعری پیکر سامنے آتے ہیں ان میں ڈکشن کی تازگی، بے ساختگی اور نغمگی کروٹیں لیتی ہوئی محسوس کی جا سکتی ہے۔ بہ طورِ مثال چند اشعار اور دوہے پیشِ خدمت ہیں:

شوخ سی مورت اجنتا کی کھڑی ہے روبرو
مرمریں انگڑائیوں میں جلوہ گر ہے شاعری

شبنمی سا رقص بے کل آگہی کا
چاہتوں کے راستے مہکا گیا ہے

غور سے دیکھا کیے تو دیکھتے ہی رہ گئے
چار سو، بس اِک ترا ہی روپ تھا نکھرا ہوا

بھولی بھالی سانولی مدھر مدھر جھنکار
پنگھٹ پنگھٹ کر گئی جلوے سب گلنار

من مندر میں ساجنا چتون تری انوپ
جیسے کہرا کاٹ کر کھلتی جائے دھوپ

اس مجموعے میں چند نظمیں بھی شامل ہیں جو کرشن مراری کے فکری اور تخلیقی اجتہاد کی رَو میں عصری آگہی سے بھی انصاف کرتی ہیں۔ ان کے دل میں عالمی امن و آشتی کا جذبہ بھی کارفرما ہے۔

کتاب کے جمالیاتی خد و خال اور عمدہ طباعت کے لیے موڈرن پبلشنگ ہاؤس مبارکباد کا مستحق ہے۔

——— رام پرکاش راہی

> **قواعدِ صغیر**
> مرتب: صغیر احمد صغیر اشرفی
> صفحات: ۵۶
> قیمت: ۳ روپے ۷۵ پیسے
> ملنے کا پتا: اشرفی کتب خانہ، دیپا سرائے سنبھل ضلع مراد آباد (یو۔پی)

بقول مولوی عبدالحق "اردو کے ہندی نژاد ہونے میں کوئی شک نہیں کیوں کہ بیرونی زبانوں کا اثر صرف اسما وصفات میں ہوا ہے ورنہ زبان کی بنیاد یہیں کی زبان پر ہے۔ تمام حروف فاعلی، اضافت، نسبت، ربط وغیرہ ہندی کے ہیں۔ ضمیریں سب کی سب ہندی ہیں۔ افعال سب ہندی ہیں لیکن عربی فارسی الفاظ نے مختلف صورتوں میں اس کی اصل خوبی میں اضافہ کر دیا ہے اور جہاں اس سے اس کی دل نشینی بڑھ گئی ہے وہیں خیالات میں وسعت پیدا ہوگئی ہے۔"

سب سے پہلے جان شواکٹیلا نے بعہد شاہ عالم ڈچ زبان میں ہندوستانی زبان کی قواعد لکھی۔ اس کے بعد کٹیلر، شلز، ہیڈلے، جان گلکرائسٹ، موسیو گارساں دتاسی، جان پلیٹ وغیرہ نے اُردو قواعد نویسی میں حصّہ لیا۔ ہندوستانی قواعد نویسوں میں انشاءاللہ خاں انشا، سرسید احمد خاں، مولوی احمد علی اور مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کی خدمات وقیع قرار دی جا سکتی ہیں مگر ان حضرات نے اُردو زبان کی صرف و نحو لکھنے میں زیادہ تر عربی زبان کا تتبع کیا ہے جو بقول مولوی عبدالحق "کسی طرح جائز نہیں" اس لیے کہ دونوں زبانوں کی خصوصیات الگ ہیں۔ اُردو ہندی نژاد ہے اور اس کی بنیاد قدیم ہندوستانی زبان پر قائم ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ اُردو زبان کی قواعد لکھنے میں ہم سنسکرت کے قواعد کا تتبع کریں۔ چنانچہ مولوی عبدالحق نے اپنی قواعد نویسی میں اس بات کا خاص خیال رکھا ہے۔ ان کی قواعد بہر اعتبار جامع ہے۔ انھوں نے اپنی قواعد کو انگریزی قواعد پر ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ اس سے قواعد کے اجزائے ترکیبی سمجھنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوتی۔ پھر بھی یہ کتاب طلبہ کے لیے ضخیم اور قدرے مشکل ہے۔

مولوی صغیر احمد سنبھلی نے "قواعدِ صغیر" لکھ کر اس مشکل کو آسان کر دیا ہے۔ یہ قواعد نہ تو بہت زیادہ ضخیم ہے اور نہ دقیق۔ بلکہ نہایت سلجھی ہوئی اور سادہ زبان میں لکھی گئی ہے۔ انھوں نے اپنی قواعد کو تین حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصّے میں لفظ اور جملے سے متعلق تمام مباحث پر نظر ڈالی ہے اور رموز

اوقاف سے بھی واقف کرایا ہے۔ حصہ دوم میں اقسامِ نظم پر روشنی ڈالی ہے اور مروّجہ اقسام پر تبصرہ کیا ہے۔ اس سے طلبہ کو موضوع کے سمجھنے میں بڑی سہولت ہوگی۔ آخر میں مُصنّف نے علمِ بیان کو نہایت آسان زبان میں سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ مثالوں سے اس کی وضاحت نہایت خوبی سے ہو جاتی ہے۔

اُردو زبان سیکھنے کے لیے "قواعدِ صغیر" کا مطالعہ بڑا مفید ثابت ہوگا۔ مجھے امید ہے طلبہ مختلف امتحانات کی تیاری میں اس سے خاطر خواہ استفادہ کریں گے۔ اسی کے ساتھ یہ کتاب مبتدی شعرا کے لیے بھی مفید ہوگی۔

—— محمد مشتاق شارق میرٹھی

رنگ منچ

مُصنّف: انور امام، سلطان احمد ساحل
صفحات: ۱۳۶
قیمت: ۲۵ روپے
ناشر: نکھار پبلیکیشنز، مئو ناتھ بھنجن۔
ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ، دہلی، بمبئی، علی گڑھ۔

ڈراما بھلے ہی کسی ادب کی شناخت کا بنیادی حوالہ ہو مگر اس حوالے کی پہلی شرط اسٹیج ہے اور اسٹیج اور ڈراما، اُردو میں دو الگ الگ چیزیں تصوّر کی جاتی ہیں ایسے حالات میں اُردو ڈرامے کی جو حالت ہے وہ سبھی جانتے ہیں۔

زیرِ تبصرہ کتاب کے مرتبین کی یہ کوشش اس لیے قابلِ ستائش ہے کہ انھوں نے ان زبانوں کے ڈرامائی ادب کو اُردو میں منتقل کرنے کی کوشش کی جن میں ڈرامے کا تصوّر اسٹیج سے جڑا ہوا ہے اور اسٹیج اپنی اہمیت منوا چکا ہے۔

مرتبین نے اپنے طور پر تو بہت غور خوض کے بعد ہی تراجم کے لیے ڈراموں کا انتخاب کیا ہوگا مگر وہ کئی ایسے ڈرامے اس میں شامل نہیں کر پائے جو نہ صرف ہندوستان میں مقبول ہوئے ہیں بلکہ دنیا بھر میں انھیں پسند کیا گیا ہے ان میں کچھ تو مراٹھی اسٹیج ہی کے ہیں جس کے کئی ڈرامے مجموعے میں شامل بھی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ مرتبین نے اپنے طور پر بہت محنت کی ہے اور ایک انتہائی اہم مگر نسبتاً گم نام گوشے پر اٹی ہوئی گرد صاف کی ہے خلوص اور موضوع سے وابستگی کے سبب وہ اس میں بہت حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔

شمعِ حرا

شاعر: حماد انجم
صفحات: ۳۲
قیمت: ڈھائی روپے
ملنے کا پتا: الانصار اکادمی، موہن بازار، بستی (یو۔پی)

جنابِ حماد انصاری مشہور عالمِ دین حضرتِ حامد الانصاری انجم کے صاحبزادے اور قادر الکلام، مگر شہرت اور ناموری سے بے نیاز شاعر ہیں۔ اور بے نیازی کا یہ وصف انھیں اپنے والد سے وراثت میں ملا ہے۔

زیرِ تبصرہ نعتیہ مجموعے سے قبل بھی حماد انجم کا حمدیہ مجموعہ "بہارِ حمد" مذہبی حلقوں میں مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ سرورِ کائنات کی ذاتِ پاک سے ان کی قلبی وابستگی نے اس مجموعے میں نعتیہ شاعری کے بہترین انتخاب میں جگہ پانے کا وصف پیدا کر دیا ہے:

معیارِ صداقت سارے عمل کردارِ محمد کیا کہیے
آئینِ ازل الفاظ و بیاں گفتارِ محمد کیا کہیے
ہے سرد شرارِ بولہبی معدوم طلسمِ تیرہ شبی
خورشید بکف عربی عجمی انوارِ محمد کیا کہیے

ہو پختہ تر مذاقِ نظارہ تو اے نظر
جلوے بہر سو ان کے رخِ ضوفگن کے ہیں

نظر میں عکسِ جمال شہِ اُمم رکھیے
اس آئینے کو بہر حال محترم رکھیے

نعتیہ شاعری کے دلدادگان کے لیے یہ مختصر مجموعہ ایک روحانی تحفے کی طرح ہے۔

—— اطہر فاروقی

پندرہ روزہ مغربی بنگال

(کلکتہ کی تین سو سالہ سالگرہ کا خصوصی شمارہ)
مدیرِ اعلیٰ: پران کرشنا بھٹاچاریہ
صفحات: ۵۸
قیمت: سالانہ تین روپے، فی پرچہ بارہ پیسے
زیرِ نظر خصوصی شمارہ ساٹھ پیسے
ناشر: شعبۂ اطلاعات و ثقافتی امور حکومت مغربی بنگال، چوتھی منزل، بلاک ءا، رائٹرس بلڈنگ، کلکتہ ۷۰۰۰۰۱۔

حکومت مغربی بنگال کا یہ پندرہ روزہ

میگزین اگرچہ رسائل کے خصوصی شماروں کی طرح ضخیم نہیں لیکن اس اعتبار سے قابل ستائش ہے کہ یہ ٹوکیو اور نیویارک جیسے عظیم شہروں کے ہم مرتبہ شہر کلکتہ کے بارے میں ایک جامع اور جیتی جاگتی تصویر پیش کرتا ہے کلکتہ کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس نے پہلی بار آوازۂ انقلاب بلند کیا اور اپنی قابل فخر صحافت سے غیر ملکی اقتدار کے خلاف قومی ذہن کی منصوبہ بند تربیت کی۔

جنگ پلاسی کی ناکامی کے بعد جب ساری فضا پر مایوسی کے بادل چھائے ہوئے تھے کلکتہ کے پُرجوش جیالوں نے خوش آئند امیدوں کے چراغ روشن کیے۔ یہ بجائے خود بڑی دلچسپ بات ہے کہ برطانوی ایوانِ اقتدار کی خشت اول بھی اسی شہر میں رکھی گئی اور اس خشت اساس کو اکھاڑ پھینکنے کا عمل بھی اسی شہر میں شروع ہوا۔

زیر نظر میگزین اپنی زندگی کے ۳۶ سال پورے کر چکا ہے۔ موجودہ شمارہ جو ۱۹۹۰ء کا پہلا شمارہ ہے کلکتہ کی تین سو سالہ سالگرہ کا خصوصی نمبر ہے کلکتہ کی تاریخی، سیاسی، سماجی اور اقتصادی زندگی کے بارے میں یہ ایک ایسی دستاویز ہے جس سے حوالوں کا کام لیا جا سکتا ہے مختلف موضوعات پر معلومات افزا مضامین میں حسب ذیل قابلِ ذکر ہیں۔

کلکتہ کی تاریخ، انقلابی تحریکات، فورٹ ولیم کالج کی لسانی اور ادبی خدمات، اُردو صحافت میں کلکتہ کا مقام۔

ڈراما اور شعر و ادب، مسلمانوں کا شہر کی تعمیر و ترقی میں حصہ، شہر کے قابل دید اور یادگار مقامات اور کلکتہ سے مرزا غالب کا تعلق خاطر آخری موضوع اس لیے بھی دلچسپ ہے کہ مرزا نے کل کے بنارس اور آج کے وارانسی کے بارے میں اپنی مشہور مثنوی "چراغ دیر" کے بعد اگر کسی شہر سے اپنی جذباتی وابستگی کا اظہار کیا تو وہ صرف کلکتہ ہے مرزا دلّی کی پرانی دنیا سے نکل کر کلکتہ کی نئی دنیا میں آئے تھے دلّی میں کسی ہم نشین نے اس شہر جلال و جمال کا ذکر چھیڑا تو بے اختیار کہہ اٹھے:

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینہ میں مارا کہ ہائے ہائے

چند در چند خوبیوں کے باوجود اس رسالے میں ایک کمی کا شدید احساس ہوتا ہے مغرب کے صنعتی انقلاب کے بعد کلکتہ میں بتدریج جو صنعتی اور تجارتی ترقی ہوئی جس کی وجہ سے ایشیا کے عظیم شہروں میں اس کا شمار ہوا اس کا کوئی ذکر اس رسالے میں نہیں۔

—— تاباں نقوی

ماہنامہ ادبی کائنات

"امامِ امّت آیت اللہ خمینی نمبر"
مدیر: عقیل الغروی
صفحات: ۳۲۳
قیمت: درج نہیں
ناشر: مکتبۂ کائنات، شعبۂ صحافت، سفینۃ الہدایہ ٹرسٹ، ۴۰-۴۱، امام باڑہ لین، رشید مارکیٹ، دہلی ۱۱۰۰۵۱

جناب روح اللہ موسوی خمینی مرحوم جن کا جدّی رشتہ سرزمینِ ہند سے تھا لیکن ان کے والد اور وہ خود ایران کے شہر خمین میں پیدا ہوئے اور اسی نسبت سے خمینی کہلائے، بیسویں صدی کی ایک انقلاب آفریں شخصیت کے طور پر ہمیشہ یاد کیے جاتے رہیں گے۔ انھوں نے جلاوطنی کی زندگی گزارتے ہوئے اپنے ہم وطنوں میں جو انقلابی جذبہ پیدا کیا اور مادیت کے مغربی افسوں میں گرفتار معاشرے میں دینی احساس کو جس طرح فروغ دیا، اسے ایک غیر معمولی انسانی کارنامہ ہی کہا جائے گا۔ وہ عالم دین تھے، اسی شرف کی بنا پر آیت اللہ کے لقب سے ملقب ہوئے حجتہ الاسلام والمسلمین کہلائے؛ اور ہمارے علمائے دین، خواہ ان کا تعلق کسی مسلک سے ہو، بالعموم نظری بحثوں میں الجھ کر رہ جاتے ہیں یا پھر اپنی تمامتر صلاحیتیں مذہب کے اس پہلو کی اصلاح اور استحکام پر صرف کر ڈالتے ہیں جس کا تعلق اعتقادات و عبادات سے ہے۔ اس پہلو کی اہمیت سے انکار، نافہمی اور نادانی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اسلام محض عبادت کے طریقے سکھانے کے لیے دُنیا میں نہیں آیا، خدا نے اسے ایک مکمّل ضابطۂ حیات کے طور پر ہمیں ودیعت کیا ہے اور اس لیے ہماری پوری عملی زندگی پر اس کا اطلاق لازم ہے۔

امام خمینی کا امتیاز یہی ہے کہ انھوں نے اسلام کو اس کی پوری معنویت کے ساتھ سمجھنے اور سمجھانے کی سعی مشکور کی۔ اقبال نے کہا ہے: عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد۔ مراد یہ ہے کہ ہم کیسی ہی برتر اخلاقی اور روحانی اقدار کے امین ہوں، اگر ان کے عملی نفاذ کے وسائل سے محروم ہیں تو ان کی برکتوں سے انسانیت کو بہرہ ور کرنے سے عاجز و قاصر رہیں گے۔ امام خمینی کی جد و جہد اور ان کی جاری کردہ تحریکِ اسلامی پر نظر کی جائے تو

اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس رمزِ حکیمانہ سے پوری طرح باخبر تھے اور ان کی یہی باخبری تھی جس نے انھیں ایسے وسائل مہیا کیے جن سے کام لے کر انھوں نے ایرانی شاہنشاہیت کا تختہ پلٹ دیا اور اس خطّۂ زمین پر ایک ایسی حکومت کی مضبوط بنیادیں قائم کردیں جو ان کے دینی معتقدات کی حامل ہے۔

خمینی صاحب کے نظریات اور ان کے طریقۂ کار سے بہت سے لوگوں نے اختلاف کیا ہے۔ ان میں زیادہ تر وہ لوگ ہیں جو مذہب اور سیاست کو الگ الگ خانوں میں رکھنا چاہتے ہیں لیکن ان سے اختلاف کرنے والوں میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جن کا خیال ہے کہ خمینی صاحب کی سیاست میں کہیں کہیں انتقامی عنصر شامل ہوگیا تھا جو اسلام میں ایک ناپسندیدہ چیز ہے۔ یہ بحثیں چلتی رہیں گی لیکن اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ امام خمینی نے اپنے فکر و عمل سے اپنے ملک کے سیاسی اور سماجی نظام کی قلبِ ماہیت تو کر ہی دی، بین الاقوامی سیاست پر بھی دور رس اثرات مرتّب کیے اور مذہب و سیاست کے باہمی رشتے کو محض نظری طور پر ہی نہیں، عملی طور پر بھی ایک نیا رخ دیا۔

"ادبی کائنات" کا زیرِ نظر شمارہ، امام خمینی کے ساتھ فاضل مدیر کی گہری عقیدت مندی ہی کو ظاہر نہیں کرتا، ان کی قابلِ قدر مدیرانہ اہلیت کا بھی آئینہ دار ہے۔ انھوں نے اس کی بجائے کہ چند اہلِ قلم سے خمینی صاحب کے افکار و خیالات پر مضامین لکھوا کر یکجا کردیے جائیں، اس نمبر میں امام خمینی کی اہم تصنیفات کے ایسے اقتباسات ترجمہ کرا کے جمع کردیے ہیں جن کے مطالعے سے خمینی صاحب کے اساسی دینی معتقدات اور ان کے سیاسی نظریات جامعیت کے ساتھ سامنے آجاتے ہیں۔ دوسروں سے مضامین لکھوائے جاتے تو ان میں مضمون نگاروں کے اپنے تاثرات و تعصبات کی شمولیت ناگزیر تھی۔ نمبر کے فاضل مرتّب نے جو طریق کار اختیار کیا، اس نے قارئین کو خمینی صاحب کے افکار و خیالات کے براہِ راست مطالعے کا موقع فراہم کردیا ہے اور یہی اس کی افادیت ہے۔

نمبر کی طباعت فوٹو آفسیٹ کے طریقے سے ہوئی ہے اور اس کا ہر صفحہ امام خمینی کی تصویر سے مزیّن ہے لیکن کتابت معمولی ہے اور کہیں کہیں پروف ریڈر کی بے پروائی کی مثالیں بھی سامنے آتی ہیں، مثلاً صفحہ ۱۲۲ پر درج حاشیہ، متن کے درمیان میں آگیا ہے اور پڑھنے والے کو الجھن میں ڈالتا ہے۔ نمبر کی دوبارہ اشاعت کی نوبت آئے تو اچھا ہو کہ اس طرح کی خامیاں دور کردی جائیں۔

——— مخمور سعیدی

OO

میگزین اگرچہ رسائل کے خصوصی شماروں کی طرح ضخیم نہیں لیکن اس اعتبار سے قابل ستائش ہے کہ یہ ٹوکیو اور نیو یارک جیسے عظیم شہروں کے ہم مرتبہ شہر کلکتہ کے بارے میں ایک جامع اور جیتی جاگتی تصویر پیش کرتا ہے کلکتہ کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس نے پہلی بار آوازۂ انقلاب بلند کیا اور اپنی قابل فخر صحافت سے غیر ملکی اقتدار کے خلاف قومی ذہن کی منصوبہ بند تربیت کی۔

جنگ پلاسی کی ناکامی کے بعد جب ساری فضا پر مایوسی کے بادل چھائے ہوئے تھے کلکتہ کے پرجوش جیالوں نے خوش آئند امیدوں کے چراغ روشن کیے۔ یہ بجائے خود بڑی دلچسپ بات ہے کہ برطانوی ایوانِ اقتدار کی خشت اول بھی اسی شہر میں رکھی گئی اور اس خشت اساس کو اکھاڑ پھینکنے کا عمل بھی اسی شہر میں شروع ہوا۔

زیر نظر میگزین اپنی زندگی کے ۳۶ سال پورے کر چکا ہے۔ موجودہ شمارہ جو ۱۹۹۰ء کا پہلا شمارہ ہے کلکتہ کی تین سو سالہ سالگرہ کا خصوصی نمبر ہے کلکتہ کی تاریخی، سیاسی، سماجی اور اقتصادی زندگی کے بارے میں یہ ایک ایسی دستاویز ہے جس سے حوالوں کا کام لیا جاسکتا ہے۔ مختلف موضوعات پر معلومات افزا مضامین میں حسب ذیل قابل ذکر ہیں۔

کلکتہ کی تاریخ، انقلابی تحریکات، فورٹ ولیم کالج کی لسانی اور ادبی خدمات، اردو صحافت میں کلکتہ کا مقام۔

ڈراما اور شعر و ادب، مسلمانوں کا شہر کی تعمیر و ترقی میں حصہ، شہر کے قابل دید اور یادگار مقامات اور کلکتہ سے مرزا غالب کا تعلق خاطر

آخری موضوع اس لیے بھی دلچسپ ہے کہ مرزا نے کل کے بنارس اور آج کے وارانسی کے بارے میں اپنی مشہور مثنوی "چراغ دیر" کے بعد اگر کسی شہر سے اپنی جذباتی وابستگی کا اظہار کیا تو وہ صرف کلکتہ ہے مرزا دلی کی پرانی دنیا سے نکل کر کلکتہ کی نئی دنیا میں آئے تھے دلی میں کسی ہم نشین نے اس شہر جلال وجمال کا ذکر چھیڑا تو بے اختیار کہہ اٹھے:

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینہ میں مارا کہ ہائے ہائے

چند در چند خوبیوں کے باوجود اس رسالے میں ایک کمی کا شدید احساس ہوتا ہے مغرب کے صنعتی انقلاب کے بعد کلکتہ میں بتدریج جو صنعتی اور تجارتی ترقی ہوئی جس کی وجہ سے ایشیا کے عظیم شہروں میں اس کا شمار ہوا اس کا کوئی ذکر اس رسالے میں نہیں۔

——تاباں نقوی

ماہنامہ ادبی کائنات
"امام امت آیت اللہ خمینی نمبر"
مدیر: عقیل الغروی
صفحات: ۳۲۳
قیمت: درج نہیں
ناشر: مکتبۂ کائنات، شعبۂ صحافت، سفینۃ الہدایہ ٹرسٹ، ۴۰ - ۴۱، امام باڑہ لین، رشید مارکیٹ، دہلی ۱۱۰۰۵۱

جناب روح اللہ موسوی خمینی مرحوم جن کا جدی رشتہ سرزمین ہند سے تھا لیکن ان کے والد اور وہ خود ایران کے شہر خمین میں پیدا ہوئے اور اسی نسبت سے خمینی کہلائے، بیسویں صدی کی ایک انقلاب آفریں شخصیت کے طور پر ہمیشہ یاد کیے جاتے رہیں گے۔ انھوں نے جلاوطنی کی زندگی گزارتے ہوئے اپنے ہم وطنوں میں جو انقلابی جذبہ پیدا کیا اور مادیت کے مغربی افسوں میں گرفتار معاشرے میں دینی احساس کو جس طرح فروغ دیا، اسے ایک غیر معمولی انسانی کارنامہ ہی کہا جائے گا۔ وہ عالم دین تھے، اسی شرف کی بنا پر آیت اللہ کے لقب سے ملقب ہوئے حجۃ الاسلام والمسلمین کہلاتے؛ اور ہمارے علمائے دین، خواہ ان کا تعلق کسی مسلک سے ہو، بالعموم نظری بحثوں میں الجھ کر رہ جاتے ہیں یا پھر اپنی تمام تر صلاحیتیں مذہب کے اس پہلو کی اصلاح اور استحکام پر صرف کر ڈالتے ہیں جس کا تعلق اعتقادات و عبادات سے ہے۔ اس پہلو کی اہمیت سے انکار، نافہمی اور نادانی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اسلام محض عبادت کے طریقے سکھانے کے لیے دنیا میں نہیں آیا خدا نے اسے ایک مکمل ضابطۂ حیات کے طور پر ہمیں ودیعت کیا ہے اور اس لیے ہماری پوری عملی زندگی پر اس کا اطلاق لازم ہے۔

امام خمینی کا امتیاز یہی ہے کہ انھوں نے اسلام کو اس کی پوری معنویت کے ساتھ سمجھنے اور سمجھانے کی سعی مشکور کی۔ اقبال نے کہا ہے: عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد۔ مراد یہ ہے کہ ہم کیسی ہی برتر اخلاقی اور روحانی اقدار کے امین ہوں، اگر ان کے عملی نفاذ کے وسائل سے محروم ہیں تو ان کی برکتوں سے انسانیت کو بہرہ ور کرنے سے عاجز و قاصر رہیں گے۔ امام خمینی کی جدوجہد اور ان کی جاری کردہ تحریکِ اسلامی پر نظر کی جائے تو

اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس رمزِ حکیمانہ سے پوری طرح باخبر تھے اور ان کی یہی باخبری تھی جس نے انھیں ایسے وسائل مہیا کیے جن سے کام لے کر انھوں نے ایرانی شاہنشاہیت کا تختہ پلٹ دیا اور اس خطّۂ زمین پر ایک ایسی حکومت کی مضبوط بنیادیں قائم کر دیں جو ان کے دینی معتقدات کی حامل ہے۔

خمینی صاحب کے نظریات اور ان کے طریقۂ کار سے بہت سے لوگوں نے اختلاف کیا ہے۔ ان میں زیادہ تر وہ لوگ ہیں جو مذہب اور سیاست کو الگ الگ خانوں میں رکھنا چاہتے ہیں لیکن ان سے اختلاف کرنے والوں میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جن کا خیال ہے کہ خمینی صاحب کی سیاست میں کہیں کہیں انتقامی عنصر شامل ہو گیا تھا جو اسلام میں ایک ناپسندیدہ چیز ہے۔ یہ بحثیں چلتی رہیں گی لیکن اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ امام خمینی نے اپنے فکر و عمل سے اپنے ملک کے سیاسی اور سماجی نظام کی قلب ماہیت تو کر ہی دی، بین الاقوامی سیاست پر بھی دور رس اثرات مرتب کیے اور مذہب و سیاست کے باہمی رشتے کو محض نظری طور پر ہی نہیں، عملی طور پر بھی ایک نیا رخ دیا۔

"ادبی کائنات" کا زیرِ نظر شمارہ، امام خمینی کے ساتھ فاضل مدیر کی گہری عقیدت مندی ہی کو ظاہر نہیں کرتا، ان کی قابلِ قدر مدیرانہ اہلیت کا بھی آئینہ دار ہے۔ انھوں نے اس کی بجائے کہ چند اہلِ قلم سے خمینی صاحب کے افکار و خیالات پر مضامین لکھوا کر یکجا کر دیے جائیں، اس نمبر میں امام خمینی کی اہم تصنیفات کے ایسے اقتباسات ترجمہ کرا کے جمع کر دیے ہیں جن کے مطالعے سے خمینی صاحب کے اساسی دینی معتقدات اور ان کے سیاسی نظریات جامعیت کے ساتھ سامنے آ جاتے ہیں۔ دوسروں سے مضامین لکھوائے جاتے تو ان میں مضمون نگاروں کے اپنے تاثرات و تعصبات کی شمولیت ناگزیر تھی۔ نمبر کے فاضل مرتب نے جو طریق کار اختیار کیا، اس نے قارئین کو خمینی صاحب کے افکار و خیالات کے براہِ راست مطالعے کا موقع فراہم کر دیا ہے اور یہی اس کی افادیت ہے۔

نمبر کی طباعت فوٹو آفسیٹ کے طریقے سے ہوئی ہے اور اس کا ہر صفحہ امام خمینی کی تصویر سے مزیّن ہے لیکن کتابت معمولی ہے اور کہیں کہیں پروف ریڈر کی بے پروائی کی مثالیں بھی سامنے آتی ہیں، مثلاً صفحہ ۱۲۲ پر درج حاشیہ، متن کے درمیان میں آ گیا ہے اور پڑھنے والے کو الجھن میں ڈالتا ہے۔ نمبر کی دوبارہ اشاعت کی نوبت آئے تو اچھا ہو کہ اس طرح کی خامیاں دور کر دی جائیں۔

——— مخمور سعیدی

○○

اُردو خبرنامہ

عبدالرحیم خان خاناں اور ان کے عہد پر سیمینار

عبدالرحیم خانِ خاناں میموریل سوسائٹی کے زیرِ اہتمام رحیم اور ان کے عہد پر ایک دو روزہ سیمینار نئی دہلی میں منعقد ہوا۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت جناب بشمبر ناتھ پانڈے نے انجام دی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطبے میں اس بات پر دکھ کا اظہار کیا کہ آج تاریخ کو غلط رنگ میں پیش کیا جارہا ہے پروفیسر خلیق احمد نظامی نے سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے عبدالرحیم خانِ خاناں اور ان کے کارناموں پر روشنی ڈالی۔ جناب وی۔ ایس۔ دیشپانڈے نے کلیدی خطبہ میں تاریخ کے صحیح استعمال پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ تاریخ دو دھاری تلوار ہے جس سے نفرت اور محبت دونوں کے پھیلانے کا کام لیا جاسکتا ہے۔

اگلے دن سیمینار کے پہلے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر ایس۔ اے۔ آئی۔ ترمذی نے انجام دی۔ اس اجلاس میں پروفیسر عبدالودود اظہر نے ہندوستانی زبانوں کے تیئیس صوفی سنتوں کی خدمات پر مقالہ پڑھا محترم ستیش چندرا شوبھا نے رحیم کے ہم عصر صوفی سنتوں کی تہذیبی روایت کے نام مقالہ پیش کیا عبدالرحیم خان خاناں کے مزار کی فنّی خصوصیات پر مقالہ ڈاکٹر عزیز الدین حسین نے پیش کیا۔ اس اجلاس کا کلیدی مقالہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے پڑھا جس کا موضوع تھا رحیم کے عہد کا تہذیبی اور سماجی پس منظر۔ تمام مقالوں پر بھرپور بحث ہوئی۔ لنچ کے وقفے کے بعد دوسرا اجلاس ہوا۔ موضوع تھا "رحیم اور ان کے معاصر" اجلاس کی صدارت پروفیسر نامور سنگھ نے کی۔ مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر ماجدہ اسد نے اسلام۔ تصوّف اور گوسوامی تلسی داس کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔ محترمہ ڈاکٹر نیلم رشی کلپ نے رحیم کی ہندی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر عارف نظیر نے رحیم کی شاعری میں بھگتی عناصر کا جائزہ لیا۔ جناب بلجیت سنگھ مطیر نے ملّا داؤد کی مثنوی چنداین پر مقالہ پیش کیا اور جناب ہری چند چڈھا نے اکبر کی مذہبی پالیسی سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ تمام مقالوں پر بحث ہوئی۔ سیمینار میں شہر کے ممتاز دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں نے شرکت کی۔ ڈاکٹر نامور سنگھ نے اپنے صدارتی خطبہ میں موجودہ دور میں رحیم اور ان کی شاعری کی معنویت کو اجاگر کیا۔ سیمینار کے کنوینر جناب شیخ سلیم احمد نے تمام اجلاسوں کی کارروائی چلائی۔

(ڈاکٹر شعیب کرمانی)

ہریانہ اُردو اکادمی کی شامِ افسانہ

چنڈی گڑھ کی اسٹیٹ سینٹرل لائبریری میں ہریانہ اُردو اکادمی کی جانب سے ایک شامِ افسانہ کا اہتمام کیا گیا جس میں ہریانہ اور پڑوسی ریاستوں کے دس افسانہ نگاروں نے اپنی تخلیقات پیش کیں۔ تقریب کی صدارت دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر قمر رئیس نے کی۔ اس موقع پر ماہنامہ "کتاب نما" کے خصوصی شمارے "صالحہ عابد حسین نمبر" کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے کہا کہ صالحہ عابد حسین اُردو افسانہ نگاری کی ایک معتبر شخصیت تھیں۔ مرحومہ کا تعلق ہریانہ کے مردم خیز خطّے پانی پت سے تھا ان کے خاندان نے اپنی تحریروں سے اُردو اور ہریانہ دونوں کو وقار بخشا ہے۔

(ناشر نقوی)

اُردو آفاقی زبان ہے

گزشتہ دنوں ہریانہ اُردو اکادمی کی جانب سے نارنول کے آفیسرز کلب میں کل ہند مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت حکومتِ ہریانہ کے وزیر جناب دھیر پال سنگھ نے کی اور مشاعرے کا افتتاح ایک دوسرے محترم وزیر جناب حکم سنگھ نے کیا۔ اپنی افتتاحیہ تقریر میں انھوں نے اُردو کو ایک آفاقی زبان قرار ہوئے اس زبان کے ادب کو ہندوستا

قیمتی سرمایہ قرار دیا۔ اس موقع پر انھوں
اکادمی کی جانب سے شائع شدہ کتاب
نوان "چھپنا کال" کی رسم اجرا بھی انجام
۔ اس کتاب کے مرتب جناب بال کرشن
مطر ہیں۔ جناب وصیر پال سنگھ نے اکادمی
ماہ مارچ کے خبرنامہ سمیت اکادمی کی
امداد سے شائع شدہ کتابوں کی رسم اجرا
ام دی۔ ان کتابوں میں "جوئے لالاخ" (ستیش
ہ) "سنّاٹے کی آواز" (رانا گنوری) "نئے
دیپے" (عابد عالمی) "انمول رتن" (ویدراج
بیجر) اور "خواب کا نقش پا" (مدن
لوی) شامل ہیں۔

(شمس تبریزی)

ردو کے مسائل پر اظہارِ خیال

مئی کے آخری عشرے میں مختلف
یخوں میں پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، پروفیسر
حسن، پروفیسر رفیق حسن خاں اور جناب
ید پاشا آزاد سنبھل آئے اور اُردو کے
ائل پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔
مسائل کا تجزیہ کرتے ہوئے مقررین
یہ بات زور دے کر کہی کہ اُردو سے متعلق
رکاری اعلانات و اقدامات پر عمل درآمد
ں ہو رہا ہے، جس کے ازالے کے لیے ٹھوس
ت عملی اختیار کرنے کی اشد ضرورت ہے۔
فیسر ظہیر احمد صدیقی نے اظہارِ خیال کرتے
ے کہا کہ جو مسائل درپیش ہیں، ان کا
ق مشکلات سے ہے، ناممکنات سے نہیں۔
کلات کے حل کے لیے ایثار و قربانی کے
بے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے سنبھل
میں اُردو تحریک کی پیش رفت اور اُردو کارکنوں
کے جذبے کی تحسین کرتے ہوئے اس یقین کا
اظہار کیا کہ کمشنری کے محبانِ اُردو اُردو کاز کی
خاطر سرگرم عمل رہیں گے اور کامیابی سے
ہمکنار ہوں گے۔

اس موقع پر پروفیسر ظہیر احمد صدیقی
نے ڈاکٹر سعادت علی صدیقی کے مجموعۂ مضامین
"ادبی تحریریں" اور جلال افسر کے مجموعۂ منظومات
"بچّوں کی نظمیں" کی رسم اجرا بھی ادا کی۔

پروفیسر محمد حسن نے اتّر پردیش میں
اُردو کی زبوں حالی کی ذمّے داری نام نہاد
اور مفاد پرست قائدینِ اُردو پر عائد کی اور
کہا کہ ایک منظم سازش کے تحت اُردو والوں کا
حوصلہ چھین لیا گیا ہے، وہ نالہ و شیون، گریہ و زاری
اور محرومی و مایوسی کے اس حد تک شکار ہو گئے
ہیں کہ ان پر مفلس بیوہ کا گمان ہوتا ہے۔ انھوں
نے اُردو والوں کو یاد دلایا کہ بھیک مانگنے سے
حق نہیں ملتا۔ اس کے حصول کے لیے سخت
جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ روہیل
کھنڈ کا علاقہ اُردو کا علاقہ ہے جہاں مائیں
اپنے بچّوں کو اُردو میں لوریاں سناتی ہیں۔
اس لیے اُردو کے تئیں اس علاقے کی ذمے داریاں
زیادہ ہیں۔ مادری زبان کی بقا و ترقی کے
لیے جدّوجہد کرنا ہمارا اخلاقی و انسانی فرض
ہے کیوں کہ جس قوم سے اس کی زبان چھین
لی جاتی ہے، وہ قوم گونگی اور بہری ہو جاتی ہے۔

گورنمنٹ رضا کالج رام پور کے پروفیسر
رفیق حسن خاں اور نوجوان صحافی فرید پاشا
آزاد نے اُردو زبان و ادب کی ترقی کے لیے سنبھل
کے با حوصلہ کارکنوں کی توصیف کی اور عاشق
پبلک لائبریری کو قابلِ فخر ادارہ قرار دیتے
ہوئے اس کی ہمہ گیر ترقّی و کارکردگی پر اظہار
مسرت کیا نیز ہر شہر و قصبہ میں اس نوع
کے ادارے قائم کیے جانے کی ضرورت پر زور دیا۔

(خلیق احمد)

اُردو اخبارات اور سرکاری اشتہارات

مشہور صحافی اور دہلی سے راجیہ سبھا
کے رُکن جناب محمد افضل نے اپنے ایک بیان
میں کہا ہے کہ ماضی اور حال میں اُردو اخبارات
کے لیے سرکاری پالیسیاں کتنی بھی مثبت
رہی ہوں، مگر یہ ہمیشہ افسر شاہی اور اعداد و
شمار کی بھول بھلیوں کا شکار رہے ہیں۔
سرکاری طور پر اشتہارات کی مد میں رکھی
جانے والی رقم کا تقریباً ۸۰ فیصد انگریزی
اور ہندی کے بڑے اخبارات کی نذر ہو جاتا
ہے کیوں کہ ان کے ایڈ ریٹ علاقائی زبانوں
کے اخبارات کے ریٹوں سے بیس اور پچیس
گنا زیادہ ہوتے ہیں۔ باقی بیس فیصد فنڈ
ہی علاقائی زبانوں کے اخبارات کو مل پاتا
ہے۔ اس لیے سرکاری اعلانات کے باوجود
اُردو اخبارات خصوصاً چھوٹے اخبارات کی
شکایات نہ صرف برقرار رہی ہیں بلکہ ان
میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ ایک عام تجزیے کے
مطابق انگریزی اخبارات صرف بڑے شہروں
میں پڑھے جاتے ہیں۔ ہندی کے علاوہ علاقائی
زبانوں کے پڑھے جانے والے اخبارات ہی
۸۰ فیصد عوام کی نمائندگی کرتے ہیں اور
ان میں اُردو سرفہرست ہے۔ اُردو اخبارات
دیہاتوں، قصبوں اور اضلاع میں کثیر تعداد
میں نہ صرف پڑھے جاتے ہیں بلکہ ملک کی ترقی

اور پالیسیوں پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔

جنابِ محمد افضل نے اس سلسلے میں عملی پیش قدمی کی ہے۔ انھوں نے کئی مرکزی وزرا خصوصاً وزیرِ صحت جناب رشید مسعود، وزیرِ سیاحت جناب ست پال ملک اور وزیرِ داخلہ جناب مفتی محمد سعید سے ملاقاتیں کرکے اُردو اخبارات کے سلسلے میں محکمہ جاتی چشم پوشی کی طرف توجہ دلائی اور پبلسٹی کے میدان میں اُردو اخبارات کی افادیت سے آگاہ کیا۔ انھوں نے بتایا کہ بعض سرکاری شعبوں مثلاً ٹورازم کی پبلسٹی سے یہ اخبارات محروم رہتے ہیں۔

جنابِ محمد افضل نے کہا ہے کہ وہ بہت جلد دوسرے مرکزی وزرا سے تبادلۂ خیالات کریں گے، جن کی تفصیلات سے گا۔ بگا ہے اور اخبارات کو مطلع کیا جاتا رہے گا۔

اُردو صحافت پر سیمینار

گزشتہ دنوں بھوپال کے مادھوراے سپرے اخبارات میوزیم کی جانب سے مدھیہ پردیش کی اُردو صحافت" ابتدا اور ارتقا" کی تقریبِ رونمائی منعقد ہوئی۔ اس کتاب کو جنابِ قمر جمالی میوزیم کے شعبۂ اُردو کے ذمہ دار جنابِ شوکت رموزی اور جنابِ اشتیاق عارف نے ترتیب دیا ہے۔ کتاب کا اجرا گورنر مدھیہ پردیش جنابِ محمود علی خاں صاحب کے ذریعے ہوا۔

اس موقع پر" اُردو صحافت کی وراثت اور موجودہ حالات" کے عنوان سے

بائیں سے: ڈاکٹر خلیق انجم، جنابِ اشتیاق عارف، جنابِ عارف عزیز، پروفیسر آفاق احمد

ایک سیمینار بھی منعقد کیا گیا۔ جس میں ڈاکٹر ظ۔ انصاری، ڈاکٹر خلیق انجم، جنابِ ناز انصاری، محترم اشتیاق عارف اور جنابِ عارف عزیز نے اپنے مقالات پڑھے۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے کہا کہ اُردو اخبارات معاشی پستی کا شکار اس لیے ہیں کیونکہ لوگ اُردو اخبار خرید کر نہیں پڑھتے۔ تعلیم یافتہ لوگ انگریزی اخبار خریدنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ چند غریب اور کم پڑھے لکھے لوگ ہی اُردو اخبارات خریدتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اُردو اخبارات میں مواد ایسا نہیں ہو[illegible] جو قارئین کو پڑھنے پر اکسائے اس کمی کو دو[illegible] کرنے کے لیے انھوں نے مشورہ دیا کہ صحا[illegible] پر لٹریچر تیار کیا جائے، صحافیوں کے لیے ورکشا[illegible] منعقد کیے جائیں صحافت سے متعلق کتب کی ریفرنس لائبریریاں قائم کی جائیں یہ کام [illegible] اُردو اکادمیاں بخوبی انجام دے سکتی ہیں۔ انھ[illegible] نے اُردو اخبارات کو جدید ٹیکنالوجی اپنانے [illegible] مشورہ بھی دیا تاکہ اُردو اخبارات دوسری زبانو[illegible] اخباروں سے مقابلہ کرسکیں۔ (بہ دو اسطی پرویز اختر [illegible])

بشیر بدر کی دیوناگری لپی میں چھپی غزلوں کی کتاب" اُجالے اپنی یادوں کے" کا[illegible] بدستِ گورنر مدھیہ پردیش بھوپال ——— تصویر میں ڈاکٹر راحت بدر، محترم کنو[illegible] علی خاں (گورنر) ڈاکٹر بشیر بدر، گورنر صاحب کی بیگم صاحبہ۔
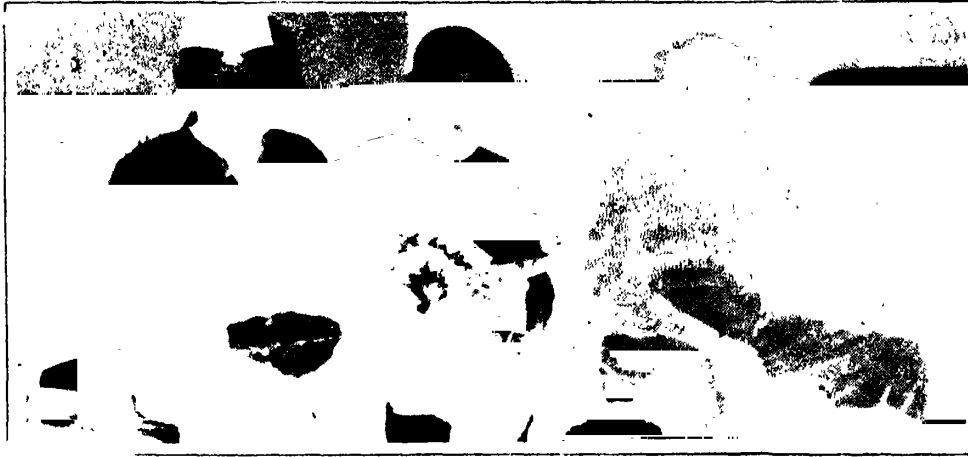
شاکر انصاری سکندر آبادی کے مجموعے "جوابی خط" کی رسمِ اجرا کے موقع پر ـــــ اجرا کے بعد کتاب پر دستخط کرتے ہوئے صدرِ جلسہ پروفیسر اسلوب احمد انصاری (درمیان میں) دائیں جانب پروفیسر آلِ احمد سرور اور بائیں جانب جنابِ شاکر انصاری سکندر آبادی۔

کھنڈوہ میں قاضی حسن رضا کے مجموعۂ کلام "میثاق" کا اجرا ڈاکٹر مظفر حنفی نے کیا۔ اس موقعے کی ایک یادگار تصویر۔

مظفر نگر میں فرید پاشا آزاد کی تصنیف "احساس کی صلیب" کی رسمِ اجرا بدست جنابِ عثمان الحق صدیقی جنرل سیکریٹری آل انڈیا اُردو تعلیمی بورڈ عمل میں آئی ـــــ تصویر میں دائیں جانب جنابِ فرید پاشا آزاد درمیان میں جناب عثمان الحق صدیقی اور بائیں جانب جناب سید منور حسن کاظمی سپرنٹنڈنٹ آل انڈیا اُردو تعلیمی بورڈ مظفر نگر۔

جگن ناتھ آزاد کا نعتیہ کلام فرانسیسی میں

اُردو کے نامور شاعر جناب جگن ناتھ آزاد نعتیہ کلام کا فرانسیسی ترجمہ کتابی صورت پیرس سے شائع ہوگیا ہے۔ ترجمہ علمی دُنیا معروف شخصیت ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے کیا جو لگ بھگ چالیس سال سے پیرس میں مقیم کتاب فرانس کے مشہور اشاعتی ادارے EDITIONS TOUGI, 30 RUE RENE BOULANGER 75010 PARIS (FRANCE) نے شائع ہے۔

وفیات

پچھلے دنوں اُردو کے مشہور کہانی کار، مور ادیب اور محقق ڈاکٹر برج پریمی مختصر علالت کے بعد انتقال کر گئے۔ وہ ۵۴ برس کے تھے۔

ڈاکٹر برج پریمی ۱۹۳۵ء میں حبہ کدل سری نگر کشمیر میں پیدا ہوئے تھے۔ ڈی۔اے۔
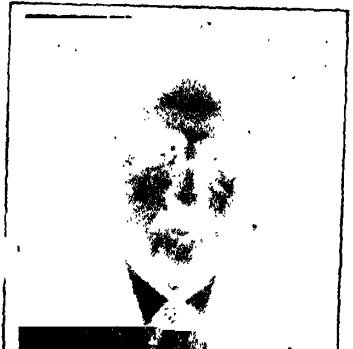
وی۔ اسکول مہاراج گنج سری نگر کشمیر سے میٹرک پاس کر کے محکمۂ تعلیم میں ملازم ہوئے۔ پھر ایم۔ اے۔ بی۔ ایڈ کی ڈگریاں حاصل کیں اور دوسرے محکمانہ امتحانات امتیاز سے پاس کیے۔ "سعادت حسن منٹو: حیات اور کارنامے" کے موضوع پر اپنا تحقیقی مقالہ پیش کیا اور اچھے محققوں میں شمار ہونے لگے۔ ڈاکٹر برج پریمی اسٹیٹ ایجوکیشن محکمے میں مختلف ذمہ دار عہدوں پر فائز رہے۔ آج کل وہ کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ریڈر کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔

ڈاکٹر برج پریمی متعدد کتابوں کے مصنف ہے۔ ریاست جموں و کشمیر سے انھیں والہانہ لگاؤ تھا۔ سعادت حسن منٹو پر ان کی کتاب ابھی چند برس پہلے شائع ہوئی جس کو ملک اور بیرون ملک کے ادبی حلقوں نے کافی سراہا۔

ڈاکٹر برج پریمی کو اپنے تحقیقی کارناموں کے پیش نظر ریاست اور بیرون ریاست کے اُردو اداروں نے مختلف ایوارڈوں سے نوازا تھا۔

ڈاکٹر برج پریمی کی چند تصانیف یہ ہیں:

(۱) سعادت حسن منٹو: حیات اور کارنامے (۲) حرفِ جستجو (۳) ذوقِ نظر (۴) کشمیر کے مضامین (۵) جلوۂ صد رنگ (۶) چند تحریریں (۷) پریم ناتھ در کی افسانہ نگاری (۸) جموں و کشمیر میں اُردو ادب کی نشوونما۔

کچھ کتابیں وہ غیر مطبوعہ چھوڑ گئے ہیں جن کے نام ہیں:

منٹو کتھا

۲۔ اوپندر ناتھ اشک کے خطوط
۳۔ میرے عہد کے لوگ
۴۔ پریم ناتھ پردیسی: عہد، شخص اور فنکار۔

● دہلی میں اُردو اور انگریزی کے معروف قلمکار جناب اِندر جیت لال چند روزہ علالت کے بعد ۵ جون کی صبح کو انتقال کر گئے۔

وہ ۲۱ اکتوبر ۱۹۲۶ء کو کوہ مری (ضلع راولپنڈی، پاکستان) میں پیدا ہوئے تھے۔

انھوں نے میٹرک سے ایم۔ اے تک کے امتحانات فرسٹ ڈویژن میں پاس کیے۔ انھوں نے اپنی عملی زندگی روزنامہ پرتاپ نئی دہلی کی ملازمت سے شروع کی۔ پھر وہ روزنامہ بندے ماترم نئی دہلی سے وابستہ ہوگئے۔ اس کے بعد محکمۂ موسمیات (پونہ و نئی دہلی) میں بطورِ آبزرور کام کیا۔ ۱۹۵۹ء سے ۱۹۸۶ء تک ایڈیٹر انگریزی (انڈین کونسل آف اگریکلچرل ریسرچ نئی دہلی) رہے اور وظیفہ حسنِ خدمت پر سبکدوش ہوئے۔

[illegible]

عمرانیات۔ ادب۔ فنونِ لطیفہ۔ طنز و مزاح۔ صحافت جیسے موضوعات شامل تھے۔

ان کی حسبِ ذیل کتابیں بہت مشہور و مقبول ہوئیں:

(۱) آج کی سائنس (۲) ببر شیر (۳) گیہوں کی کہانی (۴) نیا ہندوستان (۵) ایٹم (۶) سائنس اور ہندوستان (۷) گیہوں کاشت اور کھوج (۸) تعمیرِ نو (۹) سائنس کی باتیں (۱۰) قلم اور آواز (۱۱) ہمارے قومی ہیرو (۱۲) ہمارے سائنس داں (۱۳) پھل پھول اناج (۱۴) نغمۂ روح (۱۵) مسکراہٹ ہی مسکراہٹ (۱۶) جانور سے انسان تک (۱۷) بچوں کی دیکھ بھال (۱۸) نئی نئی باتیں (۱۹) عظیم شخصیتیں (۲۰) بیربل ساہنی۔

اردو اکادمی، دہلی نے ان کی خدمات کے اعتراف میں اس سال انھیں ایوارڈ دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ افسوس ہے کہ موت نے عجلت کی اور وہ یہ ایوارڈ حاصل کرنے کو خود زندہ نہ رہے۔

● ۲۸ مئی کو کراچی کے ایک اسپتال میں جنابِ منیر احمد شیخ کا انتقال ہوگیا۔ وہ کسی طبّی ٹیسٹ کے لیے اسپتال گئے تھے اور ٹیسٹ کے دوران ہی میں انھوں نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ ان کی عمر ۵۸ سال تھی۔

منیر احمد شیخ پاکستان کی ڈپلومیٹک سروس سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ نئی دہلی کے پاکستانی سفارت خانے سے کئی سال تک ذمہ دارانہ حیثیت سے وابستہ رہے اور اپنے ادبی پس منظر اور ذاتی اخلاقی خوبیوں کی وجہ سے دِلّی کے ادبی اور ثقافتی حلقوں میں انھیں بہت مقبولیت حاصل ہوگئی تھی۔

ان کی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے ہوا تھا، آگے چل کر انھوں نے مضامین اور انشائیے بھی لکھے۔ ان کا پہلا افسانہ "اچے برج لہور دے" پاکستان کے مشہور ادبی جریدے "فنون" میں شائع ہوا تھا جو احمد ندیم قاسمی کی ادارت میں نکلتا ہے۔ اس افسانے کے بارے میں خود ان کا بیان یہ ہے کہ یہ ایک ایسی سانولی لڑکی سے ان کا اظہارِ عشق تھا جس سے زندگی میں وہ کبھی گفتگو نہ کرسکے۔

ان دِنوں جنابِ منیر احمد شیخ کا مستقر اسلام آباد تھا اور وہ پاکستان کی وزارت اطلاعات ونشریات میں ڈائرکٹر ریسرچ اینڈ ریفرینس کی خدمت انجام دے رہے تھے۔

● ۱۰ جون کی رات کو بھوپال میں جنابِ اسد بھوپالی نے بہ عارضۂ فالج انتقال کیا۔ انتقال کے وقت وہ ستّر سال کے تھے۔

اسد بھوپالی ایک اچھے غزل گو تھے مگر انھیں شہرت فلمی نغمہ نگار کی حیثیت سے ملی۔ وہ گزشتہ چالیس سال سے بمبئی کی فلم انڈسٹری سے وابستہ تھے اور اس طویل مدّت میں انھوں نے جو گیت لکھے ان میں سے بعض بہت مشہور ہوئے۔ ان کا مستقل قیام بمبئی ہی میں تھا، چار مہینے قبل وہ اپنی لڑکی کی شادی کی تیاریوں کے سلسلے میں بھوپال گئے تھے جہاں ان پر فالج کا حملہ ہوا اور پھر وہ بستر سے اُٹھ نہ سکے۔ زندگی کی آخری سانس انھوں نے اپنے آبائی مکان میں لی اور بھوپال کے قبرستان بڑا باغ میں سپردِ خاک کیے گئے ___ پس ماندگان میں دو بیویاں، چھ بیٹیاں اور تین بیٹے ہیں۔

ہم ان ادبی سانحوں پر دِلی رنج و غم کا اظہار کرتے ہیں۔

○○

سرورق کے اندرونی صفحے کے لیے

موصولہ عنوانات

جون ۱۹۹۰ء کے "ایوانِ اُردو" کے سرورق کے اندرونی صفحے پر جو تصویر چھاپی گئی تھی، اس کے لیے موصول ہونے والے شعری اور نثری عنوانوں میں سے تصویر کی مناسبت سے موزوں سمجھے جانے والے چند عنوان ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں ۔۔۔۔۔ "گلدستہ" ان حضرات کو ارسال کیا جائے گا جن کے بھیجے ہوئے عنوان چوکھٹے میں دیے جا رہے ہیں۔

شعری عنوانات

بچوں کے چھوٹے ہاتھوں کو چاند ستارے چھونے دو چار کتابیں پڑھ کر یہ بھی ہم جیسے ہو جائیں گے (ندا فاضلی) مرسلہ: ثمینہ اثر کمل ایسوسی ایٹس، باندرہ ٹاکیز، بمبئی ۵۳

چلی ہے تھام کے بادل کے ہاتھ کو خوشبو ہوا کے ساتھ سفر کا مقابلہ ٹھہرا (پروین شاکر) مرسلہ: محمد نسیم اشرف معرفت مسلم شہزادؔ، بزمِ کہکشاں، نرکٹیا گنج، ضلع مغربی چمپارن ۸۴۵۴۵۵ (بہار)

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں (غالب)

مرسلہ: عمیر راجپوری، مظفر پور

تو شناسائے خراشِ عقدۂ مشکل نہیں
اے گلِ رنگیں ترے پہلو میں شاید دل نہیں (اقبال)

مرسلہ: عبدالرؤف خاں، اودگی کلاں

دوشیزہ اداؤں میں شگوفوں کی بہاریں
گلزار سے غنچوں کی پھبن کھیل رہی ہے (فراق)

مرسلہ: خان اسد ملک، جے پور

اس دشت کو نغموں سے گلزار بنا جائیں
جس راہ سے ہم گزریں کچھ پھول کھلا جائیں (فراق)

مرسلہ: خان جاوید بلال، اودگی کلاں

چمن تم سے عبارت ہے بہاریں تم سے زندہ ہیں
تمہارے سامنے پھولوں سے مرجھایا نہیں جاتا (مخمور دہلوی)

مرسلہ: آفتاب احمد خاور، جے پور

میں کون ہوں کہ مجھے راستے بلاتے ہیں
وہ کون ہیں کہ جنھیں حکمِ انتظار ملا (خالد عبادی)

مرسلہ: روحی عبیداللہ، دربھنگہ

بیت جائے لڑکپن تو پھر دیکھنا
زندگی کتنے خانوں میں بٹ جائے گی (نامعلوم)

مرسلہ: نفیس شیراز، نئی دہلی

ہم بھی بچے تھے بہل جاتے تھے بہلانے سے
آج کا بچہ بہل جائے ضروری تو نہیں (رؤف جاوید)

مرسلہ: ابوذر ہاشمی، بھلائی نگر

ابھی گزارے ہیں بچپن کے چار دن تم نے
ابھی سے تم نہ اکیلے ادھر اُدھر جانا (ارشاد کانپوری)

مرسلہ: سمیع الدین خاں شاداب، رامپور

خوابِ فردا کے ہیں مظہر آج کے یہ مشغلے
کل کی تیاری میں گویا آج ہیں یہ منہمک (جلال)

مرسلہ: محمد رضوان پرویز، بھاگلپور۔
نسیم احمد، نئی دہلی۔

میرا بچپن بہہ رہا ہے وقت کے سیلاب میں
میں بہت جلد اپنے پیروں پر کھڑا ہو جاؤں گا (ظفر گورکھپوری)

مرسلہ: حامد مرزا، حیدرآباد

رنگیں تھا بچپن وہ ہمارا
کتنا حسیں اور پیارا پیارا (انور کمال انور)

مرسلہ: اسلم انصاری، دیوبند

مہک اُٹھتے ہیں خوشبو سے گھر آنگن
جو پھولوں کی طرح ہنستے ہیں بچے (پرکاش تیواری)

مرسلہ: عذرا انجم انصاری، دیوبند

نثری عنوانات

"نئی اُمنگیں" (مسرور جہاں کا ناول) مرسلہ: سعید احمد قائد ۱۰۰۷، مدرسہ حسین بخش، بازار مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی ۱۱۰۰۰۶۔

"چٹکتے غنچے" (علامہ اقبال کی نظم)

مرسلہ: محمد خالد عمران معصوم، بھاگلپور

"عہدِ طفلی" (علامہ اقبال کی نظم)

مرسلہ: غازی اسلام، کٹیہار

"زندگی کا سفر" (عادل رشید کا ناول)

مرسلہ: ابن اسحٰق بنگلوری، تری کیرہ

"منزل ایک مسافر دو" (مہندر ناتھ کا ناول)

مرسلہ: معین الدین شمسی، گریڈیہہ

"دو بوندیں ساون" (مینا ناز کا ناول)

مرسلہ: محمد شمیم اشرف، مغربی چمپارن

"عہدِ طفلی اور ذہنی آزادی" (ساجدہ زیدی کا مضمون)

مرسلہ: انعام اللہ شارق، دربھنگہ

"بچپن" (انور کمال انور کی نظم)

مرسلہ: ہدیسہ بانو، دیوبند

آپ کی رائے

○ "ایوانِ اردو" کے اگست ۱۹۸۹ء کے شمارے میں "سرودِ رفتہ" عنوان کے تحت ظہیر دہلوی مرحوم کی غزل شائع ہوئی تھی جس میں ایک شعر یہ بھی شامل ہے :

یوں تو ہوتے ہیں محبّت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

درحقیقت یہ شعر مصحفی کا ہے غزل انسائیکلوپیڈیا میں ذکی کاکوروی نے بھی یہ شعر مصحفی کے نام سے منسوب کیا ہے۔

اگرچہ ظہیر دہلوی کی مذکورہ بالا غزل کو "ایوانِ اردو" میں شائع ہوئے کئی مہینے ہوچکے ہیں لیکن چوں کہ بات وضاحت طلب ہے اس لیے میں نے خط لکھنا مناسب سمجھا۔ براہِ کرم یہ خط "ایوانِ اردو" میں شائع کردیں تاکہ قارئین اس پر روشنی ڈال سکیں۔

—— احتشام اختر، کوٹہ

○ "ایوانِ اردو" اور "اُمنگ" کے ہر شمارے میں ایک دو تخلیق ایسی شائع ہوتی ہے (؟) جس کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ ایڈیٹر نے یا تو تخلیق کو سمجھا نہیں یا وہ فنکار کے نام سے مرعوب ہے۔ اب تو مئی کا شمارہ دیکھ کر آپ کی علمی صلاحیت مشتبہ ہوگئی۔ ویسے چند ایسے ادیب خواص کر (؟) پرانے ادیب جو مضامین لکھتے ہیں صرف اپنی یادداشت سے کام لیتے ادب کی رفتار کیا ہے آج کل کون کیا لکھتا ہے اس کی انھیں خبر نہیں ہوتی مگر اپنے پرانے رسوخ اور ادبی شہرت کی وجہ سے شائع ہو جاتے ہیں۔ اب سراج انور کا ہی مضمون لیجیے۔ بچّوں کے نثری ادب پر لکھا تھا تو لکھتے کہ بچّوں کا ادب کیسا ہونا چاہیے اور لکھتے وقت کن کن باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ ادیب کی فہرست (؟) دینی تھی تو بچّوں کے ادب پر لکھنے والوں کی فہرست اپنے قبل کے لکھنے والوں کے ساتھ آج کے لکھنے والوں کو بھی شامل کرنا چاہیے تھا۔ آج کل کیا لکھا جا رہا ہے اس کا بھی جائزہ لینا چاہیے تھا مگر سراج انور کا مضمون صرف اسی وجہ سے بے جان ہے اور قاری کو دلچسپی نہیں ملتی —— خاکہ کے زمرے میں آپ ڈاکٹر مجیب الاسلام کی تخلیق "ڈاکٹر عابدہ بیگم" شائع کیا ہے (؟) پتا نہیں مجیب الاسلام نے اسے خاکہ کس بنیاد پر لکھا ہے۔ اور آپ نے اس سے بڑھ کر یہ غلطی کی کہ اسے خاکہ کی صنف کی حیثیت (؟) سے شائع کیا۔ مجیب الاسلام کوئی بڑا نام نہیں تھا کہ آپ مرعوب ہوگئے۔ آپ نے تخلیق پڑھی ہوگی۔ عابدہ بیگم (مرحومہ) کی شخصیت سے تخلیق کار اور آپ متاثر تھے تو اسے مضامین کی فہرست میں لیتے۔ اور سری نیواس لاہوٹی کے مضمون کے بعد جگہ دیتے —— اسی طرح قمر جہاں کا افسانہ "صاحب" پتا نہیں کیا ہے؟ کیا آپ ایسے ہی افسانے "ایوانِ اردو" میں شائع کرنا پسند کرتے ہیں؟ تعجب ہے!

افسانے میں (؟) آمنہ ابوالحسن اور م۔ ق۔ خاں کا افسانہ بہت پسند آیا۔ خاں صاحب کا افسانہ موجودہ سیاست کی عکاسی کرتا ہے۔

بہر حال اس شمارے میں شعری حصّہ جاندار ہے جو آپ کی شعری صلاحیت اور ادبی ذوق کی مثال ہے۔ خاص کر ملک نسیم کی نظمیں۔

—— افضال احمد ندیم، پٹنہ

○ سراج انور صاحب کے مضمون "آج کا بچّوں کا نثری ادب" (مئی ۹۰ء) کے حوالے سے کچھ عرض کرنا چاہوں گا —— موصوف نے اِی سَپ (AESOP) کی کہانیوں کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ کہانیاں آج سے ۵۰۰ سال پہلے لکھی گئی تھیں حالانکہ یہ سب کہانیاں ڈھائی ہزار سال پہلے کی تصنیف ہیں کیوں کہ اِی سپ کا زمانہ ۵۶۴ - ۶۲۰ قبل مسیح ہے۔ اِی سپ ایک یونانی غلام تھا جسے یونان کے شہریوں نے طیش میں آکر چٹان سے نیچے گرا دیے جانے کی سزا دی تھی۔

یوروپ میں اِی سپ کے بعد بچّوں کے ادب میں اینڈرسن کا نمبر نہیں آتا بلکہ بچّے گریم بھائیوں کے شکر گزار ہیں یعنی جیکب کارل گریم اور ولہم کارل گریم۔ جنھوں نے پہلی مرتبہ روایتی اور زیادہ تر زبانی چلی آنے والی لوک کتھاؤں اور لوک گیتوں کو سلیقے سے مرتب کیا۔ گریم کی کہانیاں ۱۸۱۲ء سے

لے کر ۱۸۴۲ء تک جمع ہوئیں۔ بیوٹی اور بیسٹ، منیزل اور گرٹیل، ریپن زل، جیک اور بین اسٹاک وغیرہ کم وبیش ڈیڑھ سو سال سے دنیا کے بچے اپنی اپنی زبانوں میں شوق سے پڑھتے آئے ہیں۔ ان کے بعد کرسچین اینڈرسن (۱۸۰۵-۱۸۷۵) کی پریوں کی کہانیاں ۱۸۳۵ء میں شائع ہوئی تھیں۔

ماضی میں امیر خسرو سے لے کر حامداللہ افسر تک موصوف نے جن بچوں کے شاعروں کے نام گنوائے ہیں ان میں غالب اور میر بھی ہیں۔ ان دو حضرات کو بچوں کے شاعروں میں شمار کرنے کا کیا جواز ہے؟ شاید ایسے ہی کسی جواز پر عصمت چغتائی اور جیلانی بانو کو بچوں کی ادیبہ مانا گیا ہے؟ ایک بات اور دریافت کرنا چاہوں گا کہ آزادی سے پہلے بچوں کے ادیبوں اور شاعروں پر خسرو سے لے کر افسر تک "اچانک" کیسے معدوم ہوگئے؟ اچانک معدوم ہونے سے موصوف کی کیا مراد ہے؟ کیا یہ ادیب و شاعر تین کروڑ سال پہلے کے ڈائنوسار (DINOSAURS) تھے جو زمین سے اچانک معدوم ہوگئے! ہمارے سامنے تو یہ ہے کہ بچوں کے ادیب جو آزادی سے پہلے بچوں کے لیے لکھ رہے تھے وہ آزادی کے بعد بھی اگر جیے تو کبھی نہ کبھی لکھتے رہے۔ ہاں "ان گنت" رسالوں میں وہ نہیں لکھتے تھے کیوں کہ بدقسمتی سے اُردو میں ان گنت رسالے بچوں کے لیے نہ کبھی تھے نہ آئندہ ہونے کی اُمید ہے۔ پہلے چار چھ تھے تو اب مشکل سے تین چار شائع ہوتے ہیں۔

بچوں کے ادیبوں کی فہرست میں ایک نام کی غیر موجودگی مجھے کھٹکی۔ اور یہ نام ہے سید ابوطاہر مرحوم (۱۹۶۰ء) اس صدی کی تیسری اور چوتھی دہائیوں میں نہ صرف ایک اچھے مزاح نگار کی حیثیت سے مشہور ہوتے جن کے مضامین نیرنگ خیال (لاہور) عصمت (دہلی) بنات ساقی (دہلی) اور حریم (لکھنؤ) جیسے اس وقت کے معیاری رسائل کی زینت ہوتے تھے بلکہ سید ابوطاہر اُردو میں بچوں کے وہ پہلے ادیب بھی ہیں جنھوں نے ایک ماہر تعلیم ہونے کی وجہ سے بچوں کی نفسیات کا گہرا مطالعہ کرکے مختلف سائنسی موضوعات مثلاً ارتقا (EVOLUTION)، ترکیب تنویری (PHOTO SYNLHESIS)، ریڈیو، ہوا کا دباؤ وغیرہ وغیرہ کو نہایت دلچسپ اور دلکش کہانیوں کی صورت میں بچوں سے متعارف کروایا۔ بچوں کے لیے ان کے مضامین اور کہانیاں پھول (لاہور) بچوں کی دنیا (   ) اور پھر پیام تعلیم (دہلی) میں مستقل شائع ہوتے رہے۔ ان کی کتاب "دھوئیں کی پھانسی" کے کئی ایڈیشن نکلے۔ اسے پہلی مرتبہ مکتبہ جامعہ دہلی نے شائع کیا تھا۔ ہندی ترجمہ راج کمل پرکاشن (دہلی) نے شائع کیا ہے۔ یہ کتاب بچوں کے اُردو ادب میں ہمیشہ اپنا ایک مقام رکھے گی کیوں کہ انگریزی ناولوں کے چربے پر اسرار اور ہیبتناک واقعات کے بجائے یہ اس سمت رہ نمائی کرتی ہے جدھر بچوں کے لیے صحت مند، حقیقی اور تعمیری ادب پیدا کیا جاسکتا ہے۔ جس کی ہماری قوم کے بچوں کو آج اشد ضرورت ہے۔

موصوف کا کہنا کہ "پچھلی دو دہائیوں سے (یعنی ۱۹۷۰ء سے) بڑے ادیبوں نے بچوں کے ادب کی طرف خاص توجہ دی ہے۔ اسے زندگی کی ایک ضرورت سمجھا ہے۔ بچوں کا آج کا ادب کافی مالامال ہے" یقیناً باعثِ مسرت ہوتا اگر یہ بیان صحیح ہوتا۔ افسوس اور دکھ ہے کہ ان دہائیوں میں اُردو کے بڑے ادیبوں نے تو کیا کسی چھٹ بھیے نے بھی ڈھنگ سے ادھر توجہ نہیں کی۔ رواروی میں کچھ لکھنا اور بات ہے اور سوچ سمجھ کر، خلوص کے ساتھ بچوں کے ادب کو اپنانا اور بات۔

کل کے مقابلے میں آج کا بچوں کا اُردو ادب خواہ نثری ہو خواہ شعری کمتر معیار کا بھی ہے اور مقدار میں بھی کم ہے۔ آج نہ بچوں کے لیے حامداللہ افسر اور شفیع الدین نیر جیسے شاعر ہیں نہ ابوطاہر جیسے بچوں کے ادیب۔ اس کے اسباب پر بحث طویل ہوگی مگر مختصراً یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ اس کا بنیادی سبب ہندوستان میں اُردو کا زوال ہے۔

——— علی عباس ازل، بمبئی

○ اُردو اکادمی، دہلی اپنے معیاری جریدوں "ایوانِ اُردو" اور "اُمنگ" کے ذریعے اُردو کی جو خدمت انجام دے رہی ہے اس کے لیے آپ لوگ قابلِ مبارکباد ہیں۔ گزشتہ دو سال میں اِن رسائل نے گھسی پٹی روایات سے الگ ہٹ کر نظم ونثر کا جو سرمایہ اُردو ادب کو دیا ہے، قابلِ ستائش ہے۔ نظم کی مختلف اصناف اور نثری ادب میں تقریباً ہر موضوع پر تحقیقی تنقیدی اور تعمیری مواد

...رسائل سے ملتا رہا ہے۔ پھر آپ نے ...زبان و ادب کے بنیادی مسائل اور ...کے حل پر اپنے اداریوں میں اہلِ قلم کی ...مبذول کرائی ہے۔

...ماہ مئی ۹۰ء کے شمارے میں سراج ...صاحب کا مضمون "آج کا بچوں کا ...ادب" معیاری مضمون ہے۔ اس ...بل اس موضوع پر ڈاکٹر خوشحال زیدی ...مضامین نے قارئین "ایوانِ اُردو" کو بچوں ...ادب کے لیے دعوتِ فکر دی ہے۔ میں ...درخواست کرنا چاہوں گا کہ اسی طرح ...دوسرے تیسرے ماہ بچوں کے ادب ...مضامین شائع ہوتے رہیں۔ ہمارے ...کو جب تک اچھا ادب نہیں ملے گا ...تک اُردو کے مستقبل کے بارے میں ...مایوس رہیں گے۔ اور یہ تبھی ہو سکتا ...ب ہمارے اہلِ قلم بچوں کے ادب ...نے توجہ دیتے رہیں۔

—— خالد پرویز شمسی، آگرہ

...مئی ۹۰ء کا "ایوانِ اُردو" پیشِ نظر ...ڈاکٹر امبیڈکر کی خدمات کی اہمیت کا ...ہ کرنے میں حکومت نے جس سمت ...سے کام لیا اُس پر "حرفِ آغاز" کے ...ب کا تبصرہ بہت ہی مناسب اور ...ہے۔ آپ نے یہ بھی بالکل بجا فرمایا ... "اس آئین کے تئیں جس کی تشکیل ...ڈاکٹر امبیڈکر اور دوسرے رہنمایانِ قوم ...سوزی سے کام لیا۔ ہمارے دلوں میں ...ت اور احترام باقی نہیں رہا جس کا ...ق ہے۔"

اس افسوسناک صورتِ حال کی بنیادی

وجہ یہ ہے کہ مغربی ممالک کی پیروی کرتے ہوئے ہم نے اپنے ملک میں جمہوریت نافذ تو کر دی لیکن اس جانب قطعی دھیان نہیں دیا کہ جمہوری طرز کی حکومت یا انتظامیہ کی کامیابی کے لیے تعلیم کا عام ہونا شرطِ اوّل ہے۔ امریکہ اور برطانیہ جیسے ممالک میں جمہوریت کی کامیابی کا راز یہی ہے کہ وہاں کی تقریباً پوری آبادی تعلیم یافتہ ہے اور ان ممالک کے عوام (کم از کم سیاسی سطح پر ہی سہی) "بھلے" اور "بُرے" کی تمیز رکھتے ہیں۔ برخلاف اس کے ہمارے یہاں آزادی کے چالیس سال بعد بھی شرحِ تعلیم ۳۵ فی صد سے زیادہ نہیں ہو سکی ہے یعنی ہماری آبادی کا ۶۵ فی صد حصّہ آج بھی اپنے طور پر یہ فیصلہ کرنے سے قاصر ہے کہ کون سا فرد یا گروہ ملکی حکومت یا انتظامیہ کے لیے موزوں اور مناسب ہوگا —— بقول شخصے "جمہوریت مع تعلیم ایک نعمت ہے، لیکن یہی نعمت تعلیم کے بغیر ایک لعنت بن جاتی ہے۔"

آزادی کے بعد سے اب تک ہمارا تعلیمی ڈھانچہ جس بے توجہی کا شکار رہا ہے وہ ہم سب پر عیاں ہے۔ لہٰذا جمہوریت کی بقا اور اس کے استحکام کے لیے یہ ضروری ہی نہیں بلکہ ناگزیر بھی ہے کہ جس طرح بھی بن پڑے عوام کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا جائے۔

—— ارشد لکھنیاوی، نئی دہلی

◯ مئی کا شمارہ ابھی ابھی ختم کیا ہے اپنے تاثرات سے مطلع کر رہا ہوں۔

اس شمارے کی تینوں کہانیاں عمدہ ہیں او[ر] مختصر ہو[نے کے با]وجود ... اثر ...

ملک محمد جائسی سے متعلق نامی انصاری کا مضمون اور تفصیل سے لکھا گیا ہوتا تو اُردو کا طالبِ علم اس عظیم شخصیت کے فن سے واقف ہو سکتا تھا۔ خبرنامے کے تحت آپ نے بہت سی اہم خبروں سے اُردو دُنیا کو روشناس کرایا ہے خصوصاً ترقی پسند مصنّفین کی بین الاقوامی کانفرنس میں کملیشور صاحب کا بابری مسجد رام جنم بھومی مسئلے پر اظہارِ خیال، تلسی داس جی کے حوالے سے یہی بات میں نے یہاں ایک جلسے میں کہی تھی مگر لوگوں پر کوئی خاص اثر نہ پڑ سکا۔

—— مہدی پرتاپ گڑھی، پرتاپ گڑھ

◯ مئی ۹۰ء کے شمارے میں جناب جے رام داس فلک کا مضمون "رباعی کا بنیادی وزن" بہت معلوماتی ہے علم عروض اور رباعی کی فنّی جانکاری سے بھرپور اس مضمون کے لیے فلک صاحب کا شکریہ۔ غزلیں یوں تو سبھی معیاری ہیں مگر جناب کیف بھوپالی کی غزل اُستادانہ انداز لیے ہوئے ہے۔ غزل کے ساتوں اشعار میں جذبات کی روانی اور موتی جیسے جڑے ہوئے الفاظ کی ترتیب اپنی مثال آپ ہے۔

—— عبدالسلام کوثر، سہدیونگ، راجناند گاؤں

◯ "ایوانِ اُردو" مئی ۹۰ء میں محترمہ قمر جہاں کی کہانی "صاحب"، موضوع کے اعتبار سے بہت پسند آئی۔ ہمارا سماج اس قدر بدعنوان ہو گیا ہے کہ ہر ایماندار انسان سخت آزمائشوں میں گھرا ہوا ہے۔ یہی حالت آج کے گنے چنے ایماندار افسروں کی ہے جو ہر جگہ سے تبادلے کی کوشش ...

نوکری کی مدّت پوری ہو جائے اور وہ بے داغ رہ جائیں۔

—— قیصر اقبال، مونگیر

○ ماہ جون ۹۰ء کے "حرفِ آغاز" کے تحت آپ نے گجرال کمیٹی کے ایک بار پھر سرگرم ہونے پر اُردو والوں کو خبردار کیا ہے خدا کرے اُردو والے سرگرم ہو جائیں ورنہ ہمیشہ کی طرح کا ردِ عمل دکھلایا گیا تو شاید...

ارشاد احمد صاحب کی رائے پڑھ کر دلی خوشی ہوئی۔ میرا جی پر انگشت نمائی کرنے سے پہلے لوگوں کو ان کی تخلیقات کو پی کر دیکھنا چاہیے کہ ان کا ذائقہ کیسا ہے کیوں کہ ایک ادیب یا شاعر کو اس کے رہن سہن سے نہیں صرف اس کی تخلیق سے سمجھا جا سکتا ہے۔

—— شائق دھنبادی، دھنباد

○ ماہ جون کا شمارہ پیشِ نگاہ ہے۔ "غالب کی سرگذشت سیر و سیاحت" (اُردو خطوط کی تاریخی ترتیب) ایک اہم مقالہ ہے۔ واقعی یہ مضمون ایک انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ سارے خطوط اپنے وقت کے عکاس ہیں جو غالب کے اندازِ تحریر سے بھی ہمیں روشناس کراتے ہیں۔ "مولانا آزاد کی گرفتاریاں اور سزائیں" بھی قابلِ تحسین مضمون ہے۔

—— بسمل عارفی، سمستی پور

○ "ایوانِ اُردو" کے کبھی کبھی دیدار ہو جاتے ہیں۔ جون ۹۰ء کا تازہ شمارہ میرے سامنے ہے۔ مضامین میں "غالب کی سرگذشت سیر و سیاحت" اور "ہندوستانی سنگیت اور بھنڈی بازار گھرانہ" معلوماتی مضامین ہیں —— افسانوں میں "آہٹ" نے متاثر کیا۔

—— عزیز اندوری، اندور

○ "ایوانِ اُردو" کا لگاتار مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس دور کے تمام اُردو پرچوں میں "ایوانِ اُردو" کا مقام سب سے بلند ہے۔ کوئی بھی پرچہ اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اس کے تمام مضامین اور افسانے بہت ہی دلچسپ اور عمدہ ہوتے ہیں۔

—— اکرام حسین خاں، گوموہ

○○

اردو اکادمی، دہلی کا ماہانہ رسالہ

فون نمبر: ۳۲۷۶۲۱۱، ۳۲۶۳۴۴۸

ایوانِ اردو دہلی

ادارۂ تحریر:

سید شریف الحسن نقوی، مخمور سعیدی

جلد: ۴ — شمارہ: ۵ — فی کاپی ۵۰ر۲ روپے، سالانہ قیمت ۲۵ روپے — ستمبر ۱۹۹۰ء

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتا

ماہنامہ ایوانِ اردو دہلی

اُردو اکادمی، دہلی ــــ گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

خوشنویس: تنویر احمد

سید شریف الحسن نقوی (ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر) نے سیما آفسیٹ پریس، دہلی ۱۱۰۰۰۶ سے چھپوا کر اُردو اکادمی، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا

آغاز

بہار میں اُردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے اور عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ وہاں اُردو کی صورتِ حال دوسری ریاستوں کے مقابلے میں بہتر ہے۔ یہ خیال زیادہ غلط بھی نہیں۔ بہار میں اُردو کو سرکاری طور پر بھی سہولتیں دی گئی ہیں۔ اور وہاں کی اُردو آبادی بھی اپنی ذمے داریوں کو سمجھتی ہے۔ ان حالات میں یہ اطلاع بہت افسوسناک ہے کہ وہاں خود اُردو کے قلمکاروں کے ہاتھوں اُردو کے خدوخال بگاڑے جانے لگے ہیں۔ ذیل میں ہم بہار اُردو اکادمی کے رسالے "زبان و ادب" کے اداریے سے کچھ اقتباسات نقل کر رہے ہیں۔ اس میں غلط اُردو کی جن مثالوں کی نشاندہی کی گئی ہے وہ دہلی کے بعض اُردو اخباروں میں بھی نظر آجائیں گی۔ ضرورت ہے کہ اس طرح کی بدعتوں پر فوری روک لگائی جائے اور زبان کو خراب ہونے سے بچایا جائے۔

اب آپ اداریے کے اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:

"مشکلات، حوصلہ شکنی اور اُردو تعلیم کی معاشی بے فیضی کے سبب نہ صرف یہ کہ اُردو تعلیم رو بہ انحطاط ہے بلکہ اس کا معیار بھی بہت پست ہو چکا ہے۔ معیار کی پستی کا ثبوت عام اُردو داں اور اردو خواں لوگوں کی تحریر و تقریر میں اُردو کی 'بوباس' کے فقدان سے ہوتا ہے۔ یہ طبقہ اینگلو انڈین والی اُردو بولتا ہے اور تلفظ میں ہندی کی نقل کرتا ہے۔ بلکہ اُردو کو ہندی میں بولنے کی کوشش کرتا ہے۔ بہار میں صورتِ حال اور بھی اندوہناک ہے۔ "تحریری اُردو" میں زبان کو سب سے زیادہ مجروح اور رُسوا بہار کے اخبارات کر رہے ہیں۔ ایک مثال دینا بے محل نہ ہوگا۔ ایک شعر ہے:

کیا ملا تم کو مرے عشق کا چرچا کر کے
خود بھی رُسوا ہوئے آخر مجھے رُسوا کر کے

اب یہ شعر پٹنہ کی اخباری زبان کے مطابق یوں ہونا چاہیے:

کیا ملا تم کو مرے عشق کا چرچا کر
خود بھی رسوا ہوئے آخر مجھے رُسوا کر

یعنی 'کر' کے بعد 'کے' زائد بلکہ فضول ہے۔ اس لیے محذوف و متروک! اب پٹنہ کے اخبار میں یوں لکھا جانے لگا ہے ـــــ "صاحب اسکول کا معائنہ کر ہسپتال پہنچے اور وہاں عملے سے بات چیت کر مشکلات معلوم کیں ـــــ" چونکہ ہندی میں 'کر' کے بعد 'کے' کا استعمال ترک کر دیا گیا ہے اس لیے احساسِ کمتری کے مارے اکثر اخباری جہلا بھی اس کی تقلید کر رہے ہیں۔ کسی کسی 'مہا جدید' نثر نویس نے بھی اس کو اپنانے کی حماقت کی ہے۔ پٹنہ کے اُردو اخباروں میں ایک ترکیب 'کے ذریعے' والی بھی بڑے زوروں پر ہے۔ یہ انگریزی لفظ "BY" کے ترجمے سے ہوتے ہوتے اودھ پنجل زبان میں بھی دھڑلے سے چل پڑا ہے۔ "INAUGRATION BY C.M." کا ترجمہ کرتے ہیں "وزیر اعلیٰ کے ذریعے افتتاح" اور اسی طرح کے دوسرے جملے مثلاً فلاں بات پر فلاں صاحب کے ذریعے اعتراض ـــــ یہ وہ لوگ کر رہے ہیں جن میں سے بیشتر اُردو کے ایم۔ اے ہیں۔ زبان و بیان، گرامر اور املا وغیرہ کی غلطیاں اس پر سوا ہیں۔ یہ سب تعلیمی معیار کی پستی کے سبب ہے۔ اسی قبیلے کے اُردو اسکالرز اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھانے بھی جاتے ہیں۔ آئندہ اُردو زبان کا کیا حشر ہوگا اس کا تصوّر کر لیجیے۔ اُردو تعلیم کے فروغ میں انتظامی موانعات کے ساتھ ساتھ اس کے معیار کی پستی کے لیے اساتذہ اور ادھ کچری زبان دانی والے اصحابِ تحریر بھی ذمے دار ہیں۔"

ـــــ سیّد شریف الحسن نقوی

کیفی اعظمی
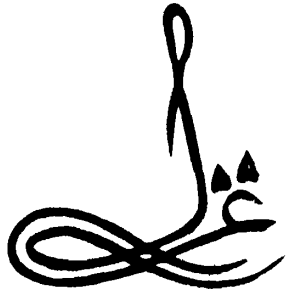
آج جو آتے ہیں اُن کو ایک دن جانا تو ہے
نربلوں نے اپنا بل آخر کو پہچانا تو ہے

چڑھتے سورج کے پجاری سُن کے ہنستے تھے یہ بات
شام کو آنا تو ہے، سورج کو ڈھل جانا تو ہے

اس میں اب ناخن گھسیں اپنے کہ اُنگلی ٹوٹ جائے
پائی ہے ورثے میں جو گتھی وہ سُلجھانا تو ہے

اپنا پیمانہ اُلٹ کے دیکھتا ہے بار بار
تشنگی سے میری واقف میرِ مے خانہ تو ہے

تیر اُسی ترکش کے سب پیوست اس سینے میں ہیں
گو قسم کھانے کو ہمسایے سے یارانہ تو ہے

پھول کھِل سکتے نہیں تو زخم ہی دل کے کھِلیں
جیسے بھی مہکے یہ دھرتی اس کو مہکانا تو ہے

بمبئی
۱۰ جولائی ۱۹۹۰ء

محبی مخمور سعیدی صاحب ایوانِ اردو کے لیے ایک تازہ غزل بھیج رہا ہوں
معیار پر پوری اترے تو کسی قریبی شمارے میں اسے جگہ دیجیے گا۔ شکریہ
[illegible]
خاکسار
کیفی

۲۵، جانکی کٹیر، جوہو، بمبئی ۴۰۰۰۴۹

سیّد عبدالباری

ہماری شاعری اور ہندوستانی تہوار

دُنیا کے ہر ملک ہر تہذیب اور ہر معاشرے میں دِل بہلانے، پرانی یادیں تازہ کرنے، مِل جُل کر کسی موقع پر خوشی منانے اور اپنی اقدار د روایات اور اپنے جلیل القدر افراد کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کی کوئی نہ کوئی سبیل ضرور پیدا کی گئی ہے۔ انسانی روح اس طرح کے مواقع کی تلاش میں رہتی ہے جب وہ کچھ دیر کے لیے اپنا بوجھ ہلکا کرسکے اور بے تکلف قہقہے لگا سکے اس طرح کے مشاغل اُسے زندگی کے جادۂ پُر خار پر سفر جاری رکھنے کے لیے تازہ دم بنا دیتے ہیں اور اس کی طبیعت کے غبار کو صاف کر دیتے ہیں۔ تہوار کا خمیر انسان کی اسی خواہش اسی ضرورت اور اسی جذبہ سے اٹھا ہے۔ یہ اس کے ذوق اجتماعیت، شوق انبساط اور عشق ماضی کا آئینہ دار ہے۔ انسان بھی عجب مخلوق ہے۔ زندگی کے مشاغل خواہ کتنے ہی مہتم بالشان کیوں نہ ہوں اُسے بہت جلد بدمزہ کر دیتے ہیں اور وہ کارزارِ دُنیا کے ریگزار میں کیف و سر مستی کے نخلستان کی جستجو کرنے لگتا ہے۔ وہ اپنے خلوت کدوں سے نکل کر ایک ایسے انبوہ عظیم میں جاکر کھو جانا چاہتا ہے جہاں ہر شخص کے لبوں پر مسکراہٹ ہو اور ہر شخص غمِ دنیا سے دامن جھاڑ کر محوِ کیف و مستی ہو، جہاں بادشاہ و فقیر سب ایک سطح پر کھڑے ہوں، جہاں مسرّتوں کے خزانے سب کو برابر تقسیم ہو رہے ہوں اور جہاں کسی کو نہ احساسِ برتری ہو اور نہ احساسِ کم تری۔

ہماری تہذیبیں اور قدیم معاشرے انسانی فطرت کے بڑے رمز شناس تھے۔ انھوں نے انسان کو ٹوٹنے بکھرنے اور زنگ آلود ہونے سے بچانے کے لیے طرح طرح کی تدبیریں کی ہیں تاکہ اس کی تھکی ہوئی روح اور واماندہ جسم کو چٹکی بجا کر تازہ دم کر دیا جائے تہوار بھی وفورِ حیات اور ولولۂ زندگی کو برقرار رکھنے کی ایک کامیاب سبیل ہے۔ چنانچہ مذاہب نے بھی اِسے تقدّس عطا کیا ہے اور جسم کی تازگی کے ساتھ روح کے تزکیہ کا بھی سامان مہیّا کر دیا ہے۔ ہندوستان میں تہواروں کی بیاض کے اوراق اُلٹیے تو محسوس ہوگا کہ یہاں جسم اور روح دونوں شانہ بشانہ محوِ خرام ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض معاشروں اور تہذیبوں میں امتدادِ زمانہ کے ساتھ تہواروں کا روحانی و اخلاقی پہلو نگاہوں سے اوجھل ہوگیا اور یہ فقط رنگ رلیاں منانے قہقہے لگانے اور لطف و لذّت مہیّا کرنے کا ایک وسیلہ بن گئے۔ تہوار نیک مقاصد اور اچھے جذبے سے شروع ہوئے تھے لیکن یاروں نے اپنی خرمستیوں کی خاطر ان کی اور خود اپنی بھی شکل بگاڑ لی۔ بات یہ ہے کہ انسان کے ظرف اور اس کے مذاق کا زندگی کے ہر موڑ پر امتحان ہوتا ہے۔ دسترخوان، کھیل کے میدان اور شادی تہوار کے مواقع پر انسان کی شخصیت بے نقاب ہو جاتی ہے۔

ہندوستان کے بارے میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ یہ ایک ایسے گلشن کی مانند ہے جہاں ہر رنگ اور ہر خوشبو کے پھول کھلتے اور مسکراتے ہیں۔ اسے اگر آپ سچ مچ دیکھنا چاہیں تو ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں اور عیسائیوں کے تہواروں پر نظر ڈالیے جو اس سرزمین کو اپنے اپنے حسن سے گلنار بنائے ہوئے ہیں۔ یہ تہوار اس طرح مِل جُل کر منائے جاتے ہیں گویا کسی طرح کی تفریق کی دیوار موجود نہ ہو۔ قومی وحدت کا جیتا جاگتا منظر ان تہواروں کے موقعوں پر دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہ ہر شخص کے دل میں گدگدی اور روح میں سرور پیدا کر دیتے ہیں۔ شاید یہی سبب ہے کہ اس سرزمین کی سوندھی سوندھی خوشبو سب کو بھاتی ہے اور وہ حالؔی کے الفاظ میں فخر سے یہ اعلان کرتے ہیں:

تیری اک مشتِ خاک کے بدلے
لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے

ہندوستان کے بڑے بڑے تہواروں میں ہولی، دیوالی، دسہرا، جنم اشٹمی، بسنت پنچمی، راکھی، عید، بقرعید، شب برات، عید میلاد النبی، محرّم، چہلم، بیساکھی اور

صدر شعبۂ اُردو، جی۔ ایس۔ پی۔ جی۔ کالج، سلطانپور ۲۲۸۰۰۱ (یو۔ پی)

ہمس ہیں۔ ہمارا ادب بالخصوص ہماری شاعری
ن تمام تہواروں کی بہترین مرقع نگار رہے
رب ہماری تہذیب اور تاریخ کو ہر دور میں
فوظ کرتا رہا ہے اور ہماری روایات کی
نش گری کو اس نے اپنے بنیادی فرائض میں
مار کیا ہے چنانچہ اُردو شاعری میں ابتدا ہی
ے ہمارے شعرا نے خواہ وہ دربار میں ہوں
بازار میں خواہ تصوّف کے کوچے میں ہوں خواہ
نیاداری میں منہمک ہوں، خواہ دانشور ہوں
واہ مزدور، سب نے تہواروں پر کسی نہ کسی
ہلو سے کچھ نہ کچھ ضرور لکھا ہے۔ اُردو کے
دیم ترین شاعر قلی قطب شاہ (متوفی ۱۶۱۱ء)
سنت پر اس طرح نغمہ سرا ہیں:

شاہ کے گھر میں سعادت کی خبر لایا بسنت
نین پتلی کے چمن میں پھول پھل لایا بسنت
موتی اور یاقوت کے گھر گھر میں انباراں لگے
ہر گدا کو مثل خاقاں کر کے دکھلایا بسنت

ردو زبان چوں کہ ہندوستان کے جمہور
ی زبان ہے اور عوام کے ہر طبقے کی ترجمان اور
ر تہذیبی گروہ کی ادا شناس ہے اس لیے
ندو پارسا، شیخ و برہمن، سب سے محبّت کرتی
ہے۔ انسان دوستی ابتدا ہی سے اس کا شعار
ہا ہے۔ چنانچہ ہندوستان کے تمام رہنے والوں
ی خوشی و غم اور نشاط و الم کو اس نے
جوں کا توں اپنے ادب میں پیش کیا ہے۔
طف یہ ہے کہ اُردو ادب کے کوچے میں
آنے کے بعد بڑے بڑے پارساؤں نے رندوں
ور بدمستوں کو گلے لگایا ہے۔ اور رندوں اور
بدمستوں نے پارساؤں کی قدمبوسی کی ہے۔
یر تقی میر کے بارے میں کہتے ہیں کہ زندگی بھر
اپنے عہد اور اپنی زندگی کی المیہ واردات و

حوادث کو شعر کا جامہ پہناتے رہے لیکن لکھنؤ
آنے تو یہاں کے رنگین مناظر دیکھ کر ان کے
آنسو بھی خشک ہو گئے اور ان پر کیف و نشاط
کی کیفیت اس طرح طاری ہوئی کہ کبھی کبھی
بدمستی کی منزل تک ان کو لے گئی۔ انھوں نے
ایک مثنوی "در بیان ہولی" لکھی جس کا پہلا
شعر ہے:

ہولی کھیلا آصف الدولہ وزیر
رنگ صحبت سے عجب ہیں خورد و پیر

تاریخ فرح بخش میں منشی فیض بخش کاکوروی
لکھتے ہیں کہ نواب آصف الدولہ ہر سال ایّامِ بہار
میں اپنی رعایا کے ایک بڑے طبقے کے اس جشن
میں حصّہ لیتے اور ہولی مناتے۔ بہت سا روپیہ
صرف کرتے۔ ان کی ماں (بہو بیگم) ہر سال
ہولی کے دنوں میں ان کے بلانے پر لکھنؤ جایا کرتیں
اور ایک ماہ وہاں رہا کرتیں۔ میر تقی میر مذکورہ
بالا مثنوی میں حقیقت نگاری کا حق ادا کرتے
ہیں اور مختلف لوگوں کے بہروپ بنانے اور رنگ
پھینکنے اور عبیر لگانے کا مزا لے کر ذکر
کرتے ہیں:

قمقمے جو گلال کے مارے
مہوشاں لالہ رخ ہوئے سارے
خوان بھر بھر عبیر لاتے ہیں
گل کی پتی ملا اڑاتے ہیں
جشنِ نوروزِ ہند ہولی ہے
راگ رنگ اور بولی ٹھولی ہے

دلّی اور دل کا یہ مرثیہ خواں لکھنؤ میں
آکر ہولی کے مناظر سے اس قدر مسرور ہوتا
ہے کہ بے ساختہ کہہ اُٹھتا ہے:

لکھنؤ دلّی سے بھی بہتر ہے
کہ کسو دل کی لاگ ایدھر ہے

اسی دور میں اکبرآباد میں میاں نظیر اکبرآبادی
اُردو شاعری کی داخلیت پسندی کے تار و پود
توڑ تاڑ خارجیت کا علم لہراتے تجربات و
مشاہدات کے ایک کشادہ میدان میں جلوہ افروز
نظر آتے ہیں اور ہر چھوٹی بڑی بات ان کی شاعری
کا موضوع بن جاتی ہے۔ تھے تو صوفی مزاج
لیکن دل بچّوں جیسا پایا تھا۔ جہاں بھی چہل پہل
بھیڑ بھاڑ اور شور و ہنگامہ ہو میاں نظیر کا
دل بلّیوں اچھلنے لگتا اور افتاں و خیزاں
وہاں جا پہنچتے۔ بلدیو جی کا میلہ ہو، جنم اشٹمی کا
جشن ہو، راکھی کی سجاوٹ ہو دیوالی میں
مٹھائیوں کی دکان اور چراغوں کی قطاریں
ہوں۔ ہر موقعے پر نظیر محو نظارہ نظر آتے۔
خاص طور پر ہولی میں میاں نظیر کو کافی
فرحت حاصل ہوتی اس پر کئی نظمیں لکھی ہیں
اور ایسا لگتا ہے جیسے خود بھی لنگوٹ میں
پھاگ کھیل رہے ہوں:

جب پھاگن رنگ جھمکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
اور دف کے شور کھڑکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
پریوں کے رنگ دمکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
خم شیشے جام چھلکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
محبوب نشے میں چھکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

نظیر اگرچہ گرد و پیش کے مناظر میں اس طرح
کھو جاتے ہیں کہ ان کا تہذیبی نقطۂ نظر سمجھ میں
نہیں آتا لیکن ماحول کی ایک ایک باریکی اس
طرح نمایاں کرتے ہیں کہ ان کی قوت مشاہدہ کی
داد دینی پڑتی ہے۔ ہولی میں محبوبوں کے مصحف
رخ کا مطالعہ اس طرح کرتے ہیں:

مُنہ سرخی سے گلنار ہوئے تن کیسر کی سی پیالی ہے

نظیر نے بسنت، دیوالی اور عید پر بھی نظمیں لکھیں۔ دیوالی میں سیر چراغاں کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ جلتے ہوئے دیے آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں:

مایل سیر چراغاں خلق ہر جا دمبدم
حاصل نظارہ حسن شمع رویاں پے بہ پے

ہر اک مکاں میں جلا پھر دیا دوالی کا
ہر اک طرف کو اُجالا ہوا دوالی کا
سبھی کے دل کو سماں بھا گیا دوالی کا
کسی کے دل کو مزا خوش لگا دوالی کا
عجب بہار کا دِن ہے بنا دوالی کا

اور پھر میاں نظیر مٹھائیوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ شیرینی فروشوں کے تیور ملاحظہ ہوں:

مٹھائیوں کی دکانیں لگا کے حلوائی
پکارتے ہیں کہ لالہ دوالی ہے آئی

لیکن سماجی بہبود کا خیال بھی ان کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور وہ دوالی کے موقعے پر جوا کھیلنے کی خراب رسم کا ذکر کرتے ہیں اور اس کے نقصانات عیاں کرتے ہیں:

کسی کے گھر کی حویلی گرو رکھا ہاری
جو کچھ تھی جنس میسر بنا بنا ہاری
کسی نے چیز کسی کی چرا چھپا ہاری
کسی نے گٹھری پڑوسی کی اپنی لا ہاری
یہ ہار جیت کا چرچا پڑا دوالی میں

پھر بھی وہ پاکیزگی، لطافت اور رونق کے اعتبار سے دسہرے پر دوالی کو ترجیح دیتے ہیں:

ہے دسہرے میں بھی یوں تو زینت و فرحت نظیر
پر دوالی بھی عجب پاکیزہ تر تہوار ہے

نظیر کو جب عید کا چاند نظر آتا ہے تو وہ اپنے ماضی کے جھروکوں میں جھانکنے لگتے ہیں اور پرانی یادیں ان کے دل پر شب خون مارتی ہیں:

دل کے ہو جاتے ہیں ٹکڑے جس گھڑی آتا ہے یاد
عید گہ تک دلبروں کے ساتھ جانا عید کا

رکشا بندھن تہوار کے موقعے پر رنگ برنگی راکھیاں دیکھ کر وہ اُچھل پڑتے ہیں اور خود بھی کسی دلبر کو راکھی باندھنے کے لیے یوں بھیس بدلنے پر تیار ہو جاتے ہیں:

پہن زنار اور قشقہ لگا ماتھے اوپر بارے
نظیر آیا ہے باہمن بن کے راکھی باندھنے پیارے
بندھا لو اس سے تم ہنس کر اب اس تہوار کی راکھی

نظیر جنم اشٹمی کو بھی نظر انداز نہیں کرتے جب کہ کرشن جی کی پیدائش کا جشن بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ نظیر کرشن جی کی پیدائش سے متعلق واقعات بڑی خوبی سے نظم کرتے ہیں:

سب ناری آئیں گوکل کی اور پاس پڑوس بیٹھیں
کچھ ڈھول مجیرے لائی تھیں کچھ گیت جچا کے گاتی تھیں
کچھ ہر دم مکھ اس بالک کا بلہاری ہو کر دیکھ رہیں
کچھ تھالی پنجیری کی رکھتیں کچھ سونٹھ سٹھورا کرتی تھیں
کچھ کہتی تھیں ہم بیٹھے ہیں نیگ آج کے دن کا لینے کو
کچھ کہتی تھیں ہم آتے ہیں آنند بدھاوا دینے کو

اُردو شاعری کا افق جب سر سید احمد خاں اور علی گڑھ تحریک کے اثرات اور انگریزی زبان و ادب کے مطالعے سے وسیع ہوا تو نظم نگاری کی طرف خاص توجہ ہوئی۔ ہمارے شعرا اب فطرت سے کسب فیض کرنے لگے۔ معاشرتی مسائل اور عوام کی دلچسپیوں اور سرگرمیوں کی طرف لوگ متوجہ ہوئے مگر زیادہ فکر ہمارے شاعروں کو اصلاح و انقلاب کی لاحق رہی۔ میلوں اور تہواروں پر اگر نظمیں لکھی گئیں تو بچّوں کے لیے ورنہ اس موضوع کو اس دور کے اہلِ قلم نے زیادہ توجہ کا مستحق نہ سمجھا۔ ترقی پسندوں نے بھی اس موضوع کو کم ہی ہاتھ لگایا لیکن اس دور میں بھی ہمارے متعدّد نظم نگار ایسے تھے جنھوں نے فطرت کو مرکز توجہ بنایا اور معاشرتی زندگی کے ہر پہلو کی عکّاسی کی۔ سیماب اکبر آبادی، تلوک چند محروم سرور جہان آبادی، جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری، اختر شیرانی وغیرہ نے خوب خوب نظمیں لکھیں۔ چکبست پر وطن کی محبّت غالب تھی۔ ان کا پیارا وطن جو تہواروں کی سرزمین ہے، اس کے جاہ و جلال کا ذکر ایک جگہ اس طرح کرتے ہیں:

شمع ادب نہ تھی جب یوناں کی انجمن میں
تاباں تھا مہر دانش اس وادیِ کہن میں

اقبال اُردو شاعری کے مردِ خود آگاہ، اپنی تخلیقی زندگی کے ابتدائی دور میں فطرت سے بہت قریب تھے اور ہندوستان کی عظمت پر متعدّد نظمیں لکھیں۔ جن بزرگوں کی یاد میں تہوار منایا جاتا ہے ان کے عظیم الشان کارناموں کو نمایاں کیا۔ ہلالِ عید کو دیکھ کر اقبال کے دل میں اہلِ مشرق کی مظلومیت کا احساس تازہ ہو جاتا ہے اور وہ ایک درخشاں ماضی کی یاد میں ڈوب جاتے ہیں:

سرگزشتِ ملّتِ بیضا کا تو آئینہ ہے
اے مہِ نو ہم کو تجھ سے الفتِ دیرینہ ہے

وہ اپنی ملّت کو اس تہوار کے موقعے پر تنبیہہ کرتے ہیں اور اس کے عبرتناک زوال پر افسردہ خاطر ہیں:

دیکھ مسجد میں شکستِ رشتۂ تسبیحِ شیخ
بتکدہ میں برہمن کی پختہ زناری بھی دیکھ

اپنی ایک اور "نظم" عید پر شعر لکھنے کی فرمائش کے جواب میں اقبال کو پھر عظمتِ رفتہ کی یاد آجاتی ہے:

خزاں میں مجھ کو رلاتی ہے یادِ فصلِ بہار
خوشی ہو عید کی کیونکر کہ سوگوار ہوں میں
پیامِ عیش و مسرّت ہمیں سناتا ہے
ہلالِ عید ہماری ہنسی اُڑاتا ہے

آخر میں یہ گفتگو اقبال کی بعد کی نسل کے ایک شاعر اختر الایمان کی نظم "برندا بن کی گوپی" کے ایک بند پر ختم کرتا ہوں جو انھیں عہدِ طفلی کا ایک خواب محسوس ہوتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ تہواروں سے ہماری والہانہ وابستگی کا دور عہدِ طفلی ہی ہوتا ہے جب کہ رنگ و نور، شور و ہنگامہ اور بھیڑ بھاڑ کے مناظر ہمارے احساسات کی دنیا میں ہلچل پیدا کر دیتے ہیں۔ اخترالایمان کا خطاب کرشن کی ایک گوپی سے ہے مگر میرا خیال ہے کہ یہ ان تمام عمر رسیدہ انسانوں کے دل کی آواز ہے جن کا بچپن تہواروں سے والہانہ شیفتگی میں گزرا ہے:

تم مری طفلی کا دیکھا ہوا اک خواب سا ہو
اِک اُجالا ہو جو نظروں کو بھلا لگتا ہے
اِک گھنی چھاؤں ہو بیٹھا ہوں جہاں پہروں میں
میں تمھیں جانتا ہوں نام نہیں یاد آتا

●●

مظہر امام

گیت

ایک سُندر سی، نازک سی تتلی ہو تم
تم کو ہر رنگ کے پھول سے پیار ہے
آج اِک رُوپ کا شہد پی کر اُٹھیں
کل کسی اور سے مُسکرا کر مِلیں
زندگی کا مناؤں کا اُبھار ہے
تم کو ہر رنگ کے پھول سے پیار ہے
ایک سُندر سی، نازک سی تتلی ہو تم
اتنی سی بات پر کیوں خفا ہوگئیں؟
کیا ہوا گر کسی میں نہ رس پاسکیں
شہر کے باغ میں اور بھی پھول ہیں
ایک سے ایک سُکمار، چنچل، حسیں
اتنی سی بات پر کیوں خفا ہوگئیں؟
ایک سُندر سی، نازک سی تتلی ہو تم
مُسکراتی رہو، خواب بُنتی رہو
رقص کرتی رہو، گیت سُنتی رہو
واسطہ کیا تمھیں دُکھ کی برسات سے
جب بسنت آئے، تم پھول چُنتی رہو
مُسکراتی رہو، خواب بُنتی رہو
ایک سُندر سی، نازک سی تتلی ہو تم
تم کو ہر رنگ کے پھول سے پیار ہے!

امیر منزل، قلعہ گھاٹ، دربھنگہ (بہار)

نِدا فاضلی

یہ کھیل ہوگا نہیں دوبارا

یہ زندگی!
آج جو تمھارے بدن کی چھوٹی بڑی نسوں میں
مچل رہی ہے
تمھارے پیروں سے چل رہی ہے
تمھاری آواز میں گلے سے نکل رہی ہے
تمھارے لفظوں میں ڈھل رہی ہے
یہ زندگی
جانے کتنی صدیوں سے یوں ہی شکلیں بدل رہی ہے
بدلتے چہروں
بدلتے جسموں میں
چلتا پھرتا یہ اِک شرارہ
جو اِس گھڑی نام ہے تمھارا
اسی سے ساری چہل پہل ہے
اسی سے روشن ہے ہر نظارہ
ستارے توڑو
کہ گھر بساؤ
علم اٹھاؤ
کہ سر جھکاؤ
تمھاری آنکھوں کی روشنی تک ہے
کھیل سارا
یہ کھیل ہوگا نہیں دوبارا

۱۰۳، امر اپارٹمنٹس، دان پاڑہ، کھار (ویسٹ)، بمبئی ۵۲

نور سین

میں، کتاب اور وہ

میں پڑھتا رہا، کتاب روتی رہی۔
وہ بولتا رہا، میں ہنستا چلا گیا۔

بات کتاب میں تھی۔ وہ اُس کے ہونٹوں
ی یا پھر وہ میری آنکھوں میں آ بسی تھی۔
بات معمولی نہ تھی۔ وہ وقت پر محیط
ی۔ باقی باتیں اُسی بات کی طرف لے جاتی
یں۔ ابتدا اور اختتام کے بیچ کی کڑی!
نہ مجھے چین تھا نہ کتاب کو۔ وہ ہم
نوں سے زیادہ بے قرار تھا۔ شاید یہی
ہ تھی کہ وہ بولتا جا رہا تھا اور میں ہنس رہا
ا۔ میری ہنسی کا راز اُس کی سمجھ میں نہیں
ہا تھا حالاں کہ اُسے کتاب پر یقین تھا اور
پر اعتماد۔

اِدھر فطرت بے حال ہو رہی تھی۔
میں کتاب کو روتے ہوئے دیکھ کر بھی
ی کے صفحے پلٹتا جا رہا تھا۔ صفحوں پر پھیلی
یر کو بار بار پڑھتے ہوئے اُس کی طرف
ذ رہا تھا جو کتاب ہی کے حوالے سے نئی
سمجھانے کے لیے بول رہا تھا اور جسے
ا دیکھ کر میں ہنس رہا تھا۔

سب کچھ حرکت میں تھا لیکن میں ساکت
ا تھا۔ نہ کتاب مجھ تک پہنچ رہی تھی نہ
یب حالت تھی۔ اتنا کچھ ہو چکا تھا۔

اتنا کچھ بیت چکا تھا۔ کائنات اندھیرے کی چادر
سے بے زار ہو چکی تھی۔ پُل اپنے نیچے بہتے چلے
جانے والے کالے پانی کو دیکھتے دیکھتے اُوب
گیا تھا۔ سب کچھ کروٹ بدلنے پر آمادہ ہو رہا
تھا۔ لیکن انتظار تھا کہ بس اپنا حوالہ دیے
جا رہا تھا۔

پھر بھی منظر پر منظر چڑھا ہوا تھا۔
کینوس کا کوئی حصہ خالی نہ بچا تھا۔ رنگوں
کا ہجوم! ریکھاؤں کی گنجلک!! آہنگ کی
اُلجھن!!!

اِس انتشار میں کتاب کا روتے چلا
جانا اور اُس کا بولنے سے باز نہ آنا اور میرا
اپنی ہنسی پر قابو نہ پا سکنا اور مقام کا وقت
کے چہرے پر نظریں جما دینا۔
مقام کے احساس میں ایسی گڑبڑ معمولی
بات نہ تھی۔ اُدھر وقت وہم، وسوسے اور
شک کا شکار ہوا جاتا تھا۔
میں نے کہا تو ہے کہ بات غیر معمولی
تھی اور اُس کا زندگی کا معمول بن جانا
ہی بات تھی۔ وہ ان گنت تہذیبوں کا سفر
کرتی ہوئی اپنی منزل کی طرف رواں تھی کہ...
میں پھر بھی پُر اُمید تھا حالاں کہ میری
آنکھوں میں صدیوں کی اذیت بسی تھی۔ اُن
میں ظلم اور تشدد کا انبار لگا ہوا تھا اور
تھا دھواں اُن آہوں کا جو غبار بن کر زمین
سے آسمان تک چھائی ہوئی تھیں۔

منظر ایسا ہی چلا آ رہا تھا۔ کتاب، میں
اور وہ اور تصویر کے رنگ اور آہنگ کا انداز
اور ریکھاؤں کے جال سے جھانکتی جھانکی۔
اپنی پیٹھ پر اپنا اور پرایا بوجھ ڈھوتا
انسان۔ جھکی کمر پر کوڑوں کی برسات ہانپتا کانپتا
خون پسینے میں نہایا اپنی بے جان ٹانگوں پر
اپنے کو گھسیٹنے پر مجبور۔ جہازی کشتیوں کے
پیندوں میں بیٹھا آہنی زنجیروں میں جکڑا
چپّو چلاتا، اپنی جان لڑاتا بھوک اور پیاس
کا مارا آخری دم تک زور لگاتا انسان۔ جیسے
ہی کشتی کو دھکیلنے کی طاقت ختم ویسے ہی سمندر
کے کھاری پانی میں پھینک دیا جانے والا غلام۔
موت ہی موت۔ آخر لمحے آنکھوں میں رِقت
بن کر اُمڈتی موت۔

میں نے ایک بار پھر کتاب کے صفحوں کی
پھڑپھڑاہٹ کے ساتھ اُس داڑھی والے کی
بات سُنی جس کے ساتھ ایک اور داڑھی آ لگی
تھی اور میری آنکھیں کینوس پر اُبھرے اُس
منظر پر جا ٹکیں جس میں پتھریلی پہاڑیاں تھیں۔
سبزے کا کوئی نشان نہیں تھا۔ ننگی چٹانوں
پر برستی بے رحم دھوپ تھی۔ اُن پہاڑیوں پر
ننگ دھڑنگ کالے جسموں والے کانیں
کھود رہے تھے۔ اُن کے ہاتھ اور بازو بیلچا
اُٹھاتے اُٹھاتے اور ہتھوڑا چلاتے چلاتے شل
ہو چکے تھے۔ پیاس تھی کہ انتہا کو پار کر چکی
تھی۔ پانی کا قطرہ تک میسّر نہیں تھا۔ اُن
کے مثانوں میں بھرا پیشاب بھی پسینہ بن کر
اُڑ چکا تھا اور خون کے چند قطرے تھے جو

ای — ۴۷، ویسٹ پٹیل نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۸

پیشاب کی نالی کو سیراب کرتے ہوئے ٹپک
رہے تھے ۔ جسم ہونک رہے تھے ۔ زبانیں
خشک فضا میں سے نمی چوسنے کے لیے باہر نکلی
پڑتی تھیں ۔ وہ رحم کی بھیک مانگ رہے تھے
لیکن اُن کے مالک اُن کو بھول کر کان کی گہرائی
اور اُس کا پاٹ دیکھنے میں مگن تھے ۔ وہ اُس
کان میں سے نکلنے والے تانبے کی مقدار آنک
رہے تھے اور تانبے کو سونے چاندی کے سکّوں
میں بدلتے ہوئے دیکھ رہے تھے ۔ شام ہوتے
ہی وہ ناکارہ ہوئے غلاموں کو تڑپ تڑپ کر
مرنے کے لیے چھوڑ کر گھوڑوں پر بیٹھ اپنے اڈّے
کو روانہ ہو گئے تھے ۔ اگلی صبح نئے غلام !

وہ اب اور بھی زور سے بول رہا تھا
اور میں اور بھی تیزی سے کتاب کے صفحے پلٹتا
ہوا ہنستے جا رہا تھا ۔ میرے سامنے کینوس تھا
اور کینوس پر وہ شہزادہ تھا جو اپنے
مصاحبوں کے ساتھ بیٹھا اُس آدمی کو چیختے،
چلّاتے، تڑپتے دیکھ کر قہقہے لگا رہا تھا جس
کے جسم سے اُس کی کھال کھینچی جا رہی تھی ۔
اُس کے بعد میں اُس حکمران کو دیکھ رہا تھا
جو جوان لڑکیوں کے پستان کاٹ کر اُن کا
ہار پروتا اور اُسے اُن کے ہی گلے میں ڈال کر
تالیاں بجاتا اور اُن ننھی نہان لڑکیوں کو الف
ننگی کرکے ہاتھی پر چڑھا کر پہاڑ کی چوٹی پر
لے جاتا اور وہاں سے انھیں ہاتھی سمیت
گہرے کھڈ میں پھینکوا کر خوشی سے پاگل
ہو جاتا تھا ۔

اب کینوس اپنے کو تیزی سے کھولتا
جا رہا تھا ۔ جنگ کیمپوں میں قطار در قطار ٹے
ہارے ہوئے فوجی اور اُن کے جسموں پر نوکیلی
کیلوں اور کھردری نعلوں سے مُڑے تلووں
والے جوتے پہنے ناچتے گاتے شور مچاتے
ہوئے اُن کے فاتح ۔ تماشہ ختم ہوتے ہی
ادھ مرے فوجیوں کے جسموں سے خون کا آخری
قطرہ نچوڑنے کے بعد اُن کے خالی دِلوں سے
آتی دھڑکن کی کھڑکھڑاتی مُردہ آواز کو کان
لگا کر سُنتے ہوئے فاتح اپنے پر اتراتے ہنستے
گاتے . . .

میں خالی دِلوں کی ہولناک کھڑکھڑاہٹ
سے دہشت زدہ ہو کر کتاب کو دیکھے جا رہا
تھا اور اُسے سُنتا ہوا کینوس کو اور بھی
پھیلتے اور نزدیک سرکتے ہوئے محسوس
کرتا ہوا اپنے خشک ہوتے ہوتے ہونٹوں پر
پھیلتی ہنسی کو تر کرنے کے لیے زبان پھیر
رہا تھا ۔ اب میرے سامنے وہ گینڈے کے
جسم والا سیاہ فام جنرل کھڑا تھا جس نے
حسین عورتوں اور خوبصورت لڑکوں کے
سر قلم کرا کے بڑے بڑے فریجوں میں محفوظ
کر لیے تھے ۔ وہ بار بار اُن میں سے چند ایک
کو نکال کر اپنے سامنے میز پر سجا لیتا اور
اُس کے مُنہ سے رال ٹپک ٹپک کر اُس کی
قیمتی پوشاک کو گندہ کرتی رہتی ۔ اُس
گینڈے کے ساتھ ہی وہ بھیڑیا کھڑا تھا ۔
جس کے ہاتھ مشین گن پر تھے اور جو اسکول
کے گراؤنڈ میں کھیل رہے اپنے میں مست
بچّوں کو بھون رہا تھا ۔ انھیں گرتے ہوئے لوٹ
پوٹ ہوتے ہوئے دیکھ کر مسکراتے جا رہا تھا ۔
خون تھا ۔ آگ تھی ۔ بارود کی بُو تھی ۔
چیخ تھی ۔ ہُوک تھی ۔ ایک پُکار تھی اور اُن
سب پر دہشت کی چادر کی طرح مسلّط
تھا ایک قہقہہ ۔
وہ اِس ماحول میں بھی بولتا جا رہا تھا
میں اِس ماحول میں بھی کتاب کھولے بیٹھا
تھا ۔ بے شک کتاب رو رہی تھی اور میں
ہنس رہا تھا اور دیکھ رہا تھا ۔

وقت کافی گزر چکا تھا اور دو داڑ
کے ساتھ لگی تھی گنجی کھوپڑی جس کا د
پُر اعتمادِ اضطرار کا مظہر تھا ۔ وہ کھوپڑ
اِس بات کی شہادت دیتی تھی کہ مریل جسم
سوکھی ٹانگوں، بجھتی آنکھوں، مُرجھائی کھا
اور خالی انتڑیوں کے لیے ذمّہ دار نظام
ختم کے قریب آ پہنچا ہے ۔ دونوں داڑھیا
اِس اعتماد کو پہلے ہی اعتقاد کا درجہ د
چکی تھیں ۔ تینوں کو اُس کا علم ہو چکا
جو انسانی رشتوں کی بنیاد تھا جو ہمیـ
ایسی حالت پیدا کر دیتا تھا جس میں عو
سے اُن کی عصمت اور بچّوں سے اُن کی
اور عام انسان سے اُس کا سب کچھ چھن جا
وہی جو انسان کو انسان کے خلاف کھڑا ک
تھا ۔ اِسی لیے اُن دو داڑھیوں کا وا
دے کر اُس گنجی کھوپڑی نے اُس نا
اور قدرے بھاری جسم والے آدمی کو
گھنی مونچھوں کے نیچے چُھپے میل خوردہ
دانت نکال کر لوگوں کو وہ سب کچھ سے
مجبور کرنے کی اجازت دے دی تھی جس
کرتے ہوئے قلم بھی کانپ اُٹھے ۔

کتاب سِسکنے لگی لیکن میں نے اُ
صفحوں پر بکھرے لفظوں کو پڑھنا بنا
کیا اور نہ ہی اُس ننھی جسم والے کا

ہوئے ہنسنے سے گریز کیا۔ بے شک میری ہنسی بے تکی ضرور ہو چلی تھی کیوں کر اب وہ بھی بے پہنچی کی آخری حدوں میں داخل ہو رہا تھا۔

کیا تم نہیں جانتے منزل پر پہنچنے کے لیے یہ سب سہنا ہی پڑتا ہے۔ برفانی چوٹیوں اور آتش فشاں پہاڑوں کا سفر، جنگلوں اور بیابانوں کی مسافتیں، بے شمار دُکھ اور لاانتہا آفتیں۔ یہ سب تو منزل کی مانگ ہوتی ہے۔ راستہ کبھی ہموار اور آسان نہیں ہوتا۔ انسان کو زندہ رکھنے کے لیے انسان کی قربانی دینا ضروری ہے۔ لاشوں کے انبار ہیں تو انھیں سمیٹ لینے والی خندقیں بھی تو ہیں۔ انسانی خون کا دریا ہے تو اسے پی جانے والا صحرا بھی تو ہے۔ چیخوں کا طوفان ہے تو اُسے اپنے میں سمو لینے والا خلا بھی تو ہے۔ حاصل کرنے کے لیے دینا بھی پڑتا ہے۔ ترازو کے پلڑے یہی مانگتے ہیں ورنہ ڈانوا ڈول...

اُس کی بات سُنتے سُنتے میں پھر کتاب میں کھو گیا۔ کتاب بھی زنجیروں کے ٹوٹنے کی بات کرتی ہے۔ آزاد فضا کا وعدہ کرتی ہے۔ خوش آئند مستقبل کا عکس دکھاتی ہے۔ ایسی صورتِ حال کا یقین دلاتی ہے جس میں یہ سب نہیں ہوگا جو آج تک ہوتا آرہا ہے۔

میں پاگل کی طرح ہنس پڑا/ تو وہ تڑپ اُٹھا۔

تم اپنی ہنسی میں چھپی بے خبری اور جہالت سے واقف دکھائی نہیں دیتے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ وقت کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا اور مقام اپنا اتہ پتہ بدلتا رہتا ہے۔ اسی لیے آج اتہاس سر کے بل کھڑا ہے اور اسی وجہ سے یہ کتاب تمام صحیفوں کو جھٹلاتی ہے۔

میں نے ہنسنا بند نہیں کیا تو وہ ایک پسلی کا آدمی اور بھی ٹیڑھا ہو گیا۔

میں مانتا ہوں کہ تم بیتے ہوئے کل کو آج بھی آنکھوں میں بسائے ہوئے ہو لیکن میں تو اب کُھلے پن کی بات کر رہا ہوں۔ اپنے کو پھر سے ترتیب دینے کا کہہ رہا ہوں۔

میں نے اور بھی زور کا قہقہہ لگایا اور کتاب کے صفحے اور بھی تیزی سے پھڑپھڑائے تو وہ ہکلایا اور مجھے لگا اُس کے اندر انسانی خون، انسانی دُکھ درد اور انسانی چیخوں کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا ہے اور وہ اپنے اندر دُور دُور سفر کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔

وہ پھر ہکلایا۔

میں نے یہ تو نہیں کہا کہ انسانی رشتوں کی بنیاد بدل گئی ہے اور جسے ہم افیم کہتے ہیں وہ اِس دُنیا میں کسی صورت میں باقی نہیں۔ میں تو بس خاکے میں نئے رنگ...

اُس کی زبان کی لڑکھڑاہٹ اور بھی بڑھ گئی اور وہ بڑبڑا اُٹھا:

میں یہ کیسے کہہ دوں کہ انسانی فطرت کی سرکوبی ہو گئی ہے۔ یہ ابھی کہاں۔ ابھی تو...

وہ چیخنے لگا اور اُس کے ساتھ ہی کائنات بھی اپنا سینہ پیٹنے لگی۔ کتاب اور بھی زور سے سسکنے لگی اِدھر میری ہنسی پاگل پن کی آخری حدوں کو چھونے لگی تو اُس کی بالوں سے عاری گنجی کھوپڑی پر بنا بھورا جزیرہ معدوم ہونے لگا اور اُس کے ساتھ سفر میں رہنے والی سپین سُندری اُس سے دُور جانے لگی۔

●●

سلیم شہزاد

جدید افسانے کا اعترافی رجحان

اعترافی رجحان افسانے کو آپ بیتی سے قریب کر دیتا ہے۔ آپ بیتی حاضر راوی کا افسانہ ہے جو ضروری نہیں کہ کسی واقعے کے صرف اپنی ذات پر گزرنے کا بیان کرے۔ وہ کسی ایسے واقعے کا رپورٹر ہو سکتا ہے جو اس نے واقع ہوتے دیکھا اور اس واقعے میں اہم شخصیت یا اس افسانے میں اہم کردار کسی اور کا رہا ہو۔ حاضر راوی نے واقعے کا مشاہدہ کیا اور بیان کر دیا کہ فلاں مقام پر، فلاں وقت، فلاں شخص پر یہ واقعہ، یہ حادثہ بیتا اور میں بھی حاضر تھا وہاں ضبطِ سخن کر نہ سکا لیکن اعترافی خصوصیت کا حامل افسانہ حاضر راوی کا اپنا افسانہ ہوتا ہے یعنی اعترافی افسانے کا واقعہ راوی کی اپنی ذات پر گزرتا ہے۔ وہ خود اپنے بیان کا اہم کردار اور واقعے کے تمام نشیب و فراز سے بخوبی واقف ہوتا ہے۔ جب وہ اپنی ذات پر بیتنے والے واقعے یا حادثے کا بیان کرتا ہے تو صورتِ حال کی جزئیات اس کے سامنے روشن ہوتی ہیں وہ افسانہ بیان کرتے ہوئے اسے دوبارہ واقع ہوتے دیکھتا اور اس کی تمام آوازیں سنتا ہے۔ حاضر راوی کے جس افسانے کا اوپر ذکر ہوا اسے بازگوئی کہا جا سکتا ہے لیکن اعترافی افسانہ بازوقوعی واقعہ ہوتا ہے۔ بازگوئی میں راوی اجمال کو تفصیل سے یا اس کے برعکس تفصیل کو مختصراً بیان کر سکتا ہے یعنی اس قسم کے بیان میں اظہار پر راوی کو یہ قدرت حاصل ہوتی ہے کہ جس منظر کو چاہے ظاہر کرے، جسے چاہے چھپا دے۔ یہاں اس بات کا بھی قوی امکان ہوتا ہے کہ وہ دلچسپی، تاثر یا تحیر کی فضا قائم کرنے کے لیے وقوعِ واقعہ کی صورت ہی بدل دے (دوسرے لفظوں میں جھوٹ بولے) بس آپ بیتی یا بازگوئی بیانِ واقعہ کا ایک منضبط محدود اور یقیناً متاثر کن اسلوب ہے لیکن اس کی آورد اسے غیر فطری اظہار بنا دیتی ہے۔ افسانہ اگر تحیر اور تجسس سے بوجھل کرایا گیا ہو تو داستان میں ڈھل جاتا ہے یا من و عن بیان کا حامل ہوا تو واقعیت سے قریب ہونے کے سبب تخلیق کی فنی قدر و قیمت کم کر دیتا ہے۔

بازوقوعی واقعہ جب بیان کیا جاتا ہے تو راوی کو سچ بولنے سے مفر نہیں ہوتا اور یہی خصوصیت اس طرزِ بیان کو اعتراف بنا دیتی ہے۔

اعتراف کسی فرد کا اپنی ذات پر بیتے ہوئے ایک واقعے یا چند واقعات کے وقوع کی شہادت دینا یا ان کے وقوع کو قبول کرنا ہے۔ یہ عمل جب افسانہ بنتا ہے تو سب سے پہلے اس کا اطلاق خود افسانہ نگار کی ذات پر ہوتا ہے کہ وہ اپنی کوئی آپ بیتی افسانے کے فنی تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر اس طرح بیان کرے کہ اس کا سچ قاری یا سامع کو اپنا سچ معلوم ہونے لگے۔ اگر افسانہ نگار کے پاس ایسا کوئی ذاتی واقعہ نہ ہو تو دوسرے مرحلے میں اسے ایسا موضوع منتخب کرنا پڑتا ہے (جیسا کہ وہ ہر قسم کے افسانے کے لیے ایک موضوع کا ضرورت مند ہے) جسے حاضر راوی کے ذریعے اس طرح بیان کیا جا سکے کہ یہ اعتراف نہ صرف افسانوی کردار کا اعتراف ہو بلکہ قاری اسے خود افسانہ نگار کا اعتراف یقین کرے اور اپنے آپ پر بھی اثر انداز پائے۔ گویا سچ بولنا اعترافی افسانے کی نمایاں خصوصیت ہے۔ یہ سچ فرد یا اجتماع کے متعلق ایسا جھوٹ بھی ہو سکتا ہے جیسے جھوٹ ہی کے روپ میں پیش کیا گیا ہو۔

سماجی حقیقت نگاری اور واقعیت کے نام پر ترقی پسند افسانے میں سچ کی بہتات نظر آتی ہے غائب راوی کا ترقی پسند افسانہ تو یقیناً "فوٹوگرافک سچ" بولتا ہے لیکن حاضر راوی کا یہ افسانہ جدید اعترافی افسانے کے برعکس محض بازگوئی کی مثال بن کر رہ گیا ہے۔ سبب اس کا نظریاتی تسلط ہے جو اجمال کو مفصل بیان کرنے کے ادبی تعمل پر بھی اثر انداز نظر آتا ہے۔ دراصل فرد کے اپنی ذات کے تعلق سے اور ذاتِ دیگر یا معاشرے کے متعلق حق بیانی کرنے میں خاصا فرق پایا جاتا ہے۔ ترقی پسند افسانہ (حاضر راوی والا) معاشرے کی تلخ حقیقتوں کی نقاب کشائی کرنے میں بہت دلچسپی لیتا ہے مگر اپنی ذات کے پردے نہیں اٹھنے دیتا۔ جدید افسانہ جو اعترافی رجحان کا حامل ہو، نہ صرف اپنی

۳۲۳، منگلوار وارڈ، مالیگاؤں ۴۲۳۲۰۳ (ناسک)

ذات کا ہو بہو عکس دکھاتا ہے بلکہ معاشرے کو بھی آئینہ دکھانے کا اہل ہے جیسا کہ قاری پر اس کی تاثر آفرینی کے متعلق گذشتہ پیراگراف میں کہا گیا۔

اعترافی افسانہ خود نوشت سوانح یا آپ بیتی کے علاوہ خود کلامی کا افسانہ بھی ہو سکتا ہے آپ بیتی سننے کے لیے جس طرح الاؤ کے گرد راوی کے علاوہ ایک یا چند نفوس کا موجود ہونا ضروری ہے اسی طرح اعتراف سننے کے لیے اعتراف خانے میں کسی پادری (سامع) کا ہونا بھی ضروری ہے مگر خود کلامی اس شرط کی پابند نہیں اور اگر کوئی سامع موجود بھی ہو تو خود کلامی پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ متکلم اس عمل میں اپنی ذات پر جھیلے جانے والے حادثے کے کرب کا بیان اپنی ہی سماعت پر پھیلتا ہے۔ وہ سوال کرتا ہے اور خود ہی جواب دیتا ہے۔ تشکیک، بے معنویت، خلفشار اور غیر ہم آہنگی کو اپنی ذات سے زائیدہ قرار دے کر اپنی ذات کو ان کا شکار بھی قرار دیتا ہے۔ یہ صورتِ حال اعترافی افسانے کے طنزیہ پہلو کو شکار کرتی ہے۔ ہیئتی نقطۂ نظر سے یہ افسانہ کسی ابہام پیدا کرنے والی تکنیک کا متحمل نہیں۔ اعتراف کی خصوصیت ہی یہ ہوتی ہے کہ وہ بلا واسطہ اور صاف و صریح بیان ہو، مجاز و تمثیل اور علامت یا لسانی پیچیدگی اعتراف نامے کی صداقت کو مشکوک بنا سکتے ہیں۔ داستانی اور حکایتی اسالیب اپنی جگہ موثر سہی مگر اعتراف نامے کے طور پر، جس کا مقصد فوری تفہیم ہے، یہ اسالیب ناکام ہیں۔ جدید افسانے کے اشکال و ابہام اور علامت زدہ ہونے کی شکایت کے بعد جب افسانہ نگار نے کہانی کا گم ہوتا سرا پکڑا تو اس نے غالباً شعوری طور پر بیان کے ان لوازم کو ترک اور راست بیانیہ اظہار کو برتنا شروع کیا اور نتیجے میں اعترافی افسانہ سامنے آیا جس کے کردار جانے پہچانے، مقام اور ماحول انسانی اور واقعات دیکھی بھالی زندگی سے ماخوذ ہیں۔

اس بات سے یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ اعترافی افسانہ روایتی افسانے کی طرح پلاٹ اور کردار والا آسان افسانہ ہوگیا ہے۔ چونکہ یہ خود کلامی کا افسانہ ہے اس لیے دروں بینی اور دروں بیانی کے سارے اطوار اس میں بآسانی مشاہدہ کیے جا سکتے ہیں اگرچہ لسانی پیچیدگی اس کا خاصا نہیں جو طول طویل جملوں اور رموز اوقاف کے باقاعدہ استعمال سے بیان میں پیدا ہوتی ہے (اور جو روایتی اور ترقی پسند افسانے کی شناخت ہے) مگر اس میں بے ربط خیالات کا انسلاک لسانی اظہار کا ایک ایسا پیکر خلق کرتا ہے جو نہ صرف متحیر کن بلکہ متاثر کن بھی ہوتا ہے۔

اعترافی افسانے کی ابتدائی مثالیں منٹو کے یہاں کافی تعداد میں نظر آتی ہیں جن میں اس نے بازگوئی بھی کی ہے اور بازو قوعی واقعات بھی قلمبند کیے ہیں کبھی وہ ایک عینی شاہد کی طرح فارس روڈ کے اس طرف کی سفید گلی میں بسنے والی رنڈیوں اور غنڈوں کی سرگذشت سناتا ہے (ممد بھائی) اور کبھی سعادت حسن منٹو کی حیثیت سے بابو گوپی ناتھ، عبدالرحیم سینڈو، غفار سائیں، غلام علی، شفیق طوسی، سردار بیگم اور زینت وغیرہ کے ساتھ خود اپنے پر بیتنے والے سانحات کو دوبارہ تخلیق کرتا ہے (بابو گوپی ناتھ) وہ پونا کے قیام کے دوران مسز اسٹیلا جیکسن عرف ممی، چڈہ، سعید عرف رنجیت کمار، غریب نواز، شکیل، عقیل، شیریں، ون کترا، ہریش، رام سنگھ، پولی، ڈولی، ایلما، تھیلما اور کٹی وغیرہ کے ہجوم میں خود بھی ایک اہم کردار کی طرح اپنے ارتکابات اور افعال کا اقبال کرتا ہے (ممی) اور پونا ہی کے قیام میں جانکی، سعید، عزیز اور نارائن کے درمیان چند خالص ذاتی نوعیت کے مسائل سے جھوجھتا ہے (جانکی)

"ممد بھائی" بازگوئی کا افسانہ ہے جس میں منٹو ایک رپورٹر کی طرح حالات جمع اور بیان کرتا ہے:

"جب میں نے تفتیش کی تو مجھے معلوم ہوا کہ فارس روڈ کے علاقے کا وہ ایک قسم کا حاکم ہے۔"

اگرچہ افسانہ نگار بحیثیت ایک کردار افسانے میں موجود ہے مگر دیدہ سے زیادہ وہ شنیدہ حالات کے بیان تک محدود ہے۔ اس کے برعکس "بابو گوپی ناتھ"، "ممی" اور "جانکی" میں اس کے اعترافات افسانوں کی بافت میں اہم دھاگوں کا رول کرتے ہیں:

"شفیق سے مجھے اس کی نگاہ بازی پسند نہیں آتی تھی۔ اوّل تو اس میں بھونڈا پن تھا۔ اس کے علاوہ کچھ یوں کہیے کہ اس بات کا بھی اس میں دخل تھا کہ وہ مجھے بھائی کہتی تھی۔ شفیق اور سینڈو اٹھ کر باہر گئے تو میں نے شاید بڑی بے رحمی کے ساتھ اس سے نگاہ بازی کے متعلق استفسار کیا۔ کیوں کہ فوراً اس کی آنکھوں میں یہ موٹے موٹے آنسو آگئے اور وہ روتی روتی دوسر

کمرے میں چلی گئی"۔

(بابو گوپی ناتھ)

"وہ مجھے بھائی کہتی تھی" منٹو کا صاف اعتراف ہے جس کے ردِ عمل میں وہ "اپنی بہن" کی کسی کے ساتھ نگاہ بازی ناپسند کرتا ہے اور بہن سے اس بارے میں "سختی" سے باز پرس بھی کرتا ہے:

چڈے نے بے ربط تقریر شروع کی "لیڈیز اینڈ جنٹلمین، آپ سب جائیں جہنم میں ——— منٹو ہمارے درمیان موجود ہے بزعم خود بہت بڑا افسانہ نگار بنتا ہے۔ انسانی نفسیات کی ——— وہ کیا کہتے ہیں ——— عمیق ترین گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ بکواس ہے۔"

(ممی)

اقتباس کی ان سطور میں منٹو نے کس صفائی سے اپنا خیال ایک اور کردار کی زبان سے ادا کرا دیا ہے!

میں نے پوچھا "آپ کو بچے پسند نہیں؟"

وہ مسکرائی "پسند ہیں، لیکن کون پالتا پھرے"۔

میں نے کہا "آپ کو معلوم ہے، اس طرح بچے ضائع کرنا جرم ہے!"

——— "اس میں جرم کی کون سی بات ہے۔ اپنی ہی تو چیز ہے اور قانون بنانے والوں کو یہ بھی معلوم ہے کہ بچہ ضائع کراتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے؟"

(جانکی)

ارتکابِ گناہ کا اعتراف اور اس میں یقیناً تکلیف ہوتی ہے۔

مثالوں کی روشنی میں یہ کہنا بے جا نہیں معلوم ہوتا کہ جدید افسانے نے منٹو کے فن سے اعترافی رجحان اخذ کیا اور اسے خاصی ترقی دی مگر منٹو کے اعتراف نامے میں خود کلامی کا رنگ ناپید ہے جیسے قرۃ العین حیدر کے ناول "آگ کا دریا" کے صفحات پر جا بجا بکھرا ہوا دیکھا جا سکتا ہے اعترافی خصوصیات کے ساتھ۔

"آگ کا دریا" میں آزاد تلازمۂ خیال اور شعور کی رو کی تکنیکوں کے ذریعے قرۃ العین حیدر نے جس طرح زمان و مکان کے تصورات کو تہ و بالا کیا، اس سے فکشن میں ان کے تقاضوں کے نئے گوشے اجاگر ہوتے ہیں۔ اس ناول کے جن حصوں میں مذکورہ تکنیکوں کا خصوصی برتاؤ ملتا ہے وہاں اگر خود کلامی نہیں پائی جاتی تو ان سے ہٹ کر بھی کرداروں کے اعمال و اقوال میں اعتراف کا رنگ بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ مثلاً:

"میرا نام ہرش نے رتناولی رکھا تھا ——— بے چارہ ہرش!" اپنا ذکر سن کر ہرش وردھن نے، جو کان میں قلم [illegible] سے اب تک مراقبے میں محو تھا، زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ "ہم شری پرتھوی ولبھ کہلاتے تھے" اس نے مقر[illegible] ہاتھ ہوا میں بلند کر کے کہا "ہم جو گویا دھن اور دھرتی کی دیویوں کے چہیتے تھے اور ہم سب کو ملیچھ ترکوں نے آکر ٹھکانے لگا دیا، ٹھکانے لگا دیا، ٹھکانے لگا دیا ———"

فرد اپنی شکست اور اپنے زوال کا معترف ہے:

پھر دفعتاً جانے کیا ہوا کہ سرل بغیر جانے ہوئے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، اسے مخاطب کر کے بولا "تم مجھے بہت اچھی معلوم ہوتی ہو، میرے ساتھ کلکتے چلو!"

——— سرل کو احساس ہوا کہ وہ شدت سے اس لڑکی کے عشق میں مبتلا ہے۔

"سنو" اس نے بڑے جذبے سے کہا "سنو" مگر پھر وہ ہڑبڑا گیا اس نے اب تک اس کا نام بھی معلوم نہیں کیا تھا۔

"مجھے ماریا ٹیریزا کہتے ہیں۔"

"ماریا ٹیریزا، مجھے تم سے عشق ہے۔"

——— اپنی ساری قابلیت اور شاعرانہ انداز بیاں اور ڈرامے کی صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے اس نے ماریا ٹیریزا کو یقین دلایا کہ ابھی اس کو ساتھ لے جانا ممکن نہیں، وہ جلد ہی اسے بلوا لے گا۔ اور یہ الفاظ کہتے ہوئے اس نے اپنے آپ کو انتہائی ذلیل اور کمینہ محسوس کیا۔

وقتی جذبات میں بہہ کر فرد کس قدر خود غرض ہو جاتا ہے، اقتباس کی آخری سطر اس کا کھلا اعتراف ہے۔

شکست اور زوال اور اپنی خود غرضی کا کھلا اعتراف منٹو اور قرۃ العین حیدر کے توسط سے جدید افسانہ نگاروں کے یہاں عام طور پر مشاہدے میں آتا ہے جو کبھی باز وقوعی واقعے کی شکل میں اور کبھی خود نوشت سوانح یا خود کلامی کے رنگ میں نمایاں ہوتا ہے۔

چند تجزیاتی مثالیں:

میرے بہت سے دشمن ہیں جن کے جاسوس ہر وقت میری نگرانی کیا کرتے ہیں کبھی فقیروں اور کبھی ہیجڑوں کے بھیس میں میرے مکان کے آس پاس ٹہلتے رہتے ہیں

ِکن خدا کی قسم میں ڈرتا نہیں ہوں ——
یرے مائنڈ میں کوئی خرابی نہیں ہے صرف
ھ سوچتا رہتا ہوں اور جب میں بولنے لگتا
وں تو جب کبھی میرا سر گرم ہو جاتا ہے تو
ں رُک نہیں پاتا، چاہتا ہوں کہ نہ بولوں،
کر بولتا رہتا ہوں۔

(جرگہ: نیّر مسعود)

یہ سطریں افسانے میں لکھے گئے ایک
لتوب سے ماخوذ ہیں۔ مکتوب لکھنے والے کا
تراف نامہ ہوتا ہے، اس بات سے انکار
ہیں کیا جاسکتا، مکتوب نگار متکلم بھی ہوتا
ہے اور راوی بھی جیسا کہ مثال کی سطروں سے
اضح ہے۔ وہ کبھی صورت واقعہ کی وضاحت
رتا ہے (میرے بہت سے دشمن ہیں ——)
ور کبھی خود کلامی کرنے لگتا ہے (میرے
ائنڈ میں کوئی خرابی نہیں ہے ——)

بوڑھے خبیث سے نفسیاتی معالج نے
ُچھا:

"کیا آپ کو گھوڑے بہت پسند
ھے؟"

"جی نہیں۔"

"کیا آپ کو گھوڑوں سے نفرت
ہے؟"

"جی نہیں۔"

"کیا آپ کبھی گھوڑے سے گرے ہیں،
ٓپ کو چوٹ آئی ہے؟"

"جی نہیں۔"

"کیا آپ پہلے بھی خواب میں گھوڑے
یکھتے تھے؟"

"جی نہیں۔"

"کیا آپ کے ارد گرد کوئی ایسا شخص
ہے جس کی شکل دیکھ کر آپ کو گھوڑا یاد آئے
اور اس شخص سے نفرت یا محبت محسوس
کرتے ہوں؟"

"جی نہیں۔"

"کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ آپ
کے پیٹ میں واقعی گھوڑا ہے اور وہ اصلی
گھوڑے جیسا ہی جسیم و تنومند ہے؟"

"جی ہاں۔"

"وہ گھوڑا چلتا بھی ہے، اس سے
آپ کو پریشانی ہوتی ہے؟"

"جی ہاں۔"

"یہ گھوڑا ہنہناتا ہے، بانچھوں سے
فرفر کرتا ہے، پھر آپ کی آنتیں چبانے
لگتا ہے؟"

"جی ہاں۔"

"آپ اس سے نفرت یا خوف محسوس
کرتے ہیں؟"

"جی ہاں۔"

(اسپ کشت مات: قمر احسن)

یہ منفی اور مثبت اعتراف کی نہایت
عمدہ مثال ہے جس میں نفسیاتی معالج کے
روپ میں فرد کی ذات کو کھنگالنے والا ایک
سائل بھی موجود ہے اور جواب دینے والا
"جی نہیں" اور "جی ہاں" کے مختصر جوابات میں
صاف اور صریح اعتراف کرتا ہوا نظر آتا ہے۔
اس کے مثبت جوابات میں بازد قوعی واقعے
کی کیفیت ہے کیوں کہ متکلم کی ذات کی ساری
پیچیدگیاں معالج کے سوالوں کی شکل میں
دوبارہ تخلیق ہو کر جواب دینے والے (متکلم)
کے سامنے آتی جا رہی ہیں۔

میں سچ کہتا ہوں، میں نہیں چاہتا تھا
لیکن میں نے کدال زمین پر رکھ دی، بیل کی راس
ہاتھ سے چھوڑ دی۔ بیل کی آنکھیں بھر آئیں وہ
رمبھانے لگا، لیٹی ہوئی کدال اٹھ کھڑی ہوئی۔
اس کا دستہ میرے دائیں ہاتھ کو چومنے لگا۔
بھومی آہیں بھرنے لگی۔ کدال، بیل اور بھومی سے
موہ ہوتے ہوتے بھی میں نقارے کی آواز کی
طرف کھنچتا چلا گیا۔

(گلیڈیٹر: کنور سین)

"میں سچ کہتا ہوں" اعترافی افسانے کی
نمایاں خصوصیت ہے۔ فرد جس طرح اپنے ایک
قسم کے زمینی (زرعی) مسائل ترک کر کے دوسری
قسم کے زمینی (توسیعی) مسائل کی طرف متوجہ
ہوتا ہے اور اسی دوسری سمت کا ہو جاتا ہے،
اس سے اپنے پرانے مسائل کی طرف اس کے
رجحان کا پتا چلتا ہے، جس کا وہ معترف ہے۔

میرے اندر سے کوئی بولا: تم غلام علی
سے نفرت نہیں کر رہے ہو، تم وہی کر رہے
ہو جو پچھلے تیس سال سے کرتے چلے آ رہے ہو۔
تمھیں اپنی محرومیاں نظر آ گئیں نا؟ تم غلام
علی جیسے ہر اس فرد سے فوراً نفرت کرنے پر
آمادہ ہو جاتے ہو جو تمھاری محرومیوں کی
عمارت میں ایک چھوٹی سی اینٹ رکھنے کا
بھی خطاوار ہو۔

(ڈار سے بچھڑے: سید محمد اشرف)

دروں بیانی، جس کا ذکر کیا گیا، اعترافی
افسانے کی ایک خصوصیت ہے جو اس مثال سے
واضح ہے۔ "اندر سے بولنے والا" فرد کا ضمیر
ہو سکتا ہے یا فرد خود کلامی میں آپ محو ہو سکتا
ہے۔ کیوں کہ اس عمل میں اسے خبر نہیں ہوتی کہ
وہ بآواز بلند سوچ رہا ہے۔ "اپنی محرومیوں کو
دیکھ لینا" اپنے محروم ہونے کے اعتراف کے

عتراف ہے۔

"بات یہ ہے بھائی کہ میں صدمے برداشت نہیں کر پاتا ـــــ اور میں کر بھی لوں لیکن وہ جو ایک کتا میرے اندر بیٹھا ہے وہ حرامی پن سے باز نہیں آتا ـــــ موقع ملتے ہی کچو کے لگاتا ہے۔"

"کون کتا ؟"

"ـــــــــــ ۔"

("میں تمھارے لیے ـــــ یا تم میرے لیے مصیبت بنے ہوئے ہو مجھے کتا سمجھنے والے کتے ـــــ ۔")

(گھونسلا : شوکت حیات)

گذشتہ مثال کے "اندر سے بولنے والے" کی طرح اس مثال میں بھی فرد کے "اندر بیٹھا ہوا کتا" اس کے ضمیر یا اس کی ذات کی علامت ہے جو کچو کے لگا لگا کر اسے سچ بولنے پر مجبور کرتا رہتا ہے۔

ایک صبح چائے کی پہلی چسکی کے ساتھ تم نے اخبار اٹھایا تو اس کے پہلے ہی صفحے پر ٹی.وی. کمپنی کے بڑے اشتہار میں خود کو کہتے پایا کہ "ٹی. وی سیٹ میں نے اس لیے خریدا ہے کہ اسی کے اسکرین پر ابھرنے والی صاف امیج میری امیج کو بھی ابھارتی ہے۔"

(ہانکا : ساجد رشید)

"ٹی. وی کی تصویر میں خود کو کچھ کہتے ہوئے پانا" اعتراف کا کنایہ ہے۔ مثال میں راوی اپنے مخاطب سے کلام کر رہا ہے اور اگرچہ راوی مخاطب سے جدا شخصیت ہے لیکن افسانہ روایت کرتے ہوئے وہ مخاطب کو اپنی نظروں سے دیکھ اور دکھا رہا ہے اس لیے افسانے کا اعتراف راوی اور مخاطب دونوں کا اعتراف بن گیا ہے۔

اور میں ہاتھ اٹھا کر گڑگڑا کر دعا مانگتا ہوں : اے اللہ مجھے جاہلوں جیسا عقیدہ عطا فرما ـــــ میری آگہی میرے لیے زہر ہے اور میرا ساحل کٹ کٹ کر سمندر میں گرتا جا رہا ہے۔

(ربابّا : حسین الحق)

آگہی جب زہر ہو اور اپنے علم کا بوجھ فرد کو ٹکڑے ٹکڑے کر رہا ہو تو اس حالت میں "جاہلوں جیسا عقیدہ" ہی اسے اپنی ذہنی الجھنوں اور اعصابی تناؤ سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔

ابہام اور اشکال اگرچہ اعترافی افسانے کی خصوصیت نہیں لیکن بعض لکھنے والوں کے یہاں داستانی اسالیب کے زیر اثر ایسے افسانوں میں بھی مبہم کیفیات اُجاگر ہوئی ہیں جن میں خود کلامی یا دروں بیانی کا رنگ غالب ہے۔ مذکورہ افسانہ نگاروں کے علاوہ بھی تمام نئے لکھنے والوں کے یہاں اعترافی رجحان کو صاف طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔

●●

کیفؔ بھوپالی

مزاجِ ناز کو کیا ہوا انھیں مجھ سے پیار ہے آج کل
ری گفتگو مری جستجو مرا انتظار ہے آج کل

ے خط نکال کے دیکھنا کبھی چومنا کبھی سوچنا
ہی مشغلہ یہی سلسلہ یہی کاروبار ہے آج کل

لیلا گھر سے نکل میاں ذرا دیکھ بھال کے چل میاں
ی ابتری بڑی رہزنی بڑی لوٹ مار ہے آج کل

ے قتل کر آ سے قتل کر تجھے سات خون معاف ہیں
ی سلطنت ترا دبدبہ ترا اقتدار ہے آج کل

ے کیفؔ کل تو تو رند تھا مرے یار تجھ کو یہ کیا ہوا
امذہبی بڑا پارسا بڑا دیندار ہے آج کل

شاہجہاں آباد، بھوپال

(آخری غزل)

جاتے ہوئے نگاہ اِدھر کر کے دیکھ لو
ہم لوگ پھر کہاں ہمیں جی بھر کے دیکھ لو

دیتا ہے اب یہی دلِ شوریدہ مشورہ
جینے سے تنگ ہو تو میاں! مر کے دیکھ لو

رہنے کا دشت میں بھی سلیقہ نہیں گیا
یاں بھی قرینے سارے مرے گھر کے دیکھ لو

شاہانِ کج کُلاہ زمیں بوس ہو گئے
تیور مگر وہی ہیں مرے سر کے دیکھ لو

سجدے میں دو جہاں ہیں اے دلؔ! ہمارے ساتھ
رُتبے یہ آستانِ قلندرؒ کے دیکھ لو

مبارک علی بیگ دلؔ ایّوبی

ولادت : ۲۱ ستمبر ۱۹۲۹ء
وفات : ۳ اپریل ۱۹۹۰ء

اسؔرار اکبرآبادی

ہنساتی رہی دِل دُکھاتی رہی
مجھے زِندگی آزماتی رہی

ہوس آگ دِل میں لگاتی رہی
وفا آگ میں گُل کھلاتی رہی

سُلگتے مسائل اُلجھتے رہے
مجھے برف باری بُلاتی رہی

محبّت کا کیا خُوب ہے سِلسِلہ
خبر جانے والے کی آتی رہی

عجب تیز آندھی ہے اِس دَور کی
شجر کچھ ہَرے بھی گِراتی رہی

مکانوں میں روحیں تو سوتی رہیں
ہوا کھڑکیوں کو جگاتی رہی

مرا دِل ہے اسؔرار وہ آئینہ
وفا جس کو رنگیں بناتی رہی

۳۲۷/۱۸، منٹولہ، آگرہ ۲۸۲۰۰۳ (یو۔پی)

بنت مسعود

تیسرا آدمی

اروشی اپنے عالیشان محل نما مکان کے اندر سرتاپا سونے سے لدی، صاحب جمال گل اندام، پوشاکِ مکلف سے اپنے آپ کو آراستہ کرکے خوانِ کھانے اور میووں کے منگواکر کچھ تناول کرتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ آنکھوں میں شفق کے رنگ جھلملانے لگے۔ ورمالا کسے پہناؤں کہ میں سوداگر جی پتی ہنرمند و ہشیار چاہتی ہوں۔

اس گنی جن کو جو چیز گم شدہ کو بتاتا ہے کہ وہ کہاں ہے اور کس جگہ ہے یا اس ہنر میں یکتا جوان کو جو کاٹھ کا ایسا گھوڑا تیار کرسکتا ہے جو تختِ سلیمانی سے بھی تیز رفتار سے اڑتا ہے یا پھر اس تیسرے گبرو جوان کو اپنا پتی چن لوں جو عجب بانکا سا لگتا ہے اور ایسا بان چلاتا ہے کہ کوئی بچ کر نہ جائے اس کے تیر کا جو پھل کھائے سو کھیت چھوڑ باہر نہ جائے۔

فاختہ کے گھونسلے پر پھر کوے نے حملہ کردیا۔ کوں کوں کرتی فاختہ یقیناً اپنے جانی دشمن کوے کا مقابلہ کررہی ہے کوں کوں کی آواز سے پتا چلتا ہے کہ سناٹا کچھ زیادہ ہی ہے۔

اپنے خوبصورت SUMMER ہاؤس میں جو پہاڑوں کا بس منظر لیے ہوئے ہے، چاروں طرف پھیلے مرغزار اور سامنے پرسکون جھیل کا پانی جہاں سے چلتی ہوئی ٹھنڈی ہوائیں پردوں میں سرسراہٹ پیدا کررہی ہیں قیمتی جواہر اپنے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے لیکمے کریم سے اپنا چہرہ صاف کرتے ہوئے کروڑ پتی ٹھیکے دار اور بزنس مین کی اکلوتی بیٹی زہرا اسم بامسمی نے سوچا شاید مجھے اس سائنسداں سے بیاہ کرلینا چاہیے جسے نوبل پرائز تک مل چکا ہے جس کی شہرت پوری دنیا میں ہے اور جو محض اس سے بیاہ کرنے سات سمندر پار کرکے آیا ہے۔ مشتری اور مریخ، چاند اور عطارد پر کیا ہو رہا ہے یہیں سے بیٹھے بیٹھے بتا سکتا ہے۔ دولت کا تو پاپا نے ڈھیر لگا رکھا ہے شاید میری قسمت میں شہرت و عزت بھی ہے ورنہ ایسا انٹلیکچوئیل شوہر کہاں ملتا؟

فون پر دوسری جانب پاپا تھے "بے بی جلدی مت کرنا فیصلہ کرنے میں ایک اور رقعہ ہے تمہارے لیے انجینیئر ہے خدا کے فضل سے اپنے ہنر میں یکتا ہے۔ ایسی ایجاد کی ہے کہ رہتی دنیا تک نام باقی رہے گا۔ دائیں اور بائیں ملکوں کے بنائے ہوئے راکٹوں سے تیز رفتار یوں سمجھ لو کہ بنا ایندھن کے چلنے والا راکٹ۔ تختِ سلیمان کی یاد تازہ کردی ہے۔

O.K پاپا میں یقیناً WAIT کرسکتی ہوں۔ مجھے کوئی جلدی نہیں۔ اس وقت تو میں اپنے گھوڑے کے پیٹ پر مڈ پیک لگنے جارہی ہوں کچھ تکلیف ہے بیچارے کو۔ نیچر کیور (NATURE CURE) میں میرا یقین کچھ بڑھ گیا ہے یوسف شاہ سے NATUROPATHY سیکھ رہی ہوں۔ بائی۔ بائی۔ خدا حافظ۔

اروشی نے اپنے سوداگر پتا سے ایک دن کی مہلت مانگی تھی لیکن وہ اسی رات گم ہوگئی۔ سوداگر بہت پریشان ہوا آخر گجر دم وہ اس شخص کے پاس گیا جو احوال گم ہونے کا بتاتا تھا اور اس جگہ کی نشاندہی کرتا تھا۔ جہاں گم شدہ پایا جاسکتا تھا۔ سوداگر نے پوچھا "میری بیٹی اروشی کہاں ہے؟ کہ وہ آج تم لوگوں میں سے کسی ایک کو اپنا بر چننے والی تھی۔ پہلے شخص نے بتایا کہ ایک پری اروشی کو ایک پہاڑ پر لے گئی ہے جہاں پہنچنا ناممکنات میں سے ہے تب سوداگر نے دوسرے شخص سے کہا کہ تم کاٹھ کا گھوڑا تیار کرو اور اسے اڑاؤ اور تیسرے شخص سے کہا کہ تم اس کی پیٹھ پر بیٹھ کر جاؤ اپنے تیر کا نشانہ اس پری کو بناؤ کہ سارا طلسم ٹوٹ جائے اور اپنے پیچھے اروشی کو بٹھا کر لے آؤ۔

واپسی پر اروشی نے ان تینوں میں سے کسے پتی چنا کسے ورمالا پہنائی؟؟ وقت بہت پیچھے رہ گیا ہے۔

زہرا اپنی مسہری پر ڈنلپ کے گدوں میں کروٹیں بدلتے ہوئے سوچ رہی

تھی کاش وہ دروپدی کی طرح ان دونوں کے ساتھ رہ سکتی کہ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔ جیسے اس کے دل میں کوئی اور چھپا بیٹھا ہو لیکن کون؟ اسے کچھ یاد نہ آیا آخر اسی اُدھیڑ بُن میں صبح ہوگئی اپنے بیڈ روم کے جھروکے سے جھانک کر دیکھا تو دونوں دانشور ڈرائینگ روم میں موجود تھے۔ دُنیا کا ہر ملک دیکھ چکے تھے یہی وجہ تھی کہ یہاں بھی بڑے مطمئن نظر آرہے جیسے پردیسی نہ ہوں۔ قریب ہی ڈائیننگ ٹیبل پر مُغلئی، چائنیز اور اٹیلین فوڈ چُنے جا رہے تھے دونوں اس کے پاپا کی ضیافت سے محظوظ ہو رہے تھے زہرا تو موٹا ہو جانے کے ڈر سے کچھ صبح میں کھاتی نہ تھی بس ایک بیڈ ٹی۔ کروڑوں کی جائیداد کی واحد مالک۔ جس کے پاپا ہوائی جہازوں میں رہتے ہیں تاکہ دُنیا بھر میں اپنی پھیلی ہوئی فیکٹریوں کا جائزہ لے سکیں۔

نہا دھو کر سُرخ اسکرٹ اور زرد بلاؤز پہن کر اس نے کٹے ہوئے ریشمی گھنے بالوں کا پونی ٹیل بنالیا وہ ابھی سیڑھیوں پر ہی تھی کہ یوسف شاہ گھوڑا دوڑاتا ہوا گھر کے دروازے تک آگیا۔

”یوسف شاہ! او دیہقانی! کیا گھوڑا گھر کے اندر لے آئے گا؟ کروڑپتی بلڈر زمان سیٹھ چلّایا۔ یوسف شاہ اس کا رشتہ دار تھا۔

”کہیں دیر نہ ہو جائے اس وجہ سے ایسی ایڑ لگائی“۔ یوسف شاہ گھوڑے سے اترا۔ ”موٹر سائیکل خراب ہوگئی ہے ورنہ اسی پر آتا“۔ اس نے گویا معذرت کی۔

”خیریت تو ہے؟ زمان سیٹھ کو ایسے موقع پر جب اس کی بیٹی اپنا بر چُن رہی تھی کسی اور کا آنا ناگوار گزرا۔

”میں بھی زہرا کا خواستگار بن کر آیا ہوں اور سُنا ہے آج اس بات کا فیصلہ ہونے والا ہے کہ وہ کس سے بیاہ کرے گی۔ میں اپنے آپ کو زیادہ مستحق سمجھتا ہوں کہ میں زہرا سے عشق کرتا ہوں اور اس کے لیے اپنی جان تک دے سکتا ہوں“۔ یوسف شاہ بولا۔

”بیوقوف!“ زمان سیٹھ نے زہر آلود مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا ”میری بیٹی کا بیاہ اس کے عاشق سے نہیں ہوگا کہ اس کے عاشقوں کی تعداد لاکھوں ہے بلکہ اس دانشور و دانا شخص سے ہوگا جو دنیا میں نامور ہوگا۔ کیا تو ان دونوں کا مقابلہ کر سکتا ہے؟ ایک سائنسداں ہے اور دوسرا انجینیر اور خلقِ خدا ان کے نام سے واقف ہے۔“

”بے شک میں ان کی دانشوری کا قائل ہوں لیکن فیصلہ تو زہرا کو کرنا ہے کہ میری چاہت اس کے لیے زیادہ ضروری ہے یا نہیں؟ میں اس کی جان سے بھی زیادہ حفاظت کروں گا۔ وہ اس دھرتی کی ہے اور یہاں سے اسے کوئی الگ نہیں کر سکتا کوئی دانشور ہو یا دُنیا کی مقبول ترین شخصیت زہرا کی حفاظت میرا فرض ہے اور اس سے محبت میرا ایمان جب تک میرے بازوؤں میں زور ہے زہرا کو کوئی مجھ سے نہیں چھین سکتا“ یوسف شاہ بولا۔

اور زہرا جو اب تک سیڑھیاں اُتر کر یوسف شاہ اپنے پاپا اور دونوں انٹلیکچوئیلز کے درمیان کھڑی ہوگئی تھی سوچ میں پڑ گئی۔ یوسف شاہ کی باتیں سُن کر اسے یوں لگا جیسے ایک کڑی زنجیر کی رہ گئی تھی اور اس گم شدہ کڑی سے کہر چیسز کا سراغ مِل گیا ہو۔

اروشی نے جو کہ ہنرمند و دانا آدمی سے بیاہ کی خواہش مند تھی اس تیسرے آدمی کو جو پری کو مار کر اسے حفاظت کے ساتھ واپس گھر لایا تھا، ور مالا پہنا دی کہ وہ اس کا محافظ تھا جب کہ پہلے دونوں نے تو صرف ہنر دکھلایا تھا اور وہ تیسرا آدمی جو اپنی جان پر کھیلا تھا اور ایسے خوفناک مقام پر گیا تھا یقیناً اس کا سچا عاشق بھی تھا۔

●●

ظیم اختر

وہ ہم سے خفا ہیں

قارئینِ محترم آپ میں سے بیشتر حضرات کی
رح ہم بھی شریف ابنِ شریف ہیں، یقین مانیے
پ کی طرح ہم نے بھی اپنے بڑوں سے بزرگوں کا
حترام اور دوستوں سے محبت کرنے کا سبق سیکھا
ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اپنے دوستوں اور ملنے
ملنے والے حضرات سے بڑی خندہ پیشانی اور
بت سے ملتے ہیں، اپنے خلوص کا اظہار بھی کرتے
یں۔ اُن سے بات چیت کرتے ہوئے پہلے تو لو
پھر بولو کی کہاوت پر عمل کرتے ہوئے نہایت
ی نپے تلے انداز میں گفتگو کرتے ہیں۔ لیکن تمام تر
شعوری اور غیر شعوری کوششوں کے باوجود ۳۲
دانتوں کے درمیان موجود یہ کمبخت زبان پھر
بھی پھسل ہی جاتی ہے اور ہمارے دوست ہم
سے ناراض ہو جاتے ہیں اور مذاق کی بات کو
سنجیدگی سے لے کر ہمارے خلوص پر شک
کرنے لگتے ہیں۔

اب یہی دیکھیے ہمارے ایک دوست
ہیں، اچھا خاصہ کاروبار ہے خدا کا دیا ہوا
سب کچھ موجود ہے، محلے میں عزت کی نگاہ سے
دیکھے جاتے ہیں لیکن بیٹھے بٹھائے جانے کیا
سمائی کہ شاعری شروع کر دی۔ ہم نے لاکھ
سمجھایا کہ میاں ہوش کے ناخن لو، اپنے خاندان
کا نہیں تو کم از کم اپنے بیوی بچوں کا ہی کچھ
خیال کرو، شہرت اور مقبولیت حاصل کرنے کے
اور بھی بہت سے مہذب اور شریفانہ کام موجود
ہیں، لیکن اُن پر شعر کہنے اور مشہور ہونے کا
بھوت کچھ اس طرح سوار ہوا کہ ہماری ایک نہ
سُنی۔ ہر دوسرے تیسرے دن وارد ہوتے
اور ہم پر اپنی شاعری مسلط کر دیتے۔ اُن
کے شعر گوئی کے جنوں کو دیکھ کر ہم کو بڑے
بوڑھوں کی کہاوت یاد آگئی کہ آدمی کو بہکنے
اور بگڑنے میں دیر نہیں لگتی۔

شروع شروع میں تو موصوف بیل گاڑی
کی رفتار سے شاعری کرتے رہے لیکن دیکھتے ہی
دیکھتے سُپر فاسٹ ٹرین کی اسپیڈ پکڑی اور
یقین مانیے غزلوں کے اسکائی اسکریپرز تیار
کرنے لگے یعنی ساٹھ ستر اشعار کی غزلیں کہنے
لگے۔ ہم چونکہ ادبی ذوق کے حامل اُن کے
واحد دوست ہیں اس لیے اُن کی ہر غزل بڑی
خاموشی سے سُنتے اور اپنے پیدائشی سُنّی ہونے
کا ثبوت دیتے ـــــ ایک دن چند بے تکلف
دوستوں کی محفل جمی ہوئی تھی کہ ہمارے شاعر
دوست بھی آگئے۔ اُن کا اور اُن کی شاعری
کا غائبانہ تعارف تو ہم اپنے تمام دوستوں سے
پہلے ہی کرا چکے تھے، وہ کیا آئے کہ گویا:

امراؤ جان آئی
محفل میں جان آئی

کسی دوست نے اُن سے غزل کی فرمائش
کی اور اندھے کو کیا چاہیے، دو آنکھیں کی
مثل پر عمل کرتے ہوئے وہ بے تکلفی سے
شروع ہو گئے۔ شیطان کی آنت لمبی غزل
کا نہ جانے وہ کون سا شعر تھا اور غزل نہ
جانے کون سی منزل میں تھی کہ قسمت کے مارے
ایک پروفیسر دوست بھی آگئے۔ تھوڑی دیر
تک ہمارے پروفیسر دوست ادب سے اپنے
واجبی سے تعلق کا اظہار کرتے ہوئے غزل
سنتے رہے اور پھر داد دیتے ہوئے کسی سے
سرگوشیاں کرنے لگے۔ شاعر دوست کو یہ
بات گراں گزری، یکلخت خاموش ہو گئے اور
پھر ناگواری سے مخاطب ہوتے "پروفیسر صاحب
آپ ادب کے کیسے استاد ہیں، میں غزل سُنا
رہا ہوں اور آپ باتیں کر رہے ہیں۔" اس
سے پہلے کہ پروفیسر دوست معذرت کرتے
یا کچھ کہتے ہم سے نہ رہا گیا اور فوراً بول اُٹھے
"میاں ان سب کی سزا یہ ہے کہ یہ غزل
دوبارہ سُناؤ ـــــ"

ہمارا یہ کہنا تھا کہ ایک قہقہہ بلند ہوا،
سب لوگ ہنسنے لگے، شاعر دوست پیر پٹختے
ہوئے کھڑے ہو گئے، چہرہ غصے سے سُرخ
ہو گیا ہوا میں ہاتھ لہراتے ہوئے بولے
"میری غزل سزا ہے۔ تم لوگ اپنے آپ
کو کیا سمجھتے ہو، میں تمھیں تو کیا آئندہ کسی کو
بھی غزل نہیں سناؤں گا۔" ہماری زبان پھر
پھسلی "خدا کا شکر آج سب کی جان بخشی
ہو گئی ـــــ" صاحبو اب آپ ہی بتایئے ہم
نے سیدھے سادے انداز میں ایک بات کہی تھی
لیکن ہمارے شاعر دوست ہم سے آج تک
ناراض ہیں۔

ایسا ہی ایک بار اور ہوا۔ ہمارے
ایک ادب نواز تاجر دوست کلکتے سے دلّی
آئے۔ ہم سے ملے اور دلّی کے شاعروں سے

سی ـــ ۱۸۵، منٹو روڈ کمپلیکس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ملنے کی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے ہمیں ہمارے شاعر دوستوں کے ساتھ اپنے ہوٹل میں ڈِنر پر مدعو کیا۔ ہم نے اپنے چند شاعر دوستوں کو اکٹھا کیا، چلتے ہوئے اپنے ایک بزرگ دوست کو بھی ساتھ لے لیا، جن کی شاعری کو اُن کے اُستاد مرحوم کے ذہن کا فکری نتیجہ کہا جاتا ہے ـــــ ادب نواز تاجر دوست کے ہوٹل پہنچ کر ہم نے تمام دوستوں کا میزبان سے تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ ہمارے اُستادِ محترم ہیں، ہم سب ان سے مشورۂ سخن کرتے ہیں ـــــ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتیں اور پھر کھانے کے بعد شعر و شاعری کا دَور چلا۔ اُستاد ہمارے برابر میں بیٹھے ہوئے تھے اور ہر شاعر کو دِل کھول کر داد دے رہے تھے، کبھی کبھی کسی شعر پر خوش ہوکر شاعر کی پیٹھ بھی تھپ تھپا دیتے۔ ہم نے ایک نظم سنائی تو اُستاد نے خوش ہوکر ہمیں گلے سے لگالیا، ہمارے بعد اُستاد کا نمبر تھا۔ اُستاد کو خاموش دیکھ کر ہم نے نہایت ہی مؤدبانہ انداز میں درخواست کی کہ قبلہ کچھ مرحمت فرمائیں۔ موصوف اپنے آپ کو سچ مچ ہم سب کا اُستاد سمجھنے لگے تھے، ہمیں ڈانٹ دیا، لیکن جب میزبان نے منت سماجت کی تو سنبھل کر بیٹھتے ہوئے کہا کہ یہ سب میرے بچّے ہیں۔ میں ان کی خوشی کے لیے آگیا ہوں۔ پچھلے پندرہ دن میں خدا جھوٹ نہ بلوائے بیس مشاعرے پڑھ چکا ہوا۔ آواز خراب ہوگئی، لیکن چونکہ آپ کی اور ان بچّوں کی خوشی منظور ہے اس لیے چند شعر پیشِ خدمت ہیں۔ یہ کہہ کر اُستاد نے ایک جھرجھری لی، گلا صاف کیا، ایک دو مرکیاں بھریں اور اچانک ہم سے مخاطب ہوئے "عظیم بیٹے، کون سی غزل سناؤں ـــ" ہماری زبان بے ساختہ پھسلی "اُستاد، جگرؔ مرادآبادی کی سُنادو یہ سب اپنے ہی ہیں ـــــ" ہمارا یہ کہنا تھا کہ کمرے میں ایک چھت شگاف قہقہہ بلند ہوا اور اُستاد ہمیں زمانے بھر کی لعن وطعن سُناتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے، وہ دن ہے اور آج کا دن اُستاد ہم سے ابھی تک خفا ہیں۔ سرِ راہے اگر کبھی مل بھی جاتے ہیں تو ہمیں دیکھ کر فوجیوں کی طرح اباؤٹ ٹرن ہوجاتے ہیں یا مُنہ موڑ لیتے ہیں۔

یہی نہیں اب دیکھیے ہمارے ایک ـــــ دوست ہیں جو خیر سے اچھے خاصے تعلیم یافتہ ہیں یعنی ہم سے بھی دو جماعتیں زیادہ پڑھے ہوئے ہیں ـــــ اچھی خاصی تعلیم کے باوجود وہ دوستوں سے آئے دن خفا رہتے ہیں۔ ہم چونکہ ان کی عزّت کرتے ہیں اور انھیں بہت عزیز رکھتے ہیں اس لیے اُن کو فوراً منا لیتے ہیں۔ ایک بار ہم سے ناراض ہوکر ایسے لمبے گئے کہ ہفتوں ہاتھ ہی نہ آئے۔ اُن کو اُن کے ہر ممکنہ ٹھکانے پر ڈھونڈا لیکن کہیں بھی ہتھے نہیں چڑھے۔ ایک دن ہمارے اور اُن کے ایک مشترک دوست نے بتایا کہ وہ اُن سے ملنے جا رہے ہیں، ہمارے مشترک دوست کو پتا نہیں تھا کہ وہ دوست آج کل ہم سے خفا ہیں۔ ہمیں نہ جانے کیا سوجھی کہ اُس مشترک دوست سے کہا کہ میاں تم اُن سے ملو تو ہمارا سلام کہہ دینا اور اُن سے کہنا کہ آج کل عظیم صاحب بہت پریشان ہیں، اُن کا کردان کبوتر چھتری سمیت اُڑ گیا ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ ہمارے مشترک دوست نے ہمارا سلام و پیغام کس طرح پہنچایا اور ہمارے ناراض دوست نے اُن کو کیا جواب دیا لیکن جب ایک دو دِن کے بعد اُن مشترک دوست سے ملاقات ہوئی تو وہ بھی ہم سے ناراض تھے، جب بہت پوچھا تو انھوں نے صرف یہی جواب دیا کہ میں باعزّت اور شریف آدمی ہوں، آپ کو میرے ساتھ اس قسم کا مذاق نہیں کرنا چاہیے تھا، اُس دن مجھے صرف آپ کی وجہ سے صلواتیں سننی پڑیں۔

قارئین، اب آپ ہی بتایئے، ہم تو سیدھے سبھاؤ میں بات کہتے ہیں اور ہمارے دوست خواہ مخواہ ہم سے ناراض ہوجاتے ہیں، زبان بہرحال زبان ہے اگر موقع بے موقع پھسل جائے تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟ کچھ آپ ہی بتایئے ہم کیا کریں؟

فصیح اکمل
۱۱۸، سلمہ منزل، کولی واڑہ، وسائی، تھانہ (مہاراشٹر)

تاریخ ایک سراب

(۱)

زمیں اپنے سب راستوں کی مُحافظ
ہمارے سفر کی حقیقی مُشاہد
وہی جانتی ہے
کہ ہم جو "انا" کے سرابوں میں گُم ہیں
کہاں سے چلے تھے
کہاں جا رہے ہیں

ازل "حرفِ کُن" کا پُر اسرار جادہ
ابد تک ہیولوں کے نقشِ قدم سے
لرزتا رہا ہے
لرزتا رہے گا
اُنا کے حصاروں کے اندر بھی کیا تھا
اُنا کے حصاروں کے باہر بھی کیا ہے
صلیبوں پہ الفاظ لٹکے ہوئے ہیں
خیالوں میں صدیوں سے وہ رن پڑا ہے
کسی سمت جائیں
کسی سمت دیکھیں
ہیولوں کی "برقِ انا" کوندتی ہے

(۲)

زمیں پر ہر اِک عہد میں رزمگاہیں
اُنا کا تصوّر بدلتی رہی ہیں
تماشہ گہہ خیر و شر میں ازل سے
نئی اُلجھنیں بھی مچلتی رہی ہیں
سوالات کی تیز تر آندھیوں میں
"وجودِ بشر" بھی لرزتا رہا ہے
کبھی پتھروں سے نوازا گیا ہے
کبھی سولیوں پر چڑھایا گیا ہے
کبھی حرفِ حق کے تحفّظ کی خاطر
اُسے زہر پی کر بھی ہنسنا پڑا ہے
کبھی ریگزاروں پہ ننگا لٹا کر
بدن کو چٹانوں سے کُچلا گیا ہے
سفر کے مصائب کو "تاریخ" کہہ کر
تسلسل کی زنجیر ڈالی گئی ہے
بدن پر لہو ہو گئی تھی جو چادر
وہ نیزوں پہ پرچم بنالی گئی ہے

(۳)

زمیں کے سفر میں طلسمات ایسے بھی اکثر ملیں گے
کہ جب رزمگاہوں سے لَوٹے ہیں قاتل
چراغوں سے ساری فضا جگمگائی
قصیدوں نے لفظوں کی مالا سجائی
یہ قاتل زمیں پر جہاں رُک گئے ہیں
وہاں زندگی سانس روکے کھڑی ہے
مگر ہم اُنا کی صلیبیں اُٹھائے
خود اپنے لہو میں سراپا نہائے
ستم کو نیا حوصلہ دے رہے ہیں
نئے مقتلوں کا پتا دے رہے ہیں

حبیب الرحمٰن نیازی

قمر مرادآبادی کی شاعری

آج سے تقریباً بارہ سال پہلے میں اپنے پھوپی زاد بھائی سید انوارالحسن نیازی کے ساتھ قمر مرادآبادی سے نیاز حاصل کرنے مرادآباد اُن کے مکان پر حاضر ہوا تھا۔ قمر صاحب بڑے خلوص و محبّت سے ملے اور مجھے اپنی تین تصانیف "شعورِ غم" "کلیاتِ قمر" اور "معراجِ داغ" اپنے صاحبزادے وہاج الحق توقیر سے منگوا کر عنایت کیں۔ بہت کچھ اپنی شاعری کے بارے میں بتایا اور اپنے متفرق اشعار سنائے میری فرمائش پر اپنی مشہور غزل:

ساقیا طنز نہ کر چشمِ کرم رہنے دے
میرے ساغر میں اگر کم ہے تو کم رہنے دے

اپنی آواز میں ٹیپ کروائی اور یہ خواہش ظاہر کی کہ میں اُن کے کلام پر کچھ لکھوں۔ بات آئی گئی ہوگئی وقت کا پہیا گھومتا رہا اور دیکھتے دیکھتے بارہ سال گزر گئے اُن کی خواہش اب پوری کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

قمر مرادآبادی کے ایک شعر سے ہی اس مضمون کا آغاز مناسب ہوگا:

دردِ فرقت نے بہت ساتھ دیا میرا قمر
ورنہ اس دور میں مشکل تھا غزل خواں ہونا

"دردِ فرقت" کا یہی احساس اُن کی غزلوں میں نمایاں ہے۔ اُن کے ایک مجموعۂ کلام کا نام "شعورِ غم" ہے یہ شعورِ غم ہی اُن کی غزلوں کا محرک ہے۔

غزل میں اگر سوز و گداز، دروں بینی اور رمزیت نہ ہو تو وہ محض "تُک بندی" ہو کر رہ جاتی ہے، غزل کی ہیئت میں شعر کہہ دینا کوئی مشکل کام نہیں۔ لیکن غزل کے مزاج پر کھرا اُترنے والا شعر کہنا آسان کام نہیں، اس کے لیے ضروری ہے کہ شاعر نے اپنی زندگی کے واقعات، حادثات اور تجربات کو جذبہ کی آگ میں تپا کر نکھارا ہو۔ تجربات میں خلوص اور صداقت ہو اور خود اُسے شاعر نے شدّت سے محسوس کیا ہو تجربات کا خلوص ہی تاثیر کا ضامن ہے۔ تجربات جب جذبات کی شکل اختیار کر لیتے ہیں تو اُن کے اظہار کے لیے مناسب الفاظ، تشبیہا استعارات اور علامتوں کی تلاش ہوتی ہے۔

قمر مرادآبادی کے اشعار میں زبان و بیان صاف، سیدھا، رواں، سلیس اور عام فہم ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ اُن کے دل و دماغ اور جذبات میں کہیں اُلجھاؤ نہیں ہے کیونکہ جب جذبات پاک و صاف نہ ہوں گے تو طرزِ ادا میں بھی پیچیدگی ہوگی۔ پیچیدگی اور مشکل گوئی کا ایک سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ شاعر کے تجربات میں خلوص کی کمی ہو۔ قمر مرادآبادی کی غزلوں میں جو صفائی و سادگی پائی جاتی ہے اس سے اُن کے خلوص کی نشاندہی ہوتی ہے اسی خصوصیت کی وجہ سے اُن کے اشعار ضرب المثل یا محاوروں کی طرح ذہن میں جگہ کر لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

آپ جس دن سے گئے دل کا عجب عالم ہے
ہم نہ بستی کے رہے اور نہ ویرانے کے

گردشِ وقت سے گھبرا کے نہ پینا اے دوست
جام میں تلخیِ ایام بھی آجائے گی

مر بھی جائیں گے کسی روز محبت میں قمر
زندگی ہے تو کبھی کام بھی آجائے گی

نکل آتے ہیں ذکرِ دل پہ آنسو
ابھی مجھ کو شعورِ غم نہیں ہے

غزل میں لطافت و شیرینیِ حسنِ بیان کی محتاج ہے لیکن صرف حسنِ بیان غزل کے اشعار کی کامیابی اور تاثیر کے لیے کافی نہیں اس کے لیے خونِ جگر کی ضرورت ہوتی ہے اس خونِ جگر کا تعلق عرفانِ غم سے ہے۔ غزل گو شاعر کا قنوطی یا یاسیت پرست ہونا ضروری نہیں لیکن اس کے لیے غم شناس ہونا نہایت ضروری ہے۔ قمر مرادآبادی "غم پرست" نہیں ہیں بلکہ "غم شناس" ہیں شاید انھیں یہ احساس ہے کہ غم زندگی کا بنیادی جذبہ ہے وہ سکونِ دل کی دعا تو کرتے ہیں لیکن یہ چاہتے ہیں کہ دعا میں اثر نہ ہو انھیں یہ بھی احساس ہے کہ پیہم شکستگی سے ہی زندگی سنورتی ہے اور جب تک دامن چاک نہ ہو جنوں معتبر نہیں ہوتا۔ اُن کی غزل کے اسی بنیادی جذبے کا عکس اُن کے اشعار میں

شعبۂ اُردو، گورنمنٹ کالج، سوائی مادھوپور (راجستھان)

ہر جگہ جاری و ساری ہے :

پیہم شکستگی سے سنورتی ہے زندگی
دامن نہ چاک ہو تو جنوں معتبر نہ ہو

اپنے سکونِ دل کی دُعا کر رہا ہوں میں
اور یہ بھی چاہتا ہوں دُعا میں اثر نہ ہو

اِک دردِ مستقل نے سنواری ہے زندگی
یہ لذّتیں کہاں تھیں غمِ گاہ گاہ میں

شمع نے لَو دی تو پروانے بنے
سوزِ غم بھڑکا تو افسانے بنے

مانا غمِ کونین بڑی چیز ہے لیکن
اس میں وہ سرورِ غمِ جاناں تو نہیں ہے

غزل اظہارِ ذات کا وسیلہ ہے اس میں انسان اپنی نجی، داخلی اور اندرونی کیفیات کو پیش کرتا ہے یہ اظہارِ ذات خارجی واقعات اور حادثات ہی کا ردِّ عمل ہوتا ہے اس طرح غزل میں ذات اور کائنات دونوں کے مسائل ہوتے ہیں۔ غزل گو شاعر حُسنِ ظاہر کو اپنی حسنِ نظر کا کرشمہ قرار دیتا ہے اور حُسنِ باطن کو بھی اپنے حُسنِ خیالات کا عکس سمجھتا ہے قمر مرادآبادی بھی اسی نقطۂ نظر کو پیش کرتے ہیں :

حُسنِ ظاہر ہے قمر میری نظر کا صدقہ
حُسنِ باطن بھی مرے حُسنِ خیالات سے ہے

قمر مرادآبادی کے تصورِ حسن و عشق میں نہ تو حد درجہ ارضیت اور لذّتیت ہے اور نہ ضرورت سے زیادہ ماورائیت ہے بلکہ ایک سنبھلی ہوئی شائستہ اور مہذب رومانیت پائی جاتی ہے جس میں احساسِ غم کی فراوانی ہے۔ اُن کی غزلوں میں تصوف اور فلسفے کے پیچیدہ مسائل نہیں کے برابر ہیں کیوں کہ غزل منطقی و مدلّل بیانات کی متحمل نہیں ہوتی اس لیے جہاں فلسفیانہ مسائل غزل میں آتے ہیں وہاں اکثر قوتِ تاثیر کم ہو جاتی ہے یا تغزل کی چاشنی کھو جاتی ہے۔ غزل کا ہر شعر ایک جذبے ایک تصوّر اور ایک خیال کی مکمل اکائی ہے جس کا اظہار اشاراتی اور رمزیاتی اندازِ بیان کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غزل پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ اس میں فکری و سماجی مسائل کی کمی ہے اور اس میں چند مخصوص خیالات کی تکرار پائی جاتی ہے۔ یہ تکرار ایک حد تک ناگزیر ہے کیوں کہ غزل گو شاعر کے بنیادی جذبات بھی ویسے ہی ہوتے ہیں جیسے عام انسانوں میں پائے جاتے ہیں۔ مادی حالات کی سخت گیریاں، ہجر و وصال کی آزمائشیں، خوشی و غم کی بارشیں، عروج و زوال کی گردشیں شاعر کے حصّے میں بھی بالکل اُسی طرح آتی ہیں جس طرح ایک عام آدمی کے لیکن شاعر کو خدا نے زیادہ حساس طبیعت دی ہے اور پھر وہ اپنے احساسات کو اشعار میں ڈھالنے کی قدرت بھی رکھتا ہے۔ وقت کی کروٹیں ادب اور شاعری میں بھی تبدیلیاں پیدا کرتی ہیں۔ محبوب کے حُسن کا تصوّر گو آج بھی وہی ہے جو صدیوں پہلے وجود میں آیا تھا لیکن علامتیں تبدیل ہو گئی ہیں استعارے بدل گئے ہیں نئی تشبیہات اور نئے پیکر وجود میں آگئے ہیں یہاں تک کہ قدیم علامتوں کے معنی و مفہوم میں بھی تبدیلی اور وسعت آگئی ہے اس پس منظر میں اگر قمر مرادآبادی کی غزلوں کا جائزہ لیا جائے تو پتا چلے گا کہ آپ نے تشبیہات، استعارات اور علامتوں کا استعمال قدیم روایتی انداز میں ہی کیا ہے لیکن اُن کے معنی و مفہوم میں جدّت و ندرت پیدا کی ہے۔ مثال کے طور پر اجتماعیت اور انفرادیت کی کشمکش جو جدید دَور کا ایک اہم مسئلہ ہے اس کے لیے قمر مرادآبادی نے گلشن اور آشیاں کے تمثیلی الفاظ کا استعمال بڑی خوبی سے کیا ہے۔ یہ شعر ملاحظہ کیجیے :

ذکرِ گلشن پر خفا ہونے لگے
وہ یہ سمجھے آشیاں کی بات ہے

ایک دوسرے شعر میں باغباں اور رنگِ بہاراں کی تمثیل سے نئے معنی پیدا کیے ہیں جس میں جدّت و ندرت بھی ہے اور رمزیت کا کمال بھی :

نکھار اتنا نہ دے اے باغباں رنگِ بہاراں کو
ہمارے خون کی سرخی اُبھر آئی تو کیا ہوگا

قمر مرادآبادی نے غزلوں کے علاوہ نظمیں اور قطعات بھی لکھے ہیں لیکن قمر مرادآبادی بنیادی طور پر غزل گو شاعر ہیں اس لیے اُن کی نظموں میں بھی غزل کا رنگ و آہنگ صاف دکھائی دیتا ہے اور خوشنما تراکیب سے اُن کی نظمیں آراستہ نظر آتی ہیں اُن کی نظم امام الہند کے یہ اشعار دیکھیے :

حادثاتِ زندگی کا رُخ بدلنے کے لیے
ایک انساں گردشِ دوراں سے ٹکراتا رہا
اُس نے ساحل پر کھڑے ہو کر نہ دیکھا موج کو
بلکہ طوفاں بن کے طوفانوں سے ٹکراتا رہا
ایک دل تھا جس پہ ہر مشقِ ستم ہوتی رہی
ایک شیشہ تھا کہ ہر پتھر سے ٹکراتا رہا
غم کے دیوانوں کو بھی درسِ جنوں بخشا گیا
لیلیٰ مقصود کے گیسو بھی سلجھاتا رہا

ان اشعار میں گردشِ دوراں سے ٹکرانا، طوفانوں سے کھیلنا، دل پر مشقِ ستم ہونا، شیشہ کا پتھر سے ٹکرانا، دیوانوں کو درسِ جنوں دینا وغیرہ یہ تمام تراکیب اور اندازِ بیان تغزل کی چاشنی لیے ہوتے ہے۔ اسی طرح پنڈت جواہر لال نہرو کی وفات پر ایک نظم "آہ نہرو" کے عنوان سے کہی ہے اس نظم کی بھی یہی خصوصیت ہے کہ اس میں غزل کی لے صاف سنائی دیتی ہے۔ بلبلیں اور آشیاں، پھول اور گلستاں، کارواں اور امیرِ کارواں، نسیمِ خوشگوار، اور غمِ روزگار جیسے الفاظ اس نظم میں تغزل اور موسیقیت کو برقرار رکھتے ہیں:

اے جواہر لال اے لعل و جواہر کے جہاں
تیری ہستی تھی وقار و عظمتِ ہندوستاں
بلبلیں کیوں کر نہ ہوں تیرے الم میں نوحہ خواں
تیرے دامن میں اماں پاتے تھے لاکھوں آشیاں
خاک سے تیری نئی دنیا بسائی جائے گی
تیرے پھولوں سے سجایا جائے گا اک گلستاں
قلت و کثرت کا مجموعہ تھا تیری زندگی
کارواں تجھ کو کہوں میں یا امیرِ کارواں

قمر مرادآبادی کی نظم "جانِ غزل" فیض احمد فیض کی نظم "مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ" کے رنگ میں کہی گئی ہے نفسِ مضمون کے اعتبار سے دونوں نظموں میں مماثلت نظر آتی ہے لیکن اندازِ بیان کے لحاظ سے قمر مرادآبادی کی نظم پر تغزل کا زیادہ گہرا سایہ ہے۔ یہ دو بند دیکھیے:

چشمِ میگوں میں لرزتی ہوئی یہ موجِ شراب
جیسے اک شاعرِ رنگیں کے خیالوں میں غزل
یہ مچلتا ہوا آغوشِ جوانی میں شباب
جیسے بیتاب ہو دل عشق میں اول اول
دوشِ نازک پہ یہ کاکلِ رُخِ رنگیں پہ نقاب
ہلکے ہلکے ہوں شبِ ماہ میں جیسے بادل
دل کی باتوں میں نہ آ اپنے ارادے نہ بدل
تو ابھی راہِ محبت میں مرے ساتھ نہ چل

اُف یہ بے رحم جہاں، ہائے یہ بے درد سماج
آج معصوم خیالوں کی کوئی قدر نہیں
جذبۂ مہر و وفا موردِ الزام ہے آج
دل کے خاموش سوالوں کی کوئی قدر نہیں
زندگی کا ہے ابھی تک وہی فرسودہ رواج
موت سے کھیلنے والوں کی کوئی قدر نہیں
تو ابھی پردۂ احساس سے باہر نہ نکل
تو ابھی راہِ محبت میں مرے ساتھ نہ چل

قمر مرادآبادی کی نظمیں عصری آگہی اور عصری تقاضوں کی بھی نمائندگی کرتی ہیں۔ چین کا حملہ، نیا انقلاب، درسِ آزادی، دار و رسن، عید، آج کل، مفہومِ حیات، میرا وطن وغیرہ ایسی ہی نظمیں ہیں جن میں وقت کی دھڑکنیں صاف سنائی دیتی ہیں۔ غزلوں اور نظموں کی طرح قمر مرادآبادی کی نعت گوئی بھی متاعِ فکر و نظر ہے۔ خصوصاً "قصیدۂ نعت مع مناجات" کے عنوان سے انھوں نے جو نعت کہی ہے وہ محسن کاکوروی کی نعت "سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل" کی یاد دلاتی ہے اس نعت کا مطلع ہے:

اٹھ کے بت خانے سے کعبہ کو چلا ہے بادل
اتحادِ حرم و دیر میں سرشارِ عمل

اس مطلعے کو دیکھ کر یہ پتا چلتا ہے کہ قمر مرادآبادی نے محسن کاکوروی کی طرح اپنی نعت میں ہند ایرانی تہذیب کی ہم آہنگی کو مدِنظر رکھا ہے۔ اس قصیدۂ نعت کے چند اشعار اور دیکھیے:

ناز یہ ہے کہ چلا ہے درِ محبوبؐ کی سمت
اس کی نظروں میں نہیں اس کی تمنا کا بدل
میں یہ کہتا ہوں کہ اس درجہ بھی مغرور نہ ہو
سوئے طیبہ جو چلا ہے تو ذرا ہوش میں چل
ہو نہ جائیں یہ قدم حدِ ادب سے باہر
ہوش کی پی، ذرا رفتار کے انداز بدل

نعتوں کے علاوہ کلیاتِ قمر میں چند منقبتیں بھی ملتی ہیں۔ پہلی منقبت حضرت سجادؓ کی شان میں ہے اس کے بعد یومِ پیدائش حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ، حضرت فاروقِ اعظمؓ، حضرت عمرؓ، غمِ حسین وغیرہ کے عنوان سے منقبتیں ہیں۔ قمر مرادآبادی کی نعت گوئی اور منقبت گوئی کی یہ خوبی ہے کہ اس میں قرآنی آیات اور احادیث کو نہایت چابکدستی اور روانی سے نظم کیا گیا ہے اور ہر جگہ تغزل کو برقرار رکھا ہے۔

اعتذار

پریس کی غلطی سے پچھلے شمارے میں جناب تاباں نقوی کی جگہ وحید صدیقی صاحب کی اور وحید صاحب کی جگہ تاباں صاحب کی تصویر چھپ گئی ہے، اس کے لیے ہم اپنے دونوں قلمکاروں سے معذرت خواہ ہیں۔

—— ادارہ

اقبال نیازی

ابُو خاں کی نئی بکری

یہ ایک تمثیلی کہانی ہے۔ جو ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی اصل کہانی کی طرح بالکل سادہ انداز میں لکھی گئی ہے لیکن اس میں معاشرے کے ایک مسئلے کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے۔ کیا آپ کو نہیں لگتا کہ ہمارے معاشرے میں اپنی مجبوریوں اور بے بسی سے لڑتا ہوا ہر وہ شخص جو اپنی بچی کے لیے اچھے اور معقول رشتے کی تلاش میں ہے وہ ایک ابُو خاں ہے اور ایسی سینکڑوں ہزاروں لڑکیاں جو رشتے کے لیے بیٹھی ہیں وہ سب ابُو خاں کی بکریاں ہیں ؟

چاندنی کی موت نے ابو خاں کو اچانک ہی بہت بوڑھا کر دیا تھا۔

کمر جھک کر کمان ہو گئی تھی۔ بھنووں اور سر کے بالوں میں سفیدی جھلکنے لگی تھی۔ جھریوں نے چہرے پر اپنے پنجے گاڑ دیے تھے۔

اکثر رات میں ابو خاں گھر کے باہر چارپائی پر پڑے پڑے ان پہاڑیوں کو ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہتے جہاں پر چاندنی اس خونخوار بھیڑیے سے لڑتے ہوئے ماری گئی تھی۔ ان کی آنکھیں ڈبڈبا جاتیں... پھوٹ پھوٹ کر رونے کو دل چاہتا اُن کا... کیوں گئی تھی چاندنی...؟ رسّی تڑا کر...؟ کس چیز کی کمی تھی یہاں...؟ کیا میں اس کی ٹھیک پرورش نہیں کر رہا تھا؟ اس کا خیال نہیں رکھتا تھا...؟ اُسے یہاں کھانے پینے کی کمی تھی...؟ پھر کیوں...؟ کتنی لمبی تو کر دی تھی میں نے اُس کی رسّی... پھر بھی آزادی کا اتنا چسکا...؟ رسّی تڑا کر بھاگ گئی...؟ کیوں؟ کیا مِلا آخر... کیا مِلا...؟" اپنے آپ بڑبڑاتے اور روتے ہوئے ابو خاں وہیں سو جاتے... اور پھر وہی خواب... جو اکثر دیکھتے... چاندنی بھاگتی ہوئی ان پہاڑوں سے نکل کر واپس اُن کی کٹیا کی طرف آرہی ہے۔ تیز اور تیز... اور وہ بھی باہیں پھیلائے اس کی طرف بڑھ رہے ہیں... چاندنی زور زور سے چلّا رہی ہے۔ اور اس کے پیچھے ایک نہیں بے شمار خونخوار بھیڑیے لگے ہیں... چاندنی اور اُن خوفناک بھیڑیوں کا درمیانی فاصلہ کم ہوتا جارہا ہے... کم... اور کم... اور ان کی آنکھ کھُل جاتی۔ سارا جسم پسینے سے شرابور ہوتا... زبان سوکھے پتّے کی مانند لرزنے لگتی۔ وہ جھٹ اُٹھ کر اندر کٹیا میں جاتے اور اُس کونے کو دیکھتے جہاں ببلی بندھی ہوئی تھی اُسے اپنی جگہ کھونٹے سے بندھا دیکھ کر انھیں اطمینان ہوتا... ببلی بھی آہٹ پاکر چونک کر سر اٹھاتی اور سامنے ابو خاں کو دیکھ کر پھر خاموشی سے سر جھکائے سو جاتی... اور ابو خاں گھڑے سے ایک ڈونگا پانی نکال کر گلاس میں ڈالتے اور پی کر رب کا شکر ادا کرتے اور واپس آکر اپنی چارپائی پر لیٹ جاتے۔

چاندنی کے جانے کے بعد ابو خاں بہت اکیلے ہو گئے تھے۔ چاندنی انھیں رہ رہ کر یاد آتی۔ ان کا دل گھبرانے لگتا تھا۔ اور ایک دن ایک بکروالے سے انھوں نے ببلی کو خرید لیا... جب ببلی کو ابو خاں گھر لائے تب وہ بہت چھوٹی تھی بالکل چاندنی کی طرح، خوبصورت نرم و نازک، سفید دودھ جیسے بالوں والی... چاندنی ہی کی طرح ببلی کو بھی ابو خاں نے بہت لاڈ پیار سے پالا تھا اور اب تو وہ کافی بڑی ہو گئی تھی...

چاندنی کے جانے کے بعد ابو خاں بہت محتاط ہو گئے تھے... وہ نہیں چاہتے تھے کہ ببلی بھی اسی طرح رسّی تڑا کر بھاگ جائے اس لیے انھوں نے کٹیا کے اندر ہی ایک مضبوط کھونٹے سے رسّی کی بجائے لوہے کی پتلی زنجیر ببلی کے پیروں میں ڈال کر اُسے باندھ رکھا تھا۔ لیکن روز شام میں اس کی زنجیر کھول کر اُسے اپنے ساتھ لے کر باہر سیر کرنے بھی جاتے اور رات میں پھر اس کے پیروں میں زنجیر ڈال کر خود کٹیا کے باہر سوتے تھے اور ذرا سی آہٹ پر اُن کی آنکھ کھُل جاتی اور وہ فوراً اندر جاکر ببلی کو دیکھتے... اور ببلی کو زنجیر سے بندھا سوتا دیکھ کر انھیں اطمینان ہوتا... وہ گھڑے سے ایک ڈونگا پانی نکالتے گلاس میں ڈال کر پیتے۔ رب کا شکر ادا کرتے اور واپس آکر اپنی چارپائی پر پڑ جاتے۔ لیکن انھیں اس بات کا پتہ بھی نہ چلتا کہ جس ببلی کو وہ سوتا ہوا سمجھ کر اطمینان کی سانس لے کر باہر چلے جاتے ہیں۔ وہی ببلی ان کے باہر جاتے ہی بڑی احتیاط سے دھیرے سے اپنا سر اُٹھا کر باہر

۱۸/۲۰، غرائب حسین ہاؤس، قریش نگر، کرلا (ایسٹ) بمبئی ۴۰۰۰۷۰

ازے کی طرف دیکھتی اور کچھ دیر بعد اپنے
ں میں ہی مُنہ چھپا کر پھر لیٹ جاتی۔
ابوخاں نے بَبلی کے پیروں کی زنجیر بھی
رنی کی طرح بہت بڑی رکھی تھی تاکہ وہ آرام
وری کُٹیا میں گھوم پھر سکے۔۔۔ لیکن کچھ
ں سے ابوخاں کو ایسا لگ رہا تھا جیسے خود
کے پیروں میں کسی نے بیڑیاں ڈال دی ہیں
ن بہ دن تنگ ہوتی جارہی ہیں بڑھاپے
سبب ان کا بدن لاغر ہوتا جارہا تھا" اب
ے جسم میں اتنی طاقت نہیں رہی تھی کہ وہ
ن کام کرسکیں۔۔۔ چلتے تھے تو پیروں میں
پاہٹ آتی تھی۔۔۔ کئی بار تو کُٹیا میں ہی
ر گر بھی چکے تھے۔۔۔ اور جب وہ گرے
و بَبلی دوڑ کر اُن کے پاس پہنچ گئی تھی اور
تی سے اُن کے پیروں پر زبان پھیرنے لگی
۔۔۔ ابوخاں کی آنکھیں چھلک پڑیں اور
ل کو گلے لگا کر بے تحاشا چومتے اور روتے
تے کہتے۔۔۔ "بَبلی۔۔۔ اب میں زیادہ
ہیں جی سکوں گا۔ میرے بعد تیرا کیا ہوگا
؟ میری بچّی۔۔۔ تو کہاں جائے گی۔۔۔؟
کھائے گی۔۔۔؟" بے زبان ببلی کی آنکھوں
رشتے نم ہوجاتے اور ابوخاں دیر تک اُس
گلے لگ کر روتے رہتے۔

ابوخاں کچھ دنوں تک تو جیسے تیسے اپنا
لی کا پیٹ بھرتے رہے، لیکن ایک وقت
بھی آیا کہ جب گھر میں فاقے کی نوبت آگئی۔
ال خود دار آدمی تھے، کسی کے آگے ہاتھ
انا نہیں چاہتے تھے۔۔۔ بَبلی کے لیے
ھ لانے کی اب اُن میں ہمّت نہیں رہی تھی۔
لے چرواہوں سے انھوں نے بات بھی کی
اسے روزانہ لے جایا کرو اور اسے چرا کر
یہاں چھوڑ جایا کرو لیکن اس کام کے لیے انھوں
نے ابوخاں سے بہت زیادہ پیسے مانگے اور
ابوخاں کے پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔۔۔
چارہ نہ ملنے کے سبب یا پتہ نہیں کس فکر میں
گھُل کر بَبلی دن بہ دن سوکھتی جارہی تھی، اُس
کی رنگت پھیکی پڑ گئی تھی۔ سفید چمکدار نرم
بال اپنی کشش کھونے لگے تھے۔ بے چاری
بے زبان بھوکی رہتی لیکن احتجاج کی ہلکی سی
آواز بھی مُنہ سے نہ نکالتی اس اُمید پر کہ آج
نہیں تو کل کچھ نہ کچھ انتظام ہوجائے گا۔ ابّو بابا
ضرور کوئی راستہ نکالیں گے اور اُس دن تو اُسے
بڑی اُمید بندھ گئی تھی جب اُس نے ابّو بابا کو
ایک گوالے سے بات کرتے دیکھا۔

"سُنو بابو۔۔۔ میری بَبلی کو تم لے جاؤ۔
میں اسے تمہارے سپرد کرتا ہوں، میں اپنا پیٹ
ہی نہیں بھر پا رہا ہوں، اس غریب بے چاری
بے زبان کو میں اس طرح تل تل نہیں مار سکتا۔
تم اسے لے جاؤ بیٹا۔۔۔ آج سے یہ تمہاری
ہوئی۔۔۔" ابوخاں نے گلوگیر لہجے میں گوالے سے
کہا، گوالے نے پہلے تو ایک نظر ببلی پر ڈالی اُسے
نظروں نظروں میں تولا، پرکھا اور پھر حقارت
سے بولا۔۔۔ "یہ تو سوکھ کر چرمرخ ہوگئی ہے۔۔۔
ابوخاں! یہ دودھ وودھ کیا دے گی؟ اگر
اچھی تندرست ہوتی جس سے ڈھائی تین سیر
دُودھ کم از کم روزانہ مل جاتا تو میں ضرور لے جاتا۔"

"لیکن سُن تو بیٹا۔۔۔"

"نہیں ابوخاں۔۔۔" گوالے نے ابوخاں
کی بات درمیان ہی میں کاٹ کر بے پروائی سے کہا۔

"ویسے بھی میری اپنی بکریاں بہت ہیں،
ان کو ہی سنبھالنا مشکل ہو رہا ہے۔ میں اسے لے
کر کیا کروں گا اسے کہاں سے کھلاؤں گا پلاؤں گا"

ابوخاں کا چہرہ اُتر گیا۔۔۔ انھوں نے
بڑی حسرت سے بَبلی کی طرف دیکھا ببلی نے انجان
بن کر نظریں چُرالیں اور زبردستی زمین پر پڑے
چند تنکوں کو سونگھنے لگی۔

اس رات ابوخاں ٹھیک سے سو نہیں
پائے۔۔۔

اور پھر تو یہ اُن کا روز کا معمول ہوگیا تھا
کہ وہ بَبلی کے لیے لوگوں سے بات کرتے، اُسے
ان کے پاس سے لے جانے کے لیے منّت کرتے
اور بَبلی کو لینے کے خواہش مند لوگ آتے اور ببلی
کی حالت دیکھ کر انکار کرکے لوٹ جاتے۔ کوئی
بَبلی کو مُفت میں لے جانے کے لیے بھی تیار نہ
تھا کہ خواہ مخواہ چارہ پانی دینا پڑے گا اور بدلے
میں اتنا دودھ بھی نہیں ملے گا جتنا ملنا چاہیے۔
اور پھر ابوخاں کی یہ شرط بھی تھی کہ تم اسے جان
سے مار کر اپنے مُنہ کا نوالہ نہیں بناؤ گے۔ تو آخر
بَبلی کو کون لے جاتا۔۔۔؟

رات میں چارپائی پر لیٹے۔۔۔ پہاڑیوں
کی طرف نظریں جمائے ابوخاں سوچ رہے تھے
۔۔۔ اچھا ہی کیا چاندنی نے، جو رسّی تڑا کر بھاگ
گئی۔ آج کم از کم ان مصیبتوں کا سامنا تو اسے
نہیں کرنا پڑ رہا ہے جن کو معصوم ببلی جھیل رہی
ہے۔۔۔ اسے آزادی چاہیے تھی۔۔۔ اور یہ۔۔۔
یہ بَبلی۔۔۔ یہ نہ جانے کیسی بکری ہے جو سدا قید
رہنا چاہتی ہے۔ اتنی لمبی زنجیر کے باوجود کُٹیا
میں نہیں ٹہلتی، بس ایک کونے میں خاموشی سے
پڑی رہتی ہے۔۔۔ آزادی حاصل کرنے کے
لیے کبھی کوئی جدّوجہد نہیں کرتی۔۔۔ ایک
خیال۔۔۔ بس اچانک ہی ایک خیال ابوخاں
کے ذہن میں آیا۔۔۔ رات کا آخری پہر تھا۔۔۔
وہ خاموشی سے اُٹھے۔۔۔ اندر کُٹیا میں گئے۔۔۔

اقبال نیازی

ابوخاں کی نئی بکری

یہ ایک تمثیلی کہانی ہے۔ جو ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی اصل کہانی کی طرح بالکل سادہ انداز میں لکھی گئی ہے لیکن اس میں معاشرے کے ایک مسئلے کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے۔ کیا آپ کو نہیں لگتا کہ ہمارے معاشرے میں اپنی مجبوریوں اور بے بسی سے لڑتا ہوا ہر وہ شخص جو اپنی بچّی کے لیے اچھے اور معقول رشتے کی تلاش میں ہے وہ ایک ابوخاں ہے اور ایسی سینکڑوں ہزاروں لڑکیاں جو رشتے کے لیے بیٹھی ہیں وہ سب ابوخاں کی بکریاں ہیں؟

چاندنی کی موت نے ابوخاں کو اچانک ہی بہت بوڑھا کر دیا تھا۔

کمر جھک کر کمان ہوگئی تھی۔ بھنوؤں اور سر کے بالوں میں سفیدی جھلکنے لگی تھی۔ جھریوں نے چہرے پر اپنے پنجے گاڑ دیے تھے۔

اکثر رات میں ابوخاں گھر کے باہر چارپائی پر پڑے پڑے ان پہاڑیوں کو ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہتے جہاں پر چاندنی اس خونخوار بھیڑیے سے لڑتے ہوئے ماری گئی تھی۔ ان کی آنکھیں ڈبڈبا جاتیں۔۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے کو دل چاہتا اُن کا۔۔ کیوں گئی تھی چاندنی۔۔۔؟ رسّی تڑا کر۔۔۔؟ کس چیز کی کمی تھی یہاں۔۔۔؟ کیا میں اس کی ٹھیک سے پرورش نہیں کر رہا تھا؟ اس کا خیال نہیں رکھتا تھا۔۔۔؟ اُسے یہاں کھانے پینے کی کمی تھی۔۔؟ پھر کیوں۔۔۔؟ کتنی لمبی تو کر دی تھی میں نے اُس کی رسّی۔۔ پھر بھی آزادی کا اتنا چسکا۔۔؟ رسّی تڑا کر بھاگ گئی۔۔۔ کیوں؟ کیا ملا آخر۔۔ کیا ملا۔۔۔؟" اپنے آپ بڑبڑاتے اور روتے ہوئے ابوخاں وہیں سو جاتے۔۔۔ اور پھر وہی خواب۔۔۔ جو اکثر دیکھتے۔۔۔ چاندنی بھاگتی ہوئی ان پہاڑوں سے نکل کر واپس اُن کی کُٹیا کی طرف آ رہی ہے۔ تیز اور تیز۔۔۔ اور وہ بھی باہیں پھیلائے اس کی طرف بڑھ رہے ہیں۔۔۔ چاندنی زور زور سے چلّا رہی ہے۔ اور اس کے پیچھے ایک نہیں بے شمار خونخوار بھیڑیے لگے ہیں۔۔۔ چاندنی اور اُن خوفناک بھیڑیوں کا درمیانی فاصلہ کم ہوتا جا رہا ہے۔۔۔ کم۔۔۔ اور کم۔۔۔ اور ان کی آنکھ کُھل جاتی۔ سارا جسم پسینے سے شرابور ہوتا۔۔۔ زبان سوکھے پتّے کی مانند لرزنے لگتی۔ وہ جھٹ اُٹھ کر اندر کُٹیا میں جاتے اور اُس کونے کو دیکھتے جہاں بیلی بندھی ہوئی تھی اُسے اپنی جگہ کھونٹے سے بندھا دیکھ کر انھیں اطمینان ہوتا۔۔۔ بیلی بھی آہٹ پاکر چونک کر سر اٹھاتی اور سامنے ابوخاں کو دیکھ کر پھر خاموشی سے سر جھکائے سو جاتی۔۔۔ اور ابوخاں گھڑے سے ایک ڈونگا پانی نکال کر گلاس میں ڈالتے اور پی کر رب کا شکر ادا کرتے اور واپس آکر اپنی چارپائی پر لیٹ جاتے۔

چاندنی کے جانے کے بعد ابوخاں بہت اکیلے ہوگئے تھے۔ چاندنی انھیں رہ رہ کر یاد آتی۔ ان کا دل گھبرانے لگتا تھا۔ اور ایک دن ایک چرواہے سے انھوں نے بیلی کو خرید لیا۔۔۔ جب بیلی کو ابوخاں گھر لائے تب وہ بہت چھوٹی تھی بالکل چاندنی کی طرح، خوبصورت نرم و نازک، سفید دودھ جیسے بالوں والی۔۔۔ چاندنی ہی کی طرح بیلی کو بھی ابوخاں نے بہت لاڈ پیار سے پالا تھا اور اب تو وہ کافی بڑی ہوگئی تھی۔۔۔

چاندنی کے جانے کے بعد ابوخاں بہت محتاط ہوگئے تھے۔۔۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ بیلی بھی اسی طرح رسی تڑا کر بھاگ جائے اس لیے انھوں نے کُٹیا کے اندر ہی ایک مضبوط کھونٹے سے رسی کی بجائے لوہے کی پتلی زنجیر بیلی کے پیروں میں ڈال کر اُسے باندھ رکھا تھا۔ لیکن روز شام میں اس کی زنجیر کھول کر اُسے اپنے ساتھ لے کر باہر سیر کرنے بھی جاتے اور رات میں پھر اس کے پیروں میں زنجیر ڈال کر خود کُٹیا کے باہر سوتے تھے اور ذرا سی آہٹ پر اُن کی آنکھ کُھل جاتی اور وہ فوراً اندر جاکر بیلی کو دیکھتے۔۔۔ اور بیلی کو زنجیر سے بندھا سوتا دیکھ کر انھیں اطمینان ہوتا۔۔۔ وہ گھڑے سے ایک ڈونگا پانی نکالتے گلاس میں ڈال کر پیتے۔ رب کا شکر ادا کرتے اور واپس آکر اپنی چارپائی پر پڑ جاتے۔ لیکن انھیں اس بات کا پتہ بھی نہ چلتا کہ جس بیلی کو وہ سوتا ہوا سمجھ کر اطمینان کی سانس لے کر باہر چلے جاتے ہیں۔ وہی بیلی ان کے باہر جاتے ہی بڑی احتیاط سے دھیرے سے اپنا سر اُٹھا کر باہر

۱۸/۳۰۔ غزالہ حسین ہاؤس، قریش نگر، کرلا ایسٹ، بمبئی ۴۰۰۰۷۰

روازے کی طرف دیکھتی اور کچھ دیر بعد اپنے
روں میں ہی منہ چھپا کر پھر لیٹ جاتی۔

ابوخاں نے ببلی کے پیروں کی زنجیر بھی
ندنی کی طرح بہت بڑی رکھی تھی تاکہ وہ آرام
پوری کٹیا میں گھوم پھر سکے۔ . . لیکن کچھ
ں سے ابوخاں کو ایسا لگ رہا تھا جیسے خود
کے پیروں میں کسی نے بیڑیاں ڈال دی ہیں
دن بہ دن تنگ ہوتی جا رہی ہیں۔ بڑھاپے
ے سبب ان کا بدن لاغر ہوتا جا رہا تھا" اب
ئے جسم میں اتنی طاقت نہیں رہی تھی کہ وہ
ئی کام کر سکیں۔ . . چلتے تھے تو پیروں میں
بلاہٹ آتی تھی۔ . . کئی بار تو کٹیا میں ہی
ڑا کر گر بھی چکے تھے۔ . . اور جب وہ گرے
تو ببلی دوڑ کر اُن کے پاس پہنچ گئی تھی اور
موشی سے اُن کے پیروں پر زبان پھیرنے لگی
ں۔ . . ابوخاں کی آنکھیں چھلک پڑیں اور
ببلی کو گلے لگا کر بے تحاشا چومتے اور روتے
تے کہتے۔ . . "ببلی . . . اب میں زیادہ
ن نہیں جی سکوں گا۔ میرے بعد تیرا کیا ہو گا
ں؟ میری بچی۔ . . تو کہاں جائے گی . . . ؟
یا کھائے گی . . . ؟" بے زبان ببلی کی آنکھوں
گوشے نم ہو جاتے اور ابوخاں دیر تک اُس
کے گلے لگ کر روتے رہتے۔

ابوخاں کچھ دنوں تک تو جیسے تیسے اپنا
ببلی کا پیٹ بھرتے رہے، لیکن ایک وقت
ا بھی آیا کہ جب گھر میں فاقے کی نوبت آگئی۔
خاں خوددار آدمی تھے، کسی کے آگے ہاتھ
پھیلانا نہیں چاہتے تھے۔ . . ببلی کے لیے
چارہ لانے کی اب اُن میں ہمت نہیں رہی تھی۔
ایک چرواہوں سے انھوں نے بات بھی کی
تم اسے روزانہ لے جایا کرو اور اسے چرا کر
یہاں چھوڑ جایا کرو لیکن اس کام کے لیے انھوں
نے ابوخاں سے بہت زیادہ پیسے مانگے اور
ابوخاں کے پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ . .
چارہ نہ ملنے کے سبب یا پتہ نہیں کس فکر میں
گھُل کر ببلی دن بہ دن سوکھتی جا رہی تھی اُس
کی رنگت پھیکی پڑ گئی تھی۔ سفید چمکدار نرم
بال اپنی کشش کھونے لگے تھے۔ بے چاری
بے زبان بھوکی رہتی لیکن احتجاج کی ہلکی سی
آواز بھی منہ سے نہ نکالتی اس اُمید پر کہ آج
نہیں تو کل کچھ نہ کچھ انتظام ہو جائے گا۔ ابو بابا
ضرور کوئی راستہ نکالیں گے اور اُس دن تو اُسے
بڑی اُمید بندھ گئی تھی جب اُس نے ابو بابا کو
ایک گوالے سے بات کرتے دیکھا۔

"سنو بابو . . . میری ببلی کو تم لے جاؤ۔
میں اسے تمہارے سپرد کرتا ہوں، میں اپنا پیٹ
ہی نہیں بھر پا رہا ہوں، اس غریب بے چاری
بے زبان کو میں اس طرح تل تل نہیں مار سکتا۔
تم اسے لے جاؤ بیٹا۔ . . آج سے یہ تمہاری
ہوئی . . ." ابوخاں نے گلوگیر لہجے میں گوالے سے
کہا، گوالے نے پہلے تو ایک نظر ببلی پر ڈالی اُسے
نظروں نظروں میں تولا، پرکھا اور پھر حقارت
سے بولا . . . "یہ تو سوکھ کر چمرخ ہو گئی ہے . . .
ابوخاں! یہ دودھ وُودھ کیا دے گی؟ اگر
اچھی تندرست ہوتی جس سے ڈھائی تین سیر
دودھ کم از کم روزانہ مل جاتا تو میں ضرور لے جاتا۔"

"لیکن سُن تو بیٹا . . ."

"نہیں ابوخاں . . ." گوالے نے ابوخاں
کی بات درمیان ہی میں کاٹ کر بے پروائی سے کہا۔

"ویسے بھی میری اپنی بکریاں بہت ہیں،
ان کو ہی سنبھالنا مشکل ہو رہا ہے۔ میں اسے لے
کر کیا کروں گا اسے کہاں سے کھلاؤں گا پلاؤں گا۔"

ابوخاں کا چہرہ اُتر گیا۔ . . انھوں نے
بڑی حسرت سے ببلی کی طرف دیکھا۔ ببلی نے انجان
بن کر نظریں چرالیں اور زبردستی زمین پر پڑے
چند تنکوں کو سونگھنے لگی۔

اس رات ابوخاں ٹھیک سے سو نہیں
پائے . . .

اور پھر تو یہ اُن کا روز کا معمول ہو گیا تھا
کہ وہ ببلی کے لیے لوگوں سے بات کرتے، اُسے
ان کے پاس سے لے جانے کے لیے منت کرتے
اور ببلی کو لینے کے خواہش مند لوگ آتے اور ببلی
کی حالت دیکھ کر انکار کر کے لوٹ جاتے۔ کوئی
ببلی کو مفت میں لے جانے کے لیے بھی تیار نہ
تھا کہ خواہ مخواہ چارہ پانی دینا پڑے گا اور بدلے
میں اتنا دودھ بھی نہیں ملے گا جتنا ملنا چاہیے۔
اور پھر ابوخاں کی یہ شرط بھی تھی کہ تم اسے جان
سے مار کر اپنے منہ کا نوالہ نہیں بناؤ گے۔ تو آخر
ببلی کو کون لے جاتا . . . ؟

رات میں چارپائی پر لیٹے . . . پہاڑیوں
کی طرف نظریں جمائے ابوخاں سوچ رہے تھے
. . . اچھا ہی کیا چاندنی نے، جو رسّی تڑا کر بھاگ
گئی۔ آج کم از کم ان مصیبتوں کا سامنا تو اسے
نہیں کرنا پڑ رہا ہے جن کو معصوم ببلی جھیل رہی
ہے . . . اسے آزادی چاہیے تھی . . . اور یہ . . .
یہ ببلی . . . یہ نہ جانے کیسی بکری ہے جو سدا قید
رہنا چاہتی ہے۔ اتنی لمبی زنجیر کے باوجود کٹیا
میں نہیں ٹہلتی، بس ایک کونے میں خاموشی سے
پڑی رہتی ہے . . . آزادی حاصل کرنے کے
لیے کبھی کوئی جدوجہد نہیں کرتی . . . ایک
خیال . . . بس اچانک ہی ایک خیال ابوخاں
کے ذہن میں آیا . . . رات کا آخری پہر تھا . . .
وہ خاموشی سے اُٹھے . . . اندر کٹیا میں گئے . . .

دیکھا بَبلی زنجیر سے بندھی سو رہی ہے... انھوں نے نہایت آہستگی سے اس کے پیروں کی زنجیر کھول دی اور انتہائی درد بھرے لہجے میں کہا ... "جا میری بچّی... چاندنی تو میری مرضی کے خلاف اس گھر سے رسّی تڑا کر بھاگی تھی۔ آج میں تجھے خود آزاد کرتا ہوں... چلی جا ... بھاگ جا... جا بیٹی... اتنی بڑی دُنیا میں تو اپنا پیٹ کہیں بھی خود ہی بھر سکتی ہے... تجھے مجھ جیسے کمزور ناتواں بوڑھے ابو خاں کی ضرورت نہیں... جا چلی جا..." زنجیر لپیٹ کر ابو خاں نے ایک کونے میں ڈال دی، گھڑے سے ایک ڈونگا پانی نکال کر پیا۔ رب کا شکر ادا کیا اور بے خوف ہو کر اپنی چارپائی پر لیٹ گئے... اُنھیں پورا یقین تھا کہ صبح ہونے تک بَبلی بھی چلی جائے گی، آزاد ہو جائے گی... شاید وہ بھی یہی چاہتی ہو لیکن چاندنی کی طرح اس میں ہمّت نہیں... جیسے کوئی بہت بھاری پتھر کی سِل ابو خاں کے سینے سے ہٹ گئی... اس دن وہ بہت گہری نیند سوئے۔

صبح جب انھوں نے دیکھا کہ بَبلی اسی طرح کونے میں دُبکی پڑی ہے تو اُنھیں بہت حیرت ہوئی... قریب جا کر انھوں نے دیکھا... بَبلی کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں... جیسے کسی کا انتظار ہو... زبان باہر نکلی ہوئی تھی... اور چیونٹیوں کی باریک قطار اُس کے مُنہ کی طرف جا رہی تھی...

بَبلی بھی آزاد ہو چکی تھی... چاندنی کی طرح...

ابو خاں کو لگا جیسے کسی نے اُن کے پیروں میں ایک بار پھر بہت بڑی زنجیر ڈال دی ہے۔

دہلی اور اس کے اطراف

"دہلی اور اس کے اطراف" جس کا پہلا نام "ارمغان احباب" تھا، مولانا حکیم سید عبدالحئی کے سفر کا روزنامچہ ہے۔ یہ سفر انھوں نے ۱۸۹۴ء میں دہلی اور اس کے نواحی علاقوں میں کیا تھا۔ حکیم سید عبدالحئی صاحب موجودہ دنیائے اسلام کی نامور شخصیت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے والدِ بزرگوار تھے۔

اس سفرنامے کو لکھے ہوئے تقریباً سو سال ہو رہے ہیں لیکن گزشتہ تہذیب سے دلچسپی رکھنے والا قاری اسے آج بھی لطف و بصیرت سے خالی نہ پائے گا اس لیے کہ جو کہانی اس میں بیان ہوئی ہے وہ بہت دور کی نہیں ہے۔ تاریخ میں ایک صدی کا فاصلہ کچھ زیادہ نہیں ہوتا۔ اس سفرنامے میں لطف و بصیرت کا پہلو اس لیے بھی ہے کہ سفر کرنے والا جویائے حق ہے۔ اسے علم کی سچی لگن ہے، اپنی تہذیب سے گہرا لگاؤ ہے، بزرگوں کے کارناموں کے لیے دل میں احترام اور ہمعصروں کی قدرشناسی کا جذبہ ہے۔ اسلامی تاریخ اور ہندوستان میں مسلم حکمرانوں، عالموں اور صوفیوں کی فیض رسانیوں سے مکمل آگاہی نے اس کے تاثرات کو وسیع سے وسیع تر کر دیا ہے اور اس سفرنامے کو ایک تاریخی، تہذیبی اور علمی دستاویز کی حیثیت دے دی ہے۔

مصنف کا اندازِ بیان، ہر قسم کے مبالغے سے بری ہے اور بے تکلف گفتگو کا رنگ لیے ہوئے ہے۔

مصنف : مولانا حکیم سید عبدالحئی — صفحات : ۱۴۴

مرتبہ : ڈاکٹر صادقہ ذکی — قیمت : ۲۵ روپے

دہلی کے مشائخ کی ادبی خدمات

یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ اُردو زبان و ادب کی ترویج و ترقّی میں ہندوستان کے صوفیائے عظام اور مشائخینِ کرام کا اہم کردار رہا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اُردو نظم و نثر کا آغاز ہی ان مقدس ہستیوں کا مرہونِ منت ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ نے فرمایا تھا کہ "انسانی ذہن نثر کی بہ نسبت نظم سے جلد اور زیادہ متاثر ہوتا ہے" چنانچہ اکثر مشائخینِ متقدمین نے تبلیغِ حق کے لیے نظم ہی کو وسیلہ بنایا لیکن ایسا نہیں کہ انھوں نے نثر کی اہمیت اور افادیت کو نظر انداز کر دیا ہو۔ جہاں نثر کی ضرورت تھی وہاں انھوں نے نثر سے بھی کام لیا ہے۔ اس طرح ان کی تحریریں ان دونوں اصنافِ ادب کے فروغ کا ذریعہ بنی ہیں۔

اس کتاب میں محبوبِ الٰہی حضرت نظام الدین اولیاؒ سے لے کر سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلوی تک ایسے ۱۳ اکابرینِ علم و تصوّف کے حالات اور ان کی بالواسطہ یا بلاواسطہ لسانی اور ادبی خدمات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے، جو دہلی کی سرزمین سے وطنی نسبت رکھتے ہیں۔ کتاب کی مصنفہ بیگم ریحانہ فاروقی خود دہلی کی ایک بڑی درگاہ کی نگراں ہیں اور یہاں کے اکابرینِ علم و تصوّف کے بارے میں ان کی معلومات بہت وسیع ہیں۔ یہ کتاب ان معلومات کا نچوڑ ہے۔

مصنفہ : بیگم ریحانہ فاروقی

صفحات : ۸۴

قیمت : ۲۱ روپے

اُردو اکادمی، دہلی سے طلب کریں

دوہے

ھا بُرا خیال ہی، اچھا بُرا بنائے
نک ہو جس رنگ کی، ویسا رنگ دِکھائے

نے ہی اعمال سے، ہر کوئی دھوکا کھائے
ے چشمہ دھوپ کا، سورج کو جھٹلائے

رس میں تو شیر تک، کرتب کر دِکھلائے
ڑا دبے مشین میں، تب سلنے میں آئے

ل ہل کرتا سراب جب دریا سا دِکھلائے
ے ہرن کی پیاس ہی، دَلدَل بیچ دھنسائے

ل، پوکھر، پیاؤ اور ندی جہاں لہرائے
"چیکورہ" گاؤں تو، خوابوں میں تڑپائے

رج جیسے نام کو، ڈھونڈا ڈھونڈ نہ پائے
رہم خود شمشاد سے، شمس میاں کہلائے

بنتی ہے شمس کی، جگ کے پالن ہار
ا کوئی نہ اب اُٹھے، نفرت کی دیوار

ا گھر لاچار کا، بچنا ہے دُشوار
ن برائی آگ میں، کھو دے گا سرکار

کچھ اِس گھاٹ پہ رہ گئے، کچھ اُترے اُس پار
مگر ہمیں تو ڈبو گیا، دریا کا منجدھار

ڈھونڈے سے جب نہیں ملے، کہیں بھی سچّا پیار
آنکھ موند کے دیکھیے، سپنوں کا سنسار

چشمہ دُھندلا نہیں ہوا، نظر ہوئی لاچار
شیشے ویسے ہی رہے، رگڑے کتنی بار

بارہ سال کے بعد تو، گھورا ہو گُلزار
بارہ پہنچے ساٹھ کی، عمر مگر بیکار

دھرم کا کس کو مان ہے، کرم کا کس کو دھیان
اندھوں کے بازار میں، اِک بھاؤ سب دھان

غرض پڑے تک ہی رہے، چاہت اور سمّان
رام کو دھوکا دے گیا، کل جُگ کا ہنومان

بھری عدالت آج بھی، ہوتا ہے اعلان
قسم کی خاطر رہ گئے، گیتا اور قرآن

دیکھا تو پھر نہیں رہا، دعوت کا ارمان
میزبان تھی لومڑی، سارس تھا مہمان

رحمن، کبیرا، قلی قطب، خسرو اور رسکھان
انھیں کے سُر میں شمس جی، ملے تان سے تان

غزل، گیت، دوہے لکھے، لکھّے لیکھ انیک
مُورت، صورت بنا بنا، آگ بجھائی ایک

کھیل کھلونے ڈھونڈیے، من کو کچھ بہلائیں
خالی پڑے مکان میں، بھوت بسیرا پائیں

جھوٹے برتن دھوئے ہیں، سچّا کرو حساب
پیٹھ پہ لاتیں کھائی ہیں، پیٹ نہ مارو صاب

رنگ روپ تو ایک ہے، کیسے پہچانیں
کوّا، کوئل کون ہے، بولیں تو جانیں

بچپن تو ہنس کھیل کٹا، کٹے بڑھاپا روئے
تو پھر ہم بھی شمس جی، تان چدریا سوئے

شمس فرّخ آبادی

سمرو منزل، گولا گنج، لکھنؤ (یو۔پی)

اِرم زیدی

یوروپین نشاۃِ ثانیہ کے خدوخال اور اسباب و نتائج

محترمہ اِرم زیدی کا یہ مقالہ ملنے کے بعد پتہ چلا کہ اس نوجوان ہونہار طالبہ نے یکم دسمبر ۱۹۸۹ء کو حیدر آباد دکن میں پانی میں ڈوب کر ناوقت وفات پائی۔ یہ اطلاع لکھنؤ کے اہلِ قلم کاظم علی خاں سے ملی۔ مقالہ نگار اِرم زیدی موصوف کی بہو ہونے والی تھی۔

یوروپ میں روشن خیالی اور ذہنی بیداری کا دور یعنی نشاۃِ ثانیہ . . (RENAISSANCE) جن اسباب کا نتیجہ بتایا جاتا ہے اُن میں ۱۴۵۳ء کا وہ تاریخ ساز واقعہ بھی شامل ہے جب ایشیائی عثمانی ترکوں نے قسطنطنیہ کو فتح کرکے مشرقی یوروپ کے اس علاقے پر سے سلطنتِ یونان کے ایک ہزار سالہ اقتدار کی داستان کو تمام کرکے تاریخِ عالم میں اُس کا تتمّہ لکھا تھا۔[۱]

یوروپ کے اقتدار سے ۱۴۵۳ء میں قُسطُنطُنیہ کے نکلنے کا واقعہ تاریخ کی وہ کروٹ تھی جِس نے یوروپین ممالک کو دورِ وسطیٰ کے تاریک نہاں خانے سے نکال کر روشن خیالی کے تابندہ و تابناک دور کے دروازے پر پہنچا دیا۔ -RENAISSA -NCE یعنی نشاۃِ ثانیہ نے صدیوں کی ذہنی غنودگی کو دُور کرکے تاریخِ عالم اور تاریخِ یوروپ دونوں ہی میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔

مغرب میں نشاۃِ ثانیہ جن دور رس و ہمہ جہت تبدیلیوں کا نقیب بنا اُن کے مظاہر یوروپ میں مذہبی اصلاح کی تحریک اور انقلابِ فرانس

نشاۃِ ثانیہ کے جن فیوض و برکات سے فیض یاب ہوا اُن کی طویل فہرست اپنے وسیع دامن میں حیاتِ انسانی کے ہر شعبے اور زندگی کے ہر گوشے میں انقلاب آفریں اور دُور رس تبدیلیوں کے ایک تاریخ ساز اِشاریے کی حیثیت رکھتی ہے۔ یوروپ میں نشاۃِ ثانیہ اگر ایک طرف علمی اور دانش ورانہ بصیرت کا سبب بنا تو دوسری جانب اُس نے مختلف فنون کی آبیاری کرکے یوروپ کو پندرہویں صدی عیسوی کے نصفِ آخر میں لیونارڈو ڈونسی (LEONARDO DA VINCi)، مائیکل این جیلو' (MICHELANGELO) اور ریفائل' (RAPHAEL) ایسے تین عظیم فن کاروں' مجسمہ سازوں اور مصوّروں کے یادگار اور سدابہار کارناموں سے مالامال کیا۔

اٹلی کے دیارِ فلورنس (FLORENCE) کا عظیم ترین فنکار لیونارڈو (LEONARDO) جس کا زمانۂ حیات ۱۴۵۲ء سے ۱۵۱۹ء تک رہا' اپنی مختلف النوع ذہنی صلاحیتوں اور اپنے نِت نئے علمی مشغلوں کی بدولت اپنے زمانے

ایک زبردست مصوّر و مجسمہ ساز تھا بلکہ وہ اپنے دور کا بڑا قد آور مفکّر اور سائنس داں بھی تھا۔ وہ نِت نئے تجربات کا خوگر تھا' تلاش و تحقیق اُس کی فطرتِ ثانیہ تھی اور وہ اشیا کے اسباب و علل کو بے نقاب کرنے کی جُستجو میں سرگرداں رہتا تھا۔ وہ اُن اوّلین سائنس دانوں میں تھا جنھوں نے جدید سائنس کی بنیادوں کو استوار کرکے اپنے دور کی ذہنی تاریخ کو سائنس کی نئی روشنی سے معمور کیا تھا۔ اُس نے کِسی استاد کے بغیر اپنے طور پر ایک وقت لاطینی (LATINI) اور ریاضی دونوں مضمونوں میں مہارت حاصل کی تھی۔ لیونارڈو اپنے دور کا ممتاز انجینیر بھی تھا اور وہ پہلا شخص تھا جس نے یہ انکشاف کیا تھا کہ جِسم میں خون گردش کرتا رہتا ہے۔ وہ انسانی جِسم کی ساخت کے مطالعے یعنی (ANATOMY) میں بھی دلچسپی رکھتا تھا۔

لیونارڈو کی کوششوں میں ہوا بازی یا ہوائی پرواز کے متعلق اُس کے نظریات و تجربات سب سے زیادہ متحیّر کُن کارنامہ ہیں۔ ہوائی پرواز میں اُسے مکمّل کامیابی تو نہ نصیب ہوئی مگر وہ کامیابی کے بہت قریب ضرور پہنچ گیا تھا۔ ہوا بازی میں کسی نے اس کے نظریات و تجربات کی تقلید کی کوشش نہیں کی۔ اگر اُس کے بعد کے لوگوں میں اُس کے کام کو آگے بڑھا

والے دو چار اور پیدا ہوئے ہوتے تو جدید ہوائی
جہاز شاید دو یا تین سو سال قبل ہی عالمِ ایجاد میں
آگیا ہوتا۔ یونارڈو نے اپنی ساری زندگی حیات و
کائنات کے سربستہ رازوں پر سے پردے اٹھانے
کی فکر میں بسر کی۔ وہ انسانی فکر کو ہمیشہ آگے بڑھانے
مستقبل کا استقبال کرنے یا آنے والے زمانے
پر قابو پانے کی تگ و دو میں کوشاں اور سرگرداں
رہا تھا[11]

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے جدید یوروپ
کی تاریخ میں نشاۃِ ثانیہ کی تحریک کا اصل، اہم
اور بنیادی سبب ۱۴۵۳ء کے دوران یونانی
حکومت کے زیرِ نگیں آنے والے شہر قسطنطنیہ
پر عثمانی ترکوں کا قبضہ تھا جس کے باعث
یونانی دانشوروں کو وہاں سے راہِ فرار اختیار
کر کے اٹلی میں پناہ لینا پڑی تھی۔ انھیں یونانی
دانشوروں نے یونان کے قدیم علم و دانش کی
بازیافت کے ذریعے یوروپ کو علم و دانش وری
کی روایت سے متعارف کر کے نشاۃِ ثانیہ کی نئی
تحریک کا آغاز کیا تھا۔ زوالِ قسطنطنیہ کا انقلاب
آفریں واقعہ نشاۃِ ثانیہ کے دوش بدوش دوسرے
اور متعدد دور رس نتائج کا بھی سبب بنا تھا۔
ایشیائی عثمانی ترک یوروپ و ایشیا کے قدیم
درمیانی تجارتی راستوں پر قبضہ کر کے ایشیا سے
یوروپی ممالک کی تجارت کے کاروبار میں جب
ایک "مزاحمتی عنصر" ثابت ہوئے تو یوروپ
کو مشرق کے لیے نئے راستوں کی تلاش پر
مجبور ہونا پڑا۔ اسی تلاش نے اگر ایک طرف
۱۴۹۱ء میں اتفاقیہ طور پر اُن کے لیے "نئی دنیا"
یعنی امریکہ تک رہبری کی تو دوسری جانب یہی
تلاش ۱۴۹۸ء میں یوروپ و ہندوستان کے
درمیان ایک [illegible]

سبب بنی۔ بعد کو ۱۵۱۹ء میں فرڈی نینڈ میگلان
(FERDINAND MAGELLAN) نے
بحرالکاہل بھی تلاش کیا۔ گویا پندرہویں صدی
عیسوی کے دو اہم واقعات یعنی نشاۃِ ثانیہ اور
جغرافیائی دریافتیں یوروپ کی جدید تاریخ کے
لیے زوالِ قسطنطنیہ ہی کی دین ہیں۔ اسی لیے لارڈ
ایکٹن (LORD ACTON) جیسے مؤرخین معترف
ہیں کہ یوروپ کی جدید تاریخ عثمانی ترکوں کی
فتوحات ہی کے سائے میں پروان چڑھی ہے[12]
ہمارے نزدیک یوروپ نے اپنی تاریخ کے تاریک
نہاں خانے کے لیے نشاۃِ ثانیہ کے جن شعلوں سے
روشنی اور گرمی حاصل کی ہے اُن شعلوں کو بھڑکانے
میں کچھ ہم ایشیائی اور مشرقی لوگوں کی چنگاریاں
بھی صرف ہوئی ہیں۔

بہ قولِ کاظم علی خاں "تاریخِ یوروپ میں
نشاۃِ ثانیہ وہ "لکشمن ریکھا" ہے جسے پار کرتے
ہی عہدِ وسطیٰ نے اپنے وجود کو کھو کر دورِ جدید
کے روپ میں "پُنر جنم" پایا تھا۔ نشاۃِ ثانیہ کے
خطِ فاصل نے جب یوروپ کی تاریخ کو قدیم
اور جدید کے دو حصوں میں تقسیم کیا تو وہ کون سے
امتیازات تھے جن کی بدولت دورِ جدید نے
عہدِ وسطیٰ کے مقابلے میں اپنا تشخص قائم کیا۔
نشاۃِ ثانیہ کی بدولت تاریخِ یوروپ میں جو جدید
عہد طلوع ہوا وہ قرونِ وسطیٰ سے ذہنی، سیاسی
اور سماجی اعتبار سے کیسا اور کتنا مختلف رہا ہے
اس پر بھی غور کرنا ضروری ہے۔

ذہنی اعتبار سے نشاۃِ ثانیہ نے یوروپ
کے جدید دور کو یونان کی کلاسیکی علم و دانشوری
کی روایت سے متعارف کرایا جس کی بدولت
انسان نے فکر و نظر کی آزادی حاصل کی۔ انسان
[illegible]

کو علمی بصیرت سے کام لے کر عقل کی سوئی پر پرکھنے
کا سلیقہ سکھایا۔ انسان نے زندگی کے مختلف
معاملات و حالات کے خوب و زشت کو پرکھنے
کے لیے تنقیدی نظر سے کام لینا شروع کیا۔ مذہب
پر انسان کی تنقیدی نظر نے مذہبی اصلاح کی
تحریک کو جنم دیا۔ انسان کی ذہنی بیداری کی اس
لہر نے ایک طرف مختلف فنونِ لطیفہ کی ترقیوں
کی راہ کھولی اور دوسری جانب انسان نے اپنی
ذات و کائنات پر غور و فکر سے کام لے کر طبی
اور طبیعیاتی سائنس کے میدان میں بھی گام فرسائی
کی۔ ہاروے کا دورانِ خون کا نظریہ، نیوٹن کی
کششِ ثقل کی دریافت اور ڈیکارٹ
(DESCARTE) کے تجرباتی سائنس کے
انکشافات اسی انقلاب کے مظہر ہیں۔ سائنس
کی ترقی دورِ جدید کے لیے متعدد اہم انکشافات
اور ایجادات کا سبب بنی جن کی بدولت انسانی
زندگی میں حیرت انگیز انقلابات ظہور میں آئے
سولھویں صدی عیسوی کے دوران پولینڈ کے
باشندے کاپرنیکس نے بطلیمی (PTOLEMY)
کے اس قدیم نظریے کو رد کیا کہ کرۂ ارض نظامِ
شمسی کا مرکز ہے اور یہ ثابت کیا کہ ہماری زمین
شمسی نظام کا مرکز ہونے کے بجائے نظامِ شمسی
میں سورج کے گرد گردش کرنے والا ایک عام
سیارہ ہے۔ بعد میں اسی نظریے کو کیپلر (KEPLER)
اور گیلیلیو (GALILEO) نے مزید تقویت
پہنچائی۔ سائنس کی ترقیوں کی بدولت ہی انسان
نے امریکہ کی نئی دنیا کو دریافت کیا اور مشرق کو
جانے والے نئے بحری راستے بھی تلاش کیے۔ ان
دریافتوں میں قطب نما کی ایجاد بھی معاون
ثابت ہوئی جو سائنس کے مطالعے کی دین ہے۔
[illegible]

وسعت رس میں لائی، جس سے ہر طرح کے علم میں اضافہ ہوا۔ بارود کی ایجاد نے قدیم آلاتِ حرب و ضرب پر ضرب کاری لگا کر جنگ کا نقشہ بدل دیا۔ بارود کی ایجاد نے یوروپ کی عسکری قوت کو بڑھایا جس کے نتیجے میں متعدد یوروپی ممالک نے اپنے برِّاعظم سے نکل کر دوسرے براعظموں میں نئی کالونیاں بسالیں۔ ۱۷۶۸ء میں واٹ (WATT) نے دخانی انجن (STEAM ENG-INE) - ایجاد کیا اور ہارگریوز (HARGRE-AVES) - اور کرامپٹن (CROMPTON) نے ۱۷۶۴ء اور ۱۷۷۶ء میں کپڑا بُننے کی کلیں ایجاد کرکے ۱۷۰۰ء کے انگلستان کے صنعتی انقلاب میں جان ڈال دی (ذوق و جستجو: خواجہ احمد فاروقی ص ۲۳۹) حصولِ علم کے شوق نے علم حاصل کرنے کے لیے آسان زبان کو اختیار کیا۔ یعنی یوروپ کے مختلف ممالک نے اپنی اپنی دیسی زبانوں کی ترقی کی کوشش کی۔ نتیجے میں جدید عہد نے یوروپ کے مختلف ملکوں میں دیسی زبانوں کی ترقی کے لیے راہ ہموار کی۔ دیسی زبانوں کی ترقی نے ان زبانوں کے ادب کو بھی تقویت دی۔

یوروپ کے عہدِ جدید کا سیاسی منظر نامہ بھی قرونِ وسطیٰ سے مختلف محسوس ہوتا ہے۔ نشاۃ ثانیہ کی فکر و نظر کی آزادی نے مذہب اور مذہبی اداروں چرچ پر تنقید کرنے کا حوصلہ عطا کیا تو رومن چرچ اور پوپ کی وہ مرکزی مذہبی اہمیت کم ہوگئی جو اپنے دائرۂ کار میں بڑی حد تک یوروپ کے عیسائی ملکوں کی سیاست کو بھی لیے ہوئے تھی۔ جدید عہد نے یوروپی ممالک میں قومیت کے تصور کو بھی تقویت دی جس کے ہاتھوں یوروپ کے مختلف ملکوں میں مضبوط قومی حکومتیں ظہور میں آئیں۔ ان قومی حکومتوں نے اپنے اپنے ملکوں کی معاشی حالت کو سُدھارا اور تجارت کو بھی فروغ دیا جس نے رفتہ رفتہ یوروپ کے اُس صنعتی انقلاب کے لیے راہیں ہموار کیں جو سائنسی ایجادات کی بدولت مشینوں سے متعارف ہو چکا تھا۔

یوروپ کے عہدِ جدید میں نشاۃ ثانیہ جو سیاسی تبدیلیاں لایا ان کے بطن سے سماجی تبدیلیاں بھی پیدا ہوئیں۔ عہدِ وسطیٰ کے جاگیر دارانہ نظام میں سماجی اعتبار سے دولت مندوں اور غریبوں کے صرف دو طبقے تھے اور اُن کے درمیان متوسط طبقے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ قومی حکومتوں نے جب تجارت اور صنعت کو فروغ دیا تو سماج میں ایک توانا اور جاندار متوسط طبقہ اُبھرا جس نے یوروپی ممالک کی سیاست میں بھی بھرپور حصہ لیا۔ انقلابِ فرانس میں اسی متوسط طبقے نے کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ قرونِ وسطیٰ میں سماج افراد کے بجائے طبقوں اور اداروں پر زور دیتا تھا۔ عہدِ جدید میں طبقوں اور اداروں کے بجائے افراد پر توجہ دی جانے لگی۔ نشاۃ ثانیہ میں اس طرح گویا انسان مرکزِ توجہ بنا۔ سماجی تبدیلیاں تہذیبی اور معاشرتی تبدیلیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں۔ جاگیردارانہ نظام کی جگہ تجارت و صنعت و حرفت کے فروغ کی بدولت نیا سرمایہ دارانہ نظام ابھر کر سامنے آیا۔ یہ تھے وہ حالات جنھوں نے نشاۃِ ثانیہ کے بعد یوروپی ممالک کے لیے ساری دنیا میں فتوحات کے دروازے کھول دیے۔[۴]

نشاۃِ ثانیہ کی بدولت جب یوروپ کے مغربی ملکوں نے زندگی کے ہر پہلو میں برتری حاصل کی تو وہاں مہم جوئی کا ایک نیا جذبہ پیدا ہوا۔ مغرب کی "تسخیرِ مشرق" مہم جوئی کے اِسی جذبے کا کرشمہ ہے۔ مہم جوئی کا یہی جذبہ یوروپ کے لیے اگر ایک طرف امریکہ کی نئی دنیا کی دریافت کا سبب بنا تو دوسری جانب ۱۴۹۸ء میں واسکوڈی گاما کی سرکردگی میں ایک پرتگالی بحری مہم کو ایک نو دریافت بحری راستے سے ہندوستان کے ساحل مالابار کے دیار کالی کٹ تک لایا۔ ڈاکٹر تاراچند نے ہندوستان میں پرتگالیوں کی آمد کے دو سبب بتائے ہیں۔ پہلا مقصد تو تجارتی نقطۂ نظر سے گرم مسالوں کا حصول تھا اور دوسری غرض یہ تھی کہ پرتگالی عیسائی دراصل مسلمانوں سے اپنی تاریخی عداوت کے ماتحت مسلمان عربوں کی اُس تجارتی اجارہ داری پر ضرب لگانا چاہتے تھے جو اُس وقت بحرِ ہند میں قائم تھی۔ بحرِ ہند میں عربوں کے بحری بیڑوں کے خلاف پرتگالیوں کی کامیابی کی رفتار حیرت ناک حد تک تیز رہی۔ پرتگالیوں کے وائسرائے المیڈا (ALMEIDA) نے ساحلِ ہند پر پرتگالی کارخانوں کے تحفظ کی خاطر کئی مضبوط قلعے بنوائے اور اُس کے جانشین البوقرق نے پرتگالیوں کو خلیجِ فارس سے ملاکا اور گرم مسالے کے جزیروں تک کے بحری ساحلی خطے کا مالک بنا دیا۔ البوقرق نے ۱۵۱۰ء میں ہندوستان کے مشہور ساحلی شہر گوا پر قبضہ کرکے اُسے ہندوستان میں پرتگالی مقبوضات کی راجدھانی بنایا۔[۵]

ہندوستان کے مغربی سواحل پر گوا کے گرد و پیش کے خطے پر پرتگالی اقتدار کے استحکام کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ بعد کو مغل حکمراں جلال الدین اکبر بھی اپنے تمام جاہ و جلال اور "مغلِ اعظم" کے خطاب کے باوجود پرتگالیوں کو اُن کی شرارتوں پر کوئی موثر سزا دینے سے قاصر رہا تھا۔[۶]

ہندوستان کی سونا اُگلنے والی سرزمین

اِس ملک میں پرتگالیوں کے علاوہ یورپ کے جن دوسرے اور بھی متعدد ملکوں کو مہم جوئی اور قسمت آزمائی کے لیے اُکساتی رہی ان میں ہالینڈ انگلستان اور فرانس کے نام شامل ہیں مگر ملک گیری کی اس تگ و دو میں میدان انگلستان کے ہاتھ رہا۔ ہندوستان میں انگلستان یا انگریزوں کے مرحلہ وار اثر و اقتدار کی طویل داستان اپنے دامن میں زمان و مکان کی جن تفصیلات کی حامل ہے ان کا بیان آسان نہیں۔ یہ داستان زمانی اعتبار سے ۱۶۰۰ء میں شروع ہو کر ۱۸۵۷ء میں اپنے نقطۂ عروج پر پہنچی تھی۔ اور بہ لحاظِ مکان اِس داستان کے ابتدائی دور میں ہندوستان "جنت نشان" کے جن بہت سے مقاموں کے نام آتے ہیں ان میں سورت۔ مدراس۔ ہگلی (بنگال)۔ ممبئی اور کلکتہ جیسے مقام شامل ہیں۔

ہندوستان میں قدم جمانے کے لیے انگریزوں کو برسوں تک "WAIT & SEE" کی پالیسی پر عمل کرنا پڑا۔ انگریز تجارت اور کاروبار کے بہانے میں ہندوستان آئے۔ کاروبار کے بہانے وہ سیاست کے راستوں سے گزر کر دربار تک پہنچے اور پھر حکمتِ عملی اور فوجی برتری کی بدولت وہ دربار سے آگے بڑھ کر ہندوستان کی سرکار کے مالک بن بیٹھے۔ ہمارے نزدیک ہندوستان میں انگریزوں کی کامیابی کی تفسیر محض ان تین کلیدی الفاظ میں بیان کی جاسکتی ہے:

۱۔ کاروبار ۲۔ دربار

۳۔ سرکار

ہندوستان میں انگریزوں نے کامیابی کی ان تین منزلوں میں سے "کاروبار" اور "دربار" کی پہلی دو منزلیں سلطنتِ مُغلیہ کے دورِ عروج میں ہی سر کرلی تھیں مگر "سرکار" کی آخری منزل سر کرنے کے لیے اُنھیں ہندوستان میں اُس وقت کا انتظار کرنا پڑا جب بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہ جہاں اور اورنگزیب کی وارث سلطنتِ مُغلیہ ۱۷۰۷ء میں اورنگزیب کی وفات کے بعد اپنے کم و بیش پونے دو سو سالہ (۱۵۲۶ء تا ۱۷۰۷ء) سفرِ اقتدار کو طے کر کے اندرونی شورشوں اور بیرونی حملہ آوروں کی یورشوں کے ہاتھوں انتشار کا شکار ہو کر ادبار سے دوچار ہوئی تھی۔

۱۷۰۷ء میں اورنگزیب کی وفات کے بعد آنے والے ڈیڑھ سو برسوں کے دوران ہندوستان پر فوجی برتری حاصل کرنے کے لیے مختلف قوتوں کے درمیان جو رسّہ کشی ہوتی رہی اس کی تفصیل کا بیان آسان نہیں۔ سیاسی رسّہ کشی اور فوجی معرکہ آرائیوں کی اس خوں چکاں داستان میں جن مختلف فریقوں کے نام آتے ہیں ان میں چند اہم یہ ہیں:

(۱) برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی (۲) سلطنتِ مُغلیہ (۳) اور (۴) والیانِ بنگال سراج الدولہ اور میر قاسم (۵) والیِ اودھ نواب شجاع الدولہ (۶) اور (۷) والیانِ میسور حیدر علی و ٹیپو سلطان (۸) ہندوستان میں فرانسیسی مہم جو (۹) ہندوستانی مرہٹے (۱۰) پنجاب میں جاٹ اور سکھ۔

برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے ان حریفوں پر یکے بعد دیگرے اپنی فوجی طاقت سے زیادہ اپنی حکمتِ عملی سے کس طرح قابو حاصل کیا یہ ایک الگ داستان ہے۔

۱۷۰۷ء میں اورنگزیب کی وفات سے ۱۸۵۷ء میں حکومتِ مُغلیہ کے خاتمے تک ڈیڑھ سو سال کے عرصے کے دوران ہندوستان کی تاریخ نت نئے عنوان سے انگریزوں کے عروج اور مغلوں کے زوال کا قصہ سناتی ہے۔ مغلوں کے ساتھ ساتھ انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستان کی وہ طاقتیں بھی زوال سے دوچار ہوتی رہیں، جنھوں نے مغلوں کے زوال پر عروج حاصل کیا تھا اور سلطنتِ مُغلیہ کے سرسبز و شاداب ہرے بھرے تناور درخت کو گھُن کی طرح کھا کر کھوکھلا کر ڈالا تھا۔ مگر وہ جو مثل ہے کہ "گیہوں کے ساتھ گھُن بھی پس جاتے ہیں" وہی مثل یہاں بھی صادق آئی جس کے نتیجے میں سلطنتِ مُغلیہ کے ساتھ اُس کی کمزوری سے فائدہ اُٹھانے والی طاقتیں بھی مغرب کے اس ہلاکت خیز سیاسی طوفان میں خس و خاشاک کی طرح اِدھر اُدھر بکھر کر رہ گئیں۔ انگریزی اقتدار کے عروج اور مغل سرکار کے انتشار و زوال کی اس ڈیڑھ سو سالہ داستان کے چند اہم اور قابلِ ذکر عنوان یوں بیان کیے جاسکتے ہیں۔

(۱) سرزمینِ بنگال پر ۲۳ جون ۱۷۵۷ء کی صبح کو ہونے والی جنگِ پلاسی میں انگریزوں کے ہاتھوں حکومتِ مغلیہ کے صوبے دار نواب سراج الدولہ کی شکست جس کے نتیجے میں بنگال پر انگریزوں کا اقتدار مستحکم ہوا۔

(۲) سرزمینِ بہار پر ۲۳ اکتوبر ۱۷۶۴ء کو ہونے والی جنگِ بکسر جس میں انگریزوں کے ہاتھوں والیِ بنگال میر قاسم، والیِ اودھ نواب شجاع الدولہ اور مغل حکمراں شاہ عالم ثانی کی متحدہ فوجوں کی ہزیمت کے نتیجے میں بنگال و بہار پر انگریزوں کا اقتدار قائم ہوا اور اودھ کی سیاست میں انگریزوں کی مداخلت کے لیے دروازہ کھلا نیز مغل بادشاہ شاہ عالم ثانی کو بعد میں انگریزی سرکار کا پنشن خوار بننا پڑا۔

(۳) جنگِ سرنگا پٹم میں انگریزوں نے اپنے زبردست حریف والیِ میسور ٹیپو سلطان کو ہزیمتی

۱۷۹۹ء کو شکست دی) ٹیپو سلطان نے جامِ شہادت نوش کیا۔[۹] (نہرو نے دی ڈسکوری آف انڈیا (ص ۲۷۵) اور گلمپسیز آف ورلڈ ہسٹری (۳۶۶،۳۶۴ نیز ۴۰۹) میں انگریزوں کے خلاف والیانِ میسور حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی مجاہدانہ سرگرمیوں کی موثر انداز میں تعریف و توصیف کی ہے) ٹیپو سلطان کو فرانسیسیوں کی حمایت بھی حاصل تھی لہٰذا اس جنگ میں فرانسیسیوں کو بھی شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

(۴) فرانسیسیوں اور والیانِ میسور کے بعد ہندوستان کی اُس زبردست مرہٹہ قوت کی شکست و ریخت کی باری آئی جس نے نہ صرف سلطنتِ مغلیہ بلکہ (۱۷۶۱ء میں احمد شاہ ابدالی کے ہاتھوں پسپائی کے باوجود) برسوں تک انگریزوں کو بھی پریشان کر کے حیراں و سرگرداں کر رکھا تھا۔ انگریزوں کو مرہٹوں پر قابو پانے کے لیے ۱۷۸۱ء، ۱۸۰۳ء اور ۱۸۱۸ء میں تین بار رزم و پیکار سے دوچار ہونا پڑا مگر ۱۸۰۳ء کی دوسری جنگ میں انگریزوں کے ہاتھوں مرہٹوں کی شکست اپنے دامن میں بہت اہم اور دور رس نتائج رکھتی ہے۔ دوسری جنگ کے بعد انگریزوں اور مرہٹوں کے درمیان ۳۰ر دسمبر ۱۸۰۳ء کو ہونے والے سُرجی اُرجن گاؤں کے صلح نامے کی بدولت لارڈ لیک کی فوجیں "فاتحانہ پرچم کے ساتھ" دہلی پہنچیں اور انگریزوں نے بوڑھے اور نابینا مغل حکمراں شاہ عالم ثانی کو (جو ۱۷۷۱ء سے مرہٹوں کی کٹھ پتلی بنا ہوا تھا[۱۰]) اپنے قبضے میں کر کے اور لال قلعے کے باہر دہلی کے تقریباً سارے شہر پر اپنا اقتدار قائم کر کے اس بات کا فیصلہ کر دیا کہ اب ہندوستان کے مقدر کی باگ ڈور مغلوں اور مرہٹوں کے ہاتھوں سے نکل کر انگریزوں کے قبضے میں آچکی ہے۔[۱۱]

(۵) مرہٹوں پر قابو حاصل کرنے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے اربابِ اختیار و اقتدار نے پنجاب کے سکھوں کی بھی بربادی کے فرمان پر اپنی مہر ثبت کی اور ۳۰ر مارچ ۱۸۴۹ء کو لارڈ ڈلہاوزی نے ایک فرمان کے ذریعے پنجاب کو بھی برٹش سرکار کا علاقہ بنا لیا (ہسٹری آف ماڈرن انڈیا ص ۱۴۷)

(۶) انگریزوں نے ہندوستان کی بڑی طاقتوں کے ساتھ ملک بھر میں بکھری ہوئی چھوٹی بڑی ریاستوں کو بھی یکے بعد دیگرے اپنی ہوسِ ملک گیری کی آگ کا ایندھن بنایا۔ یہ دیسی ریاستیں پہلے تو لارڈ ویلزلی کی SUBSIDIARY ALL-IANCE کی پالیسی کے دانے سے فرنگی دام میں پھنسائی گئیں اور پھر لارڈ ڈلہاوزی نے برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے جال میں پھنسی ہوئی دیسی ریاستوں کی ان پھڑکتی ہوئی چڑیوں کو یا تو اپنی DOCTRINE OF LAPSE کی کُند چھری سے ذبح کر ڈالا یا اُنھیں اپنی الحاق کی پالیسی سے ہڑپ لیا۔ دیسی ریاستوں کے اس دوہرے قتلِ عام میں جن ریاستوں کا کام تمام کیا گیا اُن میں سے چند کے نام یہ ہیں: ستارا، جیت پور، سمبل پور، بھگت، اودے پور، جھانسی، ناگپور اور اودھ[۱۲]

ان حالات میں ۱۸۵۶ء تک ہندوستان ان مقتول دیسی ریاستوں کا قبرستان بن گیا۔ اور ہندوستانی دیسی ریاستیں نواب مرزا شوق لکھنوی کے اس مشہور شعر کے مصداق یکے بعد دیگرے موت کے گھاٹ اُترتی چلی گئیں:

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

سید شبیہ الحسن نونہروی نے ہندوستان میں سلطنتِ مغلیہ کے کمزور ہونے پر دیسی ریاستوں کے عروج و زوال کی داستان یوں بیان کی ہے:

"... مغلیہ سلطنت کا تناور درخت کھوکھلا ہو کر جڑیں چھوڑ چکا تھا جس کی وجہ سے اس پاس کے نوخیز پودوں کو غذا کھینچ کھینچ کر نشو و نما پانے کا موقع مل گیا تھا۔ جن زوال آفریں قوتوں نے مغلیہ سلطنت کو ایک طرف گلی بنا دیا تھا وہ ان نوخیز پودوں کو باقاعدگی کے ساتھ پھولنے پھلنے کا موقع نہیں دے سکتی تھیں۔ ان چھوٹے چھوٹے پودوں کو کچھ عرصے کے لیے بڑھنے اور پھیلنے کا موقع اس لیے دیا گیا تھا کہ یہ ہندوستان کی وحدت کو ختم کرنے میں مدد دیں ورنہ ان سب کے لیے آخر کار آتشِ فرنگ کا ایندھن بننا مقدر ہو چکا تھا[۱۳]..."

سرزمینِ ہندوستان پر مغرب کے ہاتھوں مشرق کی تسخیر کی جو داستان ۱۵۱۰ء میں گوا پر پرتگالیوں کے قبضے سے شروع ہوئی تھی وہ ۳۴۷ برس بعد اس وقت نقطۂ عروج پر پہنچی جب ستمبر ۱۸۵۷ء میں انگریزی اقتدار کے خلاف "بغاوت کی تلوار" بلند کرنے پر ہندوستانیوں کو فرنگیوں کے مقابلے میں شکست سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ ستمبر ۱۸۵۷ء میں برٹش سرکار کے ہاتھوں... ہندوستانیوں کی شکست یورپ کے نشاۃ ثانیہ کے واقعے کا تاریخی نتیجہ ہے۔

ستمبر ۱۸۵۷ء میں جو ہندوستان انگریزوں کے ہاتھوں شکست و زوال سے دوچار ہوا تھا اس نے اپنی صدیوں پرانی شان دار تاریخ میں عروج و کمال کا بھی طویل زمانہ دیکھا تھا۔ انگریز سترہویں صدی کے دوران جب ہندوستان

ہیں مال و دولت کے حصول کے لیے آئے تھے وہ ظاہر ہے کہ کوئی کنگال ملک نہ تھا بلکہ وہ ماضی میں اپنے عروج و کمال کی بلندیوں پر پہنچ کر دنیا کے خوشحال ترین ملکوں میں نمایاں حیثیت کا مالک رہ چکا تھا ظاہر ہے کہ انگریز کسی کنگال اور مفلس ملک میں مال و دولت کے حصول کے لیے تو آنے سے رہے۔ ہندوستان نے انگریزوں کے دستِ سوال پران کی تجارت کے کاسہ گدائی کو اپنے بھرے ہوئے خزانوں سے خوب خوب مالا مال کیا۔ بہ قول جواہر لال نہرو، یہاں اس تلخ حقیقت کو بھی یاد رکھنا چاہیے کہ انگریزوں نے ہندوستان پر اقتدار حاصل کرنے کے لیے اپنے مفاد میں جو بڑی مہنگی مہنگی لڑائیاں لڑی تھیں اُن کے تمام و کمال مصارف ہندوستان ہی کو برداشت کرنا پڑے تھے انگریزوں نے اس انوکھی ترکیب پر بڑی چالاکی سے عمل کیا تھا کہ انگریزوں کے ہاتھوں اپنی تسخیر کی قیمت خود ہندوستان ہی ادا کرتا رہے[14] فرنگیوں کے ہاتھوں ہندوستان کے اس پُر فریب معاشی استحصال پر مصحفی امروہوی نے یوں اظہارِ خیال کیا تھا:

ہندوستان کی دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی
ظالم فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی[15]

ستمبر ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے جبر و استبداد اور معاشی استحصال کی بدولت ہندوستان اپنے زوال سے قبل صدیوں سے عروج و کمال کی جن بلندیوں اور خوش حالی کے جس تابناک سنہری دور سے گزرا تھا اس کی طویل داستان اجمال و اختصار کے ساتھ یوں بیان کی جاسکتی ہے کہ ہندوستان اپنی تاریخ میں ایک ایسے مہتم بالشان ماضی کا امین رہا ہے جو زندگی کے مختلف میدانوں میں اُس کے شاندار کارناموں کا پتا دیتا ہے۔ عہدِ رفتہ میں ہندوستان زندگی کے جن میدانوں میں دُنیا کے ملکوں میں ممتاز و نمایاں نام و مقام کا مالک رہا ہے ان میں صنعت و حرفت، تجارت، مصوری، مجسمہ سازی، فنِ تعمیر، زراعت، مذہب، فکر و فلسفہ، علم و دانشوری، تہذیب و معاشرت اور مال و دولت سب ہی کچھ شامل ہیں۔

جواہر لال نہرو کا بیان ہے کہ ماضی بعید میں ہندوستان اپنے سامان کی بدولت بدیسی تجارت پر چھایا ہوا تھا۔ مصر کی چار ہزار سال پرانی محفوظ کی ہوئی ممیاں (MUMMIES) ہندوستانی ململ ہی میں لپٹی ملی ہیں۔ صنعت و حرفت میں ہندوستان کے اعلا معیار کے تجارتی سامان کا مشرق و مغرب دونوں ہی میں شہرہ اور دور دورہ تھا۔ ہندوستانی فن کار و صنعت گر ملک کے سیاسی زوال کے دور میں بھی اپنی دست کاری کی مہارت و چابک دستی سے محروم نہ ہوئے تھے۔ انگریز اور دوسرے تاجر جو بہ غرضِ تجارت ہندوستان آیا کرتے تھے یہاں بدیسی سامان کی فروخت کے لیے نہیں آتے تھے بلکہ ہندوستان میں تیار ہونے والے نازک و نفیس سامان کو خریدنے آتے تھے جسے وہ یوروپ کے ممالک میں مُنہ مانگے داموں فروخت کر کے بے پناہ منافع کماتے تھے۔ اس طرح ابتدا میں یوروپ کے تاجر خام مال کے بجائے ہندوستان میں بُنے ہوئے سامان کی کشش کے ہاتھوں یہاں آتے تھے۔ برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی اپنے سیاسی اقتدار سے قبل ہندوستان میں بُنے ہوئے سوتی اونی اور ریشمی کپڑوں اور زرتار پوشاکوں کو فروخت کرنے کی نہایت منافع بخش تجارت کیا کرتی تھی۔ ہندوستان میں بنا اور بُنا کپڑا نہ صرف انگلستان اور دیگر یوروپی ملکوں تک جاتا تھا بلکہ چین، جاپان، برما، عرب اور ایران جیسے ملکوں کے علاوہ افریقہ کے متعدد حصّوں میں بھی اس کی زبردست مانگ تھی۔

ہندوستان کا قدیم بینکنگ -BANKING- نظام خاصا چست اور ترقی یافتہ تھا۔ یہاں کے بڑے تاجروں کے ذریعے جاری کی جانے والی ہُنڈیاں نہ صرف ہندوستان بلکہ ایران، کابل، ہرات، تاشقند اور وسطی ایشیا کے متعدد دوسرے مقامات پر بھی آسانی سے قبول کرلی جاتی تھیں۔ ہندوستان میں بحری جہاز سازی کی صنعت بھی پھل پھول رہی تھی اور نپولین سے ہونے والی معرکہ آرائیوں میں استعمال ہونے والے پرچم بردار بحری جہازوں میں ایک برطانوی امیر البحر کے بحری بیڑے میں ہندوستانی جہاز ساز کمپنی کا ایک ایسا بحری جہاز بھی شامل تھا جو ہندوستان ہی میں تیار کیا گیا تھا۔ کلائیو نے خود ۱۷۵۷ء میں بنگال کے شہر مرشد آباد کی زبردست تجارتی ترقی، اقتصادی خوشحالی اور انسانی آبادی سے معمور اس چہل پہل کا ذکر کیا ہے جو اُسے لندن جیسے ترقی یافتہ شہر کے مقابلے میں برابری کا درجہ دلوا رہی تھی۔ مشرقی بنگال میں واقع ڈھاکا اپنی نفیس ململ کے لیے دُنیا بھر میں مشہور تھا۔ بنگال کے ان دو شہروں کے علاوہ ہندوستان کے وسیع و عریض خطّوں میں اور دوسرے اہم شہر بھی اپنی صنعتی اور تجارتی سرگرمیوں کے لیے مشہور تھے۔ ہندوستان اپنی صنعت و حرفت اور تجارت کی بدولت اپنا سامان دوسرے ملکوں میں بھیج کر جس دولت و ثروت کے بل بوتے پر یوروپ کے صنعتی انقلاب سے قبل (بلکہ بعد کو بھی) دنیا کے خوش حال ترین

لوں میں نمایاں حیثیت کا مالک تھا انگریزوں
اپنی تاجرانہ خود غرضی اپنی پُر فریب سیاسی
ری گری اور اپنی ہندوستان کُش استحصالی
تصادی چالوں سے ہندوستان کو اُس دولت
محروم کردیا۔ انگریزی تاجرانہ ذہنیت کی یہ
م ظریفی بھی قابلِ غور ہے کہ اس نے ابتدا میں
ندوستان کی جس صنعت و حرفت کی بدولت
بردست مال و دولت حاصل کی بعد کو اُس
نے اُسی ہندوستانی صنعت و حرفت کو تباہ و
برباد کرکے خوشحال ہندوستان کو کنگال بنا ڈالا۔
ویا ان بدیسی تاجروں نے جس تھالی میں کھایا
سی میں چھید کیا۔ بدیسیوں نے پہلے تو ہندوستانی
صنعت و حرفت پر کاری ضرب لگا کر یہاں کی
تجارت کو غارت کیا اور پھر ہندوستان کے خام
مال سے اپنی مشینوں میں جان ڈال کر انگلستان
کے صنعتی انقلاب کے لیے زمین ہموار کی۔ اب
نگلستان اور ہندوستان کے درمیان جو تجارت
ہو رہی تھی وہ اِس نوعیت کی تھی کہ جو ہندوستان
اپنا تجارتی سامان انگلستان میں فروخت کرکے
مال و دولت کمایا کرتا تھا اب وہ اپنا خام مال
دے کر انگلستان کے سامان کی تجارتی منڈی
بن کر رہ گیا۔[۱۶]

برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں
ہندوستان کے زوال نے یہاں کی زندگی کے
دوسرے مثبت پہلوؤں کو بھی برباد کر ڈالا۔
فنونِ لطیفہ، فکر و فلسفہ، علم و دانش اور تہذیب
و معاشرت ایسی چیزیں جس خوش حالی کے بل
بوتے پر پنپتی ہیں جب وہ اقتصادی خوشحالی
ہی ہندوستان سے رخصت ہو کر انگلستان جا
پہنچی تو ہندوستان اپنی فکر و فن کی دولت کے
بھی گم ہو جانے کے خطرے سے دوچار ہو گیا۔
۱۸۵۷ء کے انقلاب میں ہندوستانیوں کی ناکامی
مآل کو اسی پُر خطر منزل پر لائی تو ہندوستان
کی آنکھیں کُھلیں اور یہاں بھی ذہنی بیداری اور
روشن خیالی کی وہی لہریں اُٹھنا شروع ہوئیں۔۔
جنھوں نے یورپی ممالک کو نشاۃ ثانیہ سے
ہم کنار کیا تھا۔ اس طرح نشاۃ ثانیہ نے یورپ
سے ہندوستان کا سفر کیا۔ ہندوستان میں نشاۃ
ثانیہ کن حالات میں ظہور میں آیا اور اس کے کیا
نتائج رہے یہ ایک دوسری ہی کہانی ہے جو
ایک علاحدہ مقالے کی طالب ہے۔[۱۷]

حواشی :

۱۔ اس حقیقت کو متعدد اہلِ قلم نے مانا ہے جن میں جواہر لال نہرو بھی شامل ہیں۔

۲۔ گلمپسیز آف ورلڈ ہسٹری۔ از جواہر لال نہرو ص ص ۲۷۸ تا ۲۷۹

۳۔ اے اسٹڈی آف یوروپین ہسٹری: ایل مکرجی، کلکتہ چودھواں ایڈیشن۔ ص نمبر ۴

۴۔ یوروپ میں نشاۃ ثانیہ اور عہدِ جدید کے خدوخال کی تفصیلات کے لیے دیکھیے: (۱) اے اسٹڈی آف یوروپین ہسٹری، ص ۴ تا ۱۵۔ (۲) گلمپسز آف ورلڈ ہسٹری نہرو ص ۲۴۳ نیز ص ۲۷۹ (۳) ذوق و جستجو: پروفیسر خواجہ احمد فاروقی لکھنؤ طبع ۱۹۶۷ء ص ۲۳۹ نیز ص ۲۵۰۔ (۴) دی ڈسکوری آف انڈیا: جواہر لال نہرو۔ نئی دہلی طبع ۱۹۸۹ء ص ص ۲۹۷ تا ۲۹۸

۵۔ رجوع کیجیے: (۱) گلمپسیز آف ورلڈ ہسٹری ص ۲۴۰ (۲) دی ڈسکوری آف انڈیا۔ ص ۲۶۰ (۳) اے شارٹ ہسٹری آف دی انڈین پیپل: ڈاکٹر تارا چند۔ مدراس طبع ۱۹۶۳ء ص ۲۲۲

۶۔ اکبر دی گریٹ مغل۔ وی۔ اے۔ اسمتھ دہلی طبع ۱۹۶۲ء ص ۸۱ نیز ص ص ۹۶ تا ۹۷

۷۔ ہسٹری آف ماڈرن انڈیا: ڈاکٹر اے۔ ایل۔ سری واستو، آگرہ طبع ۱۹۶۹ء ص ص ۲۲ تا ۲۳

۸۔ ایضاً ص ۳۳

۹۔ ایضاً ص ص ۵۶ تا ۹۲

۱۰۔ اے شارٹ ہسٹری آف دی انڈین پیپل ص ۲۳۶

۱۱۔ ہسٹری آف ماڈرن انڈیا: ڈاکٹر سری واستو ص ص ۵۴ تا ۵۵، ۹۵ تا ۹۶ نیز ۱۱۱۔

۱۲۔ اے شارٹ ہسٹری آف دی انڈین پیپل ص ص ۳۰۲ تا ۳۰۴

۱۳۔ تنقید و تحلیل: سید شبیہ الحسن نونہروی، لکھنؤ طبع ۱۹۶۲ء ص ص ۱۰۸ تا ۱۰۹۔

۱۴۔ گلمپسیز آف ورلڈ ہسٹری ص ۴۱۶

۱۵۔ بہ حوالہ اُردو شاعری میں قومی یک جہتی کے عناصر: ڈاکٹر مجاور حسین۔ الہ آباد طبع ۱۹۷۵ء ص ۲۰۷

۱۶۔ رجوع کیجیے: (۱) گلمپسیز آف ورلڈ ہسٹری ص ص ۴۱۴ تا ۴۱۹ (۲) دی ڈسکوری آف انڈیا ص ص ۲۸۴ تا ۲۸۵

۱۷۔ دیکھیے مقالہ کاظم علی خاں "ہندوستانی نشاۃ ثانیہ کے خدوخال" (غیر مطبوعہ)

سیفی سرونجی

میرے خلاف تو کبھی تیرے خلاف میں
لیکن ہے یہ بھی سچ نہیں کچھ اختلاف میں

اس کو نہیں ہے ہوش کوئی گرد و پیش کا
کب سے وہ محوِ خواب ہے اپنے غلاف میں

شہرت کے سارے راز تو بس تو نے پا لیے
رکھّا ہوا ہوں میں تو ابھی شین کاف میں

ہاں زندگی کے سارے مزے لوٹنے کے بعد
کرتا ہوں ہر گناہ کا اب اعتراف میں

مجھ کو نہ ڈھونڈیے کسی محفل میں اب کہیں
بیٹھا ہوں ایک عمر سے میں اعتکاف میں

سہ ماہی "انتساب"، سیفی لائبریری، سرونج (ایم پی)

زندگی کو آگ کا دریا بنا سکتا ہوں میں
ہر نفس میں اک نیا طوفاں جگا سکتا ہوں میں

جی رہا ہوں مدتوں سے حادثوں کے درمیاں
حادثوں کی بے بسی پر مسکرا سکتا ہوں میں

آشکارا ہو گیا ہے مجھ پہ یوں رازِ سفر
تجھ کو بھی اے راہبر! رستہ دکھا سکتا ہوں میں

گر ملے مہلت مری تیرہ نصیبی سے مجھے
ماہ و انجم تیرے قدموں میں بچھا سکتا ہوں میں

سرپرستی وقت کے حاکم کی ہے مجھ کو نصیب
اپنی خامی کو بھی اک خوبی گنا سکتا ہوں میں

حوصلہ ہو دل میں اے ارشد تو کیا ممکن نہیں
آدمی ہوں، خود کو انساں بھی بنا سکتا ہوں میں

ارشد لکھمنیاوی

۳۴۲، بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

نجمہ فرحت قادری

ہائے بیگانگی، اب دل میں بھی آتا نہیں کو
میں بھی کیا خوابِ حیا ہوں کہ جگاتا نہیں ک
بات کوئی تو ہوئی ہوگی، سبھی کہتے ہ
ورنہ بے وجہ تو افسانہ بناتا نہیں کو
وِش بدن میں ہے تو امرت ہے مری سانسوں
میں بھرا جام سہی بڑھ کے اٹھاتا نہیں کو
بس یہ کچھ سایے ہیں جو رینگتے رہتے ہیں مد
ورنہ دُنیا میں تو آتا نہیں، جاتا نہیں کو
لوگ گیتوں میں مرے نقش سجا دیتے ہ
رُوح پر سے مری، پردہ تو اُٹھاتا نہیں کو
شام ہوتے ہی تری آنکھوں میں آنسو نج
یہ دیے وہ ہیں جو جلتے ہیں، جلاتا نہیں کو

معرفت اشتیاق احمد قادری، مکان نمبر ۴۵۲، محمد زئی، شاہجہا

ید عبدالصمد حسینی

بھوت

سائنسی تحقیقات کی روشنی میں

ہندی ادب کے سیکھنے سکھانے کے مرحلوں
ا جب لفظ "بھوت" بولا جاتا ہے تو اس سے
اتہ ماضی مراد ہوتا ہے یعنی وہ باتیں جو گزرے
ے زمانے میں ہوئی تھیں لیکن جب عام بول چال
ا لفظ "بھوت" بولا جاتا ہے تو اس سے مراد ایک
ی غیر طبعی (یعنی غیر مادی) مخلوق مراد لی
تی ہے جس کا وجود اس دنیا میں واقعاً ہے
ی یا نہیں، قطعیت کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا۔
ر بھی جو عام تصور "بھوت" کے سلسلے میں ہے
کسی موجود شخص کا ہی عکسی وجود سمجھا جاتا ہے۔
ے جو شخصیت کبھی تھی اور اب نہیں ہے۔ اس
لیے بھوت کو علیحدہ اور ایک خالص مخلوق سمجھنا
اید مناسب نہیں۔ البتہ کچھ مخلوقات ایسی بھی
ں جو ہیئت و فطرت میں قدرے مماثلت و
طابقت کے باوجود عام مخلوق سے مختلف
ں۔ جن کے وجود کی شہادتیں جہاں غیر فطری
قعات و حادثات سے ملتی رہتی ہیں وہیں مذہبی
تابوں سے بھی سند ملتی ہے۔ ایسی مخلوق
ن و ملائک، فرشتہ و شیطان وغیرہ ہیں
الحال یہ مخلوقات میرا موضوعِ بحث نہیں
ں لیے پھر کبھی اس پر باتیں ہوں گی۔ البتہ جن
ملائک فرشتہ و شیطان ایسی مخلوقات
صور کی جاتی ہیں جو اپنی فطری ضروریات کے
نت اپنی ماہیت حالات کی مطابقت کے ساتھ
ختیار کرنے کی کامل قدرت رکھتی ہیں۔ اس قسم
ی باتیں کسی ایک انسانی گروہ سے وابستہ نہیں

بلکہ اقوامِ عالم میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں البتہ انھیں مختلف قومیں مختلف ناموں سے جانتی اور یاد کرتی ہیں کہیں جن و ملائک، کہیں فرشتہ و شیطان تو کہیں دیو اور پری وغیرہ کے ناموں سے لوگ انھیں یاد کرتے ہیں اور انھیں ایک تسلیم شدہ حقیقت بھی سمجھتے ہیں۔ جہاں تک مروجہ "بھوت" کا تصور ہے اس کی کوئی جداگانہ ہستی نہیں یہ کسی حقیقی وجود کا شخصی عکس اور پرتو ہے۔

ہم آئے دن بھوت کی فرضی کہانیاں سنتے رہتے ہیں جن کو باشعور طبقہ قابلِ اعتنا نہیں سمجھتا۔ ایسی کہانیوں کے لیے لفظ "فرضی" کا استعمال اس لیے کیا گیا ہے کہ جب تک ان کی تصدیق کا سائنسی ثبوت فی زمانہ نہیں مل جاتا انھیں فرضی ہی کہا جائے گا تعلیم یافتہ لوگوں کے نزدیک بھوت ایک واہمے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے لیکن بھوت پریت کی باتیں عموماً دیہات کی چوپالوں میں بڑی دلچسپی سے سنی اور سنائی جاتی ہیں۔ جس سے تفریحِ طبع بھی ہوتی ہے۔ اور تنہائی میں دلوں پر نامعلوم خوف کا غلبہ بھی ہوتا ہے لیکن یہ باتیں بھی بالکل بے بنیاد نہیں ہوتیں۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ہر شخص اپنے مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر ہی کچھ کہتا ہے۔

لوگ اکثر یہ کہتے ہوئے سنے جاتے ہیں۔ "کل رات میں پیشاب کرنے اٹھا تو مجھے کچھ سایہ سا نظر آیا۔ میرے تو اوسان خطا ہو گئے۔"

ایک شخص لمبی مدت کے بعد پردیس سے وطن آیا۔ جب گھر میں کچھ سکون ہوا اور گھر والوں نے قرب و جوار کا حال سنایا تو اس میں پڑوس کے ایک شخص کی دو ماہ قبل ہونے والی موت کی خبر بھی تھی یہ خبر سن کر وہ حیران رہ گیا۔ موت ہونا کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ لیکن اس نے کہا یہ خبر بالکل غلط ہے ابھی گیارہ بجے جب میں آ رہا تھا اگلے نکڑ پر میری اس سے ملاقات ہوئی البتہ اس نے کچھ کھل کر بات نہیں کی اور مجھ کو بھی گھر پہنچنے کی جلدی تھی اس لیے میں بھی رکا نہیں سیدھا چلتا رہا۔ غرض اس طرح کی باتیں آئے دن وقفے وقفے سے سننے میں آتی رہتی ہیں۔ بعض قومیں دو بارہ پیدائش پر یقین رکھتی ہیں۔ اب سے تقریباً پندرہ بیس سال قبل ایک انگریزی ہفتہ وار کے کئی شماروں میں ایک شخص کا بیان شائع ہوا تھا جس نے دوبارہ جنم لینے کا دعویٰ کیا تھا۔ اس نے اپنے بیان میں اپنی ۳۰۰ سال پہلے کی دنیاوی زندگی کا دعویٰ کیا تھا۔ اس مدت میں اس جگہ کا جہاں کا وہ خود کو رہنے والا بتاتا تھا، سارا نقشہ بدل چکا تھا البتہ اس نے ان نشانیوں کو جو زمانے کی خرد برد سے اب تک محفوظ رہی تھیں اور آثارِ قدیمہ کا حصہ تھیں، اپنے بیان کے ثبوت میں بہ طور دلیل پیش کیا اور اس طرح اس کے بیان کی تصدیق بھی ہوتی رہی واللہ اعلم بالصواب واقعہ کی تردید و تصدیق تو میں نہیں کر سکتا

سالنہ، بیگو سرائے (بہار)

نہ ہمارا عقیدہ ہے کہ جب ہم مرجاتے ہیں تو ر پیدا نہیں ہوتے یہ ایک ایسا موضوع ہے ں پر گفتگو کرنا اپنا قیمتی وقت ضائع کرنے مترادف سمجھا جاتا ہے شاید بھوت بھی اسی لے کی ایک کڑی ہو چونکہ ایسی ساری باتیں دق الفطرت پر محمول و مبنی نظر آتی ہیں۔

بھوت کوئی شے ہے یا صرف نفسیاتی اغی اپج ہے؟ دنیا کے شہرۂ آفاق ادیب سپیئر نے بھوت جیسے کالعدم کردار کو اپنے موں میں جگہ دی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ د کا بھوت صرف میکبیتھ (MACBETH) و نظر آتا ہے، جب کہ اس کے ساتھ اسی جگہ ں سارے لوگ موجود ہوتے ہیں۔ اس ج پر ظاہر ہونے والا بھوت فرضی بھوت جا سکتا ہے مگر ہملیٹ میں ہملیٹ کے باپ موت صرف ہملیٹ کو ہی نہیں بلکہ پہلے کے ایک بہی خواہ کو نظر آتا ہے اس لیے حقیقی بھوت کے طور پر ظاہر ہونے والا ت سمجھا جانا چاہیے بہر کیف ہمیں اس حث نہیں کہ شیکسپیئر کے بھوت اصلی تھے ضی ہم تو یہ کہنا چاہتے ہیں کہ بھوت کا د ہے جبھی لفظ بھوت وجود پذیر ہوا ۔

مندرجہ بالا استدلال سے یہ ثابت ہے کہ طبعی یا غیر طبعی شکل میں بھوت کا د مسلم ہے اب ہم سائنس کی روشنی میں پر غور کریں تو ہمیں نتیجہ خیز امکانات کا غ ملتا ہے وحیدالدین خاں اپنی کتاب ہب اور جدید چیلنج'' کے باب ''دلیل ت'' صفحہ ۵۸ کے استدلالی بیاں میں کرنا چاہتے ہیں کہ انسان کے اعمال اچھے یا برے جو بھی ہوں، ریکارڈ ہوتے رہتے ہیں۔ یہ اعمال اجالے میں سرزد ہوں یا اندھیر میں، خلوت میں سرزد ہوں یا جلوت میں سبھی ریکارڈ ہوتے رہتے ہیں اور مذہب اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب میں بھی اچھے برے اعمال اور ان کے حساب کتاب کا تصور پایا جاتا ہے اور اتنا تو غیر مذہبی لوگ بھی مانتے ہیں کہ ہر آدمی اپنے اعمال سے پہچانا جاتا ہے۔ اسلام یہ کہتا ہے کہ دو فرشتے رات اور دن کی تبدیلی اوقات کے ساتھ ہر آدمی کے ساتھ اپنی ڈیوٹی پر تعینات رہتے ہیں۔ یہ دونوں فرشتے اچھے اور برے دونوں اعمال کا ریکارڈ تیار کرتے رہتے ہیں۔ اہلِ اسلام کا اس پر ایمان ہے لیکن نیچر پرست افراد کا معاملہ دوسرا ہے۔ وہ تو ہر چیز کو مادی شیشے سے دیکھنے کے عادی ہیں حالانکہ جزوی طور پر جہاں ان کا ذہن نارسا تھک جاتا ہے وہاں وہ سپر ڈال دیتے ہیں۔ غذا کے اندر طاقت بخش صلاحیت موجود ہوتی ہے وہ اس پر یقین بھی رکھتے ہیں مگر انھیں وہ طاقت دکھائی نہیں دیتی۔ برقی رو سے ہم ہر وقت کام لیتے رہتے ہیں مگر ہمیں برقی رو کی شکل نظر نہیں آتی۔ بہر حال جدید سائنسی تحقیقات سے ہر قدم پر اسلامی عقیدے کو تقویت حاصل ہوتی جارہی ہے۔

جدید سائنسی تحقیقات کی رو سے انسان زبان سے جیسی بھی اچھی یا بری باتیں نکالتا ہے ان کا ریکارڈ تیار ہوتا رہتا ہے۔ زبان کی حرکت سے ہوا میں لہر پیدا ہوتی ہے اور کان کے آلات انھیں اخذ کرکے دماغ تک پہنچاتے ہیں۔ اس طرح بولے ہوئے الفاظ ہم سن لیتے ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ لہر پیدا ہونے کے بعد مستقل طور پر فضا میں تیرتی رہتی ہے۔ اس صورت میں ان لہروں کو گرفت میں لاکر صدیوں کی کہی ہوئی باتیں دہرائی جاسکتی ہیں۔

یہ حقیقت اب اتنی عام ہو چکی ہے کہ اس کی تصدیق کے لیے فی زمانہ کسی ثبوت کی ضرورت نہیں۔ یہ تو زبان سے نکلی ہوئی باتوں کا حال ہے۔ ہمارے تمام اعمال بھی خواہ اندھیر میں ہوں یا اجالے میں، تنہائی میں ان کا ارتکاب ہوا ہو یا مجمع عام میں سب کے سب تصویری حالت میں فضا میں موجود رہتے ہیں۔ اور جب ان کی منتشر لہروں کو ایک خاص نظم و ترتیب کے ساتھ یکجا کیا جائے تو پوری تصویر فضا میں ابھر سکتی ہے۔ جدید تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہماری حرکات و سکنات جس حالت میں بھی اور جیسے بھی سرزد ہوئی ہوں وہ اپنے اندر سے مسلسل حرارتی لہریں خارج کرتی رہتی ہیں اور یہ لہریں اس طرح نکلتی ہیں کہ اپنی وقوع پذیری کا عکس معلوم ہوتی ہیں۔ چنانچہ HEAT WAVE کو اخذ کرکے اس مخصوص حالت اور اشیا کا فوٹو تیار کیا جاسکتا ہے۔ اگرچہ یہ تحقیق ابھی تجرباتی مراحل سے گزر رہی ہے۔ اس لیے فی الحال ان حرارتی لہروں کا تجزیہ کرکے ان کو گرفت میں لانے پر پوری طرح قابو نہیں پایا گیا ہے۔ تاہم وہ دن دور نہیں جب یہ بھی آسان ہو جائے گا۔ اس کے قوی امکانات سامنے آچکے ہیں اس قسم کا واقعہ پہلی بار ۱۹۶۰ء میں ہوا تھا۔ ریڈرز ڈائجسٹ کے مطابق

ایک رات نیو یارک کے اوپر سے ایک پُر اسرار جہاز چکر لگا کر چلا گیا اس کے فوراً بعد انفراڈ (INFERAD) شعاعوں والے کیمرے کی مدد سے اس کی حرارتی تصویر لی گئی جس سے یہ پتہ چل گیا کہ جہاز کس ساخت کا تھا۔ ڈائجسٹ کی اس خبر پر تبصرہ کرتے ہوئے ہندوستان ٹائمز نے لکھا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ ہم تاریخ کو فلم پر دیکھ سکیں گے۔ اور ہو سکتا ہے پچھلے ادوار کے بارے میں ایسے ایسے انکشافات ہوں جو ہمارے موجودہ تاریخی نظریات کو بالکل بدل ڈالیں مذکورہ بالا تفصیلات کو پیش کرنے کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ انسان کی حرکات و سکنات جو اس سے سرزد ہوتی رہتی ہیں، چاہے وہ تنہائی میں ہوں یا مجمع میں ان کی حرارتی لہروں سے تصویریں بنتی رہتی ہیں۔ البتہ یہ لہریں دوسری مختلف لہروں میں ضم ہو جاتی ہیں اور چونکہ فی الحال اتنا طاقتور کیمرہ وجود میں نہیں آیا ہے جو ایک لمبے عرصے کی ان حرارتی لہروں والی شعاعوں کا تجزیہ کر کے ان کا فوٹو لے سکے اس لیے ایسا ہونا ممکنات میں سے نہیں معلوم ہوتا ہے مگر قدرتی طور پر یعنی محض اتفاقیہ بھی ایسا ہونا بعید از قیاس یا بعید از امکان نہیں کہا جا سکتا۔ دنیا کے عالم وجود میں آنے کے سلسلے میں سائنسی تحقیقات یہ بتاتی ہے کہ ستاروں کی چال ہی اس کی وجہ ہے ایک تارا جب اتفاق سے سورج کے قریب پہنچ گیا تو سورج کی سطح پر جوار پیدا ہوا اور اس پر پہاڑ سا ابھر گیا، اور جب تارا وہاں سے کھسکنے لگا تو بھاٹا کی کیفیت پیدا ہو گئی اور پہاڑ ٹکڑوں میں بکھر گیا جس کا ایک ٹکڑا ہماری دنیا ہے۔ جب یہ دنیا اس درجے تک ٹھنڈی ہوئی کہ مادے رقیق حالت میں قائم رہ سکیں تو انسان، پیڑ پودے اور دیگر مخلوقات از خود وجود پذیر ہو گئے ایسا خیال جیمس جین کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ گویا اتفاقات کو بھی چیزوں کو عدم سے وجود اور وجود سے عدم میں تبدیل کرنے کا ایک مؤثر محرک نیچر پرست بھی مانتے ہیں۔ اس لیے انفراڈ شعاعوں والی حرارتی لہریں کبھی کبھار اتفاقیہ طور پر خالص ہو جا سکتی ہیں اور ان سے فضا میں ایسے لوگوں کی تصویریں بن جاتی ہوں گی۔ جن کی زندگی میں ان کے جسموں سے نکلی ہوئی حرارتی لہریں دوسری لہروں سے کٹ کر اپنی اصلی حالت میں آگئی ہوں۔ پھر وہ بھوت تو اس شخص کی شخصیت کا یقیناً پرتو اور عکس ہوا جس کے جسم کی حرارتی لہروں سے وہ عکس یا پیکر بنا ہے۔ اس طرح کا ایک واقعہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ ایک سفری ایجنٹ مسوری (امریکہ) میں سینٹ جوزف ہوٹل کے ایک کمرے میں بیٹھا ہوا اپنے آرڈر نوٹ کر رہا تھا کہ اچانک اس کو احساس ہوا کہ اس کے دائیں جانب کوئی بیٹھا ہوا ہے۔ جب اس نے مڑ ک
تو اسے صاف نظر آیا کہ وہ اس کی بہن
جو ۹ سال پہلے مر چکی تھی کچھ دیر بعد
پیکر اس کے سامنے سے غائب ہو گ
وہ گھر پہنچ کر ماں سے اس کا ذکر کر
اور یہ بھی کہتا ہے کہ اس نے بہن کے چ
پر تازہ خراش کا داغ بھی دیکھا ہے ج
نے اس کی زندگی میں نہیں دیکھا تھ
جواب دیتی ہوئی کہتی ہے: یہ خراش ا
طور پر میری انگلیوں سے اس کے چہ
آ گئی تھی۔ ماں نے مزید کہا کہ میں نے
بدنمائی کو دور کرنے کے لیے اس کے چ
پر پاوڈر لگا دیا تھا۔

اس واقعے کی روشنی میں یہ با
ثابت ہو جاتی ہے کہ اتفاقیہ بھی
خالص لہریں یکجا ہو سکتی ہیں ا
مردوں کے عکسی پیکر کی شکل میں نظ
آ سکتی ہیں۔ اس لیے بھوت کا
ہے۔ دراصل یہ بھوت نہ
انسان کے اعمال و افعال ہیں۔ جو
بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔ اس سے
کے عقیدۂ آخرت کی بھی مکمل تا
ہے۔

نئی مطبوعات

فراق کی شاعری

مُصنّف: ڈاکٹر افغان اللہ خاں
قیمت: ۱۲۵ روپے
تقسیم کار: نصرت پبلشرز، امین آباد، لکھنؤ ۲۲۶۰۱۸ (یو.پی)

بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جو اپنی انفرادیت کے باعث ہمیشہ ایک نمایاں مقام کی مالک بنی رہتی ہیں۔ فراق گورکھپوری ایسی ہی شخصیتوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ فراق دراصل افراط و تفریط کے درمیان زندہ رہنے والی ایک ایسی شخصیت ہے جس کا مطالعہ پیچیدہ بھی ہے اور آسان بھی۔ اس لیے کہ ایک طرف جہاں فراق نیاز فتحپوری جیسی تیکھی شخصیت سے اپنے شعری محاسن کی داد لے لیتا ہے، اپنے عہد کے شعرا سے اپنی امتیازی خصوصیات کے باعث اپنے کو ایک صدی قرار دے لیتا ہے تو دوسری طرف اسے ناقدین کی ضربِ شدید کا شکار بھی بننا پڑتا ہے۔ خود فراق کی زندگی میں ان کی مخالفت میں مضامین لکھے گئے لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس طرح کی انتہاؤں کے درمیان کسی ایک ایسے نقطۂ اعتدال کو قائم کرنا تو ضروری ہو جاتا ہے جس سے فراق شناسی یا فراق فہمی کا سرا مل جاتے۔

ڈاکٹر افغان اللہ خاں نے فراق کی شاعری پر ۲۰۷ صفحات کا طویل مقالہ لکھ کر گویا فراق شناسی کی باضابطہ ابتدا کر دی ہے۔ اور اب جب کہ یہ مقالہ شائع ہو کر منظرِ عام پر آگیا ہے تو یہ یارانِ نکتہ داں کو دعوتِ بحث و تجسس دے رہا ہے۔ فراق وہ شاعر ہیں جو کبھی میر اور غالب کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں کبھی سودا و مصحفی کے رنگ میں شاعری کرنا فخر سمجھتے ہیں اور کبھی امیر مینائی اور داغ کی شہرت دیکھ کر ان کے رنگ میں رنگ جانے کی سعیِ لاحاصل کرتے ہوئے نظر آتے ہیں فراق کی یہ کوششیں شعوری ہیں، غیر شعوری نہیں۔ فراق شہرت کے شیدائی تھے اور اس کے لیے نئے نئے پہلو تراشتے رہتے تھے۔ وہ اساتذۂ اُردو کی شہرت کو جب دیکھتے تھے تو ان کے دل میں ایک خواہش بے قراری پیدا کرنے لگتی تھی اور وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح میرا شمار ان لوگوں میں ہونے لگے۔ خود ان کا بیان "شاہکار" کے "فراق نمبر" کے صفحہ ۲۷۳ پر ملاحظہ ہو۔ جس میں انھوں نے ناصر علی فراق کا نام پڑھ کر فراق تخلص اختیار کیا۔ اپنے اس بیان میں فراق نے ناصر علی فراق کو داستان گو کہا ہے حالانکہ وہ داستان گو نہیں تھے۔ فراق نے امیر مینائی کے شاگرد وسیم خیرآبادی سے اصلاح لی۔ پھر ریاض خیرآبادی سے بھی مشورۂ سخن کرتے رہے۔

لیکن جب سودا، شاہ نصیر، ناسخ، ذوق، آتش، تسلیم، شیفتہ، رند، قلق سے لے کر فانی وغیرہ کے کلام کا سکہ چلتا ہوا دیکھا تو ان کے رنگ میں بھی شعر کہنے کے لیے بے قرار نظر آتے ہیں۔ انھوں نے ان شعرا کی زمینوں میں باقاعدہ غزلیں کہی ہیں۔ اسی لیے فراق کی ابتدائی شاعری بالکل روایتی اور تقلیدی ہے۔

فاضل مصنف نے فراق کی شاعری کے ادوار کو مندرجہ ذیل طریقے سے تقسیم کیا ہے۔ تقلیدی رنگ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۰ء تک جسے ان کی شاعری کا پہلا دور کہا جا سکتا ہے اور دوسرا دور ۱۹۴۰ء سے تا حال۔ جسے فراق کی شاعری کا دوسرا دور کہا جا سکتا ہے۔

پہلے دور کے ذیل میں ڈاکٹر افغان اللہ خاں نے فراق کی شاعری پر اساتذہ کے اثرات دکھائے ہیں اور بہت دلچسپ اور نتیجہ خیز تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ مثلاً غالب اور فراق، فراق اور مومن، فانی اور فراق، اصغر اور فراق، حسرت اور فراق۔ اس طرح کی ذیلی سرخیوں کے تحت تقابل پیش کیا گیا ہے۔

فراق کی شاعری پر ہندی اور انگریزی شاعری کے اثرات بھی نمایاں ہیں جسے مقالہ نگار نے خوبی سے پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر نریش چندر جو انگریزی ادب کے اُستاد ہیں اور فراق کے بڑے قریب رہے ہیں انھوں نے فراق کی انگریزی دانی کے ذیل میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے وہ فراق کے اس قول سے بہت متاثر نظر آتے ہیں کہ "انگریزی شاعری کی روح نے اُردو شاعری کا چولا بدل لیا ہے۔"

یعنی فراق کی اُردو شاعری میں انگریزی شاعری کی روح پیوست ہے۔ فراق کا درج ذیل شعر بھی اسی طرف اشارہ کرتا ہے:

جو کل میری زبان تھی، آج
دُنیا کی زبان ہوگئی ہے

یہ فراق کی شاعرانہ تعلّی ہے جس کا اظہار ان کے ہاں بار بار ہوا ہے۔ ڈاکٹر افغان اللہ خاں بھی یہاں تاثراتی ہوگئے ہیں حالانکہ انھوں نے غیر جانبدار ہوکر فراق کی شاعری کا تحقیقی مطالعہ پیش کرنے کی سعیِ بلیغ کی ہے۔ اس مقالے میں چھ ابواب ہیں جو فراق کی غزل، فراق کی نظم، فراق کی رُباعی اور فراق کے فکر و فن سے بحث کرتے ہیں۔ بقیہ دو باب حیات و شخصیت اور ادبی و سماجی پس منظر سے متعلق ہیں۔

فراق کی غزل گوئی کو مصنّف نے گورکھپور کے شعری ادبی ماحول کے پس منظر میں جانچا اور پرکھا ہے۔ فراق کا نظریۂ حُسن و عشق فراق کی غزل میں کن کن صورتوں میں جلوہ گر ہوا ہے اس پر بڑی تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ فراق اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود ہماری غزل کے کلاسیکی شعرا سے سبقت نہ لے جاسکے اور فراق کا یہ کہنا کسی بھی طرح حق بجانب نہیں:

غالب و میر و مصحفی
ہم بھی فراق کم نہیں

یا:

سہل تو نے فراق کو سمجھا
ایسے صدیوں میں ہوتے ہیں پیدا

اس طرح کے دعوے فراق کے سطحی پن کی دلیل ہیں۔ وہ غالب و مصحفی بننے کا ادعا تو کرتے ہیں لیکن ان کی غزل ان شعرا کی رفعتوں اور علوئے تخیل کو پانے سے قاصر رہی ہے۔ فراق کی طبع انا پسند اساتذہ کے جوہر سے فیض اٹھانا نہیں چاہتی تھی بلکہ ان جیسا بننا چاہتی تھی۔

فراق کی نظم نگاری کے باب میں ڈاکٹر افغان اللہ نے اُردو نظم نگاری کے ارتقا کو پیش نظر رکھ کر شاعری اور سماجی ضرورت کے ارتباط سے بحث کی ہے۔ اور پھر ہندوستان کی سیاسی تہذیبی تاریخی حقیقتوں کے نتیجے میں اُردو نظم کے ارتقا کو کیفیت اور کمیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ انھوں نے فراق کی نظم نگاری سے بڑی اچھی بحث کی ہے۔ دراصل فراق اُردو کے پہلے نظم گو شاعر ہیں جنھوں نے اپنے لب و لہجے اور اسلوب کی مدد سے ایک خاص قسم کی کیفیت اور تاثر پیدا کیا۔ فراق کی دو نظمیں "آدھی رات" اور "پرچھائیاں" اس ذیل میں پیش کی جاسکتی ہیں۔ ڈاکٹر افغان اللہ خاں نے ان کی کچھ اہم نظموں کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ لیکن چوں کہ فراق بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور غزل ہی میں ان کا فن اور فکر اپنی تہہ داریاں دکھاتا ہے اسی لیے نظم نگاری میں وہ اپنا منفرد رنگ و آہنگ پیش نہیں کر پاتے لیکن جب وہ اُردو کے اہم نظم نگاروں کو دیکھتے ہیں تو صنفِ نظم کو بھی للچائی ہوئی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔

ڈاکٹر افغان اللہ خاں نے فنِ رُباعی کی مختصر تاریخ پر بحث کرتے ہوئے فراق کی رُباعی نگاری کا تجزیہ ۶۸ صفحات میں بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ فراق کی رباعیاں خاص طور سے "روپ" کی رُباعیاں ہندو تہذیب و تمدّن کے ساتھ ہندوستانی تمدّن کی گہری حقیقتوں سے مملو ہیں اس لیے یہ رُباعیاں ریت کال کی شاعری کے مطالعے کے بغیر آسانی سے سمجھی نہیں جاسکتیں۔ ہندی کے ریت کال کے شاعروں نے اپنے جمالیاتی ذوق کے اظہار کے لیے سنسکرت کے ڈراموں سے بہت اثرات قبول کیے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ہندو مذہب کے اساطیری واقعات بھی ان کی شاعری کی روح میں مضمر ہیں۔ فراق براہِ راست سنسکرت شعر و ادب سے استفادہ تو نہیں کرسکے لیکن ان کے مزاج اور ماحول نے ریت کال کے شاعروں کے اثرات کو رباعیوں میں ڈھال دیا ہے۔ ڈاکٹر افغان اللہ خاں اگر مختصراً سنسکرت اور ہندی کے قدیم رجحان کو پیشِ نظر رکھ کر "روپ" کی رُباعیوں کا مطالعہ پیش کرتے تو یہ باب مزید توجہ کا طالب ہوجاتا۔

فراق سے متعلق یہ مقالہ جو کتابی صورت میں ہمارے سامنے آیا ہے، مبسوط و کارآمد ہے اور فراق کی شاعری کے ایک اچھے مطالعے کی حیثیت رکھتا ہے۔

(ڈاکٹر) فضل امام
شعبۂ اُردو، الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

خوشخطی

مرتب: عزیز الحسن جعفری
صفحات: ۶۸
قیمت: ۷ روپے
ناشر: عرشی پبلیکیشنز، ۱۲/۱۰۱، گلی نمبر ۲۵، جعفرآباد، دہلی

خوش خطی کی کسی کتاب پر تبصرے کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی کیوں کہ اس میں

، اور کاتب کا کام زیادہ ہوتا ہے۔
سن جعفری صاحب کی مرتبہ کتاب
اے اطفال نے میری تمام تر توجہ
ذول کرلی۔ اس میں موصوف نے
، خطی سکھانے کے لیے جو طریقۂ کار
ہ بچوں کی فطرت کے عین مطابق ہے۔
، کی قلم پر گرفت مضبوط کرنے کے لیے
، ۱۲ صفحات صرف ایک تصویر سے
ر تک مختلف زاویوں سے سطریں لکھوانے
کیے گئے ہیں مثلاً دائیں طرف بطخ اور
دریا کی تصویر ہے۔ اوپر ہدایت لکھی
دریا سے ملائیے۔ یہ شغل بچوں کے لیے
ا اور اسی رو میں بچے ب پ ت ٹ
رہ حروف بنانے کی صلاحیت
گے۔ اسی طرح دیگر حروف کی مشق
یے بھی مختلف تصویریں اور اسٹائل
یں جس کے نتیجے میں حروف تہجی کے
تک پہنچنے سے قبل ہی بچے میں حروف
نے کی صلاحیت پیدا ہوسکتی ہے۔
ہی برقرار رہے' اس کا خاص اہتمام

——— علی ظہیر نقوی
۸۱/' ذاکر نگر' اوکھلا' نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

سے انسان تک
اندر جیت لال
: ۱۴۴' قیمت: ۴۰ روپے
ادھا پبلیکیشنز' ڈی۔ ۱۴ گل مہر
رک' نئی دہلی ۱۱۰۰۴۹

انور سے انسان تک" اندر جیت لال
کے پندرہ ہلکے پھلکے انشائیوں اور مزاحیوں کا مجموعہ
ہے اس کتاب میں مصنف کے تعارف کے طور پر
ایک "ممتاز خاکہ نگار" کے قلم سے ایک ہلکا پھلکا
مضمون بعنوان "ادھورا خاکہ پورا ادیب" بھی
شامل ہے۔ یہ ادھورا خاکہ ادھورا ہوتے ہوئے
بھی اندر جیت لال کے شخصی اور ادبی پہلوؤں
پر روشنی ڈالتا ہے۔ اسٹائل سے یہ خاکہ یوسف
ناظم صاحب کے زور قلم کا نتیجہ معلوم ہوتا
ہے اگرچہ اس پر "ممتاز خاکہ نگار" کا نام نہیں
دیا گیا۔ خاکے کا انداز بیان اور اسلوب بہت
رواں سلجھا ہوا اور پرکشش ہے جو مصنف
کی شخصیت کو پوری طرح اپنے میں سموئے ہوئے
ہے اور اس کے خدوخال اور ادبی زندگی کو
بخوبی پیش کرتا ہے۔

اندر جیت لال نے بہت ہی دلچسپ
موضوعات پر قلم اٹھایا ہے کتاب کا نام ہی
بڑی کشش رکھتا ہے ظاہر ہے کہ جانور سے
انسان بننے کی سب ہی منزلیں ہر قاری کی
دلچسپی کی حامل ہیں۔ "میرا قلم" مضمون میں
مصنف نے اپنی زندگی کی روداد بیان کی ہے
جو بہت دلچسپ ہے اور اس بات کا اظہار
بھی ہے کہ سچی لگن اور محنت مقصد کے حصول
کا بہترین وسیلہ ہے۔ اپنی ادبی خود نوشت
"میرا ادبی سفر" میں اندر جیت لال نے
اپنی ادبی اور علمی دلچسپیوں کے بارے میں
بتایا ہے، نیز انھیں جو سترہ انعامات اور
ایوارڈ تفویض ہوئے ہیں' ان کا بھی بالخصوص
ذکر شامل ہے۔ یہ مضمون یقیناً ان لوگوں
کے لیے مہمیز کا کام دے سکتا ہے جو ادبی
کاموں میں ہمت افزائی نہ پاکر دل چھوڑ
جاتے ہیں۔

"جانور سے انسان تک" نامی مضمون میں
انسان کی خوبیوں اور خامیوں کا جائزہ لیا گیا
ہے اور غالب کے الفاظ میں یہی کہا گیا ہے :

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

کیوں کہ انسان بننے کے لیے اخلاقی و نفسیاتی
جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ بقول اندر جیت
لال "جب قلب روحانیت سے سرشار ہوں گے۔
تب ہی انسانیت جگے گی" بصورت دیگر
جانور سے انسان تک کی بجائے انسان سے جانور
تک کے امکانات بڑھتے رہیں گے۔

دیگر مضامین میں "پوتا بادشاہ" میں
بچپن کی لازوال بے فکری کی دلچسپ عکاسی
ہے۔ "ناشر بنام شاعر" اور "ایرا غیرا" خوبصورت
طنزیے ہیں' اسی طرح "گھر جنوائی" "گھر دامادوں
کی زندگی پر ایک روایتی مگر دلچسپ طنز
ہے ایک ہلکی سی مسکراہٹ بہت سے اختلافوں
اور ذاتی رنجشوں کو ختم کرسکتی ہے اسی لیے
مصنف نے "مسکراہٹ" کو محبت کی زبان
کہا ہے۔ بقول مصنف "مسکراہٹ بچے کی ہو یا
بڑے کی یہ زندگی کی ایک بہت بڑی سعادت
ہے' جو ہر شخص کے حصے میں نہیں آتی کیونکہ
مسکراہٹ کا خمیر روح کے سکون اور قلب
میں رواداری کے مادے سے ہی تیار ہوتا ہے"۔
بھول میں بھول کو ایک نعمت بتایا گیا
ہے اور اس کی دلچسپ تاویلیں دی گئی ہیں۔

غرض اس کتاب کا ہر مضمون مختلف
موضوعات (جو گرد و پیش کی زندگی سے لیے
گئے ہیں) پر انشائیہ کے انداز میں یا تو فکری
تبصرہ و تنقید پیش کرتا ہے یا ہلکے پھلکے پیرائے
میں طنز یا مزاح کی کیفیت سے روشناس
کرواتا ہے۔ ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ

مصنف نے اس کتاب میں زندگی کی بہت سی سچی مگر کڑوی اور کسیلی باتیں مزاح کی شکر میں لپیٹ کر قاری کے حلق میں اتار دی ہیں نتیجتاً مضمون میں کڑواہٹ یا تیکھا پن براہِ راست نہ چبھ کر بھی اپنا گہرا تاثر چھوڑ جاتا ہے۔

سرورق سادہ مگر جاذبِ نظر ہے اچھی اور دلکش کتابوں کے شائقین سے اس کتاب کی سفارش بے جا نہ ہوگی۔

—— ایس۔ اے۔ رحمان

اسسٹنٹ ایڈیٹر نیشنل بک ٹرسٹ گرین پارک نئی دہلی ۱۶

کمندِ حرف

شاعر: عمران عظیم
قیمت: ۵۰ روپے
ملنے کا پتا: سائرہ پبلیکیشنز ’نیّر ولا‘ گنگوہ، سہارن پور (یو۔پی)۔

عمران عظیم کی شاعری کا منظرنامہ استعجاب، حیرت اور استفہام سے عبارت ہے جو ذہنِ جدید کا خاصہ ہے۔ عمران عظیم نے اپنی شاعری میں ”ماں“ کو مرکزی حیثیت دی ہے اور اس رشتے کے حوالے سے بڑی غور طلب باتیں کی ہیں۔ یہ رشتہ اتنا مقدس اور مبارک ہے کہ شاعر اُسے اپنے وجود اور حواس سے کسی لمحہ جدا کرنے پر راضی نہیں۔ اس کے نزدیک تمام ارضی و سماوی آفتوں اور عذابوں کا نتیجہ، ماں کی دُعا سے محرومی ہے:

عذاب جھیل رہا تھا کئی بلاؤں کے
لبوں پہ ماں کے گزشتہ دنوں دعا چپ تھی

عمران کے اشعار میں جہاں ماں کا کردار اپنی پوری تابناکی اور شفقتوں کے ساتھ جلوہ گر ہے وہیں عورت کا دوسرا حسین روپ بھی جگہ جگہ اپنی چھب دکھاتا ہے اور اس کے حوالے سے انسانی نفسیات کے اہم نکات بھی سامنے آتے ہیں:

الزام ہے کہ ہو گیا میں اپنے بیان کا
ہر فرد اب خفا ہے مرے خاندان کا

عمران کی غزل میں کلیدی حیثیت انسانی رشتوں کو حاصل ہے۔ جن میں شاعر کے نزدیک کچھ قابلِ احترام اور باقی نہایت کھوکھلے ہیں۔ چند اشعار مثبت پہلو کے پیش کیے جاتے ہیں:

بیٹیوں کے قد لیے صحن گھر کا چھوٹا ہے
اور ماں کی آنکھوں میں اک اداس صحرا ہے

ریل کے چلتے ہی آنکھیں بجھ گئیں
ماں کی حالت وقتِ رخصت کیا ہوئی

رخصت ہوا سفر کو تو خدشہ ہوا مجھے
ماں کا سکون و صبر بھی اشکوں میں بٹ نہ جائے

اب چند اشعار رشتوں کے منفی رخ کے تعلق سے بھی دیکھیے:

دیوار گھر کے بیچ کھڑی ہو گئی، عظیم
شہرت ملی جو مجھ کو تو بھائی نہ سہہ سکا

میرے دشمن نے خبر دی کہ بچاؤ سر کو
میرے اپنوں میں کہیں سنگ بہ کف تھا کوئی

ہم سے پوچھو رشتے ناطوں کے قصے
ہم نے پیتل کے یہ گہنے برتے ہیں

اس صراحت سے قطعاً یہ مراد نہیں کہ عمران عظیم کی شاعری کا کینوس صرف رشتوں کے خوب و ناخوب کا منظرنامہ ہے یہ ان کی شاعری کا بنیادی حوالہ بن گ[illegible] ہیں۔ اس کے ساتھ ہی بڑے شہ[illegible] افراتفری، اپنے محور سے کٹ جانے کا[illegible] اور ایک تعلیم یافتہ مگر بے کار نوجوان[illegible] اعمال و افعال کی حزنیہ داستان [illegible] کی غزل کے اہم موضوعات ہیں۔ جن[illegible] عصری شعور قابلِ اطمینان حد تک [illegible] ہے:

پڑھے لکھے بہت ہو مگر عجیب ہو تم
کسی بھی بات پہ سینہ سپر نہیں ہو[illegible]

مرا پتہ بھی تو ان کے پتے میں مضمر ہے
وہی جو میرے پڑوسی بھی ہیں پرائے [illegible]

آوارگی مزاج کی راس آ گئی اُسے
والد کی بے حساب کمائی نہ سہہ سکا

بچوں میں شعور اس قدر ہے
بچپن میں بزرگ ہو گئے ہیں

نعرۂ اتحاد لائے گا
شہر میں پھر فساد لائے گا

مندرجہ بالا اشعار عمران عظیم کے شعری سفر کی کا[illegible] غماز ہیں۔ ان کے لہجے میں طنز کی کاٹ اور [illegible] گہرائی ہے۔ عمران عظیم کے مجموعۂ کلام ”کمندِ حرف“ [illegible] مطالعے کے بعد یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے [illegible] ان کا شعری سفر اسی طرح لگن اور محنت سے جا[illegible] تو نئی غزل کے اہم شعرا کی فہرست میں ان کا نا[illegible] طور پر شامل ہو جائے گا۔

—— اسعد بدا[illegible]

شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

...و ناولوں میں ترقی پسند عناصر

ف: ڈاکٹر حیات افتخار
ات: ۳۶۸
ت: ۵۰ روپے
ر: نسیم بک ڈپو، ۲۵، پہلی منزل،
جی۔بی۔مارگ، لکھنؤ ۱۸ (یو۔پی)

زیر نظر کتاب جناب حیات افتخار کا تحقیقی
ہے جس پر مصنف کو مدراس یونیورسٹی کی
اسے ۱۹۸۳ء میں پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری
یش کی گئی۔ پیش لفظ کے علاوہ یہ کتاب
اب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں ترقی پسند
نظر، تعریف و تشریح، پس منظر اور پیش
د پیش کیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں
ادب میں ترقی پسندی کا عمومی جائزہ لیا
ہے۔ یعنی ترقی پسند شاعری، ترقی پسند
ہ اور ترقی پسند تنقید۔ تیسرے باب
ن فکر کے اعتبار سے اردو ناولوں کا
جائزہ لیا گیا ہے اس کے تحت اردو
ں کے ابتدائی دور، درمیانی دور اور
ناولوں کے ترقی پسند دور پر اظہار
لیا گیا ہے۔ چوتھے باب میں اردو کے
قی پسند ناول نگاروں اور ان کے فکر و فن
ان کے ناولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے بحث
ہے۔ پریم چند، کرشن چندر، عصمت چغتائی،
ت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، خواجہ
باس اور مہندر ناتھ کے ناولوں کو زیر
لایا گیا ہے۔ مگر رضیہ سجاد ظہیر اور
عین حیدر وغیرہ کو کیوں چھوڑ دیا گیا؟
رح شاعروں میں جہاں فیض احمد فیض،
فراق وغیرہ پر اظہار خیال کیا گیا ہے وہاں
نیاز حیدر، مخمور جالندھری جیسے اہم شعرا کو
فراموش کر دیا گیا۔

پانچواں باب 'ماحصل' کے عنوان سے
ہے جس میں اردو ناولوں میں ترقی پسند روایات
اور تصورات کی مجموعی قدر و قیمت پر بحث
کی گئی ہے۔

چھٹا باب کتابیات سے متعلق ہے۔
اس میں ان کتابوں کا ذکر ہے جن سے مصنف
نے استفادہ کیا ہے۔

کتابت اور طباعت اچھی ہے۔

— دلیپ بادل
۴۲۵، چراغ دلی، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۷

سرورق کے اندرونی صفحے کے لیے

موصولہ عنوانات

اگست ۱۹۹۰ء کے "ایوانِ اُردو" کے سرورق کے اندرونی صفحے پر جو تصویر چھاپی گئی تھی اس کے لیے موصول ہونے والے شعری اور نثری عنوانوں میں سے تصویر کی مناسبت سے موزوں سمجھے جانے والے چند عنوان ذیل میں درج کیے جارہے ہیں ـــــــ "گلدستہ" ان حضرات کو ارسال کیا جائے گا جن کے بھیجے ہوئے عنوان چوکھٹے میں دیے جارہے ہیں۔

شعری عنوانات

> مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
> اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے (غالب)
>
> مرسلہ: صبیحہ خانم، معرفت حمیدیہ لائبریری، اودی کلاں ۳۲۲۲۰۱ (راجستھان)

> وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
> اٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی (غالب)
>
> مرسلہ: احسان اللہ عمیر، کاشانۂ نجم، محلہ گدری بازار، پوسٹ لہریا سرائے، ضلع دربھنگہ ۸۴۶۰۰۱ (بہار)

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصوّرِ جاناں کیے ہوئے (غالب)

مرسلہ: خان مسعود احمد، اودی کلاں

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیرِ بارِ منّتِ درباں کیے ہوئے (غالب)

مرسلہ: چودھری غلام دبیر، کٹیہار

اسؔد خوشی سے مرے ہاتھ پانو پھول گئے
کہا جو اُس نے ذرا مرے پانو داب تو دے (غالب)

مرسلہ: افروز حیدر، مدھوپور

نزاکت اُس گلِ خوبی کی کیا کہوں انشا
نسیمِ صبح جو چھو جائے رنگ ہو میلا (انشا)

مرسلہ: خان اسد ملک، جے پور

سوچتے ہیں کسی کے پہلو میں
حُور کو کیا گلے لگائیں ہم (حفیظ جونپوری)

مرسلہ: طفیل احمد انصاری، جون پور

حسنِ کافر نے اپنے قدموں پر
اِتنے مومن جھکائے ہیں کہ نہ پوچھ (جوش)

مرسلہ: سعید احمد قائد، دہلی

اے دوست میرے سینے کی دھڑکن تو دیکھنا
وہ چیز تو نہیں ہے محبت کہیں جسے (ہری چند اختر)

مرسلہ: راشد مرزا، حیدرآباد

ویراں ہے میکدہ خم و ساغر اُداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے (فیض)

مرسلہ: عبدالرؤف خاں، اودی کلاں

عشق کا ذوقِ نظارہ مفت میں بدنام ہے
حسن خود بے تاب ہے جلوہ دکھانے کے لیے (مجاز)

مرسلہ: معین الدین شمسی، گریڈیہہ

نیند آرہی ہے ان کو آنکھیں جھپک رہی ہیں
لو بند ہو رہا ہے میرا شراب خانہ (شکیل)

مرسلہ: ابو عمارہ، اکوٹ اور نسیم احمد، نئی دہلی

مِری حیات کی غمگینیوں کا غم نہ کرو
غمِ حیات غمِ یک نفس ہے کچھ بھی نہیں (ساحر لد)

مرسلہ: محمد شمیم، ا

کون پونچھے مری آنکھوں کے سلگتے آنسو
کون اُلجھے ہوئے بالوں کی گرہ سُلجھائے (ساحر لد)

مرسلہ: انصار احم

خدا کرے کہ یہ لمحہ یہیں ٹھہر جائے
وہ اپنا سر مرے زانو پہ رکھ کے سویا ہے (شمیم

مرسلہ: یشرب بشر، د

نیند تو درد کے بستر پہ بھی آسکتی ہے
ان کی آغوش میں سر ہو یہ ضروری تو نہیں (خاموش

مرسلہ: عمر فاروق فڈنس، ا

نغمۂ جنبشِ لب ہیں ہے مقیّد، اے دوست
اور رقصاں ہے قیامت تری انگڑائی میں (دلاکر

مرسلہ: سمیع الدین خاں شاداب، را

مری داستاں کا عروج تھا تری نرم پلکوں کی چھاؤ
مرے ساتھ تھا تجھے جاگنا تری آنکھ کیسے جھپک

(بشیر

مرسلہ: شاہد حیدر وارثی، در

سورج کو چونچ میں لیے مرغا کھڑا رہا
کھڑکی کے پردے کھینچ دیے رات ہوگئی (ندا ف

مرسلہ: عمیر راجپوری، مظ

تری چادر میں تن سمیٹ لیا
ہم کہاں کے دراز قامت تھے (ممتاز

مرسلہ: حامد مرزا، حیا

سمیٹ لو تو یہ منظر ہیں ایک لمحے کے
جو طول دو تو یقیناً زمانہ چاہتے ہیں (اسعد

مرسلہ: نسیم الہدیٰ خان، مدہ

ترے قدموں سے میری زندگی کو خاص نسبت ہے
ترے قدموں میں اپنی زندگی محسوس کرتا ہوں (قمر

مرسلہ: عامرہ تبسم طالب، مراد

(بقیہ ص ۵۸

اُردو خبر نامہ

اکادمی کی سرگرمیاں

○ ۱۶ر جولائی کو دہلی اُردو اکادمی کی طرف سے نئی دہلی کے فِکّی آڈیٹوریم میں ایک شامِ غزل کا اہتمام کیا گیا جس میں پاکستان کی مشہور گلوکارہ محترمہ گلشن آرا سیّد نے لفظ اور آواز کا جادو جگایا۔ اس شام کے مہمانِ خصوصی اقلیتی کمیشن کے چیئرمین اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے چانسلر جناب سیّد مظفر حسین برنی تھے۔ صفِ سامعین میں بھی دلّی کی برگزیدہ شخصیتوں کو دیکھا جاسکتا تھا۔

سرورق کے اندرونی صفحے کے لیے موصولہ عنوانات

اگست ۱۹۹۰ء کے "ایوانِ اُردو" کے سرورق کے اندرونی صفحے پر جو تصویر چھاپی گئی تھی اس کے لیے موصول ہونے والے شعری اور نثری عنوانوں میں سے تصویر کی مناسبت سے موزوں سمجھے جانے والے چند عنوان ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں ——— "گلدستہ" ان حضرات کو ارسال کیا جائے گا جن کے بھیجے ہوئے عنوان چوکھٹے میں دیے جا رہے ہیں۔

شعری عنوانات

> مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
> اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے (غالب)
>
> مرسلہ: صبیحہ خانم، معرفت حمیدیہ لائبریری، اودی کلاں ۳۲۲۲۰۱ (راجستھان)

> وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
> اٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی (غالب)
>
> مرسلہ: احسان اللہ عمیر، کاشانۂ نجم، محلہ گدڑی بازار، پوسٹ لہریا سرائے، ضلع دربھنگہ ۸۴۶۰۰۱ (بہار)

جی ڈھونڈھتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے (غالب)

مرسلہ: خان مسعود احمد، اودی کلاں

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیرِ بارِ منتِ درباں کیے ہوئے (غالب)

مرسلہ: چودھری غلام دلیر، کٹیہار

اسدؔ خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اُس نے ذرا مرے پاؤں داب تو دے (غالب)

مرسلہ: افروز حیدر، مدھوپور

نزاکت اُس گلِ خوبی کی کیا کہوں انشاؔ
نسیمِ صبح جو چھو جائے رنگ ہو میلا (انشا)

مرسلہ: خان اسد ملک، جے پور

سوچتے ہیں کسی کے پہلو میں
حُور کو کیا گلے لگائیں ہم (حفیظ جونپوری)

مرسلہ: طفیل احمد انصاری، جون پور

حسن کافر نے اپنے قدموں پر
اتنے مومن جھکائے ہیں کہ نہ پوچھ (جوشؔ)

مرسلہ: سعید احمد قائد، دہلی

اے دوست میرے سینے کی دھڑکن تو دیکھنا
وہ چیز تو نہیں ہے محبت کہیں جسے (ہری چند اختر)

مرسلہ: راشد مرزا، حیدر آباد

ویراں ہے میکدہ خم و ساغر اُداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے (فیضؔ)

مرسلہ: عبدالرؤف خاں، اودی کلاں

عشق کا ذوقِ نظارہ مفت میں بدنام ہے
حسن خود بے تاب ہے جلوہ دکھانے کے لیے (مجازؔ)

مرسلہ: معین الدین شمسی، گریڈیہہ

نیند آ رہی ہے ان کو آنکھیں جھپک رہی ہیں
لو بند ہو رہا ہے میرا شراب خانہ (شکیل)

مرسلہ: ابو عمارہ، اکوٹ اور نسیم احمد، نئی دہلی

مِری حیات کی غمگینیوں کا غم نہ کرو
غمِ حیات غمِ یک نفس ہے کچھ بھی نہیں (ساحر لدھیانوی)

مرسلہ: محمد شمیم، کلکتہ

کون پونچھے مری آنکھوں کے سلگتے آنسو
کون اُلجھے ہوئے بالوں کی گرہ سلجھائے (ساحر لدھیانوی)

مرسلہ: انصار احمد، کلکتہ

خدا کرے کہ یہ لمحہ یہیں ٹھہر جائے
وہ اپنا سر مرے زانو پہ رکھ کے سویا ہے (شمیم جے پوری)

مرسلہ: یشرب بشر، دھنباد

نیند تو درد کے بستر پہ بھی آ سکتی ہے
ان کی آغوش میں سر ہو یہ ضروری تو نہیں (خاموش دہلوی)

مرسلہ: عمر فاروق فڈنس، شولاپور

نغمگی جنبشِ لب میں ہے مقید، اے دوست
اور رقصاں ہے قیامت تری انگڑائی میں (ڈاکٹر راہی)

مرسلہ: سمیع الدین خاں شاداب، رامپور

مری داستاں کا عروج تھا تری نرم پلکوں کی چھاؤں میں
مرے ساتھ تھا تجھے جاگنا تری آنکھ کیسے جھپک گئی (بشیر بدر)

مرسلہ: شاہد حیدر وارثی، دربھنگہ

سورج کو چونچ میں لیے مرغا کھڑا رہا
کھڑکی کے پردے کھینچ دیے رات ہو گئی (ندا فاضلی)

مرسلہ: عمیر راجہ پوری، مظفر پور

تری چادر میں تن سمیٹ لیا
ہم کہاں کے دراز قامت تھے (ممتاز راشد)

مرسلہ: حامد مرزا، حیدر آباد

سمیٹ لو تو یہ منظر ہیں ایک لمحے کے
جو طول دو تو یقیناً زمانہ چاہتے ہیں (اسعد بدایونی)

مرسلہ: نسیم الہدیٰ خان، مدھوبنی

ترے قدموں سے میری زندگی کو خاص نسبت ہے
ترے قدموں میں اپنی زندگی محسوس کرتا ہوں (قمر قریشی)

مرسلہ: عامرہ تبسم طالب، مراد آباد

(بقیہ صفحہ ۵۸ پر)

اُردو خبر نامہ

اکادمی کی سرگرمیاں

○ ۱۶ر جولائی کو دہلی اُردو اکادمی کی طرف سے نئی دہلی کے فکّی آڈیٹوریم میں ایک شامِ غزل کا اہتمام کیا گیا جس میں پاکستان کی مشہور گلو کارہ محترمہ گلشن آرا سیّد نے لفظ اور آواز کا جادو جگایا۔ اس شام کے مہمانِ خصوصی اقلیتی کمیشن کے چیئرمین اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے چانسلر جنابِ سیّد مظفّر حسین برنی تھے۔ صفِ سامعین میں بھی دلّی کی برگزیدہ شخصیتوں کو دیکھا جاسکتا تھا۔

پچھلے دنوں ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب جو چند برس سے لندن میں مقیم ہیں، دلّی آئے تو اُردو اکادمی نے ان کے خیر مقدم میں ایک محفل ترتیب دی جس میں موصوف نے لندن میں اُردو زبان و ادب اور ان کی تعلیم و تدریس کی موجودہ صورتِ حال پر روشنی ڈالی۔
تصویر میں دائیں سے: ڈاکٹر شارب ردولوی، ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب، پروفیسر نثار احمد فاروقی، سیّد شریف الحسن نقوی اور محترمہ ممتاز میرزا۔

ہر سال کی طرح اس سال بھی جشنِ آزادی کی تقریبات کے سلسلے میں ۱۱ اگست کی شام کو اُردو اکادمی دہلی کی طرف سے نظم گو شعرا کا مشاعرہ منعقد ہوا جس میں ملک کے مشہور و ممتاز نظم گو شعرا نے شرکت کی۔ مشاعرے کی صدارت پروفیسر شکیل الرحمٰن نے کی اور نظامت کے فرائض جناب خورشید افسر بسوانی نے ادا کیے ـــــ اسٹیج کا ایک منظر، دائیں سے: جناب علی سردار جعفری، پروفیسر شکیل الرحمٰن، جناب کنور مہندر سنگھ

سامعین نے مشاعرہ بڑی توجہ اور انہماک سے سنا

(تصاویر: سید فدا علی)

کرناٹک اُردو اکادمی، بنگلور

کرناٹک اُردو اکادمی بنگلور کی تشکیل ۳۰ جولائی ۱۹۸۷ء کو عمل میں آئی۔ ذیل میں ستمبر ۱۹۸۷ء تا ۳۰ مارچ ۱۹۹۰ء میں انجام دی گئی خدمات کی ایک مختصر رپورٹ درج ہے:

ادبی و تہذیبی سرگرمیاں

۱۔ شام ظرافت میسور دسمبر ۱۹۸۷ء اور شب قہقہہ کولار مارچ ۱۹۸۹ء۔

۲۔ سمینار بعنوان کرناٹک میں اُردو ادب کا موقف آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد فروری ۱۹۸۸ء گلبرگہ۔

۳۔ مشاعرہ ہبلی مارچ ۱۹۸۸ء بلگام دسمبر ۱۹۸۸ء بلاری جنوری ۱۹۸۹ء اور رائچور اکتوبر ۱۹۸۹ء۔

۴۔ شب غزل گلبرگہ فروری ۱۹۸۸ء بنگلور مارچ ۱۹۸۸ء ہاسن جنوری ۱۹۸۹ء مارچ ۱۹۹۰ء بنگلور۔

۵۔ تحریر و تقریر اور افسانہ نویسی کے مقابلے ۱۶ اضلاع میں ہائی اسکول سے ایم۔ اے تک کے طلبا کے لیے ۸۹-۱۹۸۸ء اور ۹۰-۸۹ء میں منعقد کیے گئے۔ کامیاب طالب علموں کو انعامات بشکل کتب اور توصیفی اسناد دی گئیں۔

۶۔ مولانا ابوالکلام آزاد صدی تقاریب کے سلسلے میں اکتوبر ۸۸ء کو بنگلور میں سمینار کا انعقاد۔

۷۔ جنوبی ہند اُردو کانفرنس بیدر فروری ۱۹۸۹ء۔

۸۔ اُردو استادوں اور انسپکٹر آف اسکولس کے لیے پانچ روزہ کارگاہ کاروار میں جنوری ۱۹۹۰ء۔

توسیعی خطبات

بعنوان سرسید احمد خاں، از جناب سید حامد، ۱۷ فروری ۹۰ء میسور۔

بعنوان حسرت موہانی معائب سخن کی روشنی میں، از جناب شمس الرحمان فاروقی،

۴ مارچ ۹۰ء، گلبرگہ۔

بعنوان مولانا محمد علی جوہر، از پروفیسر گوپی چند نارنگ، ۲۵ مارچ ۹۰ء، بنگلور۔

بعنوان پریم چند، از ڈاکٹر غیاث اقبال

۲۷ مارچ ۹۰ء، دھارواڑ۔

۱۰۔ بچوں کا پروگرام۔ بسلسلہ جواہر لال نہرو صدی تقاریب۔

تحتانیہ اور فوقانیہ مدرسوں کے بچوں کے لیے ٹمکور میں، ۲۰ فروری ۹۰ء، ۷ مارچ ۹۰ء

۱۱۔ شام افسانہ شیموگہ میں ۳۰ دسمبر ۸۹ء مہمان خصوصی محترمہ عصمت چغتائی۔

۱۲۔ تقریب تقسیم ایوارڈ بنگلور میں ۷ مارچ ۹۰ء۔

خصوصی انعام (ریاستی سطح پر)

مجموعی خدمات برائے اُردو زبان و ادب:

(۱) حکیم محمد امام امامی (۸۸ء)

(۲) جناب محمد قاسم پیارے (۹۰ء)

برائے شاعری:

(۱) جناب فیاض بلگوڑی (۸۸ء)

(۲) جناب حمید الماس (۸۹ء)

(۳) جناب راہی قریشی (۹۰ء)

برائے نثر:

(۱) سید شہاب الدین ندوی (۸۸ء)

(۲) جناب میر محمود حسین (۸۹ء)

(۳) جناب سلیم تمنائی (۹۰ء)

مندرجہ ذیل کتابوں پر انعام دیا گیا۔

۸۷-۱۹۸۶ء

چلنی چھلنی سائبان، از تنہا تماپوری

کالی داس فن اور شخصیت، از محترمہ شاہدہ شبنم

اندھے رشتے، از انل ٹھکر

شبنم شبنم، از محترمہ حسنہ سرور

آزردہ ستارے، از ملا عبدالغنی

۸۸-۱۹۸۷ء

کرشن چندر کے ناولوں میں نسوانی کردار

ماہ رو زمانی

چراغ وطن، جناب ثناء اللہ چراغ

۸۹-۱۹۸۸ء

حرف تمام، جناب منیر احمد جامی

آواز فطرت، جناب عبدالقدیر شاکر

دبستان حفیظ، ڈاکٹر ایم۔ اے حفیظ

بن باس، محترمہ کوثر پروین

۹۰-۱۹۸۹ء

برف کے پھول، محترمہ حسنہ سرور

آم چھو املی چھو، جناب بگڑ رائچوری

طالب علموں کی ہمت افزائی

۸۷-۸۸ء (۵)، ۸۸-۸۹ء (۱۰)، اور ۸۹-۹۰ء میں (۱۸) طالب علموں کو جنھوں نے ضلعی سطح پر ذریعہ تعلیم اُردو/ ثانوی زبان اُردو میں امتیازی نشانات حاصل کیے فی کس ۲۰۰ روپے کی کتابیں اور توصیفی سند دی گئی۔ علاوہ ازیں پی یو سی تا پی جی کے طالب علموں کو اُردو زبان و ادب میں امتیازی نشانات حاصل کرنے پر وظائف جاری کیے گئے۔

اشاعت کے لیے جزوی مالی امداد

۸۷-۸۸ء (۱۸)، ۸۸-۸۹ء (۱۲)، ۸۹-۹۰ء میں (۱۷) ادبا اور شعرا کو یہ مدد پیش کی گئی۔

لائبریریوں کو مالی امداد بشکل کتب و رسائل

ریاست کی ۳۰ لائبریریوں کو تین سال میں مبلغ ۲۷۰۰۰۰ (دو لاکھ ستر ہزار) کی کتابیں اور رسالے فراہم کیے گئے۔

اکادمی کی مطبوعات

(۱) فصیل مولانا ابوالکلام آزاد نمبر

(۲) فصیل جنوبی ہند اُردو کانفرنس نمبر

(۳) فصیل گلبرگہ سیمینار نمبر

(۴) خبرنامہ ۸۸-۸۹ء

(۵) خبرنامہ ۸۹-۹۰ء (زیر طبع)

(۶) کرناٹک میں اُردو ادب کی تار

جلد اول (عہد بہمنی، عادل شاہی اور بر شاہی کی ادبی خدمات) (زیر طبع)

(۷) فصیل توسیعی خطبات نمبر (زیر ط

(۸) انتخاب نثر ادب (زیر طبع)

کوچنگ کلاسیں

ریاست کے پانچ شہروں میں فر کوچنگ سینٹرس کا قیام عمل آیا۔ سال گذشتہ ۳۱ طلبہ نے ادارۂ اد اُردو حیدرآباد کے امتحان میں کامیا حاصل کی امسال گلبرگہ، بنگلور، میسو شیموگہ اور بلگام سے اُردو دانی اور اُ زبان دانی میں شرکت کرنے والوں کی تقریباً (۱۰۰) ہے۔ یہ مراکز ادارۂ ا اُردو سے ملحق ہیں۔

اُردو ملک کی دولت

گذشتہ دنوں ایوان غالب دہ نائب صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر شنکر دیا نے رسالہ "فکر و آگہی" کے رفعت سروش کا اجرا فرمایا۔ انھوں نے رسالے کی ا ڈاکٹر رضیہ حامد اور رفعت سروش کو دی اور کہا کہ جب بھی موقع ملتا ہے کے جلسوں میں ضرور شرکت کرتا ہوں

مانتا ہوں کہ اردو میرے ملک کی دولت ہے اور اس کو سنبھالنا بڑھانا ہماری ذمہ داری ہے۔ پورے ہندوستان کی ذمہ داری ہے۔

انھوں نے یہ بھی کہا کہ آج کاغذ اور طباعت کی گرانی کے دور میں حکومت کو چاہیے کہ ادبی کتابوں کی اشاعت کے لیے مدد دے اور وافر تعداد میں لائبریریوں میں بھجوائے۔

صدرِ جلسہ جناب آنند نرائن ملّا نے فرمایا" اگر ہماری قدر اوّل ملک کی یک جہتی ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اُردو اس یک جہتی کے لیے کوئی خطرہ ہے، یا اس کو آگے بڑھانے میں مددگار ثابت ہوگی"۔ انھوں نے کہا یہ میرا عقیدہ ہے کہ اُردو کے بغیر یک جہتی اور یگانگت ناممکن ہے۔ ملّا صاحب نے نمبر پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ رفعت سروش کی دو خصوصیات ہیں۔ ایک ان کا انفرادی انداز اور دوسرے ان کی قدرتِ کلام۔

مشہور محقق جناب مالک رام نے رفعت سروش کی نثر نگاری کو ان کی شاعری پر فوقیت دی اور کہا کہ وہ نہایت بے باکی سے قلم اُٹھاتے ہیں۔ وہ اپنے بارے میں کچھ کہہ رہے ہوں یا اور کسی کے بارے میں دو ٹوک الفاظ میں کہہ گزرتے ہیں۔ ان کی نثر بہت جاندار ہے۔

پروفیسر علی محمد خسرو نے رفعت سروش کی ڈراما نگاری پر روشنی ڈالی اور ان کی اس مقبولیت کا ذکر کیا جو بحیثیت اُردو مجلس کے پروگرام پروڈیوسر کے انھیں حاصل رہی ہے۔

جلسے کی ابتدا ڈاکٹر شارب ردولوی کے استقبالیہ کلمات سے ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ رفعت سروش اپنی شاعری میں گذشتہ پچاس سال کا احاطہ کرتے ہیں جو ہمارے ادب کا ایک اہم دور ہے۔

جناب م. م. راجندر نے اپنی تقریر میں کہا کہ فکر و فن کے تنوع کے اعتبار سے رفعت سروش ہشت پہلو شخصیت رکھتے ہیں۔ ۳۸۰ صفحات کا یہ نمبر جس میں ۶۵ قلمکاروں کے مضامین شامل ہیں۔ ان کے فکر و فن کا بھرپور احاطہ کرتا ہے۔

جلسے کے آخر میں سمن دیوگن اور اُستاد حفیظ خاں نے کلامِ رفعت سروش سے سامعین کو محظوظ کیا۔

(سید محمد عاصم)

راجستھان میں اُردو اشاعتی ادارے کا قیام

راجستھان اُردو زبان و ادب کا گہوارہ رہا ہے لیکن اشاعتی سہولتوں کی اس صوبے میں کمی رہی ہے اور آزادی کے بعد تو یہ سہولتیں نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہیں۔ ان حالات میں یہ خبر خوش آئند ہے کہ ٹونک میں حال ہی میں نازش بک سنٹر کے نام سے ایک اُردو اشاعت گھر کا قیام عمل میں آیا ہے جو اُردو کتابوں کی طباعت اور اشاعت کے علاوہ ہندوستان بھر سے شائع ہونے والی کتابوں کی اندرونِ راجستھان فراہمی کا کام بھی کرے گا۔ راجستھان نیز بیرونِ راجستھان کے مصنفین، کتب فروش اور لائبریریاں درج ذیل پتے پر اس ادارے سے رابطہ قائم کر سکتی ہیں: نازش بک سنٹر، کمیر میر عالم خاں، محلہ امیر گنج، ٹونک، راجستھان۔

(رزاق ارشد)

اُردو ریسرچ اسکالرز ایسوسی ایشن کی تشکیل جدید

اُردو ریسرچ اسکالرز ایسوسی ایشن، بہار، مظفرپور کی مجلس عاملہ کی ایک خصوصی نشست زیرِ صدارت پروفیسر ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی منعقد ہوئی جس میں باتفاق رائے یہ طے پایا کہ ایسوسی ایشن کو مزید فعال اور سرگرم بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی از سرِ نو تشکیل کی جائے۔ چنانچہ مذکورہ تجویز کے مطابق ایسوسی ایشن کے درج ذیل عہدہ داران منتخب کیے گئے:

پروفیسر ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی (چیئرمین)

ڈاکٹر ولی احمد ولی (صدر)

جناب محمد نقی امام (نائب صدر)

ڈاکٹر وجیب الرحمٰن (جنرل سکریٹری)

ڈاکٹر جلال اصغر فریدی (سکریٹری)

ڈاکٹر محمد سلیم اللہ (ناظم)

مجلس عاملہ کے ۱۲ ارکان نامزد کیے گئے۔

اخیر میں صدرِ نشست پروفیسر ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی نے ایسوسی ایشن کی غرض و غایت پر روشنی ڈالتے ہوئے عہدے داروں کو اپنی ذمہ داریوں کے ساتھ سرگرم عمل رہنے کی تلقین کی۔

(وجیب الرحمٰن)

پچھلے دنوں شاہجہانپور میں مشہور شاعرہ محترمہ سیدہ شانِ معراج کے تازہ شعری مجموعے کا اجرا دہلی اردو اکادمی کے سیکریٹری سید شریف الحسن نقوی کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس موقعے پر ایک کل ہند مشاعرہ بھی منعقد ہوا۔

عالم میں انتخاب — دِلّی

تیرھویں صدی کی ابتدا میں دہلی ترکوں کی سلطنت کا پایۂ تخت بنا اور ایک کے بعد دوسری جگہ آبادی کے بسنے کے باوجود دہلی کی رونق قائم رہی۔ مہیشور دیال صاحب نے لال کوٹ، کلوکھڑی، تغلق آباد، جہاں پناہ، فیروز آباد، دین پناہ اور پرانا قلعہ، شیر گڑھ اور شاہ جہاں آباد کا ذکر کیا ہے۔ سب سے زیادہ تفصیلی ذکر شاہ جہاں آباد کا ہے۔

لوگ کیسے مکانوں میں رہتے تھے، کیا اُن کے شغل اور مشغلے تھے، پھیری والے کیا آوازیں لگاتے تھے، بچوں کے کھیل کود کیا تھے، کھانا پینا، دسترخوان، پان اور حقہ اور ان سے متعلق کہاوتیں، دلی کے لوگ گیت، مہذب اور وضع داری، داستان گوئی، تعلیمی ادارے، فنِ خطاطی، تشبیہیں اور استعارے، میلے اور تہوار غرض کہ ہر وہ چیز جو طرزِ زندگی کی تصویر کھینچتی ہے، مہیشور دیال صاحب نے پیش کی ہے۔

مصنف : مہیشور دیال

صفحات : ۲۱۶　　قیمت : ۵۲ روپے

دِلّی کی تہذیب

دلّی صرف ایک شہر ہی نہیں، بلکہ صدیوں سے ہندوستانی تہذیب کا مرکز رہا ہے۔ اس کی تاریخ صرف ایک شہر کی نہیں بلکہ پورے برصغیر کی تاریخ ہے۔ یہاں بارہا وہ قتل و غارت گری ہوئی ہے جس پر ہلاکو خاں کو بھی شرم آئے۔ لیکن یہیں علم و فن اور اخلاق و مذہب نے بھی ایسی ترقی کی کہ اس کے آگے سمرقند و بخارا بھی ماند پڑ گئے۔ یہیں اُس مشترکہ تہذیب نے جنم لیا، جس نے مختلف مذاہب اور مختلف عقائد و نظریات کے لوگوں کو ایک ساتھ زندہ رہنے کا سلیقہ سکھایا۔

مرتب : ڈاکٹر اختلاط مرزا　　صفحات : ۸۴　　قیمت : ۱۷ روپے

○

نوجوان شاعر نواز دیوبندی جنھیں میرٹھ یونیورسٹی میرٹھ نے ان کے تحقیقی مقالے ”دارالعلوم دیوبند کی

اُردو صحافتی خدمات“ کے موضوع پر پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری تفویض کی ہے۔

○○

آپ کی رائے

○ ماہنامہ "ایوانِ اردو" (مئی ۱۹۹۰ء) میں ایک مضمون بعنوان "رُباعی کا بنیادی وزن" نظر سے گزرا۔ اس مضمون میں رُباعی کے بنیادی وزن وغیرہ کے بارے میں جو بحث کی گئی ہے اور اُس کی تائید میں جو دلائل پیش کیے گئے ہیں اُن سے مجھے قطعی اتفاق نہیں ہے۔ وجوہ درجِ ذیل ہیں:

۱۔ کلیدِ عروض کے مؤلف نے مفاعلتن اور متفاعلن پر زحافات اضمار اور عصب کے عمل سے ارکانِ مزاحفہ مفاعی لن اور مس تف علن برآمد کرنے میں کوئی بے ضابطگی نہیں کی کیونکہ اصل زحافات کی موجودگی میں زحافِ تسلین کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ لہٰذا اس بنا پر یہ کہنا بھی غلط ہے کہ تسکین کی تعریف درست نہیں ہے۔ اس کے علاوہ کلیدِ عروض میں درج اس قول کو کہ "محقق طوسی نے اضمار اور عصب کو دیکھ کر زحافِ تسلین ایجاد کیا تھا" محض غلط فہمی قرار دینا بھی قولِ قیاسی ہوا کیونکہ اس کے خلاف کوئی تحقیقی ثبوت زیرِ بحث مضمون میں فراہم نہیں کیا گیا۔

۲۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مفاعی لن کی فروعات سے اور بحکم معاقبہ مسلماتِ فن میں درج رودکی کے دریافت شدہ مندرجہ ذیل دونوں ہی وزن بنیادی ہیں جیسا کہ اُن کی فروعات سے ظاہر ہے۔ بحکم معاقبہ مفاعلن (مقبوض) کی جگہ مفاعیل (مکفوف) لانا جائز ضرور ہو جاتا ہے تاہم اُن کی فروعات مقبوض اور مکفوف ہی برقرار رہتی ہیں۔

(۱) مفعولُ۔ مفاعلن۔ مفاعیلن۔ فعل/فعول
اخرب۔ مقبوض مکفوف۔ مجبوب/اہتم

(۲) مفعولُ۔ مفاعیلُ۔ مفاعیلُ۔ فعل/فعول
اخرب۔ مکفوف ۔ مجبوب/اہتم

عروض و ضرب میں چوں کہ دو دو ارکان مزاحفہ فعل اور فعول لائے گئے ہیں اس لیے اِن بنیادی اوزان کی چار صورتیں خود بخود وجود میں آجاتی ہیں۔ لہٰذا کلیدِ عروض میں رُباعی کے اصل اوزان کی تعداد چار درج کی گئی ہے جو ہر طرح مناسب ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو رودکی کے لیے ملے جُلے دو بنیادی اوزان پر تخنیق کا عمل کرنا خاصا سر درد ہوتا اور اگر اِن تمام اوزان کو ایک ہی وزن میں گڈمڈ کر دیا جاتا (جیسی کہ زیرِ بحث مضمون میں سفارش کی گئی ہے) تب تو تخنیق کا عمل ایک گورکھ دھندا ہی بن کر رہ جاتا۔ علم عروض پہلے ہی نہایت خشک اور اُلجھا ہوا مضمون ہے اس طرح تو وہ اور بھی ادق اور پیچیدہ ہو کر رہ جائے گا۔

۳۔ عَرَج شدہ رُباعی کے جو مزید اٹھارہ اوزان برآمد کیے گئے ہیں وہ "سبب پئے سبب اور وتد پئے وتد است" کے آزمودہ اور بے خطا فارمولے کی کسوٹی پر کھرے نہیں اُترتے۔ عروض و ضرب میں "فاع" عَرَج یعنی سبب وتد ... آیا ہے اور اس سے قبل عیل ... (وتد مفروق) اور علن (وتد مجموع) لائے گئے ہیں جو مذکورہ فارمولے کے مطابق دُرست نہیں۔ لہٰذا یہ تمام اوزان (عَرَج شدہ) خود بخود غلط ہو کر رہ جاتے ہیں۔

آر۔ پی۔ شرما مہرش، بمبئی

○ جولائی کے شمارے میں "رائل ایشیاٹک سوسائٹی" پر مضمون پسند آیا لیکن تفصیلی جائزے کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ افسانے تمام اچھے ہیں۔ "رہ بتی" اور "نابینا چشم دید گواہ" سماجی افسانے ہیں آپ اسی طرح کے مضامین اور افسانے برابر شائع کرتے رہیں۔

—— محمد شمشاد، گیا

○ "ایوانِ اردو" پابندی سے پہنچ جاتا ہے۔ رسالے کی پشت پر جو غزل شائع ہوتی ہے۔ وہ میرے لیے سامانِ سرور ثابت ہوتی ہے۔

ماہ جولائی ۹۰ء کا شمارہ پیشِ نظر ہے۔ افسانوں میں "صبح ہونے تک" اور "نابینا چشم دید گواہ" نے بے حد متاثر کیا۔

—— محمد وقار افروز، بلڈانہ

○ جولائی کے "ایوانِ اُردو" میں ستیہ پال آنند کا افسانہ "صبح ہونے تک" کافی پسند آیا۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے اسے "ایوانِ اُردو" میں شائع کر کے ہم تک پہنچایا اور ستیہ پال صاحب کا بھی کہ انھوں نے اتنا اچھا افسانہ لکھا۔ جس میں تازگی بھی ہے خوشبو بھی اور دلکشی بھی۔

پروفیسر عنوان چشتی اور مظفر حنفی کی غزلیں بڑی پُرلطف اور ذائقہ دار ہیں۔ اگرچہ موجودہ شمارے میں کچھ چیزیں ایسی بھی شائع

ہوئی ہیں جو "......" میں بھی جگہ پانے کے
قابل نہیں ہیں۔ طنز و مزاح کے تحت "جوتا"
بڑی چٹ پٹی اور زندہ دل تحریر ہے لیکن اس
میں بھی اسلوب کی کمزوری اور بات کہنے کا پُرانا
اسٹائل کھٹکتا ہے۔

—— محمد حامد، دربھنگہ

○ جولائی کے شمارے میں میرا خط شائع کرکے آپ
نے جو مدیرانہ دیانتداری کی مثال دی ہے اس کے لیے
آپ قابلِ مبارکباد ہیں۔ میرا خیال ہے کہ رسالے
میں تنقیدی خطوط بھی شائع ہونا چاہیے۔
اس سے تخلیق کار اور مدیر کو بُرا نہیں
ماننا چاہیے۔

اگست ۱۹۹۰ء کے "ایوانِ اُردو" کے
سبھی مضامین پڑھ گیا۔ سبھی مضامین اچھے
اور اہم ہیں۔ اس بار افسانے بھی اچھے
لگے۔ شعری حصہ تو اچھا ہوتا ہی ہے۔ نشتر
خانقاہی کی غزلیں بہت دِنوں بعد پڑھنے
کو ملی ہیں۔ اسعد بدایونی، ناز قادری اور
شمیم فاروقی کی غزلیں خاص طور پر
پسند آئیں۔

—— افضال احمد ندیم، پٹنہ

○ "ایوانِ اُردو" صاف ستھرا معلومات
آفریں پرچہ ہے۔ صوری اور معنوی طور پر
خوب صورت مضامین اور افسانوں سے پہلے میری
نظر قارئین کے خطوط پر پڑتی ہے۔ آج کل خطوں
ہی میں تنقید، تبصرے اور تنقیص پڑھنے کو مل
جاتی ہے۔ گویا دریا کوزوں میں بند ہو جاتے
ہیں۔ تنقید اگر دل آزاری سے پاک ہو تو لکھنے
والے کے لیے نئی راہیں کھولنے کا باعث بنتی
ہے۔ اکثر خط اتنے دلچسپ اور معلوماتی ہوتے
ہیں کہ بجائے خود چھوٹے موٹے مضامین بن
جاتے ہیں۔

—— عفت موہانی، حیدرآباد

○ اگست کے "ایوانِ اُردو" میں مضمون
"کیرالا میں اُردو" بہت اچھا اور معلومات
افزا ہے مگر مُصنّف نے یہ نہیں بتایا کہ انھیں
یہ اعداد و شمار کہاں سے ملے ہیں؟ فاروق
کالج کو ہر جگہ فرخ کالج لکھا ہے جہاں یہ
کالج واقع ہے اس شہر کا نام بھی فاروق ہے
اور اسے انگریزی میں FEROKE لکھتے
ہیں یہ اس ندی کے نام پر ہے جس کے کنارے
شہر فاروق آباد ہے یہ نام عربی سے آیا
ہے اور اس سے غالباً مراد یہ ہوگی کہ وہ ندی
دو علاقوں کے بیچ میں حد فاصل ہے۔ بہر حال
مضمون کے قابلِ داد ہونے میں شک نہیں۔

خواجہ خطیر کے بارے میں تاباں نقوی صاحب
نے جو باتیں لکھی ہیں دلچسپ ہیں مگر انھیں حوالے
دینا چاہیے تھے۔ میرے علم میں نہیں کہ کسی نے ان
کا امروہہ میں انتقال ہونا لکھا ہو۔ اُن کے بارے
میں ہم عصر ماخذ ضیاء الدین برنی کی تاریخ فیروز
شاہی ہے اس میں تین مقامات پر خواجہ خطیر کا
ذکر آیا ہے اور امروہہ سے اُن کے تعلق کی طرف
کوئی اشارہ نہیں۔ برنی کا بیان ہے کہ معز الدین
کیقباد کے عہد (۶۸۶ھ — ۶۸۹ھ)
میں یہ وزیرِ مملکت تھے اور ملک نظام الدین
نے انھیں گدھے پر بٹھا کر شہر میں گشت کرائی
تھی۔ ۶۹۵ھ میں علاء الدین خلجی نے خواجہ
خطیر کو (جو بقول برنی وزراء میں سب سے
زیادہ نیک نام تھے) پھر وزیر مقرر کیا۔
غیاث الدین تغلق کا عہد آیا (۷۲۰ھ۔
۷۲۵ھ) تو اس نے عہد علائی کے بقیۃ السیف
امراء کے ساتھ حسنِ سلوک کیا جن میں خواجہ
خطیر بھی شامل تھے۔ یہ بیان کہ خواجہ خطیر
۶۷۸ھ میں ترکستان سے آئے اور وہ حضرت
قطب الدین مودود چشتی کی اولاد میں تھے
یا امروہہ میں اُن کا انتقال ہوا اور وہیں
مدفون ہوئے اِن سب باتوں کے لیے سند
درکار ہے۔ تاباں صاحب کو حوالہ دینا
چاہیے۔

حضرت مودود چشتی کو سلسلۂ چشتیہ
کا "بانی" بھی کہنا دُرست نہیں۔ وہ سلسلے کے
مشائخ کبار میں سے ہیں۔ اس کی سند بھی
درکار ہے کہ خواجہ اجمیریؒ کا سلسلۂ نسب آن
سے متصل ہوتا ہے۔

مثنوی قران السعدین کے جو اشعار درج
ہوئے ہیں ان میں آخری شعر کا ترجمہ دور
از کار ہے "جائے خود" سے وطن اور "پیوند
خویش" سے اہل و عیال (بیوی بچے)
مراد ہیں۔

آخری دو تین پیراگراف میں کچھ
کرامتوں کا بیان بھی ہوگیا ہے اس سے
مضمون کی تاریخی حیثیت کمزور ہوتی ہے۔

—— نثار احمد فاروقی، نئی دہلی

○ ایک عرصے کے بعد جناب خالد اشرف
کے مضمون "یاما" شاہد رعنا اور امراؤ جان ادا"
("ایوانِ اُردو" اگست) میں الیگزنڈر کپرن کے
مشہور ناول "YAMA, THE PIT" کا تفصیلی
ذکر پڑھ کر یک گونہ مسرت ہوئی۔ یہ ناول ایک
زمانے میں کافی زیرِ بحث رہا تھا — اپنے
موضوع اور بے باکانہ اظہار کے باعث لیکن
فنی اعتبار سے اسے ٹالسٹائی یا دوستوفسکی
کے ناولوں کے مقابلے میں کسی طرح نہیں رکھا
جاسکتا۔ زیادہ سے زیادہ اس کا شمار

دوسرے درجے کے ناولوں میں ہو سکتا ہے۔
بہرحال بہت کم لوگوں کو اب اس کا علم ہوگا کہ اس ناول کا اردو ترجمہ "یاما" کے نام سے ہی اب سے قریباً ساٹھ سال پہلے شائع ہوا تھا، اور بہتوں کے لیے یہ اطلاع دلچسپی اور حیرت کا باعث ہوگی کہ یہ ترجمہ ن۔ م۔ راشد نے کیا تھا۔ شاید معاشی ضرورتوں کے تحت۔ اس وقت بحیثیت شاعر ان کا کوئی خاص مقام نہیں تھا۔ "یاما" کے علاوہ قاضی سرفراز حسین کے ناول "شاہد رعنا" کا ایک پرانا نسخہ بھی میرے ذاتی کتب خانے میں موجود ہے۔

—— مظہر امام، دربھنگہ

○ اگست کے "ایوانِ اردو" میں جناب جی۔ ڈی۔ چندن کا مضمون "کاتب کمپیوٹر: اردو صحافت کی نئی صبح" پڑھا۔ جو دہلی میں ہونے والے کمپیوٹر کے مظاہرے سے متعلق ہے مگر مضمون تفصیلی معلومات فراہم کرنے میں کامیاب نہیں۔ جالندھر سے نکلنے والا روزنامہ "ہند سماچار" ہی نہیں، بنگلور سے نکلنے والا روزنامہ "سلطان" اور کچھ اور اخبار بھی کمپیوٹر سے شائع ہو رہے ہیں۔ نوری نستعلیق کمپیوٹر پاکستان کے ایک بڑے اشاعتی ادارے کے مالک جناب احمد جمیل مرزا اور جناب مطلوب حسن مرحوم کی کاوشوں کا نتیجہ ہے جنھوں نے اپنی ان تھک محنت سے اردو زبان میں شامل تقریباً ہر لفظ کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مختلف قسم کے ۲۰ ہزار ترسیمے (COMPOUND WORDS) تیار کیے۔
پاکستان کے ایک اور بڑے تاجر جناب فیروز کھمباٹا نے نوری نستعلیق کمپیوٹر سے قدرے مشابہ "شیراز نستعلیق" کمپیوٹر کی ایجاد کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

—— عبدالسلام کوثر، سدیونگر

○ "کیرالا میں اردو" جناب عظیم الشان صدیقی کا معلوماتی مضمون پڑھ کر متاثر ہوا۔ کیرالا کے اردو دانوں کو مبارک باد دیتا ہوں، دوسرے صوبوں کے مقابلے میں وہاں سہ لسانی فارمولے کے تحت اردو پڑھائی جاتی ہے کاش سہ لسانی فارمولے کے تحت ہر صوبے میں اردو پڑھائی جاتی۔
آس محمد کا مضمون "ترقی پسند شاعر: پرویز شاہدی" پڑھ کر تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔

—— اظہر نیّر، بھلائی نگر

○ "ایوانِ اردو" اگست ۹۰ء کے سرورق کی تصویر دیکھ کر ازحد دکھ اور افسوس ہوا اور آپ صاحبان کے ذوقِ تصویر پسندی کا ماتم کرنا پڑا۔
آپ کو تو معلوم ہے کہ موضوع یا واقعے کے پیشِ نظر ویسی ہی تصویر ڈھونڈ کر یا حاصل کر کے شائع کی جاتی ہے۔ گیان پیٹھ ایوارڈ کی خوشی میں آپ کو قرۃ العین حیدر کی ایسی غم زدہ تصویر شائع کرنے کا سجھاؤ کس نے دیا؟ کیا آپ نے جان بوجھ کر ایسی تصویر چھاپی ہے؟ اس لیے کہ گیان پیٹھ ایوارڈ پاکر قرۃ العین حیدر کا موڈ ایسا ہی ہوگیا ہوگا کچھ حیرت زدہ، غم زدہ اور تھکا تھکا۔
اسی "ایوانِ اردو" کے صفحہ ۴۹ پر آپ نے جو تصویر چھاپی ہے وہ ہزار گونہ اس سرورق کی تصویر سے بہتر ہے اور حسبِ موقع ہے۔ آپ کے پاس دونوں موڈ کی تصویریں تھیں مگر آپ نے خراب موڈ کی تصویر سرورق کے لیے پسند کی۔ میں ذاتی طور پر اس تصویر کے چھاپے جانے پر آپ ہی کے رسالے کے ذریعے عینی کے چاہنے والوں تک صدائے احتجاج پہنچانا چاہتا ہوں۔
یہ بھی عجیب بات ہے کہ آپ کا سرورق تو کئی رنگوں میں چھپتا ہے مگر آپ نے قرۃ العین حیدر کی تصویر بلیک اینڈ وہائٹ میں چھاپ دی۔
اردو کو یہ گیان پیٹھ ایوارڈ طویل عرصے کے بعد ملا ہے۔ اس کا استقبال دوسری زبانوں کے رسالوں میں شاندار طریقے سے ہوا آپ کا رسالہ فقط تصویر پیش کرنے میں ناکام کیوں رہا؟ اس ایوارڈ سے قرۃ العین حیدر کی عزت افزائی اتنی نہیں ہوئی ہے جتنی خود اردو زبان و ادب کی ہوئی ہے۔
امید کہ آپ میرے ان جذبات کو منظرِ عام پر آنے کی اجازت دیں گے۔ یہ جذبات آپ کی مخالفت کے اظہار میں نہیں ہیں بلکہ ایک ادیبہ کے احترام میں ظاہر ہوئے ہیں۔
آپ کے قاری تو آپ کو شربت روح افزا پلاتے ہی رہتے ہیں کبھی کبھی یہ مئے تلخ کام بھی نوش فرمائیں۔

—— سیّد محی رضا، بمبئی

○ محترمہ قرۃ العین حیدر کو گیان پیٹھ ایوارڈ دیے جانے کی خبر پوری اردو دنیا کے لیے پیغامِ مسرت لائی۔ اردو ماہناموں میں اس خبر کا خیر مقدم سب سے پہلے "ایوانِ اردو" نے کیا ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ آپ محترمہ کے فکر و فن پر ایک تفصیلی

مضمون بھی شائع کریں۔

——— رئیس اختر خاں، مرشدآباد

○ اگست کے سرورق پر قرۃ العین حیدر صاحبہ کی تصویر دیکھ کر خوشی ہوئی۔ آئندہ بھی مناسب موقعوں پر آپ ممتاز قلمکاروں کی تصویریں سرورق پر چھاپیں۔ دوسری زبانوں کے رسالے اکثر ایسا کرتے ہیں۔ تصویر آپ نے بہت ہی موزوں انتخاب کی ہے۔ وہ سنجیدگی، محزونی اور وہ تحیّر خیز تفکر جو عینی آپا کی تحریروں کا وصفِ خاص ہے، اس تصویر سے بھی جھلک رہا ہے۔

بلقیس عبدالرحمان، جے پور

●●

بقیہ :

شعری اور نثری عنوانات

شہرِ خوباں بھی زیارت گاہوں جیسی چیز ہے
دیکھ کر صورت بتوں کی تازہ ایماں کیجیے (راشد قمر)

مرسلہ : فرخندہ شاذ، پھلائی نگر

کسی کا نقشِ پا ہے ہم ہیں ذوقِ سجدہ ریزی ہے
ترے کعبہ کو اے زاہد یہیں سے بندگی اپنی (نامعلوم)

مرسلہ : منصور حسین، برہان پور

تجھے جس نے ابھی دیکھا نہیں ہے
قیامت کیا ہے وہ سمجھا نہیں ہے (نامعلوم)

مرسلہ : موتی لعل گپتا، صاحب گنج

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی (غالب)

مرسلہ : ناصر حسین، برہان پور

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
جس کے شانوں پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں (غالب)

مرسلہ : ایاز ظفر، بمبئی

وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درس نسخۂ عشق کا
کہ کتاب عقل کی طاق پر جو دھری تھی سو وہ دھری رہی (سراج اورنگ آبادی)

مرسلہ : شیخ محمود جیلانی، گرلا

مدتوں تیرے ہجر نے اے دوست
کم سوادوں کے ناز اٹھوائے

آج پھر میں ہوں اور تری آغوش (نریش کمار شاد)
کاش ایسے میں موت آ جائے

مرسلہ : (ڈاکٹر) شہزاد احمد، اٹاوہ

کیا خوب مصوّر نے اتاری تصویر
دیکھی نہ سنی ایسی تو پیاری تصویر
جب ہاتھ لگاتا ہوں تو جی ڈرتا ہے (داغ)
کہہ بیٹھے نہ کچھ منہ سے تمہاری تصویر

مرسلہ : فیروز فدائی، سمستی پور

تری یادوں، تری سوچوں، تری چاہت میں اگر
سو بھی جاؤں تو ترے خواب جگا دیتے ہیں (عقیل شاطر)

مرسلہ : مشکور احمد قریشی، پالن پور

نثری عنوانات

"اپنے دُکھ مجھے دے دو" (راجندر سنگھ بیدی کا افسانہ)
مرسلہ : غازی اسلام، کٹیہار
(سالانہ خریداری نمبر ۸۳۷)

"آخرِ شب کے ہمسفر" (قرۃ العین حیدر کا ناول)
مرسلہ : نیاز احمد، احسان اللہ عمیر، دربھنگہ

"درد کا رشتہ" (اختر الایمان کی نظم)
مرسلہ : معین الدین شمسی، گریڈیہ

"ایک محبت کی کہانی" (غازی صلاح الدین کا ناول)
مرسلہ : سعید احمد قائد، دہلی

"رنگ منچ" (سلطان ساحل انور امام کا ڈرامائی مجموعہ)
مرسلہ : رعنا زیدی شمع، سنبھل

"آنکھ اور خواب کے درمیان" (ندا فاضلی کا شعری مجموعہ)
مرسلہ : شیخ سلمان نیّر، بمبئی

●●

اکادمی دہلی کا ماہانہ رسالہ

فون نمبر: ۳۲۶۳۴۴۸، ۳۲۷۶۲۱۱

ایوانِ اردو دہلی

ادارۂ تحریر:
سید شریف الحسن نقوی، مخمور سعیدی

جلد: ۴ ● شمارہ: ۷ ● فی کاپی ۵۰ر۲ روپے، سالانہ قیمت ۲۵ روپے ● نومبر ۱۹۹۰ء ●

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتا
...ماہنامہ ایوانِ اُردو دہلی
...کادمی، دہلی ــــ گھٹا مسجد روڈ،
...دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

...ماہنامہ "ایوانِ اُردو دہلی" میں شائع ...والے افسانوں میں نام، مقام اور ...ت سب فرضی ہیں، کسی اتفاقیہ ...ن کے لیے ادارہ ذمہ دار نہیں۔ ...مضمون نگاروں کی آرا سے ادارے ...کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

خوشنویس: تنویر احمد

...شریف الحسن نقوی (ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر) نے سیما آفسیٹ پریس، دہلی ۱۱۰۰۰۶ سے چھپوا کر دفتر اُردو اکادمی، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا

حرفِ آغاز

اِن دنوں ہمارا ملک جن حالات سے گزر رہا ہے، ان سے کوئی حسّاس ہندوستانی شہری صرفِ نظر نہیں کرسکتا۔ ادیب اور شاعر سماج کے حسّاس ترین افراد سمجھے جاتے ہیں۔ اس لیے گرد و پیش کی صورتحال سے ان کا متاثر نہ ہونا دائرۂ قیاس سے باہر ہے۔

ہنگامی مسائل شعر و ادب کا موضوع بن سکتے ہیں یا نہیں، یہ بہت پُرانی بحث ہے لیکن اتنا تو سبھی مانتے ہیں کہ ان غیر انسانی رویّوں کا چیلنج شعرا اور ادبا کو ضرور قبول کرنا چاہیے جو انسانی برادری میں نفاق اور انتشار پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ کسی بھی شاعر یا ادیب کو یہ ہدایت دینا غلط ہوگا کہ وہ کیا لکھے اور کیا نہ لکھے لیکن اُس سے یہ اُمید رکھنا بے جا نہیں کہ جب اعلیٰ اخلاقی اور انسانی قدروں پر طاغوتی طاقتیں حملہ آور ہو رہی ہوں تو وہ ان قدروں کے دفاع کے لیے آگے آئے اور سماج میں اُسے جو شہرت اور مقبولیت اور اس کی آواز کو جو اعتبار حاصل ہے، اس مقصد کے لیے ان کے استعمال میں تردّد اور تامّل سے کام نہ لے۔

مذہبی رواداری اور غیر فرقہ وارانہ تہذیبی رویّے صدیوں سے ہندوستانی سماج کی پہچان رہے ہیں۔ اس باہمی رواداری اور غیر فرقہ وارانہ نقطۂ نظر سے جب جب ہم دور ہوئے ہیں، ملک کی فضا مسموم ہوئی ہے اور المناک واقعات پیش آئے ہیں۔ خون خرابہ، قومی املاک کا نقصان اور تعمیر و ترقی کے وسائل کی بربادی! اگر یہ بدبختانہ واقعات بار بار رونما ہوتے رہیں تو ایک مضبوط، متحد اور خوشحال ہندوستان کا جو خواب ہماری جنگِ آزادی کے مجاہدین نے دیکھا تھا، کیونکر شرمندۂ تعبیر ہوسکے گا؟

اُردو زبان و ادب کی بنیادی قدر انسان دوستی کی قدر ہے۔ مستثنیات ہر کلیے میں تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ لیکن اُردو کے بیشتر شعرا اور ادبا نے مذہبی رواداری اور انسانی اخوّت و محبت ہی کے گیت گائے ہیں۔ یہ لے آج بھی کمزور نہیں پڑی ہے بلکہ قوی تر ہوگئی ہے۔ لیکن ملک کے موجودہ حالات کا تقاضا یہ ہے کہ ہمارے ادیب اور شاعر اب عملی طور پر بھی میدان میں آئیں اور منظم ہوکر ملک کی اس صدیوں پرانی روایت کا تحفظ کریں جس کے وہ خود بھی پروردہ ہیں۔ اپنے مذہبی اور تہذیبی تشخص کو قائم رکھتے ہوئے باہمی رواداری اور ایک دوسرے کے جذبات و احساسات کی پاسداری کی اس عظیم روایت کی تعمیر و تشکیل میں ہمارے بزرگوں کی بہترین کوششیں صرف ہوئی ہیں۔ اگر ہم اسے زندہ نہ رکھ سکے تو یہ ہمارے لیے ہی نہیں پورے ملک کے لیے ایک سانحہ ہوگا ـــــــ ہمارا عظیم ملک جو مختلف مذہبی، تہذیبی اور لسانی اکائیوں کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے ہر اکائی اپنا جداگانہ وجود رکھتے ہوئے اگر عظیم تر ہندوستانی معاشرے کا حصہ ہے تو اسی لیے کہ یہ معاشرہ فراخدل ہے اور کثرت میں وحدت کا رنگ پیدا کر لینے کے وصف سے متصف۔ اس وصف کو قائم و دائم رکھنا ہمارا فرض ہے۔

دسمبر ۸۸ء کا شمارہ ہم نے "مولانا ابوالکلام آزاد نمبر" کی صورت میں پیش کیا تھا۔ ایوانِ اُردو کا اگلا شمارہ دسمبر کا ہوگا جس میں ہم انشاءاللہ کچھ اہم مضامین مولانا آزاد کے بارے میں شائع کریں گے اور مولانا آزاد کے خطوط پر مشتمل ایک نئی کتاب پر تبصرہ بھی۔

ـــــــ سید شریف الحسن نقوی

شکیل الرحمٰن

(پہلی قسط)

اِسلامی فنون — فنِ تعمیر کی جمالیات

فنونِ لطیفہ میں مُسلمانوں کے عظیم کارناموں اور اُن کی اعلیٰ ترین تخلیقات کی ایک بڑی تاریخ صدیوں میں پھیلی ہوئی ہے۔

تمام فنون میں سب سے زیادہ فنِ تعمیر سے گہری دِلچسپی کا اظہار کیا گیا۔ ابتدا میں اِس فن کی طرف کوئی خاص توجّہ نہیں تھی، ظہورِ اسلام کے بعد عرب میں فنِ تعمیر کی کوئی بڑی یا اہم مثال نہیں ملتی، عرب اُونٹوں کی کھالوں سے تیّار کیے ہوئے خیموں میں رہتے یا گیلی مٹّی سے تیّار کی ہوئی اینٹوں سے چھوٹے چھوٹے گھر بناتے، مکّہ شریف میں آبِ زم زم کے گرد جو چہار دیواری اُٹھائی گئی وہ بھی معمولی پتّھروں کی تھی، رسول کریمؐ نے ہجرت کی تو مدینہ شریف میں اپنے لیے ایک گھر بنایا، یہ بھی گیلی مٹّی سے تیّار کی ہوئی اینٹوں سے بنا، کھجور کے درخت کے تنوں سے چھت بنائی گئی، چند کمرے اسی نوعیت کے تھے، ۶۲۲ء میں ہجرت کے زمانے میں ہی مدینہ شریف میں مسجدِ نبوی کی تعمیر ہوئی۔ اُس کی صورت مُربّع نما تھی، پتّھروں کو بھی استعمال کیا گیا تھا اور دیواروں کے لیے اینٹوں کی مدد لی گئی تھی، کھجور کے تنوں پر چھت ڈالی گئی تھی اور شہتیروں کے لیے بھی ان تنوں سے کام لیا گیا تھا۔

۶۳۹ء میں کوفہ میں سعد ابن ابی وقاص کی مسجد بنی جس کی چھت مرمر کے ستونوں پر تھی۔ کہا جاتا ہے یہ سُتون کسی شاہی محل سے حاصل کیے گئے تھے۔ اِس مسجد کی صورت بھی مُربّع نما تھی اور مدینہ شریف کی "مسجد النبی" سے بڑی تھی، سایہ بان (ظلّہ) اور صحن کی طرف پہلی بار توجّہ دی گئی۔

کوفہ کی مسجد کا وہ پلان جس کے مطابق اس کی دوبارہ تعمیر ہوئی (مربع کی تشکیل)

کم و بیش ۸۰ سال کے اندر مُسلمانوں نے جانے کتنے مُلکوں کو فتح کر لیا تھا، مصر، عراق، ایران، شام، اسپین، افغانستان اور شمالی افریقہ وغیرہ میں فنِ تعمیر کی قدیم روایات موجود تھیں، مسلمان ان سے متاثر ہوئے، کلیساؤں کی پُر شکوہ عمارتوں اور قدیم عمارتوں کے آثار دیکھے تو اپنی مسجدوں کو بھی جلال و جمال کا اعلیٰ ترین نمونہ بنانا چاہا، ان سے قبل سادگی ہی مسجدوں کی بنیادی خصوصیت تھی، مدینہ منورہ کی مسجد رسول کریمؐ کے دوَر سے ۷۱۲ء تک مختلف صورتیں اختیار کرتی رہی۔ ۷۱۲ء میں خلیفہ الولید نے ستونوں کے ساتھ اسے ایک نئی شخصیت دی، مسلمان فنکاروں نے قدیم خانقاہوں، کلیساؤں اور گرجا گھروں کی صورتوں اور تکنیکی خصوصیات کا معائنہ اور مطالعہ کیا۔ ستونوں اور چھتوں کی مختلف صورتوں نے انھیں بے حد متاثر کیا۔ شامی فنِ تعمیر کے جمال نے گہرا اثر ڈالا، ساسانیوں کے محلوں کے حُسن پر بھی اُن کی گہری نظر رہی، ستون، محراب، صحن، نیم قوسی طاق، گنبد، چھتیں، دیواریں۔ مفتوحہ ملکوں میں ان کی روایات اُن کے سامنے تھیں، سنگِ مرمر اور مختلف اقسام کے پتّھروں کی تراش خراش، فرش بندی کے آرٹ اور پچّی کاری اور استر کاری کے فن کی عمدہ مثالیں موجود تھیں۔ مختلف ممالک میں انھیں فنکار معمار ملے جن سے انھوں نے بہت کچھ سیکھا، یہ معمار ان کے معاون و مددگار رہے اور تعمیری رموز سے آگاہ کرتے رہے نیز ان معماروں نے تعمیری مسالوں کی ترکیبیں بھی سمجھائیں۔

۶۴۶ء میں عمرو ابن العاصؓ نے مصر کے شہر قاہرہ میں جو مسجد تعمیر کی وہ بھی سادگی کا حُسن لیے ہوئے تھی، اس میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہیں اور اب تو جامع عمرو کے نام سے یہ مسجد اپنے تعمیری حُسن کی وجہ سے

۹۱، نارتھ ایونیو، نئی دہلی

ساری دُنیا میں مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس مسجد میں عمرو ابن العاصؓ نے پہلی بار منبر بنوایا تھا جسے حضرت عمرؓ نے پسند نہیں کیا اور ان کے حکم سے اسے توڑ دیا گیا، حضرتِ عمرؓ کے انتقال کے بعد دوسرا منبر لگوا دیا گیا جو غالباً کسی عیسائی کا تحفہ تھا۔ ابن مخلد نے ۶۸۳ء میں اِس مسجد کو نئی صورت دی اور دیواروں کو زیادہ جاذب نظر بنانے کی کوشش کی، چار مینار بنائے گئے، عالمِ اسلام میں غالباً یہ پہلے مینار تھے، اِسی طرح پتّھر رکھ کر نماز کی سمت کی طرف پہلی بار اِشارہ کیا گیا، رفتہ رفتہ 'محراب' کی تخلیق ہوئی اور پتّھروں کا استعمال ختم ہوگیا۔

حضرتِ عمرؓ کے انتقال کے بعد مسجدوں میں آرائش و تزئین کاری کا سلسلہ آہستہ آہستہ شروع ہوتا ہے۔ دیواروں کو مرمر سے آراستہ کرنے اور پچّی کاری کا رجحان بڑھنے لگا ــــ ۶۶۱ء کے بعد بنواُمیّہ کے عہد میں جب دمشق، تہذیب و تمدّن کا مرکز بنا تو مسجدوں کی تعمیر کی جانب زیادہ توجہ دی جانے لگی۔ بنواُمیّہ کے دَور کے معماروں اور فنکاروں نے دمشق اور اُس کے قرب و جوار میں جن مسجدوں کی تعمیر کی ان میں سادگی کے ساتھ اعلیٰ درجے کی پرکاری بھی شامل ہوئی، فنِ تعمیر میں آرائش اور تزئین کاری کی تاریخ کا یہی ابتدائی زمانہ ہے، فنکاروں اور معماروں نے تعمیر کی جمالیات میں کشادگی پیدا کی، صحن، حرم، دیوارِ قبلہ وغیرہ کی طرف خاص توجہ دی گئی اور بہتر تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کیا گیا۔ شامی، عجمی اور مِصری معمار اور فنکار، مسجدوں اور دوسری عمارتوں میں مُشرقی حسن کو اُبھارنے میں پیش پیش رہے ہیں، یونانی فنکاروں نے بھی اِس سلسلے میں نمایاں حِصّہ لیا ہے اور اس طرح تہذیبی آمیزشوں کے جلوے ظاہر ہونے لگے۔

بیت المقدّس کی مسجد پر لکڑی کا گُنبد نصب کر کے خلیفہ عبدالملک (۶۹۱ء) نے ایک نئی جہت پیدا کر دی۔ مسجد کے گرد دیوار اُٹھائی گئی اور اُس میں خوبصورت پتّھر لگائے گئے، لکڑی کا یہ گُنبد کب گرا کہا نہیں جاسکتا، اُس کے بعد کئی گُنبد لگائے جاتے رہے۔

۷۰۸ء میں خلیفہ ولید کے حکم سے پتّھر کا گُنبد نصب ہوا، چار مینار بنے، آرائش و زیبائش کا پہلا واضح رجحان اُبھرا، حرم کی دیواروں کو سنگِ مرمر سے آراستہ کیا گیا، دُور دراز علاقوں سے صنّاع اور فنکار بلائے گئے، سونے کے پتّھروں اور پھُولوں اور پتّوں کی صورتوں سے آرائش کا یہ پہلا واضح رجحان تاریخی حیثیت کا حامل ہے۔ گُنبد کے اندرونی حِصّے کو بھی سونے سے منڈھا گیا تھا اور محراب پر بھی سونے کے پتّر لگائے گئے تھے، قیمتی پتّھروں کو جڑنے اور دیواروں کو اِن سے جاذبِ نظر بنانے کی بھی غالباً یہ پہلی کوشش تھی۔ کہا جاتا ہے ہر جانب عقیق اور فیروزہ کے روشن ٹکڑے لگائے گئے تھے۔

بیت المقدّس کی مسجد میں سولہ دریچوں اور بارہ ستونوں کو خاص طور پر پُرکشش بنانے کی کوشش کی گئی۔ یہ بارہ ستون ایک دائرے میں تھے لہٰذا ان کے حسن کو درمیان میں کھڑے ہوکر پایا جاسکتا تھا۔ سلطان سلیمان (۱۵۵۲ء) نے اسے نئی صورت عطا کی۔ تناسب، ہم آہنگی اور آرائش و زیبائش اور تزئین کاری کے پیشِ نظر یہ مسجد دُنیا کا ایک شاہکار بن گئی ہے۔

مُسلمان فنکاروں نے اپنے ماضی اور اپنی روایات سے بہتر روشنی حاصل کی تھی اور اپنے ہم عصر فنکاروں کی اقدار کا حسن بھی حاصل کیا تھا، اِن فنکاروں نے فنِ تعمیر میں جن رجحانات کو نمایاں کیا اُن میں مشرقیت کو زیادہ سے زیادہ اُبھارنے کی کوشش کی، انھوں نے مشرقی مزاج و شعور کو آرائش و زیبائش کے عمدہ ترین نمونوں میں پیش کیا، جہاں مسلمانوں کی حکومتیں تھیں، خلفار کے نامزد سربراہوں اور حاکموں نے اِس رجحان کی سرپرستی کی اور نئی تعمیرات سے گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔ ۷۵۰ء میں جب عباسیوں کی حکومت قائم ہوئی تو بنواُمیّہ کے اسالیب کی کئی جہتیں پیدا ہوئیں۔ اِن اسالیب کے حسن کو اس دَور کے فنکاروں نے قبول کرتے ہوئے اپنی اعلیٰ روایات و اقدار کا احساس تازہ تر کیا۔ مساجد میں صحن کے حسن، موذّن کے لیے میناروں کی پُر وقار بلندی اور حرم، محراب اور دیوارِ قبلہ وغیرہ کی خوبصورتی میں ان کی تعمیرات کی جمالیات نے متاثر کرنا شروع کیا، بنواُمیّہ کے عہد میں "مشرق" اور "مغرب" میں مسجدوں کی تعمیر میں روایات و اقدار اور مذہبی وجدان کے جو جلوے موجود تھے اور مساجد کی جہت دار تعمیر کا جو شعور تھا، انھیں تجربوں میں شامل کیا گیا، بصرہ، کوفہ، قاہرہ اور مشرقی افریقہ کی مسجدوں کے جمالیاتی پیکر، نمونے بنے رہے، مسلمان فنکاروں کی اعلیٰ ترین اور افضل ترین تخلیقی صلاحیتیں فنِ تعمیر میں ظاہر ہوئی ہیں۔ اِسلامی تہذیب کے مظاہر نے تعمیرات کے فن کو عظمت بخشی ہے۔ دمشق کی اعلیٰ ترین فنی روایات نے اسالیبِ فن کو متاثر کیا اور قرطبہ کی عمارتیں معجزہ بن کر سامنے آئیں۔

۷۰۲ء کے بعد اسلامی ملکوں میں جو

مسجدیں تعمیر ہوئیں وہ فنی روایات اور نئی اقدار کی خوبصورت آمیزش کا نمونہ ہیں، دمشق، شام، یروشلم، قیروان اور قرطبہ وغیرہ کی مسجدیں اسی آمیزش کو پیش کرتی ہیں، ابتدائی مسجدوں کی تعمیر عموماً نمازیوں کی چھوٹی بڑی جماعتوں کے پیش نظر ہوئی ہے صحن، حرم اور بین العفوف راستوں کی طرف خاص توجہ رہی ہے، رفتہ رفتہ چھتوں، میناروں، محرابوں، ستونوں، اونچی دیواروں اور دروازوں اور دریچوں کی تعمیر اور ان کے حسن کی طرف خاص توجہ دی جانے لگی، کوفہ اور دمشق کی مسجدوں کی فنکاری کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی۔

مسجدوں کے نقشوں کے لیے مسلمانوں نے ہندسی طریقہ اپنی روایات سے حاصل کیا، کلیساؤں کے نقشے اُن کے لیے عمدہ مثال تھے۔ ستونوں کی بلندی اور فرشوں کی تشکیل میں بھی ہندسی طریقے ملتے ہیں۔ پتھروں کی تراش خراش میں بھی اسی طریقے کا استعمال ملتا ہے۔ پتھر کے مربعے اس سلسلے میں خاص توجہ چاہتے ہیں۔ طغروں میں بھی مسلمان فنکاروں نے ہندسی طریقے استعمال کیے ہیں۔

مسجدوں میں رنگین شیشوں کے دریچوں، ٹائیلس (Tiles) مرمر پر پچی کاری، اور ترشے ہوئے پتھروں کی فنکارانہ تشکیل اور طغروں کی عمدہ تزئین کاری نے ایک نئی روایت قائم کر دی۔

قلعوں کی تعمیر میں بھی وقت کے ساتھ رجحان تبدیل ہوتا رہا ہے، ۷۰۲ء سے ۹۶۵ء تک مسلمان فنکاروں کے فنی تجربوں کی جو تاریخ ہے ان کی حیثیت متحرک روایت کی ہے جس کا اثر آئندہ نسلوں کے فنکاروں پر ہوا ہے قلعوں میں بھی محرابوں، چھوٹے بڑے ستونوں، میناروں اور دریچوں اور دروازوں کے حسن کی طرف خاص توجہ دی گئی ہے، مصری معماروں اور فنکاروں نے افقی مستطیل کو زیادہ اہمیت دی، اسی طرح کچھ فنکاروں نے عمودی مستطیل کے ذریعے اپنے احساسِ جمال کو پیش کیا۔

ان تعمیرات سے مقامی مزاج کی ہمہ گیری کا بھی پتا چلتا ہے، مسجدوں اور قلعوں میں 'مکعب صورتوں' (Cubic Shapes) کو ابتدا سے اہمیت حاصل رہی ہے۔ ۷۸۵ء کے بعد اینٹوں اور پتھروں کے رنگوں کے پیش نظر 'مکعب صورتوں' کو دلفریب بنانے کی کوشش ملتی ہے۔ رنگوں کی مناسبت اور ان کی فنکارانہ ترتیب متاثر کرنے لگی۔

سنگِ مرمر اور پتھر دُور دراز علاقوں سے بھی لائے گئے، ان کی تراش خراش کی گئی اور پچی کاری میں اپنے فن کا عمدہ مظاہرہ کیا گیا۔ ان کی ترتیب اور 'کمپوزیشن' شاہکار کی حیثیت رکھتی ہیں۔

پرانی عمارتوں اور خصوصاً قلعوں کی دیواروں پر فنکاروں کی بنائی ہوئی تصویریں ذوقِ جمال کا عمدہ نمونہ ہیں، ان تصویروں پر یونانی اثرات کی پہچان مشکل نہیں ہے، چہروں کی تراش خراش پر عموماً یونانی انداز ملتا ہے۔ مسلمان فنکاروں نے اپنے امتیازی جمالیاتی رجحان سے مصوری کے ان نمونوں کو انفرادیت بخشی ہے۔ 'شکار' اور 'غسل کے مناظر' اور حاکموں اور شہنشاہوں کے لباس کی آرائش میں ان کی انفرادیت نظر آتی ہے، اکثر پیکر ایسے ہیں جن میں تجریدیت کا حسن ہے، بنیادی نقش کی تبدیلی کا احساس، 'مثلث' اور ترتیب اور تزئین کی وحدت میں ملتا ہے، محسوس ہوتا ہے جیسے فنکار ان کی مدد سے آہستہ آہستہ یونانی اثرات سے دُور ہٹ رہے ہیں، رفتہ رفتہ آرائش و زیبائش کا رجحان اتنا بالیدہ ہوتا گیا ہے کہ مسلمان فنکاروں کی اپنی جمالیاتی قدریں اہمیت اختیار کر گئی ہیں، مثلث اور ترتیب کی وحدت کے ساتھ مربعوں، عمودی اور افقی مستطیل اور 'مکعب صورتوں' میں نشیب و فراز کا آہنگ شامل ہوا۔ پیچ و خم کے آہنگ نے ان فنکاروں کے احساسِ جمال کی مختلف کیفیتوں کو ظاہر کیا، لکیروں میں حیرت انگیز لچک پیدا ہو گئی جس سے روشنی اور سائے کا جمالیاتی احساس بیدار ہوا اور پھر روشنی اور سائے کے تاثرات نے مجموعی طور پر ایک جمالیاتی قدر کی صورت اختیار کر لی۔ مثلثوں اور مربعوں میں جانوروں اور پودوں کی بہت سی تصویریں اُبھاری گئیں۔

ان جمالیاتی خصوصیتوں نے صدیوں میں ایک بڑا سفر کیا ہے، دوسرے فنون پر بھی ان کے اثرات ہوئے، مصوری اور صفت پارچہ بافی اور قالین بافی پر بھی ان جمالیاتی خصوصیتوں کی گہری چھاپ پڑتی رہی۔

حضرت معاویہؓ کے حکم سے جب ۶۷۳ء میں چار میناروں کا اضافہ ہوا تو مسجدوں کی عمارتوں کی سیمیٹری کا حسن اور بڑھا اور فنِ تعمیر کی ایک اعلیٰ روایت قائم ہو گئی۔

مسجد الاقصیٰ (جامع عبدالملک) کے خط و خال کے جمالیاتی پہلو، معماروں اور فنکاروں کے لیے عمدہ معیار بنے رہے۔

دمشق کی مسجد کو جب خلیفہ عبدالملک (۷۰۵ء) نے حسن کا ایک پیکر بنایا تو اُس کی پُروقار اور خوبصورت عمارت کو دُنیا کی سات

دلکش اور انوکھی عمارتوں میں شمار کیا گیا۔

خلیفہ الولید نے مدینہ منورہ کی مسجد کو ۷۰۸ء میں جب نئی صورت میں جلوہ گر کیا اور اسے ایک خوبصورت محراب سے آراستہ کیا تو مسلمانوں کی فنکاری کے اعلیٰ معیار کو حیرت اور انتہائی دلچسپی سے دیکھا گیا۔

خلیفہ الولید کے محل کے دیوانِ عام اور حمام کی آرائش و تزئین کاری نے فنِ تعمیر میں ایک نئی روایت قائم کر دی اور کئی نئی جہتوں کی تشکیل کی! اِن کی دیواروں کو تصویروں سے آراستہ کر کے مسلمان فنکاروں نے یونانی آرٹ سے آگے بڑھ کر اپنی انفرادیت کا احساس دلایا۔

۷۸۶-۷۸۷ء میں جب عبدالرحمٰن اوّل نے مسجدِ قرطبہ کی تعمیر کی تو محسوس ہوا کہ مسجد الاقصیٰ کی اعلیٰ ترین روایات کے حسن کو معماروں اور فنکاروں نے کتنی اعلیٰ سطح پر قبول کیا تھا۔

۷۸۹ء میں فلسطین کے مسلمان معماروں اور فنکاروں نے جن مسجدوں کی تعمیر کی اُن پر خطِ کوفی کے حُسن کو طغروں میں نمایاں کر کے ایک نئی جہت پیدا کی۔

۸۵۰ء میں عبّاس ابن اغلب نے سوسہ کی مسجد کی تعمیر کی تو اس کی تعمیری خصوصیتوں کے دور رس اثرات ہوئے، اُس کی مستطیل صورت گیارہ محرابوں اور صحن کی خوبصورت تشکیل نے کئی نسلوں کے فنکاروں کو متاثر کیا۔ فاطمین نے ان جمالیاتی خصوصیتوں کو مصر پہنچا دیا اور جب ۱۰۱۳ء میں مسجد الحاکم کی تعمیر ہوئی تو محسوس ہوا کہ اِن تجربوں نے اپنے حسن سے کس طرح فنکاروں کو متاثر کیا تھا۔

خلیفہ المتوکل نے سامرہ کی جامع مسجد کی تعمیر میں مسلمانوں کے ذوقِ جمال کی جانے کتنی جہتوں کو نمایاں کیا۔ ۸۴۸ء میں تعمیر کی ابتدا ہوئی اور ۸۵۲ء میں یہ مسجد حُسن کا ایک جلوہ بن کر سامنے آئی، میناروں کی تشکیل کرتے ہوئے معماروں نے اپنی عمدہ فنکاری کا ثبوت دیا، یہ مینار فنِ تعمیر کا عمدہ نمونہ ہیں، دوسرے علاقوں میں مینار بناتے ہوئے انھیں واحد معیار تصوّر کیا گیا۔ یہ جتنے دور سے خوبصورت اور دلکش نظر آتے ہیں اتنے ہی نزدیک سے جاذبِ نظر اور حُسن کا نمونہ دکھائی دیتے ہیں۔ معماروں نے اس کی دیواروں اور اس کے دروازوں اور زمینوں کو بھی آرٹ کا خوبصورت نمونہ بنا دیا ہے۔

قیروان کی جامع مسجد، سنگِ مرمر اور ٹائلس کی خوبصورت کمپوزیشن کی ایک عمدہ مثال بن کر سامنے آئی۔

وادیِ نیل میں مسلمان معماروں نے فنِ تعمیر کے انتہائی دلکش نمونے پیش کیے، سلطان احمد ابن طولون نے سامرہ کے آرٹ کے حُسن کو یہاں کی عمارتوں میں جذب کر دیا، سلطان نسلاً ترک تھا جس کی پرورش سامرہ میں ہوئی تھی۔ اُس کے محل کے نو دروازے اپنی مثال آپ تھے، مصر میں فنّی اعتبار سے اپنی نوعیت کا یہ واحد محل تھا جس کے سامنے 'پولو' کھیلنے کے لیے ایک میدان بھی تھا۔

سلطان احمد کا سب سے بڑا کارنامہ وہ مسجد ہے جس کی تعمیر پر ایک لاکھ دس ہزار دینار خرچ ہوئے تھے، سامرہ کے معماروں اور فنکاروں نے اس مسجد کو ایک ایسا شاہکار بنا دیا جسے دیکھ کر فوراً ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ دبستانِ عراق اور مصر کے مقامی رنگوں کی بڑی عمدہ آمیزش ہوئی ہے، ۲۰۳ مربع فٹ کے صحن کی سادگی اور محرابوں کی تزئین کاری ایک ہی جمالیاتی رجحان کی دو جہتوں کی عمدہ تصویریں ہیں۔ قرآنی آیات کو انتہائی خوبصورت انداز میں نقش کیا گیا ہے۔

مسجدوں، مقبروں، قلعوں، امرا اور سلطانوں کے محلّوں، مدرسوں، خانقاہوں اور حجروں وغیرہ کی امتیازی خصوصیتوں کا مطالعہ کرتے ہوئے جانے کتنے جمالیاتی پہلوؤں اور جانے کتنی جمالیاتی جہتوں کا ادراک ملتا ہے۔

مسلمان تعمیر کاروں اور معماروں نے مربع، دائرہ، مثلث، زاویہ قائمہ، افقی مستطیل عمودی مستطیل اور متوازی اور مدّور صورتوں سے گہری دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔

استر کاری، پچی کاری اور کندہ کاری اور قیمتی پتھروں اور سنگِ سلیمان کے فنکارانہ استعمال سے انھوں نے دُنیا کے فنِ تعمیر کی تاریخ میں نمایاں جگہ حاصل کی ہے۔

گنبد سازی، ستون سازی اور محراب سازی میں نئی جمالیاتی روایتیں قائم کی ہیں۔

کلاہ نما اور مدور گنبدوں، گنبدوں کی پسلیوں اور گنبدوں کو روشن رکھنے والے دریچوں کے حسن کا اعلیٰ معیار قائم کیا ہے۔

دریچوں کی کمانوں، رنگین شیشوں کے دریچوں، روشن دانوں، گھوڑ نعلی وضع کی ابھری کمانوں اور ڈیوڑھیوں اور طاقوں کی تزئین کاری میں عمدہ فنکاری کا ثبوت دیا ہے۔

سنگِ مرمر کے صحنوں، منقش چھتوں، چھتے دار حرم اور حجروں، صدر اور بغلی دالانوں، سائبانوں، چوبی چھتوں اور پُرکشش اور منقش

دروازوں اور ستون دار برآمدوں کی تعمیر و تشکیل کا ہمیشہ اعلیٰ معیار پیش کرتے رہے ہیں۔

یک سنگی مرمریں ستونوں، نیم قوسی طاقوں، غلام گردش کے پایوں، محرابوں، شہر پناہ کی متوازی دیواروں، ممبروں، پتھر کی چناتی کے ستونوں اور مرستونوں اور مرکب محرابوں میں اپنی اعلیٰ ترین صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے۔

ان سے جمالیات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوا ہے ان خصوصیات کی حامل عمارتیں صدیوں کی تاریخ میں فنِ تعمیر کے سفر کی داستان سناتی ہیں، یہ سب انسانی تہذیب اور تہذیب کی جمالیات کی اعلیٰ ترین علامتیں ہیں، بلاشبہ یہ انسان کا عظیم ورثہ ہیں۔

مسلمان صنّاعوں، معماروں، سنگ سازوں اور تعمیر کاروں نے پتھر میں کٹے ہوئے نفیس اور عمدہ کتبے تیار کیے اور انھیں اس طرح نقش کیا جیسے وہ دیواروں کی جانب بڑھتے جا رہے ہیں۔ انھوں نے کتبوں سے ٹائلوں کا تاثر پیدا کیا، چکنی مٹی سے حروف تراشے اور طغرے بنائے، کتبوں کی پٹیوں کی تشکیل میں اپنی اعلیٰ فنکاری کا ثبوت دیا، منڈیروں کی جمالیاتی تشکیل اور اندرونی تزئین کاری اور ٹائیلس کے آرائشی کام کی عمدہ مثالیں صدیوں کی تاریخ میں ہر دَور میں ملتی ہیں، استرکاری کی تہوں کے تئیں اُن کی بیداری، کمانوں کا تزئینی استعمال، گنبدوں کی ترتیب اور میناروں کی دو یا تین منزلوں کی تقسیم کے علاوہ مرمر کی فرش بندی پر نظر رکھی جائے تو اس ہمہ گیر نظام جمال کی جانے کتنی خوبصورت اور اعلیٰ ترین جہتوں کا ادراک حاصل ہوگا۔

بغداد کے تہذیبی مرکز بننے کے بعد ثقافت اور فنونِ لطیفہ، دونوں نئے ماحول اور نئی فضاؤں سے متاثر ہوئے، عجمی اور عربی قدروں کی آویزش اور آمیزش بڑی تیزی سے ہوئی لیکن عجمی اقدار زیادہ واضح طور پر نمایاں ہوتی رہیں۔ فنونِ لطیفہ اور خصوصاً فنِ تعمیر میں وہ یونانی انداز بھی رفتہ رفتہ کم ہوتا گیا جو اسلامی ثقافت اور فنونِ لطیفہ میں عربی مزاج سے بہت حد تک ہم آہنگ ہوگیا تھا، درباروں میں ایرانی وزرا، امرا اور اونچے خاندان کے افراد کا اثر و رسوخ بڑھنے کی وجہ سے بھی فنون پر عجمی رنگ تیزی سے چڑھنے لگا، عرب حاکموں نے جب یہ محسوس کیا کہ ان کے گرد عجمی سیاست کی گرفت مضبوط ہوتی جا رہی ہے اور عجمی عناصر زیادہ فوقیت حاصل کرتے جا رہے ہیں تو انھوں نے ترکوں کی مدد لی لیکن اس کا بھی کوئی خاص اثر نہیں ہوا اور عربوں کی بہت سی فنی روایتیں آہستہ آہستہ ختم ہوگئیں، ساسانیوں کی روایات سے فنی اقدار کی آبیاری ایک بار پھر ہونے لگی۔

بغداد کو عبّاسی خلیفہ ابوجعفر منصور (۷۶۲ء تا ۷۶۶ء) نے باضابطہ سوچے سمجھے پلان کے تحت ایک خوبصورت شہر کی صورت دی تھی، شہر کے گرد فصیلیں تعمیر ہوئیں، شہر پناہ اور عمارتوں، سڑکوں اور گلیوں کی تعمیر کے ساتھ مسجدوں کی بھی تعمیر کی طرف خاص توجہ تھی۔ ہارون الرشید (۷۹۶ء تا ۸۰۸ء) خلیفہ منصور ہی کے تعمیر کیے ہوئے قلعے میں رہے۔ ہارون الرشید اور ان کے جانشینوں کی نشانیاں آج بھی کھنڈروں میں موجود ہیں۔ ۱۲۵۸ء میں ہلاکو نے عبّاسیوں کے بغداد کو تباہ کر دیا۔

بنی اُمیّہ کے عہد میں فنِ تعمیر پر شامی اثرات گہرے رہے، اس کے برعکس بنی عبّاس کے دَور میں ایرانی اور ایشیائی اثرات زیادہ ملتے ہیں، ہندوستانی علوم و فنون اور ہندوستانی فلسفوں سے بھی اس عہد میں بڑی گہری دلچسپی لی گئی، بغداد سامرہ اور رقہ وغیرہ میں ہندوستانیوں کی بستیاں آباد تھیں۔ ہندو اور بُدھ علما، یوگ، دھرم اور جاتک قصّوں اور کہانیوں پر اظہارِ خیال کیا کرتے، ان میں اکثر اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے، فنِ تعمیر پر مشرقی اور ایشیائی اثرات میں ہندوستانی اندازِ فکر کی پہچان کا مطالعہ اُس وقت یقیناً دلچسپ اور معنی خیز ثابت ہوتا جب اُس عہد کی عمارتیں موجود ہوتیں۔ یوں اِس عہد کی روایات نے جو سفر کیا ہے اُن میں ہندوستانی ذہن کو پانے اور محسوس کرنے کی کوششیں جاری ہیں، گنبدوں اور محرابوں کے مطالعے میں اِس تہذیبی اور تمدّنی آمیزش کی پہچان کسی نہ کسی طرح ہو جاتی ہے۔

عبّاسیوں نے کم و بیش نصف صدی تک سامرہ کو اپنا شہر بنائے رکھا، خلیفہ معتصم نے اس شہر کو بسایا، ۸۳۸ء سے ۸۸۳ء تک اس شہر کی ایک بڑی داستان ہے۔ ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۳ء تک ہرزفلڈ (E. Herzfeld) نے اس شہر کے آثار دریافت کیے جو تہذیبی نقطۂ نگاہ سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اِن سے عبّاسی عہد کے معماروں، صنّاعوں اور تعمیر کاروں کی فنی صلاحیتوں کا علم ہوتا ہے۔ مساجد، قلعے، مکانات اور سڑکیں اپنے ماضی کے حُسن کے متعلق سرگوشیاں کرتی ہیں۔

بغداد سے سامرہ جانے کی وجہ عربوں اور ترکوں کا اختلاف اور اُن کی باہمی کشمکش تھی، سامرہ ایک دائرہ نما شہر تھا، جب ترکوں نے سامرہ کو تباہ کیا اور قتل و غارت کا بازار گرم کیا تو ایک بار پھر بغداد تہذیبی مرکز بن گیا۔

(باقی آئندہ)

غزلیں

فضا ابن فیضی

میں، پہلے ہی قدم پہ اُلجھ کر، کہاں گرا
تھا راہ میں جو نصب، وہ پتھر، کہاں گرا

وہ شخص، تھا جو اپنی جگہ، کائنات سا
کھا کر شکستِ ذات کی ٹھوکر، کہاں گرا

سب اپنے روبرو تھے، مگر کس کو اتنا ہوش
پھر کاسۂ نظر سے، وہ منظر، کہاں گرا

جو کچھ بھی بچ رہا تھا، ہوا جل کے راکھ سب
شعلہ، بجھے چراغ کے اُوپر کہاں گرا

موسم کے احتساب سے بچنا محال ہے
آندھی کہاں پہ اٹھی تھی، چھپّر کہاں گرا

سنبھلی ہوئی صفوں میں، درآئی لہو لکیر
جاکر، مجاہدین کا لشکر، کہاں گرا

ہم لوگ، اپنے وقت کے ہیں بے نوا فقیر
مت پوچھ! طرۂ کلہِ سر کہاں گرا

شاید یہ ابتدا سفرِ رنگ و بُو کی ہے
میں بھی، دہکتی آگ کے اندر، کہاں گرا

مثلِ گلوے تازہ بریدہ ہیں ہم فضاؔ
اب بھی، ہمارے ہاتھ سے خنجر کہاں گرا

مئو ناتھ بھنجن (یو۔پی)

بشر نواز

(۱)

یہی چہرہ، یہی آنکھیں، یہی رنگت نکلے
جب کوئی خواب تراشوں تری مورت نکلے

اسی امّید پہ خوابوں سے سجائیں نیندیں
کبھی ممکن ہے کوئی خواب حقیقت نکلے

اُس سے وابستہ اِک اِک چیز کو چھو کر دیکھیں
دل بہل جانے کی شاید کوئی صورت نکلے

کسی خوشبو کے تعاقب میں سفر ہے پھر سے
پھر کوئی دشت نہ اِس راہ کی قسمت نکلے

زندگی تھی کسی بازار کا منظر جیسے
ہم بھی ماتھے پہ سجائے ہوئے قیمت نکلے

جانتے سب ہیں، بکھرنا ہے مقدر اپنا
چاہتے سب ہیں مگر یہ نہ حقیقت نکلے

(۲)

چار قدم ہر راہ پہ چل کر دیکھ لیا، لوٹ آئے ہم
آتے آتے پاس تمھارے کس کس سے ٹکرائے ہم

خوشبو خوشبو پیار تمھارا جیسے بیل چنبیلی کی
دھوپ بہت تھی راہ میں لیکن سائے سائے آئے ہم

اُلجھے اُلجھے ریشم جیسی دل کی ساری باتیں ہیں
کیا چاہے ہے آخر ہم سے خود بھی سمجھ نا پائے ہم

چاند نہیں تو کوئی ستارہ کوئی دیا ہی دان کرو
روشنیوں کے ہمجولی تم، راتوں کے ہمسائے ہم

ٹوٹے تارے، اندھیارے کچھ اور بڑھا کر ڈوب گئے
لے کر پل دو پل کے اُجالے خود بھی بہت پچھتائے ہم

یونہی تمھاری باتوں سے جو جھوٹ پڑی بے دھیانی میں
اسی کرن سے دیکھو کتنے دیپ جلا کر لائے ہم

محلہ گھاٹی، اورنگ آباد (مہاراشٹر)

غضنفر

حیرت فروش

کتابوں سے نکلتے ہی نگاہیں اشتہاروں
ڑنے لگیں۔ اشتہار اور انٹرویو کے چکر میں وہ
بدر پھرنے لگا۔ اس چکر میں اُسے چکر آنے
۔ آنکھوں میں اندھیرا چھانے لگا۔ پاؤں لڑکھڑانے
۔ مگر ایک دن ایک اشتہار سے اس کی
یں چمک اُٹھیں:

"ضرورت ہے حیرتوں کی۔ ایک ایک
ت کی مُنہ مانگی رقم۔ حیرت فروش درج
پتے پر رجوع کریں۔

ادارۂ حیرت، عجائب خانۂ نو۔ کائنات
؛ آفاق نگر۔

یرتوں کی تلاش میں نکل پڑا۔ . . .

ایک جگہ ایک بے تصور پر سٹراک سٹراک
ڑے برس رہے تھے۔ جگہ جگہ سے چمڑی اُدھڑ
ڑ گئی تھی۔ جسم کی سفید چربی کھال سے باہر
آئی تھی۔ مظلوم کی چیخ اور فریاد سے زمین و
ان دہل رہے تھے مگر لوگ تماشائی بنے
ڑے تھے۔

اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ کوڑوں کی مسلسل
ب پر اس کا اپنا وجود جھنجھنا اٹھا۔ آگے بڑھا
یک مقام پر:

ایک بن بیاہی عورت ماں بنی بیٹھی تھی۔
۔ماں بیٹے دونوں کو سنگسار کر رہے تھے
ھر مارنے والوں میں بچے کا باپ بھی شامل تھا۔

اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ لرز
اُٹھا۔ کچھ اور آگے بڑھا تو دیکھا:

کل تک جو ہاتھ باندھے، سر جھکائے
حکم بجا لانے میں مصروف رہتا تھا، احکام
صادر کر رہا تھا۔

اس کا تحکمانہ انداز دیکھ کر آنکھیں حیران
رہ گئیں۔

شہر شہر، گاؤں گاؤں، گلی گلی گھوم گھوم کر
اس نے ایک ایک کر کے بہت ساری حیرتیں
جمع کیں اور ان حیرتوں کے عوض میں ملنے والی
رقم کے تصور میں جھومتا ہوا وہ ادارۂ حیرت
میں پہنچ گیا۔

"جناب! میں آپ کے لیے حیرتیں لایا
ہوں۔"

"کیا کہا؟ حیرتیں لائے ہو!"

"جی ہاں، بہت ساری حیرتیں لایا ہوں
مجھے ان کی مُنہ مانگی قیمت ملے گی نا؟"

"ضرور ملے گی۔"

"آپ سچ کہہ رہے ہیں نا؟"

"ہاں، ہاں میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔
مگر پہلے انھیں دکھاؤ تو۔"

"ابھی دکھاتا ہوں جناب! لیجیے، یہ پہلی
حیرت ملاحظہ کیجیے۔"

"بن بیاہی عورت ماں بن گئی۔"

"دوسری دکھاؤ۔"

"جرم ثابت ہو جانے کے بعد بھی مجرم
بری ہو گیا۔"

"تیسری دکھاؤ۔"

"سخت پہرے کے باوجود چور چوری
کرنے میں کامیاب ہو گیا۔"

"کوئی اور دکھاؤ۔"

"شاخ سے پھل ٹوٹا مگر زمین پر نہیں گرا۔"

"کوئی اور۔"

"پانی میں آگ لگ گئی۔"

"اور۔"

"ایک ایسا باغ دیکھا جہاں آم کے پیڑوں
پر املی کے پھل لگے ہیں۔"

"اور۔"

"کچھ مقامات پر روشنی ہی روشنی ہے
مگر اس تیز روشنی میں بھی وہاں کوئی چیز دکھائی
نہیں دیتی۔"

"اور کوئی۔"

"سائبانوں سے دھوپ برسنے لگی ہے۔"

"کوئی اور۔"

"عجیب ہیں آپ بھی! اور اور کی رٹ
لگائے جا رہے ہیں۔ مگر ایک بھی حیرت پر آپ
کی آنکھ نہیں پھیلتی۔ . . . پیشانی پر کوئی لکیر
بھی نہیں اُبھرتی۔ کیا یہ حیرتیں آپ کو حیرت
انگیز نہیں لگتیں؟"

"حیرتیں! حیرت انگیز؟ . . . نہیں تو
مجھے تو نہیں لگتیں۔"

"آپ مذاق کر رہے ہیں جناب!"

"نہیں، میں مذاق بالکل نہیں کر رہا ہوں۔"

"تو کیا سچ مچ آپ کو یہ حیرت انگیز نہیں
لگیں؟"

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔ مجھے ان میں حیرت
کی جھلک بھی نظر نہیں آتی۔"

اُردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سنٹر۔ سولن، ہماچل پردیش

" کہیں آپ کے حواس بیمار تو نہیں ہیں؟"

" نہیں، میرے حواس بالکل درست ہیں ۔ ۔ ۔"

" لیکن میں ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں، ضرور آپ کے حواس میں کوئی خرابی آگئی ہے۔"

" نہیں بھائی! میرے حواس میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ یقین نہ ہو تو میں اپنا ڈاکٹری معائنہ بھی کرا سکتا ہوں۔ ۔ ۔ تب تو یقین کرو گے نا؟"

" ہاں ڈاکٹری معائنے کے بعد مجھے یقین آ جائے گا ۔ ۔ ۔"

مینیجر نے ڈاکٹر کو بلوا کر اپنا معائنہ کرایا اور ڈاکٹر سے بولا۔

" ڈاکٹر! رپورٹ آپ خود پڑھ کر سُنا دیجیے تاکہ انھیں اچھی طرح یقین آجائے۔"

" رپورٹ کے مطابق ان کے حواس بالکل صحیح ہیں۔ کہیں کوئی خرابی یا خامی نہیں ہے۔"

" تعجب ہے ڈاکٹر! ان کے حواس میں کوئی خرابی نہیں ہے پھر بھی انھیں یہ حیرتیں حیرت انگیز نہیں لگیں ـــــ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ڈاکٹر! یہ حیرتیں جن پر میں اب تک حیران ہوں ـــــ جنھیں دیکھ کر میری آنکھیں جل جل گئی ہیں۔ پلکیں بھیگ گئی ہیں۔ چہرہ بگڑ بگڑ سا گیا ہے۔ دل دھڑک دھڑک اٹھا ہے دماغ ماؤف ہو گیا ہے۔ وجود لرز لرز اٹھا ہے۔ ان کے لیے اُن میں حیرانی کی کوئی بات ہی نہیں ہے، سمجھا! یہ ضرور ڈراما کر رہے ہیں تاکہ میری اتنی ساری حیرتوں کے مُنہ مانگے دام نہ دینا پڑیں، ڈاکٹر! میں نے یہ بڑی مشکل سے جمع کی ہیں۔ برسوں دوڑ دھوپ کی ہے۔ دھوپ میں خود کو تپایا ہے۔ بارش میں بھگویا ہے۔ کڑاکے کی سردیاں جھیلی ہیں، تب جاکر یہ مجھے حاصل ہوئی ہیں۔ ڈاکٹر! ان سے کہیے کہ اگر یہ مُنہ مانگے دام نہیں دے سکتے تو اپنی مرضی سے جو چاہیں دے دیں ـــــ مگر ـــــ"

" دیکھو! میں کوئی ڈراما ورامانہیں کر رہا ہوں اور نہ ہی میری نیت میں کوئی کھوٹ ہے۔ تم جو کچھ اپنے ساتھ لائے ہو اگر یہ حیرتیں ہوتیں تو میں واقعی تمھیں ان کے مُنہ مانگے دام دیتا ـــــ اچھا! اگر تم کو مجھ پر یقین نہیں آ رہا ہے تو میں لوگوں کو جمع کرتا ہوں۔ تم انھیں اُن کے سامنے رکھو۔ اگر وہ انھیں حیرتیں تسلیم کر لیتے ہیں تو تم جو مانگو گے میں دینے کے لیے تیار ہوں۔"

" ٹھیک ہے آپ لوگوں کو جمع کیجیے وہی فیصلہ کریں گے۔"

لوگ جمع ہو گئے۔ اس نے سب کے سامنے حیرتوں کو رکھنا شروع کر دیا۔ ایک ایک کر کے اُس نے ساری حیرتیں دکھا دیں۔ مگر کسی بھی حیرت پر کوئی بھی آنکھ نہیں پھیلی۔ کسی بھی چہرے پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

یہ دیکھ کر اس کی حیرانی بڑھ گئی۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا۔

" دیکھیے! یہ بھی تو ممکن ہے کہ سارے لوگ کسی وبا کے شکار ہوں۔ سب کے حواس بیمار ہو گئے ہوں۔"

" تمھارا یہ شک بھی ہم دور کرا دیتے ہیں۔ ڈاکٹر! تمام لوگوں کا معائنہ کر کے رپورٹ ان کے سامنے پیش کر دیجیے۔"

مجمعے کا بھی معائنہ ہو گیا ـــــ کسی میں کوئی خرابی نہیں نکلی۔

" کہیں ایسا تو نہیں کہ جانچ مشین ہی خراب ہو؟"

" تو اسے بھی جانچ کر کے دیکھ لیتے ہیں۔"

مشینوں کی بھی جانچ ہو گئی۔ مشینیں ٹھیک تھیں۔ اس کی حیرانی اور بڑھ گئی۔ اور سر ندامت سے جُھک گیا۔

" مجھے افسوس ہے نوجوان کہ تمھاری محنت رائیگاں گئی۔ ایک بار پھر کوشش کرو ممکن ہے دوسری بار کامیاب ہو جاؤ۔"

وہ وہاں سے واپس لوٹ آیا۔ حیرتوں کی تلاش جاری رہی۔ اسے وہ تمام حیرتیں پھر سے دکھائی پڑیں جنھیں وہ ادارۂ حیرت میں چھوڑ آیا تھا۔

ان کے علاوہ اس نے یہ بھی دیکھا:

بیٹا ماں کی عزت لُوٹ رہا تھا۔

باپ بیٹی کے ساتھ زنا کرنے میں مشغول تھا۔

اندھا دیکھ رہا تھا۔

آنکھ والا ٹھوکریں کھا رہا تھا۔

زہر بے اثر تھا۔

صدا بے صوت تھی۔

سرخ سفید تھا۔

سفید سیاہ تھا۔

مگر اس بار کسی بھی حیرت پر اس کی آنکھ نہیں پھیلی۔ چہرے پر لکیر نہیں اُبھری۔ پیشانی پر بَل نہیں پڑا۔ دل کی دھڑکن تیز نہیں ہوئی۔ سماعت نہیں لرزی۔ دماغ ماؤف نہیں ہوا۔ اسے اپنے آپ پر تعجب ہوا۔ اسے لگا جیسے اس کے حواس بے کار ہو گئے ہوں۔ اُس نے اپنا ڈاکٹری معائنہ کرایا ـــــ حواس بالکل درست تھے۔

حیرتوں کی تلاش میں وہ اِدھر اُدھر بھٹکتا رہا مگر کہیں بھی کوئی حیرت ہاتھ نہیں آئی۔

کئی برس بیت گئے۔ آنکھوں میں اندھیرا گھلنے لگا۔ مایوسیاں دماغ میں ڈیرا ڈالنے لگیں۔
ایک دن اچانک ایک ناقابلِ یقین حادثہ رونما ہوا۔ اس پر اُسے حیرت کا گمان ہوا۔ وہ اپنی پھیلی ہوئی آنکھوں میں اس حادثے کو لیے ادارۂ حیرت میں پہنچ گیا۔
"تم کون ہو؟"
"میں وہی ہوں جو برسوں پہلے بہت ساری حیرتیں لے کر یہاں آیا تھا مگر میری ایک بھی حیرت نہیں بکی تھی۔
"اب کس لیے آئے ہو؟"
"پھر حیرت لے کر آیا ہوں۔"
"دکھاؤ۔"
"ایک شخص کو اس کی قابلیت کی بنیاد پر ملازمت مل گئی۔"
"کیا کہا ——؟ ملازمت قابلیت کی بنا پر مل گئی؟" منیجر کی آنکھیں پھیل گئیں۔
"جی ہاں، میں سچ کہہ رہا ہوں۔"
"اب کے تم واقعی حیرت لے کر آئے ہو۔ بولو اس حیرت کے کیا دام مانگتے ہو؟"
"جناب جس آدمی کو اس کی قابلیت کی بنا پر ملازمت ملی ہے، وہ کوئی دوسرا نہیں میں خود ہوں۔ میری مشکلیں دور ہوگئیں۔ اب مجھے حیرتوں کے دام کی ضرورت نہیں رہی —— آپ چاہیں تو اسے مفت میں لے سکتے ہیں۔
اس کی بات سُن کر منیجر کی آنکھیں اور بھی پھیل گئیں اور نگاہیں ایک اور عجوبے میں محو ہوگئیں۔

غزلیں

کرامت علی کرامت

یوں تو محل کئی ملے، کتنے مکاں ملے
بچپن کے ریت کے وہ گھروندے کہاں ملے

اک کارواں کا نقشِ قدم دب کے رہ گیا
شاید کہ تہہ سے ریت کی اس کا نشاں ملے

نکلا تو ہوں میں لے کے دیا اک بجھا بجھا
ممکن ہے راستے میں کہیں کہکشاں ملے

اک بے خودی سی چھائی رہی اپنے ذہن پر
ہم زندگی سے ہوش کی حد میں کہاں ملے

یہ قافلہ چراغ کا بڑھتا رہا ہے کیوں
کیا اس کی آرزو ہے نیا آسماں ملے

جو مجھ کو اپنے کھوتے ہوئے "میں" کا دے پتا
ایسا بھی راستے میں کوئی مہرباں ملے

اکتا گیا ہوں اب میں کرامت، ہجوم سے
خواہش نہیں کہ میرا کوئی ہم زباں ملے

پروفیسر آف متھمٹکس، کھل کوٹ کالج، برہم پور ۷۶۰۰۰۱، اڑیسہ

اقبال متین

گمان و وہم نہیں ہیں، مرا یقیں ہیں اب
مرے قدم، مرے احساس کی زمیں ہیں اب
میں جام اُٹھا کے یہی سوچتا رہا اکثر
نشہ بھی لے گئے وہ لوگ جو نہیں ہیں اب
کبھی جو ساتھ تھے میرے، مری رگِ جاں تک
دلوں کو چھوڑ کے محلوں میں جاگزیں ہیں اب
ہمیں نہ پا سکا آسیبِ ظلمتِ دوراں
ہر ایک خالی مکاں میں ہمیں مکیں ہیں اب
کچھ ایسی چرب زبانی سے جہل چھپتا ہے
یہ لوگ اپنے لیے مارِ آستیں ہیں اب
فریدؔ[1] و نشوؔ[2] و پپنؔ[3] کے ساتھ ہے عمرانؔ[4]
پتا تو دے گئے ہوتے، جہاں کہیں ہیں اب
چلو متینؔ، وہیں جا کے پھر انھیں ڈھونڈیں
وہ صورتیں جو زمیں بن کے دل نشیں ہیں اب

میرے لختِ جگر
[1] فرید اقبال مرحوم، ۱۳ سال
[2] نشو (نشید اقبال مرحوم)، ۷ سال
[3] پپن (نوشاد اقبال)، ۱۱ سال
[4] عمران قیصر مرحوم، ۲۰ سال (میرا بھتیجا مشہور آرٹسٹ قیصر سرمست کا بڑا بیٹا)

۱/۳۷-۱۵-۹، والمیکی نگر، نظام آباد ۵۰۳۰۰۱ (اے پی)

نامی انصاری

مجھے کل ملا جو سرِ چمن وہ تمام نخل شباب سا
کوئی بات اس کی شراب سی، کوئی حرف اس کا گلاب سا

جسے زندگی نہ بھلا سکے، جسے موت بھی نہ مٹا سکے
وہی میں ہوں غالبِ خستہ جاں، وہی میرِ خانہ خراب سا

وہ تمام گرد فنا ہوئی، مرے جسم و جاں پہ جو بار تھی
تری اک نظر میں سمٹ گیا، مرے سر پہ تھا جو عذاب سا

وہی ایک منظرِ خوش ادا، کہیں نقش میں کہیں رنگ میں
وہی اس کی زلف، غزل نما، وہی اس کا چہرہ کتاب سا

دلِ ناصبور کے واسطے کوئی نقشِ ناز بچا نہیں
یہ جہانِ تازہ، یہ عصرِ نو، جسے دیکھیے تہہِ آب سا

کوئی بات اس میں ضرور تھی جو مرے خیال میں رہ گئی
اُسے کیوں فریبِ نظر کہوں، جسے میں نے دیکھا تھا خواب سا

عجب اتفاق ہے نامیؔ یہ کہ ہوئے ہم بھی تو کیا ہوئے
نہ شکستہ کوئی مری طرح، نہ گرفتہ کوئی جناب سا

۱۴/۲۱-۱۴-اے، نواب صاحب کا حاطہ، سول لائنز، کانپور ۲۰۸۰۰۱

سلام بن رزاق

راجندر سنگھ بیدی — کچھ یادیں

(رحلت ۱۱ر نومبر ۱۹۸۴ء)

راجندر سنگھ بیدی کو سورگباس ہوئے پورے چھ سال ہوگئے۔

ان کی حیثیت اردو افسانہ نگاروں کے درمیان بھیشم پتامہ کی طرح تھی جو زندگی کے آخری برسوں میں نامساعد حالات اور جان لیوا امراض کے تیروں سے چھلنی اپنے بھربھراتے جسم کا بوجھ اپنے ناتواں کاندھوں پر اٹھائے ہوئے تھے۔

وہ آخری ایام میں اس برگ و بار درخت کی مانند تھے جس کی جڑوں کو کیڑے چاٹ چکے ہوں مگر اُس کی ٹنڈ منڈ شاخیں اس کے قدموں میں ستانے والے مسافروں کے لیے دستِ دعا کی طرح بلند رہتی ہیں۔ اپنی طویل بیماری کے سبب بیدی صاحب نے ایک عرصے سے لکھنا چھوڑ دیا تھا۔ 'ایک باپ بکاؤ ہے' غالباً اُن کا آخری افسانہ تھا جو اظہار (بمبئی) میں شائع ہوا تھا۔ تاہم پتہ نہیں ایسا کیوں لگتا تھا کہ وہ کسی بھی وقت اپنی بیماریوں کو اپنے جسم سے جھٹک کر ایک دم سے صحت یاب ہو جائیں گے اور ایک بار پھر اپنی کسی لازوال تخلیق سے ہم سب کو حیران و ششدر کر دیں گے۔

ان سے میری پہلی ملاقات ۱۹۷۸ء کے اوائل میں ان کے ماٹونگا والے فلیٹ پر ہوئی تھی۔ میں اپنا پہلا افسانوی مجموعہ لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ بیدی صاحب اس وقت کسی فلم کی اسکرپٹ ٹائپ کرا رہے تھے۔ مجھ سے معذرت چاہتے ہوئے ایک منٹ کی اجازت چاہی اور اسکرپٹ کا پیراگراف مکمل کرلیا۔ پھر ٹائپ رائٹر سے اُٹھ کر صوفے پر میرے پاس آکر بیٹھ گئے۔ میں نے اپنی کتاب انھیں پیش کی۔ انھوں نے نہایت شفقت سے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور کتاب کو اِدھر اُدھر سے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگے۔ ان کے دستِ شفقت کا وہ مشفقانہ لمس میں آج بھی محسوس کر سکتا ہوں۔ بیدی صاحب کو میں نے پہلی بار اتنے قریب سے دیکھا تھا۔ مجھے وہ خاصے تھکے تھکے سے لگے۔ اندر کے کمرے میں گرنتھ صاحب کا پاٹھ ہو رہا تھا۔ میرے دریافت کرنے پر بیدی صاحب نے بتایا کہ آج اُن کی اہلیہ کی برسی ہے۔ اپنی اہلیہ کے ذکر پر وہ کچھ اُداس ہو گئے۔ اور کہا کہ ان کے نہ ہونے سے میں اپنے آپ کو بہت تنہا تنہا محسوس کرتا ہوں۔ پھر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ میں تقریباً ایک گھنٹے تک ان کی دلچسپ اور دلکش باتوں سے محظوظ ہوتا رہا۔ اُن کی گفتگو میں مجھے بیک وقت بچوں کی معصومیت اور بزرگوں کی شفقت کا احساس ہوا اور پہلی ہی ملاقات میں ان کی سحر انگیز شخصیت نے مجھے اپنا گرویدہ بنالیا اور میں مہینوں اپنے ہم عصر قلم کاروں سے اس ملاقات کا ذکر بڑے فخر سے کرتا رہا۔

چند مہینوں بعد ہی پتہ چلا کہ ان پر فالج کا حملہ ہوا ہے اور ہسپتال میں داخل کر دیے گئے ہیں۔ ایک طویل جدوجہد کے بعد وہ موت کے مُنہ سے نکل آئے۔ ان کی صحت یابی کی خوشی میں مہاراشٹر اردو اکیڈمی کی جانب سے ایک چھوٹی سی تقریب رکھی گئی تھی۔ کئی لوگ شریک تھے سب نے بیدی صاحب کو ان کی صحت یابی پر مبارکباد دی۔ آخر میں بیدی صاحب نے اظہارِ تشکر کے طور پر بڑی مشکل سے چند کلمات کہے۔ اُن کی زبان میں لکنت آگئی تھی اور جملے بے ربط ادا ہو رہے تھے۔ کیسا دردناک منظر تھا۔ وہی بیدی صاحب تھے جو محفل میں زبان کھولتے تو ساری محفل زعفران زار ہو جاتی تھی آج اُنھیں کے حلق میں کانٹے سے پڑ رہے تھے اور آوازیں گرہیں لگ رہی تھیں۔ دورانِ تقریر انھوں نے کسی بات پر باقر مہدی صاحب کو مخاطب کرنا چاہا۔ باقر صاحب سامنے کی صف میں بیٹھے ہوئے تھے۔ مگر بیدی صاحب باقر صاحب کا نام بھول گئے تھے۔ کوشش کے بعد بھی انھیں باقر صاحب کا نام یاد نہیں آیا تھا۔ فالج نے ان کی یادداشت کو متاثر کر دیا تھا۔ وہ اپنے عزیز ترین ساتھی کا نام بھول گئے تھے۔ حاضرین میں سے کسی نے انھیں باقر صاحب کا نام یاد دلایا۔ مگر اس کے بعد وہ تقریر جاری نہ رکھ سکے اور دل برداشتہ ہو کر بیٹھ گئے۔ ان کی آنکھوں میں بے بسی کے آنسو چھلک رہے تھے۔ دیگر حاضرین کے ساتھ میں ان سے مصافحہ کر کے اور اُن کے لرزتے ہاتھوں کو چوم کر واپس چلا آیا تھا۔ پھر تقریباً دو برس بعد ان کے بیٹے نریندر سنگھ بیدی کا انتقال ہو گیا۔ نریندر سنگھ بیدی نے بحیثیت فلم ساز اور ہدایت کار فلم انڈسٹری کو چند ناقابلِ فراموش

۹/۱۱۔ ایل۔ آئی۔ جی۔ ڈی۔ بھاؤ نگر، کرلا ویسٹ، بمبئی۔ ۴۰۰۰۷۰

فلمیں ہوئی ہیں۔ فلم انڈسٹری میں انھوں نے اپنا ایک مقام بنا لیا تھا۔ ان کی اچانک موت سے سب کو صدمہ ہوا۔ مگر بیدی صاحب کے غم کا اندازہ کون لگا سکتا تھا۔ فالج نے انھیں توڑ کر رکھ دیا تھا، ہونہار بیٹے کی موت نے تو چُور چُور کر دیا۔

ایک دن میں اور میرے ایک دوست شکیل چندران ان سے ملنے ان کے باندرہ والے مکان پر پہنچے۔ شکیل کے ان سے دیرینہ مراسم تھے۔ بیدی صاحب ہم سے بڑے تپاک سے ملے۔ بیٹے کی جدائی کا دکھ ان کے روئیں روئیں سے ٹپک رہا تھا مگر انھوں نے گفتگو سے قطعی اس کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ ہم لوگ کافی دیر تک مختلف موضوعات پر باتیں کرتے رہے۔ پرانے اور نئے افسانے کا بھی ذکر آیا۔ نئے افسانے سے بیدی صاحب بہت مطمئن نہیں تھے۔ ویسے انھوں نے بتایا کہ میں نئے لکھنے والوں کو گاہے گاہے پڑھتا رہتا ہوں۔ مگر ان میں سے بیشتر میری سمجھ میں نہیں آتے۔ میں نے مسکراتے ہوئے ادب سے کہا۔ "بیدی صاحب آخر جنریشن گیپ بھی تو ایک حقیقت ہے۔"

کمرہ ان کی ہنسی سے روشن ہو گیا۔ پھر دوسرے ہی لمحے بڑے دُکھ سے کہا کہ میرا لکھنا بالکل بند ہو گیا ہے۔ ہاتھ میں رعشہ رہتا ہے، خیالات میں انتشار کی سی کیفیت رہتی ہے البتہ تھوڑا بہت مطالعہ کر لیتا ہوں۔ مگر سنجیدہ موضوعات پر ذہن مرتکز نہیں ہو پاتا۔ اُنھیں اپنی بیماری سے زیادہ نہ لکھنے کا صدمہ تھا۔ اُن کے کمرے میں چاروں طرف کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔ انھوں نے انتہائی حسرت سے کہا کہ وہ ان ساری کتابوں کو اب شاید ہی کبھی پڑھ پائیں۔ پھر شکیل سے کہا، وہ کسی روز آئے اور ان میں سے کچھ کتابیں چھانٹ کر باقی کتابیں کسی لائبریری کو دے دے۔

بعد میں مجھے شکیل نے بتایا کہ وہ ایک روز گئے تھے اور انھوں نے کتابیں چھانٹنا شروع کیں۔ بیدی صاحب صوفے پر چپ چاپ بیٹھے دیکھ رہے تھے۔ جس کتاب کو وہ اپنے پاس رکھنا چاہتے شکیل اسے شیلف میں لگا دیتے باقی کتابوں کی ایک طرف ڈھیریاں لگائے جا رہے تھے۔ شکیل نے انھیں کتابوں کے ڈھیر میں میرا افسانوی مجموعہ بھی نکال کر ڈال دیا۔ بیدی صاحب صوفے سے اُٹھے اور انھوں نے میرا مجموعہ اُٹھا کر شیلف میں لگا دیا اور کہا کہ "ہمیں اسے یہیں رہنے دو۔"

شکیل نے جب مجھے یہ بات بتائی تو مجھے خوشی کے ساتھ ہلکے سے فخر کا احساس ہوا۔ گویا بیدی صاحب نئے لکھنے والوں سے مطمئن بھلے نہ ہوں مایوس قطعی نہیں تھے۔

ایک روز سریندر پرکاش صاحب نے مجھے اور انور قمر کو بتایا کہ وہ بیدی صاحب سے ملے تھے اور وہ آپ لوگوں کو یاد کر رہے تھے۔ تین چار روز بعد سریندر پرکاش، انور قمر، مشتاق مومن اور میں ان کے گھر پہنچے۔ پتا چلا کہ وہ ہوا خوری کے لیے جوہو گئے ہیں۔ ہم لوگ اُنھیں تلاشتے ہوئے جوہو پہنچے۔ بیدی صاحب اپنے کسی ملاقاتی کے ساتھ ٹہلتے ہوئے مل گئے۔ ہمیں دیکھتے ہی ان کا چہرہ کھل اٹھا۔ سریندر جی نے آگے بڑھ کر ان کے چرن چھوئے۔ انور قمر اور مشتاق مومن اور میں نے ان کے ہاتھ چومے۔ میں دیکھ رہا تھا ان کی آنکھوں میں ہم سب کے لیے بے پناہ شفقت تھی۔ ہم سب وہیں ریت پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد اُن کے وہ ملاقاتی وہاں سے رخصت ہو گئے۔ اس روز بیدی صاحب کافی خوش دکھائی دے رہے تھے۔ سریندر جی سگریٹ پی رہے تھے اور حسب عادت گہرے اور طویل کش کھینچ رہے تھے۔ بیدی صاحب ان کی سگریٹ نوشی کی اس ادا سے کافی محظوظ ہوئے اور بولے۔

"کبھی ہم بھی اسی طرح سگریٹ پیتے تھے۔"

پھر میں نے ان کی اجازت سے سگریٹ جلائی اور انھیں بھی سگریٹ آفر کی۔ وہ ایک لمحہ توقف کے بعد بولے۔ کوئی سگریٹ سلگا دے تو میں پی لوں گا۔"

انور قمر نے سگریٹ سلگائی اور اُنھیں پیش کی۔ بیدی صاحب نے محتاط انداز میں دو تین کش لیے۔ مگر وہ سگریٹ سے خاطر خواہ لطف اندوز نہ ہو سکے۔ اور انھوں نے سگریٹ ریت میں دبا کر بجھا دی۔ اس دن بیدی صاحب سے خوب باتیں ہوئیں۔ وہ رُک رُک کر شکستہ لہجے میں گفتگو کر رہے تھے مگر اس شکستگی میں بھی ان کے جملوں کی شگفتگی برقرار تھی۔ دورانِ گفتگو پتا نہیں کیسے باقر مہدی صاحب کا ذکر آ گیا۔ سریندر جی نے کہا کہ "آج کل باقر صاحب سے ان کے تعلقات کشیدہ ہیں۔"

پھر آگے کہا۔ "باقر صاحب، زود رنج ضرور ہیں مگر ان کے دل میں کچھ نہیں ہوتا۔"

بیدی صاحب نے مسکرا کر برجستہ کہا

"دماغ میں بھی کچھ نہیں ہوتا۔"

ہم سب بے ساختہ ہنس دیے۔ بیدی صاحب توقف کے بعد بولے۔

"وہ آدمی یعنی باقر مہدی مجھے بہت پسند ہے۔ پتا نہیں وہ لوگوں سے کیوں کر لڑ لیتے ہیں۔ مجھ سے تو کبھی جھگڑا نہیں ہوا۔"

اُس کے بعد ہم ایک کولڈ ڈرنک اسٹال پر پہنچے۔ کولڈ ڈرنک پینے کے بعد سریندر پرکاش نے بل ادا کرنا چاہا، مگر بیدی صاحب نے بااصرار انھیں منع کر دیا۔ اور خود آگے بڑھ کر پیسے دے دیے۔ ہم سمجھے تھے وہ کار میں جو ہو آئے ہوں گے مگر انھوں نے بتایا کہ اب اُن کے پاس کار نہیں رہی ہے اور یہ کہ روزانہ باندرہ سے جوہو ٹیکسی یا اسکوٹر سے ہوا خوری کے لیے آنا ان کے لیے خاصا مہنگا شوق ہے۔ اس لیے وہ جوہو ہفتے عشرے میں ہی آپاتے ہیں۔ اور روزانہ باندرہ ہی میں مکان کے قریب ایک گارڈن میں چہل قدمی کے لیے چلے جاتے ہیں۔ ہم نے انھیں اسکوٹر میں سوار کرا دیا۔ اور وہ سب سے دوبارہ ملنے کا وعدہ لے کر گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

ان سے آخری ملاقات ان کی موت سے دو ماہ قبل اُن ہی کے مکان پر ہوئی تھی۔ کینسر کے آپریشن کے بعد وہ ہسپتال سے گھر آ گئے تھے میں اور شکیل ان کی عیادت کو پہنچے۔ دروازہ انھوں نے ہی کھولا تھا۔ بیدی صاحب اَب کافی سکڑ سمٹ گئے تھے۔ گھسٹ گھسٹ کر بڑی مشکل سے چند قدم چل پاتے تھے۔ انھوں نے دو چار باتیں بھی کیں۔ مگر آواز بھرائی ہوئی اور لہجہ خاصا شکستہ تھا۔ مشکل ہی سے بات سمجھ میں آتی تھی۔ وہ کچھ مضطرب بھی دکھائی دیے۔ بعد میں بتایا کہ ان کا چھوٹا بیٹا اور بہو جرمنی سے آنے والے ہیں۔ اس روز زیادہ گفتگو بھی نہ ہو سکی۔ ہم لوگ بعد میں آنے کا وعدہ کر کے چلے آئے۔ مگر پھر ملنے کا موقع نصیب نہیں ہوا۔ بس شمشان میں ہی ان کے آخری درشن کر سکے۔

بیدی صاحب اب ہمارے درمیان نہیں رہے۔ مگر اُن کا فن اس ناقابلِ تسخیر سلسلۂ کوہ کی مانند ہمارے سامنے پھیلا ہوا ہے جس کی سربلند، دلکش چوٹیاں آنے والی نسلوں کو دعوتِ نظارہ کے ساتھ ایک چنوتی بھی دیتی رہیں گی۔

اکبر علی خاں عرشی زادہ

محلہ پھلواڑ، رامپور (یو.پی)

ادھوری داستاں

(نذرِ رودکی)

فارسی کے قدیم ترین شاعر رودکی نے بخارا کے امیر ابونصر سامانی کا ایک قصیدہ لکھا تھا جس کا آغاز "بوے جوے مولیاں آید ہمی" سے ہوتا ہے۔ حالاں کہ امتدادِ زمانہ کے باعث اس قصیدے کے چند ہی شعر باقی بچے ہیں مگر اپنی سادگی اور تاثیر کے سبب فارسی شعر کا ذوق رکھنے والوں کے آج بھی زباں زد ہیں۔ گزشتہ دِنوں انھیں گنگناتے ہوتے درجِ ذیل اُردو شعر نظم ہو گئے۔

ہم کو یارِ مہرباں یاد آتے ہے
جانِ جاں، روحِ رواں یاد آتے ہے

دلدہی و دلبری جس پر تمام
وہ عزیزِ دلستاں یاد آتے ہے

ختم جس پر اشتراکِ ذہن و دل
وہ حبیبِ راز داں یاد آتے ہے

سہل تھے ہنگامہ و مستی جہاں
وہ زمیں وہ آسماں یاد آتے ہے

رچ گیا تھا جس میں رنگِ پیرہن
وہ فضائے گلستاں یاد آتے ہے

بس گئی تھی جس میں خوشبوئے بدن
وہ ہوائے بوستاں یاد آتے ہے

اس کے چہرے میں سوا تھی تازگی
دیکھ کر روئے بتاں یاد آتے ہے

ایک پل کو بھی نہ بھولا جاتے جو
کیا کہیں کب اور کہاں یاد آتے ہے

جینے اور مرنے کا تھا جس پر مدار
وہ یقیں اور وہ گماں یاد آتے ہے

حل نہ کر پائے ہم آخر تک جسے
عشق کی وہ چیستاں یاد آتے ہے

تاب کب تھی یہ کر جلتے دیکھتے
دِل کی بستی کا دھواں یاد آتے ہے

مانگتی ہے عاشقی اپنا حساب
آج ہر سود و زیاں یاد آتے ہے

ہجر میں اُس کے جو گزرا آج تک
سب عذابِ جسم و جاں یاد آتے ہے

آندھیاں جس کو اُڑا کر لے گئیں
پھر ہمیں وہ آشیاں یاد آتے ہے

خود پہ تھا جو کچھ یقیں سب ہٹ گیا
اُس پہ تھا جو جو گماں یاد آتے ہے

اُس کے بھی پیمان دِل پر نقش ہیں
اپنا بھی اِک اِک بیاں یاد آتے ہے

ہم کو جتنا بھی وہ کر لیتا ہے یاد
کس کو کون اتنا میاں یاد آتے ہے

جسم سے جیسے جدا ہوتی ہے روح
اُس کی رخصت کا سماں یاد آتے ہے

ہے ہماری موت جس کا اختتام
وہ ادھوری داستاں یاد آتے ہے

یصر اقبال

بازو کی قوت

رات کا اندھیرا دم توڑ رہا تھا اور سیاہ سمان کی چادر پر روشنی کے سفید دھبے نمایاں ونے لگے تھے۔ درختوں پر چڑیوں کے چہچہانے ور کوے کی کائیں کائیں کی اکا دکا آوازیں بھی نی شروع ہوگئی تھیں کہ اسی درمیان بوڑھے اموکا کا نے رحیمو کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے لہا۔ "اٹھ رحیمو۔ اٹھ جا۔ دیکھ دودھ پور کے گرجا ھر سے گھنٹے کی آواز بھی آگئی ہے اور مسجد میں ذان بھی ہوگئی ہے اور تو ہے کہ اب تک سویا ہے۔ بھگوان کو ناراض کرے گا کیا؟"

"اٹھتا ہوں کاکا۔۔۔ اٹھتا ہوں۔" رحیمو نے ھر کے اندر سے جواب دیا۔ پھر رامو کاکا وہاں سے آگے بڑھ کر راستے میں پڑنے والے گھروں آواز لگاتا ہوا کرپال سنگھ کے دروازے پر پہنچا۔ رپال سنگھ نہا دھو کر اب گرودوارہ جانے کی تیاری رہی رہا تھا کہ سامنے سے رامو کاکا کو آتا ہوا دیکھ رکہنے لگا: "لو کاکا آج میں تمہارے آنے سے ہلے ہی نہا دھو کر تیار ہو گیا ہوں۔"

وہ تو ٹھیک ہے کہ آج تو خود ہی اٹھ گیا لبن ہر دن اسی طرح اٹھتا رہے گا اور گاؤں کے ارے لوگ بھی اٹھتے رہیں گے اور اپنے اپنے ھرم کے انوسار بھگوان کی پوجا کرتے رہیں گے پھر اس گاؤں پر کوئی سنکٹ نہیں آئے گا اور رھ اور سوکھے سے بھی ہم لوگوں کو مکتی مل جائے ۔" رامو کاکا نے جیسے بلاؤں سے نجات کی ٓری اور یقینی صورت بتائی۔

"ہاں کاکا تم ٹھیک ہی تو کہتے ہو۔ اگر گنگا نگر کے باسی ہمیشہ کی طرح پریم سے رہتے رہے تو پھر بھگوان کو بھی کیا پڑی ہے کہ وہ ہم لوگوں کو کسی مصیبت میں ڈالے۔ وہ تو بس یہی چاہتا ہے کہ انسان اس کی پوتر دھرتی پر بھید بھاؤ کی گندگی سے ہیضہ نہ پھیلائے۔" کرپال سنگھ نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

"تیرے وچار سندر ہیں بیٹا۔۔ بھگوان تیری رکشا کرے۔" یہ کہتے ہوئے رامو کاکا وہاں سے چل دیے اور جب اپنے گھر کے قریب پہنچے تو ایک بار پھر زوروں سے ہانک لگائی کہ سب جاگ جائیں اور یہ ان کا روز کا معمول تھا۔

مندر کے پجاری نے جب رامو کاکا کو گاؤں میں ہر طرف ہانک لگا کر واپس آتا ہوا دیکھا تو مندر میں ایک بار اور گھنٹیاں بجائیں اور اب بھجن شروع ہوگیا جس کی روح پرور آواز صبح صادق کی خاموش فضا میں ہر طرف پھیلنے لگی جس سے ہر روز گنگا نگر کے بیدار اور نیم بیدار شخص پر خدا اور بندے کے تعلق کی کیفیت پیدا ہو جاتی۔

گنگا نگر نام کا یہ گاؤں کئی سو برس پرانا تھا اور نہ جانے کب سے یہاں مختلف مذاہب اور مختلف ذات برادری کے لوگ آباد تھے یہاں کے رہنے والے فطری طور پر امن پسند تھے اور سبھی سوت کاتنے، مٹی کے برتن بنانے اور لوہے کے اوزار تیار کرنے جیسے دھندوں اور کھیتی کی کمائیوں میں مست اور مطمئن تھے۔ گاؤں کے اندر اور باہر ہری گھاس کے بڑے بڑے میدان بھی تھے، جس میں گاؤں کے مویشی اتنے آرام سے چرتے کہ ان کے دن بھر چرنے کے بعد بھی بہت سی چراگاہیں خالی رہ جاتیں جہاں کبھی کبھی پاس پڑوس کے گاؤں سے مویشی آجاتے۔

گنگا نگر سے پچھم میں سات میل کی دوری پر دودھ پور نام کی ایک بڑی بستی تھی جہاں کے لمبے لمبے اور گورے گورے کسانوں کا خاص پیشہ کھیتی اور دودھ بیچنا تھا۔ وہ اچھی ذات اور ولایتی نسل کے جانوروں کو پال کر خوب دودھ نکالتے اور اس کی کمائی سے شاندار مکانوں میں آرام سے رہتے۔ انھوں نے اپنے بال بچوں کو بڑے شہروں میں بھیج بھیج کر اچھی تعلیم بھی دلوائی تھی جس کے بعد وہ سائنٹفک ڈھنگ سے کھیتی کرنے لگے تھے۔ لیکن ان کی چراگاہیں ان کے ولایتی جانوروں کے لیے ناکافی ہوتی تھیں۔ اس لیے وہ اپنے جانوروں کو لے کر سات میل کی دوری طے کرنے کے بعد گنگا نگر پہنچنے لگے۔ جہاں کے لمبے چوڑے ہری گھاس کے میدان ان کے جانوروں کو بہت راس آئے۔ اور وہ دوگنی مقدار میں دودھ دینے لگے۔ جس سے دودھ پور کے گورے کسانوں کا کاروبار خوب چمکا اور وہ کافی امیر ہو گئے۔ لیکن ان کو اب یہ ڈر لگنے لگا کہ کہیں گنگا نگر والے ایک آواز ہو کر ولایتی جانوروں کے چرنے پر ٹیکس کا مطالبہ نہ کر ڈالیں یا پھر کسی قسم کی کڑی پابندی کا قانون بنا کر دودھ پور کے جانوروں کو گنگا نگر کی چراگاہوں میں چرنے سے بالکل روک دیں۔ اس لیے دودھ پور کے کسانوں نے پہلے تو گنگا نگر والوں کے ساتھ دوستی بڑھائی پھر یہاں مفت دودھ کے تحفے

ماڈل انٹر کالجیٹ اسکول مونگیر

بانٹنے لگے اور جب زمین ہموار ہو گئی تو گنگا نگر میں بیٹھ کر ادھر ادھر کی لگائی اور بجھائی کا کام شروع کر دیا جس سے تھوڑے ہی دنوں میں گنگا نگر کی صاف اور کھلی فضا میں دلوں کی کدورت اور رنجش کی بدبو پھیلنے لگی۔ مذہب۔ ذات برادری، نسل اور امیری غریبی کے فرق کا احساس سر اٹھانے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک لمبے عرصے تک دودھ پور کے ولایتی جانوروں کے خلاف کوئی کارروائی عمل میں نہیں آئی اور وہ یہاں کی زرخیز چراگاہوں میں اطمینان سے چرتے رہے۔ لیکن جب قدرت نے گنگا نگر کی آب و فضا کے صاف ہونے کی کوئی صورت نہیں دیکھی تو اس نے بھی خیر و برکت کا ہاتھ کھینچ لیا اور یہاں کے ہرے بھرے کھیت اور میدان سوکھنے لگے۔ چراگاہوں کی شادابی ختم ہونے لگی اور جب خود گنگا نگر کے مویشی سوکھے سے مرنے لگے تو دودھ پور والوں کو بھی سات میل کی دوری سے چل کر یہاں آنا مہنگا لگا اور رفتہ رفتہ وہ گنگا نگر سے بے تعلق ہو گئے۔ لیکن اپنی بے تعلقی سے قبل وہ گنگا نگر کے ماحول کو اس قدر پراگندہ کر چکے تھے کہ یہاں کے باسی اب آپس میں ایک دوسرے کو مشکوک اور بدگمان نظروں سے دیکھنے لگے۔ ان کے درمیان کا اعتبار اور خلوص ختم ہو گیا اور گاؤں کی مرکزی پنچایت ٹوٹ گئی۔ پچھم ٹولہ والے جو گاؤں سے ہو کر گزرتی ہوئی سڑک کے اُس پار آباد تھے انھوں نے اپنی ایک الگ پنچایت بنالی۔ پھر کچھ دنوں بعد پورب ٹولہ والے جو نہر کے پار تھے انھوں نے بھی اپنی ایک علیحدہ پنچایت کا اعلان کر دیا۔ اس طرح ایک گنگا نگر تین حصوں میں بٹ گیا اور اس کی تین پنچایتیں ہو گئیں پھر جس کو جہاں اپنی ذات برادری اور رشتے کے لوگ زیادہ نظر آئے وہاں منتقل ہو گیا۔

رحیمو کے باپ دادا کا گھر گنگا نگر گاؤں کے وسط میں واقع تھا۔ اس کے دوسرے رشتے کے تمام لوگ بھی اُس پاس کے گھروں میں رہتے تھے۔ مسجد بھی رحیمو کے گھر سے قریب تھی جہاں اس کے چچا عبداللہ میاں نماز پڑھا کرتے تھے لیکن رحیمو کو یہ خیال ہونے لگا کہ جب اس کی برادری اور رشتے کے بہت سے لوگ پورب ٹولے اور پچھم ٹولے کو چلے گئے ہیں تو اب گنگا نگر کی پُرانی پنچایت میں اس کی آواز دب کر رہ جائے گی اور ضرورت پڑنے پر اُسے یہاں انصاف بھی نہیں مل سکے گا۔ اس لیے اس کو بھی کسی ٹولے میں منتقل ہو جانا چاہیے۔ لیکن اس کو یہ فیصلہ کرنے میں دیر لگ رہی تھی کہ وہ پورب ٹولہ جائے یا پچھم ٹولہ۔ پھر کافی غور و فکر کے بعد اس نے پورب ٹولے میں رہنا اس لیے پسند کیا کہ وہاں کے لوگ رہن سہن اور ماحول کے اعتبار سے رحیمو سے کچھ پیچھے ہی تھے آگے نہیں۔ جب کہ پچھم ٹولہ والوں کا رکھ رکھاؤ کچھ ایسا تھا کہ وہ رحیمو پر بھاری پڑ سکتے تھے علاوہ ازیں رحیمو کو یہ خوش فہمی بھی تھی کہ پورب ٹولہ کی پنچایت میں اُس کی آواز کا کچھ وزن رہے گا۔

رحیمو نے جب پورب ٹولہ جانے کی تیاری کرلی تو اس کے چچا عبداللہ میاں نے اسے بہت سمجھایا کہ "بیٹا باپ دادا کے گھر کو ویران کر کے نہ جاؤ اگر آج یہاں کی فضا کچھ بگڑی ہے تو کل ٹھیک بھی ہو جائے گی۔ اور پھر اصل عزت تو اپنے ہی گھر میں ملتی ہے جہاں اپنے پرائے سب کام آتے ہیں۔" لیکن رحیمو نے کسی کی نہیں سنی اور نہر پار کر کے پورب ٹولہ چلا گیا۔

پورب ٹولہ میں رحیمو نے اپنے پیر جمانے میں اتنی محنت کی کہ اُسے مہینے اور سال کے گزرنے کا احساس بھی نہیں ہو سکا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ شاندار مکان اور مناسب جگہ زمین کا مالک بن گیا۔ لیکن وہاں کے پرانے رہنے والوں کو بیچ کے ٹولے سے آئے رحیمو کی اتنی ترقی گراں گزری۔ چنانچہ ان کے اور رحیمو کے درمیان کچھ اختلافات شروع ہو گئے۔ پھر جب پورب ٹولہ کے ایک پرانے باسی نے رحیمو کی خوبصورت بیٹی کو اپنے گھر کی بہو بنانے کی تجویز رکھی تو رحیمو کو یہ بات بہت بُری لگی۔ کیونکہ وہ پورب ٹولہ میں رہتے ہوئے بھی وہاں کے پرانے رہنے والوں کو خود سے کمتر سمجھتا تھا۔ اسے ہرگز یہ بات گوارا نہیں تھی کہ وہ اپنی نازوں کی پلی بیٹی کو وہاں بیاہ دے۔ اس طرح مزید رنجش بڑھی اور رحیمو کو پورب ٹولہ میں رہنا دشوار لگنے لگا۔ رحیمو نے حالات پر قابو پانے کے لیے پچھم ٹولہ سے اپنے خاندان کے کچھ لوگوں کو اپنی مدد کے لیے بُلا لیا۔ مگر اس سے بات اور بگڑ گئی اور اس کا ردعمل اس قدر شدید ہوا کہ رحیمو اور اُس کے ہم نواؤں کو پورب ٹولہ سے چپ چاپ نکل جانے میں عافیت نظر آئی۔ لیکن رحیمو کے لیے مسئلہ یہ تھا کہ وہ یہاں سے کہاں جائے۔ کیونکہ گنگا نگر کی پرانی پنچایت کو وہ ٹھکرا چکا تھا۔ اس لیے وہاں واپس جانا اس کے لیے شرمندگی کا باعث تھا۔ مجبوری کی صورت میں اب سوائے پچھم ٹولہ کے اور کسی جگہ پناہ کی شکل نظر نہیں آئی مگر پچھم ٹولہ پہنچنے کے لیے گنگا نگر کے بیچ ٹولے سے ہو کر گزرنا تھا اور یہ کام دن کے اجالے میں ممکن نہ تھا۔ لہٰذا اس نے رات کے اندھیرے ہی میں مُنہ چھپا کر بھاگنا مناسب سمجھا۔

اُس دن شام سے کچھ بارش ہو رہی تھی اور

جب رات آئی تو بارش بہت تیز ہو گئی۔ نالوں اور گڑھوں میں چھپے مینڈک باہر نکل آئے تھے اور ہر طرف ٹرٹر کی آواز لگا رہے تھے آسمان اب بھی صاف نہیں ہوا تھا۔ بادل کے ٹکڑے ہر جانب لٹکے لٹکے نظر آرہے تھے۔ جس کی وجہ سے ہر طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ رحیمو نے اس موقع کو غنیمت جانا۔ اپنی بیوی اور بچوں کو ساتھ لیا۔ روپے پیسے اور زیور کے ساتھ کچھ ضروری کاغذات ایک چھوٹے بکس میں بند کر کے بکس ہاتھ میں لیا اور خاموشی سے نکل پڑا۔ اس کے کچھ ساتھی آگے نکل چکے تھے کچھ پیچھے سے آنے والے تھے۔ رحیمو گیلی زمین پر پھسل پھسل کر گرتے پڑتے بچوں کو سنبھالتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا اور ایک جانب اس کی بیوی اور جوان بیٹی بھی خود کو کسی طرح سنبھال کر قدم آگے بڑھا رہی تھیں کہ اسی درمیان جب وہ لوگ نہر پار کر کے بیچ ٹولے میں داخل ہو گئے تو رحیمو نے چاہا کہ سب لوگ کچھ تیز چل کر اس ٹولے سے جلد گزر جائیں لیکن اس جلد بازی میں ایک بچے کا ہاتھ رحیمو کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ خوف سے رونے لگا۔ رحیمو نے پلٹ کر جب اسے پکڑنا چاہا تو اندھیرے میں ایک شخص سے ٹکرا گیا۔ اُسی لمحے زوروں کی بجلی چمکی جس کی روشنی میں رحیمو نے اپنے چچا عبداللہ میاں کو پہچان لیا۔ انھوں نے بھی ایک ہی نظر میں سارا ماجرا سمجھ لیا۔ رحیمو نے گھبرا کر صرف اتنا پوچھا کہ " آپ اس وقت یہاں . . . ؟ "

عبداللہ میاں نے ہاتھ میں لیے کدال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بڑی طمانیت کے ساتھ جواب دیا۔ " ہاں کھیتوں میں نالی کاٹنے گیا تھا کہ بارش کا پانی جمع نہ ہو جائے۔ " پھر عبداللہ میاں نے تھوڑے توقف سے کہا۔ " مجھے تیرا حال معلوم ہے بیٹا! لیکن تو کب تک پورب پچھم بھاگتا رہے گا۔ تیرا اصل مقام تو باپ دادا کا گھر ہے جو اب بھی تیری راہ دیکھ رہا ہے۔ " مگر رحیمو کوئی جواب دیے بغیر بیوی اور بچوں کو سنبھالتا ہوا پچھم ٹولے کی طرف بڑھ گیا۔

پچھم ٹولہ پہنچنے کے بعد اگرچہ رحیمو کے لیے قدم جمانے کے راستے کھلے ہوئے تھے لیکن پچھلے تجربے کی بنیاد پر اُسے اب یہ ڈر محسوس ہو رہا تھا کہ کچھ دنوں بعد یہاں بھی یہ آواز اُٹھ سکتی ہے کہ دوسرے ٹولے سے آئے ہوئے لوگ پچھم ٹولہ خالی کر دیں۔ کیونکہ یہ صرف پچھم ٹولہ کے پُرانے باشندوں کا علاقہ ہے۔ رحیمو اب کسی ایسی پناہ کی تلاش میں تھا جہاں وہ اپنی بقیہ زندگی سکون اور عافیت کے ساتھ گزار سکے۔ حقیقت یہ تھی کہ اب وہ بھاگتے بھاگتے تھک گیا تھا اور اس کے حوصلے جواب دینے لگے تھے۔ چنانچہ جب رحیمو کو یہ خبر ملی کہ پچھم ٹولے سے پانچ میل اُتر پچھم کی طرف سونا پور گاؤں میں جو کبھی بنجر علاقہ سمجھا جاتا تھا اب قدرت کی مہربانیوں سے وہاں کی زمین میں شاندار فصل کی کاشت ہو رہی ہے اور وہاں کھیتی کا کام سنبھالنے کے لیے دُور دُور کے گاؤں سے مزدور کسان اور ٹھیکے دار بُلائے جا رہے ہیں۔ جنھیں کافی اچھی مزدوری دی جا رہی ہے تو رحیمو نے بھی وہاں کے لیے رختِ سفر باندھ لیا اور تینوں بچوں کو لے کر سونا پور منتقل ہو گیا۔ رحیمو کو اپنے اس فیصلے پر اس وقت اور بھی خوشی ہوئی جب اُسے یہ خبر ملی کہ پچھم ٹولہ میں وہاں کے پرانے رہنے والوں اور دوسرے ٹولے سے آئے ہوئے لوگوں کے درمیان نسلی بنیاد پر جھگڑا کھڑا ہو گیا ہے۔ اگرچہ دونوں گروہ ایک ہی برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن اب ایک دوسرے کے جانی دشمن بن گئے ہیں اور باہری ٹولے کے لوگ اب کسی اور گاؤں کی طرف بھاگ رہے ہیں۔

آج صبح سویرے جب عبداللہ میاں اپنے کھیتوں پر آنکلے تو انھوں نے دیکھا کہ اتر پچھم کی طرف سے کافی تعداد میں لوگ بھاگ بھاگ کر آرہے ہیں اور کھیتوں کو پار کر کے کچھ لوگ پچھم ٹولے، کچھ پورب ٹولے اور کچھ بیچ کے ٹولے میں داخل ہو رہے ہیں۔ اس وقت اُن کی سمجھ میں نہیں آیا کہ معاملہ کیا ہے؟ یہ کون لوگ ہیں؟ اور کیوں بھاگ رہے ہیں۔ اس لیے انھوں نے ایک بھاگنے والے کو پکڑ کر پوچھا کہ " بھائی کیا بات ہے؟ آپ لوگ کہاں سے بھاگ بھاگ کر آرہے ہیں۔ اس نے اپنے بھاگنے کی رفتار کو کم کر کے جلدی جلدی کہا۔ " ہم لوگ سونا پور گاؤں سے جان بچا کر بھاگ رہے ہیں۔ کیوں کہ وہاں سونا پور والوں میں زمین کا جھگڑا ہو جانے کی وجہ سے دودھ پور والوں نے ایک گروہ کی طرف سے خطرناک ہتھیاروں کے ساتھ پورے گاؤں میں ڈیرہ جما لیا ہے۔ دوسرے گاؤں والے جو وہاں مزدوری کرنے گئے تھے بہت خطرے میں پڑ گئے ہیں۔ ان کی مزدوری بند ہو گئی ہے اور وہ بے آسرا ہو گئے ہیں۔ عبداللہ میاں نے بھاگنے والے کے ساتھ کچھ دور بھاگتے بھاگتے پھر پوچھا کہ " میرا بھتیجہ رحیمو کس حال میں ہے؟ " **بھاگنے والا** شاید رحیمو کو جانتا تھا۔ اس لیے وہ ایک بار پھر اپنی رفتار کو کم کرتا ہوا بولا۔ " رحیمو یہاں سے تین میل دور بیچ کے راستے میں اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ رُکا ہوا ہے۔ اس کے بچے بھوکے ہیں اور کھیتوں میں چل نہیں پا رہے ہیں۔

(بقیہ صفحہ ۵۳ پر)

نظمیں

زندگی

ہمیشہ چٹانوں پہ ہی بیٹھ کر

دُور ہی دُور سے میں نے دیکھا ہے لہروں کا کھیل

ہمکتی لپکتی ہوئی موج کی میں نے

آواز بھی دُور ہی سے سُنی ہے،

سمندر کی آغوش میں

میں تو اُترا نہیں ہوں ــــ ابھی تک

نہ میرے بدن کی کثافت دُھلی ہے

نہ باطن کی تشنہ لبی ہی بجھی ہے

سمندر کی روداد

مجھ سے نہ پوچھو

سمندر کی تہہ میں

گہر ہی گہر ہیں ــــ کہ پتھر کے ٹکڑے

مجھے کیا پتا ہے!

شاہد کلیم

دودھ کٹورہ، آرہ ۸۰۲۳۰۱

خوشی

خوشی بادل کا اِک ٹکڑا
نہ جانے
کب کہاں سے آئے
برسے اور نکل جائے
مگر
یہ دھوپ غم کی
جو ہمیشہ ساتھ رہتی ہے
یہی ہمراز بھی ہے ہمسفر بھی
دوست بھی میری
نہ کیوں ہم ان غموں کو
اب خوشی کا نام دے ڈالیں

پیاس

سرابوں میں
چُھپا رکھی ہے ہم نے
تشنگی اپنی
مسلسل درد پی کر بھی نہیں
بجھتی ہے پیاس اپنی
چلو اشکوں کے پنگھٹ پر
بجھائیں
پیاس اپنی بھی
تمھاری بھی

ملکہ نسیم

ای۔ ۷، ایم آئی جی ۲۷۳، اریرا کالونی، بھوپال ۴۶۲۰۱۶

خوشحال زیدی

بچوں کی لائبریری
ضروریات اور مسائل

لائبریری ـــــ خواہ بچوں کے لیے ہو یا بڑوں کے لیے، ایک ایسا ادارہ ہے جہاں علم، کتابوں، مخطوطات، کتبوں اور فلموں کی شکل میں محفوظ ہوتا ہے۔ یہ تمام مواد پڑھنے، مطالعہ کرنے اور غور و خوض کرنے کی غرض سے جمع کیا جاتا ہے۔ لائبریری ذہنی نشو و نما کا بہترین ذریعہ، انسانی تہذیب کی محافظ اور علم کا خزانہ ہے۔

لائبریری جہاں ہماری تہذیب کی محافظ اور ہمارے علم میں اضافے کی ضامن ہے۔ وہیں تھکے ہوئے لمحات کو خوشگوار بنانے کا بھی ایک وسیلہ ہے۔ دلچسپ تفریحی کتابیں بھی لائبریری ہمیں فراہم کرتی ہے۔ ایک اچھی لائبریری بچے کی ذہنی نشو و نما میں بھی نمایاں تبدیلی کا رول ادا کر سکتی ہے۔ اس کی مدد سے بچے میں خود پڑھنے کی عادت پڑتی ہے اور اس میں کتابوں کے انتخاب کا سلیقہ پیدا ہوتا ہے۔ تاریخ، جغرافیہ، ادب، زبان، سائنس، ٹکنالوجی، آرٹ اور جدید ترقیات کی مکمل اور تازہ ترین معلومات تک لائبریری کے ذریعے بچے کی رسائی ہو سکتی ہے۔ لائبریری کی مدد کے بغیر بچے میں مطالعے کی عادت اور ادبی شعور پیدا ہونا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ غلام الثقلین نقوی کہتے ہیں:

"... ذوقِ مطالعہ کے لیے جماعت کا کمرہ نہیں بلکہ لائبریری زیادہ موثر ثابت ہوتی ہے۔ لائبریری کا ماحول اگر زیادہ خوشگوار ہو گا اور یہاں اچھی کتاب پڑھنے کو ملے گی تو بچہ یہاں پہنچ کر جبر سے نہیں بلکہ دلی امنگ کے ساتھ کتاب سے اپنا رشتہ قائم کرے گا۔ لائبریری کی کتاب کا ایک اپنا کردار ہونا چاہیے، منفرد کردار، زندہ اور متحرک کردار۔ جس میں دوستی کرنے اور رفیق بننے کی صلاحیت ہو۔"[1]

بچوں میں کتابیں پڑھنے کا شوق ہوتا ہے اگر ابتدا سے ہی بچوں کی دلچسپی اچھی کتب میں پیدا ہو جائے تو یہ چیز ان کی شخصیت کی تعمیر میں بڑی مددگار ثابت ہوتی ہے۔ شروع سے ہی بچوں، کتابوں اور لائبریری ـــــ تینوں کا آپس میں رابطہ ہونا بہت ضروری ہے۔ لائبریری کی مدد سے بچہ خود تعلیم حاصل کر سکتا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ بچے اور لائبریری کے رشتے کو مضبوط بنائیں اور اسے برقرار رکھیں۔ ابتدا میں ـــــ بچے محض تفریحی کتب پڑھنے کے لیے لائبریری کا رُخ کرتے ہیں اس کے بعد معلوماتی اور پھر درسی کتب پڑھنے میں دلچسپی پیدا ہونے لگتی ہے۔

اچھی لائبریری اچھی کتابوں سے بنتی ہے بچوں کی لائبریری کے لیے کتب و رسائل کے انتخاب میں بچوں کی نفسیات، ان کی دلچسپیوں، ان کے مختلف رجحانات اور عمر کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔ والدین اور اساتذہ کا فرض ہے کہ وہ بچوں کو بتائیں کہ لائبریری سے کیا فائدے ہیں؟ بچوں کو کس قسم کی کتب کا مطالعہ کرنا چاہیے اور لائبریری سے کتابیں کس طرح لی جاتی ہیں۔ مختلف کتب اور رسائل میں بچوں کو اپنے درسی مضامین سے متعلق مواد کس طرح مل سکتا ہے؟ یہ کتب رسائل اور اخبارات، جہاں درسی مضامین سے متعلق معلومات فراہم کرتے ہیں، وہیں زندگی اور زندگی سے متعلق مختلف موضوعات پر سیر حاصل مواد فراہم کرتے ہیں۔

زمانۂ قدیم میں لائبریریاں، بادشاہوں نوابوں، راجاؤں اور رئیسوں کی ذاتی ملکیت ہوتی تھیں۔ ایک عام آدمی اور خصوصاً بچے ان سے فائدہ نہیں اٹھا پاتے تھے ۱۸۸۵ء میں نیشنل ایسوسی ایشن آف ٹیچرز کی ایک میٹنگ میں اس کمی کو محسوس کیا گیا اور مس ایمائلی ہناوے[2] کے توجہ دلانے پر اسکول اور لائبریری کا رشتہ قائم ہوا۔ اس طرح بچوں میں لٹریچر اور جنرل کتب پڑھنے کا رجحان پیدا کیا گیا، حقیقت یہ ہے کہ لائبریری بچوں میں زبردست ذہنی تبدیلی لانے میں اہم رول ادا کرتی ہے۔

بچے کو سب سے پہلے لائبریری کا تصور اسکول سے ملتا ہے۔ اسکول میں تعلیم مختلف مضامین پر مشتمل ہوتے ہوئے بھی محدود ہوتی ہے۔ بچہ درسی کتابوں کے پڑھنے کے ساتھ مزید معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

---

۱ "بچوں میں ذوقِ مطالعہ کیسے پیدا کیا جائے"، ماہنامہ "کتاب" لاہور، جنوری ۱۹۷۹ء ص ۱۸

۲ مس ایمائلی ہناوے بحوالہ بال شری ریڈی "بال پستکالیہ اور اس کا مہتو" مقالہ بموقعہ سیمینار ۱۶ تا ۱۸ نومبر ۱۹۷۹ء "بچوں کی کتابوں کا عالمی میلہ" انڈیا گیٹ لان، نئی دہلی۔

۸۰، غفار منزل ایکسٹینشن، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

کلاس روم میں استاد بچوں کو کسی پری، شہزادے یا کل کے گھوڑے کی مختصر مگر دلچسپ کہانی سناتا ہے ــــــ بچے اس کی تفصیل جاننے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے لیے انھیں لائبریری کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اسکول لائبریری میں زیادہ تر ایسی کتابیں ہوتی ہیں جن کا تعلق محض درسیات سے ہوتا ہے۔ مجبوراً بچہ عام لائبریریوں کی طرف رُخ کرتا ہے اور اسے جو بھی کتاب ملتی ہے اسے پڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔

ہمارے اسکولوں کی لائبریریوں میں کتابوں کی خریداری کا انتظام ٹھیک نہیں ہے۔ سڑک اور گلی کوچوں میں تاجرانہ ذہنیت رکھنے والوں نے لائبریریاں کھول رکھی ہیں جہاں بچوں سے معاوضہ لے کر غیر مفید، غیر معیاری کتابیں مہیا کی جاتی ہیں۔ اس قسم کی محلّہ لائبریریاں حشرات الارض کی طرح پھیلی ہوئی ہیں۔ ان لائبریریوں کی زیادہ تر کتابیں بچوں کے ذہنوں کو پراگندہ کرتی ہیں۔ اور ان کے کرداروں پر منفی اثر ڈالتی ہیں۔ اسکولوں میں دارالمطالعہ اور لائبریری کا مناسب انتظام نہ ہونے کے سبب، اس قسم کی دکان نما لائبریریاں بڑھتی جا رہی ہیں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کتابوں کی قیمتیں اس قدر بڑھ گئی ہیں کہ عام والدین خرید نہیں پاتے اور اسکولوں میں لائبریریوں کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے۔ اگر کسی اچھے اسکول میں لائبریری ہے بھی تو اس کا ماحول ٹھیک نہیں در و دیوار ہی نہیں کتابوں پر بھی گرد جمی ہے۔ اس ماحول کی کتاب بھی بہت سرد مہر ہوتی ہے وہ اپنی طرف کھینچتی نہیں بلکہ پیچھے دھکیلتی ہے لائبریری سے مراد، لائبریری کا کمرہ، کتابوں کے لیے الماریاں، مطالعے کے لیے میز اور خوش اخلاق لائبریرین سے ہے۔ کتابوں کے انتخاب میں پرنسپل یا اساتذہ کی پسند و ناپسند سے زیادہ بچوں کے خیالات، ضروریات اور دلچسپیوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ بچے کا دل بہت ملائم اور نازک ہوتا ہے۔ بچوں کی دلچسپیاں اور رجحانات الگ الگ ہوتے ہیں کچھ بچے ادب میں دلچسپی لیتے ہیں۔ کچھ بچے بہادروں کی کہانیاں پڑھنا پسند کرتے ہیں۔ کچھ جن، پری، جادوئی کہانیوں اور سائنس فکشن میں دل چسپی لیتے ہیں کسی کو سیر و سیاحت، جنگلات جانور، سمندر، پہاڑ اور وہاں کی زندگی میں دلچسپی ہے۔ کچھ بچے اخلاقی اور مذہبی موضوعات پر کہانیاں پسند کرتے ہیں۔ کوشش یہ ہونا چاہیے کہ بچوں کے لیے زیادہ سے زیادہ دلچسپ موضوعات پر کتابیں لائبریری میں ہوں۔ جن کتابوں کا انتخاب بچوں کی لائبریری کے لیے کیا جائے ان کی زبان بہت آسان اور عام فہم ہو، بچے کی نفسیات اور عمر کے مختلف مدارج کا خیال رکھا گیا ہو، اسلوب دلچسپ اور پُرکشش ہو۔ طباعت کاغذ اور ٹائٹل دیدہ زیب ہو، کتابیں بچوں کی دلچسپی اور رجحانات کے مطابق ہوں۔ کُتب کے انتخاب میں یہ بات بھی ملحوظ رکھی جائے کہ کتابیں بچوں کی شخصیت اور ان کے کردار کی تعمیر میں معاون ثابت ہوں۔

کتابوں کا انتخاب، بچوں کی عمر کے مختلف مدارج کے اعتبار سے ہونا از بس ضروری ہے۔ مثلاً ۵ سے ۸ برس تک کے بچے زیادہ تر باتصویر رنگین کتابیں پسند کرتے ہیں۔ ان کے لیے الفاظ کم سے کم اور لکھائی موٹی ہونی چاہیے۔ اس عمر کے بچے الفاظ سے کم اور تصاویر سے زیادہ سمجھ سکتے ہیں۔ کتابیں خریدتے وقت درج ذیل باتوں کو بھی مدِنظر رکھنا چاہیے۔

۱۔ کتابیں ایسی ہوں جو بچوں میں پڑھنے کے شوق کو فروغ دیں۔

۲۔ کتابیں بچوں کی ذہنی اور جسمانی دونوں قسم کی نشوونما میں مددگار ثابت ہوں۔

۳۔ کتابیں متنوع موضوعات اور متنوع اصناف میں ہوں۔ مثلاً کہانی، گیت، ناول ڈرامے، رنگین تصاویر، پہیلیاں، لطائف۔ موضوعات میں سائنس، تاریخ، سوانح عمریاں سیر و سیاحت، اخلاقیات، مذہب، قومی یکجہتی بھائی چارہ، انسان دوستی، حب الوطنی وغیرہ وغیرہ۔

اسکول سے باہر کی بھی ہر لائبریری میں بچوں کی کتابوں کا الگ شعبہ ہونا چاہیے زیادہ تر لائبریریوں میں بچوں کی کتابوں کے لیے الگ شعبے نہیں ہیں جن لائبریریوں میں بچوں کے ادب کے نام پر کچھ کتابیں موجود بھی ہیں وہ بچوں کی تمام ضروریات کو پورا نہیں کرتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بچوں کے لیے ہر شہر اور قصبے میں الگ لائبریریاں ضروری ہیں۔ عام لوگوں کا خیال ہے کہ بچوں کے لیے لائبریری قائم کرنے سے بچے درسی کتب میں دلچسپی کم لیتے ہیں اور بچوں کے تعلیمی انہماک میں خلل پڑتا ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ بعض والدین بچوں کو غیر درسی کتابیں پڑھنے سے روکتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچے گھر پر وقت گزاری کے لیے ٹیلی ویژن یا وی۔ سی۔ آر کا سہارا لیتے ہیں اور آہستہ آہستہ پڑھنے میں ان کی دلچسپی کم ہو جاتی ہے۔

۱۹۷۹ء میں بچوں کے عالمی سال کے موقعے پر بچوں کے لیے عالمی پیمانے پر لائبریریاں قائم کی گئیں۔ لیکن اس سلسلے میں ہمارے ملک میں سب سے پہلے جواہر لال نہرو نے بچوں کی بھرپور نشوونما کے لیے بچوں کے تخلیقی ادب پر خصوصی توجہ دی تھی۔ جس کے نتیجے میں بال بھون بنے۔ سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں بچوں کے لیے کتابوں کی خریداری شروع ہوئی۔ . . . چلڈرن بک ٹرسٹ اور نہرو بال پستکالیہ کا قیام عمل میں آیا۔ اِن اداروں نے بچوں کے لیے اچھی کتب شائع کرنے کے ساتھ، بچوں کے لیے دنیا بھر سے دلچسپ کتابیں لائبریریوں کے لیے فراہم کیں۔ (لیکن افسوس! ان لائبریریوں میں اُردو کی کتب ماسوا چند ترجموں کے نہیں کے برابر ہیں) ملک کے بڑے بڑے شہروں میں بچوں کی لائبریریاں قائم کی گئیں۔ اضلاع کی مرکزی لائبریریوں میں بچوں کے ادب کے لیے الگ شعبے قائم کیے گئے۔ یونیسکو (UNESCO) نے کئی اچھے منصوبے شروع کیے ہیں۔ لیکن اِن سب باتوں کے باوجود ہمارے ملک میں اردو ادب اطفال ایک ہی نقطے پر اٹکا ہوا ہے۔

اس سلسلے میں آندھرا پردیش نے خاطر خواہ پیش رفت کی ہے۔ حیدرآباد اور دیگر مشہور شہروں کی مرکزی لائبریریوں میں بچوں کی لائبریریاں قائم کی گئیں۔ چھ سو سے زائد پبلک لائبریریوں میں بچوں کے ادب کے شعبے قائم ہوئے ہیں اور چلڈرن اکادمی قائم کی گئی۔ سرکار کی طرف سے بچوں کے لیے فلم، ڈراما اور کلچرل پروگرام مختلف شہروں میں پیش کیے گئے۔

یورپ اور سوویت روس میں بچوں کے لیے لائبریری کی اہمیت کو بہت پہلے سمجھ لیا گیا تھا۔ وہاں صرف اسکولوں میں ہی نہیں شہروں، قصبوں، دیہاتوں، کارخانوں اور زراعتی فارموں میں قائم لائبریریوں میں بچوں کی کتابوں کے الگ شعبے موجود ہیں۔ وہاں بچوں کو اپنی پسند کی کتابیں بآسانی مل جاتی ہیں۔

بچوں کی لائبریری اور اس کی ترقی کے لیے اجمالاً درج ذیل اصولوں کو ملحوظ خاطر رکھا جائے تو مناسب ہوگا۔

۱۔ ہندوستان کی سبھی زبانوں میں ملنے والی بچوں کی کتب کی ایک فہرست تیار کی جائے اور وہ فہرست سبھی اسکولوں کی لائبریریوں اکادمیوں اور ناشرانِ کتب کو بھیجی جائے۔

۲۔ تمام اسکول لائبریریوں میں بچوں کی کتابوں کو اہمیت اور اولیت دی جائے۔ بچوں کی کتابوں کا الگ شعبہ ہونا چاہیے۔ یہ بات تمام سرکاری اور نیم سرکاری لائبریریوں کے لیے بھی ضروری سمجھی جائے۔

۳۔ خریداری کتب کے سالانہ بجٹ میں بچوں کی کتابیں خریدنے کے لیے ایک رقم لازماً مقرر ہونا چاہیے۔

۴۔ بچوں کی دلچسپی لائبریری میں پیدا کرنے کے لیے وہاں کلچرل پروگرام، ٹیلی ویژن، فلم اور دیگر تفریحی پروگراموں کا بھی انتظام ہونا چاہیے جو صرف بچوں کے لیے ہوں۔

۵۔ سرکاری اور نیم سرکاری ہر لائبریری میں بچوں کی کتابوں کے لیے توسیعی مراکز (EXTENTION COUNTER) اور چلتی پھرتی لائبریریاں ہونی چاہئیں۔ یہ سہولت چھوٹے چھوٹے قصبات اور دیہاتوں کے لیے بہت مفید ثابت ہوگی۔

۶۔ دیہاتی اور قصبوں کے بچوں کے لیے ان کے موضوعات پر کتابیں نہیں ملتیں۔ اس لیے دیہاتی زندگی اور ماحول سے متعلق کتابیں تیار کرائی جانی چاہئیں۔

۷۔ بچوں کی لائبریریوں کو ان کی بہتر کارکردگی پر قومی سطح پر انعامات دے کر ان کی ہمت افزائی کرنا چاہیے۔

۸۔ بچوں کے لیے اچھی معیاری کتابیں، چھاپنے والے اور بچوں تک ان کتابوں کو پہنچانے والے اداروں کی مالی معاونت کرنا سرکار کا فرض ہونا چاہیے تاکہ بچوں کو صحت مند تخلیقی ادب بآسانی پڑھنے کو مل سکے۔

۹۔ بچوں کے سالانہ اجلاس اور تعلیمی تقریبوں میں بچوں کے لیے اچھی اچھی کتابوں کی نمائش بہت مفید ہوگی۔

۱۰۔ ہر سال سرکار کی طرف سے بچوں کے ادب پر سیمینار اور ادب اطفال کی نمائش ہونا چاہیے۔ ساتھ ہی اکادمیوں کی طرف سے اچھی کتب متنوع موضوعات پر شائع ہونی چاہئیں۔

۱۱۔ بچوں کی دلچسپی کے موضوعات پر مناظمے اور ادبی مقابلے ہونا چاہئیں۔

۱۲۔ یونیورسٹی اور محکمہ تعلیم کے مختلف شعبوں میں بچوں کے ادب پر کتابیں ضروری ہیں۔

۱۳۔ بچوں کے لیے اخلاقی تعلیم، سائنسی اور عام معلومات کی حامل دلچسپ فلمیں ہر لائبریری میں ہونا چاہئیں۔ ساتھ ہی پروجیکٹر اور دیگر سامان بھی ہونا چاہیے تاکہ بچے وہاں بیٹھ کر فلمیں دیکھ سکیں۔ ساتھ ہی اسکول اور سرکاری سطح پر ہونے والے تفریحی قومی پروگراموں

کی علمی لائبریری میں ہونا چاہئیں جو بچوں کے تعمیری اور تخلیقی ذہن کی نشوونما میں معاون ثابت ہوں۔

۱۴۔ اردو اکادمیوں کو چاہیے کہ وہ تعلیمی اداروں اور ادبی انجمنوں کو بچوں کی دلچسپی اور ذہنی رجحانات کو سامنے رکھتے ہوئے اچھی معیاری اور دیدہ زیب کتابیں فراہم کریں۔ بچوں کی کتابیں خود بھی شائع کریں اور دوسرے اداروں سے خرید کر لائبریریوں کو دیں۔ اس ضمن میں اردو اکادمی دہلی نے سب سے پہلے قدم اٹھایا اور تقریباً ڈھائی سو اسکولوں اور دیگر لائبریریوں کو بچوں کے لیے اچھی خوبصورت اور دیدہ زیب کتابیں خرید کر تحفتاً پیش کیں۔

۱۵۔ ہر گھر میں ایک چھوٹی لائبریری ہونا چاہیے۔ والدین جس طرح اپنے بچوں کے لیے تحفے تحائف اور دوسری چیزیں خرید کر لاتے ہیں اسی طرح اچھی معیاری اور تفریحی کتب بچوں کو لا کر دیں۔ نیز جس طرح اسکول کی کتابوں کے لیے بیگ، الماری، شیلف وغیرہ کا انتظام کرتے ہیں اسی طرح بچوں کے لیے ایسی کتابیں رکھنے کا بھی انتظام ہونا چاہیے۔ یہ کچھ ایسا گراں سودا نہیں ہے۔

غزلیں

ادریس ضیا

یہ احتیاط برتنا بڑا ضروری ہے
تعلقات میں کچھ فاصلا ضروری ہے

ہے ناگزیر تری یاد واسطے دل کے
اندھیرے گھر کے لیے اِک دِیا ضروری ہے

وہ زندگی کا سفر ہو کہ جنگ کا میدان
محاذ کوئی بھی ہو حوصلا ضروری ہے

چراغ جلنا ضروری ہے شام ہوتے ہی
چلے ہوا بھی موافق یہ کیا ضروری ہے

ابھی یہ بات کہاں سوچ پائی ہے دُنیا
فضول کیا ہے ضیاؔ اور کیا ضروری ہے

کلاتھ مارکیٹ، اعلیٰ پور، بدایوں ۲۴۳۶۳۱ (یو۔پی)

ان پہاڑوں سے پرے گاؤں پہ بادل پھیلا
ایک برہن کی دُکھی آنکھوں میں کاجل پھیلا

جھاڑیاں مکرِ سیاست کی اُگیں بستی میں
رت جو بدلی تو وہاں خوف کا جنگل پھیلا

ناز برداری کی وہ رسم کہاں باقی ہے
پاؤں اتنے بھی نہ تو اب ارے پاگل پھیلا

ہم تو پہلے ہی سے نفرت کے بھنور میں ہیں گھرے
مل کے رہنے دے عداوت کی نہ دلدل پھیلا

شام کے در پہ مجھے چھوڑ کے سورج بچھڑا
اور کابوسِ ستم رات کو پل پل پھیلا

کربلا بن گئی یہ اپنی زمیں آج ریاضؔ
دیکھ تا حدِ نظر کیسا ہے مقتل پھیلا

بہار الدین ریاضؔ

مقام سوٹاہٹ، ڈاکخانہ، کٹک ــــ ۷۵۳۰۰۱

نثار نیپالی

میں نے جو خط تجھے اِک پیار بھرا لکھا تھا
نام تیرا تھا مگر اُس پہ پتا میرا تھا

دل میں اُبھرے تھے وفاؤں کے حسیں تاج محل
چاندنی رات میں جب میں نے تجھے دیکھا تھا

تیرے آنچل پہ سجا دوں گا میں شب کے موتی
اپنی تنہائی کے عالم میں کبھی سوچا تھا

ایک اِک کرکے 'اجنتا' کے عمل یاد آتے
لیلیٰ و ہیر کے پیکر میں تجھے ڈھالا تھا

کتنے پُر کیف محبت کے وہ لمحے تھے نثارؔ
کبھی ہنسنا تھا میسّر تو کبھی رونا تھا

رٹل اینگلس ہوم، ریلوے اسٹیشن روڈ، بنارتھ ۲۰۲، ۳۵، جلپائیگوڑی

قمر جہاں

کٹی ہوئی شاخ

کتنے سال بعد وہ اپنے وطن واپس آیا تھا۔ ہر چیز نئی نئی اور قدرے اچھوتی اچھوتی سی معلوم ہو رہی تھی اُسے... ایک مدت تک باہر رہ جانے کے باعث اب وہ خود اپنے وطن کے لیے اجنبی سا ہو گیا تھا مگر اس اجنبی پن میں بھی اپنے پن کا احساس پنہاں تھا۔ وہ دیر سے خود اپنے آپ سے سوال کر رہا ہے۔

"کیا وہ سچ میں اجنبی ہو گیا ہے؟ شکل و شباہت، لباس اور کچھ حد تک گفتگو میں، وہ بدل گیا ہے لیکن اس کا باطن...؟ اندرون میں ایک عجب توڑ پھوڑ مچی ہوئی ہے، آخر وہ اپنے آپ کو اتنا بے بس کیوں محسوس کر رہا ہے؟"

بار بار اُس کا ذہن کسی ایک سوال کے گرد مکڑی کے جالے کی طرح گھوم رہا ہے۔

"آخر وہ اتنی اچھی سرزمین اور ایسے دلدار لوگوں کو چھوڑ کر کیوں اتنے لمبے عرصے تک...؟ کیا اب سچ میں اس کی حیثیت یہاں اُس ٹوٹی ہوئی شاخ کی سی ہے جو درخت سے علیحدہ ہو چکی ہے؟"

"نہیں... نہیں، ہرگز نہیں..." بڑی بیچارگی سے اس نے اپنے سر کو جھٹکا دیا ــــ بڑے سے آنگن میں آم اور شریفے کے پیڑ اُسی طرح جھوم رہے ہیں، اس کی بوڑھی نحیف جاں بہ لب ماں سامنے کے پلنگ پر پڑی کھانس رہی ہے اور بڑی حسرت بھری نگاہوں سے اپنے اجنبی ہوتے ہوئے لختِ جگر کے ملول چہرے پر کچھ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اُس کے دیگر عزیز و اقارب بھی موجود ہیں... سب کچھ تو ہے یہاں اس کا، اس کا منہدم ہوتا ہوا گھر، اس کی ماں... اُس کے عزیز و اقارب.. مگر... مگر وہ خود یہاں کا نہیں رہا... وقت کے ایک لمبے سفر نے اُسے خود اس کے گھر میں ہی بیگانہ بنا دیا ہے۔ اس پر غیریت کی مہر اس طرح ثبت ہو چکی ہے کہ اُسے اپنوں کے برتاؤ میں بھی تصنع کی جھلک نظر آ رہی ہے۔ وہ اُس مصنوعی زندگی سے اکتا رہا ہے۔ اُسے تلاش ہے اپنے پن کی... اس اپنے پن کی جسے برسوں پہلے وہ خود اسی دہلیز پر چھوڑ گیا تھا۔

اپنا پن زندگی کو خوشگوار بنانے کے لیے کس قدر ضروری ہے، اس بات کو اس نے پہلے تو کبھی محسوس نہیں کیا تھا لیکن ایک لمبے عرصے تک مشینی زندگی گزارنے کے بعد کسی چیز کی کمی کا احساس اس طرح سوہانِ روح بنا کہ وہ ہر آسائش کو لمحوں میں بھول گیا۔

اُسے وہ دن بھی یاد تھا جب وہ اپنی جانی پہچانی دنیا کو خیرباد کہہ کر ایک اَن دیکھی دُنیا کی طرف پرواز کر رہا تھا۔ اس وقت اُس کے کانوں میں صرف ایک ہی آواز گونج رہی تھی۔

"یار اب تک تم تالاب کے مینڈک بنے رہے، باہر نکل کر دیکھو، دنیا کتنی حسین ہے۔ کیا تم نے اعلیٰ تعلیم اور اونچی ڈگریاں اسی لیے حاصل کی ہیں کہ صبح سے شام تک چپل توڑتے رہو...؟"

اُس نے بدیسی دوست کے اس مشورے کا پُرجوش استقبال کیا اور اس دن وہ بے حد خوش تھا جب اس کا ویزا باہر جانے کے لیے آگیا تھا۔

وہ اس منظر کو بھی نہیں بھولا ہے جب وہ ایئرپورٹ پر اپنے جہاز کا انتظار کر رہا تھا... اُس وقت اس کے سامنے ایک حسین دنیا آباد تھی اور وہ نرم ہواؤں کے دوش پر جھولا جھول رہا تھا۔ اچانک زندگی کتنی سُبک رفتار، کومل اور پُرکشش بن گئی تھی، زندگی کا سارا بوجھل پن نہ جانے کہاں کھو گیا تھا ــــ جہاز کے اڑان بھرتے ہی وہ ساتوں آسمانوں کی سیر کرنے لگا تھا۔ کیسے کیسے رنگین خیالات اس کے ذہن میں فلم اسکرین کی طرح منٹوں میں سین بدل رہے تھے ــــ اپنی نحیف و ناتواں ماں، بیمار والد کو بھی چھوڑنے کا اُسے ذرا غم نہیں تھا۔ بچپن کے دوست، سب شناسا چہرے اچانک اجنبی بن گئے۔ اُسے محسوس ہوا جیسے وہ قید خانے سے نکل کر کھلی فضائیں کلیلیں بھرنے لگا ہے۔

خوبصورت اور اسمارٹ ایئر ہوسٹس جب اُس کے سامنے کھانے کی پلیٹ سجائے آئیں تو اسے لگا جیسے وہ جنّت کی حوریں ہیں جو من و سلویٰ کے ساتھ اس کی میزبانی کر رہی ہیں، اُس نے ان کے دستِ نازنین سے پلیٹ لیتے ہوئے کنکھیوں سے انھیں دیکھا۔ ایئر ہوسٹس نے دلنواز مسکراہٹ کے ساتھ دریافت کیا۔

"کیا اور بھی چاہیے کچھ آپ کو...؟" اس نے جلدی سے ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔

"نہیں... ہاں..." اور پھر خود ہی

ریڈر شعبۂ اردو، سندروتی مہیلا کالج، بھاگلپور (بہار)

اپنی اس بوکھلاہٹ پر بُری طرح جھینپ گیا۔ اُس کے دل میں لمحہ بھر اس دلنواز مسکراہٹ پر گدگدی ہوتی رہی۔ لیکن پھر اس مسکراہٹ کی اصلیت اُس پر واضح ہوگئی تھی۔ جب وہی ایئر ہوسٹس اُس کے پہلو میں بیٹھے بوڑھے پسنجر سے بھی اسی دلنواز مسکراہٹ کے ساتھ مخاطب تھی۔ . .

"اوہ! تو یہ ادائیں جلوۂ عام ہیں۔ جن کو میں نے اپنے لیے مخصوص سمجھ لیا تھا۔" اپنی شخصیت کا سحر اُسے ٹوٹتا محسوس ہوا۔ عمر کا یہ حصہ بھی کیسا پُر فریب ہوتا ہے۔ منٹوں میں آسمان پر اور منٹوں میں زمین پر۔ . . جھوٹ کیا ہے اور سچ کیا' اس بات کی تمیز اس عمر میں ذرا مشکل سے ہوتی ہے۔ اُس کی آنکھوں پر بھی ایک رنگین عینک چڑھی ہوئی تھی اور وہ ہر شے کو بس اسی عینک سے دیکھ رہا تھا۔

بدیس پہنچ کر کچھ دنوں تک وہ ایک جادوئی دُنیا میں کھویا رہا ـــــ گرد و پیش کو رنگین عینک سے دیکھنے کی تقریباً اُسے عادت سی ہوگئی تھی لیکن کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد اُس کی عینک کا شیشہ میلا ہونے لگا ـــــ اُس کا معمول بن گیا تھا کہ گھر سے باہر قدم نکالتے وقت پہلے وہ اپنی عینک کے شیشے کو خوب صاف کرتا تاکہ وہ پہلی سی چمک واپس آجائے، مگر یہ دیکھ کر اُسے بڑا دکھ ہوتا کہ شیشہ صاف ہونے کی بجائے میلا ہی ہوتا جا رہا تھا۔ انہی لمحوں میں اُسے ایسا لگتا جیسے کوئی چیز چھناکے کے ساتھ اُس کے اندر ٹوٹ گئی ہو اور اس کی ساری کرچیاں اندر ہی اندر چبھتی چلی جا رہی ہیں۔ ایک عجیب سی بے چینی کا مسکن بن گیا تھا اس کا دل و دماغ. . . کبھی کبھی وہ اپنے وجود کو پنڈولم کی طرح جھولتا محسوس کرتا' لامحدود فضاؤں میں معلق زمین سے منقطع اور آسمان سے دور. . .

"یا الٰہی یہ کیسا جہاں ہے؟ باہر کی دنیا کیسی خوبصورت ہے لیکن اندر کی آتما کو چین نہیں ـــــ یہاں تو ہر شخص بس اپنے "آج" میں جی رہا ہے ـــــ" وہ اکثر غور و فکر میں ڈوبا رہتا ـــــ "کیا کل کے اعتبار کے بغیر آج کا حُسن برقرار رکھا جا سکتا ہے ـــــ؟"

"نہیں، ہرگز نہیں۔" اُس کے اندر سے کوئی چیخ اُبھرتی. . .

"وقت، ماضی، حال اور مستقبل سے عبارت ہے۔ تم اسے صرف حال سے تعبیر نہیں کر سکتے ـــــ"

اُسے حیرت ہوتی ان ہم وطنوں پر جو صرف حال کے سہارے زندہ تھے ـــــ وہ اکثر ان کے چہروں کو پڑھنے کی کوشش کرتا۔

ایک دن اُس نے اپنے قریبی دوست اسد سے دریافت کیا جو خود اس کی کمپنی میں ملازم تھا۔

"یار اسد! یہاں کے لوگ کیا اپنی زندگی سے مطمئن ہیں. . . ؟ ان کا حال تو یقیناً خوبصورت ہے مگر مستقبل کا کوئی بھروسہ نہیں ـــــ کیا اس بے اعتباری کے ساتھ کوئی حساس شخص خوش رہ سکتا ہے؟" اسد نے غور کرتے ہوئے کہا۔

"یار! تم ضرورت سے زیادہ حساس ہو، یہاں کے لوگ شاید اتنے حساس نہیں ہوتے۔"

"کیا مشینی عہد میں رہتے رہتے یہ بھی روبوٹ (ROBOT) ہوگئے ہیں. . . ؟" اُس نے مسکراتے ہوئے طنز کیا۔

"ممکن ہے۔" اسد نے مختصر سا جواب دیا۔

"نہیں یار اسد! مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے آج کے عہد کا انسان کچھ زیادہ ہی حساس ہوگیا ہے۔ ماحول کی سرد مہری نے اُس کے اندر کی آگ کو کچھ زیادہ ہی بھڑکا دیا ہے۔"

"یہ سب تمہارا واہمہ ہے۔ اپنا مسئلہ تو صرف پیٹ کی آگ ہے ـــــ" اسد کی مسکراہٹ میں درد بھی تھا اور طنز بھی، جسے بڑے سلیقے سے وہ چھپا رہا تھا۔

اُسے اکثر اپنے جیسے دوسرے ساتھیوں کی زندگی پر ملال ہوتا' وہ جو سارا سارا دن کڑی محنت کرتے اور جب گئی رات بستر پر لوٹتے تو بیوی بچے سب کو سویا ہوا پاتے. . . پھر علی الصباح ساری کائنات کو سویا ہوا ہی چھوڑ کر اپنے اپنے کاموں پر چلے جاتے. . . ان میں اکثر تو ہفتوں اپنے بچوں سے جی بھر بات بھی نہ کر پاتے. . . بیوی کی مسکان کیا معنویت رکھتی ہے ـــــ؟ اس بات کا احساس بھی کھوتے جا رہے تھے۔ گویا ان کی زندگی کوئی سیال مادہ ہو جو مشین میں ڈھل گئی ہو اور تیز چلتی ہوئی مشین کی گھر گھر کے ساتھ ان کے اندر کا ہر لطیف احساس بھی زائل ہو چکا ہو ـــــ وہ زیر لب کراہتا۔

"کیا زندگی صرف پیسے سے مطمئن ہو جاتی ہے ـــــ؟" باہر آکر وہ بھی یقیناً اچھی غذا کھا رہا تھا، اچھی خاصی رقم جمع کر رہا تھا۔ فریج، ٹی وی، اے سی، بہترین ایئر کنڈیشن کار، ویل فرنیشڈ مکان، سب کچھ کم ہی مدت میں اُس نے حاصل کر لیا تھا۔ لیکن اکثر راتیں اُس کی فوم کی آرام دہ مسہری پر کروٹیں بدلتے ہی گزر جاتیں ـــــ جب بھی کبھی گھر سے اُس کی ماں یا کسی اپنے پرائے کا خط آتا تو وہ ہفتوں تک

مضمحل مضمحل سا رہتا ــــــ بوڑھے باپ کے انتقال کی خبر ملی تو وہ جی بھر کر رو بھی نہ سکا۔ ماں کی علالت کی اطلاع ملی مگر وہ صرف تڑپ کر رہ گیا تھا۔

لیکن یہ کیسا وقت آگیا ہے کہ ایک طویل عرصہ گزار چکنے کے بعد اچانک وہاں کی سنہری سرزمین پر بھی وحشت کے بادل منڈلانے لگے ہیں ــــــ ہر شخص اپنی اپنی جگہ سہم رہا ہے۔ ان میں سے بیشتر بغیر کچھ سوچے سمجھے بنا زادِ راہ کے ہی رخت سفر باندھنے پر مجبور ہو گئے ہیں ــــــ

وہ بھی اپنی چھوٹی سی فیملی کے ساتھ واپس آچکا ہے اور اپنے گھر کی دہلیز پر دیر سے کھڑا بیتے لمحوں کو واپس بلانے کی کوشش کر رہا ہے مگر اُسے ایسا لگ رہا ہے جیسے یہ گھر اب اُس کا اپنا گھر نہیں رہا، در و دیوار کی ساخت تو وہی ہے، آم کے پیڑ اور شریفے کے پیڑ بھی وہی ہیں مگر اُس کے قدموں کے نیچے کی زمین بہتا پانی بن گئی ہے۔ سخت دھوپ سے گھبرا کر اُس نے نگاہیں اوپر کیں تو چھت کا سایہ بھی سر سے غائب تھا۔

…د عبدالحلیم

ناطق گلاوٹھوی

احوال، افکار اور کلام

"ایوانِ اردو" کے نومبر ۸۹ کے شمارے میں جناب صہبا وحید کا مراسلہ نظر سے گزرا تھا۔ انھوں نے خواہش ظاہر کی ہے کہ کوئی صاحب مولانا ناطق گلاوٹھوی کی زندگی اور کلام کے بارے میں مضمون تحریر فرمائیں۔ میں نے مولانا کے حالات اور ادبی و شعری نظریات کے متعلق ایک مضمون ترتیب دیا ہے، جو ارسالِ خدمت ہے۔ مضمون خود مولانا کی نگارشات کے اقتباسات پر، جو مختلف کتابوں اور جرائد میں شائع ہوئی ہیں اور کچھ ان کے غیر مطبوعہ مضامین کے اقتباسات پر مشتمل ہے، اس لیے زیادہ مستند بھی ہے اور اہمیت کا حامل بھی۔

—— محمد عبدالحلیم

…ختصر سوانح حیات:

میرا نام ابوالحسن ہے۔ والد صاحب رح
…م گرامی ظہور الدین حسن تھا۔ وطن مالوف
…بہ گلاوٹھی، ضلع میرٹھ۔ . . غالباً ۱۱ر نومبر ۱۸۸۶ء
…ہر کامٹی میں جو ناگپور سے ۹ میل ہے، پیدا ہوا
…لۂ نسب ساداتِ گیلان سے ملتا ہے۔ . .
…دوستان میں مولانا سید منہاج الدین صاحب،
…رثِ اعلیٰ، احمد شاہ ابدالی کے ساتھ تشریف
…ئے، جن کا میں ساتواں پوتا ہوں۔ جدی جائداد
…ندر ۱۸۵۷ء میں خاتمہ ہو گیا، جبکہ میرے
… تایا صاحب (سید عنایت اللہ) کو پھانسی
…دی گئی۔ والد صاحب نے جو کچھ پیدا کیا
…، اُسے میرے چھوٹے بھائی نے میری عدم موجودگی
…تم کیا اور مر بھی گیا۔ خدا اس کی مغفرت کرے۔
…د صاحب کو بھی ذوقِ سخن تھا، مگر وہ لکھ کر
…ع کرنے کے عادی نہ تھے۔ میرے ایک تایا سید
…ن الحسن صاحب جو بہاولپور کے وزیر اعظم
…کروہیں سو رہے ہیں، ایک زبردست عالم،
ادیب اور شاعر تھے، مگر ان کے صاحبزادے نے اُن کا سب کچھ برباد کر دیا۔ زمانۂ تعلیم وطنِ مالوف میں گزرا اور دارالعلوم، دیوبند سے علوم عربیہ کی سند حاصل کی۔ میرے زمانے کے اساتذہ مولانا شیخ الہند محمود الحسن، مولانا خلیل احمد سہارنپوری، مولانا محمد حسن خاں مراد آبادی اور مولانا ماجد علی صاحب جونپوری تھے۔ اس وقت کے طلبہ میں مولانا انور شاہ اور مولانا حسین احمد مدنی تھے۔ خود میں کیا تھا، یہ معلوم نہیں۔ انگریزی کہیں پڑھی نہیں، مگر ضرورتِ زمانہ نے یہ زبان بھی سکھائی اور اس میں بھی تحریر و تقریر کی ضرورتوں کو پورا کر لیتا ہوں۔ شاعری ۱۹۰۰ء میں شروع کی۔ ۱۹۰۴ء میں حضرت داغ سے تلمذ حاصل کیا اور ہنوز چند غزلوں پر اصلاح لینے پایا تھا کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ پھر کسی کو کلام دکھانے کا خیال نہیں کیا۔ ہمیشہ اپنے لکھے پر خود اصلاح کی۔ عرصۂ دراز سے بہ سلسلۂ تجارت خاص شہر ناگپور میں مقیم ہوں۔

تخلص اور اُس کے اثرات:

جب میں نے شاعری کو، شاعری کی طرح شروع کیا، اس وقت دارالعلوم دیوبند کا طالب علم تھا، جہاں انسان کے لیے بسلسلۂ معقول "حیوانِ ناطق" کی اصطلاح عام ہے۔ ناطق مکرانی وغیرہ کے نام سے واقف نہ تھا۔ نئے تخلص کی فکر میں "ناطق" مناسب معلوم ہوا، اختیار کر لیا۔

تخلص تو نہیں، نام کے متعلق بزرگوں سے سُنا ہے کہ انسان کے کردار میں مؤثر ہوتا ہے، مگر میں اس کا کچھ قائل سا نہیں۔ میرے تخلص کے اثرات یہی ہو سکتے ہیں کہ مستقیم القامت، بادی البشرہ، ضاحک بالطبع، تو یہ مجھ میں بھی موجود ہیں اور آپ میں بھی۔ رہا مُدرک الکلیات الجزئیات ہونا، تو معلوم نہیں یہ بات مجھ میں ہے یا نہیں۔

ابتدائے شاعری اور تلمذ:

میں نے بہت ہی کم عمر میں حضرت اطہر ہاپوڑی کی تحریک پر، جو اب میری بیوی کے خالہ زاد بھائی ہیں، شاعری کی ابتدا کی۔ گو میں اس وقت کم عمر تھا لیکن عربی نصاب دارالعلوم دیوبند کو تقریباً ختم کر چکا تھا۔ یہ میرے اساتذۂ کرام کا کرم تھا کہ وہ مجھے ذہین اور ہونہار سمجھتے تھے، مگر جہاں میرے دیگر ہم جماعت احباب اپنا سب وقت تعلیم میں ہی صرف کرتے تھے، وہاں

"الرحمٰن" [illegible] ۴۴۰۰۱۸

میں زیادہ وقت کھیل میں گزارتا تھا، مگر امتحان کے نتائج میں سب سے اچھا رہتا۔ اس لیے جہاں اساتذہ مجھ سے محبت کرتے تھے، وہاں انھیں میری کم توجہی پر افسوس بھی ہمیشہ رہا۔ جب میں نے شاعری شروع کی تو میرے احباب علم نے مجھے بہت روکا اور اساتذہ نے اس پر افسوس کیا۔ چنانچہ مولانا محمد حسن مراد آبادی نے یہ فرمایا کہ نکما تو تھا ہی، اب دونوں جہاں سے جاتا رہے گا۔ غرض یہ کہ ابتدائے شاعری میں میرا ماحول بہت ہمت شکن تھا۔ مجھے لکھ کر شعر سنانے کی بھی چوری تھی کہ زہد و علم نواز احباب و اقربا میرے ہر اُس شعر کا، جو وہ سن پاتے، مذاق اڑاتے تھے۔ اسی کا اثر تھا کہ وصل نوازی اور بوسہ بازی کی شاعری سے میں شروع ہی سے مجتنب رہا اور تفوقِ رقیب کو ہمیشہ حرام سمجھا۔

حضرت اطہر ہاپوڑی کے اہلِ فن اور صاحبِ تحقیق ہونے کا جب تو کیا، میں اب بھی معترف ہوں۔ اُن کا شاگرد ہو جانے میں مجھے عار نہ ہوتا، مگر ہوا یہ کہ اس وقت میرے قصبے کے بعض بے ہنر اُن کے شاگرد تھے، جو اُستاد سے شعر لے کر سناتے تھے اور اس پر ناز کرتے تھے۔ اُن لوگوں کے ساتھ میں نے مشارکت کو پسند نہیں کیا۔

میں حضرت بیان یزدانی میرٹھی سے ملا، جو میرے ہی ضلع کے قصبے جارچہ کے رہنے والے تھے، جس کا فاصلہ گلاؤٹھی سے کل چھ میل ہے۔ میں نے ان کی شاگردی اختیار کی، مگر بدقسمتی سے کچھ استفادہ نہ کر سکا کہ اُسی سال (۱۹۰۰ء) میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اور ہنوز مجھے یہ خیال بھی نہ آنے پایا تھا کہ اب کسی کی طرف رجوع ہوں کہ امیر مینائی کی بھی خبر آگئی . . . بیان یزدانی کا شاگرد کیوں ہوا تو اس کا جواب یہ ہے کہ میں نے اس وقت انھیں اپنے وقت کا بہترین، مکمل، ہمہ گیر، فاضل اور اہلِ فن شاعر اور اُستاد سمجھا، اور ہنوز اس خیال پر راسخ ہوں کہ بیان اپنے وقت کا سب سے اچھا شاعر تھا۔

حضرت جلال لکھنوی سے میں ایک ہی مرتبہ ملا۔ دورانِ گفتگو میں معلوم ہوا کہ یہ بزرگ کسی کو کچھ نہیں سمجھتے۔ انھوں نے امیر مینائی کو ایک دیہاتی اور غیر شاعر کہا۔ اور داغ کے متعلق فرمایا کہ وہ اہلِ علم نہیں، اس لیے ان کے سرمایۂ سخن میں صرف "گلزارِ داغ" معتبر ہو سکتا ہے، کہ اس پر اُستاد ذوق کی اصلاح ہے۔ وہ اسی ملاقات میں میرے اس شعر پر بھی اعتراض کر بیٹھے:

ساغر پہ فاتحہ ہو، دلِ تشنہ کام کی
ساقی مصلیوں کو پلا میرے نام کی

اور فرمایا کہ لفظ "فاتحہ" مذکر ہے۔ جب میں نے جواب دیا کہ دہلی کے استعمال میں مؤنث ہے اور جب اس میں تائے تانیث جو حالتِ وقفی میں "ہ" (ہو جاتی ہے) موجود ہے تو، اہلِ دہلی حق پر ہیں۔ اس پر جلال صاحب چڑھ گئے اور تلخ کلامی تک نوبت آ پہنچی۔

میں مولانا عبدالرحمٰن راسخ دہلوی کا بھی معترفِ کمال تھا اور ان کے ساتھ بسلسلۂ علوم عربی اچھی خاصی ملاقات، بلکہ دوستی بھی تھی، مگر میں نے اُن کی شاگردی کو پسند نہیں کیا کہ شعر

مولانا تاباں گلاؤٹھوی
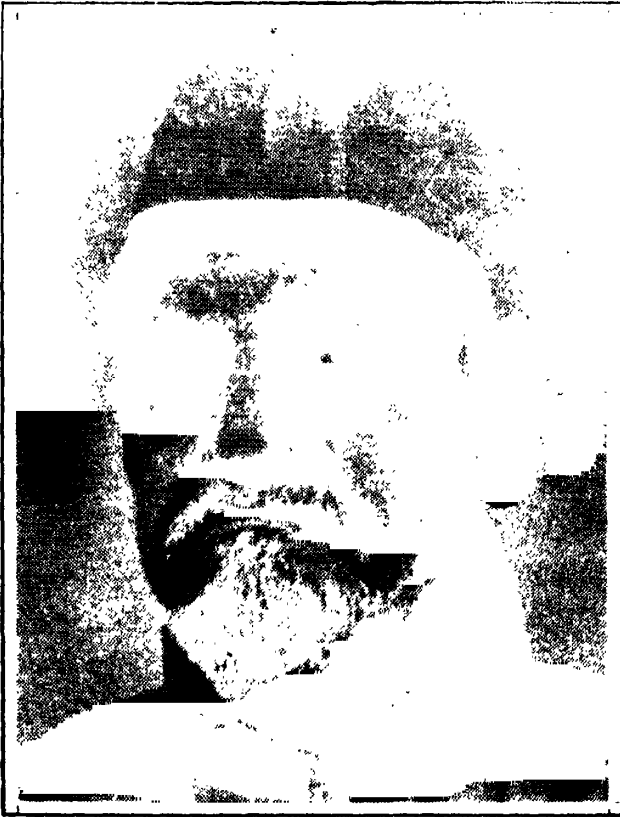
نولیسی ہیں، باوجود انہماکِ شاعری، محتاط نہ تھے،
جس کی بدولت باوجود 'متقی' عالم ہونے کے
ان کے تغزل پر سوقیت نے غلبہ کر لیا تھا، جسے
میری آوارگی اور رندی نے بھی گوارا نہ کیا۔

ابتدائے شاعری میں میں نے منیر
شکوہ آبادی کے دیوان کو بہت پڑھا۔۔۔ منشی
عبدالوحید فدا گلاؤٹھوی میرے ہم وطن بھی ہیں
اور کسی دور کے رشتے سے عزیز بھی۔ یہ صاحب
ضلع مین پوری میں ملازم تھے اور کبھی کبھی گلاؤٹھی
بھی آجاتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے مجھ سے
کہا کہ صدرا اور شمس بازغہ سے شاعری نہیں آتی۔
میں نے جواب دیا کہ 'متنبی' اور حماسہ سے تو
آتی ہے۔ بات آئی گئی ہوئی مگر مجھے خیال ہوا کہ
داغ دہلوی کے کلام کو دیکھوں کہ میں دہلی کے
نواح کا باشندہ تھا اور اُن کی ذات دہلی اور اہلِ
دہلی کے لیے مایۂ ناز تھی۔ ان کے دو دیوان
"گلزارِ داغ" اور "آفتابِ داغ" میں نے لے
لیے جن میں بلحاظ صفائی زبان و سلاستِ بیان
مجھے "آفتاب" زیادہ پسند آیا۔ میں نے اُسے بہت
پڑھا، بار بار پڑھا، بہت غور سے پڑھا اور اتنا
پڑھا کہ اس وقت یہ پورا دیوان مجھے حفظ ہو گیا
تھا۔ اسی نے میری شاعری پر اثر کیا اور یہی
میرے طرزِ بیان پر بلا ارادہ چھا گیا۔ چونکہ میں
نے اپنی شاعری کی بنیاد "آفتاب" پر رکھی، اس
لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ براہِ راست میرا
استاد "آفتابِ داغ" ہے اور بالواسطہ مرزا
داغ۔ "آفتاب" کی زبان میں میرا روزمرہ تھا،
میرے گھر کا روزمرہ تھا اور میرے قصبے کا
روزمرہ تھا، اس لیے میں نے اپنے گھر کی زبان،
زبان اور محاورات پر اپنی شاعری کو قائم کیا اور
جیسا کہ لکھ چکا ہوں، اپنے ثقاہت نواز ماحول
سے ڈرتے ہوئے سوقیت وغیرہ سے اجتناب
کیا۔۔۔ چونکہ اپنا عیب خود انسان کو نظر نہیں
آتا، اس لیے ۱۹۰۴ء میں اپنے والد صاحب
کے مشورے سے بذریعہ خط و کتابت داغ
کا تلمذ اختیار کیا مگر تین چار سے زیادہ غزلوں
پر اصلاح نہیں لی، کیونکہ ان اصلاحوں سے
اندازہ ہو گیا تھا کہ مجھے اصلاح سے زیادہ اپنے
کلام پر خود لکھتے وقت اور لکھنے کے بعد غور کرنے
کی ضرورت ہے۔۔۔ ۱۹۰۵ء میں داغ کا
انتقال ہو گیا اور قصہ ہی تمام ہو گیا۔ مگر 'آفتاب'
جو میرا راہبر تھا، عرصے تک رہا۔ اور میں نے
خود کو داغ کا شاگرد کہنا وجہ ناز سمجھا کہ یہ
دہلی کے قدیم خانوادۂ سخن سے نسبت ہے۔

فنی استعداد:

میں نے بجز درسی عروض کے کبھی فن کے
متعلق کوئی کتاب نہیں پڑھی۔ مگر یہ اتفاق ہے
کہ جن جن باتوں کو میں نے پابندی سے اختیار
کیا، وہی مسلّماتِ شعر نکلے۔ وہی فن نکلا۔ اور
زبان تو میرے گھر کی تھی ہی۔۔۔ میں اب
دوسروں کے لیے کہہ سکتا ہوں کہ جو شخص خود
اہلِ علم ہو کر ذوقِ سلیم کے ساتھ اساتذہ کے
کلام اور طرزِ بیان کو غور سے دیکھے گا، اُسے فن
آپ ہی آپ آ جائے گا۔

رنگِ سخن:

میں نے داغ کا رنگ اپنی پابندیوں کے
ساتھ لکھا۔۔۔ اردو شاعری میں محاورات کو
میں نے سب سے زیادہ نظم کیا کہ اس میں اُستاد
ذوق کے سوا میرا کوئی ہم پایہ تھا، نہ ہے اور
جب بات یہاں تک آ ہی گئی تو مجھے یہ کہنے میں
باک نہیں کہ صفائی اور روانی کا میں تنہا مالک
ہوں۔ مولانا عبدالباری آسی الدنی کی تحریک
پر میں نے غالب کا مشکل رنگ بھی لکھا ہے۔۔۔
مومن کا رنگ بھی لکھا ہے۔ میر تقی میر کا بھی۔۔۔
اور اب اپنے الگ رنگ میں بھی زبان و فن کی
پابندی کے ساتھ لکھتا ہوں:

مومن پہ بھی ایمان ہے، غالب پہ بھی، ناطق
ہم ذوق کے انداز میں رہتے ہیں مگن اور

میں ہر شعر بہت سوچ کر اور ڈرتے ڈرتے
لکھتا ہوں۔ غزل لکھنے بیٹھتا ہوں تو فکر ہوتی ہے
کہ مطلع خاطر خواہ ہوگا یا نہیں کہ یہ خدا کی دین
ہے۔ اس میں اپنا گھمنڈ نہیں چلتا۔ اور جب
تک مطلع خاطر خواہ نہیں نکل آتا، آگے نہیں
بڑھتا۔ کسی کی تعریف کی پروا نہیں ہوتی۔ البتہ
تنقیص پر ضرور ٹھنڈے دل سے غور کرتا ہوں۔
غزل نگاری کا اصل اصول یہ ہے کہ
شاعر خالی الذہن ہو کر قافیے کو ردیف کے
ساتھ ملاتا ہے اور اس سے جو جو کلام پیدا
ہوتا ہے اس کے لیے دل پذیر اندازِ بیان
اور طرزِ سخن کے مطابق سوچتا اور لکھتا ہے۔
اس لیے مصرعِ ثانی ترتیبِ خیال میں مصرعِ
اول سے پہلے ہوتا ہے۔۔۔ اہلِ فن اس
جزوِ کلام کے مطابق خیال پیدا کرتے ہیں۔
بہتر سے بہتر طرزِ بیان کی تلاش کرتے ہیں۔ اور
دل آویزی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے حسبِ
حیثیت اچھی سے اچھی زبان اور محاورات میں
لکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ عامیانہ خیالات
اور مبتذل بیان سے اجتناب کیا جاتا ہے۔۔۔
انفرادیت پسند لوگ اس کا بھی خیال رکھتے ہیں
کہ جو خیال ہم پیش کر رہے ہیں، وہ آسانی سے
کسی دوسرے کے ذہن میں تو نہیں آسکتا،
جس کا فیصلہ ان کا وجدانِ سلیم کرتا ہے۔ بیشتر
حضرات اپنے مخصوص طرزِ بیان ہی کے مطابق

لکھتے ہیں۔ اس کے باوجود اگر کوئی مضمون خیال میں آئے تو چاہے کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو، چھوڑ دیتے ہیں۔ حمد و نعت وغیرہ میں رنگِ مجاز کو بالکل دخل نہیں دیا جاتا۔ لیکن مجاز میں سب کچھ بیشتر لکھ دیا جاتا ہے۔ خاص لوگ مقطع کے علاوہ اس سے بھی اجتناب کرتے ہیں۔ میر تقی میر کے یہاں کم تر اور استاد ذوق کے یہاں زیادہ تر اس کی بھی پابندی نہیں۔ ان حضرات نے جہاں جس خیال کو اچھا سمجھا لکھ دیا ہے، مگر خوبیِ بیان کا لحاظ کہیں نہیں چھوڑا . . . بعض وقت شاعر ٹال چال کی طرح بھی کسی قافیے کی خانہ پُری کر جاتا ہے جو اہلِ کمال کے لیے زیبا نہیں:

برائے بیت لکھ لانا غزل آسان ہے ناطق
یہ مشکل ہے کہ جو شعر آئے وہ بیت الغزل آئے

تصوف نگاری:

میں نے قطب الارشاد ملجائی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ سے شرفِ بیعت حاصل کیا ہے:

چاہیے ناطق ہمیں جامِ رشید الاولیاء
مانگتے ہیں بھیک اپنے مرشدِ کامل سے ہم

چنانچہ موصوف نے جب رحلت فرمائی تو جہاں عربی میں حضرت مولانا شیخ الہند کا نکالا ہوا مادۂ تاریخ سب سے زیادہ پسند کیا گیا، وہاں حضرت مرحوم کے صدقے میں میرا اردو کا نکالا ہوا مادۂ تاریخ سب سے زیادہ پسند کیا گیا۔ جو یہ ہے:

وائے راہِ حق کا سچا رہنما جاتا رہا
(۱۹۰۵ء)

میں مدرسۂ عالیہ دیوبند کا عالم تو کیا ہو سکتا ہوں، طالب علم رہا ہوں، اور میں نے بیشتر سب ہی اکابرِ دیوبند کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا ہے اور بہت سے اہلِ سلوک و تورع حضرات کی آنکھیں دیکھی ہیں، جن میں بعض حضرات کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ حضرت مولانا عبدالرحیم رائے پوری، حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ، حضرت مولانا شیخ الہند دیوبندی، حضرت مولانا حکیم محمد صدیق مرادآبادی، مولانا اشرف علی تھانوی قدس اللہ اسرارہم۔ جن میں کا ہر ایک آسمانِ سلوک کا آفتابِ تاباں تھا، اور ان میں سے کئی بزرگوں کی بزمانۂ طالبعلمی جوتیاں بھی اُٹھائی ہیں۔ اس لیے چاہتا تو ہزاروں . . . مکاروں کی طرح خود بھی سالک بن بیٹھتا، لیکن میں سالکوں کی خاکِ پا بھی نہیں۔ مگر یہ بھی نہیں کہ راہ و رسمِ منزلہا سے بالکل بے خبر ہوں . . . حضرت مولانا گنگوہیؒ کے خلیفہ حضرت صوفی کرم حسین صاحب گلاؤٹھوی کے ساتھ میرا بہت ساتھ رہا ہے۔ وہ مجھ سے خاص محبت بھی کرتے تھے، لیکن بدقسمتی سے کبھی ذکر و شغل کرنے کی سعادت نصیب نہیں ہوئی۔ البتہ بزرگانِ دین کے ادراک ہمیشہ کرتا رہا ہوں اور اگر قسمت نے یاوری کی تو خیال ہے کہ کرتا رہوں گا۔

اپنے بزرگوں کے صدقے میں نکاتِ تصوف کے متعلق میں کچھ کم نہیں جانتا، لیکن مجھے اس میں ادعا نہیں۔ . . میں نے تصوف کے مسائل نظم بھی کیے ہیں، مگر خصوصیت کے ساتھ نہیں۔ اس رنگ کا میرا ایک مطلع یہ ہے:

ہیں کبھی واعظ، کبھی ہیں مرشدِ میخانہ ہم
گھومتے جاتے ہیں حسبِ گردشِ پیمانہ ہم

. . . میں کہتا ہوں کہ قلبی کیفیات کو جہاں مقام آتا تہ بہ تہ پردوں میں دھرا ہوا ہے اہلِ باطن کا دل ہی جانتا ہے اور دل ہی میں اُتارتے ہیں۔ الفاظ میں وہ بھی نہیں سمجھا سکتے۔ جو کچھ کہتے ہیں وہ حقیقت کا عشرِ عشیر بھی نہیں ہوتا۔

متروکاتِ شاعری:

اپنے متروک الفاظ کو میں نے کہیں جمع نہیں کیا۔ جو لفظ اچھا نہیں معلوم ہوتا، نہیں لکھتا۔ مگر ان کے لکھنے والوں پر معترض بھی نہیں ہوتا۔ تمثیلاً "میں" اور "تو" کو مخفف لکھنا مجھے گوارا نہیں اور مصرعے کی ابتدا میں تو انھیں دیکھ کر نفرت ہوتی ہے۔ آخر متروک تو وہی لفظ ہوگا جو زبان والے نثر میں نہیں بولتے۔ تو اب دیکھیے کہ ملک میں کہیں بھی یہ الفاظ مخفف بولے جاتے ہیں کیا:

بحثِ متروکات کو ناطق اٹھا کر رکھ پرے
اپنے قصبوں کی طرف دھارا زباں کا جائے ہے

کچھ غزل کے متعلق:

غزل کے متعلق ہمیشہ سے یہ خیال ہے کہ وہ عموماً معشوق اور خصوصی طور سے عورت سے لطیف پیرائے میں گفتگو کرنے کا نام ہے۔ اور ابھی تک جو کچھ ہوتا رہا ہے وہ سب اسی ماحول سے متعلق ہے۔ زبور میں حضرت سلیمانؑ کی شاعری جو غزل الغزلات کے نام سے ہے، اس میں بھی کم از کم خیال یہ ہے کہ انھوں نے اپنی ملکہ بلقیس کی مدح سرائی کی ہے . . . میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ فارسی کی شاعری میں تقریباً امرد پرستی ہے، جس سے شیخ سعدیؒ بھی نہیں بچے۔ اور "گلستان" کی بعض حکایتوں میں بھی یہ گرا ہوا معیار نظر آتا ہے۔

اُردو شاعری میں جہاں تک غور کیا جائے بیشتر شعرا کے کلام میں یہی نظر آتا ہے کہ وہ طوائف کے گرد گھومتی ہے۔ جس بے وفائی، ظلم و ستم، کج ادائی، ناز و انداز اور بے حیائی کا بیان بیشتر متقدمین و متاخرین شعرا کے کلام میں نظر آتا ہے،

وہ سب طوائفوں کا ہی خاصہ ہے۔ مرزا داغ کی شاعری میں اور اس کے متعلق جو افسانے سُنے ہیں، ان میں بیشتر طوائف ہی ہوتی ہے، اور ان کا یہ شعر خصوصاً ناچتا ہوا ہے :

وہ دمِ رقص گردشیں اس کی
ایک پھر کی نظر میں پھرتی ہے

مومن خاں مومن بڑے مقدس و متورع شاعر تھے یقین ہے کہ وہ کبھی کسی طوائف سے ملے بھی نہ ہوں گے۔ لیکن شاعری کے ماحول سے وہ بھی متاثر ہیں۔ دیکھیے فرماتے ہیں :

اس غیرتِ ناہید کا ہر راگ ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے، آواز تو دیکھو

میں نے اب سے ۳۵۔۴۰ سال قبل جب بوس و کنار کی شاعری کو ترک کیا اور زُلف و کاکل وغیرہ کے بیان سے اجتناب کرنے لگا تو اس طرف بھی میرا خیال گیا تھا اور جب ہی سے میں نے ایسے مضامین کو لکھنا بھی چھوڑ دیا، جو طوائفوں کے گرد گھومتے ہیں :

نہ اپنی شاعری کی دسترس ہے بندِ محرم تک
نہ آتا ہے ہمیں مضمون ناطق، بوسہ بازی کا

یہ تو نہیں کہتا کہ ایسا کوئی مضمون میری شاعری میں بالکل نہیں۔ ہوں گے اور ملیں گے، لیکن بہت کم، کہ کسی فن کی ڈگر کو ایک دم چھوڑ دینا اور چھوڑ کر اہلِ فن رہنا بہت مشکل بات ہے۔

میں نے گل و بلبل، شمع و پروانہ وغیرہ کے بیان سے بھی اپنے کلام کو ملوث نہیں کیا۔ حسن و عشق کا بیان بھی میرے یہاں بہت کم ملے گا۔ اس کے لیے مجھے اپنا طرزِ بیان سب سے الگ کر دینا پڑا۔ میری شاعری اب حالاتِ زمانہ اور اپنے پیش پا افتادہ مضامین تک ہی محدود ہے :

پیش پا افتادہ ناطق لیتے ہیں مضموں سمیٹ
کھینچ لیتے ہیں خیال اپنا جب اونچا جائے ہے

شاعر کی اہمیت :

اللہ تعالیٰ شاعروں کے متعلق فرماتے ہیں: "والشعراء یتبعہم الغاوون الم تر انہم فی کل واد یہیمون وانہم یقولون ما لا یفعلون"، زمانہ اس آیتہ شریفہ کو شاعری کی تنقیص کہتا ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اس سے بہتر شاعری کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ قرآن مجید کا طرز بیان ملاحظہ کیجیے کہ اتباعِ شعرا کو گمراہی فرمایا ہے، شاعروں کو بدبخت یا گمراہ نہیں بتایا۔ اور اس کی دلیل میں ارشاد ہے کہ کیا نظر نہیں آتا کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے ہیں اور وہ کہتے ہیں، جو کرتے نہیں۔ یعنی یہی کہ شاعر کا خیال ہر بات پر حاوی ہے۔ وہ سب کچھ لکھ ڈالتا ہے۔ اسی لیے شاعر اپنی ہمہ گیری کے لحاظ سے "تلمیذ الرحمٰن" ہے۔ اور اسی خیال سے اہلِ ہند کا مقولہ ہے "جہاں نہ جائے رَوی، وہاں پہنچے کَوی" یعنی شاعر کے خیالات نظامِ شمسی سے وسیع تر ہیں۔ . . . وہ لوگ ضرور بدبخت تھے، جنھوں نے شعرائے عرب کی خیال آرائی کو قرآنی حقائق کے مقابلے میں پیش کیا کہ شعرا کا مقصد خیال آرائی اور حُسنِ بیان تھا۔ وہاں حُسنِ عقیدہ کا سوال کیا۔ "یقولون ما لا یفعلون" بھی بیانِ واقعی کہ شاعر کا وہ تعامل بھی نہیں ہوتا۔ اور کیوں ہو۔ . . ؟ شعرا کو بُرا کہنے والے بزعمِ خود غلط علما اسے بھول جاتے ہیں کہ اگر کسی نے پیغمبرِ اسلام کے سامنے ممبر پر بیٹھنے کی سعادت حاصل کی تو وہ شاعری کی بدولت تھی۔ خود نبی کریمؐ کا وجود بیانِ حقائق و اعتقادیات کے لیے تھا۔ اس لیے یہ سعادت حسان بن ثابتؓ کو حاصل ہوئی، دیگر صحابۂ کرام کو نہیں۔ پیغمبر اسلام کی شان چونکہ "ما علمناہ الشعر وما ینبغی لہٗ" کی تھی اس لیے خاتم النبیینؐ کے ساتھ یہ الہامی شان ایک شاعر کی ہوئی، جس کے متعلق رسولِ کریمؐ نے فرمایا ہے: "ان اللہ یؤید لحسان بروح القدس"۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ جس طرح حقائق کو وحی کی شان حاصل ہے، اس طرح خیالات کو بھی . . . فرق یہ ہے کہ اوّل الذکر واجب العمل ہیں اور مستقل، لیکن آخر الذکر محض وقتی اور دماغی کیفیات کے لیے۔ دیکھیے حسانؓ کی شاعری کو اعتقادیات سے کوئی واسطہ نہیں، مگر لغو بھی نہیں۔ یہی نہیں تو اس سے کچھ کم درجہ میرے نزدیک ہر سلامت رو شاعر کا ہے۔ . . شعر میں واقعات کے ساتھ صنائع کی بھی ضرورت ہے، نثر کی سادہ بیانی یہاں نہیں چلتی۔ اس لیے کفارِ مکہ کے مقابلے میں اسلام کو حسانؓ کی ضرورت ہوئی اور یہی ضرورت تھی جس کے لیے حضرت سلیمانؑ کو بلقیس کے حُسن کی مدح سرائی کے لیے غزل الغزلات میں جانا پڑا جو "عہدِ عتیق" میں موجود ہے اور اسی لیے مولانا رُوم نے فرمایا کہ "شاعری جزویست از پیغمبری . . ." شعر کو اعتقادی جنس نہ بنایا جائے۔ اسے پڑھیے، حسبِ حیثیت لطف اُٹھائیے اور بھول جائیے۔ اگر اس میں کچھ دم ہو گا تو نقش ہو جائے گا، نہیں تو گیا۔

شاعر اور علامہ؟: میں ان لوگوں کو سختی سے منع کرتا ہوں، جو مجھے علامہ لکھ دیتے ہیں۔ اس میں کچھ انکسار کو بھی دخل نہیں۔ یہ انکسار نہیں، حقیقت ہے کہ اوّل تو میری وہ

شان نہیں جس کی بنا پر بعض علمائے سلف کو علامہ کہا گیا۔ دوسرے یہ کہ یہ تفصیل ہندوستان میں ان لوگوں کی ایجاد ہے جو فیصلہ کر چکے ہیں کہ یہاں خدا نے ایک ایسا شاعر پیدا کیا جس کا ثانی کوئی کبھی تھا بھی نہیں اور کبھی ہو بھی نہیں سکتا چنانچہ اس کا استعمال اسی شاعر کے لیے ہوا اور ہوتا چلا جا رہا ہے۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ اُس شاعر کی شان یکتائی میں دست اندازی ہے...

سنیے بندہ نواز... قرونِ اولیٰ یا زمانۂ متقدمین میں کسی کو علامہ نہیں کہا گیا۔ اس وقت ہماری آپ کی عربی علمی قابلیت والے لوگ عالم بھی نہیں کہلاتے تھے، بلکہ اُنھیں مُلّا کہا جاتا تھا۔ چنانچہ مولانا جامی جیسی ہستی کو بھی مُلّا جامی اب تک لکھا جاتا ہے اور شرح جامی کو "شرح مُلّا" کہا جاتا ہے۔ سلطان محی الدین اورنگ زیب کے استاد کو جنھوں نے اورنگ زیب کو "اورنگ زیب" بنا کر "فتاویٰ عالمگیری" جیسی کتاب کا مصنف بنایا اور جنھوں نے اصولِ فقہ میں "نورالانوار" جیسی وقیع و مستند کتاب لکھی ہے، مُلّا جیون کہتے ہیں۔

پہلے لوگ بڑی قابلیت والی ہستی کو عالم کہتے تھے۔ جو اپنے زمانے میں یا کسی خاص فن میں فردِ واحد ہوتا تھا، اس کے لیے لفظ "امام" استعمال ہوتا تھا، جیسا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے لیے اس وقت یہ لفظ استعمال ہو رہا ہے۔

ہندوستان میں بلحاظِ علم و فن سب سے بڑا خاندان دہلی والوں کا تھا، جن میں شاہ ولی اللہ صاحب کو اگر امام بھی کہا جائے تو بجا ہوگا۔ ان کے علاوہ شاہ عبدالعزیز صاحب کی ہستی بھی بہت بڑی ہستی تھی۔ ان لوگوں کی خاک پا ہونے کا فخر بھی آج کسی بڑے سے بڑے عالم کے لیے وجہ ناز ہو سکتا ہے۔ یہ لوگ "شاہ" کہلائے یا "مولانا" "مولوی"... علامہ کا استعمال ان کے لیے کسی عالم نے نہیں کیا... بلحاظِ منقول، مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی ہندوستان کے آفتاب و ماہتاب ہوئے۔ مگر کسی نے اُنھیں بھی علامہ نہیں کہا۔ مولانا شیخ الہند محمود الحسن دیوبندی کو بھی یہ خطاب نہیں ملا۔ بلحاظِ منقول خیرآباد کا خاندان امام فن تھا۔ مگر نہ مولانا فضل امام علامہ بنے، نہ مولانا فضل حق اور نہ مولانا عبدالحق۔ ہندوستان میں ایک اور بڑی ہستی مولانا صدیق حسن خاں کی تھی، جن کی تصانیف تمام بلادِ اسلامی میں مروج اور مقبول ہیں اور علمائے فرنگی محل میں مولانا عبدالحئی صاحب کا تبحّر علمی مُسلّم ہے۔ مگر یہ حضرات بھی علامہ نہیں بنائے گئے۔

علامہ بنے اور بنائے گئے تو کون؟ شاعر... جن کے لیے علامہ ہونا کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ یہاں ذہنِ رسا و فکرِ سلیم کی ضرورت ہے، جس پر علم سے صیقل ہوتی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ خسروئے دکن نے حضرت جلیل مانکپوری کو "امام الفن" کا خطاب دیا۔ "علامۂ فن" نہیں بنایا کہ لفظ امام سے شانِ اجتہاد پیدا ہوتی ہے، جو مضمون آفرینی کا دوسرا نام ہے۔

اب ذرا لفظ "علامہ" کے معنی و ترکیب ملاحظہ کیجیے، تو اسے لفظ "عالم" کی تفضیل کا صیغہ کہہ سکتے ہیں، مگر اس کے لیے لفظ "اعلم" مستعمل ہے کہ آپ نے "واللہ اعلم" کا استعمال بہت زیادہ سنا اور دیکھا ہوگا۔ یہ لفظ "علامہ" جس طرح تفضیل کا صیغہ ہے، اسی طرح تانیث کا بھی صیغہ ہے، جس کی تائے تانیث، حالتِ وقفی میں "ہ" ہو گئی ہے۔ اس لیے کسی مرد کے لیے اس کا استعمال کم از کم مجھے تو گوارا نہیں ہوتا۔ خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ اُردو کے استعمال میں لفظ "علامہ" نے مہتذ ہو کر اپنے تانیثی معنی کے ساتھ کچھ زیادہ مفہوم بھی پیدا کر لیا ہے کہ اب اس کا استعمال ایسی عورت کے لیے کیا جاتا ہے، جو مکارہ ہو۔ آپ نے سنا ہوگا کہ کسی بدوضع اور چالاک عورت کے لیے کہا جاتا ہے کہ "وہ بڑی علامہ ہے"، یا "بڑی علامہ بنی پھرتی ہے"... اس لیے اس لفظ "علامہ" کا مفرد استعمال بمعنی عالم، فاضل اسی طرح متروک ہونا چاہیے، جس طرح لفظ "بدن" کا بمعنی جسم ہو گیا ہے۔

ہمارے شعرائے کرام کا کچھ حال نہ پوچھیے۔ انھیں ہر نئے طرزِ تخاطب کو جو کہیں بھی نظر آئے ہتیا لینے کا بڑا شوق ہے۔ میں نے اپنے بچپن میں دیکھا تھا کہ "حضرت" کا لفظ صرف ریاض خیرآبادی کے لیے لکھا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ عام ہو گیا۔ مولانا شروع ہوا، وہ بھی اس حال کو پہنچا۔ اب علامہ کا دور ہے اور ایک درجن سے زیادہ "علامات" ہو گئے ہیں۔ دیکھیے اس کے بعد کیا ہوتا ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ فن اور جوہر نادر ہو رہے ہیں اور خود بینی اور خود ستائی کا زور ہے۔

مستورات اور شاعری:

یہ جو بحث ہے کہ عورت خود غزل ہے اور شاعری میں عورت ہی کا بیان ہوتا ہے اس لیے عورت کو شاعری نہیں کرنی چاہیے۔ میں اس بات سے کسی حد تک متفق نہیں ہوں...

شاعری پر مردوں ہی کا کچھ اجارہ نہیں۔ ہمیشہ ہی سے عورتیں کم و بیش شاعری کرتی چلی آئی ہیں۔ عرب میں بھی شاعرات تھیں، ایران میں بھی اور ہندوستان میں بھی، جن میں کئی بہت مشہور ہیں۔ میرے خیال کے مطابق عورت اگر ایسی شاعری نہ کرے جس سے میں اجتناب کرتا ہوں تو یقیناً عورت کے لیے وہ شاعری مذموم نہ ہوگی اور اگر کوئی صاحب لیاقت عورت اخلاقی شاعری کرے، تو وہ میرے نزدیک زیادہ مستحسن ہوگی۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ آج کل شاعرات وجود میں آرہی ہیں، جن میں بیشتر متشاعرات ہیں۔ ان کے متعلق یہ چیلنج کیا جاتا ہے کہ اگر وہ واقعی شاعرات ہیں تو کہیں مجمعے میں آکر جو طرح برو قت دی جائے اس پر کم از کم دو شعر لکھیں اور جب اس چیلنج کو کوئی شاعرہ منظور نہ کرے تو وہ یقیناً شاعرہ نہیں۔ لیکن مجھے یہاں بھی تامل ہوتا ہے کہ اگر کوئی مجھے بھی چیلنج کرے کہ اگر تو شاعر ہے تو کسی مجمعے میں آکر دو شعر کہہ دے، تو شاید میں بھی اسے منظور نہ کروں۔ اور یہ بات خوشی سے گوارا کر لوں کہ لوگ مجھے بھی غیر شاعر کہیں۔ . . .

بہر حال اس معاملے میں شاعرات کی ذاتی علمی قابلیت اور اس کے اشعار کو دیکھ کر فیصلہ کرنا چاہیے:

سخن گوئی میں پہلی بات ناطق طبع موزوں ہے
پھر اس پر علم ہو تو یہ فن آتا ہے توغل سے

شاعری میں جانشینی:

اول تو شاعری میں جانشینی ہے ہی لغو۔ یہ تو بادشاہوں اور فقیروں سے مخصوص ہے دوم یہ کہ شاعروں کی جانشینی نہ صرف یہ کہ ایک نئی اُپج اور بے معنی سی بات ہے بلکہ اس کا حاصل حصول بھی کچھ نہیں۔ یہ جانشینی کا سوال خدا غریقِ رحمت کرے حضرت ریاض خیرآبادی نے منشی امیر مینائی کی وفات پر پہلی مرتبہ شاعری میں پیدا کیا۔ اس سے ان کا مقصد حضرت جلیل مانکپوری کے لیے حیدرآباد دکن میں ایک خاص مقام پیدا کر دینا تھا اور وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے۔ ورنہ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ شاعری میں جو جانشینی ریاض نے لاٹھونسی، اس کے حق دار خود ریاض ہی تھے۔ ان کے سامنے کوئی دوسرا نہیں۔ مگر وہاں تو سوال ہی دوسرا تھا جس کی ضرورت اپنی خانہ نشینی کے لیے نہ سمجھی اور اپنے ایک خواجہ تاش بھائی کی دنیا بنا دی۔ خدا میرے اس مرحوم کرم فرما کو جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ہر مسلمان کو ریاض کا سا توکل اور ایثار عطا فرمائے۔

کھلی بات ہے کہ اگر شاگردانِ امیر مینائی نے بالاتفاق جلیل مانکپوری کو جانشین امیر مینائی نہ مانا ہوتا تو جہاں استاد مرزا داغ کے بعد فرمانروائے حیدرآباد کا ان کے شاگرد ہونے کا سوال پیدا نہ ہوتا۔ ریاض نے نہ صرف پہلی مرتبہ شاعری میں جانشینی کو پیدا کیا، بلکہ اپنے اس اقدام سے جہاں حضرت جلیل کی دنیا سنوار دی، وہاں تلامذۂ داغ پر بھی ایک ایسی کاری ضرب لگائی، جس کے ایک ہی وار میں سب کے سب شہید ہو گئے۔

میرے خیال سے حضرت داغ کے انتقال کے بعد شاگردانِ داغ کو ان کی جانشینی کا سوال لے کر بیٹھنا نہ تھا، بلکہ اس وقت جو سوال پیدا ہوتا تھا وہ یہ تھا کہ خسروِ دکن کا اُستاد ہونے کی صلاحیت کس میں موجود ہے۔ اور تلامذۂ داغ میں کون ایسا شخص ہے جو ہمہ گیر شہرت اور قابلیت کا مالک ہے۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جاتا تو حضرتِ داغ کے شاگردوں میں کئی اصحاب اس کی اہلیت رکھتے تھے کہ فرمانروائے دکن کے اُستاد بنتے۔ یوں تو حضرت داغ کے بہت سے شاگرد اس منصبِ جلیلہ کے حق دار تھے، لیکن خاص طور پر جو لوگ جلیل مانکپوری سے کہیں اچھا لکھنے والے تھے اور جو فرمانروائے دکن کے اچھے اُستاد ثابت ہوتے، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

۱۔ بھائی نسیم بھرتپوری، جن کی ذاتِ گرامی پر خود حضرتِ داغ کو ناز تھا۔

۲۔ مولانا بے خود بدایونی، جو بلحاظِ علم و فن ایک مسلم بزرگ اور بہترین شعور والے شاعر تھے۔

۳۔ حضرت سید حیات بخش رسا گلاؤٹھوی، جو بہت اچھا لکھنے والے تھے۔

۴۔ حضرت بے خود دہلوی، جن کی برتری سے ہند و پاک کا تقریباً ہر شاعر واقف ہے۔

۵۔ حضرتِ احسن مارہروی، جن میں خاص استادانہ شان موجود تھی، اور جو حضرت اُستاد کے پاس رہ کر ان کی اصلاحوں سے مستفیض ہوتے رہے۔

۶۔ حضرت نوح ناروی، جو صفائی اور روانی بیان میں حضرت داغ کی دوسری شخصیت تھے۔ ان چھ کے علاوہ بھی کئی لوگ ایسے تھے جو فرمانروائے دکن کی استادی کے فرائض بحسن و خوبی انجام دے سکتے تھے۔

میں نے یہاں قصداً ڈاکٹر اقبال مرحوم کا نام نہیں لیا کہ ان کا راستہ دوسرا ہی تھا اور

جہاں تک مجھے علم ہے، استادی کا خیال بھی کبھی اُن کے ذہن میں نہیں آیا۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ جب جلیل مانکپوری نے فرمانروائے دکن کی استادی کے منصب کو قبول کیا، اس وقت سوال یہی پیدا ہوتا تھا کہ اُنھیں حضرتِ داغ کے کسی مقتدر شاگرد کی طرف رُجوع کرایا جاتا۔ مگر بدقسمتی سے اس کا تو کسی کو خیال بھی نہیں آیا۔ اور بے معنیٰ جانشینی کے سرپھٹول میں سب بھڑ گئے، جس کا اس کے سوا اور کوئی نتیجہ نہ نکلا کہ یا تو ہر جانشینی کا مدعی اپنی اپنی جگہ جانشینِ داغ بن کر بیٹھ گیا۔ یا پھر بالواسطہ سب مدعیانِ جانشینی نے بالاتفاق بھائی نواب سائل دہلوی کو اس طرح جانشینِ داغ مان لیا، کہ انھوں نے جس جس شاگردِ داغ کو جانشینی کی سند عطا فرمائی، اُس نے پھر اپنے آپ کو "بسندِ سائل" جانشینِ داغ کہا۔ اور اس طرح نواب سائل سب مدعیان جانشینی کے اتفاق رائے سے جانشینِ داغ بن گئے۔ ایسی خود فریبی کی دُنیائے شعر و ادب میں مجھے تو کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ . . شاید یہ بات میرے استاد بھائیوں کو ناگوار ہو، مگر کیا کروں مجھ میں یہ "بدعادت" ہے کہ جب صاف گوئی پر آتا ہوں، تو کسی کی لگی لپٹی نہیں رکھتا:

کہتے ہیں تو پھر کچھ لگی لپٹی نہیں رکھتے
ہم کہنے پہ آتے ہیں تو کہتے ہیں کھری بات
(ناطق)

ممکن ہے یہ بات میرے بعد پسند کی جائے، لیکن زندگی کا تجربہ تو یہ ہے کہ ہمیشہ میں نے اس سے نقصان ہی اُٹھایا ہے۔

اپنی پسند کے اشعار:

میرا تو رطب یابس جو کچھ ہے، وہ سب ہی مجھے پسند ہے کہ اوّل تو لکھتے وقت ہی دیکھ بھال کر لکھتا ہوں، پھر غزل کی تکمیل و نظرِثانی کرکے جس شعر کو ذرا بھی کسی جھول میں ڈھیلا بیٹھا ہوا دیکھتا ہوں، نکال دیتا ہوں۔ اب کیا اپنی پسند کے شعر پیش کروں۔ . . بھائی اپنے کلام میں سے خود اپنے پسندیدہ شعر نکال کر پیش کرنا، بڑی غلطی ہے کہ اس کے لیے بھی حُسنِ قبول تو دوسروں کا کام ہے، مگر اپنے بقیہ کلام کی بے وقعتی خود اپنے ہاتھوں ہو جاتی ہے، دوسرے اسے دیکھنے کی بھی پروا کیوں کریں۔ . .

مرتبِ مضمون کو ناطق صاحب کی معیت میں تقریباً گیارہ سال (۱۹۵۸ء سے اُن کے انتقال تک) رہنے کی سعادت حاصل رہی ہے۔ موصوف ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ قدوقامت بلند اور مستقیم، جسم لحیم شحیم اور آواز پُروقار تھی۔ بڑے وجیہہ، بارعب اور پُرجلال تھے۔ بیاسی سال کی عمر میں بھی ان کی تندرستی نہایت اچھی تھی۔ سماعت و بصارت میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں آئی تھی۔ تین چار کلومیٹر کی مسافت پا پیادہ آسانی سے طے کر لیتے تھے۔ انھیں برودتِ مثانہ اور سلسل بول کا مرض پُرانا تھا۔ رمضان المبارک ۱۳۸۸ھ (۱۹۶۸ء) کے ستائیس روزے مکمل کر لیے تھے۔ اٹھائیسویں روزے کو افطار کے قبل اُنھیں خون کی قے ہوئی۔ پیشاب اور پاخانے کے ذریعے بھی خون خارج ہونا شروع ہوا۔ اور اچانک حبسِ بول کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ پیشاب کے رُک جانے سے تکلیف بہت بڑھ گئی۔ اسی کے علاج کے لیے انھیں بیس دسمبر ۱۹۶۸ء کو اسپتال میں داخل کرا دیا گیا جہاں وہ چھبیس دن تک زیرِ علاج رہے۔ مرض میں جب کچھ افاقہ ہوا تو ۱۵ جنوری ۱۹۶۹ء کو گھر آ گئے اور یہیں علاج معالجہ ہوتا رہا۔ لیکن اس درمیان میں وہ بہت کمزور ہو گئے تھے اور اُٹھنے بیٹھنے سے معذور۔ پلنگ پر ہی لیٹے لیٹے تمام ضروریات پوری کرتے تھے۔

مولانا کی پہلی بیوی سے جو گلاوٹھی میں رہتی تھیں چھ بچے (۲ لڑکے اور ۴ لڑکیاں) ہوئے۔ جو سب کے سب اُن کے عینِ حیات داغِ مفارقت دے گئے۔ چار بچے کم سنی میں اور ایک لڑکا اور ایک لڑکی گھر بار والے ہو کر۔ اس بیوی کا بھی دس برس قبل مئی ۱۹۵۸ء میں انتقال ہو چکا تھا۔ دوسری زوجہ ناگپور کی تھیں اور مولانا کے ساتھ رہتی تھیں۔ اس بیوی سے ان کی کوئی اولاد نہ تھی۔ اقتصادی حالت پہلے ہی خستہ تھی اس لیے بیماری کا زمانہ بہت عسرت اور کسمپرسی میں کٹا۔ پانچ ماہ بسترِ علالت پر پڑے پڑے ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گئے تھے۔ ۲۶ مئی ۱۹۶۹ء کو یکایک ان کی حالت نے تشویش ناک صورتحال اختیار کر لی۔ زبان بند ہو گئی۔ اور شام سات بجے سے ہچکیوں کا سلسلہ شروع ہوا جو آخیر دم تک قائم رہا۔ اس وقت وہ اپنے اس شعر کے بالکل حسبِ حال تھے:

ہچکیوں پر ہو رہا ہے زندگی کا راگ ختم
جھٹکے دے کر تار توڑے جا رہے ہیں ساز کے

رفتہ رفتہ نبض ڈھلنے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے یہ شعر خاص اسی موقع کے لیے کہا ہے:

سقوطِ نبض خبر ہے سکونِ خاطر کی
اب آ چلا ہے اب آ جائے گا قرار مجھے

آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ رات کے قریب بارہ بجے آخری ہچکی آئی اور روحِ قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی :

اضطرابِ دل میں آ جا کر دوام آ ہی گیا
زندگی کو ایک حالت پر قیام آ ہی گیا

دوسرے دن دس ربیع الاول ۱۳۸۹ ہجری (مطابق ستائیس مئی ۱۹۶۹ء) کو انھیں بھان کھیڑا مسلم قبرستان، مومن پورہ، ناگ پور میں سپردِ خاک کر دیا گیا :

ہم اُٹھے تو زمینِ گور سے ناطق صدا آئی
رہیں گے بارِ خاطر بن کے، ہو کر بارِ دوش آئے

انتخابِ کلام :

بعض غزلوں کے مطلعے ملاحظہ فرمائیں۔

(مرتب)

نقش آئینہ ہے، تیری شوخیِ تحریر کا
دوسرا رُخ صاف آتا ہے نظر تصویر کا

مرے غم کی اُنھیں کس نے خبر کی
گئی کیوں گھر سے باہر بات گھر کی

جو چیز انھوں نے خط میں لکھی تھی نہیں ملی
خط ہم کو مل گیا ہے، تسلی نہیں ملی

کیا ارادے ہیں وحشتِ دل کے
کس سے ملنا ہے خاک میں مل کے

ہم چلے ہیں دوسری دُنیا بسانے کے لیے
ہے کوئی راضی ہمارے ساتھ جانے کے لیے

رندانِ بادہ نوش کی چھاگل اُٹھا تو لا
بادِ بہار، دوڑ کے بادل اُٹھا تو لا

خود ہو کے کچھ خدا سے بھی مردِ خدا نہ مانگ
رسمِ دُعا یہ ہے کہ دُعائے دُعا نہ مانگ

ہو گئی بند چشمِ شوق، گرد و غبار دیکھ کر
حسرتِ دید مٹ گئی، لیل و نہار دیکھ کر

ناپنا تھا مجھے غم، عمر کے پیمانے سے
رہ گیا کام ادھورا، مرے مر جانے سے

ہماری داستاں کے ساتھ رودادِ جہاں کیوں ہو؟
جہاں ہم ہوں، نہیں تم ہوں، زمیں کیوں، آسماں کیوں ہو؟

مشکل رہِ عدم کی ہم آساں نہ کر سکے
جلدی میں چل دیے کوئی ساماں نہ کر سکے

اسی کی دین ہے غم، میں گلا نہیں کرتا
قبول ہو کہ نہ ہو، اب دُعا نہیں کرتا

کس کو مہرباں کہیے، کون مہرباں اپنا
وقت کی یہ باتیں ہیں، وقت اب کہاں اپنا

چال اور ہے دنیا کی، ہمارا ہے چلن اور
وہ ساخت ہے کچھ اور، یہ بے ساختہ پن اور

وعدہ پہ ہم کو راہ دکھاتے ہی رہ گئے
اچھے تم آ رہے تھے کہ آتے ہی رہ گئے

اضطرابِ دل میں آ جا کر، دوام آ ہی گیا
زندگی کو ایک حالت پر قیام آ ہی گیا

ہم کہاں ہوں گے دعاؤں میں اثر ہونے تک
کچھ نہ کچھ ہو تو رہے گا ہی مگر ہونے تک

اور کچھ غم کے سوا جی کے نہ حاصل ہوتا
زندہ رہتے بھی تو جینا ہمیں مشکل ہوتا

صیاد اب قفس کی مصیبت گراں نہیں
میں نے سمجھ لیا ہے کہ یہ آشیاں نہیں

بھر پائے جانِ زار تری دوستی سے ہم
جیتے رہے تو اب نہ ملیں گے کسی سے ہم

کیا جستجوئے راحتِ دُنیا کرے کوئی
ملنے کی چیز ہو تو تمنا کرے کوئی

دیکھتا رہتا ہوں اکثر، شانِ قدرت دیکھ کر
خوب اصورت دیکھتا ہوں خوبصورت دیکھ کر

ہم کہاں ہیں، ہمیں نہ تھا معلوم
آپ کیا ہیں، یہ اب ہوا معلوم

خود مری حسرتِ افسردہ، سخن کوش نہیں
گفتگو ورنہ اسیرِ لبِ خاموش نہیں

نوٹ : اس مضمون کی ترتیب اور انتخاب میں جن کتب و جرائد سے مدد لی گئی ہے، اُن کے نام درج ذیل ہیں :

۱۔ دیوانِ ناطق، مرتب عبدالحلیم، اکتوبر ۱۹۷۶ء
۲۔ سبع سیارہ، مصنف ناطق گلاؤٹھوی جون ۱۹۶۰ء

(بقیہ صفحہ ۴۲ پر)

غزلیں

محمد مختار کوثر

طور پر تم کو بتائیں کیا ہوا
معرفت میں ذوقِ نظر رسوا ہوا

فصلِ گل کی داستاں تو سن چکے
یہ بتاؤ پھر چمن میں کیا ہوا

بحرِ غم کو دیکھ کر بحرِ فنا
اپنی پایابی پہ شرمندہ ہوا

کاروانِ عیش و عشرت کے قریب
قافلہ اک اور ہے ٹھہرا ہوا

ہم تو کوثرؔ اک محبت کا دیا
چھوڑے جاتے ہیں یہاں جلتا ہوا

۶۶، حسین منزل، ادریس گنج، ہردوئی

ہم نے خود اس کو بھلا رکھا ہے
ورنہ ہر دل میں خدا رکھا ہے

منتظر کون ہے میرا اب تک
رہ گذاروں پہ دیا رکھا ہے

دشتِ بے آب میں دل کے، ہم نے
گلِ امید کھلا رکھا ہے

وہ ملے گا تو بتا دوں گا اسے
میں نے اک راز چھپا رکھا ہے

مسکراہٹ ہے لبوں پر اس کے
اور خنجر پہ گلا رکھا ہے

اپنے چہرے کو مری آنکھوں میں دیکھ
آئینہ خانے میں کیا رکھا ہے

تحسین منور

۱۶۵، حوض رانی، مالویہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۷

ساغر ملک

تلاشِ ذات کے افسوں میں کھو گیا ہوں میں
ترا بہانہ ہے خود ہی کو ڈھونڈتا ہوں میں

ہزار داغ پڑے ہیں تمھارے چہرے پر
مرے قریب نہ آؤ کہ آئینہ ہوں میں

تمھارے دل میں بھڑکتی تو خاک ہو جاتے
وہ آگ جس میں اکیلا سلگ رہا ہوں میں

کرو نہ فکر مری رہبرانِ فکر و نظر
رہِ حیات کے ہر خم سے آشنا ہوں میں

نہ بزمِ عیش ہے ساغرؔ نہ مجلسِ ماتم
کسی کی یاد میں تنہا ہی جی رہا ہوں میں

تلولی، پڈگھا ۴۲۱۱۰۱، ضلع تھانے (مہاراشٹر)

انیس احسن اعظمی

ہندی کا اُردو داں ادیب
بھیشم ساہنی

عمر کے بامقصد ۷۵ سال اور تخلیقی سفر کے یادگار ۵۰ سال پورے کرنے والے ہندی کے صفِ اوّل کے افسانہ نگار، ناول نگار، مدیر، مترجم، اداکار، ڈراما نگار اور ڈھول پیٹ کر جسے سیکولر کہا جاسکے اس شخص کا نام ہے بھیشم ساہنی۔ آزادی کے بعد ہندی ادب کو جن نثر نگاروں اور تخلیق کاروں نے سجایا سنوارا ہے، ان میں بھیشم ساہنی سرِفہرست ہیں۔

۸/ اگست ۱۹۱۵ء کو راولپنڈی کے ایک آریہ سماجی بیوپاری گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد جناب ہربنس لال ساہنی نے ابتدائی تعلیم کے لیے گوروکل پوٹھوہار میں داخلہ کرا دیا۔ گوروکل میں صرف ہندی اور سنسکرت سے واقفیت ہوسکی۔ وہاں سے فارغ ہونے پر انھیں جس اسکول میں داخل کرایا گیا وہاں ذریعۂ تعلیم اُردو تھی۔ گھر کے ماحول میں ہندی، پنجابی اور سنسکرت کا زور تھا۔ ہائی اسکول میں داخل ہونے پر انگریزی زبان سے سابقہ پڑا۔ بی۔اے آنرز اور پھر لاہور کے گورنمنٹ کالج سے انگریزی ادب میں ایم۔اے کیا۔ ادب کے حوالے سے اُردو اور انگریزی کا ان پر زیادہ اثر رہا۔ ۱۹۵۷ء میں جب وہ روس میں مقیم تھے پنجاب یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔

تمس، بسنتی، جھروکے، کڑیاں، میّا داس کی ماڑی، جیسے ناولوں ــــ امرتسر آگیا ہے، او حرامزادے، نیا مکان، شوبھا یاترا، چیف کی دعوت، جیسے افسانوں (ساہنی جی کے افسانوں) کے نو مجموعے شائع ہوچکے ہیں ــــ ہانُش، کبیرا کھڑا بجار میں، اور مادھوی جیسے ڈراموں کے ذریعے بھیشم ساہنی نے ہندی ادب کی موثّر خدمت کرتے ہوئے ملک کی تقسیم کے المیے کے ساتھ ہی ریزہ ریزہ بکھرتی انسانی قدروں، تہذیب و تمدّن ــــ فن و ثقافت کے شعبوں میں سیاسی دخل اندازی، پس ماندہ اور درمیانی طبقے کی بے بسی اور فرقہ واریت جیسے مسائل کو اپنے قلم کی نوک سے بار بار چھیڑا ہے۔ وہ انجمن ترقی پسند مصنّفین کے جنرل سکریٹری بھی رہ چکے ہیں علمی اور ذہنی اعتبار سے مارکس وادی ہیں۔ مزاجاً بے حد شائستہ، مہذّب، خاموش، اور سنجیدہ واقع ہوئے ہیں۔ 'دھن کے پکّے'، قلم کے سچّے اور ادب اور انسانیت کے بے لوث خدمت گار۔ مثال کا ملنا مشکل ہے۔

فلمی دُنیا کی مشہور شخصیت جناب بلراج ساہنی بھیشم ساہنی کے بڑے بھائی تھے۔ بلراج ساہنی کا شمار سینما کے اہم اداکاروں میں تو تھا ہی اس کے ساتھ ساتھ وہ مقبول مصنّف بھی تھے۔ بھیشم ساہنی کی شخصیت پر بڑے بھائی کا خاص اثر رہا ہے ــــ ایک بار بھیشم ساہنی نے بڑے بھائی کو اپنی سفارش کرنے کے لیے لکھا کہ آپ فلاں شخص سے کہہ دیں تو میرا کام ہو جائے گا۔ خط کا جواب آیا "پیڑ پر سے اپنے ہاتھ سے پھل توڑنے کا اپنا ہی لطف ہے میں تمھیں اس لطف سے محروم نہیں کرنا چاہتا۔"

۱۹۴۲ء میں جب بھیشم ساہنی راولپنڈی کے ڈی۔اے۔وی کالج میں انگریزی پڑھاتے تھے اور بہ حیثیت اداکار اور ہدایت کار ڈراموں میں بھی حصّہ لیتے تھے۔ ان کا تعارف بی۔اے فائنل کی طالبہ شیلا سے ہوا دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے۔ ساہنی جی کی منگنی کہیں اور ہوچکی تھی لیکن ۱۹۴۴ء میں شیلا جی کا ایم۔اے فائنل کا امتحان ختم ہوتے ہی دونوں نے گھر والوں کی رضامندی سے شادی کرلی۔ آج بھی دونوں ہر محفل میں ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں۔

۱۳/ اگست ۱۹۴۷ء کو آخری فرنٹیئر میل میں سوار ہوکر وہ دلّی آئے تاکہ طلوعِ صبح آزادی کا نظارہ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔ بھیشم ساہنی کو اندازہ نہیں تھا کہ اس کے بعد وہ اپنے وطن راولپنڈی نہیں جاسکیں گے کیونکہ وہ پاکستان کا حصّہ بن چکا ہوگا اور ایسی افراتفری مچے گی کہ اللہ کی پناہ، ان کے خاندان کے لوگ جیسے تیسے کشمیر چلے آئے لیکن والد نے راولپنڈی چھوڑنے سے انکار کردیا بعد میں لوگوں کے بہت اصرار پر ان کے والد کے مُسلمان دوست نومبر ۱۹۴۷ء کے آخری ہفتے میں انھیں ہندوستان کی سرحد تک چھوڑ گئے۔

بھیشم جی ایک ہفتہ دلّی میں رہے اور جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو بڑے بھائی

۱۹۱۹، ترکمان گیٹ، دہلی ۱۱۰۰۰۶

بلراج ساہنی کے پاس بمبئی چلے گئے اور اپٹا (I.P.T.A) میں شامل ہو گئے، وہاں خواجہ احمد عباس کی ایڈاپٹیشن پر تیار کیا گیا ڈراما "بھوت گاڑی" کی ہدایت کی ذمہ داری لی۔ اس ڈرامے میں خواجہ احمد عباس، بلراج ساہنی، خود بھیشم ساہنی، ان کی بیگم شیلا اور شوکت اعظمی نے رول کیا۔ ڈراما مقبول ہوا اور بمبئی سے باہر احمد آباد میں بھی اس کے شو ہوئے۔ اس ڈرامے کی مشق (ریہرسل) کے دوران بلراج ساہنی اور کیفی اعظمی میں جھڑپ بھی ہو گئی تھی بقول بھیشم جی "اس وقت کیفی اعظمی بہت خوبصورت گبرو جوان تھا۔"

بمبئی میں قیام کے دوران بھیشم جی کی ملاقات کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی سے ہوئی اور وہیں ساحر لدھیانوی کے یہاں پہلی بار بنّے بھائی (سجاد ظہیر) سے ملے، بعد میں سجاد ظہیر صاحب کے کہنے پر وہ انجمن ترقی پسند مصنّفین میں شامل ہوئے اور یہیں سے ان کے مراسم فیض احمد فیض کے ساتھ دوستانہ ہوتے گئے۔ کچھ ہی دِنوں بعد بھیشم جی بمبئی چھوڑ کر انبالہ چلے آئے وہاں ایک کالج میں ملازمت کرلی اور ۱۹۵۰ء میں دِلّی کے دِلّی کالج میں جو اب ذاکر حسین کالج کے نام سے جانا جاتا ہے، انگریزی پڑھانے لگے۔ ۱۹۵۷ء میں حکومت روس کی جانب سے وہ روس میں مترجم مقرّر ہوئے اور ۱۹۶۳ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔ وہاں انھوں نے بے شمار روسی کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ ہندوستان واپس آنے پر ظ۔ انصاری، مدیر "شاہراہ" کے اصرار پر بھیشم جی نے اپنے افسانوں کا اُردو میں ترجمہ کیا جو "شاہراہ" میں شائع ہوئے۔ ۱۹۶۵ء سے ۱۹۶۷ء تک ہندی ادب کے معیاری رسالے "نئی کہانیاں" کے مُدیر رہے۔ ۱۹۸۰ء میں کالج کی نوکری کو خیر آباد کہا اور تخلیقی کاموں میں سرگرم ہو گئے۔ سعید مرزا کی فلم "موہن جوشی حاضر ہو" اور اپنے ناول ٹی۔وی سیریل "تمس" ("تمس" پر ۱۹۷۶ء میں انھیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملا) میں اداکاری کے جوہر بھی دکھا چکے ہیں۔

زندگی کے ۷۵ سال مکمّل کرنے پر بھیشم ساہنی کہتے ہیں "میں زندگی کے سفر

ڈاکٹر بھیشم ساہنی

میں گرتا پڑتا بہت سی منزلیں پار کر کے ۷۵ سال کی عمر کو پہنچا ہوں مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں نے زندگی کو سمجھ لیا ہے۔ یا زندگی کی کوئی سچائی میرے ہاتھ لگ گئی ہے، یا زندگی پر میری پکڑ زیادہ مضبوط ہو گئی ہے، یا میں نے زندگی کو جینے کا کوئی صحیح راستہ ڈھونڈ نکالا ہے۔ ۷۵ کا ہو گیا ہوں کچھ بڑھیا لکھ جاؤں گا —— ایسا بھی نہیں ہے۔ بڑھیا لکھنے کے لیے کوئی عمر نہیں ہوتی —— مُصنّف کا المیہ یہ ہے کہ اپنی تخلیق وہ پھاڑ کر پھینک بھی نہیں سکتا۔"

بھیشم جی سے جب میں نے پوچھا کہ آپ نے اُردو میں کبھی کچھ نہیں لکھا ایسا کیوں؟ تو مسکرا کر بولے "خط و کتابت تو اُردو میں ہی کی ہے خاص طور سے والد اور بڑے بھائی کے ساتھ صرف اُردو میں ہی خط و کتابت رہی ہے۔"

بھیشم ساہنی نے یوں تو افسانہ، ناول، ڈراما (شروع شروع میں شاعری بھی کی تھی) غرض کہ ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے اور ہر جگہ اپنے نام کا جھنڈا بھی گاڑا ہے۔ لیکن میرا ان سے جو رشتہ ہے وہ ڈرامے کا ہے۔ ۱۹۷۷ء کے شروع میں جب ایم۔کے۔ رینا نے دِلّی میں ایک تجرباتی تھیٹر گروپ "پریوگ" کی داغ بیل ڈالی تو میں بھی ایک چھوٹے کارکن کی حیثیت سے اس میں بھرتی ہو گیا۔ کچھ دن بعد جب یہ گروپ خوب سرگرم ہو گیا تو بھیشم جی کو اس کا صدر اور مجھے خزانچی چُنا گیا۔ یہ دونوں عہدے پچھلے ۱۳ سال سے ہم دونوں کے پاس ہی ہیں جب کہ باقی عہدوں میں خاصی تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔

۱۹۸۰ء میں بھیشم جی نے کبیر کی زندگی پر ایک ڈراما لکھا "کبیرا کھڑا بجار میں" پریوگ نے طے کیا کہ اگر اسے پُوربیا زبان میں کیا جائے تو ڈراما با اثر ہوگا چوں کہ گروپ میں میں ہی ایک پوربیا تھا اس لیے یہ ذمّہ داری مجھے دی گئی۔ بعد میں "پریوگ" نے اس ڈرامے کے ۱۳۰ شو کیے جو دِلّی میں ایک ریکارڈ بنا۔ میں نے اس ڈرامے میں کبیر کے ساتھی قمرالدین جولاہے کا رول کیا۔ "پریوگ" نے ہانش اور مادھوی کو بھی کامیابی کے ساتھ اسٹیج کیا۔

بھیشم جی کی کہانی "چیف کی دعوت" کو ایم۔کے۔ رینا نے ٹیلی ویژن پر تقریباً دس سال قبل پیش کیا تھا جسے "باس کی دعوت" کے نام سے کئی بار دکھایا جا چکا ہے۔ میں نے اس میں بھی رول کیا تھا۔ بھیشم جی کے ڈراموں کی خوبی یہ ہے کہ بہت سادہ زبان میں وہ گہری بات کہہ جاتے ہیں جس کا دیر تک دل پر اثر رہتا ہے۔

پریم چند یہ مانتے تھے کہ جس ادب کا سماج سے سروکار نہیں ـــــ وہ ادب نہیں ہے۔ بھیشم جی کی تمام تخلیقات سماج سے جڑی ہوتی ہیں۔ وہ ہندی ادب کے ان چند مُصنّفین میں سے ایک ہیں جو صحیح معنوں میں سیکولر ہیں اور اہم بات یہ ہے کہ وہ اپنی تخلیق میں سیکولرازم اور کمیونزم کا ڈھول بھی نہیں پیٹتے۔ ہندی میں فرقہ واریت اور تقسیم ملک جیسے موضوع پر بھیشم ساہنی کا قلم اتنا ہی سرگرم رہا ہے جتنا اُردو میں منٹو کا۔ یہ اور بات ہے کہ جو غم و غصّہ اور تیکھا پن منٹو کے یہاں (ٹوبا ٹیک سنگھ) دکھائی دیتا ہے وہ غصہ بھیشم جی کے یہاں (تمس) نہیں ہے۔ بھیشم ساہنی اپنی تمام کہانیوں، ناولوں اور ڈراموں میں سیدھے عوام سے مخاطب ہیں۔ کاش کہ بھیشم جی نے افسانے کے بجائے ڈرامے کو اپنے ادبی سفر کا محور بنایا ہوتا تو آج وہ موہن راکیش، بادل سرکار، وجے تیندولکر، جیسے بڑے ڈرامانگاروں کی صف میں سب سے آگے ہوتے۔

علی محمود

شیطان

پتھر کا بنا ایک مکان جس میں ایک ہی دروازہ تھا۔ وہ بھی پتھر کا۔ مکان قیمتی ہیرے جواہرات سے بھرا ہوا تھا۔ باہر ہزاروں کی تعداد میں لوگ جمع تھے۔

"دروازہ مت کھولو۔ ورنہ تمھارے بزرگوں کی ساری محنتیں بیکار جائیں گی —"
مذہبی کتابیں انھیں ہدایت — دے رہی تھیں۔

انھوں نے نہیں مانا۔ کیوں کہ ترقی یافتہ دور کے لوگ تھے۔ زمانے کے ساتھ چلنے والے۔ دروازہ کھولنے کی انھوں نے بہت کوششیں کیں مگر کامیاب نہیں ہوئے۔

ایک شخص کافی دیر سے ان کی زور آزمائی دیکھ رہا تھا۔ سب تھک ہار گئے تو وہ آگے بڑھ کر بولا:

"ایک شرط پر میں دروازہ کھول سکتا ہوں۔"

"ہمیں آپ کی ساری شرطیں منظور ہیں۔" لوگ بیک وقت بولے۔

"دروازہ کھولوں گا۔ اور سب سے پہلے میں داخل ہوں گا۔ میرے نکلنے پر آپ لوگ اندر جاسکتے ہیں۔"

"منظور ہے" سب نے کہا۔

"دروازہ کھلا تو تم تباہ و برباد ہوجاؤ گے۔" مذہبی کتابیں لوگوں کو نصیحت کر رہی تھیں۔

لوگوں نے توجہ نہیں دی۔ وہ آگے بڑھا۔ قریب پہنچا۔ غور سے دروازے کو گھورا۔ اپنے سر کا مغز نکال کر دروازے پر دے مارا۔ دوسرے ہی لمحے دروازہ خود بخود کھل گیا۔

"قابل آدمی معلوم ہوتا ہے۔ شاید اس دور کا نجات دہندہ ہے۔" سب نے اس کی تعریف کی۔

وہ اندر داخل ہوا۔ پورے کمرے کا جائزہ لیا۔ اس کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ اس نے خزانے کو گھور کر دیکھا اور اپنے سر کا مغز نکال کر اس پر پھیلا دیا۔ عجیب سنسناہٹ کی سی آواز آئی۔ چند لمحے بعد مغز سمیٹ کر اپنے سر میں فٹ کرلیا اور بڑی شان سے جھومتا ہوا باہر آیا۔

"اب تم لوگ اندر جاسکتے ہو۔" اس نے کہا۔

سبھی آگے بڑھے۔ خوشی خوشی اندر دا[خل] ہوئے اور کمرے کا جائزہ لیا۔ یکایک — حیرت زدہ ہوگئے۔ ان میں کھلبلی مچ گئی افرا تفری کا سا عالم پیدا ہوگیا۔ یہ سب کیسے ہوا؟ کیوں کر ہوا؟ کئی طرح کے خیالات ان کے دماغ میں پیدا ہوئے۔

انھیں اب اس شخص کی تلاش تھی۔ جو ان کا راہبر تھا اور سب سے پہلے مکان میں داخل ہوا۔ مگر اس کا کہیں پتا نہیں تھا۔ گویا ہوا میں تحلیل ہوگیا تھا۔

مذہبی کتابوں کے حروف اب تک باقی تھے۔ مٹے نہیں تھے اور لوگوں کو نصیحت کر رہے تھے — "تم بھی ہوا میں تحلیل ہو جاؤ گے۔ شیطان سے بچو!"

اس شخص نے مکان کے سارے خزا[نے] کو کوئلے میں تبدیل کر دیا تھا۔

۱۰۱/۲۵، ویسٹ ریلوے کالونی، تاردیو، بمبئی ۴۰۰۰۳۴

بقیہ: ناطق گلاؤٹھوی

۳۔ کلیل میں غلیل، ناطق گلاؤٹھوی، ۱۹۵۱ء۔
۴۔ مخطوطہ خود نوشت، ناطق گلاؤٹھوی، غیر مطبوعہ۔
۵۔ ماہنامہ "نگار" لکھنؤ، مدیر نیاز فتحپوری، سالنامہ جنوری فروری ۱۹۴۱ء
۶۔ ماہنامہ "صبح امید" بمبئی، مدیر عبدالحمید بوبیرے، سلور جوبلی نمبر فروری ۱۹۶۰ء
۷۔ مجلہ "زرنگار" ناگپور، مرتب پروفیسر سید یونس، دسمبر ۱۹۷۵ء
۸۔ مضمون "کیا عورتوں کو شاعری کرنا چاہیے" مضمون نگار ناطق گلاؤٹھوی، غیر مطبوعہ۔

نئی مطبوعات

ذہن جدید (سہ ماہی)
ترتیب : زبیر رضوی
صفحات : ۲۰۶
قیمت : ۲۰ روپے
پتا: پوسٹ بکس نمبر ۷۰۴۲، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

زبیر رضوی اُردو کے ان بیدار ذہن ادیبوں کی صف سے تعلق رکھتے ہیں جو ایک زمانے میں ترقی پسند تحریک کے بڑے سرگرم رکن تھے اور بعد میں اس سے منحرف ہو کر جدیدیت کی تحریک سے جڑ گئے۔ ایسے دوسرے ادیبوں میں خلیل الرحمان اعظمی، وارث علوی، بلراج کومل اور عمیق حنفی کا نام لیا جا سکتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ ترقی پسند تحریک کی مخالفت میں بھی یہ اتنے ہی شدت پسند ٹھہرے جتنے کہ اس کی حمایت میں تھے۔ لیکن جہاں تک جدیدیت کا تعلق ہے انھوں نے "شبخونی" انتہا پسندی کے دستور کو قبول کرنے کے بجائے اعتدال کا راستہ اختیار کیا اور کم از کم تخلیقی سطح پر ترقی پسند فکر کے توانا اثرات و عناصر کو رد نہیں کیا۔

"ذہن جدید" کے صفحات بھی اسی صورت حال کی غمازی کرتے ہیں۔ اس کی نگارشات میں اگر ایک طرف ممتاز مفتی، سریندر پرکاش، محمد علوی اور مخمور سعیدی کی کاوشیں شامل ہیں تو دوسری طرف فیض احمد فیض، انور عظیم، جیلانی بانو، عبداللہ حسین اور وحید اختر کے نام نمایاں ہیں۔ جن کا جدیدیت یا سکہ بند جدیدیت سے کوئی علاقہ نہیں۔ جو ترقی پسند روایت سے وابستہ ہونے کے باوجود اپنی الگ الگ شناخت رکھتے ہیں۔

اس شمارے کا ایک حصہ فلسطینی ادیبوں کے مدافعتی ادب (ترجمہ) کے لیے مخصوص ہے جسے جدید اصطلاح میں ادب انتفاضہ کہا جاتا ہے اس حصے میں شامل دو کہانیوں اور دو نظموں میں وطن پرستی اور صیہونی ظلم و تشدد کے خلاف بغاوت اور سرکشی کے وہی جذبات اور فنی اظہار کا وہی سادہ و راست پیرایہ ہے جو ترقی پسند ادبی روایت کا ایک حصہ رہا ہے۔

اس سے قطع نظر "ذہن جدید" آج کی ادبی صحافت میں ایک اہم کمی کی تلافی کرتا ہے۔ اس نے ہم عصر ادب کے مسائل پر غور و فکر اور بحث کے دروازے کھولے ہیں۔ اس نے اُردو کے سنجیدہ قارئین کو اُردو کی محدود دنیا سے باہر، دوسری زبانوں کے ہم عصر ادبی رجحانات اور دوسرے فنون خصوصاً مصوری تھیٹر اور فلم کی دنیا میں ہونے والے تجربات سے روشناس کرانے کی روایت کو زندہ کیا ہے۔ ترقی پسند ادبی پرچوں نے ایک زمانے میں یہ کام وسیع پیمانے پر انجام دیا تھا جس کا دیرپا اثر ہمارے ذہنی اور تخلیقی رویوں پر پڑا تھا۔

ایسے پرچوں کے پیچھے اکثر ایک خود آگاہ اور متحرک شخصیت ہوتی ہے جو قارئین کے ذوق اور ذہن کو ایک خاص سمت دینا چاہتی ہے اور اس کے لیے ایک دیوانگی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس پرچے کی کم و بیش ایک چوتھائی تحریریں زبیر رضوی کی قلمی کاوش کا نتیجہ ہیں۔ بعض اہم ادیبوں کے تعارف نامے لکھے۔ ممتاز مفتی، وشنو پربھاکر، قرۃ العین حیدر، منو پارکھ اور تا شنگیشکر جیسے نامور فنکاروں سے دلچسپ اور معلوماتی انٹرویو لیے۔ پھر ان کا کالم "کتابوں کی باتیں" جہاں انھوں نے نہ صرف اُردو کی بلکہ انگریزی کی بعض اہم کتابوں کا بھی تعارف کرایا ہے۔

بحث میں بلراج کومل، شمس الرحمان فاروقی، وحید اختر اور راقم الحروف کی تحریریں شامل ہیں۔ بلراج کومل اور فاروقی صاحب کے نوشتے خاصے اشتعال خیز اور جذباتی ہیں۔ ان کا ہدف ترقی پسندی ہے۔ اعتراضات فرسودہ ہیں۔ فاروقی صاحب کا دعویٰ ہے کہ "آج پورے اُردو ادب میں کوئی ترقی پسند شاعر نہیں۔ کوئی ترقی پسند افسانہ نگار نہیں، کوئی ترقی پسند ڈراما نگار نہیں۔" فاروقی صاحب کی تسلی کے لیے اگر ان کے اس مضحکہ خیز جذباتی دعوے کو مان لیا جائے تو ایک چھوٹا سا سوال ان سے ضرور ہوگا کہ بیسویں صدی میں نہ صرف اُردو میں بلکہ برصغیر کی تمام زبانوں میں شعری اور افسانوی ادب کا جو عظیم سرمایہ وجود میں آیا ہے اس کا بڑا حصہ اگر ترقی پسند ادیبوں کی دین نہیں تو کس کی دین ہے؟ انھیں غصہ دراصل اس پر ہے کہ بیس سال پہلے "شبخونی" جدیدیت کے زیر اثر جو ادب پیدا ہوا تھا اس کا نام لیوا

آج کوئی نہیں ہے اور نوجوان پیڑھی کے بیشتر قلمکار جدیدیت کی تنگ و تاریک گلی میں مڑنے کے بجائے ترقی پسند ادبی روایت سے جڑ گئے ہیں۔

باقر مہدی کا مضمون "ترقی پسندی اور جدیدیت کی کشمکش" معلوماتی لیکن ہمیشہ کی طرح حوالوں سے معمور اور ریڈیکل ہے۔ مضمون میں انھوں نے ہربرٹ مارکوز، لوکاچ، التھوز اور بعض دوسرے مارکسی مفکرین کے حوالے سے مارکسی جمالیات کے مسائل پر روشنی ڈالی ہے اور آخر میں نتیجہ یہ نکالا ہے کہ ـــــ "میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ سیاست اور ادب کا گہرا ساتھ ہے اس کے لیے کسی پارٹی کا ممبر کسی منشور کی پیروی اور کسی تحریک کا علم لے کے چلنے کی ضرورت نہیں"۔

شکر ہے کہ سریندر پرکاش اب علامتی کہانی کی بھول بھلیوں سے باہر نکل آئے ہیں۔ ان کی کہانی "حاضر حال جاری" میں تیرو نشتر کی کیفیت ہے۔ انسانی قدروں کی پامالی اب صرف شہروں کی فصیل تک محدود نہیں یہ سیل بلا گاؤں تک پہنچ گیا ہے۔ اس موضوع پر یہ کہانی نہ صرف اس شمارے کی بلکہ اس دہے کی بہترین تخلیقات میں شمار ہوگی۔ "جوس کا گلاس" میں دلیپ سنگھ کا خالص مزاج تیکھے سیاسی طنز میں ڈھل گیا ہے قرۃ العین حیدر نے اپنی تصنیفی زندگی اور محرکات کے بارے میں کچھ بڑی دلچسپ اور اہم باتیں کہی ہیں مثلاً یہی کہ "میں لکھتی اس لیے ہوں کہ میں کچھ کہنا چاہتی ہوں"۔ خوف ہے کہ اب وہ جدیدیوں کی زیادہ معتوب ہوں گی اس لیے کہ کچھ کہنے کے لیے لکھنا ان کی شریعت میں جرم ہے۔

الغرض "ذہن جدید" کا یہ شمارہ اپنے مباحث اور نوبہ نو دلچسپ مضامین کے لحاظ سے سنجیدہ قارئین کو مطالعے کی دعوت دیتا ہے۔ امید ہے کہ آئندہ شمارے کتابت کی غلطیوں سے پاک ہوں گے۔

ـــــ (ڈاکٹر) قمر رئیس

فکر و آگہی (رفعت سروش نمبر)

ایڈیٹر: ڈاکٹر رضیہ حامد
صفحات: ۳۸۷
قیمت: ۱۰۰ روپے
ملنے کا پتا: باب العلم پبلیکیشنز، ایچ-۶۵ جی سیکٹر ۲۲، نوئیڈا ۲۰۱۳۰۱۔

زندہ شخصیات پر کام کرنا بڑے جوکھم کا کام ہے وہ فنکار جو اپنی تمام خوبیوں اور خرابیوں کے ساتھ ہمارے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے اس کی زندگی اور فن کو تجزیے کی چھلنی میں چھان کر پیش کرنا اور اس کے فن پاروں کی چھان پھٹک کرنا اس لیے مشکل ہے کہ اگر آپ نے تعریف کر دی تو آپ پر دوست نوازی کا الزام عائد ہوگا اور اگر خرابیاں اجاگر کر دیں تو یار کی یاری سے بھی گئے۔ اسی لیے لوگ اپنے ہم عصروں پر رائے دیتے ہوئے کتراتے ہیں اور رسالے کے ایڈیٹر بھی زیادہ تر ایسے ادیبوں کے نمبر نکالتے ہیں جو اپنی زندگی کا حساب کتاب صاف کر کے دنیا سے منہ موڑ چکے ہیں لیکن ادھر کچھ دنوں سے کچھ خود اعتماد ایڈیٹروں نے اپنی روش بدلی ہے اور کچھ شخصیات نمبر شائع ہو کر قبول عام کی سند حاصل کر چکے ہیں۔ "فکر و آگہی" کا 'رفعت سروش نمبر' ڈاکٹر رضیہ حامد کا ایک ایسا ہی کارنامہ ہے جس میں انھوں نے ۶۰-۶۵ ایسے ناقدین اور دانشوروں کو یکجا کر دیا ہے جو مختلف مکاتیب فکر کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اور ان سب نے اپنے اپنے زاویے سے رفعت سروش کے فکر و فن پر روشنی ڈالی ہے۔ ان مضامین میں کہیں تیکھا تنقیدی لہجہ بھی ہے جنھیں ایڈیٹر نے شائع کر کے اپنی فراخ دلی کا ثبوت دیا ہے۔

اس مختصر سے تبصرے میں یہ تو گنجائش نہیں کہ ۳۸۷ صفحات پر مشتمل نمبر کے ہر مضمون کے بارے میں کچھ کہا جاتے۔ رفعت سروش نمبر ۴ ابواب پر مشتمل ہے: شخصیت، شاعری، منظوم ڈرامے اور نثر۔ شخصیت کے باب میں ۳۲ صفحوں پر رفعت صاحب کی مختلف تصویریں ہیں اور عطیہ سلطان کا لکھا ہوا بھرپور سوانحی خاکہ جس سے واضح ہوتا ہے کہ رفعت سروش کی زندگی کن کن مراحل سے گزری ہے۔ اور 'چھپر کے گھر' سے 'آکاش وانی بھون' تک ان کے سفر کی روداد کیا ہے۔ انور عنایت اللہ، سید شہاب الدین دسنوی، جوگندر پال، مجتبیٰ حسین اور نور جہاں ثروت کے مضامین خاص طور سے رفعت سروش کی زندگی کے بہت سے گوشے اجاگر کرتے ہیں۔ اور ان کی بیٹی شبانہ نذیر کا مضمون تو بہت ہی اثر انگیز ہے۔

رفعت سروش کے بارے میں یہ تو سب جانتے ہیں کہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے لیکن ان کے یہاں جو اعتدال پسندی ہے اور اپنے دور کے غالب رجحانات اور

ا محرکات کو ذہن و فکر میں جذب کر کے
رکے پیکر میں ڈھالنے کا جو فن ہے اس
ندازہ اس نمبر کے جن مضامین کو پڑھ کر
ا جاسکتا ہے ان میں خصوصیت سے قابل
آنند نرائن ملّا، پروفیسر شکیل الرحمٰن، پروفیسر
یس، علی جواد زیدی، ڈاکٹر خلیق انجم، بلراج
ں، مخمور سعیدی، ڈاکٹر بشیر بدر، پروفیسر
ری کاشمیری اور ڈاکٹر شارب ردولوی کے
ین ہیں۔

رفعت سروش کے ناقدین نے بجا طور
ں امر کا اعتراف کیا ہے کہ انھیں ادب
وہ مقام نہیں ملا جس کے وہ مستحق تھے اور
نہاد ترقی پسند تنقید نگاروں کی گروہ بندی
سں کی وجہ قرار دیا ہے جو ایک حد تک
ہے۔

منظوم ڈراما رفعت سروش کی پہچان
رر رسالے کے اس باب میں ان کے منظوم
ں وپیرا اور ڈانس ڈراموں پر کھل کر
خیال کیا گیا ہے۔ 'جہاں آرا' پر پروفیسر
چند نارنگ کا مقالہ ایک کامیاب مقالہ
علی سردار جعفری کا مختصر مگر جامع
ن 'ساون بھادوں' رفعت صاحب کے
ج تحسین ہے۔ ابراہیم یوسف بلا شبہ
کے ایک مستند ناقد ہیں۔ انھوں نے
ں سروش کی ڈراما نگاری کے محاسن
دل سے اعتراف کیا ہے۔ پروفیسر
یدی اور نظام صدیقی کے مضامین ایک
ے کو کاٹتی ہوئی لکیروں کی طرح ہیں یہ
مقالے خصوصی دعوت مطالعہ دیتے ہیں۔
امی، پروفیسر قاضی عبدالستار پروفیسر
ا اور قیصر قلندر کے مضامین رفعت
سروش کے فن کو سمجھنے میں معاون ہیں۔

حصۂ نثر میں مالک رام، پروفیسر مسعود
حسین، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، پروفیسر تنویر احمد
علوی، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، ظفر پیامی اور
م۔م۔ راجندر اور دیگر اہم قلم نے رفعت
سروش کی نثر کا جائزہ لیا ہے اور انھیں
'صاحب طرز' قرار دیا ہے۔ عشرت کرتپوری نے
ان کی مشہور تصنیف 'بمبئی کی بزم آرائیاں'
کا سیر حاصل تجزیہ کیا ہے۔

"فکر و آگہی" کے اس خصوصی نمبر نے
ایک ایسے ادیب اور شاعر کو مجموعی طور پر پیش
کیا ہے جس کی تخلیقی سرگرمیاں گزشتہ ۵۰
سال سے اہلِ ذوق کو اپنی طرف متوجہ کرتی
رہی ہیں۔

——— سہیل انجم صدیقی (ایڈووکیٹ)
آر۔ ۲۸۴، رمیش پارک، لکشمی نگر، دہلی ۱۱۰۰۹۲

پچھلے موسم کا پھول

شاعر: مظہر امام
صفحات: ۱۲۸
قیمت: ۵۰ روپے
ملنے کا پتا: امیر منزل، قلعہ گھاٹ،
دربھنگا ۸۴۶۰۰۴ (بہار)۔

مظہر امام شاعر بھی ہیں اور نثر نگار بھی۔
نثر میں ان کی تنقیدی نظر اور شگفتہ اسلوب
اور شاعری میں ان کا منفرد لب و لہجہ ان کی
انفرادیت کی شناخت ہیں۔ شاعری میں انھوں
نے نظموں اور غزلوں دونوں پر طبع آزمائی کی ہے
اور وہ اہل سخن سے اپنا خراج بھی حاصل کر چکی ہیں۔
اس وقت ان کا مجموعۂ کلام "پچھلے موسم کا پھول"
میرے سامنے ہے۔ اس مجموعے کو پڑھتے وقت
اس بات کو ذہن میں رکھیے کہ یہ ان کے قیام
کشمیر کے زمانے کا کلام ہے۔ اب اس کے
بعد مجموعے کے نام کی وضاحت کی ضرورت
نہیں رہے گی۔ اس مجموعے میں تمام تر غزلیں ہیں
اور ان غزلوں میں کشمیر کی رومانی فضا کی خوشبو
رچی بسی ہوئی ہے اور یہ جمالیاتی احساس جب
ان کے ذاتی تجربات سے ہم آہنگ ہوتا ہے تو
اس کے نتیجے میں ایک طرف لطف بیان پیدا
ہوتا ہے اور دوسری طرف حسّاس دلوں کی
دھڑکنوں سے ان کا رشتہ مل جاتا ہے۔ زمانے
کے بدلتے ہوئے رنگ کو کس طرح شاعر نے
شعری جمالیات سے ہم آہنگ کر دیا ہے:

سفر میں اچانک سبھی رُک گئے
عجب موڑ اپنی کہانی میں تھا

'سفر' 'موڑ' 'کہانی' ان الفاظ پر جتنا غور کریں،
معانی کی تہیں کھلتی چلی جائیں گی اور شعر کا دائرہ
وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جائے گا۔

یہ کہانی کا وہی موڑ ہے جب عشق و محبت
اور ندرتِ ادا کا شاعر اچانک اپنے عہد کے کرب
کو محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس سفر میں کن منزلوں
سے گزرنا پڑتا ہے اس کے لیے ہندوستان کی
تاریخ کا پس منظر دیکھنا ہوگا اور دورِ حاضر کا
جائزہ لینا ہوگا:

اس نے کس ناز سے بخشی ہے مجھے جائے پناہ
یوں کہ دیوار سلامت ہو، مگر گھر نہ رہے

پیاسے تھے تو پانی کو پکارا تھا ہمیں نے
ندی ادھر آئی ہے تو گھر لے کے گئی ہے
بے بال و پری اب بھی سرِ دشت ہے محفوظ
آندھی تو فقط برگ و ثمر لے کے گئی ہے

تیسرے شعر میں "بے بال و پری" کے محفوظ ہونے
پر اطمینان کا اظہار اسی کرب کی طرف اشارہ
کرتا ہے جب غالب نے رہزن کو دعا دی تھی کہ
" رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو"
یہی سبب ہے کہ ان حالات سے متاثر ہو کر مظہر
امام کے یہاں کبھی کبھی ایک ذہنی کشمکش کی کیفیت
پیدا ہو جاتی ہے :

وہ بے جہت کا سفر تھا، سوادِ شام نہ صبح
کہاں پہ رکتے، کہاں یادِ رفتگاں کرتے

مگر خوش آیند بات یہ ہے کہ مظہر امام نامساعد
حالات میں بھی رجائیت کا دامن ہاتھ سے نہیں
چھوڑتے :

قافلے شہر و صحرا بھٹکتے ہوئے
اک ستارہ سرِراہ جلتا ہوا

اگر "ستارہ سرِراہ" چمک رہا ہے تو قافلوں کو منزل
ضرور ملے گی۔ بس ستارے پر نظر رہے۔

یوں تو غزل کے مزاج میں بہت وسعت
ہے۔ زندگی کا ہر مسئلہ اس کا موضوعِ سخن ہے۔
مگر اس کا خمیر چوں کہ عشق سے تیار ہوا ہے
اس لیے جب غزل کی بات آتی ہے تو داستانِ
محبت سننے کو جی چاہتا ہے۔ مظہر امام اس میدان
میں بھی اجنبی نہیں ہیں۔ یہ کلاسکی روایت کا
عطیہ ہے اور کشمیر کی حسین فضاؤں نے اس
میں رنگینی بھری ہے۔

ابھی نگاہ جھکی نہ تھی کہ میں نے ہونٹ رکھ دیے
سوال وہ نہ کر سکا مگر جواب لے گیا

مظہر امام کی غزلوں میں مجھے ندرتِ ادا نے متاثر
کیا ہے۔ ندرتِ بیان کا شوق کبھی رسوائی کا سبب
بن جاتا ہے اور کبھی شاعر کی شناخت کا ذریعہ
بھی۔ ان اشعار کو پڑھ کر فیصلہ اہلِ سخن پر چھوڑتا
ہوں۔

کرم تھے مجھ پہ کچھ اتنے، میں سوچتا کیسے
کہ دوسروں پہ بھی وہ مہربان کتنا تھا!

بیچ میں کچھ تو رہ و رسمِ تکلف رکھو
اجنبی یوں نہیں ملتے ہیں شناسا کی طرح

نہ جانے دل پہ کیا گزری، مگر باہر نہیں بدلا
تمھارے بعد بھی اس شہر کا منظر نہیں بدلا

مظہر امام کے یہاں زبان و بیان کا لطف اٹھانا ہے
تو یہ اشعار پڑھیے :

اٹھو کہ اب تو صبح ہوتے دیر ہو گئی
وہ داستانِ درد سنا کر، سنو، گیا

تم کو تو پتا ہوگا کہ ہمراہ تمھیں تھے
دنیا مرے خوابوں کو کدھر لے کے گئی ہے

میں نے جب حالِ تمنا پوچھا
دل نے چپکے سے کہا "رہنے دو"

خود فریبی کا یہ انداز بھی خوب ہے :

نہ رکتا وہ، مگر ٹھٹکا تو ہوتا
یقیناً اس نے پہچانا نہ ہوگا

میں اکثر سوچتا ہوں کہ اتنے خوبصورت
اشعار کہنے والا شاعر آزاد غزل کے سرابوں
میں کیا تلاش کرنے جاتا ہے۔

—— ظہیر احمد صدیقی
شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی ۱۱۰۰۰۷

تلوک چند محروم

مؤلف : رام لعل رام نابھوی
صفحات : ۷۶
قیمت : ۵ روپے

ناشر : ساہتیہ اکادمی —— ہیڈ آفس :
(ا) رویندر بھون، ۳۵ - فیروز شاہ روڈ،
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱ -
(ب) سیلز آفس : سواتی، مندر مارگ،
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱ -
(ج) علاقائی دفاتر :
(۱) بلاک V - بی، اوپیندر سرو ور،
اسٹیڈیم، کلکتہ ۷۰۰۰۲۹ -
(۲) بمبئی، مراٹھی گرانتھ سنگھرالیہ مارگ،
دادر، بمبئی ۴۰۰۰۱۴ -
(۳) ۲۹ - ایلڈرس روڈ، تینام پیٹھ،
مدراس ۶۰۰۰۱۸ -

اس کتاب میں ۲۲ عنوانات کے تحت
جناب محروم کی ۷۹ سالہ زندگی کے حالات اور
علمی و ادبی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان
کی شخصیت اور فن پر ہندوستان کے مشہور
نقادوں اور بلند پایہ شاعروں نے تعریف میں
اتنا کچھ لکھا ہے کہ مزید گنجائش ہی نہیں رہی۔ اس
پر محروم صاحب کے فرزند پروفیسر جگن ناتھ آزاد
نے تو کمال کر دیا۔ کوئی کسر ہی باقی نہیں چھوڑی۔ ایسے
عالم میں جناب رام لعل نابھوی نے ترتیب و تالیف
کے لیے قلم اٹھایا ہے۔ اس مختصر سی کتاب میں
جو "ہندوستانی ادب کے معمار" کے سلسلے کی
ایک کڑی ہے، رام لعل نابھوی صاحب نے گاگر
میں ساگر بند کر کے رکھ دیا ہے۔

محروم کسی کے شاگرد نہ تھے۔ ملازمت
کے دوران میں مختلف اصنافِ سخن میں (غزل، نظم،
رباعی، بچوں کی نظمیں، ترجمہ) جولانیِ طبع کے
جوہر دکھاتے رہے۔ خود اعتمادی کی بدولت
مشقِ سخن سے اپنا مقام حاصل کیا۔ کلام "زمانہ"
"کان پور" اور "مخزن" لاہور جیسے مقتدر رسائل

ترام کے ساتھ شائع ہوتا تھا۔ خودنمائی،
، شہرت اور نقص چینی سے انھیں سخت نفرت تھی۔
وہ ہندوستانیت کے دل دادہ تھے۔
سوز، غم، یاس، الم پسندی اُن کے خاص موضوع
اشعار کی جو مثالیں درج کی گئی ہیں۔ قابلِ
یں اور پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔

آخری مضمون میں جو ضمیمے کے طور پر قلم کے
، کیا گیا ہے مرحوم کی تصنیفات و تالیفات کی
ت دی گئی ہے جس سے اس حقیقت کا ثبوت
وتا ہے کہ مرتّب نے خوب مطالعہ کرکے بڑی محنت
تاب مرتّب کی ہے۔ جو مختصر ہونے کے باوجود
ہے ... ہاں، منتخب کلام صرف سات صفحوں
یا گیا ہے۔ اکادمی سے درخواست ہے کہ
رے ایڈیشن کے لیے مزید کلام کا اضافہ
ے موجودہ انتخاب کچھ کم ہی ہے۔

ساہتیہ اکادمی ہمارے دلی شکریے کی مستحق
ایسی کتاب کی قیمت صرف ۵ روپے رکھی گئی
جو ہر قسم کے ظاہری اور معنوی محاسن سے
ال ہے۔ صاف عیاں ہے کہ اس ادارے کو
کی بے غرض خدمت مقصود ہے۔ زرکشی
ب نہیں۔

—— امر چند قیس جالندھری

ے پروفیسر ایم۔ پی۔ چاند، ڈی۔ ۸۱، یونیورسٹی
ں، کوروکشیتر، ہریانہ ۱۳۲۱۱۹۔

امہ جمیل مظہری
ات اور نثری تخلیقات کا مطالعہ

مف: ڈاکٹر فضیل احمد
ت: ۸۰ روپے
شر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولا
لیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

علّامہ جمیل مظہری اُردو شاعری کا ایک اہم نام ہے۔ بالعموم لوگ انھیں ایک شاعر کی حیثیت سے ہی جانتے ہیں۔ اور ان کا یہ شعر بھی زبان زد ہے:

بقدرِ پیمانۂ تخیّل سرور ہر سر میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریبِ پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

لیکن جمیل مظہری کی ادبی شخصیت کی تکمیل ان کی نثری تخلیقات کے بغیر نہیں ہوسکتی۔ یہ مقام مسرت ہے کہ زیرِ تبصرہ کتاب ان کی نثری تخلیقات کے مطالعے کے لیے مختص ہے۔

کتاب بنیادی طور پر تین ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اوّل 'زندگی کا مطالعہ' باب دوم 'مختلف کارکردگیاں، مختلف مشاغل اور باب سوم 'نثری تخلیقات کا مطالعہ۔ ان ابواب میں ضمنی عنوانات کے تحت دیگر ادبی اور شخصی پہلوؤں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں دو رائے نہیں ہوسکتی کہ مصنّف نے محنت سے جمیل مظہری سے متعلق حقائق کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ دیگر بات ہے کہ کہیں کہیں تجزیے میں گہرائی کی کمی نظر آتی ہے اور اکثر مقامات پر تکرار کی صورت بھی۔

جمیل مظہری نے افسانے بھی لکھے اور طنزیہ، مزاحیہ، فکاہیہ مضامین بھی۔ سیاسی، ادبی، تاریخی نوعیت کے علمی مقالے بھی لکھے اور ایک ناولٹ "شکست وفتح" بھی اور بعض تراجم بھی کیے۔ اتنا نثری سرمایہ کسی ادیب کے اسلوب نگارش کے تجزیے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ اس لیے کہ یہ سرمایہ بڑی حد تک متنوع بھی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر فضیل احمد نے بھی اس سرمایے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کی نثر کی خصوصیات کا جائزہ لیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ:

"جمیل کے تمام فکاہیہ کالموں کی زبان میں ایک درمیانی درجے کی نثر کا حسن موجود ہے۔ یعنی نہ اس میں غیر معمولی ادبیت ہے اور نہ غیر معمولی غیر ادبی انداز کی پیشکش ہوتی ہے۔ بلکہ انھوں نے اپنے فکاہیہ کالم کی زبان کے لیے اسی انداز بیان کو اختیار کیا ہے جو اودھ پنچ کے مزاحیہ کالم میں عام طور پر پایا جاتا ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جمیل نے اودھ پنچ کے مزاحیہ کالم کی زبان کے انداز، لب ولہجہ اور روایت کو زیادہ پُر کیف انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔"

کم و بیش اس طرح ڈاکٹر فضیل احمد نے جمیل کے افسانوں کے اسلوب، ان کے تنقیدی اور تحقیقی مقالوں کے اسلوب کا بھی جائزہ لیا ہے۔ لیکن اس جائزے میں اسلوب یا زبان اور بیان پر کم توجہ دی گئی ہے اس کے برعکس ان کے موضوعات سے زیادہ بحث ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک تشنگی کا احساس باقی رہتا ہے کہ آخر اُردو نثر کی تاریخ اور ارتقا میں جمیل مظہری کا کیا مقام ہے۔ اور ان کی نثر کی خصوصیات کیا ہیں؟

پھر بھی یہ کتاب جمیل فہمی میں اس لیے معاون ثابت ہوگی کہ اس میں ان کی نثر نگاری سرسری طور پر ہی سہی پہلی بار سامنے آتی ہے۔

—— ارتضیٰ کریم

فیکلٹی آف آرٹس، شعبۂ اُردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی ۱۱۰۰۰۷۔

اُردو خبر نامہ

لندن میں اُردو

گزشتہ دنوں شعبۂ اُردو بمبئی یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام لندن میں مقیم ماہرِ تعلیم جناب محمد قاسم دلوی نے ایک خطبہ پیش کیا۔ موصوف برطانیہ میں واقع ملٹی کلچرل ڈولپمنٹ سروس لندن بیورو آف والتھم فارسٹ کے نائب صدرِ شعبہ ہیں۔ اُن کے خطبے کا موضوع تھا "____ برطانیہ میں جنوب ایشائی زبانوں کی تدریس اور اُردو کی صورتحال ____"

جناب محمد قاسم دلوی نے اپنے خطبے میں کہا کہ ہمارے ادارے کے اغراض و مقاصد میں جس امر کی حیثیت سب سے نمایاں ہے وہ یہ ہے کہ لندن میں جا کر بسنے والے افراد وہاں کی زبان کو اپنانے کے مرحلے میں کہیں وہاں کی تہذیب میں ضم نہ ہو جائیں۔ دراصل یہ ادارہ ہماری تہذیبی شناخت کو برقرار رکھنے کے لیے وجود میں لایا گیا ہے۔

موصوف نے دیگر ایشائی زبانوں کے مقابلے میں برطانیہ میں اُردو کی مقبولیت کا بھی ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو کی مقبولیت کے لیے بچوّں میں بحث و مباحثے کا ماحول پیدا کیا جاتا ہے۔

بچوّں کی صلاحیت میں اضافے کے لیے ہم تین مدارج سے اُنھیں گزارتے ہیں۔

۱. پڑھنا ۲. بولنا ۳. سُننا

جب تک بچوں میں بولنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی تب تک ہم اُنھیں مصروف رکھتے ہیں۔

ہندوستانی گاؤں کی جھلک

مُسلم ویلفیر سوسائٹی، بھونیشور کا سالانہ جلسہ سوچنا بھون، بھونیشور میں منعقد ہوا۔ جناب پدما نابھ بہرا، نائب وزیر ثقافت و سیاحت و رابطۂ عامہ، حکومت اڑلیسہ، اس جلسے کے مہمانِ خصوصی تھے۔ جلسے کی صدارت سوسائٹی کے صدر جناب محمد سکندر نے کی۔

اسی جلسے میں جناب سید شکیل دسنوی کے دوسرے شعری مجموعے "تنہا تنہا" کا اجرا مہمانِ خصوصی کے دستِ مبارک سے عمل میں آیا۔ موصوف نے کہا کہ شکیل دسنوی جواں جذبات کے شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں ہندوستانی گاؤں کی جھلک پوری آب و تاب کے ساتھ نظر آتی ہے۔ ہندوستانی لب ولہجہ، تشبیہات، استعارے اور تلمیحات اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔ انھوں نے اردو شاعری کو ہندوستان کی دھرتی کی خوشبو سے معطر اور ہندوستانی تہذیب سے مزیّن کر دیا ہے۔

جلسے کے بعد ایک کُل ہند محفلِ شاعرہ منعقد ہوئی۔ مشاعرے کی صدارت جناب شکیل دسنوی نے اور نظامت جناب فرزان سیفی نے کی۔

(محمد عزیز، بھونیشور)

ایک ادیب کی قدر افزائی

نوجوان افسانہ نولیس اور طنز و مزاح نگار جناب منظور وقار کو ان کی نثر نگاری پر غالب کلچرل اکیڈمی نے سروش ایوارڈ سے نوازا ہے جو انھوں نے رائچور میں منعقدہ "جشنِ غالب" کے موقع پر وزیر برائے اوقاف (مہاراشٹر) پروفیسر جاوید خاں کے ہاتھوں حاصل کیا۔

جناب منظور وقار کی نگارشات ملک کے مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ حال ہی میں ان کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ "ہنسنا منع ہے" شائع ہوا ہے۔

(چاند اکبر، گلبرگہ)

بدیع الزماں خاور نہیں رہے

ارضِ کوکن کے مقبول شاعر، معتبر مترجم اور ممتاز نثر نگار جناب بدیع الزماں خاور کا ۲ر ستمبر ۱۹۹۰ء کی صبح حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ

...وایولی، ضلع رتنا گری میں انتقال ہوگیا۔
...موف کی عمر تقریباً پچاس برس تھی پسماندگان
...بیوہ اور دو بیٹے اور ادبی اثاثے کے طور
...مندرجہ ذیل کتابیں چھوڑ گئے ہیں۔

شعری مجموعے :

۱۔ حروف، ۲۔ میرا وطن ہندوستان،
۳۔ بیاض، ۴۔ امرائی، ۵۔ لفظوں کا پیرہن، ۶۔ سات سمندر، ۷۔ ننھی کتاب (بچوں کے لیے) ۸۔ موتی پھول ستارے،
۹۔ سبز و تازہ نہالوں کے انبوہ میں۔

ترجمہ ونثر :

۱۔ خوشبو (مراٹھی نظموں کے تراجم)
۲۔ سبیل (مراٹھی نظموں اور ابھنگوں کے تراجم)
۳۔ دینار (مراٹھی نظموں کے تراجم)
۴۔ مراٹھی رنگ (مراٹھی نظموں کے تراجم)
۵۔ مہاراشٹر کی تہذیبی و ادبی قدریں (مضامین کا مجموعہ)

خاور صاحب کا بیس بائیس سال پہلے دہلی میں بھی قیام رہا تھا اور یہاں ان کے ادبی دوستوں کا ایک حلقہ قائم ہوگیا تھا۔ وہ طبعاً ملنسار واقع ہوئے تھے۔ ان کی شاعری موضوعات کے لحاظ سے متنوع اور زبان و بیان کے اعتبار سے بے عیب ہے۔ علاوہ بریں تراجم کے ذریعے انھوں نے اُردو شعر و ادب میں جو اضافہ کیا وہ یادگار رہے گا۔ ان کی موت ایک ادبی سانحہ ہے۔ ان کی تصنیفی سرگرمیاں ابھی جاری تھیں اور وہ زندہ رہتے تو ابھی اُردو کو اور بھی بہت کچھ دیتے۔ ادارہ ایوانِ اُردو ان کے انتقال پر دلی رنج کا اظہار کرتا ہے اور ان کے پسماندگان کے غم میں شریک ہے۔

سرورق کے اندرونی صفحے کے لیے

موصولہ عنوانات

اکتوبر ۱۹۹۰ء کے "ایوانِ اُردو" کے سرورق کے اندرونی صفحے پر جو تصویر چھاپی گئی تھی اس کے لیے موصول ہونے والے شعری اور نثری عنوانوں میں سے تصویر کی مناسبت سے موزوں سمجھے جانے والے چند عنوان ذیل میں درج کیے جارہے ہیں ــــــ "گلدستہ" ان حضرات کو ارسال کیا جائے گا جن کے بھیجے ہوئے عنوان چوکھٹے میں دیے جارہے ہیں۔

شعری عنوانات

نہ پوچھو کون ہیں کیوں راہ میں ناچار بیٹھے ہیں
مسافر ہیں سفر کرنے کی ہمت ہار بیٹھے ہیں (نامعلوم)

مرسلہ: سیّد محمد فیصل گجراتی،
F.6.11/C 337، بٹلہ ہاؤس، کالونی
نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔

مجھے بلا کے یہاں آپ چھپ گیا کوئی
وہ میہماں ہوں جسے میزباں نہیں ملتا (فانی بدایونی)

مرسلہ: افروز حیدر، معرفت محمد امین انصاری، حاجی گلی، مدھوپور، ضلع دیوگھر ۸۱۵۳۵۳ (بہار)۔

بات کب کی ہے ہمیں یاد نہیں ہے لیکن
ہم بھی رکھتے تھے کبھی چھوٹا سا اک گھر اپنا (نسیم صدیقی)

مرسلہ: شفیق عالم، ۱۶-سی، سر سیّد ہال (نارتھ) اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲ (یو۔پی)۔

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے (غالب)

مرسلہ: عبداللہ عثمانی، دیوبند

زمانے سے گِلہ ہے مجھ کو بے شک
مگر خود سے شکایت کم نہیں ہے (آل احمد سرور)

مرسلہ: محمد حسّان، مظفر پور

یہ سرد رات، یہ آوارگی، یہ نیند کا بوجھ
ہم اپنے شہر میں ہوتے تو گھر چلے جاتے (ناصر کاظمی)

مرسلہ: شکور زیدی، بجنور

چادرِ اوقات کی تنگی نہ پوچھ
پاؤں جب ہم نے چھپایا سر کھلا (کلیم عاجز)

مرسلہ: اے۔ علی، برہانپور

دِل نا امید تو نہیں ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے (فیض)

مرسلہ: عمران خاں، برہانپور

زمیں پر تو سو، آسمان اوڑھ لے
مکاں تجھ کو کتنا کشادہ ملا (منیر سیفی)

مرسلہ: سیّد عبیداللہ، پٹنہ

سو جاتے ہیں فٹ پاتھ پہ اخبار بچھاکر
مزدور کبھی نیند کی گولی نہیں کھاتے (منوّر رانا)

مرسلہ: راشد مرزا، حیدرآباد

زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں (فیض)

مرسلہ: حامد مرزا، حیدرآباد
قیوم احمد، محمود آباد۔

اب اپنی زندگی میں حرارت کہاں سے لائیں
محنت کشوں کے گھر میں تو چولہا بھی سرد ہے (مناظر حسن شاہین)

مرسلہ: جاوید اقبال صدیقی، چاکند

جلا رہی ہے ٹھٹھرتے بدن کو بھوک کی آگ
ہمارے چاروں طرف برف کی ردائیں ہیں (مناظر حسن شاہین)

مرسلہ: ظفر دانش، چاکند

ٹھنڈ کے خوف سے باہر نہیں آتے کچھ لوگ
اور کچھ رات کو سڑکوں پہ رہا کرتے ہیں (شاداب ذکی)

مرسلہ: طلعت بی، بدایوں

بیٹھ جاتے ہیں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے
ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے (حفیظ جونپوری)

مرسلہ: آفتاب احمد خاور، جے پور

زندگی بھر کی اذیت ہے یہ جینا یارب
ایک دو دن کی مصیبت ہو تو کوئی سہہ لے (اختر انصاری)

مرسلہ: سہیلہ خانم، اودی کلاں

کچھ روز یہ بھی رنگ رہا انتظار کا
آنکھ اٹھ گئی جدھر بس اُدھر دیکھتے رہے (اثر لکھنوی)

مرسلہ: گیہان یادو، جے پور

سر پر ہجومِ دردِ غریبی سے ڈالیے
وہ ایک مشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے (نامعلوم)

مرسلہ: برہان احمد، فیضان احمد، اودی کلاں

راہ گم کردہ وجودِ تفرقہ پرداز کے
ہم ہیں محوِ جستجو کھوئے ہوئے ہمراز کے (ناطق گلاوٹھی)

مرسلہ: صبیحہ خانم، اودی کلاں

بس اک چراغ ہے باقی ترے قبیلے کا
جسے فساد کی زد سے بچا لیا میں نے (ناصر بدایونی)

مرسلہ: فرحت قادری، بدایوں

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں (غالب)

مرسلہ: خالد ظفر، بمبئی
نسیم احمد، نئی دہلی

ہو کوئی بھی موسم انھیں فٹ پاتھ پہ رہنا ہے
کیا گھر کی غریبوں کو ضرورت نہیں ہوتی (شاداب ذکی)

مرسلہ: فیروز احمد، بدایوں

چمن کو اس لیے مالی نے خوں سے سینچا تھا
کہ اس کی اپنی نگاہیں بہار کو ترسیں (ساحر لدھیانوی)

مرسلہ: روبینہ، شولاپور

تم انتظار میں بیٹھے ہو کس کے اے رحمت
ادھر سے وہ تو کبھی کا گزر گیا ہے میاں (رحمت امروہوی)

مرسلہ: نرملا سارا، پشپا کنج

وہ وقت جب نہ رہا یہ بھی بیت جائے گا
یہ بات یاد رہے گی کسی سے کچھ نہ ہوا (رحمت امروہوی)

مرسلہ: ڈاکٹر انجنا سدھیر، لکشمی نگر

در و دیوار کی چھت کی رہی حسرت جن کو
نام پر اُن کے کوئی کلبۂ احزاں لکھ دو (اظہر نیّر)

مرسلہ: ابو ذر ہاشمی، بھلائی نگر

معتوب رہا ہوں میں یہاں روزِ ازل سے
ہو جرم کسی کا بھی سزا میرے لیے ہے (اظہر نیّر)

مرسلہ: فرخندہ شاذیہ، بھلائی نگر

اے گردشِ زمانہ بس اب مجھ پہ رحم کر
بیٹھا ہوں تھک کے ٹک ابھی منزل کے سامنے (یحییٰ بھائی)

مرسلہ: کاظم بجنوری، اعظم گڑھ

ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے ہو قسمت کا رونا روتے ہو
منزل چلنے سے ملتی ہے قسمت کھولے سے کھلتی ہے (آل احمد سرور)

مرسلہ: عمیرا جرپوری، مظفر پور

کچھ ان کو طلب گھر کی نہ باہر سے انھیں کام
تکیہ کی نہ خواہش ہے نہ بستر سے انھیں کام (نظیر اکبرآبادی)

مرسلہ: ایم۔ عالم، نوادہ

جن کے ماں باپ نے فٹ پاتھ پہ دم توڑ دیا
ان کے بچوں کو کوئی چھت نہیں ملنے والی (نواز دیوبندی)

مرسلہ: شفیق احمد سیفی، سیوہارہ

جس جگہ شام ہوئی اپنا بسیرا ہے وہیں
ہم سے آواروں کا صیاد نشیمن کیسا (اصغر گونڈوی)

مرسلہ: محمد کامران سیفی، سیوہارہ

بے گھری قسمت ہے اپنی اپنا گھر ہے بھی کہاں
چھوڑنے جائیں جو ہم کو راستے دہلیز پر (ظفر گورکھپوری)

مرسلہ: ماجد مرزا، حیدرآباد

مصروفیت کی بھیڑ میں رشتے بھی کھو گئے
خود آج اپنے آپ سے ہیں اجنبی سے لوگ (نامعلوم)

مرسلہ: فرید بابا، بیڑ

مجھ سے لے جاؤ مرے دل کے دہکتے شعلے
رات ٹھنڈی ہے انھیں بانٹ دو گھر گھر یارو (ظفر گورکھپوری)

مرسلہ: ناہید انجم، بمبئی

مدد اے حسرتِ بے مائیگی اب یہ ارادہ ہے
خرابے میں جلاؤں گا چراغ آرزو برسوں (انور اعظمی)

مرسلہ: ابنِ اصغر، اعظم گڑھ

کوئی پُرسانِ وفا ہے نہ پشیمانِ جفا
زخم ہم اپنے دکھائیں تو دکھائیں کس کو (نامعلوم)

مرسلہ: سید عظیم الحسن، سیوہارہ

میں ہوا کے جھکڑوں کے درمیاں
اور تن پر ایک چادر آخری (ظفر گورکھپوری)

مرسلہ: احتشام حسین، علی گڑھ

ہو جس کی زیست کا مقصد سفر مدام سفر
تو پھر وہ اپنے لیے کیوں مکاں بنائے گا (صابر فخرالدین)

مرسلہ: محمد سلیم الدین، رائچور

خانہ برباد سمجھ کر ہمیں ڈھلتی ہوئی رات
طنز سے پوچھتی ہے، کون سے گھر جاؤ گے (محمود سعیدی)

مرسلہ: فردوس النسا، ٹونک

نثری عنوانات

"پوس کی رات" (پریم چند کا افسانہ)

مرسلہ: محمد رشید قریشی، پلاموں۔
قمر رضوی جامی، نوادہ۔

"سرزمینِ یاس" (ساحر لدھیانوی کی نظم)

مرسلہ: تضمین بانو، برہانپور

"غریب کا جاڑا" (سرور کابری کی نظم)

مرسلہ: احسان اللہ عمیر، لہریا سرائے

"موسم زمستان" (نظیر اکبرآبادی کی نظم)

مرسلہ: محمد عابد اختر شاہی، نوادہ

"خیال کی دستک" (ساگر سرحدی کا ڈراما)

مرسلہ: حمیدہ بانو، دیوبند

"اُداس موڑ" (ابراہیم یوسف کا ڈراما)

مرسلہ: عتیق احمد، دیوبند

بقیہ بازو کی قوت

عبداللہ میاں فوراً گھر آئے اور اپنے ایک آدمی کو دودھ، روٹی اور شکر کے ساتھ ایک رقعہ دے کر رحیمو کے پاس روانہ کیا۔ رقعے کی ابتدائی سطور میں لکھا تھا ——— "رحیمو! مجھے خبر ملی ہے کہ تو شرنارتھیوں کی طرح کسی ویران جگہ پر پڑا ہوا ہے اور تیرے بچے بھوکے ہیں۔ بیٹا! تو حالات سے گھبرا کر کب تک اور کہاں تک بھاگتا رہے گا۔ بھاگتے رہنے سے تو بہتر ہے کہ میری طرح بازو میں قوت پیدا کر لے اور اپنی جگہ ڈٹ کر رہنا اور مرنا سیکھ لے۔ اس لیے کہ آتنک واد تو تجھے ہر جگہ ملیں گے۔"

آپ کی رائے

▲ ماہنامہ "ایوانِ اُردو" بابت ماہ اگست ۱۹۹۰ء میں میرا ایک مضمون بعنوان "ساتویں صدی ہجری کے وزیر باتدبیر ——— سیّد محمد خواجہ خطیر" اشاعت پذیر ہوا تھا۔ یہ مضمون سید محمد خواجہ خطیر کے علوئے مرتبت اور پاکیزگیِ کردار کا ایک سادہ سا تعارف تھا۔ اس مضمون پر میرے ہم وطن اور عزیز دوست نثار احمد فاروقی صاحب کی رائے ایوانِ اُردو ماہ ستمبر ۱۹۹۰ء میں "آپ کی رائے" کے تحت نظر سے گزری تو بڑی مسرت ہوئی کہ مجھے اس کے جواب میں خواجہ صاحب کے متعلق تاریخی واقعات کو پہلے سے زیادہ تفصیل سے پیش کرنے کا خوشگوار موقعہ ملا۔

فاروقی صاحب نے بڑی خود اعتمادی سے لکھا ہے:

" خواجہ خطیر کے بارے میں تاباں نقوی صاحب نے جو باتیں لکھی ہیں "دلچسپ" ہیں مگر انھیں حوالے دینا چاہیے تھے میرے علم میں نہیں کہ کسی نے ان کا امروہہ میں انتقال ہونا لکھا ہو۔ ان کے بارے میں ہم عصر ماخذ ضیاُ الدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی ہے اس میں تین مقامات پر خواجہ خطیر کا ذکر آیا ہے اور امروہہ سے ان کے تعلق کی طرف کوئی اشارہ نہیں۔"

ان واقعات کو جو میرے سابقہ مضمون میں شامل ہیں "دلچسپ باتوں" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ بھی غنیمت ہے ورنہ ممکن تھا کہ وہ کہیں افسانہ ہی قرار دے دیتے۔ ان کے تاریخی حوالوں کے مطالبے کو پورا کیا جا رہا ہے۔ لیکن ان کا یہ لکھنا کہ:

"میرے علم میں نہیں کہ کسی نے ان کا امروہہ میں انتقال ہونا لکھا ہو۔"

ان کے اس ذہن کا غماز ہے کہ جو بات ان کے علم میں نہیں اس کا سرے سے کہیں وجود ہی نہیں مجھے ان کی ہمہ دانی بھی تسلیم مگر وہ تو پُر اعتماد انداز میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ:

" ان کے بارے میں ہم عصر ماخذ ضیاُ الدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی ہے اس میں تین مقامات پر خواجہ خطیر کا ذکر آیا ہے اور امروہہ سے ان کے تعلق کا کوئی ذکر نہیں۔"

فاروقی صاحب اگر امروہہ کی نصف درجن مقامی تاریخوں سے بے تعلق نہ رہے ہوتے تو انھیں خواجہ صاحب کے امروہہ سے تعلق کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ یہ بات باعثِ حیرت ہے کہ فاروقی صاحب صرف برنی کی تاریخ فیروز شاہی کو ہم عصر ماخذ تسلیم کرتے ہیں اور حضرت امیر خسرو کی نگارشات نظم و نثر "مفتاح الفتوح" کو اور "خزائن الفتوح" کو نظر انداز کرتے ہیں جو امیر خسرو کے چشم دید حالات پر مشتمل ہیں اور بعد کے مورخین جن سے حوالوں کا کام لیتے ہیں حیرت بالائے حیرت یہ ہے کہ انھوں نے تاریخ فرشتہ۔ سفرنامہ ابن بطوطہ، تاریخ مبارک شاہی اور تذکرۃ الکرام جیسی معتبر کتابوں سے بھی جو تھوڑے قبل و بعد کے وقفے سے معاصر تاریخیں تسلیم کی جاتی ہیں صرف نظر کر لیا ہے۔

قدیم مورخین ہم عصر سلاطین کے آخری سانسوں تک کا شمار کرتے ہیں لیکن وزرا کے تفصیلی حالات کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے اور وہ وزرا جو اپنے عہدوں سے سبکدوش ہو کر اپنے وطن جا چکے ہوں ان سے تو بالکل ہی صرفِ نظر کر لیتے ہیں خواجہ خطیر کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔

دہلی کے علاوہ دوسرے شہر جہاں عمائدین وقت نے زندگی کے آخری دن گزارے ہیں وہاں کی مقامی تاریخیں ان لوگوں کے ماضی اور حال کے بارے میں تفصیلی حالات سے باخبر کرتی ہیں یہی صورت امروہہ کی ہے جہاں بڑے بڑے باعظمت بزرگ جیسے حضرت سید شاہ شرف الدین شاہ ولایت رح حضرت شاہ نصیر الدینؒ۔ حضرت شاہ ابنؒ اور "خان جہاں" خواجہ سیّد محمد خطیر تشریف لائے اور یہاں کی خاک کا پیوند ہوئے ان لوگوں کے بارے میں مقامی تاریخ نویسوں نے ان کے تفصیلی حالات شائع کر کے انھیں زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔

نخبتہ التواریخ فارسی نے خواجہ صاحب کی امروہہ میں آمد قیام اور محلہ نخشبی آباد کرنے کا تذکرہ کیا ہے۔ ڈسٹرکٹ گزیٹیر مراد آباد ۱۹۱۱ء نے خواجہ صاحب کے بارے میں حسبِ ذیل عبارت لکھی ہے:

'AN OTHER MOHALLA "NAKHSHABI" FOUNDED BY KHAWAJA KHATEER.

دوسرے محلوں کے علاوہ محلہ نخشبی خواجہ خطیر نے آباد کیا۔

تاریخ اصغری نے جو آئینۂ عباسی کے بعد پہلی جامع اور معتبر تاریخ ہے، خواجہ صاحب کی امروہہ میں آمد کا واضح طور پر ذکر کیا ہے۔ تاریخ "شجرات سادات امروہہ" میں مولوی سید بشیر حسن لکھتے ہیں:

" اصل وطن آپ کا (خواجہ صاحب کا) شہر نخشب (ترکستان) تھا۔ غیاث الدین بلبن کے عہد

میں دہلی آئے۔ بادشاہ نے آپ کو اپنا وزیر مقرر کیا۔ پھر جلال الدین فیروز سلطان علاء الدین اور غیاث الدین تغلق کے وزیر مقرر ہوئے پس از ترک مشاغل بغرض توطن امروہہ تشریف لائے اور اس جگہ سکونت اختیار کی جو بعد میں محلہ تخششی کے نام سے مشہور ہوا۔"

صاحب شجرات نے خاندان کا شجرہ شائع کرنے کے بعد لکھا ہے:

"مودودی خاندان امروہہ تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ ایک بڑا خاندان ہے جو سنبھل، سہسوان، اجمیر اور دیگر مقامات میں پھیلا ہوا ہے جس میں بڑے بڑے عالی مرتبت علما، فضلا، منشی اور قاضی ہوئے ہیں۔"

فاروقی صاحب نے برنی کی کتاب تاریخ فیروز شاہی سے حسب ذیل عبارت بطور خاص نقل کی ہے:

"معزالدین کیقباد کے عہد (۶۸۶ - ۶۸۹ھ) میں یہ وزیر مملکت تھے اور ملک نظام الدین نے انھیں گدھے پر بٹھا کر شہر میں گشت کرائی تھی۔ ۶۹۵ھ میں علاء الدین خلجی نے خواجہ خطیر کو (جو بقول برنی وزرا میں سب سے زیادہ نیک نام تھے) پھر وزیر مقرر کیا۔ غیاث الدین تغلق کا عہد آیا (۷۲۰ - ۷۲۵ھ) تو اس نے عہد علائی کے بقیۃ السیف امرا کے ساتھ حسن سلوک کیا جن میں خواجہ خطیر بھی شامل تھے۔"

یہ بات کہ ملک نظام الدین نے خواجہ صاحب کو گدھے پر بٹھا کر شہر میں گشت کرائی مورخین کے درمیان اختلافی ہے۔ خلجی خاندان کے مؤلف کے۔ ایس۔ لال نے صفحہ ۳۸۷ پر لکھا ہے:

"ضیاء الدین برنی کے اپنے تعصبات اس کی اپنی کمزوریاں اور خامیاں ہیں۔ یہ اس کے تعصب ہی کا ایک نمونہ ہے کہ اس نے خواجہ صاحب کے "خارج البلد" کیے جانے کے واقعے کو انتہائی بھونڈی شکل میں پیش کیا۔ میں نے اپنے مضمون میں خواجہ صاحب کا "خارج البلد" ہونا خود ہی تحریر کیا تھا اور میری معلومات کا ماخذ مولانا علی میاں کے والد محترم مولانا عبدالحئی کی عربی کتاب "نزہت الخواطر" تھی جو تاریخی اختلافات کی تجزیہ کاری اور حقیقت پسندی کے اعتبار سے اس صدی کی سب سے زیادہ معتبر کتاب خیال کی جاتی ہے اس کا اصل نسخہ ہمدرد لائبریری میں محفوظ ہے اور اس کا ترجمہ گیارہ جلدوں میں لاہور سے شائع کیا جا چکا ہے۔ نزہت الخواطر کی آزاد رائے حسب ذیل ہے:

"بلبن نے کیخسرو فرزند شاہزادہ محمد کے حق میں وصیت کی تھی لیکن امرا کی سیاسی کشمکش نے کیخسرو کے بجائے بلبن کے دوسرے بیٹے بغرا خان کے لڑکے معزالدین کیقباد کو بادشاہ بنا دیا۔ نظام الدین فخرالدین کوتوال شہر کا داماد بھی تھا اور بھتیجہ بھی نظام الدین نے نوعمر بادشاہ کو بھڑکایا کہ کیخسرو ابھی زندہ ہے اگر اسے دو بلبنی امرا کی تائید حاصل ہوگئی تو آپ سے حکومت چھن جائے گی۔ اس نے در پردہ کیخسرو کی حمایت کا الزام لگا کر خواجہ صاحب کو خارج البلد کر دیا۔"

فاروقی صاحب برنی سے اپنی عقیدت برقرار رکھتے ہوئے نزہت الخواطر کو اگر تھوڑی اہمیت دیں تو ان کے ذوق تحقیق کی کوئی توہین نہ ہوگی۔ کے۔ ایس۔ لال اپنی کتاب خلجی خاندان کے صفحہ ۳۸۶ پر برنی کے تعصب کمزوری اور خامی کی تصویر ذیل کے الفاظ میں کھینچتا ہے:

"برنی واقعات کو بیان کرنے کا اپنا ایک مخصوص انداز رکھتا ہے اور وہ اس کو قابل یقین بنانے کی بھرپور کوشش کرتا ہے۔ اس کا اظہار بیانیہ کے قاضی مغیث الدین کے ساتھ علاء الدین کی گفتگو اور قطب الدین کے اپنے محبوب وزیر خسرو خان سے شیفتگی کے بیان میں ہوتا ہے۔ علاء الدین کے ساتھ قاضی مغیث الدین کی گفتگو کے وقت کوئی تیسرا آدمی موجود نہیں تھا لیکن مورخ (برنی) قاضی اور سلطان کے درمیان کہے جانے والے ہر لفظ کو لکھتا ہے۔ اس قسم کے واقعات میں برنی دوسرے لوگوں کے منہ میں خود اپنے خیالات رکھ دینے کا خوش آئند موقع پاتا ہے ایک اور جگہ وہ قطب الدین کے قتل کی واقعات سے بھرپور رات کی اتنی زبردست تصویر کشی کرتا ہے اور یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ جیسے وہ ایک روزن سے اس کمرے میں جھانک رہا تھا جس میں قطب الدین اور اس کا محبوب وزیر سو رہے تھے ایسے واضح بیانات عوام کے ذہنوں کو تو متاثر کرتے ہیں لیکن تاریخی صداقت کی خواہش کی تسکین نہیں کر سکتے۔"

برنی نے خواجہ صاحب کے معاملے میں بھی شاید (بقول کے۔ ایس۔ لال) دوسرے لوگوں کے منہ میں خود اپنے خیالات رکھ دینے کا خوش آئند موقع پا لیا ہے۔ فاروقی صاحب لکھتے ہیں کہ:

"یہ بیان کہ خواجہ خطیر ۶۷۸ھ میں ترکستان سے آئے اور حضرت قطب الدین مودود چشتی کی اولاد میں تھے یا امروہہ میں ان کا انتقال ہوا اور وہیں مدفون ہوئے ان سب باتوں کے لیے سند درکار ہے۔ تاباں صاحب کو حوالہ دینا چاہیے۔"

فاروقی صاحب نے ایک ہی سانس میں کئی باتوں کے حوالے طلب کر لیے ہیں۔ میں نے اپنے مضمون میں خواجہ صاحب کا شہر نخشب (ترکستان) سے آنا تحریر کیا تھا۔ فاروقی صاحب نے "نخشب"

کا نام لینا کسی مصلحت سے ضروری نہ سمجھا اور
صرف "ترکستان" کافی سمجھا لیکن باوجود امروہوی
ہونے کے انھیں یہ بھی نہیں معلوم کہ نخشب کی نسبت
سے امروہہ میں ایک پورا محلہ "نخشبی" آباد ہے جو
خواجہ صاحب کی وہاں آمد کی یاد دلاتا ہے۔ خواجہ
خطیر کا اولادِ حضرت مودود چشتی میں ہونا مقامی
تاریخ اصغری کے علاوہ سوانحی کتاب "خواجہ
معین الدین چشتی" سے بھی ثابت ہے عبارت
ملاحظہ ہو:

" خواجہ قطب الدین مودود چشتی ۴۳۰ھ میں
پیدا ہوئے اور ۵۲۷ھ میں وفات پائی۔ چشت
سے ان کے صاحبزادے سید ابواحمد ہندوستان آئے
اور واپس چلے گئے ان کے ایک بیٹے کی وفات
ہندوستان ہی میں ہوئی انہی کی اولاد میں ملک کی
نامور علمی شخصیت سید ابوالاعلیٰ مودودی ہیں سلک
چشتیہ حضرت خواجہ مودود چشتی سے شروع ہوا۔
آپ کے پدرِ بزرگوار خواجہ ابو یوسف ناصر الدین
انہی سے بیعت تھے۔ خواجہ معین الدین چشتی کا تعلق
بھی اسی سلسلے سے ہے۔"

واضح ہو کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی
خواجہ خطیر کے شجرۂ نسب میں شریک ہیں۔ اس کے
علاوہ صاحب "شجرات سادات امروہہ" واشگاف
لکھتے ہیں:

" خواجہ خطیر کے جدِ امجد خواجہ محمد قطب الدین
چشتی جن کی نسبت سے ان کا خاندان مودودی
کہلاتا ہے ان کا ثبات "اقتباس الانوار" (مولفہ
مولوی محمد اکرم [illegible]) میں صفحہ ۲۱۵ پر "جواہر
مودودی" قلمی [illegible] ۴۴ پر اور مرآۃ الاسرار
(مولفہ مولوی عبدالحق) میں لکھا ہے کہ وہ جدی پدری
نسبت سے حسنی تھے اور ان کا شجرہ بھی امام علی
نقی تک ہے۔"

مذکورہ اقتباسات سے واضح ہو جاتا ہے کہ:

" مسلک چشتیہ حضرت خواجہ مودود چشتی
سے شروع ہوا۔"

اس کے برخلاف اگر کچھ لوگ بانیِ "سلسلۂ چشتیہ"
حضرت ابواسحٰق شامی کو قرار دیتے ہیں تو یہ
صوفین کا اپنے گھر کا معاملہ ہے۔ فاروقی صاحب
میرے بجائے مولف کتاب "خواجہ معین الدین
چشتی" سے محاسبہ کریں۔ مجھے یہ اعتراف ہے کہ
خواجہ معین الدین چشتی خواجہ قطب الدین مودود
چشتی کے نسب کے نہیں۔ سلسلۂ چشتیہ کے
شریک ہیں۔ فاروقی صاحب کے کئی اعتراضات
کا جواب دیا جا چکا لیکن یہ بات ابھی جواب طلب
ہے کہ:

"امروہہ میں ان کا انتقال ہوا اور وہ وہیں
مدفون ہوئے۔"

امروہہ میں جب خواجہ صاحب کی آمد ثابت ہے
تو امکان غالب یہی ہے کہ انتقال بھی اسی شہر
میں ہوا لیکن فاروقی صاحب چونکہ اپنے ہر
حرفِ تنقید کا جواب چاہتے ہیں اس لیے عرض
ہے کہ:

خواجہ صاحب نے شہر سے جانبِ شمال
نزدِ کربلا باغ انبہ لگایا مسجد تعمیر کی وہیں مدفون
بھی ہیں ایک وسیع چبوترہ جس پر آپ کی قبر
ہے صدیوں سے محفوظ ہے چند درخت کہنہ
اور مسجدِ منہدمہ کا کچھ حصہ بھی موجود ہے۔ آج
تک کسی کو اس علاقے پر ناجائز قبضے کی ہمت
نہ ہو سکی ایک بار خاندان ہی کے ایک فرد نے
اس چبوترے پر ۱۰۳۸ھ میں دوسری قبر بنانے
کی کوشش کی تھی اس پر نزاع ہوا۔ معاملہ
اس وقت کے قاضی سید امجد حسینی ابن سید
سالار حسینی کی عدالت تک پہنچا۔ انھوں نے حکم
دیا کہ اس چبوترے پر اب یا آئندہ کوئی دوسری
قبر نہ بنائی جائے۔ تاکہ خواجہ صاحب کی قبر کا
امتیاز باقی رہے۔ اس فیصلے کی ایک نقل ہمدرد
اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ تغلق آباد دہلی میں
محفوظ ہے۔

فاروقی صاحب چبوترہ مذکورہ پر ناجائز
قبضہ کرنے کی کوشش کرنے والے کے پیشاب
میں خون آنے یا آم کے پرانے درخت کو کاٹنے
کی کوشش میں درخت سے گرنے کے واقعات
کو تسلیم نہ کریں مگر قاضی صاحب کے تاریخی
فیصلے کا تو اعتبار کریں۔

اپنے تبصرے میں فاروقی صاحب نے
ایک نصیحت بھی فرمائی ہے کہ:

" مضمون کے آخر میں دو تین پیراگراف میں
کچھ کرامتوں کا بیان بھی ہو گیا ہے۔ اس سے مضمون
کی تاریخی حیثیت کمزور ہوتی ہے۔"

میرے مضمون میں کرامتوں کا ذکر بھی
بطور تعارف تھا۔ یہ کرامتیں اس لیے قابلِ ذکر
سمجھی گئیں کہ یہ صدیوں پرانی روایات پر مبنی
ہیں اور ان سے عوامی عقیدت کا سوال وابستہ
ہے۔ مضمون اگر بنیادی طور پر تاریخی ہوتا تو ان
واقعات کو چنداں اہمیت نہ دی جاتی۔ جہاں
تک میرے مطالعے کا تعلق ہے تاریخ کی کتابوں
میں اور عام مضامین میں خرق عادات واقعات
کا کثرت سے ذکر کیا گیا ہے۔ فاروقی صاحب
کو میرا مشورہ یہ ہے کہ:

ہر بیشہ گماں مبر کہ خالی ست

آخر میں حوالے کی وہ چند کتابیں جن سے
برنی کی تاریخ فیروز شاہی کے علاوہ خواجہ خطیر
کے مرتبہ و مقام کا تعین ہوتا ہے:

ریخ فرشتہ (محمد بن قاسم فرشتہ)
جلال الدین کے بعد جب علاؤ الدین تخت
ں ہوا تو اس نے خواجہ کا عہدہ (وزارت)
رار رکھا۔

فتہ الکرام (علی شیر سندھی)
ملک تاج الدین کو ملتان اور سید محمد خواجہ
یر کو بھکر اور علی شیر کو سیستان پر حاکم مقرر کیا۔

نخب التواریخ (ضیاء الدین برنی) اردو ترجمہ
مام الدین۔
سلطان غیاث الدین بلبن کے انتقال
بعد ملک کچھن نے جس کا نام التمر تھا معز الدین
اد کے بیٹے کو تخت سلطنت پر بٹھا دیا اور سبھی
ران کے عہدوں پر برقرار رکھا چند ماہ کے بعد
بھٹری میں دربار آراستہ کیا اور خواجہ خطیر
خواجہ جہاں" کا خطاب عطا کیا۔ ۶۸۹ھ میں
زمام سلطنت جلال الدین فیروز کے قبضہ
ئی تو اس نے وزیر موصوف کو "وزیر الممالک"
عہدہ سے سرفراز کیا۔

ثنوی قران السعدین (حضرت امیر خسرو)
خواجہ خطیر میں حضرت امیر خسرو کے گیارہ اشعار
ہتہ الخواطر (مولانا عبد الحی) اس کا حوالہ
ون میں دیا جا چکا۔

جرات سادات امروہہ (مولوی سید
سن) اس کا بھی حوالہ مضمون میں دیا جا چکا۔

جہ خاندان (کے۔ ایس۔ لال) ترجمہ
محمد یسین مظہر صدیقی۔ (یہ کتاب فارسی، عربی،
سکرت، ہندی اُردو اور انگریزی کی ۱۲۵
ں کا ماحصل ہے) صفحہ ۲۳۔ ۲۴، باب ۲
" جلال الدین فیروز خلجی ۱۳ جون ۱۲۹۰ء
ت نشین ہوا اور اس نے سلطان فیروز شاہ خلجی
ب اختیار کیا۔ وزارت خواجہ خطیر کو تفویض کی
گئی وہ بلبن اور کیقباد کے دور حکومت میں بھی
اسی عہدے پر فائز رہے۔ علاؤ الدین نے ایک دور
اندیش سیاست داں کی طرح جلالی امیروں کو ملک کے
اعلیٰ مناصب دے کر ان کا تعاون حاصل کر لیا۔
پرانی حکومت کے بعض سرکردہ اشخاص اور بعض
اس کے محبوب امرا کی مخلوط وزارت قائم کی گئی،
جلال الدین کے مشہور خواجہ جہاں (وزیر اعظم)
خواجہ خطیر کو ان کے سابقہ عہدے پر بحال رکھا گیا۔
صفحہ ۱۷۴

علاؤ الدین نے اپنی تخت نشینی پر خواجہ خطیر
کو وزارت کے عہدے پر مقرر کیا تھا خواجہ وسیع تر
تجربہ اور بڑی ذہانت کا مالک تھا اس نے بلبن کے
عہد میں بطور نائب وزیر اور جلال الدین کے عہد
میں وزیر کی حیثیت سے کام کیا تھا۔ وہ ایک مستعد
شہری منتظم تھا۔

خلاصۃ الانساب (قلمی ۱۲۶۶ھ) (سید
ارشاد علی)
اور نخشب اصل وطن مالوفان کا معلوم
ہوتا ہے جہاں حکماء و فلاسفہ نے جودت طبع اور
رائے زرین سے بارہ کوس کی روشنی کی تعداد سے
ایک چاند مساوی الانوار جس وقت بنایا تھا شب
کو تو وہ بخوبی روشن ہوتا تھا مگر دن کو ایک چاہ
میں غروب ہو جاتا تھا۔ اسی سبب سے ان صاحبوں
کو نخشبی کہتے ہیں۔

کتب انساب۔
حیات العلماء۔ شرف الانساب۔ مراۃ الانساب۔
خزینۃ الانساب۔ تذکرہ علماء و فضلا (قلمی)۔۔۔
بعہد جہانگیر۔

——— تاباں نقوی امروہوی (نئی دہلی)

▲ ایوان اردو ستمبر ۹۰ء کے شمارے میں
پروفیسر نثار احمد فاروقی صاحب کا ایک خط شائع
ہوا ہے جس میں موصوف نے ازراہِ عنایت میرے
مضمون "کیرالا میں اُردو" پر بھی اظہار خیال
کرتے ہوئے چند سوال اٹھائے ہیں جس کی وجہ
سے مجھے ان باتوں کی وضاحت کا بھی موقع مل گیا
جن کی مضمون میں گنجائش نہیں تھی۔
فاروقی صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ
مصنف نے یہ نہیں بتایا ہے کہ اس نے یہ معلومات
کہاں سے حاصل کی ہیں چنانچہ اس سلسلے میں عرض
ہے کہ انجمن اساتذۂ اردو جامعات ہند کے جنرل
سکریٹری ہونے کی حیثیت سے میرا کیرالا کے
اردو اساتذہ سے رابطہ قائم ہے اس کے علاوہ
انجمن اساتذۂ اُردو نے ۱۹۸۴ء میں اپنی کل ہند
سالانہ کانفرنس گورنمنٹ کالج ملاپرم (کیرالا)
میں منعقد کی تھی جس میں یہ خاکسار بھی شریک
ہوا تھا اور اسی تعلق سے مجھے ملاپرم، کالی کٹ،
پال گھاٹ، پرمبا اور فرخ نگر جانے اور لوگوں
سے ملنے، اردو کے مسائل پر گفتگو کرنے اور اس
کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا موقع
ملا تھا۔ مزید یہ کہ انجمن کی طرف سے ہر سال
۱۳ مارچ کو کیرالا میں بھی یوم اُردو منایا جاتا ہے
جس میں اردو کی موجودہ صورت حال اور اس کے
فروغ کے بارے میں غور کرتے ہوئے تجاویز
منظور کی جاتی ہیں۔ ان جلسوں کی رپورٹ بھی ہر
سال انجمن کو موصول ہوتی رہتی ہے۔ اس انجمن اور
اُردو کے تعلق ہی سے سید محمد سرور صاحب اور
کیرالا اُردو ٹیچرس ایسوسی ایشن ثانوی اسکول کے
اُردو اساتذہ کی انجمن کے جنرل سکریٹری جناب
پی۔ کے۔ کریم صاحب کالی کٹ سے بھی خط و
کتابت ہے۔ اس مضمون میں شامل اعداد و شمار
کریم صاحب کے فراہم کیے ہوئے ہیں چنانچہ
کیرالا میں اُردو کے بارے میں مختلف اوقات

تھا اور مختلف لوگوں کے ذریعے جو معلومات حاصل ہوتی تھیں بالعموم کو اس مختصر مضمون میں جمع کر دیا گیا ہے تاکہ کیرالا میں اردو تعلیم کا مختصر خاکہ سامنے آسکے۔

جہاں تک فاروق اور فرخ کا سوال ہے ممکن ہے کہ اس سلسلے میں فاروقی صاحب نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہی درست ہو لیکن مجھے کیرالا کے لوگوں نے اور خصوصاً پروفیسر قدرت اللہ بقادی صاحب (فرخ کالج) نے یہ بتایا تھا کہ یہ شہر ٹیپو سلطان نے اپنی فتح کے یادگار کے طور پر فرخ نگر کے نام سے آباد کیا تھا جو فرخ سے بگڑ کر فاروق ہو گیا ہے لیکن اب بھی بہت سے لوگ اسے فرخ نگر کے نام سے ہی پکارتے ہیں چونکہ یہ کالج اسی شہر کے نام پر قائم کیا گیا ہے اس لیے میں نے بھی اسے تاریخی روایت فرخ نگر سے ہی منسوب کرنا مناسب سمجھا ہے۔ اس وقت اس کالج کا نام کئی طرح لکھا جاتا ہے۔ FAROOK، FAROKE اور FARROKE، اس میں صحیح نام کیا ہے اس کا فیصلہ تو اہلِ شہر ہی کر سکتے ہیں۔

——— عظیم الشان صدیقی (دہلی)

▲ اکتوبر ۱۹۹۰ء کے ایوانِ اردو میں سرودِ رفتہ کے عنوان سے سیماب اکبر آبادی کی غزل بھی پڑھی اور محمد عبد الحلیم صاحب کا اظہارِ خیال بھی۔

میرا اپنا خیال یہ ہے کہ غزل میں اس قسم کا توارد یا غلط فہمی ناگزیر ہے۔ قدیم غزل کا اسلوب ہی نہیں بلکہ مفہوم بھی کافی حد تک متعین ہے لہٰذا کسی کی زبان سے کوئی اچھا شعر سن کر آدمی مغالطے میں پڑ جاتا ہے کہ وہ اسی کا شعر ہے۔

داغ پر تو سرقے کا الزام کوئی نہیں لگا سکتا قیامِ حیدرآباد کے زمانے میں ان کی ایک بیاض گم ہو گئی تھی جس کا انھیں قلق تھا۔ اِدھر اُدھر سے دوستوں کی مدد سے گم شدہ غزلیں حاصل کرنے میں مصروف تھے۔ ایک قوال ان کی محفل میں آیا اور ایک غزل گائی جو انھیں پسند آئی استفسار پر کہ یہ غزل کس کی ہے، قوال نے بے جھجک کہا کہ حضور آپ ہی کی ہے۔ غزل ان کے رنگ میں تھی انھوں نے قوال کی بات پر یقین کر لیا۔ اگلے دن شہر میں مشاعرہ تھا وہاں داغ نے یہی غزل سنائی۔ بعد میں پتہ چلا کہ غزل مضطر خیرآبادی کی ہے۔ اس میں قصور کسی کا نہیں۔ قدیم غزل گو شاعروں کا حال ایسا ہے جیسے تنگ گلی میں رہنے والے دو تین لڑکے کسی ایک ہی لڑکی سے عشق کر رہے ہوں، بھید کھلے بنا نہیں رہ سکتا۔ انفرادی رنگ ہم سب کی غزلوں میں ڈھونڈ لیتے ہیں مگر بسا اوقات یہ قیاس ہی ہوتا ہے۔

بھوپال کے ایک پرچے نے 'اپریل فول نمبر' نکالا۔ اس میں ایک فرضی غزل لکھ کر غالب سے منسوب کر دی گئی۔ اس غزل کو دو ماہرینِ غالبیات نے اپنے اپنے مرتب کردہ دیوانِ غالب میں شامل کر لیا۔ اس قسم کے حوادث کہاں تک گنوائے جائیں۔

——— گوپال متل (نئی دہلی)

▲ اکتوبر کے شمارے میں ایک صاحب نے "ایوانِ اردو" (جولائی ۱۹۹۰ء) میں شائع شدہ ایک غزل پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے کہ رگ، نگ، پگ کا قافیہ 'رتجگا' کیوں کر ہو سکتا ہے۔ حالانکہ غزل کے قوافی رگوں، نگوں، پگوں، رتجگوں وغیرہ ہیں جن کے استعمال میں مجھے قباحت نظر نہیں آتی۔ اسی طرح تخفیف کے عمل میں یہ قوافی رگ، نگ، پگ اور جگ ہو جائیں گے اور بہر اعتبار صحیح ہونگے معترض کو غلط فہمی ہوئی یہاں ایطائے جلی یا خفی کچھ بھی نہیں نظر آتا۔

ایک دوسرے صاحب نے اسی شمارے میں بمبئی دوردرشن سے ٹیلی کاسٹ ہونے والے ایک مشاعرے میں نقابت کے دوران میرے استعمال کردہ ایک جملے پر اعتراض کیا ہے کہ اس میں انگریزی محاورے کی پیروی ہے انگریزی الفاظ اور محاورے جس طرح ہماری زبان خصوصاً بول چال کی زبان میں مستعمل ہیں ان کی روشنی میں اسے اعتراض برائے اعتراض ہی کہا جا سکتا ہے۔

——— مظفر حنفی (کلکتہ)

▲ اکتوبر ۹۰ء کے شمارے میں رشید حسن خاں کا مضمون "پہیلیوں کے متعلق چند باتیں" کافی معلوماتی اور دلچسپ مضمون ہے۔ خاں صاحب نے بڑی خوبصورتی سے پہیلی اور معمہ کے فرق کو واضح کیا ہے۔ عفت موہانی کا افسانہ گہرا تاثر چھوڑتا ہے۔ گوپال متل کی نظمیں اور آل احمد سرور کی غزلیں دلکش ہیں۔ ابن آصف صاحب کی جانکاری کے لیے عرض ہے کہ خالد بھائی خدا کے فضل سے بخیر و عافیت ہیں۔ اور آپ کی خیریت نیک چاہتے ہیں۔

——— آفاق عالم صدیقی، دربھنگہ

اردو اکادمی دہلی کا ماہانہ رسالہ

فون نمبر: ۳۲۷۴۲۱۱، ۳۲۶۳۳۲۸

ایوانِ اردو دہلی

ادارۂ تحریر:
سید شریف الحسن نقوی، مخمور سعیدی

جلد: ۴ ● شمارہ: ۸ ● فی کاپی ۵۰ر۲ روپے، سالانہ قیمت ۲۵ روپے ● دسمبر ۱۹۹۰ء ●

ماہنامہ "ایوانِ اردو دہلی" میں شائع ہونے والے افسانوں میں نام، مقام اور واقعات سب فرضی ہیں۔ کسی اتفاقیہ مطابقت کے لیے ادارہ ذمہ دار نہیں۔

مضمون نگاروں کی آرا سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتا

ماہنامہ ایوانِ اردو دہلی

اردو اکادمی، دہلی ــــــ گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

خوشنویس: تنویر احمد

[illegible] سے چھپوا کر اردو اکادمی، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا

حرفِ آغاز

دو سال پہلے "ایوانِ اردو" کا "مولانا ابوالکلام آزاد نمبر" شائع ہوا تھا۔ مولانا آزاد کی شخصیت قومی اتحاد اور یک جہتی کی روشن علامت [illegible] ذات میں وہ تمام اوصاف جمع ہوگئے تھے جنھیں ہم ہندوستان کی ہزار سالہ تہذیبی روایت کا ماحصل کہہ سکتے ہیں۔ ان کی [illegible] ہوئی تھی اسی اسلامی فکر نے انھیں دوسرے مذاہب کا احترام کرنا بھی سکھایا تھا۔ وہ ایک سچے ہندوستانی تھے اور ہندوستان کی بھلائی انھیں اس سرزمین پر بسنے والے مختلف نسلی، مذہبی، ثقافتی اور لسانی گروہوں کی باہمی محبت اور اخوت میں نظر آتی تھی۔

بدقسمتی سے ہمارا ملک ان دنوں جس تنگ نظری اور تنگ دلی میں مبتلا ہوگیا ہے، اس کے دفعیے کے لیے مولانا آزاد اور ہماری تحریکِ آزادی کے دوسرے بزرگ رہنماؤں مثلاً مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو جیسے اکابرین کے پیغام کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا بہت ضروری ہوگیا ہے۔ ذیل میں ہم مولانا آزاد کی تحریروں کے چند اقتباس اپنے قارئین اور ملک کے دانشوروں کی توجہ اور غور و فکر کے لیے درج کر رہے ہیں:

"تاریخ کی غلط تعلیم نے انسان کو تقسیم کر دیا ہے۔ ہماری موجودہ تاریخی کتابوں میں بتایا جاتا ہے کہ انسان مختلف نسلوں اور قوموں سے تعلق رکھتے ہیں، پھر ان اقوام کی داستان میں باہمی تصادم پر زور ہوتا ہے اور مختلف گروہوں میں نفرت اور منافرت کو پیش کیا جاتا ہے۔ ناگزیر ہے کہ اس طرح جو تاریخ پڑھائی جائے گی اس سے ذہنی تنگی اور تصادم پیدا ہوگا۔" (۲۴ مارچ ۱۹۵۱ء کو یونیسکو کے ایک جلسے سے خطاب)

"تاریخ انسانی کے ہر دور میں آپ دیکھیں گے کہ انسان نے دُنیا میں بہت سی حد بندیاں قائم کی ہیں، جیسے جغرافیائی حد بندی کہا جاتا ہے، یہ یورپ ہے یہ ایشیا، یہ عرب ہے یہ ہندوستان وغیرہ۔ مذہبی حد بندی، ہم کہتے ہیں: یہ مسلمان ہے یہ عیسائی، یہ ہندو یہ سکھ وغیرہ۔ قومی حد بندی کہا جاتا ہے: یہ انگریز ہے، یہ اطالوی، یہ ہندی وغیرہ۔ لسانی حد بندی، کہا جائے گا: یہ فلاں زبان کا بولنے والا ہے اور یہ فلاں زبان کا، وغیرہ۔ ایسے ہی رنگ و نسل کی حد بندی وغیرہ ——— یہ تمام حد بندیاں ہماری زندگی کی قدرتی ضروریات ہیں لیکن جب تک یہ تعمیری ذات میں رہتی ہیں ہمارے لیے ایک بڑا سہارا بنتی ہیں اور جب یہ تخریبی رنگ اختیار کرلیتی ہیں تو گروہِ انسانی کو تباہ کر دینے والی اور مٹا دینے والی بن جایا کرتی ہیں۔" (خطبہ: "مہاتما گاندھی کی یادگار" فروری ۱۹۴۸)

انھوں نے بہ طور خاص اپنے ہم مذہبوں کو مخاطب کرکے کہا تھا:

"اگر تمام عالم ہمارا وطن ہے اور اس لیے محترم ہے تو وہ خاک تو بدرجۂ اولیٰ ہمارے احترامِ محبت کی مستحق ہے جس کی آب و ہوا میں صدیوں سے پرورش پا رہے ہیں۔ اگر تمام فرزندانِ انسانیت ہمارے بھائی ہیں تو وہ انسان تو بدرجۂ اولیٰ ہمارے احترامِ اخوت کے مستحق ہیں جو اس خاک کے فرزند اور مثل ہمارے اسی کی سطح پر بہنے والے پانی پینے والے اور اسی فضائے محبوب کو پیار کرنے والے ہیں۔"

("مضامینِ آزاد" حصہ چہارم، مرتبہ منشی مشتاق احمد)

تاریخی کتابوں کی تدوینِ نو کی سفارش حکومت کی قائم کردہ مختلف کمیٹیوں نے بھی کی ہے مگر افسوس ہے کہ اس پر عمل نہیں ہوا۔ اپنے گروہی تشخص کو تعصب کی شکل دے دینے کے خلاف بھی باتیں بہت ہوتی رہتی ہیں، اب ان پر خلوصِ دل سے کان دھرنے کی ضرورت ہے ورنہ قومی شیرازہ بندی کے وہ تمام خواب بکھر جانے کا اندیشہ ہے جو آزاد ہندوستان کے بانیوں اور اس کے اوّلین معماروں نے دیکھے تھے۔

——— [illegible]

شکیل الرحمٰن

(دوسری قسط)

اسلامی فنون ـــــ فنِ تعمیر کی جمالیات

۸۴۶ء اور ۸۵۲ء کے درمیان سامرہ کی معروف مسجد ''مسجد متوکل'' کی تعمیر ہوئی جس میں ایک لاکھ نمازیوں کے لیے جگہ تھی. کہا جاتا ہے کہ اس مسجد کی شہرت اپنی سادگی کے حسن کی وجہ سے تھی. اب یہ کھنڈر کی صورت میں ہے. خلیفہ متوکل (۸۴۶ء تا ۸۶۱ء) نے اور بھی عمدہ اور نفیس عمارتیں تعمیر کی تھیں ستونوں کے لیے سنگِ مرمر کا استعمال عام تھا.

سامرہ کے فنکار ظروف سازی اور شیشے پر نفیس کام کے لیے بڑی شہرت رکھتے تھے. اس شہر کی مصنوعات مشرقی ایشیا میں مقبول تھیں. مختلف اقسام کے شیشوں کے برتنوں کو منقش کیا جاتا تھا. اس زمانے میں چین کے سفید برتن بھی مختلف ملکوں میں پہنچ رہے تھے اس کے باوجود سامرہ کے فنکاروں کے اس کام کو بڑی مقبولیت حاصل تھی، اُن کے برتن چمک دار ہوتے اور وہ اپنی تابندگی اور درخشانی کی وجہ سے پُرکشش نظر آتے. فنکار برتن اور دیواروں کی چکنی مٹی کے پلستروں کو چمکاتے تھے، مسجدوں اور قلعوں کی چمک دمک اور ان کی تابانی کا بھی انھوں نے ایک اعلیٰ معیار قائم کیا تھا. سفید پس منظر پر نیلے رنگ کا خوبصورت استعمال اتنا ہر دلعزیز ہوا کہ دوسرے اسلامی ملکوں میں صدیوں رنگ کی یہ صورت مقبول رہی سامرہ کے فنکاروں نے تابندگی اور درخشانی اور نیلے رنگ سے اپنی [illegible] کے خلوص سے ہم آہنگ

کردیا اور یہ اُن کا بڑا کارنامہ تھا.

سامرہ کی ''جامع مسجد'' کی تعمیر کے دس سال بعد ابوابراہیم احمد نے قیروان میں ایک انتہائی خوبصورت مسجد تعمیر کی، اس کے محرابی دروازوں اور مرکزی محراب کے قریب گنبد نے ایک نیا معیار قائم کردیا. محرابی دریچوں کے حسن کو بھی نئے انداز سے اُبھارنے کی کوشش کی گئی. مدوّر اور مربع نما صورتوں سے معماروں کی گہری دلچسپی کا پتہ چلتا ہے... سنگِ مرمر اور ٹائیلس سے ان مسجد کے حسن میں اضافہ کیا گیا ہے.

وادیٔ نیل میں احمد ابن طولون (۸۶۸ء تا ۸۸۴ء) نے فنِ تعمیر سے گہری دلچسپی لی تو قلعوں، محلوں اور مسجدوں کی تعمیر کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوگیا. احمد، نسلاً ترک تھا، جس کی پرورش سامرہ میں ہوئی تھی، ۸۱۵ء میں بخارا کے حاکم نے طولون کو غلام کی حیثیت سے خلیفہ مامون کو تحفتاً پیش کیا تھا. خلیفہ متوکل کے انتقال کے بعد ترکی فوجیوں نے متوکل کے جانشین کو کٹھ پتلی بنا کر رکھ دیا. احمد ابن طولون، قیروان کا سردار بن گیا. مذہب اور ادب سے اس کی گہری دلچسپی نے اُسے عوام میں مقبول بنادیا تھا، فسطاط کے قریب ہی اس نے اپنے لیے ایک شاندار قلعہ تعمیر کیا جس میں نو بڑے دروازے تھے، اس علاقے میں اور بھی کئی خوبصورت محل بنے، یہ محل بے حد

جیت کرتا تھا لہٰذا اس نے ایک چڑیا گھر بھی تیار کیا تھا. ساٹھ ہزار دینار خرچ کرکے ایک ہسپتال کی عمارت بھی تعمیر کی تھی، جبل ایشکر زمین پر اس کی جامع مسجد آج بھی موجود ہے، اس مسجد کے خشتی پلاسترحرم، ایوان، صحن (۳۰۲ مربع فٹ) حوض، محرابیں، گنبد، ستون، پایوں کی نوک دار کمانیں اور اس کی دیواریں اور دروازے مصری اور عراقی معماروں کے ادراک کی آمیزش کے عمدہ نمونے ہیں. اس مسجد کے ۱۲۸ دریچے اس کے حسن میں اور اضافہ کرتے ہیں، مسجد میں خطِ مستقیم، مثلث اور مدوّر صورتوں سے مختلف ڈیزائنیں بنائی گئی ہیں. مینار پر سامرہ کی فنکاری کا اثر واضح ہے. خطِ کوفی میں قرآنی آیات کے نقش کو اُبھار کر اور پُرکشش بنا دیا گیا.

جب مصر میں فاطمیوں کی حکومت شروع ہوئی (۹۶۹ء) تو انھوں نے فسطاط کے شمال میں القاہرہ (قاہرہ) کے نام سے شہر بسایا شمالی افریقہ پر بنی فاطمہ کی گرفت مضبوط ہوچکی تھی اور بغداد کے حکمران اس صورتِ حال سے پریشان تھے. فاطمیوں نے مصر کو سیاسی آزادی دی اور اس ملک کی ثقافت سے گہری دلچسپی لے کر اسے پروان چڑھایا. دیکھتے ہی دیکھتے قاہرہ ایک اہم تہذیبی مرکز بن گیا، بغداد اور قرطبہ کے ساتھ قاہرہ کو بھی ایک اہم تہذیبی مرکز تصور کیا جانے لگا. اس دور کے فنکاروں، صناعوں اور تعمیرکاروں نے ایرانی اثرات بڑی شدت سے قبول کیے لہٰذا فنِ تعمیر اور دوسرے فنون پر ایرانی اور مقامی رنگوں کی آمیزش کی وجہ سے ایک نیا اسلوب جنم لینے لگا. جانوروں، پرندوں

۹۱، نارتھ ایونیو، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

حرفِ آغاز

دو سال پہلے "ایوانِ اردو" کا "مولانا ابوالکلام آزاد نمبر" شائع ہوا تھا۔ مولانا آزاد کی شخصیت قومی اتحاد اور یک جہتی کا آدرش نمونہ تھی۔ ان کی ذات میں وہ تمام اوصاف جمع ہوگئے تھے جنھیں ہم ہندوستان کی ہزار سالہ تہذیبی روایت کا ماحصل کہہ سکتے ہیں۔ ان کی فکر اسلامی رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ اسی اسلامی فکر نے انھیں دوسرے مذاہب کا احترام کرنا بھی سکھایا تھا۔ وہ ایک سچے ہندوستانی تھے اور ہندوستان کی بھلائی انھیں اس سرزمین پر بسنے والے مختلف نسلی، مذہبی، ثقافتی اور لسانی گروہوں کی باہمی محبت اور اخوت میں نظر آتی تھی۔

بدقسمتی سے ہمارا ملک ان دنوں جس تنگ نظری اور تنگ دلی میں مبتلا ہوگیا ہے، اس کے دفعیے کے لیے مولانا آزاد اور ہماری تحریکِ آزادی کے دوسرے بزرگ رہنماؤں مثلاً مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو جیسے اکابرین کے پیغام کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا بہت ضروری ہوگیا ہے۔ ذیل میں ہم مولانا آزاد کی تحریروں کے چند اقتباس اپنے قارئین اور ملک کے دانشوروں کی توجہ اور غور و فکر کے لیے درج کر رہے ہیں:

"تاریخ کی غلط تعلیم نے انسان کو تقسیم کر دیا ہے۔ ہماری موجودہ تاریخی کتابوں میں بتایا جاتا ہے کہ انسان مختلف نسلوں اور قوموں سے تعلق رکھتے ہیں۔ پھر ان اقوام کی داستان میں باہمی تصادم پر زور ہوتا ہے اور مختلف گروہوں میں نفرت اور منافرت کو پیش کیا جاتا ہے۔ ناگزیر ہے کہ اس طرح جو تاریخ پڑھائی جائے گی اس سے ذہنی تنگی اور تصادم پیدا ہوگا۔" (۲۴ مارچ ۱۹۵۱ء کو یونیسکو کے ایک جلسے سے خطاب)

"تاریخِ انسانی کے ہر دور میں آپ دیکھیں گے کہ انسان نے دنیا میں بہت سی حد بندیاں قائم کی ہیں، جیسے جغرافیائی حد بندی کہا جاتا ہے: یہ یورپ ہے یہ ایشیا، یہ عرب ہے یہ ہندوستان وغیرہ۔ مذہبی حد بندی، ہم کہتے ہیں: یہ مسلمان ہے یہ عیسائی، یہ ہندو یہ سکھ وغیرہ۔ قومی حد بندی کہا جاتا ہے: یہ انگریز ہے، یہ اطالوی، یہ ہندی وغیرہ۔ لسانی حد بندی، کہا جائے گا: یہ فلاں زبان کا بولنے والا ہے اور یہ فلاں زبان کا، وغیرہ۔ ایسے ہی رنگ و نسل کی حد بندی وغیرہ ——— یہ تمام حد بندیاں ہماری زندگی کی قدرتی ضروریات ہیں لیکن جب تک یہ تعمیری دائرے میں رہتی ہیں ہمارے لیے ایک بڑا سہارا بنتی ہیں اور جب یہ تخریبی رنگ اختیار کر لیتی ہیں تو گروہِ انسانی کو تباہ کر دینے والی اور مٹا دینے والی بن جایا کرتی ہیں۔" (خطبہ: "مہاتما گاندھی کی یادگار" فروری ۱۹۴۸ء)

انھوں نے بہ طور خاص اپنے ہم مذہبوں کو مخاطب کر کے کہا تھا:

"اگر تمام عالم ہمارا وطن ہے اور اس لیے محترم ہے تو وہ خاک تو بدرجۂ اولیٰ ہمارے احترامِ محبت کی مستحق ہے جس کی آب و ہوا میں ہم صدیوں سے پرورش پا رہے ہیں۔ اگر تمام فرزندانِ انسانیت ہمارے بھائی ہیں تو وہ انسان تو بدرجۂ اولیٰ ہمارے احترامِ اخوت کے مستحق ہیں جو اس خاک کے فرزند اور مثل ہمارے اسی کی سطح پر بہنے والے پانی پینے والے اور اسی فضائے محبوب کو پیار کرنے والے ہیں۔"

("مضامینِ آزاد" حصہ چہارم، مرتبہ منشی مشتاق احمد)

تاریخی کتابوں کی تدوینِ نو کی سفارش حکومت کی قائم کردہ مختلف کمیٹیوں نے بھی کی ہے مگر افسوس ہے کہ اس پر عمل نہیں ہوا۔ اپنے گروہی تشخص کو تعصب کی شکل دے دینے کے خلاف بھی باتیں بہت ہوتی رہتی ہیں، اب ان پر خلوصِ دل سے کان دھرنے کی ضرورت ہے ورنہ قومی شیرازہ بندی کے وہ تمام خواب بکھر جانے کا اندیشہ ہے جو آزاد ہندوستان کے بانیوں اور اس کے اوّلین معماروں نے دیکھے تھے۔

——— سید شریف الحسن نقوی

شکیل الرحمٰن

(دوسری قسط)

اسلامی فنون — فنِ تعمیر کی جمالیات

۸۴۶ء اور ۸۵۲ء کے درمیان سامرہ کی معروف مسجد، مسجد متوکل کی تعمیر ہوئی جس میں ایک لاکھ نمازیوں کے لیے جگہ تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس مسجد کی شہرت اپنی سادگی کے حسن کی وجہ سے تھی۔ اب یہ کھنڈر کی صورت میں ہے۔ خلیفہ متوکل (۸۴۷ء، ۸۶۱ء) نے اور بھی عمدہ اور نفیس عمارتیں تعمیر کی تھیں ستونوں کے لیے سنگِ مرمر کا استعمال عام تھا۔

سامرہ کے فنکار ظروف سازی اور شیشے پر نفیس کام کے لیے بڑی شہرت رکھتے تھے۔ اس شہر کی مصنوعات مشرقی ایشیا میں مقبول تھیں۔ مختلف اقسام کے شیشوں کے برتنوں کو منقش کیا جاتا تھا۔ اس زمانے میں چین کے سفید برتن بھی مختلف ملکوں میں پہنچ رہے تھے اس کے باوجود سامرہ کے فنکاروں کے اس کام کو بڑی مقبولیت حاصل تھی، اُن کے برتن چمک دار ہوتے، وہ اپنی تابندگی اور درخشانی کی وجہ سے پُرکشش نظر آتے۔ فنکار برتن اور دیواروں کی چکنی مٹی کے پلستروں کو چمکاتے تھے، مسجدوں اور قلعوں کی چمک دمک اور ان کی تابانی کا بھی انھوں نے ایک اعلیٰ معیار قائم کیا تھا۔ سفید پس منظر پر نیلے رنگ کا خوبصورت استعمال اتنا ہر دلعزیز ہوا کہ دوسرے اسلامی ملکوں میں صدیوں رنگ کی یہ صورت مقبول رہی۔ سامرہ کے فنکاروں نے تابندگی اور درخشانی اور نیلے رنگ کو مسلمان فنکاروں کے مزاج سے ہم آہنگ کر دیا اور یہ اُن کا بڑا کارنامہ تھا۔

سامرہ کی "جامع مسجد" کی تعمیر کے دس سال بعد ابو ابراہیم احمد نے قیروان میں ایک انتہائی خوبصورت مسجد تعمیر کی، اس کے محرابی دروازوں اور مرکزی محراب کے قریب گنبد نے ایک نیا معیار قائم کر دیا۔ محرابی دریچوں کے حسن کو بھی نئے انداز سے اُبھارنے کی کوشش کی گئی۔ مدوّر اور مربع نما صورتوں سے معماروں کی گہری دلچسپی کا پتہ چلتا ہے... سنگِ مرمر اور ٹائلس سے ان مسجد کے حسن میں اضافہ کیا گیا ہے۔

وادیٔ نیل میں احمد ابن طولون (۸۴۸ء تا ۸۶۸ء) نے فنِ تعمیر سے گہری دلچسپی لی تو قلعوں، محلوں اور مسجدوں کی تعمیر کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا۔ احمد، نسلاً ترک تھا، جس کی پرورش سامرہ میں ہوئی تھی، ۸۱۵ء میں بخارا کے حاکم نے طولون کو غلام کی حیثیت سے خلیفہ مامون کو تحفتاً پیش کیا تھا۔ خلیفہ متوکل کے انتقال کے بعد ترکی فوجیوں نے متوکل کے جانشین کو کٹھ پتلی بنا کر رکھ دیا۔ احمد ابن طولون، قیروان کا سردار بن گیا۔ مذہب اور ادب سے اس کی گہری دلچسپی نے اُسے عوام میں مقبول بنا دیا تھا، فسطاط کے قریب ہی اس نے اپنے لیے ایک شاندار قلعہ تعمیر کیا جس میں نو بڑے دروازے تھے، اس علاقے میں اور بھی کئی خوبصورت محل بنے، پرندوں سے بے حد محبت کرتا تھا لہٰذا اس نے ایک چڑیا گھر بھی بنا رکھا تھا۔ ساٹھ ہزار دینار خرچ کر کے ایک ہسپتال کی عمارت بھی تعمیر کی تھی، چھ ایکڑ زمین پر اس کی جامع مسجد آج بھی موجود ہے، اس مسجد کے خشتی پائے، حرم، ایوان، صحن (۳۰۲ مربع فٹ) حوض، محرابیں، گنبد، ستون، پایوں کی نوک دار کمانیں اور اس کی دیواریں اور دروازے مصری اور عراقی معماروں کے آرٹ کی آمیزش کے عمدہ نمونے ہیں۔ اس مسجد کے ۲۸ دریچے اس کے حسن میں اور اضافہ کرتے ہیں مسجد میں خطِ مستقیم، مثلث اور مدوّر صورتوں سے مختلف ڈیزائنیں بنائی گئی ہیں۔ مینار پر سامرہ کی فنکاری کا اثر واضح ہے۔ خطِ کوفی میں قرآنی آیات کے نقش کو اُبھار کر اور پُرکشش بنا دیا گیا۔

جب مصر میں فاطمیوں کی حکومت شروع ہوئی (۹۶۹ء) تو انھوں نے فسطاط کے شمال میں القاہرہ (قاہرہ) کے نام سے شہر بسایا شمالی افریقہ پر بنی فاطمہ کی گرفت مضبوط ہو چکی تھی اور بغداد کے حکمران اس صورتِ حال سے پریشان تھے۔ فاطمیوں نے مصر کو سیاسی آزادی دی اور اس ملک کی ثقافت سے گہری دلچسپی لے کر اسے پروان چڑھایا۔ دیکھتے ہی دیکھتے قاہرہ ایک اہم تہذیبی مرکز بن گیا، بغداد اور قرطبہ کے ساتھ قاہرہ کو بھی ایک اہم تہذیبی مرکز تصور کیا جانے لگا۔ اس دور کے فنکاروں، صناعوں اور تعمیر کاروں نے ایرانی اثرات بڑی شدت سے قبول کیے۔ لہٰذا فنِ تعمیر اور دوسرے فنون پر ایرانی اور مقامی رنگوں کی آمیزش کی وجہ سے ایک نیا اسلوب جنم لینے لگا۔ جانوروں، پرندوں

۹۱، نارتھ ایوینیو، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

پھولوں، درختوں اور انسانی شکلوں کو منقش
کرنے اور ان کی تصویریں واضح طور پر پیش
کرنے میں فنکاروں کو بڑی آزادی حاصل ہوئی
اسکندریہ، ایران، مشرقی ایشیا اور ہندوستان
سے تعلقات کی وجہ سے اِن علاقوں کے اثرات
بھی نظر آنے لگے۔ ۱۱۷۱ء میں فاطمی حکومت
کے زوال کے بعد بھی قاہرہ بدستور
تہذیبی مرکز بنا رہا۔

فسطاط کے قریب ایک بہت بڑا قلعہ
تعمیر ہوا جو فوجیوں کے لیے مخصوص تھا، خشتی
دیوار اُٹھائی گئی۔ یہ شہر کی پہلی دیوار تھی، دوسری
دیوار ۱۰۹۳ء میں مکمل ہوئی جس کی تشکیل میں
شامی معمار شریک رہے۔ اس میں چند بڑے
بڑے دروازے تھے، دیوار کے اوپر مربع
صورت کئی برج لگائے گئے تھے۔ باب الفتوح
اور باب النصر معروف دروازے تھے۔ پتھروں
کی تراش خراش میں معماروں نے اچھی فنکاری
کا ثبوت فراہم کیا تھا۔

فاطمی خلفا کے قلعوں کی جاہ وحشمت
کی تفصیل جا بجا ملتی ہے، ان کے جلال و جمال
کی کہانیاں مشہور ہیں اور اکثر ایسی ہیں جن سے
پرستان کے قصوں کا تاثر پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً
قلعوں کے دریچے سونے کے تھے، محرابوں پر
ہیرے جواہرات لگے ہوئے تھے جو تاریکی میں
بڑے روشن نظر آتے تھے وغیرہ وغیرہ۔ ۹۷۳ء
میں تما ہوا، نو دروازوں کا جو مشرقی قلعہ تعمیر
ہوا تھا۔ اس کی تفصیل ملتی ہے۔ یہ ۳۴۵ میٹر
طویل تھا، دسویں صدی کے آخر میں جو مغربی
قلعہ بنا تھا وہ مشرقی قلعے سے چھوٹا تھا۔ حکمرانوں
نے اپنے قلعوں کو خوبصورت نام دے رکھے تھے
۹۷۲ء میں ازہر کی جامع مسجد کی تعمیر
ہوئی، اس کی پرانی صورت اب بھی موجود ہے۔
یہ مسجد اس دور کے جمالیاتی رجحان کو نمایاں
کرتی ہے، محرابوں کو نوکیلا بنانے اور میناروں
کو دائروں کی صورتوں میں ابھارنے کا رجحان
واضح ہے۔ ازہر کی مسجد بنی فاطمہ کی تعمیر کردہ
تمام مسجدوں میں اب تک سب سے قدیم سمجھی
جاتی ہے۔ وقت کے ساتھ اس میں تبدیلیاں
ہوتی رہی ہیں۔ اب یہ جامعہ ازہر کی صورت
میں سامنے ہے۔ دو ایکٹر زمین پر یہ مسجد ایک
خشتی دیوار کے اندر تھی۔ قیروان کی مسجد سے
بہت حد تک ملتی جلتی تھی۔ محراب سازی اور
گنبد سازی میں معمار ابن طولون کی مسجد کی تکنیک
سے قریب تر تھے۔ حرم، صحن، ڈیوڑھی اور دالان
وغیرہ کی تعمیر میں بھی احمد ابن طولون کی جامع مسجد
کے اسلوب کا رنگ ملتا ہے۔ نکیلی کمانوں پر
ایرانی اثرات واضح ہیں۔ استرکاری، آرائش
اور تزئین کاری میں عجمی رنگ کی پہچان شکل ہے۔

خلیفہ الحاکم نے ۱۰۰۳ء میں ایک نئی مسجد
تعمیر کی جس کا پلان ازہر کی جامع مسجد کے مطابق تھا
فرق یہ تھا کہ خلیفہ الحاکم نے اینٹوں کی جگہ پتھروں
سے کام لینے کا حکم دیا تھا۔ اس اعتبار سے دونوں
مسجدیں ایک دوسرے سے مختلف نظر آتی ہیں۔
مسجد کو دریچوں کی خوبصورت ترتیب سے تقسیم کیا گیا۔

خلیفہ الحاکم کے بعد جو عمارتیں تعمیر ہوئیں
اُن میں آرائش و زیبائش کو بڑی اہمیت حاصل
رہی۔ مثلاً محرابوں کی طرف زیادہ توجہ دی گئی۔
سیپ میں نقش اُبھارے گئے۔ مربعوں، دائروں
اور نقاطوں سے نئے نئے ڈیزائن تیار کیے گئے۔
گھوڑ نعلی وضع کی اکہری کمانوں اور مثلث نما
صورتوں کی جانب خاص توجہ دی گئی۔ لکڑی کے
تختوں پر نقش اُبھارے گئے۔ عمارتوں کے اندر
دیواروں کو طرح طرح منقش کیا جانے لگا، محرابوں
کے نئے نئے ڈیزائن تیار کیے گئے۔ خطِ کوفی میں
خطاطی کے خوبصورت نمونے آویزاں ہونے لگے
بارہویں صدی کی ابتدا میں ترک فنکاروں نے
قلعوں، محلوں اور مکانوں کو تصویروں سے سجا
کر انھیں نگار خانہ بنا دیا۔ مسجدوں کی اندرونی
لکڑی کی چھتوں پر گل بوٹے ابھار کر ایک نئی جہت پیدا کر دی گئی۔

سلجوق وہ ترکمانی خانہ بدوش تھے جو بخارا
اور ایران میں داخل ہوئے تو ان علاقوں کی مٹی
سے گہرا رشتہ قائم کر لیا۔ یہاں کے ماحول میں
جذب ہو گئے، رچ بس گئے۔ ان کے عروج
سے ترک اقدار و عناصر کی آبیاری ہونے لگی۔
درباروں میں فنون کی سرپرستی ہونے لگی۔ اور
سلجوقیوں نے اپنی روایات اور مقامی اثرات
کی آمیزش سے مختلف تجربے کیے۔ . . . مقبروں
کو زیادہ سے زیادہ خوبصورت بنانے کا رجحان
اتنا بڑھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے پرانے مقبروں کی
نئی تعمیر شروع ہو گئی۔ اور نئے مقبروں کے
لیے نقشے تیار ہونے لگے اور ان نقشوں کے
مطابق انھیں شاہکار بنانے کی کوشش کی جانے
لگی۔ مسجدوں کی طرح مقبروں کو بھی جاذبِ نظر
اور پُرکشش بنایا گیا۔ ۹۸۵ء میں جو مقبرے
تعمیر ہوئے ان پر ستاروں کے پیکر زیادہ ملتے
ہیں۔ ۱۱۸۶ء میں مقبروں میں گنبد لگائے گئے،
بزرگوں کے آستانوں کی تعمیر میں جہاں
سادگی کا حسن قائم رہا وہاں نقاشی
اور تزئین کاری سے کشش بھی پیدا کی گئی۔ مدرسوں
کی عمارتوں سے سلجوقی فنکاروں کی گہری دلچسپی
رہی ہے مدرسے مذہبی تعلیمات کے مرکز
تھے۔ لہٰذا ان کی عمارتوں کو زیادہ پُرکشش اور
جاذبِ نظر بنانے کی طرف توجہ دی گئی معروف

سلجوقی وزیر نظام الملک نے جس نے عمر خیام
کی سرپرستی کی تھی نیشاپور میں ایک مدرسہ قائم
کیا اور اس کی عمارت کی خوبصورت تعمیر میں
پیش پیش رہا۔ مختلف علاقوں میں سلجوقیوں نے
فنِ تعمیر سے گہری دلچسپی لی، دمشق میں ان کی تعمیر
کردہ عمارتوں کی ایک اعلیٰ روایت رہی ہے۔ آرائش و
زیبائش اور تزئین کاری سے ان کی گہری دلچسپی
رہی لہٰذا ان کی تعمیر کردہ مسجدوں، مدرسوں
اور قلعوں میں ان کا یہ رجحان بہت واضح رہا۔
پتھروں اور لکڑیوں پر کندہ کاری کی وجہ سے
ان کی عمارتوں کا ایک نیا اسلوب پیدا ہو گیا
تھا۔ مقبروں کے کتبوں کو خطِ کوفی کے حُسن سے
اُبھار کر سلجوقی فنکاروں نے ایک عمدہ روایت
قائم کی جس کے دور رس اثرات ہوئے۔

ایران میں مسجدوں کی تعمیر کی تاریخ ۱۰۰۰ء
سے شروع ہوتی ہے۔ ۱۰۵۰ء سے ۱۰۸۶ء تک
تہران اور مشہد اور دوسرے کئی شہروں میں
خوبصورت مسجدیں اور عمارتیں تعمیر ہوئیں بعض
مسجدیں تو جلال وجمال کا اعلیٰ ترین مظہر ہیں۔
عجمی معماروں اور صنّاعوں نے گنبدوں کو زیادہ
سے زیادہ دلکش بنانے کی کوشش کی۔ ۱۰۸۰ء
میں قم کی جامع مسجد میں جو گنبد لگایا گیا وہ کم و بیش
اسی فٹ اونچا تھا۔ اور انتہائی جاذبِ نظر تھا۔
ایران کی مسجدوں کو غور سے دیکھا جائے تو محسوس
ہوگا کہ گنبد سازی اور گنبد تراشی میں مختلف قسم
کے تجربے ہوتے رہے ہیں سلجوقیوں کے عہد
میں اکہری صورت کے گنبد مقبول تھے جن پر
ساسانی اثر واضح تھا۔ سلطان سنجر (۱۱۵۷ء)
کے مقبرے پر جو گنبد ہے اس کی صورت مختلف
ہے۔ اس کی دوہری صورت واضح ہے۔ گنبد
قابوس (۱۰۰۷ء) کی صورت ان دونوں سے
مختلف ہے۔ گنبد کے اندر گنبد کی تعمیر کی گئی
ہے۔ اس میں پکی اینٹوں کا استعمال ہے۔ خطِ کوفی
میں جو دو تحریریں ہیں ان کا حسن متاثر کرتا ہے۔

عجمی معماروں نے میناروں کی تعمیر میں بھی گہری
دلچسپی کا اظہار کیا۔ بعض مقبروں کے مینار اُن کے
آرٹ کے شاہکار تصور کیے جاتے ہیں۔ سلجوقی
آرٹ نے میناروں کے حسن میں جو اضافہ کیا
ہے اس کی پہچان مسجدوں اور مقبروں کے کئی
میناروں سے ہوتی ہے جو عموماً پتھروں سے بنے ہیں
اور مثمن (OCTAGON) صورتوں میں ابھرے ہوئے ہیں
سلجوقی فنکاروں نے محراب سازی میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا
اظہار زیادہ فنکارانہ طور پر کیا ہے۔ چھوٹی چھوٹی
اینٹوں سے محراب کے حسن کو ابھارا گیا ہے،
اینٹوں کی مناسب ترتیب متاثر کرتی ہے۔
پتھروں کی مدد سے بھی اسے زیادہ مضبوط اور
مستحکم بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

عجمی معماروں اور تعمیر کاروں نے
سلجوقیوں کے عہد میں مسجدوں، مقبروں، مدرسوں،
ہسپتالوں اور دوسری عمارتوں کی تعمیر کرتے
ہوئے اپنے احساسِ جمال کی کئی جہتوں کو نمایاں
کیا ہے۔ خطِ کوفی اور خطِ نسخ دونوں کے حُسن
کی جانے کتنی مثالیں مختلف عمارتوں پر ملتی ہیں۔
عمارتوں کی تزئین اور آرائش میں عربی رسم خط
کے جلوؤں نے بڑی مدد کی ہے۔ استر کاری
کے مسالے (STUCCO) سے بھی عمارتوں کے
حسن میں اضافہ ہوا ہے۔ قلعوں اور امرا کے محلوں
کو تصویروں سے سجا کر اُنھیں اور پُرکشش
اور جاذبِ نظر بنا دیا۔ شکار اور دربار کے
مناظر کو نقش کرنے یا کندہ کرنے کا عام رجحان
رہا ہے۔ ۱۲۲۰ء میں چنگیزی طوفان نے جانے
کتنی عمارتوں کو ہمیشہ کے لیے مٹا کر رکھ دیا۔
نیشاپور کی تباہی کی وجہ سے سلجوقی آرٹ کے
جانے کتنے شاہکار ہمیشہ کے لیے گم ہو گئے۔ شہر
کے شہر تباہ ہوئے اور خوبصورت ترین عمارتیں
نذرِ آتش ہو گئیں۔

۱۲۹۵ء سے منگولوں نے فنِ تعمیر کی
طرف توجہ کی اور تبریز کے قریب عجمی فنکاروں
کی مدد سے چند عمدہ عمارتیں اُبھرنے لگیں۔۔۔
غازان خان نے جب اسلام قبول کیا تو اُس نے
ایران کی روایات سے دلچسپی لینا شروع کی چونکہ
وہ خود ماہرِ تعمیرات تھا اور عمارتوں کے عمدہ
نقشے تیار کیا کرتا تھا۔ لہٰذا اُس نے عجمی معماروں
کی حوصلہ افزائی کی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ فنِ تعمیر
کی تاریخ کا ایک مستقل عنوان بن گیا۔ صوفیوں اور
درویشوں کے لیے اس نے ایک خوبصورت
عمارت تعمیر کی جس میں کئی حُجرے تھے۔ اُس کی
نگرانی میں پرانے مقبروں کی نئی تعمیر ہوئی۔ مدرسوں
اور کتب خانوں کی دلکش عمارتیں اُبھرنے لگیں،
شہروں کے دروازوں کو منقش کیا جانے لگا۔
بازاروں میں کئی دُکانیں سجائی گئیں اور اُنھیں
آرٹ کے نمونوں سے سجایا گیا۔ تاج الدّین
علی شاہ اس عہد کا ممتاز ماہر اور صنّاع گزرا
ہے جس نے غازان خان کی ہمیشہ مدد کی اور
اس کے تیار کیے ہوئے نقشوں کو حقیقتوں میں
تبدیل کیا۔ غازان خان کے لڑکے محمد خدابندہ
نے بھی فنِ تعمیر سے گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔
اس نے مدرسوں، مسجدوں اور خانقاہوں کی
عمارتوں کے ساتھ عوامی غسل خانوں اور بازار
کی دکانوں کی تعمیر کی۔ اس کے مقبرے کے
حسن کی تعریف مغرب کے ماہرین اب تک
کرتے ہیں۔ یہ منگول آرٹ کا ایک شاہکار سمجھا
جاتا ہے۔ تاج الدّین شاہ نے تبریز میں جو مسجد

تعمیر کی وہ آج بھی شکستہ حالت میں موجود ہے،
کہا جاتا ہے کہ اس پر سونے اور چاندی کا عمدہ
کام بھی تھا۔ اور ان کی مدد سے محراب کو زیادہ
جاذبِ نظر بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔

ایرانی منگول فنِ تعمیر کی ایک مسلسل
روایت رہی ہے۔ منگولوں نے جہاں ایرانی آرٹ
کو اپنے تجربوں سے متاثر کیا وہاں وہ خود ایرانی
فنون کی جمالیاتی قدروں سے متاثر ہوئے۔
ایرانی جمالیاتی تجربے بڑے مستحکم اور مضبوط رہے
ہیں۔ لہٰذا نصف صدی سے کم عرصے میں یہ تجربے
ایک بار پھر چھانے لگے اور پندرہویں صدی
میں تو اپنی انفرادی جمالیاتی خصوصیتوں کا باضابطہ
احساس دلانے لگے۔ اصفہان، تبریز اور
مشہد اور دوسرے شہروں میں مسجدوں، مدرسوں
مقبروں، محلوں اور مکانوں کی تعمیر پر ایرانی
روایات اور اقدار کی گہری چھاپ پڑنے لگی۔
محراب سازی، گنبد سازی اور ستون تراشی
اور ایوان، صحن، اور حرم وغیرہ کی نئی تعمیر نے
عجمی تجربوں کی نئی جہتوں کو شدت سے نمایاں
کیا۔

مملوک معماروں اور تعمیر کاروں نے
ایوبی دبستان (شام) سے متاثر ہو کر فنِ تعمیر
کو کئی نئی جہتیں عطا کیں۔ پتھروں سے خوبصورت
عمارتیں تعمیر کیں۔ ان کی تعمیر کردہ مسجدیں اور
مدرسے جلال وجمال کا مظہر ہیں۔ ہسپتالوں
کی عمارتوں کو بھی جاذبِ نظر بنایا۔ فنِ تعمیر
میں عہدِ مملوک کے کارنامے بڑی اہمیت
رکھتے ہیں۔ تیرہویں صدی کے وسط سے سولھویں
صدی کی ابتدا تک یعنی کم وبیش دو سو پچاس
سال تک کے دور میں فنکاروں، معماروں اور
صناعوں نے بڑے کارنامے انجام دیے۔

فلسطین اور شام سے صلیبی حملہ آوروں
کو نکال کر جب مملوک شام کے حاکم بن گئے
تو انھوں نے پتھروں کی تراش خراش اور
پتھروں کی آرائش وزیبائش سے زیادہ کام لینا
شروع کیا۔ مملوک معماروں اور صناعوں نے
سلجوقی اور نصرانی روایات کے بھی گہرے
اثرات قبول کیے ہیں۔ مملوکوں کا عہد تہذیبی اور
تمدنی آمیزش اور آویزش کا ایک بڑا اہم دور
تھا۔ ان کے فن پر جہاں ایرانی اور عراقی اثرات
ہیں وہاں آرمینی اور بازنطینی اثرات بھی ہیں۔
سلجوقی آرٹ نے بھی انھیں گہرے طور پر متاثر
کیا ہے۔ مملوک بہت جلد سنگی تعمیر کے بڑے
معمار اور تعمیر کار بن گئے۔ قاہرہ کی بہت
سی عمارتیں آج بھی ان کے فن کی عظمت
کی گواہ ہیں۔

ملکہ شجرۃ الدر (موتیوں کا درخت)
کا مقبرہ ابتدائی مملوک گنبد سازی اور استر
کاری کے فن کا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ اس
مقبرے میں خشتی طاقتوں کی دو قطاریں توجہ
طلب ہیں۔ اس لیے کہ یہ تزئین کاری اور
آرائش کے مملوک رجحان کو نمایاں کرتی ہیں۔

قاہرہ کے شمال میں ایک مسجد تعمیر ہوئی
جس کے آثار اب بھی موجود ہیں، یہ مملوک
حکومت کے بانی بیبرس کی تعمیر کردہ مسجد ہے
کم وبیش سوا ایکڑ زمین پر بنی تھی اور اس میں
سنگ مرمر کا استعمال کیا گیا تھا۔ اس پر نصرانی
اثرات ملتے ہیں۔ سنگی تعمیر کا یہ عمدہ نمونہ ہے۔
یہ وہی جامع مسجد ہے جسے نپولین نے مصر میں
قلعے کے طور پر استعمال کیا تھا۔ اس کی تکمیل
۱۲۶۹ میں ہوئی۔

۱۲۸۴ء میں الملک المنصور سیف الدین
نے ایک شفاخانے کی عمارت تعمیر کی اور اس کے
ساتھ ہی ایک مدرسہ بنوایا۔ ان دونوں عمارتوں
میں سنگِ مرمر استعمال کیا گیا تھا۔ اس دور
میں سنگی عمارتوں کی تعمیر کا سلسلہ شروع ہو گیا
تھا۔ مسجدوں اور مقبروں کو دلکش بنانے کا رجحان
واضح رہا ہے۔ سیف الدین کا مقبرہ آج بھی موجود
ہے۔ اس عہد کی تعمیرات پر جہاں شامی اور سلجوقی
اثرات ہیں وہاں گوتھک اور مورتی اثرات بھی
ملتے ہیں۔ گنبدوں اور دریچوں کو زیادہ جاذب نظر
بنانے کی کوشش کی گئی۔ اسی طرح روشن دانوں
اور ستونوں کی آرائش کی طرف بھی خاص توجہ دی۔
عمارتوں کو بلند بنانے اور فن کے جلال کو ظاہر
کرنے کا رویہ خاص طور پر توجہ طلب ہے۔

الملک المنصور سیف الدین اور اس کے
لڑکے الناصر محمد ۱۲۹۳ء ۱۳۴۰ء دونوں نے
فنِ تعمیر سے گہری دلچسپی لی تھی، الناصر نے ہزاروں
مزدوروں کی مدد سے اس نہر کی تعمیر کی جس سے
اسکندریہ اور دریائے نیل کا رشتہ قائم ہو گیا۔
قاہرہ میں ایک بڑے وسیع قلعے کی تعمیر کی جس کی
شہرت دور دور تک پہنچی۔ الناصر تیس خوبصورت
مسجدوں کا خالق کہا جاتا ہے۔ وہ خود تعمیرات
کا ماہر اور معمار تھا۔ فنونِ لطیفہ سے اس نے
گہری دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔

الناصر کے لڑکے سلطان حسن کی دلچسپی بھی
فنِ تعمیر سے کم نہ تھی، اس کی تعمیر کردہ مسجدوں
کی تزئین کاری نے بڑی شہرت حاصل کی۔ مسجدوں
میں صحن کی تشکیل کرتے ہوئے اس نے چار دالان
بنوائے جہاں اسلامی دینیات کے چار ممتاز
دبستانوں کے علما بیٹھتے اور نمازیوں کو درس دیتے۔
معماروں نے اینٹوں اور لکڑیوں کی مدد سے ان
مسجدوں کے حسن میں اضافہ کیا۔ گنبد ہلکے لیکن

خوبصورت لکیروں کے حامل تھے، مختلف رنگوں کے پتھروں کے استعمال سے عمارتیں پرکشش بن گئی تھیں۔

مملوک سلطانوں نے شام سے مدرسوں کے خاکے حاصل کیے اور شرقی ترکستان سے گنبد سازی کے فن کے نمونے لائے اور ان دونوں سے مسجدوں کے خاکے اور نقشے تیار کیے۔ ۱۲۶۰ء سے ۱۲۷۰ء تک کی تعمیر کردہ مسجدوں پر ان کی پہچان ہو سکتی ہے۔

مسلمان معماروں، صناعوں، سنگ سازوں اور تعمیر کاروں نے جہاں خشتی مسجدوں کا اعلیٰ معیار پیش کیا ہے وہاں سنگی مسجدوں کا بھی ایک عمدہ معیار پیش کیا ہے۔ سنگ کاری اور تزئین و آرائش میں رفتہ رفتہ وہ آگے ہی بڑھتے گئے ہیں۔ کوفی کتبوں کی تزئین کاری، گل بوٹوں کی آرائش اور کندہ کاری میں انھوں نے جو اعلیٰ مقام حاصل کیا ہے اس کی کوئی اور مثال نہیں ملتی۔

وسط ایشیا نے تعمیر کاری میں جہاں اعلیٰ معیار قائم کیے وہاں انگنت جمالیاتی جہتوں کی تشکیل میں بھی نمایاں حصہ لیا۔ سامان اسمٰعیل (۸۹۲ء ـ ۹۰۷ء) کا مقبرہ بخارا میں تعمیر ہوا تو غالباً پہلی بار محسوس ہوا کہ اینٹوں کی تراش خراش اور ان کی فنکارانہ ترتیب سے حسن کا کتنا اچھا نمونہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ عرصہ تک معماروں نے اینٹوں کی مدد سے مقبروں کو جاذب نظر بنانے کی کوشش کی۔ اس کی صورت مکعبی ہے ایک خوبصورت گنبد ہے اور ایک دلکش محراب درمیانی گنبد کے گرد چار چھوٹے قبّے (CUPOLA) اس مقبرے کو اور پرکشش بنا دیتے ہیں۔

فرغانہ کے مشرق میں بھی خوبصورت مقبرے ملتے ہیں۔ یہاں ایک پرانا مینار بھی ہے جو شکستہ حالت میں ہے۔ ایران اور ترکی کے میناروں کو دیکھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ ان کا رشتہ وسط ایشیا کے ایسے ہی میناروں سے ہے۔ فنکاروں نے اقلیدسی صورتوں سے گہری دلچسپی لی اور ٹائیل کی مدد سے ان صورتوں کو زیادہ جاذب نظر بنایا۔

حاجی یوسف عہدانی کی یاد میں ۱۱۴۸ء میں جو "مسجد ہمدان" تعمیر ہوئی وہ آج بھی جلال و جمال کے بہتر نمونے کے طور پر سامنے ہے۔

تیمور نے سمرقند کو ایک بہت بڑا تہذیبی مرکز بنا دیا تھا۔ ۱۳۳۶ء سے ۱۴۰۴ء تک اس کے عہد میں جانے کتنی خوبصورت اور دلکش عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ قلعے، محل، مسجدیں اور حجرے آج بھی اس دور کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ یہ سب حسن کے اعلیٰ ترین شاہکار ہیں۔ ان پر چینی اور ترکی اثرات بھی ملتے ہیں۔ ۱۳۹۷ء میں سمرقند میں خوجہ احمد کی مسجد تعمیر ہوئی۔ خواجہ احمد کا مقبرہ اسی مسجد کے قریب ہے۔ اس مسجد کی مربع نما صورت اور اس کے دو دلکش گنبد تعمیر کاری کا عمدہ نمونہ ہیں۔ ایک گنبد تربوز کی صورت لیے ہوئے ہے جو تیموری دور کے معماروں کی ایک بڑی خصوصیت رہی ہے۔ یہ صورت وسط ایشیا کے مختلف علاقوں میں بے حد مقبول ہوئی۔ دروازے کے قریب دو بڑے مینار ہیں جو اس عہد کے قلعوں کے میناروں سے ملتے جلتے ہیں۔ تیمور نے اپنے وطن کش میں ایک پرشکوہ قلعہ تعمیر کیا جس کی عظمت کا تذکرہ ہر دور میں ہوتا رہا ہے۔

۱۴۰۱-۲ء میں تیمور نے اپنی بیگم بی بی خانم کی یاد میں سمرقند میں ایک انتہائی دلکش اور جاذب نظر مسجد تعمیر کی۔ اس میں گنبد سازی کا ایک نیا تجربہ ملتا ہے۔ اس کے دروازے آرٹ کی عمدہ مثال ہیں۔

تیمور نے اپنی زندگی میں اپنا مقبرہ تعمیر کرایا تھا جو گورِ امیر کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا پرشکوہ گنبد فنِ تعمیر کی تاریخ میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ "ٹائیل" کے استعمال میں فنکارانہ ہنرمندی ملتی ہے۔ کئی رنگوں کے پتھروں سے اس کی دیواروں کو منقش کیا گیا ہے۔ عربی اور فارسی میں کئی کتبے ہیں جو اس کے حسن میں اضافہ کرتے ہیں۔

تیمور کے لڑکے مرزا شاہ رخ (۱۴۰۴ء ـ ۱۴۴۷ء) نے خراسان میں ہرات کو دارالحکومت بنایا۔ فنِ تعمیر سے اس نے بھی گہری دلچسپی لی۔ شہر پناہ کی تعمیر کی اور اس کے اندر اپنا قلعہ بنوایا۔ شہر پناہ کی دیوار اونچی اور پرشکوہ تھی جس میں چار بڑے دروازے تھے۔ مسجد بھی اسی دور کی یادگار ہے، خراسان میں اتنی خوبصورت اور دلفریب عمارت اور کہیں نظر نہیں آتی۔ شاہ رخ کی بیوی گوہر شاد نے بھی فنِ تعمیر میں اپنی گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔ ہرات میں اس نے ایک بڑے مدرسے کی تعمیر کی جس کا نقشہ اس عہد کے معروف ماہرِ تعمیرات استاد شیرازی نے تیار کیا تھا۔ ہرات میوزیم میں اس مدرسے کا ایک پتھر (سنگِ مرمر) آج بھی رکھا ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ معروف خطاط جعفر جلال ہراتی نے اس مدرسے کی بڑی عمارت کو اپنے فن سے سنوارا تھا۔

تیموری دور کے معماروں، صناعوں اور سنگ سازوں نے فنِ تعمیر کی ایک اعلیٰ ترین روایت قائم کی۔ اس روایت نے دوسرے ملکوں کا پراسرار سفر کیا ہے۔

اسپین نے فنِ تعمیر کی جمالیات کے دائرے کو وسیع سے وسیع تر کرنے میں نمایاں

حصہ لیا ہے۔ اسپین میں مسجدوں، قلعوں، محلوں،
باغوں، فواروں اور حماموں کی تعمیر کا جو سلسلہ
عبدالرحمٰن اوّل (۷۵۶، ۷۸۸ء) کے عہد
سے شروع ہوا وہ صدیوں تک قائم رہا۔ شامی
فنکاروں اور معماروں نے ابتدا سے ان کی تعمیر
میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسپین
کی تعمیرات پر شامی اثرات زیادہ نمایاں اور
واضح ہیں۔

اُمیہ خلفا نے قرطبہ کو ایک بڑا تہذیبی مرکز
بنا دیا تھا۔ عبدالرحمٰن اوّل نے شہر پناہ کی تعمیر
کی اور قرطبہ سے کچھ دور اپنا قلعہ بنوایا جو فنی اعتبار
سے اُن کے دادا خلیفہ ہشام کے شامی قلعے کی تعمیر
سے قریب تھا۔ ۷۸۶ء میں مسجد قرطبہ کی بنیاد رکھی
مجموعی طور پر ان کی تعمیر پر اسّی ہزار دینار خرچ
ہوئے تھے۔ یہ مسجد جو جلال و جمال کا ایک عمدہ
پیکر ہے۔ ایک سال میں بن کر تیار ہوئی، ساڑھے
چھتیس ہزار مربع گز پر یہ دنیا کی تیسری بڑی مسجد
ہے۔

عبدالرحمٰن اوّل کے جانشینوں نے ہر دور
میں اس میں تبدیلیاں کی ہیں۔ رومی معبد کے بعد
یہاں کلیسا بنا اور اس کے بعد مسجد قرطبہ کی تعمیر
ہوئی۔ ابتدا میں صرف کلیسا کا نصف حصہ مسلمانوں
کی عبادت کے لیے تھا۔ عبدالرحمٰن اوّل نے پورا
کلیسا خرید لیا اور اس مسجد کی بنیاد رکھی۔ عبدالرحمٰن
ثالث نے اس کا مربع نما مینار بنوایا۔ المنصور
(۹۷۶ء، ۱۰۰۲ء) نے اس کی تزئین و آرائش میں
گہری دلچسپی لی۔ محراب کے قریب گنبد بھی ۷۸۶ء
کے بہت بعد بنا ہے۔

مسجد قرطبہ میں چھتوں، ستونوں، سرستونوں،
گھوڑ نعلی کمانوں، دائروں، مربعوں، کمانوں کی
نیم دائرہ صورتوں، محرابوں، گنبدوں اور کشادگی کے
کام اور پچی کاری اور قبلہ، دالان، مقصورہ اور
حرم وغیرہ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ
فنِ تعمیر کی ایک اعلیٰ روایت کی تشکیل ہوئی ہے،
اس روایت نے اپنی جمالیاتی روایات سے بھی
بامعنی رشتہ قائم کیا ہے اور مقامی اثرات سے
نئی جمالیاتی جہتوں کی تشکیل بھی کی ہے۔

عبدالرحمٰن ثالث (۸۲۲ء، ۸۵۲ء) نے
ایک بڑی شاندار اور پُرشکوہ حویلی تعمیر کی ۸۳۶ء
میں اس کی تعمیر شروع ہوئی۔ اور بیس سال تک
یہ سلسلہ چلتا رہا۔ وادی الکبیر کے قریب یہ حویلی
فنِ تعمیر کا عمدہ نمونہ تھی۔ اپنی رفیقۂ حیات کے
نام پر اس کا نام الازہرہ رکھا۔ اس میں چار سو
کمرے تھے، مشرقی بڑے کمرے میں فوارے
لگے ہوئے تھے جہاں بعض جانوروں کے طلائی
مجسمے قیمتی پتھروں پر لگائے گئے تھے۔ ان جانوروں
کے مُنہ سے پانی جاری رہتا تھا۔ سنگ مرمر کے
ساتھ سونے اور جواہرات کی آمیزش انتہائی
فنکارانہ تھی۔ کہا جاتا ہے اس حویلی کی تعمیر میں دس
ہزار مزدوروں نے حصہ لیا تھا۔

ابن احمر (۱۲۷۲ء) نے غرناطہ میں اپنا
’سرخ محل‘ تعمیر کیا جو اسپین میں اعلیٰ ترین
تعمیر کاری کا نمونہ سمجھا گیا ہے۔ پچی کاری کا آرٹ
اپنے عروج پر تھا اور کتبوں کو انتہائی فنکارانہ
انداز میں سنگ مرمر پر اُبھارا گیا تھا۔ سرخ محل
کے سایہ بان اور گنبد اور اس کی خوبصورت
چھتوں نے اسپین کی اعلیٰ روایت کو آگے بڑھا
دیا تھا۔ اس میں خوبصورت باغ تھا، فوارے
تھے، کمروں میں مصوری کے خوبصورت نمونے
تھے۔ ہلکے نیلے، گلابی اور سنہرے رنگوں سے کمروں
کو جاذب نظر بنایا گیا تھا۔ موسیقی کے لیے ایک
بہت بڑا ہال تھا جسے سجانے میں ابن احمر نے
ذاتی دلچسپی لی تھی۔

سلجوقیوں نے ترکی میں بڑی خوبصورت
عمارتیں تعمیر کیں۔ گیارہویں صدی سے ان کی
تعمیر کردہ عمارتوں کی باضابطہ تاریخ موجود
ہے۔ ڈھائی سو سال کی حکومت میں انھوں نے
شہروں میں مسجدیں تعمیر کیں، قلعے بنوائے، مدرسوں
اور شفاخانوں کی عمارتیں بنوائیں۔ ان کے بنوائے
ہوئے سرائے، پُل اور فوارے فنکاری کے
عمدہ نمونے سمجھے گئے ہیں، مقبروں کی آرائش اور
تزئین کاری میں اناطولیہ کے فنکار پیش پیش رہے
ہیں۔

ترکوں نے سلجوقیوں کی روایت کی قدر کی
اور فنِ تعمیر میں اس کی روشنی حاصل کی ترکی معماروں
اور تعمیر کاروں نے اس روایت کو اس طرح
جذب کیا کہ تہذیبی آمیزش کے خوبصورت
جلوے فنِ تعمیر کی اعلیٰ سطحوں کا احساس عطا
کرنے لگے۔ سولھویں اور سترھویں صدی میں تو
اس آمیزش نے اعلیٰ ترین منزل حاصل کر لی۔

ترک معماروں نے گیارھویں صدی میں
اناطولیہ میں ایک دلکش مسجد تعمیر کی تھی جس میں پتھروں
اور لکڑیوں کا استعمال کیا گیا تھا، اس کی صورت
مستطیل تھی اور اس کے گرد ایک مضبوط دیوار
اٹھائی گئی تھی۔

سلجوقی معماروں اور تعمیر کاروں نے
خراسان کے آرٹ کو متعارف کیا اور گنبدوں
اور محرابوں کی تشکیل میں خراسانی انداز کو قائم رکھا
۱۲۲۹ء کے بعد مقبروں کی تزئین و آرائش میں بھی
یہ انداز ملتا ہے۔ انھوں نے عموماً اینٹوں کی جگہ
پتھروں کا استعمال کیا ہے۔ ۱۳۱۲ء میں خدابندہ
خاتون کا مقبرہ تعمیر ہوا۔ جس میں اقلیدسی صورتوں
کی تنظیم و ترتیب توجہ طلب ہے، مدرسوں اور

مساجد کے دروازوں کی آرائش کے تجربے

سامرہ کی جامع مسجد کے دروازے کا خاکہ (۸۴۶ء - ۸۵۲ء)

مسجد قرطبہ کے دروازے کا خاکہ (۹۶۱ء - ۹۷۶ء)

ہسپتالوں کی عمارتوں میں بڑے بڑے دروازے لگائے گئے اور ان کی دیواروں کو منقش کرنے کی کوشش کی گئی۔

وسط ایشیا کی عمارتوں کی طرح، ترک عمارتوں کی صورتیں عمودی نہیں ہیں بلکہ عام طور پر افقی ہیں۔

مسلمان اس عظیم تہذیبی ورثے کے ساتھ ہندوستان آئے۔

فنِ تعمیر کی وسیع تر، تہہ دار اور جہت دار جمالیات نے برِ صغیر کے نظامِ جمال سے تخلیقی رشتہ قائم کیا اور یہاں تعمیرات میں نئے جلوے بھرنے لگے۔

'ہند مغل جمالیات' کے پس منظر میں ان تمام جمالیاتی تجربوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ برِ صغیر کے نظامِ جمال سے تخلیقی رشتہ قائم کرکے مسلمانوں کے اس فن نے جہاں فنی اور جمالیاتی تجربوں کی ایک کائنات سامنے رکھ دی۔ وہاں انسان اور انسان کے ذہنی اور جذباتی رشتوں کو بھی استحکام بخشا۔

جام دیا ہے چوم کر، اور سرور بڑھ گیا
خون میں پھول کھل گئے، آنکھ میں نور بڑھ گیا

خوب اڑا لیا غبار، گھوم چکے ہر اک دیار
فائدہ دل کو کچھ نہیں، درد ضرور بڑھ گیا

ہاتھ خطا کا تھام لے، عفو و عطا سے کام لے
بندش و احتساب سے، جرم و قصور بڑھ گیا

اس نے نگاہ پھیر کر، راستہ دے دیا مجھے
بوجھ وہیں اُتار کر، میں بھی حضور بڑھ گیا

حال مظفر آپ کا، غیر تھا یوں ہی عشق میں
اور بنامِ شاعری، ایک فتور بڑھ گیا

مظفر حنفی

شعبۂ اُردو، کلکتہ یونیورسٹی، کلکتہ ۷۳

محسن زیدی

نہ آسمان کا رکھا نہ اِس زمیں کا مجھے
ڈبو یا اُس نے تو چھوڑا نہیں کہیں کا مجھے

اُسے تلاش کروں جا کے کس دیار میں اب
دیا تھا اُس نے تو اپنا پتا یہیں کا مجھے

میں ایک بار ترے راستے سے کیا بھٹکا
کہ عمر بھر نہ ملا راستہ کہیں کا مجھے

دیارِ غیر میں مانوس سی مہک کیسی
لگے ہے بو سے، یہ گل اپنی سرزمیں کا مجھے

سوال کر کے میں اب کس قدر پشیماں ہوں
کہ وسوسہ تھا تمھاری اِسی نہیں کا مجھے

خوشا نصیب! ملا ہے وہ اعتبارِ نظر
کہ خوف ہے کسی ناقد نہ نکتہ چیں کا مجھے

زوالِ شب کا میں لے کر پیام آیا ہوں
سفیر جانیے اس دورِ آخریں کا مجھے

عطا ہوا مجھے محسن یہ فرشِ مخمل کیوں
کہ جب مزاج ملا بوریا نشیں کا مجھے

۱۷۷، راؤز ایونیو، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

بیٹھا نہیں تھا اُجڑا ہوا گھر سجا کے میں
تھا کربِ انتظار میں اُس کو بلا کے میں

مایوسیاں ہیں، اِس میں انا کا سوال کیا
نادم ہوا ہوں دستِ طلب کو بڑھا کے میں

بے نام خواہشوں کی طرف دیکھتا ہے کون
کس سمت جاؤں بارِ تمنا اُٹھا کے میں

میرے لیے ہے چاروں طرف نفرتوں کی آگ
مجرم ہوں ایک جلتا ہوا گھر بچا کے میں

نکلا نہیں ہوں اب بھی صدا کے حصار سے
اپنے شجر کے سارے پرندے اُڑا کے میں

بدلی ہوئی فضا نے مجھے کر دیا نڈھال
سمجھا تھا کامیاب ہوں فصلیں اُگا کے میں

جب زندگی سے ترکِ تعلق کا ہے سوال
اب اور کس کو دیکھوں گا اپنا بنا کے میں

میرا وجود اُس کی نظر میں نہیں حیات
لایا تھا جس کو سب کی نظر سے بچا کے میں

حیات لکھنوی

امامیہ ہال، پنچکوئیاں روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

حبیب کیفی

جلی روٹی

آپ غلط کہہ رہے ہیں جناب! روٹی جلی ہوئی نہیں ہے۔ البتہ یہ کچھ کراری ضرور ہے۔ اور اگر سچ کہوں تو یہ کہ روٹی آپ کو کھانی ہی نہیں آتی۔ جی ہاں، میں آپ ہی سے مخاطب ہوں۔ اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ روٹی اگر اس قدر کراری نہ ہوتی تو بھی آپ کو پسند نہ آتی۔ یقینی طور پر آپ اس میں کچھ نہ کچھ نقص نکالتے اور شکایت کرتے کہ اندر بیٹھا ہوا رسوئیا مزے کر رہا ہے۔

ہم لوگ کتنے مزے کرتے ہیں، یہ میں بعد میں بتاؤں گا۔ لیکن پہلے میں آپ کی اصلیت اور حقیقت کا پتہ دے دوں۔ آپ کا نام دھام بتانا بے معنی ہے۔ پول کھلنے ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ نہایت ہی مہذب کہے جانے والے لوگوں میں سے ایک ہیں۔ آپ کے پاس ایک اچھا سرکاری عہدہ ہے جس کی بدولت تنخواہ کے علاوہ بھی آپ کی اچھی خاصی آمدنی ہے۔ رعب ہے۔ تو جناب! یہ تو ہوئیں سطحی باتیں۔ اب ذرا اندرونی باتیں بھی ہو جائیں۔

یوں ہے کہ اگر دیکھا جائے تو آپ کے گھر کا خرچ آپ کی تنخواہ میں آرام سے چل سکتا ہے اور آڑے وقت کے لیے آپ کچھ بچا بھی سکتے ہیں۔ لیکن نہیں، آپ کے منہ تو خون لگ چکا ہے۔ اوپری چمک دمک نے آپ کا دماغ خراب کر رکھا ہے۔ کبھی آپ کے پاس سائیکل تک نہیں تھی اور اب یہ عالم ہے کہ پچھلے سال ہی خریدی گئی کار کو فروخت کر کے آپ جدید ترین ماڈل اور پسندیدہ رنگ کی کار خریدنا چاہتے ہیں۔

پہلے آپ ایک چال قسم کی جگہ میں رہتے تھے۔ اب صورت یہ ہے کہ جو تھا مکان بنوانے کی غرض سے آپ نے ایک بڑا سا پلاٹ خریدا ہے۔ آپ کے مکان میں کیا تھا؟ گنتی کے کچھ برتن، اور دو چار میلے سے بستر۔ اور اب تو آپ نے دیسی بدیسی دیدہ زیب کراکری کا ڈھیر لگانے کے علاوہ اسٹیل کے برتنوں کا ذخیرہ کھڑا کر لیا ہے۔ نرم ملائم بستروں پر آپ آرام فرمانے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ آپ اور آپ کا پریوار یکسر بدل گیا ہے ــــــ بیوی کے لیے بیش قیمت زیور اور لباس، بچوں کے لیے عمدہ قسم کے لذیذ ترین کھانے اور کھیل کود کے مہنگے سامان، خود آپ رئیسوں کے چلن لیے ہوئے سچ تو یہ ہے کہ اس وقت آپ کی دولت کا کوئی شمار نہیں ہے۔

آپ کی اس رئیسی کی اصل وجہ میں بیان کر چکا ہوں ــــ آپ کی اوپری آمدنی اور چالاکی! آپ ہر ایک شخص کی ضرورت سے واقفیت رکھتے ہیں۔ خوش کرنے کا فن آپ کو آتا ہے۔ لیکن افسوس کہ پھر بھی آپ دکھی ہیں۔ آپ کو جلی روٹی یا کچی روٹی سے کوئی غرض نہیں ہے۔ آپ کو تو نقص نکالنے کا بہانا چاہیے اور تان مجھ رسوئیے پر ٹوٹی ہے۔

تو میں کہہ رہا تھا کہ آپ دکھی ہیں، آپ کے گھر سے ہی چلتے ہیں۔ آپ اپنی بیوی سے سخت پریشان ہیں کہ نہیں؟ دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دینے کے لیے معاف کریں جناب! پر آپ کی شریکِ حیات ساوتری واقعی ستی ساوتری اور ماں حوا قسم کی عورت ہوا کرتی تھی لیکن یہ آپ کی مفلسی کا زمانہ تھا۔ وہ پوری طرح آپ کے بس میں تھی۔ حالانکہ آپ ستیہ وان نہیں تھے۔

پھر ہوا کیا؟ آپ کی جماعت برادری جب بدل گئی، یعنی آپ جب امیر ہو گئے تو وہ بھی یکسر بدل گئی۔ بلکہ وہ بدل دی گئی۔ گٹ پٹ سیکھ کر اسی تہذیب میں ڈھل جانے کے کارن آپ کی شہ پر وہ آپ کی رنگین پارٹیوں میں شرکت کرنے لگی۔ پہلے پہل جھجکتے ہوئے اور بعد میں دل کھول کر وہ گلائز کرنے لگی۔ گلائز ہونے لگا تو وہ انگریزی دھنوں پر تھرکنے بھی لگی۔ اسے رقص دیکھ کر پہلے پہل تو آپ بڑے خوش ہوئے کہ چلو، ساوتری بھی مہذب ہوئی۔ غیر مردوں کے ساتھ وہ بلا جھجک جھوم جھوم کر رقص کرنے لگی۔ اس طرح خود آپ کو بھی پرائی عورتوں کے ساتھ بانہوں میں بانہیں ڈال کر ناچنے کی چھوٹ مل گئی اور بعد میں اسی وجہ سے بھی آپ کا سکون لٹنے لگا۔ آپ دونوں کی گفتگو کا یہ ایک نمونہ ہے۔

"یہ مرڈیا کیسا لگتا ہے تمھیں؟" ساوتری سے آپ پوچھتے ہیں۔

"بھلا آدمی ہے۔" وہ سادگی سے کہتی ہے۔

"اور میں؟" آپ کی نگاہیں بیوی کو تولتی ہوئی ٹٹولتی ہیں۔

وہ آپ کے سوال کی تہہ تک پہنچنے کے بعد سوالیہ نگاہوں سے آپ کو دیکھنے لگتی ہے۔ اندر ہی اندر وہ تڑپ اٹھتی ہے۔ آپ کی وہ تردید کرنا

۱۵۹، ذاکر حسین کالونی، ۶، چوپاسنی روڈ، جودھپور (راجستھان)

...تی ہے۔ لیکن یک بیک کچھ سوچ کر وہ اپنا رُخ
...بدلتی ہے۔ پلٹ کر وہ ایسی چوٹ کرنا چاہتی ہے
...پ لاجواب ہو جائیں اور پھر کبھی ایسی بات مُنہ
...نہ نکالیں۔

• مسٹر مڑیا کے آگے تو آپ پھیکے پھیکے لگتے
...ا!"

بیوی کی بے باکی پر آپ اندر تک تلملا جاتے
...، خود کو آپ زخمی محسوس کرنے لگتے ہیں۔ لیکن
...بطور خاص خاوند ہونے کے سبب آپ اپنی
...ی کی بات کو غلط رنگ دے ڈالتے ہیں۔ اپنے
...وضعدار الفاظ کو آپ ہتھیار کی صورت استعمال
...نے کی سوچ رہے ہیں کہ اتنے میں اچانک ہی
...پر ایک اور حملہ ہو جاتا ہے:

• اور سنو وہ مسز اہلووالیہ کیسی عورت ہے؟
...وتری پوچھتی ہے۔

• وہ ایک خاندانی اور شریف عورت ہے!"
...کہتے ہیں۔

" جبھی تو وہ اکثر اپنے پورے بدن پر خوشبو
...ر چیکی چپکی تمہارے ساتھ ناچتی رہتی ہے۔
...ن خیال رہے کہ خضاب اس کے تمام بالوں کو
...کر سیاہ نہیں کر سکتا!"

" تو آخر اپنی اوچھی ذات پر اُتر آئی نا!"

بس... بس... بس۔ دیکھا آپ نے؟
...ے تم اور تم سے تُو پر آئے آپ دونوں۔ اور
...س کے بعد تڑاخ اور جوابی تڑاخ جو ہوئی ہے
...کا تذکرہ دلچسپ ہوتے ہوتے بھی بے سود
...ہے... اور آپ کو جلی روٹی کی شکایت ہے!

اور جناب! ادھر آپ واقعی مسز اہلووالیہ
...چکر میں پڑ گئے، اور اُدھر آپ کی ساوتری مڑیا
...رخصت ہوتی ہوئی جوانی کے تجربات سے
...ندہ اٹھانے لگی۔ اور آپ دونوں کو شکوہ شکایت
سے آگے فرصت بھی کہاں ہے؟

تو صاحب! قصہ کوتاہ یہ کہ مرض بڑھتا
ہی گیا جوں جوں دوا کی، دوا آپ نے دارو یعنی
شراب سے کرنا چاہی۔ یہی حال آپ کی بیوی کا
بھی ہے۔ وہ کیوں پیچھے رہتی۔ برابری کا درس
آخر آپ ہی نے تو دیا تھا اُسے۔

مجھے دم لینے کی فرصت نہیں ہے۔ تاہم میں
آپ کے ایک اور صدمے کی طرف اشارہ
کرتا چلوں۔ چھوکرے کا ذکر فضول ہے۔ یہ کمبخت
تو باڑ میں موتتے اور بہتی گنگا میں ہاتھ دھوتے
آئے ہیں۔ ہمارے سماج میں اس کا کوئی نوٹس بھی
نہیں لیتا۔ لیکن جہاں تک چھوکری یا آپ کی
زبان میں بے بی (BABY) کا تعلق ہے وہ تو
غضب ہی ڈھانے لگی ہے۔

اپنی بے بی کے رنگ ڈھنگ آپ نے
دیکھے ہیں۔ اُنیس پار کر چکی یہ آپ کی بے بی آگے
ہرے راما ہرے کرشنا کا انداز اپنائے ہوئے
تھی اور ان دنوں وہ آپ جیسا کوئی... کے
علاوہ ہری اوم ہری اور ڈسکو دیوانے کی دھنوں
پر جھومتی تھرکتی ہے۔ لباس اس کا ماشاء اللہ
لوکٹ (LOW CUT) اور سلیولیس
(SLEEVLESS) رہتا ہے۔ کئی قسم کے نشوں
کی وہ عادی ہو چکی ہے اور کئی کئی طرح کے لوگوں
سے دوستی کر کے وہ کافی تجربہ کار ہو چکی ہے۔
ہے نا! اور آپ اس پر کسی قسم کی کوئی پابندی
نہیں لگا سکتے۔ پابندیاں تو گھروں سے لگا کرتی
ہیں اور گھر ہوا کرتے ہیں عورتوں کے۔ عورت
سے یہاں مراد بیوی سے ہے اور آپ کی بیوی...
ساوتری کے متعلق کچھ اور بھی کہنا باقی رہ گیا ہے
کیا...؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ شعوری یا
لاشعوری طور پر آپ سے وہ کسی قسم کا انتقام
لے رہی ہو...؟

کیا آپ اپنی روٹیوں کا ماضی جاننا چاہیں
گے؟ تو سنیے جناب! بچپن میں آپ مکئی یا جوار کی
روٹیاں کھایا کرتے تھے۔ باجرے کی روٹیاں بھی
تھیں۔ وجہ ظاہر ہے کہ گیہوں آپ کے پریوار کے
لیے بہت مہنگا تھا۔ بلکہ سوکھی روٹیوں سے بھی
آپ کی پیٹ بھرائی ہوا کرتی تھی۔ چھاچھ یا پانی میں
بھیگی ان روٹیوں کا ذائقہ یاد ہے نا آپ کو...؟
اور جب آپ کو گیہوں کی روٹیاں نصیب ہوئیں تو
آپ نے جانا کہ جنت ہی مل گئی ہے! اور حالات
نے جب پلٹا کھایا تو دوسری بہت ساری چیزوں
کے ساتھ ہی ساتھ آپ کو اپنی من پسند روٹیاں
بھی ملنے لگیں۔ آپ کو اپنی ماں کے ہاتھ کی بنی
روٹیوں کی تو یاد ہے نا؟ وہ نیک بخت آپ کو
جب کھلانے بیٹھتی تو آپ پر اپنی ساری مامتا
انڈیل دیا کرتی تھی۔

اور آپ ہیں کہ اب ہماری بنائی ہوئی روٹیوں
سے کھیلنے لگے! ان میں نقص نکالنے لگے ہیں آپ!
سچ کہوں جناب! تو یہ بھی کہ روٹیاں اب آپ
کھاتے ہی کہاں ہیں۔ کہاں ہیں اب جوار باجرے
اور مکئی کی وہ روٹیاں جن میں آپ کی ماں کی ممتا
ملی ہوئی تھی؟ کہ جن میں اس کے کچے دودھ کی
مٹھاس ملی ہوتی تھی۔ کہاں ہیں اب ساوتری کی
ہاتھ کی بنی وہ روٹیاں کہ جن میں اس کے پتی برت
دھرم کے علاوہ اس کی بے پناہ محبت ملی ہوتی تھی۔
وہ روٹیاں کہ جنھیں آپ چولہے کے پاس بیٹھ کر
بڑے ہی آرام اور اطمینان کے ساتھ کھایا کرتے
تھے۔ کہاں ہیں آپ کی بھابھی کے ہاتھ کی بیلی ہوئی
وہ روٹیاں کہ جن میں چھیڑ خانیاں بھی شامل ہوا
کرتی تھیں؟... آپ تو اپنی اُنیس سالہ بے بی

کے ہاتھ کی بیلی اور بھی روٹیوں تک سے کیے
ترسے ہوئے ہیں۔ اس بیچاری کو تو آٹا گوندھنا
بھی نہیں آتا! اس پر طرہ یہ کہ اکثر ہی وہ روٹیاں
پھینک دیا کرتی ہے۔ غصے میں قیمتی کراکری چکنا چور
کر دیا کرتی ہے۔ ٹو اِن ون (TWO-IN-ONE)
دیوار سے دے مارتی ہے اور . . . اس میں
قصور کس کا ہے؟ تیری بیلی ہوئی روٹی کا؟

دل پسند کھانا کھانے کے لیے آپ آزاد
ہیں نا؟ لیکن نہیں، آپ اپنی پسند کا کھانا کھا ہی
نہیں سکتے۔ آپ اپنی مرغوب غذا سے محروم ہیں
جناب! گھر سے ذرا باہر قدم رکھیے تو۔ اُن دنوں
آپ لالہ جی کے ٹھیلے کے پاس سڑک کے کنارے
کھڑے ہو کر گول گپے اور دہی بڑے وغیرہ کھا
کر لمبی ڈکار لینے میں کسی قسم کی جھجک محسوس نہیں
کرتے تھے۔ مونگ پھلی چھیل کر کھاتے ہوئے آپ
بہت دور جایا کرتے تھے . . . اور اگر آپ کہیں
تو میں آپ کو آپکی پرانی جگہ لے چلوں تو یاد کیجیے
کہ اُن دنوں دفتر میں آپ کے دیگر ساتھی ٹفن لایا
کرتے تھے اور لنچ کے وقت آپ سب کے ساتھ
بیٹھ کر کھانا کھایا کرتے تھے۔ کسی بھی طرح کے
تعصب کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ کئی طرح کے
ذائقوں اور لقمہ در لقمہ ہنسی کی یاد نے آپ کو
اداس کر دیا ہے نا؟ اور اس وقت آپ سلوتری
کے ہاتھ کے بنے پھلکوں کو کھاتے ہوئے دل ہی
دل میں اُسے یاد کرنے لگ جایا کرتے تھے نا؟

اُنھیں دنوں ایک بار کتنا پیارا مذاق ہوا
تھا آپ کے ساتھ ــــ لنچ کے وقت ہمیشہ
کی طرح سب لوگوں نے اپنے اپنے ٹفن کھولے۔
آپ نے جب اپنا ٹفن کھولا تو پھلکوں اور سبزی
پیاز وغیرہ کی جگہ اس میں پتھر ملے۔ یہ دیکھ کر اس
وقت وہاں فلک شگاف قہقہے بلند ہوئے تھے۔
اور آپ پر طرح طرح کے فقرے کسے گئے تھے۔ لیکن
آپ کے رول کی داد دینی پڑے گی۔ خود اعتمادی
کے ساتھ زیرِ لب مسکراتے ہوئے آپ اپنی جگہ بیٹھے
رہے تھے۔ گویا کہ آپ ایسی حرکت کرنے والے
کو صاف صاف پہچان لینے کے باوجود خاموش
ہوں۔

اور اب صورت یہ ہے کہ عمدہ قسم کے
لنچ کے ہوتے ہوئے بھی آپ اس سیدھے سادے
وقت کے معمولی سے ٹفن کی یاد سے ہی جذباتی
ہو کر اُداس ہو جایا کرتے ہیں۔ . عمدہ قسم
کے لنچ میں شامل ہیں تین سوکھی سبزیاں، چھونکی
ہوئی دال یا کڑھی، سلاد۔ پھلکے تو ضروری ہیں
ہی۔ پڈنگ کے طور پر حلوہ، دیسی گھی کا چورما یا
مٹھائی کے کچھ پیس۔ بھنی ہوئی سونف۔ کسی بھی
شخص کے منہ میں پانی آ سکتا ہے۔ یہ سب دیکھ
کر۔ لیکن صورت یہ ہے کہ اکثر آپ لنچ لے ہی
نہیں پاتے۔ کبھی یہ نوکروں کی نذر ہو جایا کرتا
ہے تو کبھی کتے اس سے اپنی پیٹ بھرائی کرتے
ہیں۔ اور آپ . . . ؟ پھلوں پر اکتفا کرتے ہیں
یا پھر بھوکے ہی رہ جاتے ہیں!

شام کے کھانے یا ڈنر کا بھی یہی عالم ہے
سوپ پر آپ زیادہ زور دیتے ہیں۔ بھوک آپ
کی مرنے لگی ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ آپ
کی بیوی اور بے بی ہی ہے

◄

اور جناب! اِدھر آپ کی مہارت اور
ہوشیاری کا کون قائل نہیں ہے؟ جو نہیں ہے
وہ محض احمقوں کی جنت میں رہتا ہے۔ اسی طرح
کا ایک احمق آپ کو پھنسانے کے چکر میں خود
ہی زیرِ دام آ گیا۔ ہوا کیا تھا؟ معمولی سی تو بات
تھی۔ ساری بات فائنل ہو چکی تھی۔ اِس کی
فائل آپ کی ٹیبل پر آپ کے دستخط کے لیے کئی
روز تک پڑی رہی جو تھے روز وہ شخص آپ کی
خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ اور جس خوش اخلاقی
کا آپ نے ثبوت دیا تھا، اسے دیکھ کر تو وہ آپ
کا مُرید ہو چلا تھا۔

• ہم تو چاہتے ہیں کہ آپ خوب ترقی کریں
آپ نے اس سے کہا تھا۔

• آپ کی شبھ کامنائیں چاہئیں!" یہ اُس
کی بھیگی آواز تھی۔

• ہماری شبھ کامنائیں تو آپ کے ساتھ ہی
ہیں" اور آپ موقع دیکھ کر اصل بات پر آ گئے۔

• اور ہم بھی آپ سے کچھ شبھ کی اُمید کرتے ہیں

" جی؟" وہ کچھ سمجھ نہ سکا۔

• آپ بُدھی مان ہیں اور آپ کے لیے
اشارہ ہی کافی ہے . . . اس کی منظوری ہو
جانے سے جہاں آپ کو ہر ماہ دو تین ہزار کی
آمدنی ہونے لگے گی وہاں آٹھ دس ہزار کی
چھوٹی سی رقم آپ کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی

" جی" دو پل رک کر اس نے کہا تھا۔ "دو
تین دن میں اس کا پربندھ ہو جائے گا"

اور اس اثنا میں جو کچھ بھی ہوا وہ آپ
کی مہارت کا آپ ہی گواہ ہے۔ وہ بھولا شخص
اینٹی کرپشن میں گیا تھا۔ آپ کو پھانس کر زیرِ دام
لے آنے کی ساری تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔
اور آخر وہ گھڑی بھی آ گئی کہ آپ کو دھر لیا جاتا
اور آپ اخبار کی سرخیوں میں آ جاتے۔ پورے
دس ہزار کے کرنسی نوٹوں کا بنڈل آپ کی ٹیبل
پر آپ کے سامنے پڑا تھا کہ اچانک ہی رُخ
پلٹ گیا۔ آپ کے تیور دیکھ کر اور آپ کے
اُپدیش سن کر وہ چکرا گیا تھا۔ قدرے بلند آواز
اور شاہانہ انداز میں آپ نے فرمایا تھا:

"جناب رشوت دے کر آپ مجھے کرپٹ کرنا چاہتے ہیں؟ ایسا کرنے کی کوشش کر کے آپ نے میری بے عزتی کی ہے . . . ایمانداری میرا مذہب ہے اور باپو کو میں اپنا آدرش مانتا ہوں۔ آپ کا کام . . ."

اور آپ کا جملہ ادھورا رہ گیا تھا۔ بغیر کوئی چٹ بھیجے یا اطلاع دیے اچانک ہی چار پانچ لوگ آپ کے چیمبر میں داخل ہوئے تھے۔ لیکن واہ رے آپ کی ہوشیاری کہ متعارف ہونے اور ہاتھ ملانے کے بعد آپ نے انھیں بتایا کہ سامنے والا شخص بطورِ رشوت ٹیبل پر رکھے روپے آپ کو دینے کی کوشش میں لگا ہے انسر پلٹتا دیکھ کر اس بھولے مانس نے آپ پر الزام دھرنے کی کوشش کی تو مسکرا کر آپ نے اس دستے کے چیف کو وہ ٹیپ تھما دیا تھا جس میں آپ دونوں کے درمیان ہوئی گفتگو لفظ بہ لفظ مقید تھی۔

اگلے روز اخبارات کی سرخیوں میں آپ ہی آپ تھے۔ آپ کی ایمانداری کے گن گائے گئے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس ساری تگ و دو پر آپ نے ایک بڑی رقم صرف کی تھی۔ لیکن اصلی روٹی کی بات اپنی جگہ ہے۔

ایسی اندھی کمائی، چمک دمک، عقل اور مہارت کے باوجود آپ کے دکھی ہونے کی دو وجوہ ____ بیوی اور بے بی ____ کا ذکر میں کر چکا ہوں۔ اب ذرا خود آپ کے پیدا کردہ کارن کا چرچہ ہو جائے ____ یعنی آپ یوں بھی ہیں کہ آپ کو اپنی آمدنی بہت ہی قلیل لگتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ آپ قرض میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ بھی میں آپ کو بتادوں۔ یوں ہے کہ ایک برائی سو برائیوں کو جنم دیتی ہے۔ پہلے پہل آپ بیڑیاں پھونکنے لگے۔ بیڑی سے آپ سگریٹ پر آئے اور اس کے بعد چرٹ۔ یہاں تک تو پھر بھی غنیمت تھا۔ لیکن جب گلا اچھی طرح تر ہونے لگا تو ہاتھوں میں پتے آ گئے۔ اور پتے کی بات یہ ہے کہ یہیں سے آپ کا پتہ کٹنا شروع ہو گیا۔ پندرہ بار آپ ہارتے تو دو بار جیتتے۔ یہ سلسلہ ان دنوں بھی جاری ہے۔

اور صورت کیا ہے ان دنوں؟ روز رات کو سونے سے قبل آپ ایک تہیہ کرتے ہیں کہ اگلی صبح سے آپ ایک نئی زندگی شروع کریں گے۔ تمباکو نوشی سے توبہ کر لیں گے اور شراب سے بھی مکمل طور پر دوری قائم کر لیں گے۔ پتّوں کو بھی اب سے کبھی ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ مسز اہلووالیہ سے چلا آ رہا معاشقہ بھی ختم! ایسے تمام فیصلے لیتے ہوئے رات کے وقت آپ خوب دھواں اڑاتے ہیں کہ صبح سے تو تمباکو نوشی بند ہے ہی۔ حلق میں ایک آدھ پیگ اس لیے زیادہ انڈیل لیتے ہیں کہ ظالم چھٹی جا رہی ہے۔ بڑی دیر تک پتے بازی چلتی رہتی ہے کہ اب اس کے بعد تو کبھی کھیلنا ہی نہیں ہے اور مسز اہلووالیہ . . . جذبات کی رَو میں اس کے آگے آپ کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں کہ اس سے سلسلہ ختم ہوا جا رہا ہے۔

اور اگلی صبح ہوتا کیا ہے؟ آنکھ کھلتے ہی آپ دھواں اڑانے لگتے ہیں۔ رات ہینگ اوور کے اُتار کے لیے ایک ہلکا سا پیگ بنا کر پیتے ہیں ____ شام ہوتے ہی آپ کے ہاتھوں میں پتّوں کے لیے کھجلی ہونے لگتی ہے اور پھر . . . پھر وہی سلسلہ! . . . معاف کیجیے گا۔ آپ کو کسی نے بھی گھاس نہیں ڈالی۔ اسی لیے تو آپ اِدھر نکل آئے اور لگے ہیں روٹیوں میں کیڑے نکالنے۔ ورنہ جناب! کہاں آپ اور کہاں یہ ہوٹل؟ نقص اور خامیاں تو کئی ہیں جناب! جیسے آپ کو علم ہی نہیں ہے کہ یہاں اندر کی حالت کیا ہے۔ صورت یہ ہے کہ شدت کی گرمی ہے اور ہمارا پسینہ بھی ان روٹیوں میں شامل ہے۔ اور ہمارے ہاتھ بھی کوئی بہت زیادہ صاف نہیں ہوتے۔ اِدھر چوہوں کا راج ہے . . . روٹی میں آپ کو نقص نہیں نکالنا چاہیے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اصل خامی کا آپ کو علم نہیں ہے۔ بہرحال آپ کو ہم سے بُرا نہ ہو، ہمیں آپ سے شکایتوں کے باوجود ہمدردی ہے۔

اچھا تو وداع جناب! خدا حافظ۔

قلمکار حضرات سے گزارش

دفتر میں مضامینِ نثر و نظم کثیر تعداد میں جمع ہو گئے ہیں اس لیے اعلانِ ثانی تک اپنی نگارشات بلا طلب بھجوانے کی زحمت نہ فرمائیں۔ اُمید ہے اس گزارش کو گستاخی پر نہیں ہماری مجبوری پر محمول کیا جائے گا۔ ____ ادارہ

رضا نقوی واہی
۵/۱۶، گردنی باغ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۱

یہ غزل گوئی

ہمارے شہر عظیم آباد میں آج کل 'غزل سازی' کی کاٹیج انڈسٹری جا بجا کھلی ہوئی ہے۔ نصف درجن ادبی انجمنیں ہیں، جو باقاعدگی سے ہر ماہ طرحی مشاعرے منعقد کیا کرتی ہیں۔ ہر مشاعرے میں تیس چالیس شعرا غزلیں سناتے ہیں۔ بعض نشستوں میں بادلِ ناخواستہ مجھے بھی شرکت کرنی پڑتی ہے۔ اور طرحی زمین میں کلام بھی سنانا پڑتا ہے۔ چنانچہ چند روز قبل بھی مجھے اس مشقت سے گزرنا پڑا۔ طرحی کلام کی نقل بھیج رہا ہوں، اگر مناسب سمجھیں تو "ایوانِ اُردو" میں شائع فرمائیں۔

صفِ اوّلیں تو ہے خاص صف وہاں جا ملے یہ کہاں شرف
صفِ آخریں سے بھی دُور تر جو اشارہ ہو تو وہیں سہی (شادؔ عظیم آبادی)

—— رضا نقوی واہی

"دھمکیاں کیا مجھے اے شامِ بلا دیتی ہے" (مصرعِ طرح)

بزمِ کوثر* مجھے ہر ماہ سزا دیتی ہے
مصرعِ طرح کی زنجیر پنہا دیتی ہے

یہ غزل گوئی بھی اعصاب کی بیماری ہے
لوریاں دے کے جو ذہنوں کو سُلا دیتی ہے

اِک ذرا ملتی ہے شاعر کی اَنا کو تسکین
داد و تحسیں کے سوا اور یہ کیا دیتی ہے

زحمتِ قافیہ پیمائی سے واقف نہیں کون
اچھّے اچھّوں کو یہ دیوانہ بنا دیتی ہے

جب اُلجھ جاتی ہے شعروں میں قوافی سے ردیف
شاعرِ خستہ کے چھکّے ہی چھڑا دیتی ہے

کبھی ایطائے جلی اور خفی کی اُلجھن
کبھی ترسیل کی ناکامی سزا دیتی ہے

کبھی ایہام کا پیچ اور کبھی تجنیس کی گانٹھ
کبھی تقطیع غلط ہو کے دغا دیتی ہے

ہے کوئی شعر کبھی لفظی تنافر کا شکار
کبھی تعقید چُھری فن پہ چلا دیتی ہے

کبھی اِبہام کی رَو ذہن کو جھٹکے دے کر
ایبسٹریکٹ آرٹ کی تصویر دِکھا دیتی ہے

یہ غزل گوئی بھی کچھ تیرے ستم سے نہیں کم
"دھمکیاں کیا مجھے اے شامِ بلا دیتی ہے"

* ادبی مرکز پٹنہ کے سکریٹری

عبداللطیف اعظمی

مولانا آزاد کی جیل یاترائیں

ماہنامہ ایوانِ اُردو ——— مولانا ابوالکلام آزاد نمبر' بابت دسمبر ۱۹۸۸ء میں میرا ایک مضمون :" مولانا آزاد کی گرفتاریاں اور سزائیں" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ تقریباً ڈیڑھ سال کے بعد' ایوانِ اُردو' بابت ماہ جون ۱۹۹۰ء میں اسی عنوان سے جناب خورشید پرویز صدیقی کا ایک مضمون شائع ہوا ہے' جس میں انھوں نے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق میری کچھ غلطیوں کی نشاندہی کی ہے۔ میں ایسے مضامین کا ہمیشہ خیر مقدم کرتا ہوں' جن میں میرے کسی مضمون یا کسی کتاب کی صحت مند تنقید کی گئی ہو۔ اس مضمون کے لیے خاص طور پر میں فاضل مضمون نگار کا اس لیے شکر گزار ہوں کہ اپنا زیرِ بحث مضمون میں اپنی ایک زیرِ ترتیب کتاب میں شامل کرنا چاہتا ہوں۔ ان کے تنقیدی مضمون کی وجہ سے مجھے اپنے مضمون کی نظرِ ثانی کرنے اور بعض غیر واضح پہلوؤں کی وضاحت کا موقع ملا۔

میرے مضمون کا بنیادی حصہ وہ ہے' جس میں مولانا آزاد کی جملہ قید و بند کی تفصیلات دی گئی ہیں۔ بغیر کسی تکلف کے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ بڑی محنت اور پوری تحقیق کے ساتھ' اخبارات کی ایسی فائلوں کی مدد سے یہ تاریخیں پہلی مرتبہ مرتب کی گئی ہیں' جو آسانی سے نہیں ملتیں۔ مجھے خوشی ہے کہ فاضل مضمون نگار نے' رانچی کی نظر بندی کے علاوہ جملہ تاریخوں کو اپنے مضمون میں بعینہٖ نقل کیا ہے' اس کے علاوہ ازراہِ کرم مجھے اس سرٹیفکیٹ سے نوازا بھی ہے کہ" مولانا کی پہلی نظر بندی کے ماسوا دیگر تمام گرفتاریوں کی تاریخیں درست ہیں۔" اس تعریفی جملے کو پڑھ کر خوشی ضرور ہوئی' مگر اسی کے ساتھ شیطان نے دل میں یہ وسوسہ بھی ڈال دیا کہ اس کے علاوہ کچھ اور لکھنے کے لیے' انھیں اسی قدر پاپڑ بیلنے پڑتے جو میں بیل چکا ہوں۔

اصل کام تو تاریخوں کی ترتیب تھی' اگر وہ کام اطمینان بخش ہو گیا ہے تو مدت کا تعین ہر وہ شخص کر سکتا ہے جو ریاضی کا ماہر ہو اور حساب کتاب کا تجربہ رکھتا ہو۔ مجھے اپنی ریاضی کے بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں ہے' مگر میں نے مولانا آزاد کی حیاتِ زندانی کی مدت کے تعین کی جو کوشش کی ہے' اس کے بارے میں فاضل مضمون نگار کے جملہ اعتراضوں سے میں متفق نہیں ہوں۔ فاضل مضمون نگار نے لکھا ہے :" مدت کے تعین میں اعظمی صاحب سے ہر جگہ سہو ہوا ہے۔" ان کا یہ اعتراض علی الاطلاق صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ دو مسئلوں میں ——— رانچی کی نظر بندی اور مولانا آزاد کی تاریخ پیدائش کے متعلق راقم الحروف اور فاضل مضمون نگار کے درمیان اصولی اختلاف ہے' جسے سہو یا غلطی میں شمار نہیں کیا جا سکتا ہے' اس کے علاوہ مدت کا تعین کرتے وقت میں نے قصداً موٹے طور پر حساب کیا تھا اور جہاں دو یا تین دن کم یا زیادہ ہوتے تھے' وہاں" تقریباً" کا سہارا لیا تھا' اس یقین کے ساتھ کہ ضروری تاریخوں کی موجودگی میں صحیح مدت کا پتہ چلانا کچھ مشکل نہیں ہوگا۔ مثلاً دوسری گرفتاری کے بارے میں تاریخوں کے اندراج کے بعد میں نے لکھا ہے :" تقریباً ایک سال ایک ماہ۔" فاضل مضمون نگار نے اس کے بارے میں اعتراض کرتے ہوئے پہلے لکھا ہے :" لطیف صاحب نے قید کی کل مدت ۳۹۵ دن یا ایک سال ایک ماہ بتائی ہے جو غلط ہے' کیونکہ اس میں دو روز کا اضافہ ہے' پہلی بات یہ کہ ۳۹۵ میں نے نہیں لکھا ہے۔ یہ موصوف کا اضافہ ہے۔

دوسری گزارش یہ کہ میں نے" تقریباً" لکھا تھا جسے موصوف نے حذف کر دیا۔ دوسری جگہ موصوف نے اس مدت کے بارے میں لکھا ہے :" ۱ سال ۲۸ دن۔" میں نے ۲۸ دن لکھنے کے بجائے" تقریباً ایک ماہ" لکھ دیا۔ بہرحال چونکہ فاضل مضمون نگار کی خواہش ہے کہ مدت کا تعین کرتے وقت پوری باریکی سے حساب کیا جائے اور ایک ایک دن شامل کیا جائے' اس لیے ان کی خواہش کے مطابق میں نے از سرِ نو مدت کا تعین کیا ہے' خدا کرے کہ یہ کوشش کامیاب ہو۔ مزید احتیاط کے طور پر مدت کی تفصیلات الگ سے زیراکس کروا کر اکاؤنٹ کے مختلف ماہرین کو چیک کرنے کے لیے بھیجی ہیں۔

فاضل مضمون نگار کے اعتراضات کی روشنی میں حسب ذیل عنوانات کے تحت اپنے خیالات پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔

۱۔ رانچی کی نظر بندی (۲) قید و بند کی مدت (۳) مقاماتِ گرفتاری و رہائی (۴) مولانا کی عمر

۳۴۹' ذاکر نگر' جامعہ نگر' نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

۵۔ نتیجہ، یعنی حیاتِ زندانی کا تناسب
۶۔ آخر میں ایک گزارش یا مشورہ۔

۱۔ رانچی کی نظربندی

رانچی کی نظربندی کے بارے میں خورشید
دیقی صاحب نے رائے زنی کرتے ہوئے
ھا ہے: "مولانا کی اوّلین نظربندی کی تاریخ
کے بارے میں لوگ عام طور پر غلطی کرتے
ہے ہیں۔ اواخر مارچ ۱۹۱۶ء میں حکومت
گال نے مولانا کو حدودِ صوبہ سے نکل جانے
نوٹس دیا تھا، محققین اس نوٹس کے جاری
ونے کی تاریخ سے یا پھر رانچی میں مولانا کے
یام کے ایک ہفتہ بعد، یعنی اپریل ۱۹۱۶ء
کے پہلے ہفتے سے مولانا کی نظربندی کی مدت
روع کرتے ہیں۔ یہ ایک بنیادی غلطی ہے اور
لی صاحب سے بھی یہی غلطی سرزد ہوئی ہے۔"
کن ہے یہ الزام صحیح ہو اور بقول صدیقی صاحب
ھ سے یہ بنیادی غلطی ہوئی ہو، مگر میں پوری
طبیعت کے ساتھ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس
ظربندی کے جملہ پہلوؤں کے بارے میں میرا
وقف بالکل وہی ہے جو مولانا آزاد نے اپنی
تلف تحریروں میں لکھا ہے۔ خود میری کوئی
ئے نہیں ہے، اس لیے اگر مورد الزام ہیں
مولانا آزاد، نہ کہ یہ خاکسار راقم الحروف۔
س مسئلے پر گفتگو کرنے سے قبل یہ عرض کردوں کہ
عض تاریخوں کے بارے میں خود مولانا کی تحریروں
اختلاف ہے۔ اب تفصیلات ملاحظہ ہوں۔
اس مسئلے پر غور کرتے وقت پہلا سوال یہ
یدا ہوتا ہے کہ بنگال سے حکمِ جلاوطنی کی تاریخ
یا ہے؟ اس سلسلے میں مولانا کی تحریروں میں
از کم تین تاریخیں ملتی ہیں۔ اپنی پہلی خود نوشت سوانح
حیات "تذکرہ" میں لکھا ہے: "۲۳ مارچ ۱۹۱۶ء
کو بنگال گورنمنٹ نے ڈیفنس ایکٹ کی
دفعہ ۳ کی بنا پر حکم دیا کہ ایک ہفتے کے اندر
حدودِ بنگال سے باہر چلا جاؤں۔" (۲) جس
زمانے میں بنگال سے نکل جانے کا حکم ملا تھا،
اس زمانے میں مولانا "البلاغ" نکال رہے
تھے۔ اس وقت کے زیرِ ترتیب اور آخری شمارے
میں مولانا نے لکھا ہے: "۲۸ مارچ کو گورنمنٹ
بنگال کا حکم زیرِ دفعہ ۳ ڈیفنس ایکٹ پہنچا کہ
میں چار دن کے اندر کلکتہ کا قیام ترک کردوں
اور حدودِ بنگال سے باہر چلا جاؤں۔ بعد کو
یہ مدت ایک ہفتے تک بڑھا دی گئی۔" (۳)
غبارِ خاطر کے خط نمبر ۶ مورخہ ۱۱ اگست
۱۹۴۲ء میں مولانا نے لکھا ہے: "۷ اپریل
۱۹۱۶ء کو حکومت بنگال نے ڈیفنس آرڈیننس
کے ماتحت مجھے بنگال سے خارج کردیا۔"
"غبارِ خاطر" کے مذکورہ بالا خط کا مکمل اقتباس
نقل کرنے کے بعد صدیقی صاحب نے لکھا ہے:
"اس سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا ۷
اپریل ۱۹۱۶ء کو رانچی وارد ہوئے۔ ۔ ۔"
صدیقی صاحب کے اس جملے سے اندازہ ہوتا
ہے کہ ان کے نزدیک رانچی پہنچنے کی تاریخ ۷
اپریل ہے، اس کے برعکس میرے خیال میں
اپریل کی پہلی تاریخ قابلِ ترجیح ہے، کیوں کہ
یہ تاریخ انھوں نے رانچی ہی میں دورانِ نظربندی
میں لکھی ہے اور تذکرہ اسی زمانے میں نظربندی
سے رہائی سے قبل شائع ہوا ہے۔ اسی میں
مولانا نے مزید لکھا ہے: "۳۰ مارچ کو کلکتہ
سے۔ ۔ ۔ نکلا اور رانچی پہنچا۔" اس کے مطابق
ظاہر ہے مولانا دوسرے روز، ۳۱ مارچ کو
کسی وقت رانچی پہنچ گئے ہوں گے۔ اسی لیے
قیام رانچی کا آغاز میں یکم اپریل ۱۹۱۶ء سے
کرتا ہوں۔
اسی طرح نظربندی کے احکام کے بارے
میں بھی مولانا کے بیانات میں اختلاف ہے، مثلاً
(۱) انڈیا ونس فریڈم میں لکھا ہے: "۶ مہینے بعد
مجھے رانچی میں نظربند کردیا گیا۔" گویا اکتوبر ۱۹۱۶ء
میں نظربندی عمل میں آئی۔ صدیقی صاحب نے
نہ جانے کس بنیاد پر اس کی تاریخ ۸ اکتوبر ۱۹۱۶ء
لکھی ہے۔ (۲) ترجمان القرآن کی جلد اوّل کے
دیباچے میں مولانا نے لکھا ہے: "۸ جولائی ۱۹۱۶ء
کو یکایک حکومتِ ہند نے میری نظربندی کے
احکام جاری کردیے۔" اسی بنیاد پر مالک رام
صاحب نے لکھا ہے: "۸ جولائی ۱۹۱۶ء کو
حکومتِ ہند نے ان کی رانچی میں نظربندی کا
حکم جاری کردیا۔" اس کے بارے میں ناواقفیت
کی بنا پر، صدیقی صاحب نے لکھا ہے: "مالک رام
صاحب شاید ۸ اکتوبر کی جگہ ۸ جولائی لکھ
گئے۔" (۳) مولانا نے غبارِ خاطر میں جلاوطنی کا
ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: "میں رانچی گیا اور
شہر سے باہر مورا بادی میں مقیم ہوگیا، پھر کچھ
دنوں کے بعد مرکزی حکومت نے وہیں قید
کردیا۔" اس اقتباس کے دونوں خط
کشیدہ الفاظ قابلِ غور ہیں۔ پہلی بات یہ کہ
نظربندی کی کوئی تاریخ لکھنے کے بجائے "کچھ
دنوں کے بعد" لکھا ہے اور نظربندی کے
بجائے "قید" کا لفظ لکھا ہے۔
ان اختلافات سے قطع نظر مولانا کے
مذکورہ بیانات سے قطعی طور پر واضح ہوتا ہے
کہ رانچی پہنچنے کے کچھ عرصے کے بعد مولانا کو
نظربند کردیا گیا۔ ایسا کتنے عرصے کے بعد کیا
گیا ہوگا یا چوتھے مہینے میں ۸ جولائی ۱۹۱۶ء

گویا چھ ماہ کے بعد، اکتوبر ۱۹۱۶ء میں، جب بھی ہوا ہو، مگر ایسا ہوا ہے، پھر ایسی صورت میں راقم الحروف کو کس بنیاد پر یہ اصرار ہے کہ مولانا کی نظر بندی کی مدت رانچی پہنچنے کے بعد ہی سے شروع ہو گئی؟!

جن لوگوں کو میرے اس خیال سے اتفاق نہیں ہے، ان سے ایک سوال ہے، کیا رانچی پہنچنے کے بعد، مولانا آزاد پر کوئی پابندی نہیں تھی اور وہ ایک عام شہری کی طرح اسی طرح آزاد تھے، جیسے جلاوطنی سے پہلے تھے اور اپنی مرضی سے رانچی یا مورا بادی سے باہر جہاں چاہتے جا سکتے تھے؟ میرا جواب ہے کہ ایسا نہیں تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ اپنی مرضی سے رانچی گئے تھے، مگر میرا خیال ہے کہ وہاں پہنچنے کے بعد حکومت بہار کی پولیس نے انھیں اپنی تحویل میں لے لیا اور اس کے بعد ان پر حکومت بہار کے احکامات نافذ ہونے لگے۔ اس کا ایک بین ثبوت "قول فیصل" کا وہ طویل اقتباس ہے، جسے صدیقی صاحب نے ایوانِ اردو کے آزاد نمبر کے حوالے سے اپنے مضمون میں نقل کیا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں: "جب اکتوبر ۱۹۱۶ء میں (مجھے) نظر بند کیا گیا اور بہار گورنمنٹ کے حکام اور پولیس افسر تلاشی کے لیے آئے تو انھوں نے میری تمام کتابوں کو بھی ایک خوفناک لٹریچر سمجھ کر نہایت احتیاط کے ساتھ اپنے قبضے میں کر لیا۔"[۴۸] اس کے علاوہ شروع ہی سے جب بھی مولانا نے اپنی اس جلاوطنی کا ذکر کیا ہے تو ہمیشہ اس کے ساتھ "نظر بندی" کا لفظ بھی لکھا ہے۔ مثلاً: "دنیا نے جلاوطنی اور نظر بندی کی خبر سنی[۴۹]۔ . . ." اس کے تقریباً دو صفحے کے بعد پھر لکھتے ہیں اور اس کے ساتھ "بند و قید" کا اضافہ کرتے ہیں: "بہتر ہے کہ جلاوطنی و نظر بندی کے قید و بند میں کام کرنے کا ایک نمونہ دکھلا دیا جائے۔"[۵۰]

علاوہ ازیں مولانا جب بھی اس نظر بندی کا ذکر کرتے ہیں تو اس کی مدت چار سال لکھتے ہیں۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب اس کا آغاز قیام رانچی، یعنی یکم اپریل ۱۹۱۶ء سے کیا جائے۔ اس کی بھی چند مثالیں ملاحظہ ہوں: رانچی کی رہائی کے تقریباً پونے دو سال کے بعد، ۲۳ ستمبر ۱۹۲۱ء کو کلکتہ سے ہفتہ وار "پیغام" جاری ہوا تو اس کے پہلے شمارے کے اداریے میں مولانا لکھتے ہیں: "۱ جنوری ۱۹۲۰ء کو مجھے چار سال کے بعد نظر بندی سے رہا کیا گیا[۵۱]. . ." اس اداریے کی اشاعت کے چند ماہ کے بعد ۱۰ دسمبر ۱۹۲۱ء کو گرفتار کر کے ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ اسی مقدمے کے سلسلے میں ۲۴ جنوری ۱۹۲۲ء کو انھوں نے عدالت کو ایک تحریری بیان دیا، جو بعد میں "قول فیصل" کے نام سے شائع ہوا۔ اس بیان میں مولانا رانچی کی نظر بندی کے سلسلے میں لکھتے ہیں: "میں نے نظر بندی کے زمانے میں چار سال تک اپنی ڈاک کے لیے خود ہی سنسر شپ کے فرائض بھی انجام دیے ہیں۔"[۵۲] تیسری مثال ملاحظہ ہو: "غبار خاطر" کے خط نمبر ۶ کا گزشتہ سطروں میں کئی مرتبہ ذکر آیا ہے، اس کے بالکل شروع میں مولانا لکھتے ہیں: "قید و بند کی زندگی کا یہ چھٹا تجربہ ہے۔ پہلا تجربہ ۱۹۱۶ء میں پیش آیا تھا، جب مسلسل چار برس تک قید و بند میں رہا۔"[۵۳]

مذکورہ بالا مثالوں اور حوالوں کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ ہمارے سامنے نہ تو حکومت بنگال کے حکم کی تفصیلات ہیں، نہ تفصیل سے اور یقین کے ساتھ رانچی میں حکومت بہار کی پولیس کے رویے کے متعلق کچھ علم ہے اور نہ ہی مرکزی حکومت کے حکم نظر بندی کے متعلق وثوق کے ساتھ کوئی رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ . . .

"ترجمان القرآن" جلد اول کے دیباچے سے صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم نظر بندی انیس دفعات پر مشتمل تھا اور مولانا کے الفاظ میں "نظر بندی کے بعد کوئی موقع باقی نہیں رہا کہ باہر کی دنیا سے کسی طرح کا علاقہ رکھ سکوں۔"[۵۴]

شاید اس مضمون کے قاریوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ اگر میرا یہ خیال صحیح ہے کہ مرکزی حکومت کے حکم نظر بندی سے پہلے مولانا ایک نظر بند کی زندگی بسر کر رہے تھے تو دوبارہ نظر بندی کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ میرا خیال ہے کہ اگر صحیح صورت حال پر نظر ہو تو یہ سوال پیدا نہیں ہوگا۔ چونکہ یہ مسئلہ خاصا اہم ہے، اس لیے تھوڑی سی تفصیل پیش کرنا ضروری ہے۔

مولانا جب رانچی چلے گئے تو ان کے دوست احباب اور عقیدت مندوں نے یہ کوشش شروع کی کہ حکومت بنگال اپنا حکم واپس لے۔ یہ تحریک کچھ ایسے عزم و حوصلہ اور جوش و خروش کے ساتھ شروع کی گئی تھی کہ لوگوں کو یقین تھا کہ بہت جلد حکومت اپنا حکم واپس لے لیگی۔ چنانچہ مولانا لکھتے ہیں: "اس اثنا میں حکم جلاوطنی کی منسوخی کے لیے احباب و مخلصین نے کوئی دقیقہ سعی و تدبیر کا اٹھا نہ رکھا۔ شاید اس قسم کی کوششوں کی یہ پہلی مثال ہے کہ ساٹھ ہزار سے زیادہ دستخطوں کے ساتھ میموریل بھیجا گیا۔ بعض ارکان حکومت بنگال کے خطوط پچھلے مہینے آتے رہے۔ اور معلوم ہوا کہ غلط فہمی کا اعتراف ہے۔ حال ہی میں ایک شخص سے ملاقات کرتے ہوئے خود لارڈ مائیکل نے بھی ایسا

ظاہر کیا تھا حتیٰ کہ شام تک منسوخیِ حکم کے
کی اُمید دلائی تھی" مگر جب مولانا کو یقین
یا کہ جلاوطنی اور نظر بندی کی یہ مدت طویل
تی ہے تو انھوں نے اپنا کاروبارِ عشق شروع
دیا۔

رانچی پہنچنے کے چند ہی ماہ بعد، غالباً
تھے ماہ، جولائی میں رمضان شریف کا مہینہ
وع ہوا تو مولانا نے اس مبارک مہینے میں
شہر کی جامع مسجد سے اپنی سرگرمیاں شروع
یں۔ مولانا لکھتے ہیں: "جس مقام پر مقیم ہوں
یہاں سے کچھ فاصلے پر ہے۔ رمضان المبارک
جمعہ کے دن جامع مسجد گیا۔ چند صفوں سے
دہ مجمع نہ تھا۔ لوگوں نے خطبہ و امامت کے
سخت اصرار کیا، مجبوراً خطبہ دینا پڑا۔ ان
روں نے اب تک خطبے کے یہی معنی سمجھے تھے
بی کی کوئی چھپی ہوئی کتاب پڑھ دی جائے۔
ں مسلمانوں کی تعداد اگرچہ ابھی خاصی ہے،
ایک گم نام گوشے میں پڑ جانے کی وجہ سے
درجہ تباہی و بدحالی میں مبتلا ہیں۔ نمازِ جمعہ
بعد سے ایک قوی داعیہ قلب میں محسوس
رہا ہے کہ اگر حالات طولِ قیام کا باعث
ئے تو یہاں بھی اپنا کام شروع کر دینا
ہیے" ملاحظہ فرمائیے کہ ابھی مرکزی حکومت
طرف سے نظر بندی کا حکم نہیں آیا ہے، مگر
بھی مولانا کیا فرماتے ہیں، لکھتے ہیں: "دنیا
فراغ و آزادی کے زمانے کے کاموں کا کچھ
ہ نمونہ دیکھ لیا ہے، بہتر ہے کہ جلاوطنی و نظر
ی کے بند و قید میں کام کرنے کا بھی نمونہ
ملا دیا جائے کہ اصلی آزمائش گاہِ عمل یہی ہے۔
گو ہو رہی ہے گم عشق و ہوس میں بھی امتیاز
یا ہے اب مزاجِ ترا امتحان پرست"

براہِ کرم خط کشیدہ الفاظ پر بطورِ خاص
دوبارہ نظر ڈال لیجیے، کیا اس سے اندازہ نہیں
ہوتا کہ مرکزی حکومت کے احکامِ نظر بندی
سے پہلے بھی مولانا کو "فراغ اور آزادی" میسر
نہیں تھی۔ اور وہ جلاوطنی کے ساتھ نظر بندی
کی بھی زندگی گزار رہے تھے؟ بہر حال آہستہ
آہستہ مولانا کے خطباتِ جمعہ کی شہرت پورے
رانچی میں پھیل گئی اور غیر مسلموں نے بھی اُنھیں
سننے اور ان سے استفادہ کرنے کا اشتیاق ظاہر
کیا۔ چنانچہ مولانا نے ان کو بھی مسجد میں آنے کی
اجازت دیدی اور ان کے لیے مسجد میں بیٹھنے کے
لیے معقول انتظام کر دیا۔ مولانا کی ان بڑھتی ہوئی
سرگرمیوں کو مرکزی حکومت نے تشویش کی نظر
سے دیکھا اور ان پر روک لگانے کے لیے نظر بندی
کے قواعد اور پابندیوں کو اتنا سخت کر دیا کہ
بقول مولانا بیرونی دنیا سے ان کا تعلق بالکل
ختم ہو گیا۔

مولانا کی اس نظر بندی کا تعلق تین حکومتوں
سے تھا ــــــ حکومتِ بنگال، حکومتِ
بہار اور مرکزی حکومت۔ اوّل الذکر دونوں
حکومتوں کے کاغذات سے ضروری اور صحیح
معلومات حاصل کرنے کے لیے میں نے "مولانا
آزاد کی خفیہ فائل" کے فاضل مصنف، جناب
شانتی رنجن بھٹاچاریہ صاحب (کلکتہ) اور خدا
بخش لائبریری پٹنہ کے ڈائرکٹر، ڈاکٹر عابد
رضا بیدار سے درخواست کی ہے اور خوشی کی
بات ہے کہ ان دونوں آزاد شناسوں نے میری
یہ درخواست قبول کر لی ہے۔ خوش قسمتی سے
آجکل جناب یونس سلیم صاحب بہار کے گورنر
اور بحیثیت عہدہ خدا بخش لائبریری کے چیرمین
ہیں۔ اُمید ہے کہ ان کے تعاون سے قابلِ قدر
مدد ملے گی۔ مرکزی حکومت کے کاغذات خود
راقم الحروف دیکھ رہا ہے۔

اس سلسلے کا اب صرف ایک مسئلہ رہ
گیا ہے اور وہ ہے اس نظر بندی کی تاریخ رہائی کا۔
اگرچہ میرے نزدیک اس کی صحیح تاریخ یکم جنوری
۱۹۲۰ء ہے اور اس کی حمایت میں مختلف مواقع
پر میں نے ناقابلِ تردید دلائل و شواہد پیش کیے
ہیں۔ مگر اس کی ایک تاریخ، ۲۷ دسمبر ۱۹۱۹ء
بھی ہے، جو خود مولانا آزاد کی تفسیر، ترجمان القرآن
جلد اوّل کے دیباچے میں درج ہے اور بوجوہ
مالک رام صاحب نے اپنے مضمون: "مولانا آزاد
بحیثیت صحافی" مطبوعہ آزاد نمبر بابت نومبر
۱۹۸۸ء میں یہی تاریخ لکھی ہے۔ چونکہ صدیقی
صاحب اس تاریخ اور اس کے ماخذ سے واقف
نہیں ہیں، اس لیے کسی قدر جھنجلاہٹ اور
ناگواری سے لکھا ہے: "۲۷ دسمبر کی تاریخ مالک رام
صاحب خدا جانے کہاں سے اور کیسے لائے" امید
ہے کہ ان کی یہ غلط فہمی اب دور ہو گئی ہوگی۔

۲. قید و بند کی مدت

میں نے اپنے پچھلے مضمون میں مولانا آزاد
کی قید و بند کی مدت کا جو تعین کیا تھا، اس
کے بارے میں صدیقی صاحب نے لکھا ہے: "اعظمی
صاحب سے ہر جگہ سہو ہوا ہے۔" اس کے
بارے میں میں اپنی رائے شروع میں لکھ چکا
ہوں۔ بہر حال موصوف کے اعتراضات کی روشنی
میں میں نے ازسرِ نو مدت کا تعین کیا ہے، جس
کی تفصیل ذیل میں پیش کرتا ہوں:

۱. تین سال ۹ ماہ، یعنی ۱،۳۷۰ دن
۲. ایک سال، ۲۷ دن، یعنی ۳۹۲ دن
۳. ۵ ماہ ۹ دن، یعنی ۱۵۹ دن

۴. ۲ ماہ یعنی ۶۰ دن

۵. ۱۱ ماہ ۵ دن یعنی ۳۳۵ دن

۶. ۲ سال ۱۰ ماہ ۲۱ دن یعنی ۱۰۴۱ دن

کُل مُدت : ۳،۲۵۷ دن

خود صدیقی صاحب نے بھی مولانا کی زندانی زندگی کی مدت کا تعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ رانچی کی نظر بندی کے علاوہ، دوسری مدتوں میں بھی میرے اور ان کے حساب میں تھوڑا بہت فرق ہے، جو ناقابلِ لحاظ ہے، مگر یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ یہ فرق کیوں؟

۳. مقاماتِ گرفتاری و رہائی

میرے مضمون پر اعتراض کرتے ہوئے صدیقی صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے: "انھوں نے (یعنی راقم الحروف نے) گرفتاری اور رہائی کے مقامات کا ذکر نہیں کیا ہے، جو ضروری تھا۔" اس کو پڑھ کر مجھے غالب کا مشہور مصرع بے ساختہ یاد آگیا:

گر میں نے کی تھی توبہ، ساقی کو کیا ہوا تھا!

آخر موصوف نے بھی مولانا کے قید و بند کی تاریخیں زیرِ بحث مضمون میں درج کی ہیں، وہی اس کمی کو پورا کر دیتے۔ اس کے لیے تحقیق کی بھی ضرورت نہیں تھی، جب میں نے ایوانِ اُردو کے آزاد نمبر کے لیے اپنا مختصر مضمون بھیجا تھا، تو اس سے پہلے ماہنامہ آجکل کے آزاد نمبر (بابت نومبر ۱۹۸۸ء) کو ایک طویل مضمون بھیجا تھا، جس میں مولانا کی اہم تاریخیں اور ان کی سیاسی سرگرمیاں بسط و تفصیل سے لکھی ہیں، جس طرح موصوف نے ایوانِ اردو سے میری مرتبہ تاریخیں بعینہٖ اپنے مضمون میں نقل کر دی ہیں، اسی طرح بلا تکلف آجکل کے میرے مضمون سے گرفتاریوں اور رہائیوں کے مقامات بھی نقل کر دیتے۔ بہرحال ان کے اعتراض کی تعمیل میں ذیل میں تاریخ وار مقامات کی ضروری تفصیل پیش کرتا ہوں:

۱. اواخر مارچ ۱۹۱۶ء کو حدودِ بنگال سے نکل جانے کا حکم ملا۔ مولانا ۳۰ مارچ ۱۹۱۶ء کو کلکتہ سے نکلے اور رانچی پہنچ گئے اور شہر سے باہر مورابادی میں ٹھہر گئے۔ وہیں سے یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو ان کی رہائی عمل میں آئی۔

۲. ۱۰ دسمبر ۱۹۲۱ء کو جمعہ کے دن شام کے چار بجے کلکتہ میں گرفتار کرکے پریسی ڈنسی جیل بھیج دیا گیا۔ وہیں مقدمہ چلایا گیا اور متعدد پیشیوں کے بعد ۹ فروری ۱۹۲۲ء کو پورے ساٹھ دن کے بعد ایک سال کی قید مشقت کی سزا دی گئی۔ سزا پوری کرکے، ۶ جنوری ۱۹۲۳ء کی صبح کو جمعرات کے دن سنٹرل جیل علی پور کلکتہ سے رہا کیے گئے۔ اسی مقدمے کے دوران ۲۴ جنوری ۱۹۲۲ء کو مولانا نے عدالت کو ایک تحریری بیان دیا تھا، جو بعد میں قولِ فیصل کے نام سے شائع ہوا۔

۳. ۲۱ اگست ۱۹۳۰ء کو بعد دوپہر، میرٹھ کے مجسٹریٹ کے وارنٹ پر کلکتہ میں گرفتار کیا گیا اور ڈیرہ دون ایکسپریس سے میرٹھ لایا گیا۔ ۲۷ اگست کو جیل میں مقدمہ شروع ہوا اور اسی دن ۱۹۳۰ء کے آرڈیننس نمبر ۶ دفعہ ۳ کے تحت چھ ماہ قید محض کی سزا دی گئی اور میرٹھ جیل میں قید کر دیا گیا۔ رہائی کے کچھ دنوں پہلے گونڈہ جیل میں منتقل کر دیا گیا، جہاں سے ۲۸ جنوری ۱۹۳۱ء کو رہا کیا گیا۔

۴. ۱۲ مارچ ۱۹۳۲ء کو دہلی میں گرفتار کرکے جیل بھیج دیا گیا اور تقریباً دو ماہ بعد ۱۱ مئی ۱۹۳۲ء کو دہلی جیل سے رہا کیا گیا اسی کے ساتھ حکومت نے حکم دیا کہ وہ کانگر کی سرگرمیوں میں حصہ نہ لیں اور حکومت ک اجازت کے بغیر دہلی سے باہر نہ جائیں۔

۵. ۳ جنوری ۱۹۴۱ء کی صبح کو سوا پانچ مولانا دہلی سے الہ آباد پہنچے، وہیں ریلوے اسٹیش پر گرفتار کرکے نینی جیل (الہ آباد) بھیج دیا گ یہ گرفتاری الہ آباد کی ایک تقریر مورخہ ۱۲ ۱۹۴۰ء کی بنا پر عمل میں آئی۔ ۸ جنوری ۱ کو سٹی مجسٹریٹ الہ آباد نے ڈیفنس آف انڈ رولز دفعہ ۳۸ (۵) کے تحت ڈیڑھ سا قید محض کی سزا دی۔ ۲۸ دسمبر ۱۹۴۲ء بعد دوپہر نینی جیل (الہ آباد) سے رہا ہوئے

۶. ۹ اگست ۱۹۴۲ء کو علی الصباح ب میں گرفتار کرکے قلعہ احمد نگر میں نظر بند کر گیا۔ اوائل اپریل ۱۹۴۵ء میں قلعہ احمد سے بانکوڑہ جیل میں منتقل کر دیا گیا اور و سے ۱۵ جون ۱۹۴۵ء کو رہا کیا گیا۔ پا بجے شام کو کلکتہ ایکسپریس سے کلکتہ کے روانہ ہوئے اور دوسرے روز صبح کو کلکتہ

۴. مولانا کی عمر

یہ معلوم کرنے کے لیے کہ مولانا کی مکمل میں ان کی جیل کی زندگی کا تناسب کیا ہے کی صحیح عمر کا علم ضروری ہے اور یہ عمر اسی معلوم ہو سکتی ہے، جب ان کی صحیح تاریخ معلوم ہو، لیکن بدقسمتی سے یہ تاریخ کسم معلوم نہیں، کیونکہ خود مولانا نے اپنی تہ آپ بیتیوں میں سنہ عیسوی کے علاوہ ص ہجری کا مہینہ اور سنہ لکھا ہے، تاریخ

، یعنی ۱۸۸۸ء مطابق ذوالحجہ
ر۔ ابھی حال ہی، پچھلے سال کے
، مولانا کا ایک خط مورخہ ۱۵/ جولائی
ذریافت ہوا ہے۔ جسے خدا بخش
، (پٹنہ) کی فیلو شائستہ خان صاحبہ
ضمون: "مولانا آزاد کے صحیح سالِ
کا انکشاف" میں شائع کیا ہے۔ یہ
ماہنامہ 'کتاب نما' بابت ماہ ستمبر
، شائع ہوا ہے۔ کتاب نما کی اگلی اشاعت
ر میں اس خط کے بارے میں میرا
شائع ہوا ہے، جس میں میں نے لکھا
، خط کے اِنھی مندرجات کو میں
پر قابلِ قبول سمجھتا ہوں، جن کے
، صراحت کے ساتھ مولانا آزاد نے
لکھا ہے۔ چونکہ اس خط کے انکشاف
ولانا نے اپنی پیدائش کے متعلق بہت
سے اور بار بار لکھا ہے، اس لیے میرے
، نو دریافت سنہ پیدائش سہوِ قلم
ہیے۔ اب رہا تاریخ کا مسئلہ تو میرے
س کی صرف ایک ہی صورت ہے، وہ
ی الحجہ ۱۳۰۵ھ کو مولانا کی تاریخ
رض کر لیا جائے، جس کے مطابق
ریخ پیدائش ۹/ اگست ۱۸۸۸ء
وسری صورت یہ ہے کہ اُردو کے
افی، نامور مصنف اور مولانا آزاد
یہ مرید، مولانا غلام رسول مہر کی
تسلیم کر لیا جائے، انھوں نے اپنے
، میں لکھا ہے: "خود مجھے مولانا سے جو
وا ہے، اس کی بنا پر میں نے تاریخ
ر ذی الحجہ ۱۳۰۵ھ، یعنی ۱۷/ اگست
طے کی تھی"۔[۱۵]

مولانا کی وفات ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء
کو ہوئی ہے، اس لحاظ سے مفروضہ تاریخ پیدائش
کے مطابق مولانا کی عمر ۶۹ سال ۶ ماہ ۱۴ دن
ہوتی ہے۔ یعنی کُل ۲۵،۳۹۹ دن۔ مولانا مہر
کے مطابق اس مدت میں آٹھ دن کا اضافہ ہو جائے گا۔

۵۔ نتیجہ یعنی زندانی زندگی کا تناسب

مولانا آزاد نے اپنی پانچ سزاؤں کی مجموعی
مدت، سات برس آٹھ مہینے کا اپنی اُس وقت
کی عمر کے ترپن (۵۳) برس سے جو تناسب
نکالا تھا، اُس کے مطابق ان کا ہر ساتواں دن
جیل میں گزرا تھا۔ میں نے مولانا کی وفات کے
بعد، ان کی مکمل زندگی اور چھٹی سزائے قید
کی مدت کو شامل کر کے جو تناسب نکالا، حسنِ
اتفاق سے اس کا نتیجہ بھی وہی نکلا، یعنی ہر
ساتواں دن جیل کی نذر ہوا۔ صدیقی صاحب میرے
مضمون پر کافی قیل و قال کے بعد خود حساب
کر کے جس نتیجے پر پہنچے، عجب اتفاق ہے کہ
یہ بھی وہی ہے، جس پر مولانا اور راقم الحروف
دونوں پہنچے تھے۔ چنانچہ موصوف نے لکھا ہے:
"بہرحال اس حساب سے بھی (تقریباً) وہی
نتیجہ نکلا، یعنی مولانا کی زندگی کا ہر ساتواں
دن کم و بیش قید خانے کے اندر گزرا"۔ لیکن
نہ جانے کیا سوچ کر اس کے معاً بعد یہ بھی
لکھا ہے: "لیکن زیادہ بہتر ہوگا اگر یہ کہا جائے
کہ زندگی کا ہر آٹھواں دن جیل میں گزرا"۔ اس
کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی، اس سلسلے میں انھیں
ذاتی خط لکھا ہے جس کو بھیجے ہوئے ایک مہینے سے
زیادہ ہو گیا، مگر اب تک جواب نہیں ملا۔ موصوف
نے مولانا آزاد کی جو تاریخِ ولادت لکھی ہے،
اس کی بنیاد اور حوالہ بھی اس خط میں معلوم کیا تھا۔

میرے اور صدیقی صاحب کے نقطۂ
نظر میں دو بنیادی اختلاف ہیں، وہ نظر بندی
کا آغاز ۸/ اکتوبر ۱۹۱۶ء سے کرتے ہیں اور
راقم الحروف یکم اپریل ۱۹۱۶ء سے، ان کے
نزدیک اس کی کُل مدت ۳ سال دو ماہ ۲۵
دن، یعنی ۱۱۸۱ دن ہے اور میرے نزدیک
تین سال ۹ ماہ، یعنی ۱۳۷۰ دن۔ اسی طرح
ان کی رائے میں مولانا آزاد کا یوم پیدائش ۱۷/ یا
۲۲/ اگست ۱۸۸۸ء اور مولانا کی عمر ۶۹ سال
۴ ماہ پانچ دن، یعنی ۲۵،۳۰۵ دن ہے میرے
نزدیک ایک مفروضہ تاریخ کے مطابق مولانا کا
یوم پیدائش ۹/ اگست ۱۸۸۸ء ہے اور مولانا
مہر کی روایت کے مطابق ۱۷/ اگست ۱۸۸۸ء
ہے، اس لحاظ سے مولانا کی عمر ۶۹ سال ۶ ماہ
۱۴ دن، یعنی کُل ۲۵،۳۹۹ دن ہوئی۔ مولانا مہر
کے مطابق اس مدت میں ۸ دن کا اضافہ
ہو جائے گا۔ ان تمام اختلافات کے باوجود
اور تمام سزاؤں کی مدت کے از سرِ نو
تعین کے بعد بھی نتیجے میں کچھ زیادہ فرق پیدا
نہیں ہوا۔ یعنی پچھلے نتیجے میں صرف ۵۶ عشاریہ
کا اضافہ ہوا ہے، گویا ۷،۵۶ دن قید میں گزرا
اگر آپ مناسب سمجھیں تو صدیقی صاحب کے
الفاظ میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں: "مولانا کی زندگی
کا ہر ساتواں دن کم و بیش قید خانے میں گزرا"۔

۶۔ ایک گزارش یا مشورہ

میں ذاتی طور پر فاضل مضمون نگار
خورشید پرویز صدیقی صاحب سے واقف
نہیں ہوں اور بدقسمتی سے ان کا یہ پہلا مضمون
ہے جو میری نظر سے گزرا ہے۔ اگر اس سے پہلے
ان کا کوئی علمی یا تنقیدی مضمون یا مضامین یا

کوئی کتاب یا کتابیں شائع ہوئی ہیں تو یہ میری بدتوفیقی ہے کہ انھیں پڑھنے کی عزت حاصل نہیں ہوئی۔ لیکن اس کے باوجود ان کو ایک مخلصانہ مشورہ دینا چاہتا ہوں، امید ہے کہ وہ سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور فرمائیں گے۔

اپنے اس مضمون میں انھوں نے متعدد مقامات پر میری طرف ایسی باتیں منسوب کی ہیں، جنھیں میں نے اس طرح نہیں کہا یا لکھا ہے، جس طرح انھوں نے میرے حوالے سے بیان کیا ہے۔ چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔۔۔

"لطیف صاحب نے قید کی کُل مدت ۳۹۵ دن یا ایک سال ایک ماہ بتائی ہے جو غلط ہے، کیونکہ اس میں دو روز کا اضافہ ہے۔" اس عبارت میں خط کشیدہ دنوں کی تعداد خاکسار نے نہیں لکھی ہے، یہ صدیقی صاحب کا اضافہ ہے۔ نیز میں نے اس مُدّت کے ساتھ "تقریباً" کا لفظ لکھا تھا جو بامقصد تھا مگر موصوف نے اعتراض کرتے وقت اسے حذف کر دیا۔ دوسری مثال اس سے زیادہ اہم ہے: مولانا آزاد کی عمر کی مدت کے بارے میں مَیں نے جو کچھ لکھا ہے، اس پر اعتراض کرتے ہوئے موصوف نے لکھا ہے: "اعظمی صاحب نے مولانا کی عمر کی کُل مدت ۶۸ سال ، ماہ ۹ یا ۱۰ دن لکھی ہے، یہ بھی غلط ہے۔" اس کو دیکھنے کے بعد میں نے محسوس کیا یا تو میں نے ۶۹ کے بجائے ۶۸ لکھ دیا ہے یا کتابت کی غلطی ہے، بہر حال غلطی تو غلطی ہے، مگر موصوف نے زیادتی یہ کی ہے کہ اس غلط مدت یا عمر سے مولانا کی تاریخ پیدائش نکالی جس میں، میرے حساب سے خود ان سے غلطی ہوئی ہے اور اس غلط در غلط حساب سے جو تاریخ پیدائش نکلی ہے، اسے میری طرف اس طرح منسوب کر دیا، گویا یہ میں الفاظ میں نے لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "معلوم نہیں کہاں سے اعظمی صاحب نے مولانا کی تاریخ پیدائش ۱۲ مئی ۱۸۸۹ء نکالی ہے، وہی جانیں۔" کسی پر الزام لگانے کا یہ طریقہ میں نے پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔

لیکن مالک رام صاحب کی ایک عبارت کے ساتھ انھوں نے جو سلوک کیا ہے، اسے تو موصوف کا شاہکار کہا جا سکتا ہے۔ مالک رام صاحب نے اپنے ایک مضمون میں مولانا کی رانچی نظر بندی کے سلسلے میں صرف اس قدر لکھا ہے: "ابھی اس حکم اور ان کے رانچی میں قیام پر پانچ مہینے بھی نہیں گذرے تھے کہ ۸ جولائی ۱۹۱۶ء کو حکومت ہند نے ان کی رانچی میں نظر بندی کا حکم جاری کر دیا۔" اب صدیقی صاحب کی عبارت ملاحظہ فرمائیے: "محترم مالک رام صاحب کا کہنا ہے کہ "مولانا رانچی میں تقریباً پانچ ماہ تک آزاد رہے، ۸ جولائی ۱۹۱۶ء کو انھیں نظر بند کیا گیا۔" جس جرأت اور دلیری کے ساتھ یہ تحریف کی گئی ہے، کیا تحقیق کی دنیا میں اس کی کوئی اور مثال ملے گی؟!

انھی چند مثالوں کے پیش نظر موصوف کو انتہائی ادب سے مشورہ دینا چاہتا ہوں کہ خدارا آئندہ احتیاط سے کام لیں اور کسی کی طرف کوئی ایسی بات منسوب نہ فرمائیں جو اس نے نہ کہی ہو۔ یہ نہ صرف اصولِ تحقیق کے منافی ہے، بلکہ دیانت کے بھی خلاف ہے۔

حوالہ جات

۱. مولانا آزاد: تذکرہ (لاہور ایڈیشن) صفحہ ۳۱۵۔
۲. مولانا آزاد، البلاغ (مورخہ ۷، ۱۴، ۲۴ مارچ ۱۹۱۶ء) صفحہ ۳۰۹
۳. مولانا آزاد، غبارِ خاطر (حاشیہ) ساہ اکادمی ایڈیشن، صفحہ ۳۵
۴. مولانا آزاد، ہماری آزادی (ترجمہ: م مجیب) پہلا ایڈیشن، صفحہ ۲۳
۵. مولانا آزاد، ترجمان القرآن حصہ او (دیباچہ) ایڈیشن ۱۹۸۹ء صفحہ ۱۹
۶. مالک رام: آجکل آزاد نمبر، نومبر صفحہ ۸۵۔ "کچھ ابوالکلام آزاد کے با یں" (۱۹۸۹ء ایڈیشن) صفحہ ۶۱
۷. مولانا آزاد: غبارِ خاطر: حوالہ سا
۸. مولانا آزاد: قولِ فیصل، بحوالہ ابو اُردو۔ آزاد نمبر دسمبر ۸۸ء صفح
۹. مولانا آزاد: تذکرہ، صفحہ ۳۱۶
۱۰. مولانا آزاد: تذکرہ، صفحہ ۳۱۸
۱۱. مولانا آزاد: ہفتہ وار پیغام ب ۲۳ ستمبر ۱۹۲۱ء صفحہ ۲
۱۲. مولانا آزاد: قولِ فیصل۔ حوالہ سابق
۱۳. مولانا آزاد: غبارِ خاطر۔ حوالہ سا
۱۴. مولانا آزاد: ترجمان القرآن۔ حوالہ سا
۱۵. مولانا آزاد: تذکرہ حوالہ سابق
۱۶. مولانا آزاد: تذکرہ حوالہ سابق
۱۷. غلام رسول مہر: معترضین ابوا آزاد (تالیف: عبداللطیف ا مطبوعہ: ۱۹۹۰ء، صفحہ ۶۱
۱۸. مالک رام: حوالہ سابق، نمبر

نظمیں

اے خسروِ شیریں سخناں!

(فیض احمد فیضؔ کی چھٹی برسی پر)

ھ برس سے ادب وفن کے چمن زار میں فیضؔ!
وز ہمراہِ صبا ہے تری یادوں کا گزر
صبا مجھ کو لیے پھرتی ہے اُس وادی میں
رے شعروں میں جہاں ہے مرے خوابوں کا سفر

رے نغموں سے عبارت ہے نہ جانے کتنی
ری صبحوں کی لطافت، مری شاموں کی مہک
تنی مانوس ہے الفاظ کے چہرے سے ترے
ل کے دُکھنے کی ادائرات کے ڈھلنے کی کسک

رے احوال وکوائف کی فضا کاری میں
ری نظموں، تری غزلوں کے کئی رنگ رہے
ں ہے، جیسے مرے احساس کی سرگوشی سے
رے گیتوں کے خم و پیچ ہم آہنگ رہے

ہے خود، اک تربیتِ ذوقِ طلب تیرا سخن
عارض ولب کے فسانے، قد وگیسو کے فسوں
فکرِ فردا، غمِ ایام، شعورِ ہستی
دار سے کوچۂ دلدار تلک شرحِ جنوں

تو، کہ خاموش ہے آج اے شہِ شیریں سخناں!
کتنے ہونٹوں پر ہے غلطاں "تری آواز کا رنگ"
کتنے پیرایوں میں ہے طرزِ تکلم تیرا
"حرفِ سادہ کو عنایت کیے اعجاز کا رنگ"

نئی راہیں، نئی سمتیں، نئی جہتیں ہیں، مگر
آج بھی تیری صدا، سنگِ نشاں ٹھہری ہے
"تونے جو طرزِ فغاں کی تھی قفس میں ایجاد
فیضؔ! گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے"

عبدالاحد سازؔ

ذکریا مینور، چوتھا منزل، ۱۴۹، یوسف میر علی روڈ، بمبئی ۴۰۰۰۰۳

ھائیکو

(۱)

نفرتوں کے درمیاں
آدمی کب تک جیے گا؟
اے مکینِ آسماں

(۲)

اتنا اُوپر آسماں
اور زمیں پیروں تلے کھسکی ہوئی
آدمی جائے کہاں؟

(۳)

برگد کی چھاؤں
شاید سفر میں اب کوئی
مل جائے گاؤں

تنویر اختر رومانی

آزاد نگر، جمشید پور ۸۳۲۱۱۰ (بہار)

خورشید اکرم

گرم کوٹ

(راجندر سنگھ بیدی کی نذر)

بیدی کا کلرک اب ریٹائر ہو چکا تھا۔

اس کے برسوں پرانے گرم کوٹ میں اتنے پیوند لگ چکے تھے کہ اب کی سردی میں اسے پھر ایک نئے گرم کوٹ کے مسئلے سے دوچار ہونا تھا۔ لیکن اس کی نوبت نہیں آئی۔ اب کے جو سردی آئی تو اس کے سارے دکھ آسان کر گئی۔ آتے موسم کی گلابی سردی میں جب بازار اور اشتہار گرم کپڑوں سے گرمانے لگے ہیں، وہ کھانستا کھنکھارتا ہوا مر گیا۔

اس کا اکلوتا بیٹا جس کی چھوٹی سی خواہش کو پورا کرنے کے لیے وہ موسم کی سختی جھیلنے کو تیار ہو گیا تھا اسی بیٹے کی بے روزگاری اور اس کے نتیجے میں ہونے والے فرسٹریشن کو دیکھ کر اس نے 'بڑے صاحب' کی سفارش سے اس کی نوکری لگوا دی تھی۔ اس طرح بیدی کے کلرک کا بیٹا بھی کلرک بن گیا۔ اس نے وہ فائلیں اور کرسی سنبھال لی جو اس کے باپ نے چھوڑی تھیں۔ گھر بھی ویسا ہی تھا کرائے کا۔ بیوی بھی ویسی ہی اور بچے بھی ویسے ہی۔ مگر اب زمانہ بدل گیا تھا۔ اس کا بیٹا ٹرائی سائیکل نہیں پڑوسی کی طرح رنگین ٹی۔وی چاہتا تھا۔ زمانے نے جو ترقی کی تھی اس کا ساتھ وہ خود تو نہ دے پایا کہ وہ کلرک کا بیٹا کلرک ہی رہا۔ لیکن اب کی نسل میں کلرک کا بیٹا افسر کے بیٹوں سے کم کے خواب اور خواہشیں نہیں رکھتا تھا۔ بیٹی کانونٹ میں پڑھنے کی ضد کیا کرتی اور بیوی اس کو بس میں دھکے کھانے سے بچنے کے لیے اسکوٹر خریدنے پر زور دے رہی تھی۔

"جانتے ہیں! کل مسز مکھرجی آئی تھیں بڑی خوش۔ بتانے لگیں کہ مکھرجی صاحب نے اسکوٹر لے لیا ہے ــــــ تم بھی کیوں نہیں اڈوانس لے کر اسکوٹر خرید لیتے۔ بس میں آنے جانے میں کتنی تکلیف ہوتی ہے تمھیں کبھی کبھار ہم لوگ بھی شام کو اس پر گھومنے نکلا کریں گے۔"

اس نے بھی سوچا: سچ شام کو کتنی اچھی ہوا چلتی ہے۔ کتنا سہانا لگتا ہے جب پچھلی سیٹ پر بیٹھی عورت اپنے شوہر کی کمر پکڑے بیٹھی ہوتی ہے۔ اور اس کے کھلے ہوئے بال ہوا میں اڑتے ہیں۔ اس لمس سے کیسی گدگدی ہوتی ہوگی پیٹھ میں۔ کبھی کبھی ذرا سی تبدیلی سے بھی سب کچھ کیسا نیا نیا سا لگتا ہے

خواہش خود سر ہوتی جا رہی تھی۔ اچانک اسے خیال آیا کہ پٹرول کی قیمت بہت بڑھ گئی ہے۔ پھر اڈوانس کی قسط کٹ جائے گی تو تنخواہ بچے گی ہی کتنی۔

تنخواہ اس کی بہت بڑھ گئی تھی۔ اس نے اندازہ لگایا۔ ابھی صرف پانچ ہی برس تو ہوئے ہیں اس کی نوکری لگے ہوئے۔ اس دوران میں دس بار ڈی۔ اے میں اضافہ ہوا۔ تیسرے پے کمیشن کی سفارش اور سالانہ انکریمنٹ الگ۔ مہینے کی آخری تاریخ کو جب یک مشت پیسہ ملتا ہے تو اسے یہ دنیا کتنی سستی معلوم ہوتی ہے۔ اس وقت جو چھوٹے بڑے خرچے اس کے ذہن میں آتے ہیں۔ اس کے حساب سے وہ مہینے میں دو سو یا سو روپے بچا لینے کی حالت میں ہوتا ہے۔ لیکن جیسے جیسے دن گزرتے ہیں اسے لگتا ہے دن ٹھہر گئے ہیں اور جیب سے پیسے اڑ اڑ کر بھاگ رہے ہیں۔ برسوں سے ہر ماہ کے اخیر میں وہی تنگی اور اس کے نتیجے میں پیدا شدہ جھنجھلاہٹ اکثر مہینے کے آخری دنوں میں گھر کی فضا بالکل تنی تنی رہتی۔ بیوی خالی خولی محبت سے اکتا کر کھنچی کھنچی رہتی اور بیٹا یا بیٹی کی کسی نہ کسی بہانے ایک آدھ بار پٹائی ضرور ہو جاتی۔

ایسا نہیں کہ وہ اپنے بیٹے یا بیٹی کی پٹائی کر کے خوش ہوتا ہو۔ ایسا بھی نہیں کہ بیوی اس سے منہ پھلا کر اطمینان سے جی رہی ہوتی ہے۔ سب کچھ ہاں سب کچھ ویسا ہی رہتا ہے۔ بس دن اور وقت اس موڈ کو بدل دیتا ہے۔ لیکن تنخواہ ہاتھ میں آتے ہی سب کچھ نارمل ہو جاتا ہے۔ بیٹے کو گود میں لے کر اس کی فرمائش سنتا ہے اور اس کو پورا کرنے کا وعدہ کرتا ہے۔ بیوی آپ ہی آپ سینے سے لگ جاتی ہے۔ پہلا ہفتہ ہنسی خوشی گزر جاتا ہے۔ پھر دن بدن زندگی کی مسرتوں کے آئینے پر ضروریات کی گرد کی تہہ موٹی ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ مہینے کے آخری دنوں میں اس آئینے کے سارے عکس دھندلا جاتے ہیں۔

ہر مہینے کے شروع میں وہ سوچتا ہے کہ اب کے قسطوں پر ٹی۔وی خرید لے گا۔ بیٹا ٹھیک ہی تو کہتا ہے۔ زمانہ اتنی تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔ دنیا کہاں سے کہاں چلی گئی ہے۔ بچے اپنی آنکھوں سے دنیا کے کیسے کیسے روپ دیکھ رہے ہیں۔ ان کا

بلاک سی، کوارٹرس ۶، بنگلہ صاحب لین، ہنومان روڈ فلیٹس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ہمت کھل رہا ہے۔ پھر یہ کہ وہ پڑوس میں سکسینہ
صاحب کے یہاں ٹی۔وی دیکھنے جاتا ہے۔ پتہ
نہیں وہاں وہ لوگ اس کے ساتھ کیسا سلوک
کرتے ہوں گے۔ پتہ نہیں اُسس کا بیٹا' اس کا
موقین بیٹا کس احساس میں جکڑا کونے میں بیٹھ
کر ٹیلی وژن کے پردے پر دنیا کو دیکھتا ہوگا۔
کسی کونے میں سہما سا۔ اس کے اندر کا باپ تلملا
اٹھتا ہے وہ اپنے بیٹے کا فخر اور خوشی کے احساس
سے تمتماتا ہوا چہرہ دیکھنا چاہتا ہے اور سوچتا ہے
کہ کسی طرح اس مہینے قسطوں پر ٹی۔وی لے ہی
لینا چاہیے۔ پھر اس کے بہلاوے کا اور کوئی
سامان ہے بھی تو نہیں۔ ابھی آٹھ دس مہینے پہلے
تک بابو اسے چھوٹے چھوٹے قصے سنا کر بہلایا
کرتے تھے۔ اسے گدگدایا ہنسایا کرتے تھے۔
کلیلہ و دمنہ' کی حکایتیں سنا کر اس کے معنی
بتایا کرتے تھے۔ اسس لیے اُسے کبھی اس بات کی
کمی نہیں محسوس ہوئی کہ بیٹے کے جی کو بہلانے کے
لیے بھی کوئی سادھن کرنا ضروری ہے۔ بابو جی
یقیناً USEFUL تھے گو وہ ریٹائر ہو گئے تھے۔
بیمار بھی رہتے تھے لیکن سچ پوچھو تو اس میں بھی
کوئی نقصان نہ تھا۔ بابو کو جتنی پینشن ملتی تھی وہ
ایک بوڑھے رٹائرڈ کلرک کے خرچ سے بہت
زیادہ تھی۔ بیمار وہ لاکھ پڑ جائیں مگر دوا ہسپتال
سے لاتے تھے۔

"بتا جی! رات آپ کس قدر کھانس رہے
تھے۔ آج ڈاکٹر کے پاس ضرور چلے جائیے گا۔"

مگر بابو پتہ نہیں کس خیال سے ڈاکٹر کے
پاس کبھی نہیں گئے۔ وہ جب کبھی انھیں ڈاکٹر
کے پاس جانے کو کہتا بابو مذاق اڑانے والے
انداز میں کہتے۔

"ارے بیٹا! ڈاکٹر کا بل دیکھ کر تو اچھا بھلا
آدمی بیمار ہو جائے۔" کہہ کر بابو زور سے ہنسنے
کی کوشش کرتے۔ اور اس کوشش میں وہ
ہانپ جاتے۔ بابو ہنستے رہنے کی کوشش کرتے
تھے کم دلچسپ باتوں پر بھی بابو جی کھول کر ہنسنا
چاہتے لیکن ہوتا یہ کہ جی بھر کر ہنسنے سے پہلے ہی
کھانسنے اور ہانپنے لگتے اور چُپ ہو جاتے جیسے
وارم اَپ کے دوران ہی کوئی کھلاڑی تھک کر
سائڈ لین میں بیٹھ جائے۔

بابو کی موت سے اتنا تو ہوا کہ اب کھانسی
کے دورے پڑنے سے جو اس کی نیند میں خلل
پڑتا تھا وہ ختم ہو گیا تھا۔ اب وہ اور بیوی بچے
کم سے کم رات کو چین کی نیند سو سکتے تھے لیکن
اس کے ساتھ ساتھ کئی طرح کا نقصان بھی ہوا۔
گھر پر جو ایک بزرگ کا سایہ تھا وہ سر سے اُٹھ
گیا۔ اس بات سے وہ کئی روز تک بہت اُداس
رہا۔ لیکن پھر یہ سوچ کر دل کو بہلانے میں کامیاب
ہو گیا کہ بابو کو اب جی کے کرنا بھی کیا تھا۔ سچ
پوچھو تو کسی کو بھی جی کے کیا کرنا ہوتا ہے۔ بس
زندگی کاٹنی ہوتی ہے۔ اور پھر ایک نہ ایک
دن مرجانا ہوتا ہے۔ البتہ یہ کہ بابو کی موت کے
بعد اس کے بیٹے کا دل بہلانے والا' اسے چھوٹی
چھوٹی کہانیاں سنانے اور ہنسانے گدگدانے
والا کوئی نہ رہ گیا تھا۔ بابو کی موت کے دو تین
مہینے کے بعد اُسے ان کی موت کے نقصانات کا
ایک اور پہلو نظر آیا۔ بابو کی پینشن کی جو تھوڑی بہت
رقم ہر مہینے آجاتی تھی اسس کا سلسلہ اب ختم ہو
گیا تھا۔ اب مہینے کے آخری دنوں میں اُسس کا
ہاتھ کچھ زیادہ ہی تنگ ہو جاتا۔

بابو کو مرے ہوئے سال ہونے کو
آیا تھا۔ موسم بدل رہا تھا۔ وہ موسم آرہا تھا جس میں
دھوپ چھاؤں جیسی ہو جاتی ہے۔

اسے بیٹھے بیٹھے بابو کی یاد آنے لگی۔ بابو
ہمیشہ انکار کرتے لیکن صحیح معنوں میں وہ کتنے
خواہشمند تھے کہ کسی صورت سے ایک گرم کوٹ
سلوا لیں۔ اسے اپنے بابو کے گرم کوٹ کا قصہ
نہیں معلوم تھا۔ اس نے یہ کہانی پڑھی تھی لیکن
اسے محض ایک کہانی سمجھ کر بھلا دیا تھا۔ اسے نہیں
معلوم تھا کہ اس کہانی کا مرکزی کردار اسی کا
بابو تھا اور یہ وہی گرم کوٹ تھا جسے بابو برسوں
سے پیوند لگا کر پہن رہے تھے۔ اسے پتہ نہیں
تھا کہ بابو نے اس کوٹ کو کب سلوایا تھا۔ اسے
تو بس اتنا یاد تھا کہ جب سے اس نے ہوش سنبھالا
تھا ہر سال سردی بھر بابو کو وہی کوٹ پہنتے ہوئے
دیکھتا۔ ہر سال' شاید ہر سال ماں ضد کرتی کہ
نیا کوٹ سلوالو۔ ہر سال بابو شاید ایسا ہی کچھ
جواب دیتے:

"ارے ٹھیک ہے اس کا جھگڑا کیا ہے۔
ایک بار کوٹ بن گیا' بہت ہے۔ اب بیٹے کو
پہناؤ نیا بنوا کر۔"

اور ماں ہر دو تین برس پر اس کے لیے
ایک نیا کوٹ سلوا دیتی۔

"اماں! یہ کوٹ تو ابھی بالکل ٹھیک ہے۔"
وہ خوشی سے بھرا احتجاج کرتا۔

"نہیں نہیں! اب یہ پُرانا ہو گیا ہے۔ یہ
کپڑے تو درزن سے کہنا کہ ذرا ٹھیک سے
سی دے۔" اس کے آگے گریجویشن کرنے پر
تو ماں کی خوشی کا جیسے ٹھکانہ ہی نہیں رہا تھا۔
ماں نے جانے کہاں سے اتنے پیسے جمع کر لیے تھے
کہ اس کے لیے اتنا عمدہ کوٹ کا کپڑا خرید لائی
تھی۔

"لو اسے ذرا بڑھیا سا سلوانا۔ چار آدمیوں
کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ہوتا ہوگا۔ یہ کیا کہ ہر

وقت وہی پرانا کوٹ بدن پر ٹانگے پھر رہے ہیں۔"

اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کی ماں گرم کوٹ کے معاملے میں اتنی ٹچی (TOUCHY) کیوں ہے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ عورت اپنی کس خواہش کی تکمیل کے لیے کون سا جتن کرتی ہے۔

اس نے کوٹ کو نکال کر دیکھا خوشنما نفیس کوٹ بوسیدہ ہو چکا تھا۔ ایک مدت تک لگاتار ایک ہی کوٹ کو پہنتے پہنتے دہ داب چکا تھا۔ اس سے پہلے اتنے برسوں تک کوئی ایک کوٹ اس نے نہیں پہنا تھا۔ ماں ہوتی تو یہ کوٹ اس نے کب کا رٹائر کر دیا ہوتا۔ لیکن ماں نے تو جیسے اپنی آخری پونجی اپنے بیٹے کے بدن پر سجا کر خوشی سے ایسے آنکھیں موندیں کہ پھر کھول نہ سکی۔ تب سے اب تک اس نے اسی کوٹ کو ہر سال دھلوا دھلوا کر پہنا تھا۔ دھلائی کرواتے کرواتے اس کا استر اور جیبیں پھٹ گئی تھیں اب ٹھنڈک کا مقابلہ کرنے میں یہ کوٹ ناکام تھا۔ پتہ نہیں یہ اس کا اپنا احساس تھا یا کپڑے نے اپنی قوتِ مدافعت کھو دی تھی۔ وہ پچھلے تین چار برس سے ہر سال نئے کوٹ کی بابت سوچتا لیکن پھر اسے ذہن سے جھٹک دینے کے سوا اور کوئی چارہ نہ پاتا۔

سردیوں کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ تنخواہ ملنے کے بعد کا پہلا ہفتہ ختم ہو چکا تھا۔ دفتر کے لوگ کوٹ پہن کر آنے لگے تھے۔ اس نے غور سے دیکھا، کئی لوگوں کے کوٹ نئے تھے۔ یا کم از کم نئے نہیں تھے تو اس کے کوٹ کی طرح بوسیدہ بھی نہیں تھے۔ عجیب بات یہ ہے کہ وہ بھی تو اسی کی طرح کلرک ہیں۔ اس کے جتنی ہی تنخواہ پاتے ہیں۔ ویسی ہی ٹکی بندھی زندگی گزارتے ہیں، پھر ان کے پاس اتنے سارے پیسے کہاں سے آ جاتے ہیں کہ اتنی جلدی جلدی یہ کوٹ بنوا لیتے ہیں۔ اسے اپنی آنکھوں پر کچھ کچھ شک سا ہونے لگا تھا۔

لنچ کے بعد گپ شپ کے دوران میں اس نے ایک بار مہرہ کے کوٹ کو چھو کر دیکھ ہی لیا۔

"بہت بڑھیا کوٹ ہے یار!"

"Raymonds کا کپڑا ہے بھائی صاب!"

مہرہ نے شیخی بگھارنے کے انداز میں کہا۔

بہت قیمتی ہوگا۔ ہے بھی خوبصورت کیسا جچ رہا ہے اس پر۔ 'کتنے میں پڑا؟' اس نے پوچھنا چاہا۔ لیکن اسے محسوس ہوا کہ یہ بڑا نامعقول سوال ہوگا۔ اچانک اپنی افسردگی پر قابو پانے کے لیے اس کی حسِ مزاح بیدار ہوئی۔ اس نے کہا۔

"مہرہ! یہ اتنا بڑھیا کوٹ سسرال سے ملا ہے کیا؟"

دو تین روز کے بعد یوں ہوا کہ گنگولی نے باتوں باتوں میں ہنستے ہوئے اس سے کہا۔

"کیوں یار! ایک ہی کوٹ کو رگڑے جا رہے ہو۔ اس کی جان چھوڑو۔ کسی غریب کو دے دو۔ دوسرا کوٹ لے لو۔"

وہ کُھبر گیا۔ گنگولی مذاق اڑا رہا ہے؟

"دوسرا کوٹ کہاں سے آئے گا یار! اتنے پیسے بچ جاتے ہیں؟"

"کتنے پیسے؟ ارے آج کل تو کوٹ بہت سستے ملنے لگے ہیں۔ اور وہ بھی اچھے قسم کے کوٹ . . ."

"اچھے کوٹ اور سستے؟ اچھا، سستے سے کیا مطلب ہے صاحب! کتنا بھی سستا ہو پانچ چھ سو تو لگ ہی جائیں گے۔"

"ارے یار! کس دنیا میں رہتے ہو۔ بازار وازار نہیں جاتے کیا۔ سو روپے میں ایک نمبر کوٹ ملتا ہے۔ اے ون . . ."

"سو روپے میں کوٹ؟" وہ ہنسا روپے میں تو کوٹ کا فوٹو بھی نہیں ملے گا چوری کا مال ہے کیا؟"

"چوری کا نہیں ہے۔ یورپ اور کنٹریز سے جو مال آتا ہے نا۔ انھی میں سے مگر ہوتا ہے بہت عمدہ۔ باہر کے مال کی ہی اور ہے۔ لگے گا ہی نہیں کہ یہ پہنا ہوا ہے۔ پچھلے ہفتے مہرہ نے وہی کوٹ خریدا دیکھ کر لگتا ہے کہ وہ پرانا یا پہنا ہوا ہے

یوروپیوں اور امریکیوں کا اتر بڑی کراہیت سی ہوئی۔ یہ گورے لوگ کتنے گندے ہیں۔ ہفتوں نہیں نہاتے یوروپ اور امریکہ کے لوگ، ایڈز ز پتہ نہیں ایڈز سے مرنے والوں کے کو ہی یہاں امداد کے طور پر بھیج دیے جا ان کو پہن کر تو ایڈز ہو جائے گا۔ وہ کرا سے بھر اٹھا۔ سامنے سے مہرہ گزرا۔ مہرہ اسے گھن آنے لگی۔ دن بھر اسے مہرہ کو د کراہیت سی ہوتی رہی۔ مہرہ پر کیا مو جن جن کے بدن پر اچھا سا کوٹ چڑھا سب کو دیکھ کر اسے گھن سی آ رہی تھی۔ آپ میں مست تھا۔ سبھی اپنے آپ میں تھے۔ ایک لمحے کو اس نے محسوس کیا کہ کوٹ اس نے پہن رکھا ہے۔ کیسا عمدہ ہے۔ مگر دوسرے ہی لمحے اسے اس خ کراہیت سی ہوئی۔

شاید تیسرے ہی روز اس نے اس کو اپنے ریٹائرمنٹ کا الٹی میٹم

ں کر دفتر جانے والی بس میں وہ سوار ہوا۔
ں بھیڑ تھی۔ جب وہ بھیڑ میں اپنے لیے
ب جگہ کی تلاش میں زور آزمائی کر رہا
ں وقت اس کا کوٹ پیٹھ پر سے تھوڑا
ل گیا۔ اب اس کو چھپایا بھی تو نہیں جا
تھا۔ پتہ نہیں یہ کوٹ کسی نہ کسی وجہ سے
کے اعصاب پر کیوں سوار تھا۔ بھاری من
ن چُراتا ہوا وہ دفتر پہنچا۔ ذرا دیر بعد
ہلکتا ہوا آفس میں داخل ہوا۔ اُس نے
کہ مہرہ کے کوٹ کے بٹن کھلے ہوئے تھے
، کے چلنے سے کوٹ کا نچلا حصہ آگے پیچھے
ہوا بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔ اُسے
رح دیکھ کر کراہیت کی ایک ہلکی سی لکیر
یں اُبھری۔ پھر ایک خیال آپ ہی آپ
یں آیا۔ بُرا کیا ہے؟ آدمی ہی کا پہنا ہوا
!

شام کو دفتر سے نکل کر وہ پرانی چیزوں
ار کی طرف چل پڑا۔

ذہن عجیب طرح کی اُلجھن میں تھا۔
... گرم کوٹ ... نیا کوٹ نہیں
ہینڈ ... اُترن ... ایڈز ...
ں نہ نہانے والے گندے یوروپیوں کا
... کیچڑ میں لت پت آدمی ....
... بیماری ... دوسرا اچھا سا
... بُرا کیا ہے۔ عجیب طرح کے
ت ـــــ ایک دوسرے سے ٹکراتے
قویت پہنچاتے ہوئے خیالات۔ انہی
ت کے گھیرے میں گھرا وہ بازار پہنچ گیا۔
ں ہر طرف 'خوش پوش' لوگ بھاؤ
سہے تھے۔

ہاں ناں کرتے کرتے اس نے بالآخر اپنی
پسند کا ایک کوٹ سو روپے میں خرید ہی لیا۔
ہا... کتنا سستا ہے۔ چلو اب اس کو
ڈرائی کلینر کو دے دیں گے۔ دھو دے گا
تو ایڈز کے جراثیم کیا اس کے باپ بھی مر جائیں
گے۔ ہو جائے گا بالکل پاک صاف۔ تصور میں
اس نے اپنے آپ کو کوٹ پہنے ہوئے دیکھا۔
اسے اپنا آپ ہی بڑا اسمارٹ لگا۔ پھر اچانک ہی
اسے لگا اترن... اس خیال کے آتے ہی
اسے اپنے آپ سے گھن آئی۔ سوچا چلو واپس
کردو۔ نہیں واپس تو اب لے گا نہیں۔ چلو کسی
غریب کو دے دو۔ مگر اب وہ خود کیا کرے گا۔
کیا پہنے گا۔ جو پیسے تھے وہ بھی گئے۔ اوں ہوں؟
خیرات کرنا وہ بھی گھر لٹا کر کیا معنی؟ اسی اُدھیڑ
بن میں وہ کپڑوں کی لین سے باہر نکلا۔ سامنے
پان سگریٹ کی ایک گمٹی تھی۔ اس نے ایک
پنوی کٹ سگریٹ خریدا۔ سگریٹ وہ نہیں
پیتا تھا۔ سگریٹ خریدنے تک یہ بات ذہن میں
نہیں آئی کہ اس نے سگریٹ کیوں لیا۔ اسے
لگا سرشاری کے احساس میں ایسا ہوتا ہے۔
سگریٹ کی دُکان میں لگے ہوئے آئینے میں اُس
نے اپنے آپ کو دیکھا۔ ایک ادا سے سگریٹ جلایا۔
شیخی کے انداز میں سگریٹ کا دھواں مُنہ سے
اُگل دیا۔ اسے اچھا لگا۔ اس نے ایک زور کا کش
لیا۔ اب کے جو دھواں اگلا تو اس کے ساتھ ایک
ٹھنڈی سانس بھی آپ ہی آپ مُنہ سے نکل گئی۔
جیسے وہ ہار گیا ہو۔ یا کچھ کھو رہا ہو۔ اس نے انگلی
میں دبے ہوئے سگریٹ کی طرف دیکھا۔ سگریٹ
کا جلا ہوا حصہ راکھ ہو گیا تھا اور آگ راکھ میں
گم ہو رہی تھی۔ راکھ کی سرحد جہاں پر ختم ہوتی تھی
وہاں سے دھوئیں کی دُبلی پتلی ٹیڑھی میڑھی سی
لکیریں اُٹھ رہی تھیں۔ اس نے ہلکے سے جیسے
بغیر کسی کوشش کے راکھ جھاڑ دی۔ اس نے
سوچا آدمی جب کسی طرح کے تناؤ میں ہوتا ہے
تب بھی تو سگریٹ پیتا ہے۔ اس خیال کے
آتے ہی اس کا مُنہ کڑوا ہو گیا۔ سگریٹ سے
دھوئیں کی ٹیڑھی میڑھی لکیریں اُٹھ رہی تھیں۔
اُسے لگا جیسے سامنے دھواں ہی دھواں ہے۔ اس
نے زور سے پھونک ماری۔ دھوئیں کی کمزور
لکیریں پیچھے ہٹیں پھر ہوا میں تحلیل ہو گئیں۔ اُس
نے ایک کش اور لیا۔ سگریٹ کا دوسرا سرا انگارہ
ہو گیا۔ سگریٹ پیتا ہوا وہ آگے بڑھا۔ ایک لین
میں بہت سارے جوتے چپل والے بیٹھے تھے۔
اس نے دیکھا اچھے بھلے جوتے تھے۔ چلو دیکھیں
یوں ہی۔ ایک جگہ رک کر اس نے سامنے پڑے
ہوئے جوتوں پر نظر دوڑائی۔ ایک جوڑے پر
اس کی نگاہ ٹک گئی۔ کیا عمدہ جوڑا ہے۔ پُرانے
ہیں؟ نہیں تو کیا نئے اس فٹ پاتھ پر ملیں گے
اس نے جوتے اُٹھا کر اُلٹ پلٹ کر دیکھا ہیں
تو پُرانے ہی۔ لیکن لگتا نہیں ہے کہ پرانے ہیں۔
جوتا ہر طرف سے بالکل ٹھیک ٹھاک تھا موڑ
کر مروڑ کر دیکھا۔ بالکل ٹھیک ہے۔ سب
طرح سے جب اطمینان ہو گیا تو اس نے دُکاندار
سے پوچھا۔

"یہ جوتا کتنے کا ہے بھائی...؟"

غزلیں

کیوں پڑے رہتے زمیں پر نقشِ پا ہم بھی نہ تھے
سب مسافر تھے اگر تو راستا ہم بھی نہ تھے

سنگساری دیکھنے اِک بھیڑ اکٹھا تھی مگر
اُس پہ کیا پتھر اُٹھاتے آئینا ہم بھی نہ تھے

دیکھ کر کارِ جہانِ آرزو جینا پڑا
ورنہ پہلے زندگی کے ہمنوا ہم بھی نہ تھے

بے سبب ترکِ تعلق میں گزاری زندگی
وہ اگر روٹھا نہ تھا اس سے خفا ہم بھی نہ تھے

کچھ دنوں سے ہم بھی اے افسرؔ نظر انداز ہیں
ایسا لگتا ہے کہ اس کا مدّعا ہم بھی نہ تھے

خورشید افسر بسوانی

بسواں، سیتاپور ۲۶۱۲۰۱ (یو.پی)

احترام اسلام

کرب کی آکاش گنگا پار کرتی ہے غزل
کلپناؤں کے افق پر تب ابھرتی ہے غزل

آپ اتنا تلملا اٹھتے ہیں آخر کس لیے
آپ کی تصویر ہی تو پیش کرتی ہے غزل

جام و پیمانہ لیے پھرتی رہی ہوگی کبھی
اب تو ہاتھوں میں لیے درپن گزرتی ہے غزل

ہاتھ میں مہندی رچاتی ہے نہ کاجل آنکھ میں
مانگ میں افشاں نہیں اب دھول بھرتی ہے غزل

شان دیکھو وہ بھی سینے سے لگاتا ہے اسے
احترامؔ اسلام جس پر وار کرتی ہے غزل

۵۴۷، اتر سوئیا، الہ آباد ۲۱۱۰۰۳ (یو.پی)

نہ وہ شعور کی لو ہے نہ وہ نظر کا چراغ
بجھی حیات کی مانند ہے ہنر کا چراغ

اندھیری رات کا دل چیرتا ہوا کوئی
چلا ہے لے کے ہتھیلی پہ اپنے سر کا چراغ

میں اپنے حرفِ ملامت کا خود شکار ہوا
کہ گھر میں آگ لگی جس سے وہ تھا گھر کا چراغ

اک آنے والے کا ہر پل ہے انتظار اسے
ہوا کی زد پہ فروزاں رہے گا در کا چراغ

دعا خود اپنی جگہ آفتاب تھی اے نازؔ
خدا نے اس کو دکھایا نہیں اثر کا چراغ

نازؔ قادری

مہدی حسن روڈ، مظفر پور ۸۴۲۰۰۳ (بہار)

عبدالقوی دسنوی

کچھ حیات مولانا ابوالکلام آزاد سے متعلق

مولانا ابوالکلام آزاد، قریب ترین زمانے کے اُردو کے شاید تنہا مصنف ہیں جن کی زندگی سے متعلق بعض تاریخوں اور واقعات کے بارے میں بڑی اُلجھنیں پیدا ہو گئی ہیں، بعض اُلجھنیں تو خود ان کی تحریروں کی پیدا کردہ ہیں اور بعض دوسروں کے فیصلوں کی وجہ سے در آئی ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ مولانا آزاد سے متعلق دلچسپی رکھنے والے اکثر حضرات دوسروں کی لکھی ہوئی غیر معتبر تحریروں کو بنیاد بنا کر مولانا آزاد کی حیات سے متعلق اپنے مقالات قلمبند کرتے ہیں۔ اور ستم یہ کہ اپنی دریافتوں کے صحیح ہونے پر اصرار ہی نہیں کرتے بلکہ دوسروں کو اپنی غلط بنیادوں پر غلط ثابت کرنے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اپنی محدود معلومات کو لامحدود متصور کرتے ہیں۔ اور اپنی بات پر اڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور دوسروں سے متعلق اپنی بے بنیاد تضحیک آمیز تحریروں سے خوش ہوتے ہیں۔ اور اپنی کج روی اور کج کلاہی پر ناز کرتے ہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ وہ یا تو تحقیق کے اخلاقیات جانتے ہوئے بھی ان پر عمل کرنا نہیں چاہتے یا انھیں معلوم نہیں کہ تحقیق کی سرحدیں سند کی حدود میں کب داخل ہوتی ہیں اور دوسروں کی تحریروں کو غلط ثابت کرنے کے لیے کس طرح کی سچائیاں پیش کرنی پڑتی ہیں اور اس کے لیے کیسا اسلوب مناسب ہے۔

دراصل تحقیق مسلسل تجسس و تلاش، چھان بین اور صبر و ضبط کے ساتھ سچائی کی تلاش کا تقاضہ کرتی ہے۔ کاٹا اور لے دوڑے والی بات اہلِ تحقیق کے لیے مناسب نہیں ہے۔ غلطیوں کی نشاندہی کرنا بُری بات نہیں ہے اس لیے کہ تحقیق کے میدان میں لغزشوں کے امکانات قدم قدم پر پیدا ہوتے ہیں۔ بسا اوقات خود اس شخص کی یادداشت یا تحریریں دھوکا دے دیتی ہیں جس کے بارے میں تحقیق کی جا رہی ہوتی ہے اور کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ اس کی تحریر صحیح ہوتی ہے لیکن اس سے متعلق فراہم مواد اسے غلط ثابت کر دیتا ہے۔ خود مجھے اس کا تجربہ اس وقت ہوا جب میں مولانا سید سلیمان ندوی سے متعلق کام کر رہا تھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی کی ایک تحریر مخزنِ لاہور سالگرہ مارچ ۱۹۲۹ء میں "میری اور مخزن کی تاریخ" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی جس میں انھوں نے لکھا تھا:

"یہ (مخزنِ لاہور) پہلا رسالہ تھا جو میری علمی و ادبی ہوش و تمیز کے عہد میں نکلا! اس کو دیکھ دیکھ کر میری طبیعت نے بھی جولانی دکھائی اور اس روش پر بے اختیارانہ قدم پڑنے لگے۔ "وقت" کے عنوان سے عمر میں پہلا مضمون لکھا جس نے مخزن کے صفحات میں جگہ پائی۔"

(یادگارِ سلیمان مرتبہ عبدالقوی دسنوی، ص ۱۵۱)

میں نے جب مخزن کی جلدوں میں مولانا سید سلیمان ندوی کی تحریریں تلاش کیں تو معلوم ہوا کہ مضمون کا عنوان "وقت" نہیں "آخر وقت" ہے جو دسمبر ۱۹۰۲ء کے مخزن میں شائع ہوا تھا، ایک انکشاف یہ بھی ہوا کہ خود مولانا کو یہ خیال نہیں رہا کہ یہ ان کا پہلا مضمون نہیں تھا اس سے پہلے ان کا ایک مضمون "خاتونوں کی تعلیم" دو قسطوں میں ۲۱ر جون ۱۹۰۲ اور ۵ر جولائی ۱۹۰۲ء کے الپنچ پٹنہ میں شائع ہو چکا تھا، لیکن دلچسپ انکشاف اس وقت ہوا جب مولانا سید سلیمان ندوی کے عزیز ساتھی مولوی سید نجم الہدٰے ندوی سے معلوم ہوا کہ "آخر وقت" مولانا کا پہلا مضمون ہی ہے لیکن ماہنامہ ہونے کی وجہ سے مخزن میں تاخیر سے شائع ہوا۔ لیجیے تحقیق کیا فیصلہ سناتی ہے اور سچائی کیا ہے۔

تحقیق کے سلسلے میں ایک اور واقعہ کی طرف میں آپ کو متوجہ کرنا چاہوں گا۔ ۱۹۸۷ء میں جب میری مختصر کتاب "ابوالکلام آزاد" ساہتیہ اکادمی سے شائع ہوئی تو برادرم عبداللطیف اعظمی صاحب نے اس کتاب پر ایک تفصیلی تبصرہ ماہنامہ آج کل دہلی اکتوبر ۱۹۸۷ء میں قلمبند کیا اور اس کتاب کی بہت سی غلطیاں اور خامیاں نکالنے کی بے مقصد کوشش کی۔ میں اس تبصرے کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا اس لیے کہ تحقیق کٹھ حجتی کا نام نہیں ہے۔ صرف ایک اعتراض کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہوں گا۔ اعظمی صاحب نے تحریر کیا ہے:

"مولانا لکھتے ہیں: "۱۹۰۴ء میں ایسے حالات پیش آئے کہ میں عراق چلا گیا۔۔۔ وہاں

پوسٹ گریجویٹ ڈپارٹمنٹ آف اردو، سیفیہ کالج، بھوپال ۴۶۲۰۰۱ (ایم پی)

سے واپس آیا تو بمبئی میں مولانا شبلی مرحوم سے ملاقات ہوئی۔ یہ پہلی ملاقات تھی۔" راقم الحروف کے نزدیک مولانا کی واپسی ۱۹۰۵ء میں ہوئی تھی۔"

(ماہنامہ آج کل، اکتوبر ۱۹۸۷ء ص ۱۷)

عرض ہے کہ اول تو یہ کتاب "آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی" ______ مولانا آزاد کی لکھی ہوئی نہیں ہے اس کتاب کے متعلق مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی لکھتے ہیں:

" میں نے مولانا کو اکسانا شروع کیا کہ "تذکرہ" کی دوسری جلد لکھا دیں۔ ہفتوں "میرے بھائی" ______ "میرے بھائی"! کہہ کر ٹالتے رہے مگر میں بھلا پیچھا چھوڑنے والا تھا۔ تقاضا جاری رکھا۔ آخر راضی ہوگئے اور یہ کتاب لکھانا شروع کردی۔

بولتے جاتے تھے اور میں پنسل سے گھسیٹتا جاتا تھا۔ رات کو مسودہ صاف کرلیتا تھا۔ مولانا نے یہ کتاب اس طرح لکھوادی کہ سامنے نہ کوئی نوٹ ہوتا تھا۔ اور نہ کبھی مجھ سے پوچھا "کل کیا لکھوایا تھا"؟ دوسرے دن بیٹھے نہیں کہ بولنے کا رشتہ فوراً مل گیا۔"

(آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی: بہ روایت ______ ملیح آبادی، ص ۱۸۔ ۱۹)

یہ کتاب جس طرح لکھائی گئی ہے، محققین کے نزدیک معتبر نہیں ہوسکتی۔ اب اقتباس کو ملاحظہ کیجیے جس کے سہارے عبداللطیف اعظمی صاحب عراق سے مولانا آزاد کی واپسی ۱۹۰۵ء قرار دے رہے ہیں:

" ۱۹۰۴ء میں ایسے حالات پیش آئے کہ میں عراق چلا گیا اور پھر کوئی نمبر لسان الصدق کا نہیں نکلا۔"

(آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی: بہ روایت ______ ملیح آبادی، ص ۳۱)

لسان الصدق کے شماروں کی اشاعت حسب ذیل ماہ و سنہ میں ہوئی ہے:

جلد ۱ شمارہ ۱ ۲۰ نومبر ۱۹۰۳ء
جلد ۱ نمبر ۲، ۲۰ دسمبر ۱۹۰۳ء ___ جلد ۲، نمبر ۱، ۲۰ جنوری ۱۹۰۴ء ___ جلد ۲ نمبر ۲ ۲۰ فروری ۱۹۰۴ء ___ جلد ۲ نمبر ۳، ۲۰ مارچ ۱۹۰۴ء ___ جلد ۲ نمبر ۴، ۲۰ اپریل ۱۹۰۴ء ___ جلد ۲ نمبر ۵، مئی ۱۹۰۴ء
جلد ۲ نمبر ۶، ۷، جون جولائی ۱۹۰۴ء ___
جلد نمبر ۸، ۹، اگست ستمبر ۱۹۰۴ء ___
جلد ۳ نمبر ۱، ۲، اپریل مئی ۱۹۰۵ء

کیا لسان الصدق کے تمام شماروں کی اشاعت کے ماہ و سنہ دیکھنے اور مطالعہ کے بعد یہ محسوس نہیں ہوتا کہ وہ اس زمانے میں کسی سفر پہ بیرونِ ہند روانہ نہیں ہوئے۔ ممکن ہے بعض حضرات کے ذہن میں یہ بات ہو کہ اگست ستمبر ۱۹۰۴ء کے شمارے کے بعد اپریل مئی ۱۹۰۵ء میں لسان الصدق کے شمارے ۱، ۲ (جلد ۳) شائع ہوئے۔ اس تاخیر کی وجہ خود مولانا آزاد نے آخری شماروں کی ابتدا میں "تبادلہ سنین اور لسان الصدق" کے تحت اس طرح بتائی ہے:

" صبح ہوئی، شام ہوئی۔ دن گیا، رات آئی، کل شنبہ تھا، آج یکشنبہ ہے کل اکتیسویں تھی آج پہلی ہے، اس طرح تسبیح کے دانے اپنے آخری مرکز تک پہنچ گئے اور اس سلسلے کا ایک دور جس کی ابتدا کسی کو معلوم نہیں ختم ہوا ستمبر و اکتوبر، نومبر و دسمبر، آج جنوری کی پہلی تاریخ ہے اور نیا دور نئے سرے سے شروع ہوتا ہے۔

(لسان الصدق مرتبہ عبدالقوی دسنوی ص ۲۲۷)

◀

" اکتیسویں دسمبر کی رات اور پہلی جنوری کی صبح بھی کس قدر عجیب اور حیرت انگیز تھی! جبکہ ۱۹۰۴ء کے وہ نظر فریب تماشے جن کے دیکھنے سے ابھی ہماری نگاہیں سیر نہیں ہوئی تھیں۔ یکایک نظروں سے غائب ہوگئے اور ایک ناگہانی ڈراپ سین نے آنے والے تماشوں کا منتظر بنا دیا۔ ۱۹۰۵ء کی آمد آمد ہے اور نہایت بے چینی سے انتظار کی آنکھیں اٹھی ہوئی ہیں کہ ۱۹۰۵ء کے اسٹیج پر کیسے کیسے ایکٹر آتے ہیں؟ اپنے تماشوں سے دیکھنے والوں کو بے چین کرکے جاتے ہیں؟ یا مسرت و شادمانی میں محو کرکے؟"

(لسان الصدق، مرتبہ عبدالقوی دسنوی ص ۲۲۸)

▶

" لسان الصدق ۱۹۰۳ء میں شائع ہوا تھا اور جنوری ۱۹۰۴ء سے اس کی دوسری جلد شروع ہوئی تھی۔ نو نمبروں پر یہ جلد ختم ہو گئی اور آج جنوری ۱۹۰۵ء سے یہ تیسری جلد میں قدم رکھتا ہے۔"

(لسان الصدق مرتبہ عبدالقوی دسنوی ص ۲۲۸)

محترمی عبداللطیف اعظمی سے میری گزارش ہے کہ وہ اپنے اس فیصلے کو مستند ماخذوں کی مدد سے صحیح ثابت فرمادیں کہ مولانا آزاد نے ۱۹۰۴ء میں عراق کا سفر کیا اور ۱۹۰۵ء میں واپس آئے۔ اگر وہ تاریخ اور ماہ بھی درج فرمادیں تو مولانا آزاد کی حیات سے دلچسپی رکھنے والوں کو تحقیقی کام کرنے میں آسانی پیدا ہوجائے گی۔

قارئین کو یہ بھی بات ذہن میں رکھنی چاہیے
لانا آزاد نے ۱۹۰۴ء کے سفر کا تذکرہ
ونس فریڈم میں کہیں نہیں کیا ہے۔ البتہ
۱ء کے بیرون ممالک میں سفر کا ذکر اس
ب میں اس طرح ملتا ہے:
"۱۹۰۸ء میں جب میں قاہرہ گیا تو
ہر کا نظامِ تعلیم ۔ ۔ ۔ ۔
"مصر سے میں ترکی اور فرانس گیا۔ ارادہ تھا
گے لندن تک جاؤں۔ یہ میں نہ کر سکا اس
ہ مجھے خبر ملی کہ میرے والد بیمار ہیں۔ میں
ں سے ہندوستان واپس آگیا۔"
(ہماری آزادی: متر "محمد مجیب" ص ۱۹)
معلوم نہیں اسی صفحہ ۱۹ پر یہ کس طرح تحریر
:
"مصر میں مصطفیٰ کمال پاشا کے پیروؤں
کچھ تعلقات پیدا ہوئے۔ میں ینگ ٹرکس
روپ سے بھی ملا جس نے قاہرہ میں اپنا
قائم کیا تھا۔ ۔ ۔"
۱۹۰ء میں مصر سے مصطفیٰ کمال پاشا کا کیا تعلق؟
انا نے سہواً "مصطفیٰ کامل" کی جگہ "مصطفیٰ
ل" لکھا دیا ہے۔ یا ہمایوں کبیر صاحب سے
لی سرزد ہوئی ہے۔
اب میں مولانا آزاد کی تصنیف تذکرہ کی
ف متوجہ کرانا چاہتا ہوں جس میں مولانا آزاد
اپنی والدہ کے متعلق تحریر کیا ہے:
"میری والدہ حضرت شیخ محمد ظاہر وتری
ی مدینہ منورہ کی بھانجی تھیں۔"
(تذکرہ: ابوالکلام آزاد، ص ۲۵)
ن انڈیا ونس فریڈم میں یہ درج ہے:
"اس وقت میرے والد قریب پچیس
ل کے تھے وہ مکہ معظمہ گئے اور وہیں سکونت

اختیار کرلی۔ انھوں نے اپنے لیے مکان بنوایا
اور شیخ محمد ظاہر وتری کی لڑکی سے عقد کرلیا۔
(ہماری آزادی: مترجمہ، محمد مجیب ص ۹)
ایسی صورت میں صحیح کیا ہے یہ کہنا مشکل
ہے۔ البتہ میرے نزدیک تذکرہ کی بات زیادہ
درست اس وجہ سے ہے کہ وہ کتاب رانچی کی
نظربندی کے زمانے کی ہے اور خود آزاد کی
لکھی ہوئی ہے۔

مولانا آزاد کی پیدائش کے سلسلے میں
تذکرہ میں تحریر ہے:
"یہ غریب الدیار عہد و ناآشنائے عصر،
بیگانۂ خویش، و نمک پروردۂ ریش، معمورۂ
تمنا و خرابۂ حسرت کہ موسوم بہ احمد و مدعو بابی
الکلام ہے ۱۸۸۸ء مطابق ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ میں
ہستی عدم سے اس عدم ہستی نما میں وارد ہوا اور
تہمت حیات سے متہم۔"
"والد مرحوم نے تاریخی نام فیروز بخت
رکھا تھا اور مصرعہ ذیل سے ہجری سال کا استخراج
کیا تھا۔
جواں بخت و جواں طالع، جواں باد!"
(تذکرہ: ابوالکلام آزاد، ص ۳۱۰)
میرے نزدیک یہی تاریخ ولادت
درست ہے۔ انڈیا ونس فریڈم میں بھی سنہ
ولادت ۱۸۸۸ء درج ہے:
"میں مکہ معظمہ میں ۱۸۸۸ء میں پیدا
ہوا۔"
(ہماری آزادی مترجمہ، محمد مجیب ص ۱۰)
لیکن اس کے ساتھ ایک نئی بات یہ بھی ہے کہ:
"دو سال بعد (۱۸۹۰ء میں) میرے والد
پورے خاندان کو لے کر کلکتہ آ گئے۔"

اس آخری جملے نے ایک نیا جھگڑا یہی کھڑا
نہیں کردیا کہ مولانا آزاد کی نہ تو ابتدائی تعلیم
مکہ معظمہ میں ہوئی نہ ہی عربی زبان ان کی تربیت
کا ذریعہ بنی۔ اس لیے کہ کلکتہ پہنچنے کے ایک
سال بعد جبکہ مولانا آزاد کی عمر تین سال کی ہوگی
ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ یہ کہنا بھی اب
دشوار ہوجاتا ہے کہ عربی ان کی ابتدائی بولنے
کی زبان بنی ہوگی۔

جلاوطنی کا حکم:

تذکرہ میں مولانا آزاد لکھتے ہیں:
"۲۳ مارچ ۱۹۱۶ء کو گورنمنٹ بنگال
نے ڈیفنس ایکٹ کی دفعہ ۳ کی بنا پر حکم دیا کہ
ایک ہفتے کے اندر حدود بنگال سے باہر چلا
جاؤں۔ ۔ ۔"
"۳۰ مارچ کو کلکتہ سے کہ سالہا سال
کے متصل قیام کی بنا پر بے جا نہیں اگر وطن
کہوں، نکلا اور رانچی پہنچا۔"
(تذکرہ: ابوالکلام آزاد ص ۳۳۲)
لیکن اس کتاب کے مقدمے میں فضل الدین احمد
صاحب نے ۲۳ مارچ کی جگہ اپریل تحریر
کرکے اُلجھن پیدا کردی ہے۔ وہ رقمطراز ہیں:
"اپریل ۱۹۱۶ء میں جب گورنمنٹ
بنگال نے بنگال سے باہر چلے جانے کا آرڈر
جاری کیا اور وہ رانچی چلے گئے۔ ۔ ۔"
(تذکرہ، ابوالکلام آزاد، ص ۱۷)
اب ملاحظہ کیجیے ہفتہ وار پیغام کا پہلا
شمارہ ۲۳ ستمبر ۱۹۲۱ء، مولانا آزاد اپنی نظربندی
سے رہائی کے متعلق لکھتے ہیں:
"ا رجنوری ۱۹۲۰ء کو جب مجھے چار
سال کے بعد نظربندی سے رہا کیا گیا۔" (ص ۲)

"جنوری ۱۹۲۰ء میں جب میں نظربندی کے گزشتہ قید و بند سے نکلا"

(ص ۲)

یہاں یہ بات بھی غور کرنے کی ہے کہ مولانا نے نظربندی کا زمانہ "چار سال" قرار دیا ہے۔ حالانکہ یہ زمانہ ساڑھے تین سال سے کسی طرح زیادہ نہیں ہے۔

انڈیا ونس فریڈم میں رانچی جانے کی تاریخ درج نہیں ہے لیکن نظربندی اور نظربندی سے رہائی کی تاریخ اس طرح درج ہے:

"... چھ مہینے بعد مجھے رانچی میں نظربند کر دیا گیا اور میں ۳۱ دسمبر ۱۹۱۹ء تک یہاں حراست میں رہا۔ یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو میں دوسرے نظربندوں اور قیدیوں کے ساتھ شاہ انگلستان کے اعلان کے ماتحت رہا کر دیا گیا۔"

(ہماری آزادی، ص ۲۳)

مولانا آزاد رانچی ۳۰ مارچ ۱۹۱۶ء کو پہنچے اور ۸ جولائی ۱۹۱۶ء کو نظربندی کا حکم ہوا۔ یہ مدت سوا تین ماہ سے زیادہ نہیں۔ معلوم نہیں اس کتاب میں چھ ماہ کی مدت کس طرح بتائی گئی ہے۔

ترجمان القرآن جلد اول کے دیباچے میں مولانا آزاد تحریر کرتے ہیں:

"۳۰ مارچ ۱۹۱۶ء کو جب میں کلکتہ سے روانہ ہوا...."

(ص ۱۹)

"لیکن ۸ جولائی ۱۹۱۶ء کو یکایک حکومت ہند نے میری نظربندی کے احکام جاری کر دیے اور اس طرح اس..." (ص ۱۹)

"۲۷ دسمبر ۱۹۱۹ء کو حکومت نے مجھے رہا کر دیا۔"

(ص ۲۲)

غبار خاطر میں مولانا آزاد رقمطراز ہیں:

"۷ اپریل ۱۹۱۶ء کو حکومت بنگال نے ڈیفنس آرڈیننس کے ماتحت مجھے بنگال سے خارج کر دیا تھا میں رانچی گیا اور شہر سے باہر مورابادی میں مقیم ہو گیا پھر کچھ دنوں بعد مرکزی حکومت نے وہیں قید کر دیا اور اس کا سلسلہ ۱۹۲۰ء تک جاری رہا۔"

(غبار خاطر: ابوالکلام آزاد، ص ۲۵ حاشیہ)

یہاں مولانا آزاد نے ۲۳ مارچ ۱۹۱۶ء کے بجائے ۷ اپریل جلاوطنی کے حکم کی تاریخ بتائی ہے اور ستم یہ کیا ہے کہ "نظربندی" کو "قید" کہا ہے۔ غبار خاطر ہی کے صفحہ ۲۳۶ پر لکھتے ہیں:

"۱۹۱۶ء میں جب پہلی مرتبہ گرفتاری پیش آئی تھی۔"

مولانا نے یہاں "نظربندی" کو گرفتاری کے نام سے یاد کیا ہے۔

الہلال کا پہلا شمارہ:

انڈیا ونس فریڈم میں درج ہے:

"جون ۱۹۱۲ء میں الہلال کا پہلا شمارہ نکلا۔"

(ہماری آزادی مترجمہ: محمد مجیب ص ۲۱)

حالانکہ الہلال کا پہلا شمارہ ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء کو منظر عام پر آیا۔ آگے تحریر ہے:

"... جلد ہی حکومت نے ضمانت ضبط کر لی اور دس ہزار کی مزید ضمانت کا مطالبہ کیا۔ یہ بھی جلد ضبط ہو گئی۔ اس دوران میں ۱۹۱۴ء کی جنگ چھڑ گئی تھی۔ ۱۹۱۵ء میں الہلال پریس ضبط کر لیا گیا۔ پانچ مہینے بعد میں نے البلاغ کے نام سے ایک نیا پریس قائم کیا اور اسی نام کا اخبار جاری کر دیا۔"

(ہماری آزادی، مترجمہ محمد مجیب۔ ص ۲)

حالانکہ ۱۶ نومبر ۱۹۱۴ء کو الہلال کی ضمانت ضبط کر لی گئی تھی اور ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو آخری شمارہ نکل کر الہلال بند ہو گیا۔

انڈیا ونس فریڈم میں درج ہے:

"۱۹۴۴ء کے شروع میں گھر سے اطلاع ملی کہ وہ (زلیخا بیگم) پھر بہت بیمار ہیں۔"

حالانکہ ۹ اپریل ۱۹۴۳ء کو ہی زلیخا بیگم وفات پا گئی ہیں۔

دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ انڈیا ونس فریڈم کا ترجمہ کرتے وقت بھی پروفیسر محمد مجیب صاحب مرحوم سے بعض غلطیاں سرزد ہو گئی ہیں

۱۔ "مگر سلطان جہاں بیگم نے بھوپال میں انہیں (مولانا منور الدین) کو روک لیا۔"

(ہماری آزادی، ص ۹

اگرچہ انڈیا ونس فریڈم کے ص ۱ پر نواب سکندر جہاں بیگم درج ہے جو صحیح ہے۔

۲۔ "۱۰ جنوری کو بمبئی میں جواہر لال نے ایک پریس کانفرنس بلائی۔"

(ہماری آزادی، ص ۲۱۳

لیکن انڈیا ونس فریڈم ص ۱۵۵ پر ۱۰ جولائی تحریر ہے۔

ایسی صورت میں جب کہ مولانا آزاد کے بیانات میں یکسانیت نہیں ہے۔ دوسروں کی

ریروں میں بہت سی تاریخیں اور واقعات
ج نہیں ہیں اور غیر معتبر تحریروں کی بھرمار
. مولانا آزاد پر تحقیقی کام کرنے والوں کو
ت احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ نہ اُنھیں
ں غلطیوں کو دوسروں کے سر تھوپنے کی
شش کرنی چاہیے نہ ہی کام کرنے والوں
سامنے غیر فتے وارانہ بیانات سے مشکلات
ا کرنی چاہیے بلکہ صرف سچائی کی تلاش کو
ار بنانا چاہیے۔ اور تحقیقی کام کرنے والوں کے
معاون ثابت ہونا چاہیے تاکہ مولانا آزاد
مکمل اور مستند سوانح حیات مرتب کرنے
ں کامیابی حاصل ہو۔

ابیات

یادگار سلیمان' مرتبہ عبدالقوی دسنوی' پہلی بار دسمبر ۱۹۸۴ء : بہار اُردو اکادمی۔ پٹنہ۔

آج کل' دہلی ماہنامہ : مدیر راج نرائن راز۔ اکتوبر ۱۹۸۷ء پبلیکیشنز ڈویژن نئی دہلی۔

آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی (بہ روایت ملیح آبادی) پہلی بار اپریل ۱۹۵۸ء حالی پبلشنگ ہاؤس' دہلی۔

ماہنامہ لسان الصدق کلکتہ' مرتبہ عبدالقوی دسنوی' پہلی بار اکتوبر ۱۹۸۸ء مکتبہ جامعہ نئی دہلی۔

ہماری آزادی : ابوالکلام آزاد: مترجمہ محمد مجیب' تیسری بار' ۱۹۷۶ء اورینٹ لونگ مین لیمٹڈ۔

تذکرہ : ابوالکلام آزاد' مرتبہ مالک رام' دوسری بار ۱۹۸۱ء' ساہتیہ اکادمی نئی دہلی

۷۔ ترجمان القرآن : ابوالکلام آزاد' جلد اوّل' تیسری بار ۱۹۸۰ء' ساہتیہ اکادمی' نئی دہلی۔

۸۔ غبار خاطر : ابوالکلام آزاد' مرتبہ مالک رام' پہلی بار ۱۹۶۷ء ساہتیہ اکادمی' نئی دہلی۔

۹۔ ابوالکلام آزاد : عبدالقوی دسنوی' پہلی بار ۱۹۸۷ء' ساہتیہ اکادمی' نئی دہلی۔

۱۰۔ انڈیا ونس فریڈم (انگریزی) پہلی بار ۱۹۵۹ء اورینٹ لونگ مینس پرائیوٹ لمیٹڈ۔

۱۱۔ ہفتہ وار پیغام زیر نگرانی مولانا ابوالکلام ایڈیٹر عبدالرزاق ملیح آبادی' جلد ۱ نمبر ۱' ۲۳ ستمبر ۱۹۲۱ء ۴۵۔ رپن روڈ کلکتہ۔

نظمیں

تحفّظ

وہ جو اندر سے نہیں کُھلتا
وہ باہر کیا کھلے گا؟
لوگ تالوں کی طرح اپنی حفاظت میں لگے ہیں
اور وہ دریا
جو ان سب کو کنارے چھوڑ کر
اب آتے دن خود میں سمٹتا جا رہا ہے
ریت پر چھوڑے ہوئے
اپنے ہر اک نقشِ قدم میں
آدمی کے خون کی بُو سونگھ کر ترسا رہا ہے

سر بریدہ خشک پیڑوں کی قطاریں
بھاگتے قدموں کا پیچھا کر رہی ہیں
گولیاں، بارود، بندوقیں، سلاخیں
جیل، چیخیں
جب سے لوہے کو زباں حاصل ہوئی ہے
سوچنے والوں کے مستک چھن گئے ہیں

گو یہ روٹی آج بھی زندہ مقدّس چیز ہے
لیکن عجب نشّے کا عالم ہے کہ جس میں
لوگ روٹی کی جگہ اپنی وراثت چاٹ جانے پہ تلے ہیں
لوگ تالوں کی طرح اپنی حفاظت میں لگے ہیں

طلعت عرفانی

۴۱/۶۷، مور سرائے، ریلوے کالونی، دہلی ۱۱۰۰۰۶

انتظار

ابھی سویرا
ہوا نہیں ہے
نہ جانے کتنی ہے رات باقی
ہوا سے زنجیر ہل گئی ہے
نہیں ہے در پر
کوئی نہیں ہے

تثلیث

اے غمِ دوراں خدارا سچ بتا
چند مُردہ آرزوؤں کے سوا
اور ہے انسان کے سینے میں کیا

پس منظر

ماضی کے اوراق نہ پلٹو
اِن میں تم کو
چند حسیں لمحات ملیں گے
کچھ یادیں انمول ملیں گی
بے منزل کچھ راہیں ہوں گی
جگ مگ جلوہ گاہیں ہوں گی
خواب مگر اک خواب رہے گا
خواب کا پیچھا لاحاصل ہے

اسلم دربھنگوی

ریلوے کوارٹرس، سی/۵۳، ۷، چاند ماری کالونی، آسنسول ۲

شانتی رنجن بھٹاچاریہ

کچھ مولانا ابوالکلام آزاد کے سلسلے میں

(سرکاری خفیہ رپورٹوں سے)

ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت کے دور میں حکومتِ بنگال کے محکمۂ سیاست کی طرف سے ہر سال بنگال سے شائع شدہ اخبارات و رسائل کے سلسلے میں ایک خفیہ رپورٹ (CONFIDENTIAL REPORT) شائع ہوتی تھی۔ یہ رپورٹیں محض اعلیٰ سرکاری افسران کے استعمال ہی کے لیے ہوتی تھیں اور ان رپورٹوں کا شمار نہایت اہم سیاسی دستاویزوں میں ہوتا تھا۔ اب بھی اس طرح کی چند رپورٹیں حکومت مغربی بنگال کے محافظ خانے (STATE ARCHIVES) میں محفوظ ہیں۔ میں نے کئی سالانہ رپورٹیں دیکھی ہیں۔ ۱۹۱۳ء، ۱۹۱۴ء اور ۱۹۱۵ء کی رپورٹوں میں مولانا آزاد کے سلسلے میں کئی باتیں پائی جاتی ہیں، جو ہمارے لیے نہایت اہم ہیں۔ ان رپورٹوں سے یہ بات بھی کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ انگریزوں کی نظر میں مولانا آزاد کتنے "خطرناک" تھے چونکہ ان رپورٹوں میں مولانا آزاد کو "NOTORIOUS AGITATOR" (بدنام شورشی) کہا گیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہفت روزہ "الہلال" اور "البلاغ" اور چند دیگر اخبارات کے سلسلے میں بھی کئی باتوں کا علم ہوتا ہے۔ ایسی باتیں جن سے اب تک ہم آگاہ نہیں تھے۔ یہ رپورٹیں ہر سال "ANNUAL REPORT ON INDIAN NEWS PAPERS AND PERIODICALS PUBLISHED IN BENGAL DURING ____" کے عنوان سے شائع ہوتی رہی ہیں۔ لہٰذا ان رپورٹوں میں جو کچھ مولانا آزاد کے سلسلے میں درج ہے اس کا ترجمہ پیش کرتا ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا آزاد کے سلسلے میں تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے یہ رپورٹیں انمول ہیں۔ میں حکومت مغربی بنگال کا شکر گزار ہوں کہ مجھے ان سالانہ رپورٹوں کا مطالعہ کرنے، نوٹ لینے اور ضرورت کے مطابق ان کے مواد کا استعمال کرنے کی اجازت دی گئی۔

۱۹۱۳ء کی سالانہ رپورٹ سے

ہلال پریس کلکتہ : ____ انڈین پریس ایکٹ ۱۹۱۰ء کے نافذ ہونے کے بعد پریس اینڈ رجسٹریشن آف بکس ایکٹ ۱۸۶۷ء کے مطابق، اگست ۱۹۱۲ء میں اخبار "الہلال" نکالنے کے لیے ڈکلریشن دیا گیا۔ چیف پریسیڈنسی مجسٹریٹ کلکتہ نے دو ہزار روپیہ زرِ ضمانت سے مستثنیٰ قرار دیا تھا۔ لیکن آگے چل کر اس اخبار کا عام لہجہ اتنا سخت، اتنا زیادہ نامعقول اور قابلِ اعتراض ہو گیا کہ حکومت نے انڈین پریس ایکٹ ۱۹۱۰ء، دفعہ ۳(۱) کے تحت دیے گئے اختیارات کو بروئے کار لاتے ہوئے مجسٹریٹ کو احکامات جاری کیے کہ محافظ پریس سے زرِ ضمانت طلب کیا جائے۔

الہلال

۹ اور ۱۶ اپریل ۱۹۱۳ء کے شماروں میں شاہِ یونان کے قتل کے سلسلے میں مذکورہ اخبار میں جو مضامین شائع ہوئے ان کے سلسلے میں اخبار کے پبلیشر مولانا ابوالکلام آزاد کو وارننگ دی گئی ہے۔ یہ وارننگ آئی۔ پی۔ کوڈ کی دفعہ ۱۵۳/اے، کے تحت دی گئی۔ وارننگ کی تاریخ ۲۴ مئی ۱۹۱۳ء ہے۔

الہلال

اُردو ہفت روزہ '۱۳ میکلارڈ اسٹریٹ' کلکتہ۔ ہلال پریس ۱/۷' میکلارڈ اسٹریٹ' کلکتہ۔ تعدادِ اشاعت ایک ہزار۔ ایڈیٹر مولانا ابوالکلام آزاد ولد مولانا خیرالدین ___ عمر ۲۷ سال' ڈکلریشن نمبر ۱۰.۱۱۔ تاریخ ۲۲ اگست ۱۹۱۲ء۔ کیفیت ___ اخبار کا لہجہ سخت حکومت مخالف ہے۔ ایکٹ نمبر ۱' ۱۹۱۰ء دفعہ ۸ (۲) کے تحت ۲۴ ستمبر ۱۹۱۳ء کو دو ہزار روپیہ زرِ ضمانت داخل کیا گیا ہے۔

۱۹۱۴ء کی رپورٹ سے

انگلستان اور ترکی کے درمیان جنگ سے قبل اس اخبار کے لہجے (مزاج) میں ہلکی سی نرمی پائی گئی تھی۔ بے شک لہجے میں اس سدھار اور نرمی کی وجہ، اس سے قبل مسجد کانپور کے سلسلے میں اس اخبار میں شائع شدہ اشتعال انگیز مضامین کے خلاف زرِ ضمانت کی طلبی رہی ہے۔ لیکن یہ اثر دیرپا نہیں رہا۔ اس نے اپنا یہ عقیدہ کہ "مذہب اسلام کے مطابق ایک مسلمان کو صرف اللہ کا وفادار ہونا ہے اور کسی کا نہیں" بہ ترک نہیں کیا ہے۔ جنگ چھڑ جانے کے

آنندا پلی پشت پور باپتیاری، کلکتہ ۷۰۰۰۹۲

بعد سے اس کے مضامین میں جرمنی کی طرف جھکاؤ اور اس کی طرفداری پائی جاتی ہے۔ جرمنوں کی "سکندرِ اعظم اور نپولین کی طرح بہادری" کی مدح سرائی اور قدردانی کے جذبات سے یہ مضامین پُر ہیں۔ اُس نے جرمنوں کی بے غرضی اور ایثار پیشگی کا اظہار بھی کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ "بے غرضی عصری تاریخ میں عزت و وقار کی نظر سے دیکھی جائے گی۔" جرمنی سے یہ ہمدردی اور ساتھ ہی جنگ کے سلسلے میں سرکاری خبروں پر اس کی بے اعتمادی اور برٹش فوج کی کامیابیوں کو اہمیت نہ دینا یا گھٹا کر دیکھنا' ان سب باتوں نے اس اخبار کے مضامین کو ایسا قابلِ اعتراض بنا دیا کہ اس کے زرِ ضمانت کو ضبط کر لینا ضروری ہو گیا۔ اور اسی کے نتیجے میں یہ اخبار بند ہو گیا۔

اخبار "الہلال" کے دو شمارے دفعہ ۴(۱) کے تحت ضبط کر لیے گئے اور ہلال پریس نے دو ہزار روپے کی جو ضمانت دی تھی وہ بھی ضبط کر لی گئی۔

۱۹۱۴ء میں آئی۔ پی۔ ایکٹ ۱۹۱۰ء کے تحت اخبار "الہلال" کے ۴ اور ۱۴ اکتوبر کے شمارے ضبط کر لیے گئے۔

کامریڈ

دہلی سے شائع ہونے والا اخبار —— آئی۔ پی۔ ایکٹ کی دفعہ ۴(۱) کے تحت حکومتِ ہند نے اس کی تمام کاپیاں ضبط کر لی ہیں۔ اخبار "الہلال" جو بند ہو چکا ہے اس کے مدیر ابوالکلام آزاد نے کلکتہ ہائی کورٹ میں ایک اپیل داخل کی تھی۔ مورخہ ۱۱ جنوری ۱۹۱۵ء کو ہائی کورٹ نے یہ کہہ کر درخواست کو خارج کر دیا کہ یہ اس عدالت کے دائرہ اختیار سے باہر ہے اور یہ کہ عرضی گزار کا اس اخبار سے کوئی تعلق نہیں ہے کہ وہ مذکورہ ایکٹ کے تحت اس سلسلے میں کوئی درخواست دے۔

الہلال

ہفت روزہ —— تعدادِ اشاعت چار ہزار۔

۱۹۱۵ء کی رپورٹ سے

ایک ہفتہ وار اخبار "البلاغ" کے نام سے نومبر سے شائع ہونے لگا ہے۔ اس میں مذہبی اور تاریخی مضامین جن میں اتحادِ اسلامی (PAN-ISLAMISM) کے رجحانات پائے جاتے ہیں شائع ہوتے ہیں۔

البلاغ

اردو ہفتہ روزہ '۴۵' رپن لین' البلاغ پریس، کلکتہ۔ سالانہ چندہ ۱۲ روپیہ۔ تعدادِ اشاعت ایک ہزار۔ مالک و مدیر مولانا ابوالکلام آزاد ولد خیر الدین مرحوم۔ عمر تقریباً ۳۳ سال وہ بدنام شورشی ہیں اور پنجاب اور ریاست متحدہ میں ان کا داخلہ بند ہے۔ وہ "الہلال" کے سابق مدیر ہیں۔ پرنٹر و پبلشر قطب الدین احمد ولد آفتاب الدین احمد مرحوم۔ ساکن ۳' مارٹر اسٹریٹ۔ عمر تقریباً تیس سال۔ اُنھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کے سیاسی خیالات کو اپنا لیا ہے' جن کے تحت وہ برسوں سے کام کرتے آئے ہیں۔ وہ پہلے ملٹری اکاؤنٹس آفس میں کلرک تھے اور پھر سابق اخبار "الہلال" کے مینیجر بھی رہے۔ ڈکلریشن نمبر ۱۲۰' مورخہ ۴ اکتوبر ۱۹۱۵ء۔ کیفیت —— پریس ایکٹ کی دفعہ ۳' نمبر ۱' ۱۹۱۰ء کے تحت ۲ ستمبر ۱۹۱۵ء کو دو ہزار روپیہ ضمانت دی گئی ہے۔ اخبار کا پہلا شمارہ ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء کو نکلا اور یہ اخبار مذہبی مضامین شائع کرتا ہے۔

اقدام

اردو روزنامہ۔ ۴/۲ کولنس اسٹریٹ کلکتہ۔ مقامِ اشاعت فائن آرٹ کاٹیج پریس تعدادِ اشاعت ایک ہزار۔ ایڈیٹر محی الدین احمد بی' اے۔ عمر ۲۵ سال۔ وطن کاسر (KASUR) پولیس اسٹیشن قرآن والا' پنجاب۔ پبلشر اور پرنٹر محمد نظام الدین احمد ولد ناصر الدین احمد مرحوم ساکن نمبر ۱/۱۵ رپن اسٹریٹ کلکتہ۔ عمر تقریباً ۴۲ برس۔ وہ عینک کے تاجر ہیں اور انھوں نے ۲۰ نومبر ۱۹۱۴ء کو ایک اخبار "رفاقت" کے نام سے جاری کیا تھا۔ اب اُسی کا نام بدل کر "اقدام" ہوا ہے۔ اب وہ بدنام شورشی ابوالکلام آزاد کا ساتھ دے رہے ہیں' جن کے سلسلے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اس اخبار کے قلمی معاون بھی ہیں اور اس کی پالیسی کے نگراں بھی۔ ڈکلریشن نمبر ۱۴۳' تاریخ ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء کیفیت کسی قسم کے زرِ ضمانت سے مستثنیٰ ہے۔ تاریخِ اجرا: ۷ دسمبر ۱۹۱۵ء۔

فرزانہ خان

بیساکھی

اچانک فون کی گھنٹی بجی . . .

"ہیلو ـــــ کیا میں ندھی سکسینہ سی. ڈی. پی. او سے بات کر سکتا ہوں؟"

"جی! میں ندھی بول رہی ہوں، آپ کون ہیں؟"

"میں نریندر شرما ایس. ڈی. ایم بول رہا ہوں، معاف کیجیے آپ جیسی ہستی سے ابھی تک میرا تعارف نہیں ہوا۔ آج کے اخبار میں عورت کی زندگی کا جو خاکہ آپ نے کھینچا ہے اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں؟"

ندھی بولی کہ وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر صرف کافی پینے کو تعارف نہیں مانتی، اسی لیے وہ زیادہ لوگوں سے متعارف ہونا نہیں چاہتی۔

دوسری طرف ایک زوردار قہقہہ سنائی دیا۔ "مان گئے بھئی آپ واقعی رائٹر ہیں۔ لیکن آپ سے ملے بغیر سکون نہیں ملے گا۔"

نریندر کے اصرار پر ندھی ملنے کے لیے راضی ہوگئی۔

ندھی کچھ ایسی خصوصیات کی مالک تھی جن کی وجہ سے لوگ اس کے بارے میں طرح طرح کی رائے قائم کر لیتے تھے۔ بات کرتے وقت ندھی بھول جاتی تھی کہ وہ کسی مرد یا عورت سے بات کر رہی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ اس کے ساتھی افسروں کی بیویاں اس کی بے باکی کو غلط رنگ دے دیتیں۔

کل رات وہ ایک سرکاری پارٹی میں گئی تھی، اور بات بات پر مسکرا رہی تھی ابھی پارٹی چل ہی رہی تھی کہ ضلع ایس. پی. نے موقع نکال کر اس سے کہا:

"کیا پارٹی کے بعد کچھ وقت دے سکتی ہیں؟"

ندھی نے بے رخی سے انکار کر دیا۔ لوگ جب بھی اسے غلط سمجھتے وہ ان سے ایک دم کنارہ کر لیتی اور لوگوں کی گندی ذہنیت اسے تکلیف پہنچاتی رہتی۔

آج نریندر کے فون نے اسے جھنجھوڑ دیا تھا اسے ڈر تھا کہ کہیں ایک اور تلخ تجربے کا شکار نہ ہونا پڑے۔

دھیرے دھیرے نریندر اور ندھی کی ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھنے لگا۔ نریندر ندھی کی تعریفیں کرتے تھکتا نہ تھا۔ ندھی کو بھی نریندر کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا اچھا لگتا تھا۔

نریندر اوسط خاندان کا ایسا نوجوان تھا جس نے اپنی محنت اور لگن سے ایڈمنسٹریٹو سروس میں کامیابی حاصل کی تھی، اور جلد ہی وہ اونچے عہدے پر فائز کر دیا گیا تھا۔ تیس سال کا ہونے پر بھی ابھی تک کنوارا تھا۔ اس کے لیے رشتوں کی کمی نہ تھی لیکن وہ اپنی شریکِ حیات چننے کا فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔

اتوار کی ایک شام ندھی نریندر کے گھر بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ کھانے کے بعد ندھی اور نریندر لان میں آ بیٹھے۔ نریندر نے ندھی کو اپنے والد کا خط دکھایا، جس میں انھوں نے ڈھیر سے رشتوں میں سے جلد ایک لڑکی چن کر نریندر کو شادی کرنے کی صلاح دی تھی۔ وہ اندر سے البم اٹھا لایا۔ جس میں کئی لڑکیوں کے فوٹو لگے ہوئے تھے نریندر شرما کی الجھن یہ تھی کہ اسے اس کہکشاں میں سے ایک ستارہ چننا تھا۔

ایک طرف ڈاکٹر، انجینیئر اور افسر لڑکیاں، دوسری طرف گھریلو خوبصورت اور معزز خاندان سے تعلق رکھنے والی لڑکیاں اس البم کے ذریعے نریندر تک پہنچنے کے خواب دیکھ رہی تھیں۔ نریندر بولے جا رہا تھا۔

فلاں لڑکی کے باپ ـــ آئی. جی پولیس ہیں۔

فلاں بہت بڑے نیتا کی لڑکی ہے۔

فلاں بزنس مین جہیز میں پندرہ لاکھ دینے کو تیار ہے۔

ندھی کو لگا جیسے نریندر جتانا چاہتا ہے کہ وہ کس اونچے تخت پر بیٹھا ہے۔ جہاں ہر بڑا آدمی اس سے اپنی لڑکی کی شادی کرنا چاہتا ہے۔

"تم ان میں سے کسی ایک لڑکی کو کیوں نہیں چن لیتے؟" ندھی نے پوچھا۔

نریندر کی حالت اس بچے کی طرح تھی

حویلی جرنیل صاحب، نزد بڑا کنواں، ٹونک (راجستھان)

جس کے سامنے خوبصورت کھلونوں کا ڈھیر لگا ہو، اور اس سے کہا جائے کہ ان میں سے صرف ایک کھلونا چُننا ہے۔

نریندر بولا" آپ جیسی لڑکی جسے ملے گی۔ وہ بڑا قسمت والا ہوگا۔ مگر کیا آپ یہ نہیں سوچتیں کہ نوکری کرنے والی لڑکیاں گھر کا دھیان نہیں رکھ پاتیں۔"

ندھی نے کہا" نوکری پیشہ لڑکیاں گھریلو لڑکیوں سے زیادہ چُست ہوتی ہیں اور دونوں ذمّے داریاں بخوبی سنبھالتی ہیں۔"

نریندر کچھ سوچ کر بولا" اگر میں آپ سے نوکری چھوڑنے کے لیے کہوں تو کیا آپ چھوڑ دیں گی۔"

" میری بات چھوڑو، مگر ضرورت پڑنے پر ہر عورت نوکری چھوڑ سکتی ہے۔ اگر مرد اس ڈر سے کہ کہیں عورت اس سے آگے نہ نکل جائے، نوکری چھوڑنے کو کہے۔ تب عورت کو نوکری نہیں چھوڑنا چاہیے۔"

ندھی کا لہجہ کچھ کڑوا ہوگیا تھا۔

نریندر کا نوکر رام ندھی کے لیے کافی بنا لایا، جب بھی ندھی نریندر کے گھر جاتی وہ اس کی بہت خاطر کرتا تھا۔ شاید وہ یہ سوچتا تھا کہ ندھی ایک دن میم صاحب بن کر اس گھر میں آجائے گی۔

رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ ندھی اپنے گھر جا چکی تھی۔ مگر نریندر اب بھی ندھی کی باتوں پر غور کر رہا تھا۔

دوسری طرف ندھی اپنے گھر پر بیٹھی، سوچ رہی تھی کہ آخر ایسا کیوں ہے کہ اچھی سے اچھی لڑکی ایک موڑ پر آکر مرد کے بارے میں سوچنے کے لیے مجبور ہے۔ اسے اپنے مستقبل کے لیے ایک بیساکھی کی ضرورت کیوں ہے؟

ندھی کی نظر میز پر رکھی چائے پر پڑی، اُس نے چائے کا ایک گھونٹ لے کر کپ میز پر رکھ دیا۔ دیر سے رکھے ہونے کی وجہ سے چائے کب کی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔

ندھی دو تین دن سے نریندر کے بارے میں زیادہ ہی سوچنے لگی تھی۔ اُسے نریندر اچھا لگتا تھا۔ مگر وہ اس کے لیے اپنی سروس کیوں چھوڑے ——— !

نوکر نے چترا کے آنے کی خبر دی۔

چترا چوپڑا ندھی کے بچپن کی سہیلی تھی۔ اُس نے شہر کے ایک رئیس کے لڑکے سے شادی کی تھی۔ اُس کے شوہر کی دولت اور شہرت نے اُس کی شخصیت کو مسخ کر دیا تھا۔ ندھی عام طور پر ایسے لوگوں سے دُور رہتی تھی۔ مگر اس کو اپنے بچپن کی سہیلی چترا سے ایک قسم کا لگاؤ تھا۔ چترا اِدھر اُدھر کی بات کر کے بولی " تم نریندر کی دوست ہو۔ میں اپنی چھوٹی بہن کی شادی اس سے کرنا چاہتی ہوں۔ تم اسے سمجھاؤ۔ بھاؤنا تھوڑی موٹی اور سانولی ضرور ہے لیکن نریندر اس سے شادی کر کے راتوں رات لکھ پتی بن سکتا ہے۔ میرے ڈیڈی جہیز میں پچاس لاکھ دینے کو تیار ہیں۔"

ندھی بولی" میں نریندر کی پسند جانتی ہوں۔ وہ راضی نہیں ہوگا۔"

چترا مُنہ بنا کر بولی" کہیں تم نریندر کو اپنے لیے تو بچا کر نہیں رکھنا چاہتیں۔ خیر میں بھاؤنا کی شادی اس سے کر کے ہی رہوں گی۔" یہ کہہ کر پیر پٹکتے ہوئے چترا کمرے سے باہر نکل گئی ——— اپنے شوہر اور باپ کے پیسے نے اُسے بے حد مغرور بنا دیا تھا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی ندھی اس کو باہر تک چھوڑنے آئی۔ اتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ ندھی سوچ رہی تھی وہ چترا کی بہن کے بارے میں نریندر سے بات کرے گی۔

ٹیلیفون پر نریندر کہہ رہا تھا" میں نے شادی کرلی ہے یہ خبر سب سے پہلے آپ کو ہی دے رہا ہوں۔"

ندھی نے سوچا نریندر کہیں مذاق تو نہیں کر رہا؟ مگر اس کو یہ بات مذاق میں بھی اچھی نہیں لگی۔ ندھی نے پوچھا" دلہن کون ہے۔ کیا یہ ابھی بھی راز ہے۔"

نریندر نے بتایا کہ اس نے "انا" کے ساتھ آج ہی کورٹ میرج کی ہے، نریندر یہ بات جتنی آسانی سے کہہ گیا، ندھی کے لیے یہ سُننا اتنا آسان نہ تھا۔ اپنی عادت کے مطابق نریندر بولتا ہی جارہا تھا، لیکن ندھی سکتے کے عالم میں بیٹھی رہ گئی وہ نریندر کی باتیں سُننے کے قابل ہی کہاں رہ گئی تھی۔

ندھی سوچ رہی تھی" انا" جو اب تک شادی سے انکار کرتی رہی تھی آج اس نے بھی اپنی بیساکھی ڈھونڈ لی ہے ———

پھر وہ اپنی ڈائری لکھنے لگی۔ آج مجھے پہلی بار لگا کہ میں اکیلی ہوں۔ کتنی لڑکیوں کا اکیلاپن مجھ میں سما گیا ہے۔

آخر کوئی لڑکی انسان بن کر کیوں نہیں جی پاتی اسے آدمی کے لیے عورت بن کر ہی جینا پڑتا ہے؟ ——— کیوں ۰۰۰ ؟

آخر کیوں ۰۰۰ ؟؟

دل ہے اِک شعلہ بجھے گا تو دھواں ہو جائے گا
یہ دھواں پھر رفتہ رفتہ قہرِ جاں ہو جائے گا

دائرہ در دائرہ محدود نقطے پر نہ جا
دیکھنا جس دن یہ پھیلا بیکراں ہو جائے گا

زندگی کی تیز رفتاری ہیں کس کو سوچنا
آج کا ہر واقعہ کل داستاں ہو جائے گا

غم سے پتھر ہے مرا دل کیوں بناتا ہے ہدف
اس پہ تو ہر تیر تیرا رائیگاں ہو جائے گا

اُس کی صورت کی نمائش اپنے لفظوں میں نہ کر
ورنہ سارا شہر تجھ سے بدگماں ہو جائے گا

جمیل قریشی

مونس بریلوی

میں سنگ ہوں کوئی آزر بدن عطا کر دے
اور اُس کے بعد خدا پیرہن عطا کر دے

میں ایک شاخِ چمن تو چُرا بھی سکتا ہوں
عطا تو یہ ہے کہ سارا چمن عطا کر دے

یہ زہرِ ہوش و خرد اب پیا نہیں جاتا
مرے خدا مجھے دیوانہ پن عطا کر دے

نہ جانے کب سے سوالی ہے شامِ تنہائی
بس ایک بار سہی انجمن عطا کر دے

نہیں نصیب میں شبنم کا ایک قطرہ بھی
ترا کرم ہے کہ گنگ و جمن عطا کر دے

صلیبِ فکر کی زینت بنا رہا مونس
کبھی دعا نہیں مانگی کہ فن عطا کر دے

ہم تو لکھتے رہے رودادِ زمانہ برسوں
لوگ پڑھتے رہے لمحوں کا فسانہ برسوں

دام بچھتے رہے خوش رنگ پرندوں کے لیے
بھوک بنتی رہی قاتل کا نشانہ برسوں

لوگ ہر سانحہ کچھ دن میں بھلا دیتے ہیں
ایک دیوانے کو رونا ہے دِوانہ برسوں

کاش اِک در پہ ٹھہر جاتے ہمارے بچّے
ہم نے اس شہر میں بدلا ہے ٹھکانہ برسوں

میں بھی اس دور میں زندہ ہوں بہ اندازِ میرا
مجھ کو روئے گا مرے بعد زمانہ برسوں

آفتاب عالم

	۸، آزاد نگر، ہلدوانی ۲۶۳۱۳۹، ضلع نینی تال	۲۶۔ دھوبی بگان، کمرہٹی، کلکتہ ۷۰۰۰۵۸

نئی مطبوعات

نخلِ جنوں (شعری مجموعہ)
شاعر: علیم اللہ حالی
صفحات: ۱۲۰
قیمت: ۴۰ روپے
ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

"نخلِ جنوں" علیم اللہ حالی کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ جس میں غزلیں اور نظمیں شامل ہیں۔ ان کا پہلا شعری انتخاب "سفر جلتے دنوں کا" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ جسے اربابِ فکر و نظر نے قدر کی نگاہوں سے دیکھا تھا۔ ڈاکٹر علیم اللہ حالی کا شعری رویّہ آغازِ سفر سے ہی بڑا واضح رہا ہے۔ وہ حیات کو، کائنات کو، اشیا کو ایک خاص نقطۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم عصر شعرا میں موضوعات کی مماثلت کے باوصف ان کا اپنا وہی مخصوص نقطۂ نگاہ اور اس کے بطن سے جنم لینے والا انفرادی لب و لہجہ ان کی شاعری کی شناخت قائم کرتا ہے۔ خود ان کے الفاظ ہیں:

"جو چیز شاعر کی کلیتہً اپنی ہوتی ہے وہ حالات و واقعات کا ردِ عمل، محسوسات، جذبات و کیفیات اور رنج و راحت میں اظہارات کی انفرادیت ہے۔ . . . میری شاعری میں میرا روئے سخن خود میری طرف ہے جب آدمی اپنے آپ سے ہم کلام ہوتا ہے تو اظہار و بیان کے وہ اصول و قواعد کام نہیں آتے جو دوسروں تک اپنے مافی الضمیر کو پہنچانے کے لیے ہوتے ہیں۔ یہاں ایک طرح کے MONOLOGUE کی ضرورت ہوتی ہے ـــــ اور بسا اوقات اظہار کا یہ طریقہ پیچیدہ، ٹیڑھا میڑھا، مبہم اور کبھی کبھی ناقابلِ فہم ہو جاتا ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ میرے شعری اظہار میں یہ عجوبہ کاریاں موجود ہیں۔"

شاعر کے اس بیان کی روشنی میں جب ہم "نخلِ جنوں" کا شعری سفر شروع کرتے ہیں تو کہیں اظہار میں ٹیڑھے پن، پیچیدگی یا ابہام کی ایسی صورت نہیں ملتی کہ وہ "ناقابلِ فہم" لگے۔ بالخصوص غزلوں کی دنیا میں کوئی ابہام نہیں۔ ہاں نظموں میں کسی حد تک "اظہار کی یہ عجوبہ کاریاں" ضرور موجود ہیں۔ اگرچہ غزل کے ایک شعر میں بھی انھوں نے اس کا ذکر کیا ہے کہ:

ہر صوت و حرف رقص میں آزاد ہو علیم
صحنِ ہنر میں رشتۂ لفظ و بیاں جلا

صحنِ ہنر میں لفظ و بیاں کے رشتہ کو نذرِ آتش کرنے کی یہ خواہش کوئی نئی نہیں ہے۔ غالب نے اسے اپنے انداز سے کہا ہے۔ دراصل "وسعتِ بیانی" کی یہ اذیت اٹھانے کے بعد ہی اچھی اور سچی شاعری جنم لیتی ہے۔ چنانچہ اسی جذبے نے علیم اللہ حالی کے "صحنِ ہنر" کو وسیع، ہمہ گیر اور متنوع بنایا ہے۔

غزلوں میں ذکرِ محبت بھی ہے اور فکرِ حیات و کائنات بھی۔ جن میں اشاریت بھی ہے، پیکر تراشی بھی اور فنی خصوصیات بھی۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں:

عمر بھر بس ہم ہی ہم حائل رہے
میرے ان کے درمیاں کچھ بھی نہ تھا

میں اپنے آپ میں تجھ کو سمیٹتا کیوں کر
میں ایک لمحۂ محدود، اک زمانہ تو

گزرا ہر ایک شخص مجھے دیکھتا ہوا
گویا میں آدمی نہ ہوا آئینہ ہوا

غزل گوئی کے مقابلے میں حالی کی فنی شخصیت نظم نگاری میں زیادہ کھل کر سامنے آتی ہے اور ان کی تخلیقی توانائیوں کا احساس ہوتا ہے۔ نظموں میں خیالات کی روانی ہے اور یہ خیالات شخصیاتی ہوتے ہوئے بھی کائناتی ہیں۔ ان میں ایک مسلسل فکر کارفرما ہے، جس کو شعری قالب میں ڈھال دیا گیا ہے۔

ایسی نظموں میں شکستِ حصار کے بعد؛ لفظ؛ آواز؛ صورت گری؛ آخری الہام؛ انصاف؛ ہواؤں کا حصّہ؛ مسافر سے وغیرہ بہت کامیاب ہیں۔

خدا کرے "نخلِ جنوں" کی یہ شادابی روز افزوں نکھرتی جائے تاکہ اردو شعری ادب میں کچھ اچھے اضافے ہو سکیں۔

ـــــ ارتضیٰ کریم
فیکلٹی آف آرٹس، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی ۱۱۰۰۰۷

پہلی غلطی

مصنف : اسحٰق خضر
صفحات : ۱۲۸
قیمت : ۳۰ روپے
اشاعت زیر اہتمام : ہمزباں پبلیکیشنز، ۱۹۳ - ایم - ایچ - بی - کالونی، مالیگاؤں ۴۲۳۲۰۳، ضلع ناسک (مہاراشٹر)

"پہلی غلطی" اسحٰق خضر صاحب کے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کے مجموعے کا نام ہے۔ اسحٰق خضر صاحب اگر کہیں چوکے ہیں تو اس کتاب کا نام رکھنے میں اور پشت پر اپنی فوٹو دینے میں کیوں کہ یہ دونوں ہی مزاح کے عنصر سے پاک ہیں! میری یہ بدقسمتی ہے کہ اس سے پہلے میں نے اسحٰق خضر صاحب کی کوئی مزاحیہ تحریر نہیں پڑھی ورنہ اِس کتاب کی طرف سب سے پہلے لپکتا۔ مگر جن حالات میں اور جس مقصد کے لیے مجھ تک یہ کتاب پہنچی، اس کا مطالعہ ناگزیر تھا۔ سوچا جستہ جستہ یعنی کہیں کہیں سے پڑھ لوں گا۔ میری ایک خامی اور ہے کہ کتاب کے اندر یا باہر کسی نقاد یا ادیب کی رائے نہیں پڑھتا کیوں کہ فی زمانہ اُردو کی کوئی کتاب ایسی نہیں ملتی جس میں ایک یا نصف درجن نقادوں یا ادیبوں کی مُصنّف کے بارے میں قصیدہ خوانی نہ ہو۔

مگر صاحب خضر اسحٰق صاحب کی کتاب جو میں نے پڑھنی شروع کی تو اس کا ایک ایک مضمون اور ہر مضمون کا ایک ایک لفظ پڑھ کر ہی اسے چھوڑ سکا! شاید ہی کوئی مضمون ہو جسے پڑھ کر میں بے ساختہ بار بار نہ مسکرایا ہوں۔ اسحٰق خضر تو میدانِ ظرافت اور بذلہ سنجی کے چھپے رستم نکلے! انھوں نے اپنی "پہلی غلطی" سے ہی اپنی جگہ صفِ اوّل کے مزاح نگاروں میں محفوظ کر لی ہے۔

اسحٰق خضر صاحب کا اسلوب نگارش غیر پیچیدہ، طاقتور اور رواں دواں ہے۔ وہ اپنی تحریر کے بہاؤ میں ظرافت کی پھلجھڑیاں چھوڑتے جاتے ہیں۔ اُن کا مزاح عوام اور خواص دونوں کو متاثر کرے گا۔ خواص سے میری مراد ان بلند ذوق حضرات سے ہے جن کا مطالعہ وسیع ہے، جو پختہ ذہن ہیں اور ظرافت میں بھی ایک مخصوص سطح اور معیار تلاش کرتے ہیں۔

بلاشبہ اسحٰق خضر صاحب کے انشائیوں کا یہ مجموعہ اُردو کے مزاحیہ ادب میں ایک سنگِ میل کی حیثیت حاصل کرے گا۔ یوں تو اس مجموعے کا ہر مضمون قابلِ تعریف ہے مگر مزاح کی جو کیفیت اور فضا حاتم طائی کا انٹرویو یا قلا باز خاں باز میں ملتی ہے اس کی نظیر مشکل سے ہی ملے گی۔ اسحٰق خضر صاحب نے کچھ اچھوتے اور غیر مانوس موضوعات کو بھی اپنے مزاحیہ قلم سے چھوا ہے۔ ایسے مضامین میں دُم، قصہ دودھ میں پانی کا، چھٹی، ٹوپی اور منگھی قابلِ ذکر ہیں۔

—— م. م. راجندر
۶۸، چتر وہار، نئی دہلی

اختر انصاری : دید پسِ دید

مصنف : شمس بدایونی
صفحات : ۱۴۰
قیمت : ۲۵ روپے
ملنے کا پتا : مکتبہ جامعہ، اُردو بازار، جامع مسجد، دہلی ۱۱۰۰۰۶

زیر نظر کتاب اختر انصاری مرحوم کی زندگی اور ادبی کاوشوں کا احاطہ کرتی ہے۔ مُصنّف نے مرحوم کو بہت نزدیک سے دیکھا، سمجھا اور پرکھا ہے۔

ابتدائیہ میں شمس بدایونی نے حرفے چند میں ڈاکٹر وحید اختر نے دیباچے میں ڈاکٹر سیّد لطیف حسین ادیب نے اور مقدمے میں شاکر نقوی نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ اختر انصاری کی زندگی، شاعری، معلمی، افسانہ نگاری، ڈراما نگاری اور تنقید کے ذکر کے بعد ڈائری کے اوراق اور خطوط ہیں اور آخر میں تصانیف کی فہرست اور مرحوم پر لکھے گئے مضامین کی فہرست ہے۔

مرحوم کے ۱۵ شعری مجموعے، ۴ افسانوں کے مجموعے، ۱۰ تنقید کے مجموعے، تعلیم کے متعلق ۴ کتب اور ۳ متفرق کتابوں کے علاوہ ۹، ۱۰ انتخابات کے مجموعے ہیں۔ ان پر ۲۶ مضامین چھپے اور رسالوں میں گوشے نکلے۔

مرحوم کی زندگی میں یونیورسٹیوں میں کچھ تحقیقی کام ہوئے لیکن ڈاکٹر وحید اختر کی نظر میں ان کی تنقیدی حیثیت مشتبہ ہے۔ اُردو شعبوں، نصابی کمیٹیوں نے ان پر توجہ ہی نہیں کی۔

سب سے اہم حصہ ڈائری کے اوراق ہیں جو حقایق پر مبنی روزمرّہ کی باتیں ہیں۔ خطوط میں چیخیں ہیں، کرب مسلسل ہے۔ بے پناہ

ٹیسیں ہیں۔ ان کی کچلی ہوئی روح ہے۔ لہجے کی
تلخی ہے۔ یاوہ گوئی ہے۔ گالیاں بھی ہیں۔ اچھے
اچھوں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ گھریلو زندگی
سے بہت دُکھی رہے۔

اختر انصاری ۱۹۰۹ء میں پیدا ہوئے۔
۱۹۸۸ء میں اللہ کو پیارے ہوئے۔ علی گڑھ مسلم
یونیورسٹی سے بی۔ ٹی اور ایم۔ اے کے امتحانات
پاس کیے۔ شعبۂ تعلیم (ٹیچرز ٹریننگ کالج) میں
لیکچرار رہے اور وہیں سے ریٹائر ہوئے۔ ۱۹۲۸ء
میں شعر کہنا شروع کیا۔ شعرگوئی کے ساتھ ساتھ
افسانہ نگاری اور تنقید کی طرف چل پڑے۔
سب سے پہلا تنقیدی کام "افادی ادب"
تھا۔ ڈاکٹر وحید اختر کا کہنا ہے کہ رومانی دور
سے ترقی پسندی اور ترقی پسندی سے جدیدیت
کے دور تک کوئی شاعر ہم عصر میلانات اور
تخلیقی امکانات کی دریافت میں اتنا شریک و
فعال نہیں رہا، جس قدر اختر انصاری
رہے ہیں۔

اختر انصاری چاہتے تھے کہ فانی بدایونی
پر ایک انسائیکلو پیڈیا کا پروجیکٹ تیار ہو۔
وہ خود پر بھی سیمینار کرانے، ڈاکٹریٹ کرانے
کے خواہاں تھے۔ لیکن وہ یہ کام اعلیٰ پایے کے
نقادوں سے چاہتے تھے۔ سیمینار کرنے کی دو
ایک تجاویز ہوئیں تو وہ سرے نہیں چڑھیں۔
جس سے مزید تلخی پیدا ہوئی۔

کچھ خطوط ایسے ہیں جن میں ان کی کتابیں
چھپنے چھپوانے، اکادمیوں کو انعامات کے لیے
بھیجنے وغیرہ کا ذکر ہے۔

اختر انصاری یقیناً فنا فی العلم تھے۔
ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ اپنے
ڈرائینگ روم میں محدود ہوتے چلے گئے۔ ان
پر قنوطیت غالب آگئی تھی۔ ان کے جنازے
کے ساتھ بہت کم لوگ تھے، باوجود یہ کہ
علی گڑھ میں اہل علم و کمال رہتے ہیں۔

اُردو ادب پر اختر انصاری کا قرض
ہے۔ مُصنف نے کچھ حق ادا کیا ہے۔ کاش
یونیورسٹیاں اور ادبی ادارے متوجہ ہوں۔
کتابت، طباعت اچھی ہے۔

——— رام لعل نابھوی
دیوان بازار، نابھا، پنجاب

سرابوں کی فصل

شاعر: جمنا پرشاد راہی
قیمت: ۴۰ روپے
ناشر: مُصنف، آبکار واچ کمپنی، رگھوبیر پوری، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ (یو۔پی)
ملنے کے پتے: (۱) مکتبہ جامعہ، علی گڑھ/بمبئی/دہلی
(۲) ایجوکیشنل بک ہاؤس، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ (یو۔پی)

قریب تیس پینتیس برس پہلے اُردو کی
کلاسیکی غزل کے قدیم استعارات و علائم سے
کلیتہً مُنہ موڑ لینے کے بعد اُردو کی جدید غزل
جن نئے راستوں پر گامزن ہوئی وہ خاصے
ناہموار تھے۔ کہیں کہیں غزل کو مداری کا
کھیل بھی بنا دیا گیا مگر سنجیدہ شعرا نے نہ
صرف اس دلکش صنف کی ساکھ قائم رکھی،
بلکہ اس کے نئے روشن امکانات بھی دریافت
کیے۔ تغیّر و تبدّل کے اس مرحلے میں جمنا پرشاد
راہی نے جو راستہ قبول کیا اور جو روش
اختیار کی وہ سلاست روی کی راہ تھی۔ زیر نظر
کتاب کے مطالعے سے یہ حقیقت سامنے آتی
ہے کہ راہی عدمِ ابلاغ کی بدعت سے دُور
رہے ہیں۔ اور قارئین تک اپنے جذبات و
احساسات کی ترسیل کو ضروری سمجھتے ہیں۔ ان
کے کلام پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ بات
بھی بآسانی معلوم ہو جاتی ہے کہ ان کی شاعری
تجربات و مشاہدات اور لہجے کے لحاظ سے مکمل
طور پر ان کی اپنی شاعری ہے۔

ذیل کے اشعار میرے خیال کی
تائید کریں گے:

سلگتی ریت پہ آنکھیں نچوڑتے کیوں ہو
سمندروں کو سرابوں سے جوڑتے کیوں ہو

درخت پی گئے ماہِ تمام کی کرنیں
پڑی ہے رات کی دلہن نڈھال شاخوں پر

گزرے ہوئے لمحات سے منہ پھیر لیں کیسے
ٹوٹے ہوئے رشتوں سے ہمیں پیار بہت ہے

دیارِ سنگ میں رہ کر بھی شیشہ گر تھا میں
زمانہ چیخ رہا تھا کہ بے ہنر تھا میں

صرف سوکھے ناریل ہیں مفلسوں کے ہاتھ میں
کھڑکیاں مندر کی سب دستِ رسا کے ساتھ ہیں

عجیب آگ ——— لگا کر کوئی روانہ ہوا
مرے مکان کو جلتے ہوئے زمانہ ہوا

جادۂ زیست میں تنویرِ سحر آنے تک
خواب بُنتے رہو تعبیرِ نظر آنے تک

کتاب کا سرورق خوشنما ہے کتابت و

طباعت دلکش ہے۔ یقیناً "سرابوں کی فصل" اُردو کے شعری ادب میں ایک قابلِ لحاظ اضافہ ہے۔

——— دلیپ بادل

۴۲۵، چراغ دلّی، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۷

عبدالحلیم شررؔ بحیثیت شاعر

مصنف: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی
صفحات: ۲۷۲
قیمت: ۱۴ روپے
تقسیم کار: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولا مارکیٹ، دریاگنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

"عبدالحلیم شررؔ بحیثیت شاعر" اُردو ادب میں ایک اضافہ ہے۔

• ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی صرف شررؔ کی شاعری ہی کو، جو بڑی حد تک ہم لوگوں کی نظر سے اوجھل تھی، منظرِ عام پر نہیں لاتے بلکہ اس کے مختلف پہلوؤں اور متنوع ابعاد پر بھرپور بحث کرکے قیمتی تنقیدی سرمایہ ہمارے سامنے لے آئے ہیں۔

ابواب یہ ہیں:

ابتدائیہ
پہلا باب: عبدالحلیم شررؔ کا ادبی پس منظر
دوسرا باب: فن شاعری اور نظم معریٰ و نظم آزاد کی ہیئتیں
تیسرا باب: عبدالحلیم شررؔ کی شاعری کا تنقیدی جائزہ
چوتھا باب: عبدالحلیم شررؔ کا اسلوبِ سخن
پانچواں باب: جدید اُردو شاعری میں عبدالحلیم شررؔ کا مقام
کتابیات

شاعری پر اور بالخصوص عبدالحلیم شررؔ کی شاعری پر یہ تنقیدی مباحث ہمارے جادۂ تنقید پر روشن چراغوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس کتاب میں مناظر عاشق ہرگانوی کی تحقیقی صلاحیتیں جس طرح نمایاں ہوئی ہیں ان کی بدولت ان کا شمار ہم ان اہل قلم حضرات میں کرسکتے ہیں جو مسلّمہ حیثیت کے شاعر اور ساتھ ہی ساتھ مستند نقاد بھی ہیں اور معتبر محقق بھی!

——— جگن ناتھ آزاد

۲۵/۱، گورنمنٹ کوارٹرس، گاندھی نگر، جموں ۱۸۰۰۰۴

جوابی خط

شاعر: شاکر انصاری سکندرآبادی
صفحات: ۱۲۸
قیمت: ۳۰ روپے
ناشر: (مصنف) ۳۸۸، انصاریان، سکندرآباد، بلندشہر (یو۔پی)

"جوابی خط" شاکر انصاری کا مجموعۂ کلام ہے۔ شاکر انصاری کا تعلق سکندرآباد سے ہے۔ شاعری ورثے میں ملی ہے۔ کہنہ مشق شاعر ہیں۔ اس مجموعے کا غور سے مطالعہ کرنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شاکر صاحب کلاسیکی وضع کے شاعر ہیں۔ اور اپنی جڑوں پر قائم رہ کر تازہ ہوا کے جھونکوں کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ اُن کے یہاں "آپ بیتی کو جگ بیتی" بنانے کا عمل بھی ہے اور حب الوطنی اور سماجی حقائق کی بازگشت بھی سنائی دیتی ہے۔ وہ حالات کو محسوس کرتے ہیں اور اُن کا تجزیہ کرکے انھیں اپنی شاعرانہ زبان دیتے ہیں۔ اُن کے چار مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ پہلا مجموعۂ کلام "برکاتِ صیام" دوسرا مجموعہ "تحفۃ النساء" تیسرا مجموعہ "عکسِ تخیل" اور چوتھا مجموعہ زیرِ تبصرہ "جوابی خط" ہے۔ اس مجموعے میں غزلیں، نظمیں دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ غزلوں میں زبان و بیان کی صفائی کے ساتھ خیال کی ندرت بھی پائی جاتی ہے۔ نظموں میں سیاسی اور سماجی نظمیں عمدہ ہیں۔ شاکر صاحب۔ وطن دوستی کا جذبہ اپنے دل میں رکھتے ہیں اور یہ رجحان اُن کے شعری سرمایے میں خوب سے خوب تر ہے۔ ان کی ایک نظم "پاسِ وطن" کے چند شعر ملاحظہ فرمائیں:

میں ہندی ہوں کب ایران و عدن کی بات کرتا ہوں
وطن سے پیار ہے مجھ کو وطن کی بات کرتا ہوں

نہ پیرس کی طرف پہنچا کبھی ذوقِ جمیل اپنا
مبارک مصر والوں کو رہے دریائے نیل اپنا

میں اپنے ملک میں گنگ و جمن کی بات کرتا ہوں
وطن سے پیار ہے مجھ کو وطن کی بات کرتا ہوں

نظموں کے علاوہ شاکر کی غزلوں میں ہر طرح کے خیالات و مضامین ملیں گے۔ غزل کی جمالیاتی اور روحانی فضا میں بھی وہ پرواز کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں:

اپنا جلوہ جو کبھی اس نے دکھایا ہے مجھے
آتشِ شوق میں کچھ اور جلایا ہے مجھے

اس نے اظہار محبت پہ جھکا کر نظریں
رازِ دل کتنے تکلف سے بتایا ہے مجھے

زحمتِ جلوہ نہ فرمائیں مرے واسطے آپ
میں شبِ غم میں ستاروں سے بہل جاؤں گا

ان اشعار میں زبان و بیان کی سادگی کے ساتھ غزل کا دل کش رنگ بھی ملتا ہے۔" جوابی خط" عمدہ کاغذ، اچھی کتابت اور دیدہ زیب سرورق کے ساتھ ساتھ فوٹو آفسیٹ پر چھپا ہے۔ قیمت بھی مناسب ہے۔

——— ماجد دیوبندی

بازدید

مصنّف : مخمور سعیدی
صفحات : ۱۶۸
قیمت : ۶۰ روپے
ناشر : موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

اُردو شاعری کے میدان میں مخمور سعیدی کی ایک امتیازی حیثیت اور شان ہے، لیکن ان کی نثری کاوشیں بھی کچھ کم وقیع نہیں —— "بازدید" میں انھوں نے ایک ایسا رنگا رنگ تصویر خانہ سجایا ہے جس کی سیر کرنے والے کے لیے کہیں بھی اُکتاہٹ کا کوئی پل نہیں آتا۔ بیتے دنوں کے دھندلکے میں یادوں کے جگنوؤں کے جگمگانے کا سماں ہو یا ناقدانہ بصیرت کی گل کاریاں، فنِ شناسی کی رہ گزر ہو یا شخصیت کے جائزے کا مرحلہ، مخمور سعیدی کی نثر ہر جگہ نشاطِ مطالعہ کا ایک نیا افق سامنے لے آتی ہے۔ شعر کی منطق اور ہے، تنقیدی اور تجزیاتی نثر کی منطق کچھ اور، مگر مخمور سعیدی نے "در کفے جامِ شریعت، در کفے سندانِ عشق"، کا کرشمہ نہایت عبارت کے ساتھ کر دکھایا ہے۔

حظِ مطالعہ اس کتاب کا بلاشبہ ایک بڑا وصف ہے، لیکن ایک آدھ جگہ یہ وصف اُلٹا وار بھی کر گیا ہے۔ مثلاً "ساحر لدھیانوی" پر مضمون میں یہ انکشاف کیا گیا ہے: "... ایک خاتون یہ دعویٰ کرتی ہیں کہ ساحر نے ان سے نکاح کر لیا تھا اور وہ بہت دن تک ساحر کے ساتھ ان کے گھر میں رہی ہیں۔ پھر کچھ اختلافات پیدا ہوئے اور ساحر نے انھیں گھر سے نکال دیا —— ایسی کوئی شہادت نہیں کہ ساحر نے اس شادی کا اعتراف کیا ہو، لیکن اگر ان خاتون کا بیان درست ہے تو کہنا پڑے گا کہ ساحر نے اس معاملے میں اپنے والد جیسا ہی ظالمانہ رویّہ اختیار کیا اور عمل کی حد تک اپنے اُن خیالات سے خود ہی منحرف ہو گئے جن کا اظہار عورت کے تئیں ان کی شاعری میں بارہا ہوا ہے۔ اس کا یقیناً کوئی گہرا نفسیاتی سبب ہوگا" ——

یہاں مخمور سعیدی نے جو قطعی فیصلہ صادر کیا ہے اس کی بنیاد ایک ایسی روایت ہے جس کی صحت خاصی مشکوک ہے۔ مفروضہ اور قیاس کی اساس پر اس طرح نتیجے نکال لینا ساحر کے ساتھ بھی زیادتی ہے اور خود مصنّف کی ناجانب دارانہ تجزیہ کی روش کے ساتھ بھی۔

"بازدید" میں شامل تمام مضامین پہلے سے مطبوعہ ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کتابی صورت میں ان کو یک جا کرتے وقت، ان پر سرسری نظر بھی نہیں ڈالی گئی ہے۔ اس کے نتیجے میں قاری ایک مقام پر شدید الجھن سے دوچار ہوتا ہے۔ ساحر پر مضمون میں (صفحہ ۱۰۰ پر) وہ پڑھتا ہے: "رسیدی ٹکٹ، میں جہاں جہاں ساحر کا ذکر آیا ہے، میں نے اسے یکجا کر کے ایک مضمون کی شکل دے دی ہے، جسے آپ اگلے صفحات میں ملاحظہ کریں گے۔ لاہور کا ذکر کیا، کے وہ تمام پیراگراف جن میں ساحر کے لاہور کے شب و روز کا حال بیان ہوا ہے، پر مشتمل مضمون شاملِ کتاب ہیں" لیکن تلاش کے باوجود بے چارے قاری کو یہ دونوں تحریریں "بازدید" میں کہیں نظر نہیں آتیں۔ اگر ان تحریروں کو کتاب میں شامل نہیں ہونا تھا تو اِس عبارت کو حذف کر دینا ضروری تھا۔

"بازدید" کا ذیلی عنوان "تاثراتی اور تجزیاتی مضامین" مصنّف کے لیے اس اعتراض کی زد سے بچنے کے لیے ڈھال کا کام دے سکتا ہے کہ جا بجا شخصی تاثر اور ناقدانہ تجزیے کے درمیان کوئی حدِ فاصل قائم نہیں رہی ہے مگر شاید اسی انداز نے (پیرایۂ اظہار کی شگفتگی کے ساتھ مل کر) اس کتاب کو مطالعہ کے لطف کی انتہا بنا دیا ہے۔ مخمور سعیدی کے دروں بین اور نکتہ آفریں ذہن نے ان تمام شعرا کے ذاتی اور تخلیقی کردار کے کچھ نئے گوشے، کچھ نئی جہتیں، کچھ نئے پہلو دریافت کیے ہیں جن پر اس کتاب میں اجمالی یا تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ ان شعرا میں وہ بھی ہیں جن کا دوام جریدۂ عالم پر ثبت ہو چکا ہے اور وہ بھی جن کی قدر اور مرتبے کا تعین وقت کے ہاتھوں ہونا ابھی باقی ہے۔ غالب، جوش، جگر، بسمل سعیدی، گوپال متل، ساحر، شفق خواجہ، کرشن موہن، زبیر رضوی اور دوسروں کے باب میں ان کی جچی تلی، خیال انگیز گفتگو توازن کا دامن کہیں نہیں چھوڑتی یہ اور بات ہے کہ کچھ زاویوں سے اختلافی بحث کی بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دے لیکن یہ معرکہ آرائی بھی بہرحال زبان و ادب کی گرمیٔ حیات سے معمور ہونے کی دلیل ہوگی اور اس بنا پر بھی یہ پیش گوئی آسانی سے کی جاسکتی ہے کہ "بازدید" پڑھنے والے مخمور سعیدی کی مزید نثری کاوشوں کا اور بھی زیادہ اشتیاق کے ساتھ انتظار کریں گے۔

——— جلیس عابدی

۲۳۴۷، گلی شاہ کلّو، بازار چتلی قبر، دہلی ۱۱۰۰۰۶

اُردو خبر نامہ

مختلف شعبوں میں نمایاں کارکردگی کے لیے پچھلے دنوں نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے دہلی کی ممتاز شخصیتوں کو "دہلی سٹی زنز کونسل ایوارڈ" پیش کیے۔ تقسیم ایوارڈ کی یہ تقریب سٹی زنز کونسل دہلی کی سلور جبلی کے موقعے پر منعقد کی گئی۔

تصویر میں نائب صدر جمہوریہ جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کو ایوارڈ پیش کر رہے ہیں۔ بائیں جانب دہلی کے لیفٹننٹ گورنر جناب ارجن سنگھ کھڑے ہیں۔

گزشتہ دِنوں ایوانِ غالب میں اُردو اکادمی، دہلی کے تعاون سے خواتین کے ماہنامے "باجی" کی رسم اجرا کی تقریب ہوئی۔ اس موقعے پر کُل ہند مشاعرۂ خواتین بھی منعقد کیا گیا۔ "باجی" کی رونمائی جناب آئی۔ کے۔ گجرال نے فرمائی۔
تصویر میں، دائیں سے ۔۔۔۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ، جناب اندر کمار گجرال، جناب م۔ افضل، جناب رفعت سروش اور حاجی انیس دہلوی۔ (تصویر: سیّد فدا علی)

شعبۂ اُردو، بمبئی یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام مشہور رہنما اور ماہرِ تعلیم مرحوم جسٹس بدرالدین طیّب (پیدائش ۱۰ر اکتوبر ۱۸۴۴ء) کے یوم پیدائش کے موقعے پر ایک سیمنار منعقد ہوا۔ اس موقعے کی ایک تصویر میں (دائیں سے بائیں) محترمہ کاملہ طیّب جی، ڈاکٹر رفیق زکریا، ڈاکٹر ایس۔ ڈی۔ کرنک (پرو وائس چانسلر)، ڈاکٹر اسحاق جمخانہ والا اور پروفیسر عبدالستّار دلوی۔

پچھلے دنوں بمبئی کے نہرو سینٹر ی اسٹیڈیم میں امین پالی ٹیکنک انسٹی ٹیوٹ کڈ پہ کی امداد کیلیے ایک شام غزل منائی گئی۔ اس موقعے کی ایک تصویر جس میں فلم اسٹار جناب دلیپ کمار کے ساتھ غزل سنگر کرن شکلا اور ریبن شکلا (شکلا سسٹرز) اور پروگرام کمیٹی کے سکریٹری جناب ممتاز راشد کو دیکھا جاسکتا ہے۔

پچھلے دنوں دہلی کی ادبی تنظیم "محفل" کی طرف سے "ایک شام سریندر شجر کے نام" منائی گئی۔

تصویر میں سریندر شجر اپنا کلام سناتے ہوئے۔

قلمزاد کا جلسہ

نوجوان ادیبوں کی انجمن "قلمزاد" کے زیر اہتمام غالب اکیڈمی نئی دہلی میں ڈاکٹر اجمل اجملی کے پہلے شعری مجموعے "سفرزاد" کی رسم اجرا دہلی یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر مونس رضا کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ پروفیسر رضا نے "سفرزاد" پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ شاعری کا سفر کبھی نہ ختم ہونے والا سفر ہے اور ڈاکٹر اجمل اجملی کی شاعری اس کبھی نہ ختم ہونے والے سفر کا ایک قدم ہے۔ پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی نے اپنی تقریر میں

ڈاکٹر اجملی کے روسی نظموں کے تراجم کی طرف
اشارہ کیا اور کہا کہ وہ اُردو ادب کے لیے
ایک خاص تحفہ ہیں ان تراجم کی بھی اشاعت
ہونی چاہیے۔ معروف ہندنا ادیب جناب
بھیشم ساہنی نے ترقی پسند نظریے کی روشنی
میں 'سفرزاد' پر بحث کی۔ جناب مظہر امام
نے کہا کہ اجملی صاحب کی شاعری میں شکستِ
خواب کے عناصر پائے جاتے ہیں لیکن ان
کے ساتھ ساتھ اُن کے یہاں نئے خواب بھی
موجود ہیں۔ ہندی کے ادیب ڈاکٹر
وشوناتھ ترپاٹھی نے ان کی شاعری کے صوتی
اور لسانی نظام سے بحث کی۔ پروفیسر قمر
رئیس نے کہا کہ 'سفرزاد' کی اشاعت بہت
پہلے ہونی چاہیے تھی کیوں کہ "سفرزاد" ڈاکٹر
اجملی کی چالیس سالہ مشق کا حاصل ہے اور
بہت اصرار کے بعد منظرِ عام پر آیا ہے۔
پروفیسر قمر رئیس نے مزید کہا کہ اجملی صاحب
نے ترقی پسند نظریے کو اپنے اندر جذب
کرلیا ہے۔ اس مجموعے میں شامل نذرِ میر
کے عنوان والی غزلیں یاسیت اور محرومی
لیے ہوئے ہیں لیکن نذرِ غالب میں جو غزلیں
شامل ہیں ان میں رجائیت کے عناصر کی
بھرپور عکاسی ہے۔ انور عظیم نے بتایا کہ
میں "سفرزاد" کے خالق کو چالیس برس سے
جانتا ہوں اور انھوں نے اپنی مایوسی کے
دور میں بھی رجائیت کو برقرار رکھا ہے۔ ڈاکٹر
شارب ردولوی نے "سفرزاد" کی شاعری پر
فنی نقطۂ نظر اور ترقی پسند اصولوں کے
ساتھ محاکمہ کیا۔ نوجوان ادیب ڈاکٹر
مجیب الاسلام نے بھی ڈاکٹر اجملی کی شاعری
پر اپنی رائے کا اظہار کیا ــــ صدرِ جلسہ
جناب غلام ربّانی تاباں نے اپنی صدارتی
تقریر میں اجملی صاحب کی شاعری، ان کی
زندگی اور اشتراکی تحریک تینوں کو ایک
ہی سلسلے کی کڑی بتایا اور کہا کہ "سفرزاد"
ترقی پسند ادب کے سفر میں ایک اہم اضافہ
ہے۔

ــــ (ڈاکٹر) جلال انجم

جلسۂ تعزیت

دہلی رائٹرز فورم کے زیرِ اہتمام اُردو
کے سرکردہ صحافی اور شاعر جناب وجاہت
افروز کی یاد میں ۲۹ اکتوبر کو غالب اکیڈمی
نئی دہلی میں 'ویر ارجن' کے ایڈیٹر جناب
انل نریندر کی صدارت میں ایک تعزیتی جلسہ
منعقد کیا گیا۔ جس میں بہت بڑی تعداد میں
دہلی کے صحافیوں نے شرکت کی۔ جلسے کا آغاز
تلاوتِ کلامِ پاک سے ہوا۔ اس کے بعد جناب
پروانہ ردولوی نے وجاہت افروز مرحوم
کی پیشہ ورانہ صلاحیتوں پر روشنی ڈالی۔
انھوں نے کہا کہ وجاہت افروز نے جو روزنامہ
"پرتاپ" کے چیف رپورٹر تھے زرد صحافت اور
منفی رپورٹنگ سے ہمیشہ احتراز کیا اور مثبت
انداز میں احوال و کوائف کو پیش کرنے کی
کوشش کی۔ وہ ایک کھوجی رپورٹر تھے اور
واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے سے گریز
کرتے تھے۔ انھوں نے ان حضرات کا شکریہ
ادا کیا جنھوں نے طویل علالت کے دوران
افروز مرحوم کی ہر ممکن امداد کی۔ پروانہ
ردولوی نے خاص طور سے اس سلسلے میں
دہلی کے لیفٹننٹ گورنر جناب ارجن سنگھ،
وقف بورڈ کے چیئرمین جناب امتیاز خاں
آئی اے ایس' اور اُردو اکادمی' دہلی کی
مالی اعانتوں کا ذکر کیا۔ اِس موقعے پر
جناب شمس الزماں' جناب علی صدیقی'
جناب شاہد صدیقی' جناب غفران احمد'
جناب جاوید حبیب' جناب فاروق ارگلی'
جناب رئیس مرزا اور جناب فرحت احساس
نے بھی افروز مرحوم کی خوبیوں بالخصوص صحافتی
سوجھ بوجھ کا ذکر کرتے ہوئے ان کی بے وقت
موت پر صدمے کا اظہار کیا۔ جناب حیات
لکھنوی نے افروز مرحوم کو منظوم خراجِ
عقیدت پیش کیا۔ جلسے نے ایک قرارداد
منظور کرکے ضرورت مند صحافیوں کے لیے
ایک مستقل فنڈ قائم کرنے کا مطالبہ کیا۔
قرارداد میں دہلی کے لیفٹننٹ گورنر سے
افروز مرحوم کی بیوہ کا وظیفہ مقرر کرنے اور
اُردو اکادمی' دہلی سے وہ ماہانہ وظیفہ افروز
مرحوم کی بیوہ کے نام منتقل کرنے کی درخواست
کی جو علالت کے دنوں میں افروز مرحوم کو
ملا کرتا تھا۔ فاتحہ پر جلسہ ختم ہوا۔

غیر طلبیدہ نگارشات

جن کی واپسی کے لیے مناسب سائز
کا ٹکٹ لگا ہوا لفافہ ساتھ نہ ہو'
ناقابلِ اشاعت سمجھی جانے پر ضائع کردی
جاتی ہیں۔

ــــ ادارہ

آپ کی رائے

جولائی کے شمارے میں "سرودِ رفتہ" کے تحت سراج میر خاں سحر کی غزل سے محظوظ ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ ہر شعر استادانہ رنگ و آہنگ کا آئینہ دار ہے۔ لیکن غزل کا مطلع: سینے میں دل ہے، دل میں داغ، داغ میں سوز و ساز عشق پردہ بہ پردہ ہے نہاں پردہ نشیں کا راز عشق حرف بہ حرف حضرت بیدم شاہ وارثی کی گیارہ اشعار پر مشتمل غزل کا مطلع بھی ہے جو دیوان بیدم نام نور العین المعروف مصحف بیدم میں شامل ہے، جسے خورشید بک ڈپو، امیٹھی ہاؤس امین آباد لکھنؤ نے ۱۹۸۴ء میں شائع کیا ہے۔ اتفاق سے دیوانِ بیدم میرے پاس بھی ہے۔ دیباچہ خواجہ حسن نظامی دہلوی نے لکھا ہے۔ تقریظ لکھنے والوں میں بھی بہت سے ممتاز حضرات ہیں۔ بیخود موہانی کی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تحریریں ۱۹۳۵ء کی ہیں۔ انھوں نے اپنی تحریر کے آخر میں اپنے دستخط کے ساتھ تاریخ ۳ مارچ ۱۹۳۵ء درج فرمائی ہے۔ یہ سرقہ ہے یا توارد؟ کیا بیدم شاہ وارثی پر سرقے کا گمان کیا جاسکتا ہے جن کا ادبی دیوان درجۂ کمال کو پہنچ کر منظور بارگاہ نگاہ ہوچکا ہے۔

——— زار غازیپوری (۲۴ پرگنہ)

"ایوانِ اُردو" کا میں مستقل قاری ہوں۔ ماہ اگست کے شمارے میں اگاسکر صاحب کا مضمون پڑھا۔ اگاسکر صاحب نے صحیح لکھا ہے کہ مراٹھی میں یہاں "قیام" کے معنی میں "مقام" استعمال ہوتا ہے اور اسی طرح جاگہ "जागा" بھی مختلف صورتوں میں استعمال ہوتا ہے مرہٹی فلموں اور ناٹکوں میں اردو کے اشعار بے ساختہ استعمال کیے جاتے ہیں۔ بعض روزانہ اخبارات میں ہر روز ایک دو شعر معنی کے ساتھ چھاپے جاتے ہیں۔ مہاراشٹر میں کتنے ہی شوقین غزل گانا نہایت ضروری سمجھتے ہیں اور بعض گایک تو غزلیں گا کر ہی مشہور ہوئے۔ نوجوان طبقہ غزلوں اور اشعار کی پاکٹ بکس خریدتا ہے اور اپنی گفتگو میں برمحل اردو اشعار کا استعمال بھی کرتا ہے۔ وہ دن دور نہیں جب مہاراشٹر کی کثیر آبادی اُردو بولنا لکھنا اور پڑھنا شروع کردے گی۔ بہ حال اردو اور مرہٹی میں بہت قرابت داری ہے۔ جیسا کہ اگاسکر صاحب نے لکھا ہے دہلی کی زبان سے (در حقیقت اُردو زبان سے ہونا چاہیے) مرہٹی کی ایسی قرابتیں اور بھی ہیں ——— جن کی کھوج لگانا محققین کا کام ہے اور اُمید ہے کہ مہاراشٹر کے اردو جانکار جو مرہٹی سے بھی واقفیت رکھتے ہیں یہ کام انجام دیں گے۔

——— عبدالغفار خلجی (احمد نگر)

ستمبر کے "حرفِ آغاز" میں کہی جانے والی باتیں غور طلب ہیں ہندوستان میں کچھ دوسری چیزیں بھی اردو کے خد و خال بگاڑ رہی ہیں مثلاً: آل انڈیا ریڈیو سے اردو میں نشر ہونے والی خبروں میں ہندی الفاظ کا بے جا استعمال۔

——— واصف جمال (دربھنگہ)

ستمبر کے اداریے میں آپ نے اُردو زبان و ادب کے سلسلے میں جن امور کی جانب اشارہ کیا ہے وہ واقعی قابلِ غور ہیں۔

——— فراق جلالپوری (فیض آباد)

ماہنامہ "ایوانِ اُردو" بابت ستمبر ۱۹۹۰ء میں سید عبدالباری صاحب کا ایک مضمون "ہماری شاعری اور ہندوستانی تہوار" شائع ہوا ہے، جس میں انھوں نے محرم اور چہلم کو بھی ہندوستانی تہواروں میں شمار کیا ہے۔ اس سلسلے میں عرض ہے پیس کار ایسوسی ایشن کے صدر مہتاب علی امروہوی صاحب کا ایک مراسلہ روزنامہ "قومی آواز" (نئی دہلی) مورخہ ۲۷ ستمبر ۱۹۹۰ء میں "اردو اکادمی دہلی کے نام" کے عنوان سے شائع ہوا ہے جس میں یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ محرم اور چہلم کے لیے تہوار کا لفظ استعمال نہیں کرنا چاہیے تھا۔

اس اعتراض کے بارے میں کچھ لکھنے سے قبل یہ عرض کردوں کہ راقم الحروف نے تہوار کے بارے میں اردو کے جس قدر لغت دیکھے ہیں ان سب میں بلا استثنا اس کا املا "تیوہار" ہے، اس لیے میں اس لفظ کو اسی املا کے ساتھ لکھوں گا۔ البتہ جہاں دوسروں کے حوالے سے کچھ لکھوں گا یا نقل کروں گا تو اس میں وہی املا لکھوں گا جو انھوں نے اختیار کیا ہے۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو محرم اور چہلم ہی نہیں، بقرعید، شب برات، میلاد النبی اور کرسمس بھی مروجہ تیوہاروں میں نہیں آتے۔ مگر کیا کیا جائے، ہندوستان کے مخصوص حالات میں ان سب کو تیوہاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ محرم ایک افسوسناک تاریخی واقعہ ہے اور ایک عظیم الشان شہادت کی یاد میں منایا جاتا ہے۔ اس کی غم ناکی اور الم ناکی کے پیشِ نظر اس کے لیے کوئی ایسا لفظ

استعمال کرنا، جس میں مسرت و خوشی کا ذرا بھی
شائبہ ہو، یا اس کی سنجیدگی پر حرف آتا ہو یا اس
کا وقار مجروح ہوتا ہو یا سوءِ ادب کا پہلو
نکلتا ہو نہ صرف یہ کہ نامناسب بلکہ افسوسناک
اور قابل اعتراض ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ میری
یہ رائے بھی ہے کہ زیرِ بحث مضمون میں اگر محرم
اور چہلم کو ہندوستانی تیوہاروں میں شمار کیا گیا ہے
تو اس کی وجہ سے یہ سمجھنا کہ خدانخواستہ فاضل
مضمون نگار کی نیت ان دونوں مذہبی روایات
کے تقدس کو ٹھیس پہنچانا تھا، صحیح نہیں ہے
اور جناب سید شریف الحسن نقوی کے بارے
میں تو اس قسم کی کوئی بات سوچی بھی نہیں جا
سکتی، کیونکہ خود فاضل مراسلہ نگار کے الفاظ ہیں:
" وہ خود شیعہ فرقے سے تعلق رکھتے ہیں،
ان سے زیادہ محرم اور چہلم کی افادیت کو کون
جانتا ہے"۔ محترم مراسلہ نگار نے " افادیت "
کا لفظ لکھا ہے، اگر راقم الحروف لکھتا تو اس کے
بجائے " معنویت " لکھتا۔ فاضل مراسلہ نگار
نے وفورِ جذبات سے مغلوب ہو کر اس پر بھی
غور نہیں کیا کہ یہ کوئی پہلا موقع نہیں ہے جب
محرم کے لیے تیوہار کا لفظ استعمال کیا گیا ہو۔
مولانا حسرت موہانی نہ صرف یہ کہ اپنے دور کے
اردو شعرا میں ایک امتیازی حیثیت کے مالک
تھے، بلکہ ایک زباں داں کی حیثیت سے ان کی
بڑی شہرت تھی، وہ اپنے موقر رسالہ " اردوئے
معلی " میں مشہور شعرا اور ادیبوں کی ادبی اور
لسانی غلطیوں کو کبھی نظر انداز نہیں کرتے تھے،
مشہور ادیبوں اور شاعروں سے ان کے معرکے
ر[illegible] ہیں اور اساتذہ کے تنقیدی تذکرے لکھے
ہیں، جن کا اردو ادب میں ایک اونچا مقام ہے
انھوں نے محرم کے لیے لفظ " تیوہار " کا استعمال
کیا ہے۔ اپنے طویل مضمون " نقوشِ زنداں " میں،
جو غالباً ۱۹۰۹ء میں اردوئے معلی میں متعدد
قسطوں میں شائع ہوا تھا اور بعد میں " مولانا
حسرت موہانی قید فرنگ میں " کے نام سے
کتابی صورت میں شائع ہوا ہے، جیل کی چھٹیوں
کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے: " مسلمانوں
کے تیوہار عید، بقرعید، شب برات، محرم میں
شاذ و نادر ہی کسی تیوہار پر تعطیل ہوتی ہے"۔ (سہ
ماہی اردو ادب (دہلی) حسرت نمبر (۱۹۸۰ء
شمارہ ۱ تا ۴، صفحہ ۱۲۰)

اس کے علاوہ ایک بات اور بھی غور طلب
ہے، وہ یہ کہ حکومتِ ہند نے محرم اور چہلم کی
چھٹیاں مسلم تیوہاروں ہی کے ضمن میں منظور کی ہیں
اور ان کا ذکر گورنمنٹ " ہالی ڈیز " - (HOLI-
DAYS) میں ہوتا ہے۔ انگریزی کے اس
لفظ: " ہالی ڈیز " کے معنی بابائے اردو مولوی
عبدالحق مرحوم کے انگریزی اردو لغت میں
تیوہار کے علاوہ یومِ تعطیل اور یومِ تفریح بھی
درج ہیں۔

نامناسب نہ ہوگا اگر ہم ایک نظر اس پر
بھی ڈال لیں کہ " تیوہار " کے معنی کیا ہیں؟ اردو
کے مشہور اور مستند لغات بہت پہلے مرتب
ہوئے تھے۔ بعد میں جو مرتب کیے گئے، موجودہ
بدلے ہوئے حالات کی روشنی میں تحقیق کرنے
کے بجائے قدیم لغات سے بالعموم معنی وغیرہ نقل
کر لیے گئے ہیں۔ البتہ کراچی (پاکستان) سے " اردو
لغت " کے نام سے ایک ایسا لغت شائع کیا
گیا ہے، جس کی ترتیب و تدوین میں بڑی حد
تک تحقیق و تفتیش سے کام لیا گیا ہے۔ یہ لغت
اردو ڈکشنری بورڈ (کراچی) کے اہتمام میں مرتب
کر کے شائع کیا گیا ہے۔ اور اس کے مدیرِ اعلیٰ
مولوی عبدالحق مرحوم (۱۹۶۰ء تا ۱۹۶۱ء) اور
ڈاکٹر ابواللیث صدیقی (۱۹۷۶ء تا حال) ہیں۔
اس لغت میں لفظ " تیوہار " کے حسبِ ذیل
معنی درج ہیں:

" وہ تقریب جس میں اجتماعی طور پر مقررہ
تاریخ میں غم یا خوشی منائی جائے"۔ (جلد پنجم،
صفحہ ۸۵۹)

میرا اپنا خیال ہے کہ ایوانِ اردو کے
فاضل مضمون نگار، سید عبدالباری صاحب نے
تیوہار کا لفظ اسی معنی میں استعمال کیا ہے جو
اوپر درج ہے، نہ کہ ایسی محفل کے معنی میں جو
لطف و مسرت اور تفریح کے لیے منعقد کی گئی
ہے۔

محرم نے تو پھر بھی بڑی حد تک اپنی سنجیدگی
اور ثقاہت اور اپنے اعلیٰ مقاصد کو محفوظ اور
برقرار رکھا، مگر شب برات نے اپنا روحانی اور
دینی پہلو یکسر کھو دیا ہے اور اس کا مقصد بڑی
حد تک صرف حلوہ خوری اور آتش بازی تک
محدود ہو گیا ہے۔ اسی طرح بقرعید کا اصل
مقصد نگاہوں سے اوجھل ہو گیا ہے اور صرف
گوشت کھانے کھلانے کو بنیادی مقصد اور
اصل مطمحِ نظر سمجھ لیا گیا ہے۔ اگر غور سے دیکھا
جائے تو ان کو بھی آجکل کے تیوہاروں میں شامل
کرنا ان کی توہین ہے، مگر کیا کیجیے، ہم سب اس کو
تیوہار ہی کہتے اور سمجھتے ہیں یہ ذہنیت زمانے کی
یا ہندوستان کے ماحول کی دین ہے۔ ضرورت
اس بات کی ہے کہ محرم ہو یا شب برات، ہماری
کوشش ہونی چاہیے کہ یہ لطف و تفریح کا ذریعہ
نہ بننے پائیں اور ان کا روحانی، اخلاقی اور دینی
پہلو نمایاں ہو اور ان کے اعلیٰ اقدار کو
قوم و ملک کے سامنے پیش کیا جائے۔

——— عبداللطیف اعظمی (دہلی)

○ ستمبر ۱۹۹۰ء کے شمارے میں سیفی
سرونجی صاحب کی ایک غزل شامل اشاعت
ہے جس کے قوافی خلاف، غلاف، اختلاف
وراعتراف وغیرہ ہیں۔ مگر وہ ردیف کا اچھی
طرح تعین نہیں کر پائے کہ وہ ضمیر شخصی لفظ
میں " ہے یا حرفِ جار " میں " ہوتا تو یہ ہے
شاعر غزل کے مطلعے ہی میں ہم قافیہ ور ردیف
مصرعے نظم کرکے اپنے آپ کو قوافی ور ردیف کا
بند کرلیتا ہے۔ اور پوری غزل میں اس پابندی
ملحوظ رکھتا ہے۔ مگر شاعر موصوف نے غزل
مطلعے ہی میں اس سے اختلاف کرتے ہوئے
مصرع اولیٰ میں ضمیر شخصی (مَیں) اور مصرع ثانی
حرف جار (مِیں) نظم کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

میرے خلاف تو کبھی تیرے خلاف میں
لیکن ہے یہ بھی سچ نہیں کچھ اختلاف میں

سرے اور تیسرے شعر میں بطور ردیف
رف جار ہی نظم ہیں۔ مگر چوتھے شعر میں پھر
یر شخصی لفظ " میں " نظم کیا گیا ہے۔ اگر یہ
لی قصداً کی گئی ہے تو یہ سراسر روایت
بغاوت ہے۔

کفیل احمد نیّر (کلکتہ)

ایسی مثالیں اساتذہ کے ہاں بھی مل جائیں گی۔

ادارہ

○ اگر عبدالصمد حسینی صاحب مجھ سے پوچھتے
ب بھوتوں پر ... ن کرتے ہیں؟ اور میں کہتا کہ
، اور پھر حسینی صاحب غائب ہو جاتے تو
، بہت مزا آتا لیکن ستمبر ۱۹۹۰ء کے ایوانِ
میں ان کا " بھوت " دیکھ کر مزا ہی کرکرا
۔ ان واہموں کو انگریزی کے گمراہ کن رسالے
ریڈرز ڈائجسٹ یا کرپچین سائنس مانیٹر
فروغ دیتے رہتے ہیں۔ حقیقی سائنس کے
دلائل چونکہ ان تمام توہمات کی نفی کر دیتے
ہیں اس لیے ان کو منوانے کے لیے مسخ شدہ اور
توڑ مروڑ کر پیش کیے جانے والے سائنسی نظریات
اور وقوعے (PHENOMENON) استعمال
کیے جاتے ہیں۔ سائنس کی نگاہ میں بھوت اب
تک محض واہمہ کیوں ہے یہ بحث طویل ہوگی۔
فی الحال موصوف نے جو بھوت کے وجود کو
مذہب اسلام کی رو سے ثابت کرنے کی کوشش
کی ہے اس کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہوں گا۔
ہر مذہب کی طرح اسلام بھی روح کو
مادّے سے الگ شے متصور کرتا ہے اور ہمیں
بتاتا ہے کہ موت کے بعد جسم فنا ہو جاتا ہے مگر
روح باقی رہتی ہے لیکن یہ روح جسم سے نکال
کر عالم برزخ میں پہنچا دی جاتی ہے جہاں وہ
قیامت تک رہے گی۔ روزِ حساب اس کے
اعمال وافعال کی بنیاد پر اسے جنّت یا جہنّم میں
بھیج دیا جائے گا۔ مگر عالم برزخ سے روح دوبارہ
اس دنیا میں نہیں آسکتی۔ اس لیے کسی بھی مُردے
کا کوئی شکل اختیار کرنا خواہ اپنی ہو یا دوسرے
کی ناممکن ہے ـــــ لہٰذا بھوت کا عقیدہ
اسلام کے منافی ہے۔ موصوف اس بات کو جانتے
ہیں اس لیے بھوت کو ثابت کرنے کے لیے
یہ دلیل دیتے ہیں کہ یہ بھوت دراصل اس آدمی
کی روح نہیں ہے بلکہ اس کے اعمال وافعال
نے یہ شکل اختیار کی ہے۔ جب اعمال وافعال انسانی
یا حیوانی صورت اختیار کرسکتے ہیں، مثلاً دوسری مادی
اشیا کو متحرک و متاثر کرنا انھیں استعمال
کرنا تو پھر روح کیا چیز ہے؟ اور اس کا تصوّر
کیا ہے؟ وہ کون سی طاقت ہے جو اعمال و
افعال کو بالکل ویسے ہی ایک جگہ جمع کر دیتی ہے
اور اُنھیں اسی طرح متحرک بھی کر دیتی ہے جس
طرح وہ مرنے سے قبل اس ہستی میں نظر آتے
تھے؟ موصوف نے اس کے لیے جو سائنسی دلائل
دیے ہیں وہ تصدیق طلب ہیں نہ آواز اس طرح
جمع ہوتی ہے نہ روشنی۔

ـــــ علی عباس ازل (بمبئی)

○ ستمبر ۱۹۹۰ء کا " ایوانِ اردو " شروع
تا آخر پڑھ گیا۔ سلیم شہزاد کا مضمون خیال انگیز
ہے۔ " یوروپین نشاۃ ثانیہ کے خدوخال " ایک
معلوماتی مگر خشک مضمون ہے۔ محترم کیفی اعظمی
کی غزل مایوس کن اور محترم مظہر امام کا گیت
مضحکہ خیز ہے۔ پڑھ کر خاصی بوریت ہوئی لیکن
اس بوریت کے احساس کو کنور سین، بنت مسعود
اور اقبال نیازی کے افسانوں نے زائل کر دیا۔
سید عبدالصمد کا مضمون بھی دلچسپ ہے۔

ـــــ آفاق عالم صدیقی (دربھنگہ)

○ ایوانِ اُردو کا ستمبر کا شمارہ موصول ہوا۔
شعری حصّے کو پہلے دیکھنے کی عادت سی بن گئی ہے۔
اس کی وجہ اس صنف کی طرف میرا میلان ہے۔
کیف بھوپالی کی غزل کا یوں تو ہر شعر قاری
کو متاثر کرتا ہے لیکن یہ شعر مجھے بہت پسند آیا:

نہ اکیلا گھر سے نکل میاں ذرا دیکھ بھال کے چل میاں
بڑی ابتری، بڑی رہزنی، بڑی لوٹ مار ہے آج کل

ارشد لکھمیناوی لکھمنیاں کے ہونہار قلم کار ہیں۔ عموماً
ان کی تحریر کا موضوع حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ ہوا کرتا
ہے۔ اندازہ نہیں تھا کہ ان کے اندر ایک اچھا
شاعر ہونے کی بھی استعداد موجود ہے۔ کس قدر
مبنی برحقیقت ہے ان کا یہ شعر:

سرپرستی وقت کے حاکم کی ہے مجھ کو نصیب
اپنی خامی کو بھی اِک خوبی گنا سکتا ہوں میں

ـــــ سرور الہدیٰ (بیگوسرائے)

○ ستمبر کا ایوانِ اُردو ملا ارم زیدی کی بے

ن موت کی خبر سے بڑا صدمہ ہوا۔ ان کے
ون کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوا کہ وہ ایک معتبر
ر نگار کی حیثیت سے اردو ادب کے
ن کو بھر سکتی تھیں۔ خدا ان کے متعلقین کو صبر
افرمائے۔

بنتِ مسعود کی کہانی "تیسرا آدمی" پسند
اور نئے انداز کی لگی۔

______ قیصر اقبال (مونگیر)

○ "ایوانِ اردو" ستمبر ۱۹۹۰ء کے شمارے
ایک عنوان "اردو ملک کی دولت ہے" نظر
ے گزرا جس میں ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے اردو
تعریف کی ہے اور کہا ہے کہ اردو کو سنبھالنا
ماری ذمے داری ہے۔ جناب شنکر دیال شرما
نے اردو کے فروغ کے لیے جو کچھ کہا اس کے
یے میں شرما جی کو مبارکباد دیتا ہوں اور اس
ہے پر عمل کا بھی متمنی ہوں۔

______ محمد طارق انور (گریڈیہہ)

○ ماہنامہ ایوانِ اردو' ستمبر' اکتوبر نظر سے
گزرا جس میں آپ نے زبان و ادب پٹنہ میں شائع
اداریے کا حوالہ دیتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ صرف
پٹنہ ہی کے اردو اخبارات میں اردو زبان و
بیان کی غلطیاں نہیں بلکہ دلّی کے اردو اخبارات
میں بھی اس قسم کی غلطیاں ہیں۔ آپ نے ان کا شمار
بھی کرایا ہے' یہ تو خیر اخبارات کی بات ہوئی۔
نجم الثاقب شحنہ نے اپنے ایک مضمون "این'
سی' ای' آر' ٹی کی گیارہویں کتاب' میں سو سے
زیادہ زبان و بیان کی خامیاں واضح کی ہیں۔ یہ
مضمون سہ ماہی تکمیل بھیونڈی جنوری ۱۹۹۰ء
میں شائع ہوا ہے۔ اس کے مرتبین (خود ان کے
الفاظ میں مولفین) میں ہندوستان کے نامور
ادیب' نقاد' شاعر اور پروفیسر حضرات شامل
ہیں۔ حیرت بھی ہوئی' افسوس بھی کہ کتاب میں
خاص طور پر فرہنگ میں نہایت فاش غلطیاں
در آئی ہیں۔ اس قسم کی غلطی آپ نے بھی کی ہے۔
ایوانِ اردو اکتوبر ۱۹۹۰ء کے حرفِ آغاز کے
آخر میں آپ نے لکھا ہے" یہ فرض بنتا ہے" فرض
"بنتا" کون سا محاورہ ہے۔ فرض ہونا محاورہ ہے۔

______ تاج پیامی (ارریہ)

○ ستمبر اور اکتوبر کے حرف آغاز میں جس
غلط اردو کی نشاندہی کی گئی ہے مختلف ریاستوں
کے نکلنے والے روزناموں اور ماہناموں میں
بھی نظر آتی ہے' اور بھی بہت ساری غلطیاں
رواج پا رہی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے
کہ اس طرح اردو کو داغدار ہونے سے بچانے
کے لیے فوری طور پر عملی قدم اٹھایا جائے۔

غلط اردو کے رواج پانے کی بنیادی
وجہ لسانیات سے لاتعلقی ہے۔ دورانِ تحریر
گوناگوں اشتباہات سر اٹھاتے ہیں لیکن
ہمارے قلم کار حضرات قواعد کی طرف رجوع
کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ قیاساً
جو درست سمجھتے ہیں' اس کو قبول کر لیتے ہیں۔
اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اردو
میں صرف و نحو سے متعلق کتابوں کی بہت کمی
ہے۔ ایسی کتابیں معدودے چند ہی ہیں جو
ہماری ہر ہر قدم پر رہنمائی کر سکیں۔ اردو میں
بھی تحلیلات ہوتی ہیں اردو میں بھی ادغام کے کچھ
قاعدے متعین ہیں۔ حذف و اضافے کی ضرورت
اس میں بھی پیش آتی ہے' لیکن ایسی کتاب کہیں
ڈھونڈنے پر ملے تو ملے کہ جس میں یہ سب
بتایا گیا ہو۔ مجھے تو افسوس اس وقت ہوا جب
مجھے آپ کی تحریر میں بھی غلطی نظر آئی اگرچہ یہ
غلطی قواعد سے لاعلمی یا بےتعلقی کی بنا پر نہیں
بلکہ جلد بازی کی بنا پر سرزد ہوئی ہے' حرف
آغاز میں آپ نے لکھا ہے کہ" ہم زبان و ادب
کے اداریے سے کچھ اقتباسات نقل کر رہے ہیں
اس میں غلط اردو کی جن مثالوں کی نشاندہی کی
گئی ہے وہ دہلی کے بعض اردو کے اخبارات
میں بھی نظر آجائیں گی" مندرجہ بالا عبارت میں
دو غلطیاں موجود ہیں۔ ایک تو لفظ[ل] (واحد) اس کو
اس کے بجائے ان (جمع) ہونا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ
آپ نے لفظ بھی کو اخباروں سے متعلق کر دیا ہے'
جبکہ اس کو لفظ دہلی سے متعلق ہونا چاہیے' یعنی
جملہ اس طرح ہونا چاہیے" دہلی کے بھی بعض اردو
اخباروں میں . . ."

مضمون" بھوت: سائنسی تحقیقات کی
روشنی میں" ایک جگہ" جن و ملائک فرشتہ و
شیطان" لکھا گیا ہے۔ صاحب مضمون سے پوچھا
جا سکتا ہے کہ محترم! کیا ملائک و فرشتے میں کوئی
فرق ہے جن و شیطان میں تو خیر سے وصفی فرق
ہے لیکن" فرشتہ و ملک" میں (جن' فرشتہ'
اور شیطان (واحد) کی مناسبت سے ملائک
(جمع) نہیں بلکہ ملک (واحد) استعمال کرنا چاہیے'
اگر جنس کا اعتبار کیا گیا ہے تب بھی)

مذہبی نظریات سے متعارض مضمون
تو آپ کو چھاپنا ہی نہیں چاہیے۔ مذہبی نظریات
کے مطابق بھوت کی حقیقت یہ ہے کہ وہ جن
کی قبیل سے ہے۔ جس طرح انسان کی اس کے
رنگ' زبان' مزاج اور تہذیب و تمدن کے
اعتبار سے درجنوں قسمیں ہیں۔ اسی طرح جن کی
بھی اس کے مزاج و تہذیب کے اعتبار سے
مختلف قسمیں ہیں۔ بھوت بھی انھی قسموں میں سے
ہے۔

______ وارث مظہری (دہلی)

[ل] "اس" کا اشارہ اداریے کی طرف ہے اقتباسات

کی طرف نہیں ـــــ بھی دہلی سے ضرور کچھ دور جا پڑا ہے۔ لیکن تعلق اسی سے ہے۔

ـــــ ادارہ

○ ستمبر اور اکتوبر کے شماروں میں 'زبان و ادب' کے حوالے سے جو کچھ آپ نے لکھا ہے خصوصی توجہ چاہتا ہے۔ کچھ لوگ اپنے منفرد طرز نگارش کا دم بھرتے ہوئے اردو کے خد و خال بگاڑنے پر تلے ہیں۔ جو صرف اردو ہی نہیں ان اہل قلم کے حق میں بھی ضرر رساں ہے۔

ـــــ نوشاد عالم ساقی (مظفرپور)

○ اکتوبر ۹۰ء کے شمارے میں خالد علوی صاحب کا مضمون "غالب کا سال ولادت" مضمون نگار کے محتاط تحقیقی رویے کی نشاندہی کرتا ہے۔ اگرچہ صرف ایک خط کے نتیجے میں غالب کی عمر مزید دس سال بڑھانا زیادتی ہے لیکن اس سمت سوچنے پر مجبور ہونا یقینی ہے۔

غالب کا یہ فارسی خط کافی زمانے سے محققین کی دلچسپی کا باعث رہا ہے۔ عرشی صاحب اس کو جعلی خط کہہ کر خاموش ہو گئے۔ مالک رام صاحب نے خط کی تاریخ تحریر کو ۳۶ سال آگے بڑھا دیا۔ اپنی بات کی تائید میں انھوں نے ۱۸۰۴ء کو ۱۸۴۰ء مانا اور توضیح یہ دی کہ ۱۸ اور ۴ ہندسوں کا درمیانی نقطہ سنہ کے نون کا نقطہ ہے اور ۴ کے بعد کا نقطہ غائب گیا ہے مزید براں کہ انھوں نے (مالک رام صاحب نے) مصر جانے سے قبل ۱۹۴۰ء میں جب یہ خط دیکھا تھا تو اس پر یہ نقطہ موجود تھا گویا اس وقت سن اس طرح ہوگا ۱۸۰۴۰ء۔ اس کے بعد جناب کالی داس گپتا رضا نے مالک رام صاحب کے ہی مضمون سے متاثر ہو کر غالب کی والدہ کی وفات کا سنہ ۱۹۴۰ء مان لیا (ص ۱۸، دیوان غالب کامل، تاریخی ترتیب سے) رضا صاحب نے اسے نہ صرف والدۂ غالب کی وفات کا سال مانا بلکہ اسی سال علالت کا بھی ذکر فرما دیا۔ گویا ادھر غالب نے یہ خط لکھا اُدھر والدہ داغ مفارقت دے گئیں۔

خالد علوی صاحب نے اس فارسی خط کے علاوہ دو نہایت اہم نکتے بھی اپنی بات کی تائید میں پیش کیے ہیں۔ "طبقات شعرائے ہند" کا حوالہ اس لیے اہم ہے کہ مولوی کریم الدین سے غالب کے ذاتی مراسم تھے۔ میاں داد خاں سیاح کے نام غالب کا خط بھی اہم ہے۔ ان تینوں شہادتوں پر خالد علوی سے قبل کسی کی نظر نہیں گئی تھی۔

ـــــ شاہد حسن (دہلی)

○ ماہنامہ 'ایوان اردو' کا شمارہ (اکتوبر ۱۹۹۰ء) پیش نظر ہے۔ اس شمارے میں جناب خالد علوی نے اپنے مضمون "غالب کا سال ولادت" میں اُن گتھیوں کو دوبارہ الجھا دیا ہے جنھیں میں نے اپنے مضمون 'غالب کا سال ولادت' (مشمولہ ششماہی 'غالب نامہ' شمارہ جنوری ۱۹۸۵ء) میں سلجھانے کی کوشش کی تھی۔ مضمون نگار موصوف نے اپنی بات جن دلائل و شواہد سے واضح کرنے کی کوشش کی ہے، ان میں تین کے سوا باقی تمام تر وہی ہیں جو میں اپنے مضمون میں پیش کر چکا ہوں جو تین نئی شہادتیں پیش کی گئی ہیں، ان کی کیفیت حسب ذیل ہے:

(۱) مولوی کریم الدین مولف "طبقات شعرائے ہند" کا بیان: یہ بیان میرے پیش نظر تھا لیکن کسی سہو کی بنا پر اصل مضمون میں شامل نہیں ہو سکا تھا۔ "غالب: احوال و آثار" میں شمولیت کی غرض سے جب اس مضمون پر نظر ثانی کی گئی تو اس زمرے کی دوسری شہادتوں کے ذیل میں اس کا بھی اضافہ کر دیا گیا۔ ان شہادتوں سے صرف اتنا ہی ظاہر ہوتا ہے کہ غالب کے معاصرین کے اندازے کے مطابق ان کی عمر اُس سے زیادہ تھی جتنی کہ وہ خود بتاتے تھے۔ اصولی طور پر اس قسم کے اندازوں اور تخمینوں کو کسی قطعی فیصلے کی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا (غالب: احوال و آثار، میرے مضامین کا مجموعہ ہے جو حال ہی میں نصرت پبلشرز، لکھنؤ سے شائع ہوا ہے)۔

(۲) ذخیرۂ حبیب گنج میں محفوظ غالب کا خط: اس خط کا زمانۂ تحریر ۱۸۰۴ء نہیں ۱۸۴۰ء ہے۔ مالک رام صاحب "فسانۂ غالب" میں شامل اپنے مضمون میں اس موضوع پر کافی شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈال چکے ہیں۔ اور بظاہر حال ان کے دلائل و شواہد کو رد کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ علوی صاحب کا یہ ارشاد کہ اس خط کے آخر میں غالب کی جو مہر ہے، وہ ان تمام مہروں سے مختلف ہے جو اب تک ہمارے علم میں آچکی ہیں، یکسر خلاف واقعہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ انھوں نے اس خط کا صرف عکس دیکھا ہے، اصل خط نہیں دیکھا، ورنہ وہ اس غلط بیانی سے ہرگز کام نہ لیتے۔ اس تحریر کے آخر میں وہی مہر ثبت ہے جو اب تک کی اطلاع کے مطابق غالب کی اولین مہر ہے اور جو انھوں نے ۱۲۳۱ھ (۱۸۱۶ء) میں بنوائی تھی۔ عکس میں سنہ واضح نہیں لیکن باقی تمام نقش و نگار بالکل واضح ہیں۔ ظاہر ہے کہ ۱۸۱۶ء میں بنی ہوئی مہر ۱۸۰۴ء کی کسی تحریر میں ثبت نہیں کی جاسکتی۔

دستاویزی نوعیت کی اس تحریر سے

منعلّق دوسری قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ ۱۸۰۴ء
میں غالب کی والدہ عمر کی اُس منزل کو نہیں
پہنچی تھی جہاں ان کی زندگی کی طرف سے کسی
مایوسی یا خطرے کا امکان ہو۔ چنانچہ مختلف
شواہد سے اس کے بعد بھی مدّت دراز تک ان کا
زندہ رہنا ثابت ہے۔ علائی کے نام جولائی
۱۸۶۲ء کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ
جب تک زندہ تھیں، غالب کو زرِ نقد کی صورت
میں برابر آگرے سے کچھ بھیجتی رہتی تھیں۔ غالب
کے قیامِ کلکتہ کے دوران انھیں جون ۱۸۲۹ء
میں آگرے سے چار سو پچھتّر روپے کی ہنڈی
موصول ہوئی تھی جو یقیناً ان کی والدہ ہی نے
بھیجی ہوگی کیوں کہ والدہ کے علاوہ کسی اور
بزرگِ خاندان کی آگرے میں موجودگی کی کوئی
شہادت نہیں ملتی۔ اسی زمانے کا ایک اور خط
ہے جو ۲۹ اپریل ۱۸۲۸ء کا لکھا ہوا ہے، یہ
معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت غالب کی والدہ دہلی
میں موجود تھیں اور اپنے چھوٹے بیٹے مرزا یوسف
کی دیکھ بھال کر رہی تھیں۔ غالب کے بقول اس
وقت مرزا یوسف کی حالت میں غلبۂ دیوانگی
کے بعد اتنا افاقہ ہوگیا تھا کہ وہ "زن و دختر و مادر"
کو "زن و دختر و مادر" سمجھنے لگے تھے۔ غالب
نے اپنی والدہ کے قرض خواہوں کے اطمینانِ
خاطر کے لیے یہ تحریر بالیقین اس کے بعد ہی
لکھی ہوگی۔ اس تحریر پر مرزا یوسف کے دستخط
نہ ہونے کی وجہ بھی اس کے سوا کچھ اور نہیں
ہوسکتی کہ وہ اس زمانے میں عالمِ ہوش و حواس
میں نہیں تھے۔

(۳) مرزا یوسف کی شادی کا منظوم
دعوت نامہ: خالد علوی صاحب کی تحریر کے
مطابق اس دعوت نامے کی رو سے مرزا یوسف
کی شادی ۲۲ شعبان ۱۲۳۸ھ کو چوبیس سال
کی عمر میں ہوئی تھی۔ یہ انتہائی صریح اور
افسوسناک غلط بیانی ہے۔ اس دعوت نامے
سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس شادی کے لیے
دوشنبے کا دن اور ماہِ شعبان کی بائیسویں تاریخ
طے ہوئی تھی۔ اس تاریخ پر سنہ کا اضافہ جناب
خالد علوی نے اس طرح فرمایا ہے جیسے کہ یہ بھی
اصل دعوت نامے میں موجود ہو۔ جب کہ امر واقعہ
یہ ہے کہ یہ سنہ ۱۲۲۷ھ بھی ہوسکتا ہے اور اس
کے بعد کے متعدد سنوں میں سے کوئی اور سنہ
بھی۔ اس لیے اس دعوت نامے کی بنیاد پر بھی
کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں ضمناً یہ
عرض کردینا بھی بے محل نہ ہوگا کہ غالب کی شادی
"۷ رجب ۱۲۲۵ھ" کو نہیں، ۱۷ رجب ۱۲۲۵ھ
کو ہوئی تھی۔

خاتمۂ کلام کے طور پر یہ عرض کردینا
ضروری معلوم ہوتا ہے کہ میں نے اپنے مضمون
میں جو نتائج اخذ کیے ہیں، ان کی تردید یا ان سے
انحراف اس وقت تک ممکن نہیں جب تک باوثوق
طور پر یہ ثابت نہ کردیا جائے کہ اپنی پیدائش
کے سلسلے میں غالب کا بیان کردہ مہینا، دن اور
تاریخ یکسر غلط اور ان کی تائید میں میرے پیش
کیے ہوئے عقلی و نقلی دلائل قطعاً ناقابلِ قبول
ہیں نیز حالی نے "یادگارِ غالب" میں نقل کیے
ہوئے غالب کے اس فارسی مصرعے میں جس کا
صحیح متن میرے نزدیک ع ظہورِ من بجہاں
در ہزار و ہشت و دویست ہے، دانستہ تحریف
کی ہے۔

خالد علوی صاحب، جہاں تک مجھے
علم ہے، ابھی میدانِ تحقیق میں نو وارد کی حیثیت
رکھتے ہیں۔ میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ انھیں اگر
اس خارزار میں اترنا ہی ہے تو نہایت سنبھل کر ق
رکھنا چاہیے کہ یہاں ادنیٰ سی بے احتیاطی بھی
لغزش کا سبب بن سکتی ہے۔

——— حنیف نقوی (وارانسی)

○ "ایوانِ اُردو" (اکتوبر ۱۹۹۰ء) نظر نو
ہوا۔ "آپ کی رائے" کالم میں کرامت علی کرامت
صاحب کا خط نظر سے گزرا۔ انھوں نے ڈا
عنوان چشتی کی غزل (مشمولہ ایوانِ اُردو
۱۹۹۰ء) کے قوافی رتجگوں اور رگوں، نگوں، بگ
قوافی میں ایطائے خفی کا عیب تلاش کر
کی کوشش کی ہے۔ میری رائے میں عنوان چ
صاحب کی غزل کے ان قوافی میں ایطا ن
ہے۔ شمس الرحمن فاروقی نے ایطا کی تعریف
اس طرح لکھی ہے:

"ایطائے جلی وہ ہے جس میں قافیہ
ٹکڑوں والے لفظ سے بنا ہو۔ اور آخری
الگ کردیں تو جو بچ رہے، وہ ہم قافیہ نہ
مثلاً بت گر اور ستم گر وغیرہ۔"
(درسِ بلاغت، ص

یاس یگانہ چنگیزی نے لکھا ہے:
"ایطائے خفی اس وقت واقع
ہے جب لفظ تو دونوں اصلی اور صحیح ہ
لیکن ان کے آخری حروف اس طرح مشا
ہوں کہ تکرار کی قید کا دھوکہ ہو۔ مثلاً آ
اور حرمان۔" (چراغِ سخن، ص

ان اصولوں کو سامنے رکھ کر عنوان چش
صاحب کے مطلع اور کرامت صاحب کی
پر غور کیجیے۔ مطلع ہے:

آنکھوں میں کرب دل میں عجب رتجگوں کے ہیں
ان انگلیوں میں لمس جو کھتی رگوں کے ہیں

اس ضمن میں مندرجہ ذیل باتیں قابلِ غور

رگوں اور زنجگوں مرکب قوافی ہیں۔
جنھیں شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے دو ٹکڑوں والا لفظ اور یاس یگانہ چنگیزی نے آخری یا بڑھائے ہوئے حروف قرار دیا۔ رگوں اور زنجگوں میں بڑھائے ہوئے حروف 'وں' ہیں۔ ان کو نکال دینے سے رگ اور جگ بچتا ہے۔ چونکہ بڑھائے ہوئے حروف کو نکال دینے سے باقی الفاظ با معنی مگر مقفیٰ (جگ اور رگ) بچتے ہیں اس لیے ان میں ایطائے جلی یا ایطائے خفی کا عیب نہیں ہے۔

کرامت صاحب کو ایک اور تسامح ہوا ہے۔ اُردو میں زنجگا، زنجگے اور زنجگوں تین الگ الگ الفاظ ہیں۔ زنجگوں قوافی کی صورت میں لانے پر 'وں' کو نکالنے کے بعد زنجگا نہیں بچتا بلکہ زنجگ بچتا ہے۔ اگر بڑھائے ہوئے حروف کو نکال دینے پر ایک لفظ بے معنی اور دوسرا با معنی بچتا ہو تو بھی ایطائے جلی یا خفی نہیں ہے۔ البتہ خود کرامت صاحب اپنے شعر میں ایطا کا ارتکاب کرتے ہیں:

یہی ہے ہستیِ عالم تو نیستی کیا ہے
خودی کا رنگ جو یہ ہے تو بےخودی کیا ہے

اس مطلع سے نیستی کی 'ی' اور بےخودی کی 'ی' نکال دینے پر الفاظ (نیست اور بےخود) باقی بچتے ہیں۔ دونوں با معنی ہیں اور مقفیٰ نہیں ہیں اس لیے ایطا ہے۔

——— عطا عابدی (نئی دہلی)

○ "ایوانِ اُردو" کے اکتوبر ۹۰ء کے شمارے میں میری ایک غزل "خیرہ باطن بزعمِ خود شعلہ" شائع ہوئی ہے۔ اس غزل کے تین مطلع اور ایک شعر آپ نے قلمزد کر دیے ہیں۔ ازراہِ کرم، اس غزل کے مندرجہ ذیل تین مطلع اور ایک شعر اس خط کے ذریعے قارئین تک پہنچا دیں۔

بعض اوقات حاکم الحکما
بھی ہو محکوم احمق الحمقا
گرچہ ہوں آج کاہل الکہلا
تھا کبھی میں بھی فاعل الفعلا
ہر محرّر ہے عالم العلما
ہر مقرّر ہے افصح الفصحا
کیا یہ خوش فہمی ہے کہ چھُٹ بھیّے بھی
ہر سخنور ہے شاعر الشعرا

اکثر لوگ مجھ پر الزام دھرتے ہیں کہ میں نے اُردو غزل کو ہندی آمیز کر دیا ہے، میں نے سوچا بطور تجربہ ایک عربی آمیز غزل بھی کہہ دوں تاکہ ناقدینِ فن کو میری دقیق النظری اور وسیع المشربی کا اندازہ ہو سکے۔

——— کرشن موہن (نئی دہلی)

○ "ایوانِ اُردو" اکتوبر ۹۰ء کے شمارے میں پروفیسر شیخ علی، وائس چانسلر، گوا یونیورسٹی، گوا کا مضمون "تعلیم: قومی یکجہتی کا ایک ذریعہ"، نہایت سبق آموز اور شعور کو بیدار کرنے والا ہے۔ موصوف نے ایک جانب مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کا ذکر بڑے مدلّل انداز میں کیا ہے تو دوسری جانب مسلمانوں کی کوتاہیوں، کمزوریوں اور ناامیدیوں پر گہری ضرب لگائی ہے۔ آج ہمارا ملک جس صورتِ حال سے گزر رہا ہے اس صورتِ حال میں یہ مضمون باشندگانِ ہند کو دعوتِ فکر دیتا ہے۔

——— محفوظ آسمنی (گیا)

○ "ایوانِ اُردو" (اکتوبر ۹۰ء) پڑھا۔ "تعلیم: قومی یکجہتی کا ایک ذریعہ" ہر لحاظ سے اہم اور اعلیٰ مضمون ہے۔ ضرورت ہے سنجیدگی سے پڑھنے، سمجھنے اور عمل کرنے کی۔ افسانوں میں "اندھا کنواں" اور "رشتے" کافی متاثر کرتے ہیں۔ "دل ریزہ ریزہ" پہلے ہی کسی رسالے میں پڑھ چکا ہوں۔

——— محمد زاہد (دربھنگہ)

○ اکتوبر ۹۰ء کے "ایوانِ اُردو" میں جناب م۔ ق۔ خاں کی کہانی پسند آئی۔ بیانیہ ذرا کمزور ہے۔ پروفیسر آلِ احمد سرور کی غزلیں تبرک کا درجہ رکھتی ہیں۔ رشید حسن خاں صاحب کو چاہیے اُردو پہیلیوں کا ایک مستند مجموعہ ترتیب دے کر شائع کروائیں۔ "ایوانِ اُردو" کے سرورق، کاغذ اور طباعت پر زرِ کثیر خرچ کرنے کے بجائے اس کی ضخامت بڑھائیں۔ ہر صفحے پر تین کالمی کتابت پرچے کے ادبی مزاج سے میل نہیں کھاتی۔ "سرودِ رفتہ" والے صفحے پر نیلی زمین پر سیاہ حرفوں کی چھپائی مضرِ بصارت ہے۔ زرد زمین پر سیاہ حروف زیادہ نمایاں ہوتے ہیں۔

ایک رباعی سرور صاحب کی نذر ہے:

تھا حرص و ہوس سے سدا بیگانہ فقیر
اب عمرِ گذشتہ کی ہے یادوں کا اسیر
سورج ہے تری عمر کا بجھتا سا چراغ
روشن ہے مگر تیرے قلم کی تحریر

——— اقبال کرشن (کلکتہ)

○ "ایوانِ اُردو" میں م۔ ق۔ خاں کی کہانی "رشتے" پڑھی۔ خاں صاحب اگر انسان اور کتے کے رشتے کو اجاگر کرنا چاہتے ہیں تو ان سے پہلے کئی لکھنے والوں نے یہ کام کر دیا ہے لیکن اگر وہ کتے کو انسان پر فوقیت

دینا چاہتے ہیں تو یہ بات حلق سے نہیں اُترتی۔ خلا میں جانے والی کُتیا " LYKA " اس لیے اہم نہیں ہے کہ خلا میں گئی تھی۔ آسے خلا میں لے جانے والا انسان اہم ہے۔ خاں صاحب نے یہ ظاہر نہیں کیا کہ آخر وہ بچہ اُن کتوں کے درمیان کہاں سے آیا۔ اُسس پر طرّہ یہ کہ انسان کا بچہ کُتوں کی طرح چلنے لگے۔ نفسیات میں ہم نے جبلّت کے بارے میں ضرور پڑھا ہے کہ ہر انسان کی اپنی جبلت ہوتی ہے جو بچپن سے ظاہر ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ کہیں نہیں پڑھا کہ ایک انسان کا بچہ جانوروں میں رہ کر اپنے جسمانی اعضا کا صحیح استعمال بھول جائے۔ کہانی کے آخری پیراگراف کو پڑھ کر جس میں مُصنّف نے کُتیا کی حالتِ زار پیش کی ہے۔ جب وہ بچہ کتیا سے چھین لیا جاتا ہے (انسان کا بچہ) ہمیں اپنے محلّے کی وہ کُتیا یاد آئی جو سات آٹھ بچوں کو جنم دینے کے بعد کچھ دن اُن کے پاس رہتی ہے اور پھر اس طرح غائب ہو جاتی ہے کہ دوبارہ اُس وقت لوٹ کر آتی ہے جب اُس کا پیٹ دوسرے آنے والے بچوں سے بھاری بھرکم نظر آتا ہے۔ اب آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ کُتیا ایک انسان کے بچے کو کتنی جلدی نظر انداز کر سکتی ہے۔

—— شیخ محمود جیلانی (گُرلا)

◯ میں بڑے شوق اور انہماک کے ساتھ "ایوانِ اُردو" کا مطالعہ کرتا ہوں۔ اس میں طبع ہونے والے مضامین ہوں، افسانے ہوں یا دیگر نگارشات ادبی حلقے میں پسند کیے جانے کے لائق ہیں۔

—— محمد عمر کھتری (دہار)

◯ چند ماہ سے برابر "ایوانِ اُردو" کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ ڈھائی روپے میں اتنا معیاری جریدہ مہیّا کرانا، بے شک بڑی بات ہے۔ خدا کرے یہ روز بروز خوب سے خوب تر ہوتا جائے۔

—— محمد ولی اللہ لکھمنیاوی (بیگوسرائے)

سرورق کے اندرونی صفحے کے لیے

موصولہ عنوانات

نومبر ۱۹۹۰ء کے "ایوانِ اُردو دہلی" کے سرورق کے اندرونی صفحے پر جو تصویر چھاپی گئی تھی، اس کے لیے موصول ہونے والے شعری اور نثری عنوانوں میں سے تصویر کی مناسبت سے موزوں سمجھے جانے والے چند عنوان ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں:

شعری عنوانات

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے (غالب)

مرسلہ: خالد جمیل (اسلامیہ مڈل اسکول گرڈیہہ ۸۱۵۳۰۱، بہار)

یہ ہمنوائی احباب ایک دھوکا ہے
پرندے شاخ پہ کچھ دیر چہچہاتے ہیں (الطاف نادر)

مرسلہ: محمد راشد جمیل (نادر واچ کمپنی کچہری بازار، بھدرک ۷۵۶۱۰۰)

کس کو فرصت جو حالِ میر سُنے
رنگ کچھ اور ہی ہے محفل کا (میر تقی میر)

مرسلہ: ریاض الحق انصاری، نئی دہلی

اس سے چالیں ہم چلیں، چلے الگ یہ چال
گرو تو ہم سب ہیں مگر وقت گرو گھنٹال (ظفر گورکھپوری)

مرسلہ: سیّد سمیر مرزا، بمبئی

جہاں کی بھیڑ میں یادوں کی دولت بھی گنوا بیٹھے
مقدر دیکھیے جیتی ہوئی بازی بھی ہار آئے (ظفر گورکھپوری)

مرسلہ: انصاری امتیاز، بمبئی

ہے ضروری اب یہی اپنے وطن میں دوستو
کھیل کھیلو کوئی لیکن، امن کا پیغام دو

مرسلہ: صابر علی صابر صدیقی، سہارنپور

آپ رہ جائیں گے نقشِ پا ڈھونڈتے
وقت بیساکھیوں پر گزر جائے گا (منیر سیفی)

مرسلہ: سیّد عبید اللہ، پٹنہ

اکیلے بیٹھو گے تو مسئلے جکڑ لیں گے
ذرا سا وقت سہی دوستوں کے نام کرو (دلشاد نظمی)

مرسلہ: عرشی شاداب حنا، جمشید پور

نثری عنوانات

"گوشۂ عافیت" (پریم چند کا ناول)

مرسلہ: غازی اسلام (معرفت سب ڈویژنل ایگریکلچر آفیسر، آفیسرز کالونی، مرچائی باری، پوسٹ و ضلع کٹیہار ۸۵۴۱۰۵، بہار)

"صحبت کا اثر" (ڈپٹی نذیر احمد کا مضمون)

مرسلہ: فیض اسد العارفین، اکبر پور

"شطرنج کے کھلاڑی" (پریم چند کا ناول)

مرسلہ: سیّد صفدر حسن (گیا) سعید احمد قائد (دہلی)

"شہ مات" (ابن آصف کا افسانہ)

مرسلہ: چودھری غلام وکیر، کٹیہار

"گلدستہ" پہلے اور دوسرے نمبر پر درج شعری عنوان اور پہلے نمبر پر درج نثری عنوان بھیجنے والے حضرات کو ارسال کیا جائے گا۔

Aiwan-e-Urdu Delhi, Issue No. 44 Dec. 1990, Price Rs. 2.50 A.H.W.
Registered with the Registrar of News Papers at R. N. No. 45938/87 Delhi Postal Regd.No.D

ب محشر وہ رشک آفتاب آنے کو ہے
اور اس پر یہ قیامت بے نقاب آنے کو ہے

ب میں کیوں دیکھی یا رب میں نے برہم زلف یار
کچھ تو ہے کوئی بلا کوئی عذاب آنے کو ہے

ساقی نے نہ پوچھی اور ہم ہر دور میں
یہی سمجھے اب ادھر جام شراب آنے کو ہے

انی کے لیے منہ سے اڑا جاتا ہے رنگ
نامہ بر پھرنے کو ہے خط کا جواب آنے کو ہے

ب مہہ آئینہ ہے انقلاب دہر کا
سایہ ہے جانے کو گھر سے ماہتاب آنے کو ہے

تو کیا ڈر ہے زکی میرے گنہ ہیں بے حساب
ہاں یہ ایماں ہے مرا روزِ حساب آنے کو ہے